ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری

DR. ZAKIR HUSAIN LIBRARY

JAMIA MILLIA ISLAMIA
JAMIA NAGAR

NEW DELHI

CALL NO. 891.439105 168354 URD
Accession No.

891 43905 36603

891.4390 5 Ra. P4C
Call No 16-234 Acc No 141/2020

اُردو

انجمن ترقی اُردو کا سہ ماہی رسالہ

ایڈیٹر

عبدالحق بی۔اے (علیگ)

آنریری سکریٹری

انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد (دکن)

اردو

۱ - یہ انجمن ترقی اردو کا سہ ماہی رسالہ جنوری ، اپریل ، جولائی اور اکتوبر میں شایع ہوا کرتا ہے —

۲ - یہ خالص ادبی رسالہ ہے جس میں زبان اور ادب کے مختلف شعبوں اور پہلوؤں پر بحث ہوتی ہے - حجم کم از کم ڈیڑھ سو صفحے ہوتا ہے —

۳ - قیمت سالانہ محصول ڈاک وغیرہ ملا کر سات روپے سکۂ انگریزی (مع محصول ڈاک وغیرہ آٹھ روپے سکۂ عثمانیہ)

۴ - تمام خط و کتابت مولوی عبدالحق صاحب بی اے ، آنریری سکریٹری انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن) سے ہونی چاہئے —

—— :*: ——

(باہتمام محمد صدیق حسن منیجر انجمن اردو پریس ، اردو باغ اورنگ آباد دکن میں چھپا اور دفتر انجمن ترقی اردو سے شایع ہوا)

اردو

جلد ۱۴	جنوری سنہ ۱۹۳۴ ع	حصہ ۵۳

انجمن ترقی اردو کا سہ ماہی رسالہ

اورنگ آباد (دکن)

اردو

چودھویں جلد　　　　　　　　سنہ ۱۹۳۴ ع

فہرستِ مضامین

مقالے

رسالوں کے خاص نمبر

زنانے رسالے

—(٭)—

نه
شه
٦
٧
٨
٩ ت
١٠ ه
١١ له
١٢ سه
مك
١٣ د ٤
١٤ شيخ
ب
١٥ كهڑو
١٦ كهڑو
١٧ روسى
١٨ ٹيگور

اردو

جنوری سنه ۱۹۳۴ ع

فہرست مضامین

شیخ ملا نصرتی ملک الشعراے بیجاپور

از

(اڈیٹر)

عادل شاہي حکومت دکن کی ان یادگار زمانہ حکومتوں میں سے ھے جسے تاریخ کبھی نہیں بھلا سکتی - بہمنی سلطنت کے ضعف و زوال پر یوسف عادل شاہ نے بیجاپور میں اپني خود مختار حکومت قائم کرلی (سنہ ۸۹۵ ھ ' ۱۴۸۹ ع) جس کي حدود مغرب ساحل پر گوا تک پہنچتي تھیں - اس کي وفات پر اس کا بیٹا اسمعیل عادل شاہ تخت پر بیٹھا (سنہ ۹۱۶ ھ ۱۵۱۱ ع) - اس کے زمانے میں حکومت کو خوب فروغ ھوا - یہ دونوں فارسي کے اچھے شاعر تھے اور ان کے کلام کے نمونے تذکرہ نویسوں اور مورخوں نے اپني کتابوں میں نقل کیے ھیں - اسمعیل کے بعد ابراھیم عادل شاہ اول (سنہ ۹۴۱ ھ) اور اس کا جانشین علی عادل شاہ (سنہ ۹۶۵ ھ ۱۵۵۷ ع) اول ھوا - یہ بادشاہ بڑا الوالعزم اور قدردان علم و ھنر تھا - بیجاپور کا قلعہ ' جامع مسجد ' آب رساني کي نہریں اور دوسري کئي خوبصورت عمارتیں اس کي تعمیر کی ھوئی ھیں - اس کے جانشین ابراھیم عادل شاہ ثاني (سنہ ۹۸۸ ھ ۱۵۷۹ ع) کے وقت ملک کا عروج و فروغ ' رعیت کی خوش حالي اور علم و کمال کی سرپرستی برابر قائم رھی - علمي دنیا میں نورس نامہ اس کي بڑی یادگار ھے - لیکن اس کے بعد محمود عادل شاہ کے عہد (سنہ ۱۰۳۷ ھ ۱۶۲۸ ع) میں

ایک طرف مرھٹوں نے شیواجی کي سر کردگي میں اُبھرنا شروع کیا اوردوسری طرف شاھجہاں کي ھوس ھولناک صورت میں نمودار ھوتي نظر آئي - اس کے عہد میں بھی اردو کے اچھے اچھے شاعر گزرے ھیں - محمد عادل شاہ کي وفات پر علی عادل شاہ ثاني تخت پر بیٹھا (سنه ۱۰۶۷ ھ ۱۶۵۶ ع) اور جب اس کا وقت آپہنچا تو حکومت اس کے شیر خوار بیٹے سکندر عادل شاہ کو پہنچي اور اس نام کے سکندر پر بادشاھت کا خاتمہ ھوگیا —

بیجاپور اس وقت شہر کي حیثیت سے کچھہ بھي نہیں لیکن اس میں ایسے تاریخی اور شاندار آثار اور بے مثل یادگاریں موجود ھیں که دلي اور آگرہ کے بعد اس کا درجه ھے - سلطان محمد عادل شاہ کا مقبرہ جو گول گنبد یا بول گنبد کے نام سے مشہور ھے دنیا میں اپنی نظیر نہیں رکھتا ' کہتے ھیں که اتنا عظیم الشان گنبد تمام عالم میں کہیں نہیں - ابراھیم عادل شاہ ثاني کا مقبرہ جو عام طور پر ابراھیم روضه کہلاتا ھے ' روضۂ تاج محل کے بعد دنیا کي سب سے خوبصورت عمارت ھے - مشہور توپ ملک میدان جو دنیا کي سب سے بڑی توپ ھے اب تک وھاں موجود ھے - ان کے علاوہ قلعه ' فصیل ' برج و بارہ ' بے شمار مقبرے ' مسجدیں ' کاروانسرائیں ' محلات جو اب تک زمانے کے انقلاب اور حوادث کی دست برد کا مقابله کرتے رھے ھیں ' اب بھی کسي نه کسي صورت میں گزشته عظمت و شان کي شاھد ھیں - وہ محلسرائیں اور عشرت کدے جہاں کبھي مال و منال ' حسن و جمال اور عروج و اقبال کے جمگھٹے تھے اب جنگلی کبوتروں کا بسیرا ھیں جن کي غٹرغوں سے بھیانک گونجیں پیدا ھوتی ھیں —

علي عادل شاہ ثاني کے زمانے میں شعر و سخن کا گہر گہر چرچا تہا - فارسي کا رواج تو خیر تہا هي اور سالہا سال سے چلا آرہا تہا لیکن دکني کو اس عہد میں اور زیادہ فروغ ہوا - بادشاہ خود بہت بڑا سخن سنج اور موزوں طبع تہا اور خوش کلام شعرا کی قدر کرتا تہا - اور بڑی بات یہ تہی کہ اپنی ملکي زبان یعنے دکنی کی طرف زیادہ میلان تہا اور اس کے کلام سے جو ہمیں دستیاب ہوا ہے اس کے صحیح ذوق کا پتا لگتا ہے - صاحب بساتین السلاطین لکہتے ہیں —

" در عہد همایونش سخنوران فارسي گو چند فرد نادر روزگار بودند ' اما چوں طبع همایون بادشاہ اکثر میل بجانب لغت خاص خویش یعنی زبان دکنی داشت بر طبق الناس علی دین ملوکہم ' شعراے هندی گو بسیار از خاک بیجاپوری بر خواستہ اند خانہ بخانہ هنگامۂ شعر تازہ گوئی گرم داشتہ اند " —

" لغت خاص خویش " کے الفاظ قابل توجہ ہیں - شخصی حکومتوں میں اکثر اوقات بادشاہ جدت و بدعت کا سر چشمہ ہوجاتا ہے - جدھر اس کا میلان دیکہتے ہیں سب اسي طرف ڈھل جاتے ہیں اور اس کي مرضی ' مذہب ' رسم و رواج وغیرہ پر سبقت لے جاتي ہے - بادشاہ کی ادب پروری نیز شاعری کي داد خود نصرتی نے ان اشعار میں دی ہے :

بسارِیا * فصاحت نے حسان کوں چھپایا بلاغت نے سحباں کوں
سخن سنج کامل ہنرور تُہیں زباں آوراں کا بهي داور تُہیں
ترے شعر تے شاعراں کوں ہے نور مضامین معنانیاں کے گردوں کا نور
مضامین کے گل دکھایا تُہیں ارت + کاچ میوہ چکھایا تہیں
جگت گُر ‡ کے نورس کو نورس دیا ہر یک رس چکھانے توں سووس دیا

* بھلایا + معنی ‡ اس سے مراد ابراہیم عادل شاہ ہے جس کا نورس نامہ مشہور ہے اور جو جگت گرو کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے —

اس میں شبہ نہیں کہ دکنی زبان کو کبھی اس قدر فروغ نہوتا اگر قطب شاہی اور عادل شاہی بادشاہ اس طرف توجہ نہ کرتے اور خود اس زبان میں شعر کہہ کر اس کی قدر و منزلت نہ بڑھاتے - علی عادل شاہ کا یہ رجحان دیکھہ کر لوگوں کا اور شوق بڑھا اور دکنی شاعری ملک میں عام ہوگئی - علی عادل شاہ ثانی کے عہد میں دکنی زبان کے بہت اچھے اچھے شاعر گذرے ہیں لیکن ان سب میں ملا نصرتی کا پایہ بہت بڑھا ہوا ہے —

مصنف تذکرۂ شعراے دکن نے نصرتی کا نام محمد نصرت لکھا ہے اور چمنستان شعرا کی پیروی میں یہ بھی لکھا ہے کہ وہ حاکم کرناٹک کے قرابت داروں میں سے تھا لیکن کوئی حوالہ یا ثبوت اس کے لیے پیش نہیں کیا - بغیر سند کے اس کے تسلیم کرنے میں تامل ہے - تخلص کی مناسبت سے محمد نصرت نام ہونا قرین قیاس تو ہے مگر یقینی نہیں —

گارساں دتاسی نے گلشن عشق کے ایک قلمی نسخے کی سند پر جو کانجی ورم میں لکھا گیا تھا اُسے برھمن بتایا ہے - یہ بیان بھی مبہم ہے - اس سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ خود کتاب میں اس قسم کا کوئی اشارہ ہے یا کاتب نے آخر میں اپنی طرف سے اضافہ کردیا ہے - بعد کے بعض تذکرہ نویسوں نے بھی گارساں دتاسی کے اس بیان کی بنیاد پر اُسے برھمن لکھہ دیا ہے - اس کتاب کے متعدد نسخے میری نظر سے گزرے ہیں - ان میں کہیں اشارتاً بھی ایسی کوئی بات نہیں ہے جس سے یہ استنباط کیا جاے کہ نصرتی برھمن تھا بلکہ خود نصرتی نے اپنے متعلق گلشن عشق میں ایک آدہ جگہ جو سرسری سا ذکر کیا ہے اُس سے اِس قول کی تردید ہوتی ہے - حضرت بندہ نواز گیسو دراز کی مدح میں

لکھتے لکھتے ایک شعر لکھا ھے :

بحمد اللہ گر سي به کرسی مري
چلی آئی ھے بندگی میں تری

یہاں کرسی سے مراد پیڑھی یا پشت ھے یعني میں پشت در پشت یا نسلاً بعد نسلٍ تیری بندگي میں ھوں - اس سے ظاھر ھے که اس کے باپ دادا مسلمان تھے —

بادشاہ کي مدح کے آخر میں دو چار شعر اپنے متعلق یه لکھے ھیں :

که میں اصل میں یک سپاھی اتھا		فدا درگه بادشاھی اتھا
مجھے تربیت کرتوں ظاھر کیا		شعور اس ھنر کا دے شاعر کیا
وگرنه نه تھا مجھه یه کسب کھال		کتا ھوں اتا یو سخن حسب حال

ان اشعار سے اتنا ضرور معلوم ھوتا ھے که نصرتی سپاھي زادہ تھا اور اس کا تعلق فوج سے تھا - آگے چل کر اس تعلق کو اُس نے اور بھی صاف کردیا ھے - " حسب حال " کے تحت میں لکھتا ھے :

که تھا مجھه پدر سو شجاعت مآب		قدیم یک ساعدار جمع رکاب
وو شه کام پر زندگانی منے		کمر بسته تھا جانفشانی منے

علی نامے میں بھی ایک جگه اس نے اس کا اشارہ کیا ھے که شاعري میرا آبائي پیشه نہیں ھے —

اے شاہ رتن کا کھن ھوا مجھه من سو تیرا فیض ھے
کچھه کسب سوروثي نه ھوئي حقا که مجھه یو شاعري

مصنف تذکرہ شعراے دکن نے جو یه لکھا ھے که " مدت تک کرناٹک میں رھا پھر سیر کرتے ھوے بیجاپور میں آیا اس وقت علی عادل شاہ کا زمانه شباب پر تھا، باریاب ھوا، عہدہ منصب سے سر فراز ھوا "

صحیح نہیں معلوم ہوتا - خصوصاً آگے چل کر نصرتی نے اپنے بچپن اور ابتدائی زمانے اور بادشاہ کی شہزادگی کا ذکر کیا ہے - اس سے اس واقعہ کی صحت اور بڑی مشتبہ ہوجاتی ہے - چنانچہ وہ کہتا ہے کہ بادشاہ عالم شہزادگی ہی سے میرا خریدار تھا :

میرا شہ جو بوجک * اہے جوہری وو شہزادگی میں اتھا مشتری
نوی پانوں سا شہ یو بالا اتھا چڑت بدّ † کا دن دن اجالا اتھا
دسے گرچہ ظاہر نہنے سن میں سخت اتھے پن ازل تے عطا اسکوں بخت
میری طبع کی کہن کو قابل پچھان نکوی کہن ہے کر اس مقابل پچھان
دھر نہار اکثر اثر مہر کی رکھیا مجھہ اوپر نت نظر مہر کی

گلشن عشق میں نصرتی نے اپنی تعلیم و تربیت کا بھی ذکر کیا ہے جس کے لیے وہ اپنے والد کی شفقت و تربیت کا ممنون ہے - ذیل کے اشعار میں بڑی سادگی سے اس کا بیان لکھا ہے :

کہ تھا مجھہ پدر سو شجاعت ماب قدیم یک ساعدار جمع رکاب
وو شام کام پر زندگانی منے کمر بستہ تھا جانفشانی منے
بچانے جنم آپنا ننگ و نام اپس زندگی میں کیا خوب کام
اول تھیچ لگ مجھہ میں نہنو ادگی ‡ میرے حق میں اندیش استادگی
نظر دھر کہ مجھہ تربیت میں سدا رکھیا نہیں کہ ہیں مجھہ اپس تھے جدا
سکچ § مجھہ تھے جانے کوں دن نس منے پڑورے لے بزرگاں کی مجلس منے
معلم جو میرے جتے خاص تھے دھر نہار وو مجھہ سوں اخلاص تھے
شجانے سبق کوئی میرا بار دل دھر نہار تھے پیار ہو یار دل

* پرکھنے والا - † بڑھتی ہوی عقل - ‡ لڑکپن - § حجاب ، پہلے مہر نے دل سے حجاب دور کرنے کے لیے —

کچهه یک میں سنبها لیا جب اپنا شعور کیا کر کتابان پو اکثر عبور

نصرتی نے اپني تصانیف میں اپنے متعلق اس سے زیادہ کچهه نہیں لکها۔ لیکن روضة الاولیا بیجاپور مولفه محمد ابراهم صاحب بیجاپوری (سنه تالیف ۱۲۴۱ هـ) میں شیخ منصور کے حالات میں یه لکها هے که شیخ نصرتی ملک الشعرا اُن کے برادر عیني تهے - اس کتاب کا ترجمه شاه سیف الله صاحب ایک بزرگ نے کیا هے جس کا قلمی نسخه ایک دوست کی عنایت سے میري نظر سے گذرا هے - انهوں نے شیخ منصور کے حالات میں اپني معلومات سے یه اضافه کیا هے *:

"آپ کے دو برادر مولانا شیخ ملا نصرتي ملک الشعرا اور شیخ عبدالرحمن سپاهي تهے - یه هر سه برادران حقیقي هیں - هر ایک صاحب ایک ایک فن میں کمال رکهتے تهے - شیخ منصور علم دعوت میں، شیخ عبدالرحمن سپاه گری میں اور شیخ ملا نصرتي شاعري میں - مولانا شیخ منصور اور شیخ عبدالرحمن دونوں کو اولاد صلبی نهیں هے - مولانا شیخ ملا نصرتی ملک الشعرا کو آل هے اولاد نهیں اور ان کی آل سے پانچ چادر والے، گهڑیال والے، منور والے، هاشم پیر والے، مقبل والے، گو اسنگی والے، نگینه باغ والے هم ساگر والے موجود هیں"

بیجاپور جاکر میں نے مزید حالات کی تحقیق و تفتیش کي تو معلوم هوا که مولانا نصرتی کي اولاد اب تک موجود هے - ایک مهربان کی بدولت محمد ملتاني قادري صاحب عرت جعفر صاحب جاگیردار

---

* اس ترجمه کا مطبوعه نسخه بهی موجود هے جو مطبعه صبغة اللهی رانچور میں سنه ۱۳۱۴ هـ میں طبع هوا تها - اس میں یه عبارت درج نهیں —

گولسنگي (ضلع بیجاپور) سے ملاقات هوئي اور انہوں نے اپنی عنایت سے اپنے خاندان کي سند جاگیر جس میں خاندان کا شجرہ بھی هے میرے حوالے کردی - یہ سند انعام شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے عہد کی هے اور اس پر امانت خاں عالمگیر شاهی اور محمد کاظم مرید شاہ عالمگیر کی مہریں ثبت هیں- یہ درحقیقت قدیم عادل شاهي سند کی تجدید هے -

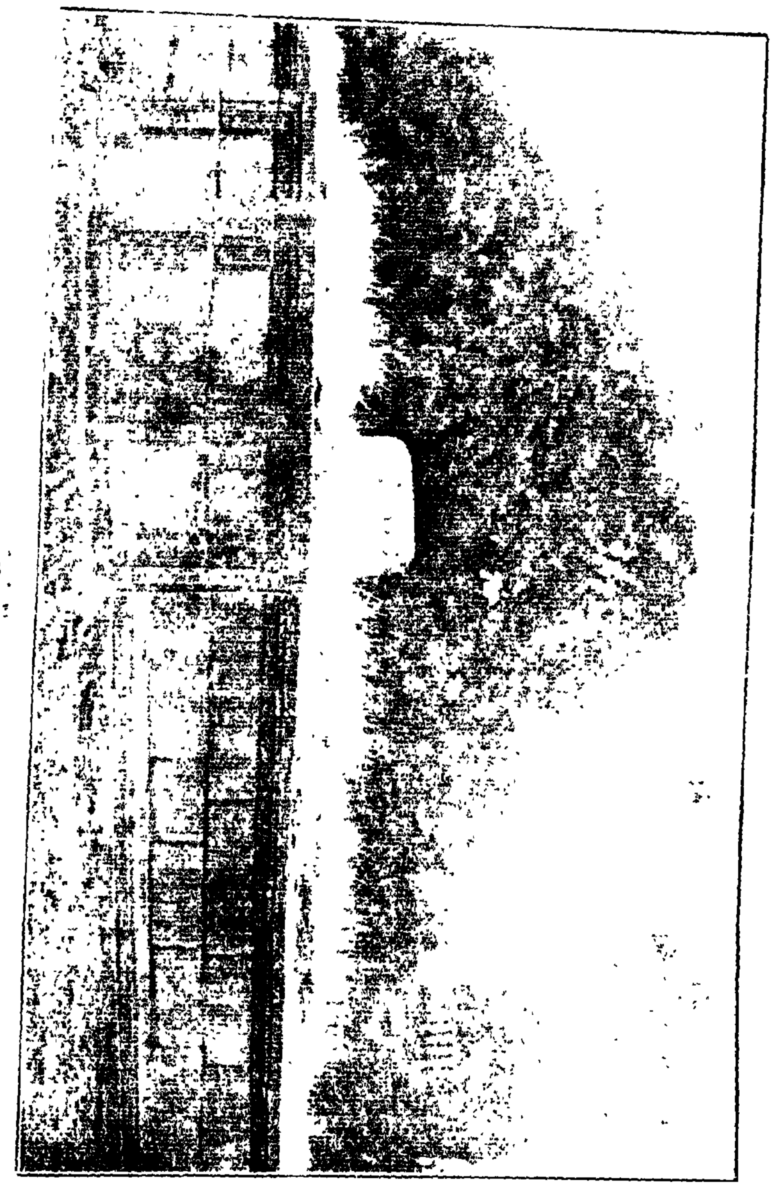
چنانچہ خود اس سند میں اس کا حوالہ ان الفاظ میں موجود هے

" باغ مذکور مع درختهائے و چاہ ها بشیخ پیر محمد بطریق انعام ابدی باولاد و احفاد دادہ شد و محضرے کہ برگم شدن سند انعام ابدی باغ مذکور بمہر علي عادل خاں بیجاپوری بنام شیخ منصور بدست دارد صحیح و از لوث تجعیل و تلبیس مبرا ست ' -

چونکہ شیخ منصور لاولد مرے اس لیے ان کی معاش موقوعہ نگینہ باغ ان کے خواهر زادہ شیخ پیر محمد صدیقي (قادری) کو ملي - سند مذکور میں ان کا شجرہ ضمناً آگیا هے - وہ عبارت یہاں نقل کی جاتي هے —

" کہ یک قطعہ باغ نگینہ کہ موازی دوازدہ بیگہ محدودہ و معروفہ و معلومہ متصل باغ و مسجد ملک جہاں اندرون قلعہ است بموجب اسناد احکام سابق در قبض و تصرف مالکان شیخ پیر محمد قادري ابن شیخ برهان الدین بن شیخ علي خواهر زادۂ شیخ منصور بن شیخ مخدوم بن شیخ ملک بود و شیخ پیر محمد مذکور حي و قائم است " —

اس سے صاف ظاهر هے کہ ملا نصرتی نسلاً بعد نسلٍ مسلمان تھے اور



ان کی بہن کی اولاد اب تک موجود اور ان کے بھائی شیخ منصور کی جاگیر پر قابض و متصرف ہے ۔ یہ معاش شیخ پیر محمد صدیقی کے انتقال پر ان کی بیوی اور تین لڑکیوں پر تقسیم ہوئی ۔ جیسا کہ پہلے بحوالۂ ترجمۂ روضۃ الاولیا ذکر ہوچکا ہے ملا نصرتی کے کوئی اولاد نرینہ نہ تھی البتہ بیٹی تھی جس کی " اولاد سے جعفر صاحب اور صاحب حسنی نگینہ باغ والے گواسنگی میں موجود ہیں ' * —

میں نے بیجا پور میں نصرتی کی قبر کا پتا لگایا ' یہ اسی نگینہ باغ میں ہے جس کا ذکر سند انعام میں آیا ہے اور اب یہ زمین گورمنٹ ہائی اسکول کے احاطے میں ہے ۔ قبر کا عکس اسی صفحے کے مقابل دیا گیا ہے ۔ مقبرے کے جاے وقوع کی تصدیق روضۃ لاولیا سے بھی ہوتی ۔ چنانچہ شیخ منصور کے حالات میں لکھا ہے :

خدمت شریفش اہل اللہ و از کاملان اہل دعوت است و در تصرف دعوت و تکسیر ممتاز وقت بود ۔ سلطان عادل شاہ و اسکندر شاہ اعزاز و اکرام ایشان می کردند ۔ قبرش در نگینہ باغ است و شیخ نصرتی ملک الشعرا کہ برادر عینیء ایشان می شود ہم دراں جا مقبور است " —

غرض ان تمام واقعات سے صاف ظاہر ہے کہ ملا نصرتی بیجا پور کے معززین میں سے تھے اور یہ اور ان کے دونوں بھائی اپنے اپنے فن اور کمال کی وجہ سے خاص شہرت رکھتے تھے اور مقبول بارگاہ شاہی تھے —

بادشاہ کے دربار میں پہنچنے کا واقعہ اس نے اس طرح لکھا ہے کہ جب میں تعلیم و تربیت پا چکا تو میری تقدیر چمکی ۔ بادشاہ شہزادگی ہی کے زمانے سے اس پر مہربان تھا ۔ اب جو تخت پر بیٹھا اور عین کامرانی و جہانبانی کا عالم تھا تو :

بھلا بھیج بندے کو اس حال میں　　نظر کر مرے بے بہا مال میں

---

* ترجمۂ روضۃ الاولیا (مطبوعہ) صفحہ ۲۱۹ —

پرکھتا چلیا یو رتن سر بسر دیکھے پارکھہ * یو اہل نظر
و ہیں جگ میں بندہ رہلے بے نیاز رکھیا اپنی خدمت میں کر سرفراز

میں ابھی اوپر لکھہ آیا ہوں کہ بجز ان چند مقامات کے جو نقل ہوچکے ہیں نصرتی نے اپنی تصانیف میں اپنے متعلق اور کچھ نہیں لکھا۔ البتہ علی نامے کے ایک قصیدے میں ضمناً بادشاہ سے اپنی بے سر و سامانی کی شکایت کی ہے اور عرض کیا ہے کہ جس گھر میں میں رہتا ہوں وہ بہت تنگ ہے - پڑوس بہت نا معقول ہے ، آس پاس سب اراذل و انفار آباد ہیں۔ گھر کی یہ حالت ہے کہ بارش ہوئی تو صحن حوض بن جاتا ہے اور اب کی برسات میں تو غضب ہی ہوگیا کہ پانی کی رو گھر کا سارا ساماں بہا لے گئی - آخر میں التجا کی ہے کہ کوئی ایسا مکان عنایت فرمایا جاے جو میری طبیعت کے مناسب ہو اور جہاں میں اطمینان اور فراغت سے کام کرسکوں- ان اشعار کا یہاں نقل کرنا لطف سے خالی نہ ہوگا - پہلے وہ اپنی شاعری کے متعلق تعلی کرتا ہے اور اس کے بعد کہتا ہے :

پن کیا کروں اے شاہ میں کئی باب بے سامان ہوں
اول تو ایسا گھر نہیں جہاں تھار ہوے راحت بھری

گھر بی نہنا یک ہے ولے دائم ہے علت لئی اوسے
لڑکا نہ سوں ہمسایہ بد ویسیچہ بھویں کی بد تری

مطلق اراذل قوم اوہیں گرد ایسے بے حیا
سمجیں وو گالی کھاؤ کوں سمجیں گھٹ ہور مسخری

جن کی زبان تے لام کاف آتا ہے شیطان سیکنے
سانچے بچے سوں جب کریں تعلیم جنگ زرگری

---

* پرکھنے والے ، جوہری —

هنگام پر برسات تک پڑنے میں ار کا نیر بھر
گھر حوض هوکر کیچھ کے رہے دھوپ کالے لگ تری

اِس سال تو ار * کا ستم سامان گھر کالے گیا
اوبر یا هے یک نہالی لهات یعلے ڈگن هور دھر تری

بندے کی آخر عرض یو هے اے جہاں کے سایہ باں
یا کر پڑے گھر کو کوڑا یا کر کرم سے یاوری

فرماں سوں عالی حکم کے بخشش مجھ ایسا گھر دلا
جو صات تر سج طبع کوں جہاں هوے صفائی بہتری

ایک دوسرا واقعہ علی نامہ کی تمہید میں نصرتی نے ضمناً بیان کردیا هے جس سے معلوم هوتا هے کہ اس کے دونوں بھائی اس کی زندگی هی میں وفات پاچکے تھے - چنانچہ وہ لکھتا هے :

دو بازو میرے دین و دنیا کے زور تو ٹو تھےسوتھا جیو میں مجھ سخت شور
جلم جگ دیکھت دل کوں سج بنغ باغ دیا تھا فلک داغ بالاے داغ

صاحب بساتین السلاطین نے نصرتی کی بد یہہ گوئی کا ایک واقعہ لکھا هے کہ ایک روز بادشاہ محل میں رونق افروز تھے اور حوض میں فوارہ عجیب بہار دے رہا تھا ' بادشاہ کی زبان سے بے ساختہ یہ مصرع نکلا —

اُڑتا سو یو فوارہ پانی کا کیا نچھل هے

ملا نصرتی نے فوراً جواب میں یہ مصرع کہا :

---

* یہ لفظ لر لهر کا بگاڑ هے - بعض صاحبوں نے اسے " لڑکا " پڑھا هے اور مطلب یہ پیدا کیا هے کہ اس کا لڑکا بہت نالایق اور اوباش تھا حالانکہ واقعہ یہ هے کہ ملا نصرتی کے لڑکا تھا هی نہیں - نیز سیاق و سباق عبارت سے اس کا کوئی قرینہ نہیں پایا جاتا —

تجھہ شاہ پر اُڑانے موتی کا مور چل ہے

بادشاہ چونکہ خود ایک خوش مذاق اور خوشگو شاعر تھا اس لیے نصرتی جگہہ جگہہ اپنے تئیں بادشاہ کا شاگرد ظاہر کرتا ہے - اسے نصرتی کی شاہی عقید تمندی یا انکسار پر محمول کرنا چاہئیے ورنہ وہ کسی کا شاگرد نہ تھا اور فطرتاً شاعر تھا - بادشاہ کی مدح میں پہلے ہی دو شعر یہ ہیں —

مجھے یو سخن بادشاہ یاد ہے پچھیں پیر کے وصف استاد ہے

مجھہ اُستاد اُستاد عالم اچھے جتا علم از بر جسے جم اچھے

بحمد اللہ کیا مجھد بڑے بخت آج نہ اُستاد کوئی مجھہ علی شہ کے باج

اس قسم کا خیال اس نے کئی جگہہ ظاہر کیا ہے - لیکن اصل حقیقت بھی وہ ایک جگہہ لکھہ گیا ہے —

نہ کچھہ شاعری کسب کا کام ہے نہ یو حق کی بخشش تھے الہام ہے

نصرتی نے تین بادشاہوں یعنی محمد عادل شاہ، علی عادل شاہ ثانی اور سکندر عادل شاہ کا زمانہ دیکھا - فتوت نے اپنے تذکرہ ریاض حسنی میں لکھا ہے کہ جب شاہ اورنگ زیب عالمگیر نے دکن فتح کیا تو وہاں کے شعرا کو حاضر کرنے کا حکم دیا - ان میں نصرتی بھی تھے اور ان کے کلام کو سب سے افضل تسلیم کیا اور خطاب ملک الشعراے ہند سے سر افراز فرمایا - مولوی عبدالجبار مرحوم نے تذکرۂ شعراے دکن میں ان کا سنہ وفات ۱۰۹۵ ھ لکھا ہے لیکن یہ معلوم نہیں ہوا کہ یہ اطلاع انہیں کہاں سے حاصل ہوئی - اگر یہ سنہ وفات صحیح ہے تو فتوت کا بیان صحیح نہیں ہوسکتا کیونکہ عالمگیر نے بیجا پور کو سنہ ۱۰۹۷ ھ میں فتح کیا تھا —

نصرتی کی تصانیف

نصرتی کی تصانیف جو اب تک ہمیں دستیاب ہوی ہیں وہ یہ ہیں :

۱ - گلشن عشق - ۲ - علی نامہ - ۳ - تاریخ اسکندری - ۴ - قصائد و غزلیات —

اور غالباً ان کے سوا نصرتی کی اور کوئی تصنیف ہے بھی نہیں - اب ان میں سے ہر ایک کا ذکر الگ الگ کیا جاتا ہے اور آخر میں نصرتی کے کلام کی خصوصیات پر ایک نظر ڈالی جائے گی —

گلشن عشق | یہ نصرتی کی سب سے پہلی تصنیف ہے اور ایک عشقیہ مثنوی ہے - جس میں منوہر و مدھ مالتی کے عشق کا فسانہ بیان کیا گیا ہے - قصہ کہاں سے لیا گیا ہے اس کا معلوم کرنا دشوار ہے کیونکہ نصرتی نے اس کا کہیں اشارہ نہیں کیا - صرف اس قدر لکھا ہے کہ ان کے ایک دوست " مسمی نبی ابن عبدالصمد " نے اس قصے کے لکھنے کی ترغیب دی - تحقیق سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصہ اس سے قبل بھی تحریر میں آچکا تھا - ایک صاحب شیخ منجھن نامی نے اسے ہندی میں لکھا تھا - یہ کتاب اب تک کہیں دستیاب نہیں ہوئی - اس کا حوالہ ایک دوسری کتاب مسمی " قصۂ کنور منوہر و مد مالت " * میں ملتا ہے - یہ فارسی مثنوی ہے - مصنف کا نام معلوم نہیں ہوا ' البتہ سنہ تصنیف سنہ ۱۰۵۹ ہے - اس میں مصنف نے شیخ منجھن کی ہندی کتاب کا ذکر کیا ہے اور اپنے قصے کی بنیاد اسی پر رکھی ہے - تیسری کتاب عاقل خاں رازی عالمگیری کی مثنوی مہر و ماہ ہے جو سنہ ۱۰۶۵ کی تصنیف ہے - اس میں بھی یہی قصہ ہے - نصرتی کی گلشن عشق کے بعد بھی بعض شعرا نے اس فسانے کو نظم کیا ہے - ان میں سے ایک حسام الدین حصار کا رہنے والا عالمگیر کے عہد میں ہوا ہے یہ بھی فارسی مثنوی ہے - کتاب کا نام حسن و عشق اور اس کا سنہ تصنیف ۱۰۷۱ ہجری ہے - یہ کتاب میرے پاس موجود ہے - اگرچہ ان سب کتابوں میں قصہ ایک ہے لیکن ہر مصنف نے کسی قدر رد و بدل یا اختصار سے بیان کیا ہے - ان سب میں گلشن عشق بہت جامع اور ضخیم ہے - نصرتی نے اصل قصے میں چنپاوتی اور چندرسین کی داستان ضمنی طور پر بڑی خوبی سے ملائی ہے - یہ کہنا دشوار ہے

---

* فہرست مخطوطات فارسی برٹش میوزیم جلد دوم صفحہ ۸۰۳ —

ہے کہ کس نے کس سے اس قصے کو لیا - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک زمانے میں یہ قصہ بہت مقبول اور مشہور تھا اور ہر مصنف نے اسے اسی طرح بیان کردیا ہے جیسا کہ مقامی طور مشہور چلا آرہا تھا - یہ ممکن ہے کہ نصرتی کے نظر سے عاقل خاں کی مثنوی ٴ مہر و ماہ گزری ہو اور اس نے تصرت کر کے اسے زیادہ پر لطف بنا دیا ہو یا جس طرح اس نے اپنے وطن میں یہ داستان سنی ہو اسی کو کسی قدر درست کر کے نظم کردیا ہو - قصے کا خلاصہ یہ ہے —

ایک راجا تھا ، اس کا نام تھا بکرم - اس کا پائے تخت کنک گیر تھا - کوئی بیٹا نہ تھا اس غم سے دل فگار رہتا تھا - ایک دن راجا رسوی پر بیٹھا تھا کہ ایک فقیر نے صدا دی - راجا ویسے ہی کھانے کا تھال اٹھا کر اس کے پاس لے گیا - جب آنکھیں چار ہوئیں تو وہ کچھ لئے بغیر چل دیا - راجا کو اس کا بہت دکھ ہوا اور فقیر سے سبب پوچھا تو اس نے کہا کہ میں بانجھ کے گھر سے کچھ نہیں لینا چاہتا - یہ سننا تھا کہ راجا کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے اور وہ غم و رنج سے نڈھال ہوگیا - رانی نے سمجھایا کہ اس طرح رنج کرنے سے کیا حاصل : اس فقیر کو ڈھونڈو اور جو وہ کہے وہ کرو - شاید در مقصود ہاتھ آجائے - میں تمھاری غیر حاضری میں راج پاٹ سنبھال لوں گی - غرض راجا سدھارا اور جنگل بیابان بستی اور آبادی میں مارا مارا پھرا - اتفاق سے ایک بن میں حوض کے کنارے پہنچا - وہاں کچھ پریاں نہا رہی تھیں ، ان کے کپڑے لے کر درختوں میں چھپ گیا - پریاں بہت پریشان ہوئیں اور روئی دھوئیں تو یہ نکلا اور اپنی واردات سنائی - پریوں نے اسے درویش تک پہنچانے کا وعدہ کیا اور اپنا ایک ایک بال بھی دیا - کپڑے پہن وہ اسے اڑا کر اس بن میں لے گئیں جہاں وہ درویش رہتا - وہاں پہنچا تو فقیر اسے دیکھ کر سمجھ گیا اور کہنے لگا ، دیکھ یہ درخت ہے اس کا پھل توڑ لے اور اپنی رانی کو لے جا کر کھلادے ، خدا تجھے بیٹا دے گا - راجا نے باہر آکر جونہیں پریوں کے بال

جلائے کہ پریاں حاضر ہوگئیں اور اسے اڑا کر لے چلیں اور محل پر لاکر چھوڑ دیا۔ راجا رانی سے ملا اور اسے وہ پھل کھلا دیا۔ نو مہینے کے بعد بیٹا ہوا۔ سارے ملک میں خوشی اور مسرت کے شادیانے بجنے لگے۔ نجومیوں نے زائچہ دیکھا اور اس کا نام منوہر رکھا اور کہا کہ یہ بڑا خوش نصیب اور با اقبال ہوگا۔ لیکن چودہ برس پر گیارہ مہینے گذرنے پر اس کے لئے خطرہ ہے۔ اس وقت اس پر بڑی اپتا پڑے گی لیکن وہ پھر ہر بلا کو بھگت کر صحیح سلامت آجائے گا۔ اس مصیبت کو کوئی دور نہیں کرسکتا، اس کا آنا اٹل ہے۔ راجا یہ سن کر بہت رنجیدہ ہوا اور حکیموں کو بلا کر پوچھا کہ وہ کونسی ایسی بلا ہے۔ انھوں نے سوچ کر جواب دیا کہ وہ عشق ہے۔ پوچھا اس کا علاج ؟ کہا کہ اُس وقت تک ایسی جگہہ رکھا جائے کہ آسمان تک نہ دیکھہ سکے تو اس کا بچنا ممکن ہے۔ چنانچہ اس مشورے کے مطابق اس کے لئے ایک بہت پر فضا اور خوش نما محل تیار ہوا اور اس میں وہ پلنے لگا۔ جب چار برس چار ماہ چار دن کا ہوا تو پڑھنے بٹھایا اور ضروری علوم و فنون کی تحصیل کرنے لگا۔ یہ سارے انتظام ہوئے لیکن جو وقت آنے والا تھا وہ نہ ٹلا —

چودھویں رات ہے چاندنی کا نور سارے عالم پر چھایا ہوا ہے کچھہ پریاں سیر کو نکلیں، اس محل اور باغ کو دیکھہ کر ایسی ریجھیں کہ آسمان سے اتر کر وہاں آگئیں۔ اب جو محل میں داخل ہوئیں تو کنور کے حسن و جمال کو دیکھہ دنگ رہ گئیں۔ آپس میں کہنے لگیں کہ ایسا حسین دنیا میں کوئی نہیں، اس کا جوڑا بھلا کہاں مل سکتا ہے۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ خالق نے ہر ایک کا جوڑا بنایا ہے اور وہ کہیں نہ کہیں ضرور ہوگا۔ دوسریوں نے کہا کہ ہماری تمھاری شرط کہ یہ انسان بے جوڑ ہے۔ یہ سن کر وہ پری ملول ہوئی اور کہنے لگی اچھا ہم ایک کام کریں کہ ہم نو پریاں ہیں نو کھنڈ میں جائیں اور اس کا جوڑا تلاش کریں۔ غرض ہر ایک ایک جانب کو چلی۔ آٹھوں تو ڈھونڈ ڈھانڈ کے چلی آئیں اور ناکام رہیں۔

نوبیں کا انتظار کرنے لگیں۔ اتنے میں وہ آئی اور کہنے لگی شکر ہے کہ میں نے اس کا جوڑا پالیا، سات دریا پار ایک دیس ہے مہارس نگر نام، اس کا راجا دھرم راج ہے اور اس کی بیٹی (مدمالتی) چاندے آفتاب چندے ماہتاب ہے۔ اگر تم کو شک ہو تو آؤ چلو دیکھ لو۔ غرض انھوں نے آپس میں صلاح کر کے منوھر کا پلنگ اٹھایا اور مہارس نگر کے محل میں لے آئیں۔ اور جہاں مدمالتی سو رہی تھی وہیں لاکے رکھ دیا۔ اتنے میں منوھر کی آنکھ جو کھلی تو حیران ہو کے دیکھنے لگا کہ میں کہاں آگیا۔ پھر جو دوسری طرف نگاہ کی تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک ماہ رو نازنین سو رہی ہے جس کے حسن کی تاب سے سارا محل جگمگا رہا ہے۔ یہ دیکھتے ہی سو جان سے عاشق ہوگیا۔ تھوڑی ہی دیر میں مدمالتی کی بھی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ پلنگ پر ایک حسین نوجوان لیٹا ہوا ہے بگڑ کر کہنے لگی کہ تو کون؟ کیا تو جان سے بیزار ہے جو یہاں آیا ہے۔ منوھر نے کہا یہ تو میرا محل ہے، راجا بکرم کا بیٹا اور کنک گیر کا کنور ہوں۔ یہ سن کر وہ بہت ہنسی کہ تو دیوانہ ہے، یہ مہارس نگر ہے اور اس محل میں میں رہتی ہوں۔ میرا باپ دھرم راج یہاں کا راجا ہے۔ دونوں حیران و ششدر رہے۔ آخر آپس میں ملتے ہیں اور ایک دوسرے پر فدا ہوجاتے ہیں۔ ایک پلنگ پر آجاتے ہیں اور ایک دوسرے سے انگوٹھی بدلتے ہیں۔ بات چیت کرتے کرتے آنکھ لگ جاتی ہے — اتنے میں سیر کر کے پریاں واپس آجاتی ہیں۔ ان کو ایک جگہ دیکھ کر جدا کرتے ہوے جی کڑھتا ہے۔ پھر یہ خیال آتا ہے کہ اگر واپس نہیں لے جاتیں تو اس کے ماں باپ رو رو کے جان دیدیں گے۔

اور خدا سے دعا مانگتی هیں که هم اسے لے تو جاتے هیں لیکن اے کارساز تو انہیں پھر ملا دے - منوهر کو اٹھا کر اس کے محل میں پہنچا دیتی هیں - جب صبح کو آنکھ کھلتی هے تو سخت بیچین هوتا هے اور حالت روز بروز ابتر هونے لگتی هے - راجا یه دیکھ کر بہت پریشان هوتا هے - نجومیوں کو بلا کر پوچھتا هے وہ کچھ نہیں بتا سکتے - منوهر کی ایک دائی تھی جسے وہ اپنی ماں کی برابر سمجھتا تھا اور بہت محبت کرتا تھا - وہ مہر و محبت کی باتیں کرکے منوهر سے اس کا حال پوچھتی هے - وہ سارا قصه بیان کرتا هے - دائی بہت تسلی تشفی دیتی هے اور پھر راجا سے ساری کیفیت بیان کرتی هے - راجا بہت سے هوشیار اور طرار شاطر لوگوں کو مہارس نگر کی تلاش میں بھیجتا هے - وہ ملک ملک پھرتے هیں مگر مہارس نگر کا کہیں پتا نہیں لگتا اور مایوس هوکر واپس آجاتے هیں - تب راجا بیٹے سے کہتا هے که مہارس نگر کا کہیں پتا نہیں ملتا یه تیرا وهم هے یا سایه هے اس خیال کو چھوڑ دے - منوهر نہیں مانتا اور کہتا هے که تم مجھے جانے دو میں خود هی اپنی محبوبه کو تلاش کروں گا - باپ نے چار و ناچار منظور کرلیا اور کہا اچھا جاتے هو تو بادشاهوں کی طرح جاؤ که تمهاری عزت بھی هو —

سامان سفر تیار هوتا هے اور کنور جہاز پر تمام ساز و سامان اور مصاحبوں اور ملازموں کو لے کر روانه هوتا هے - رستے میں ایک بڑا اژدها ملتا هے وہ جہاز کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتا هے - سب ساتھی ڈوب جاتے هیں اور یه بمشکل کنارے پہنچتا هے - پھر ایک صحرائے آتشیں ملتا هے - وهاں ایک بزرگ سے ملاقات هوتی هے - وہ اسے رسته بتاتے هیں اور ایک چکر دیتے هیں جو سب آفات

کو دفع کرتا ھے - چلتے چلتے ایک عظیم الشان باغ میں جا پہنچتا ھے جہاں وہ ایک عالیشان مکان دیکھتا ھے اور دروازہ کھول کر اندر جاتا ھے - کیا دیکھتا ھے کہ اندر ایک حسین نازنین لیٹی ھے - تھوڑی دیر بعد اس کی آنکھ کھلتی ھے تو اس اجنبي کو دیکھ کر حیرت کرتی ھے اور پوچھتی ھے کہ تو کون ھے اور یہاں کیسے آیا - وہ اپنا سارا حال بیان کرتا ھے - یہ حال سن کر وہ حسینہ ھنسي اور پھر روئي - اس نے سبب پوچھا تو کہا کہ تیرے نصیب میں سکھ ھے اور میرے نصیبوں میں دکھ - میں تجھے خوش خبری دیتي ھوں کہ تو اپنی محبوبہ سے ملے گا - میں مدمالتي کي بڑی عزیز سہیلی ھوں - میرا نام چنپاوتي ھے اور میرا باپ سورمل ھے اور اپنے ملک کا راجا ھے - ھم میں اور دھرم راج میں بڑا اتفاق و اتحاد ھے اور معبد میں اور مدمالتی میں بہناپا ھے - میں ایک روز اپني سہیلیوں کے ساتھ باغ کي سیر کر رھي تھي کہ یکایک ایک آندھی آئی - اس آندھي میں سے ایک دیوزاد نکلا اور مجھے اُڑا کر لے گیا - اب اس کے پھندے میں ھوں - یہ کہہ کر وہ رونے لگی - منوھر نے کہا رو مت، میں تجھے اس کے پنجے سے چھڑاؤں گا - اُس نے کہا وہ بڑا قوی اور زبردست دیوزاد ھے، بني آدم کی کیا مجال کہ اس کا مقابلہ کرے - اتنے میں دیو کي آمد کا غلغلہ ھوا - اُس نازنین نے کہا کہ چھپ جا ورنہ ھلاک کر ڈالے گا اور میں بھي مصیبت میں مبتلا ھو جاؤں گی - وہ نہ مانا اور لڑنے پر مستعد ھو گیا - اور دیو کو ھلاک کرکے چنپاوتی کو ساتھ لے روانہ ھوا - چلتے چلتے وہ کنچن نگر میں پہنچے اور ایک باغ میں جاکر ٹھیر گئے - مگر دیکھا کہ سارے شہر پر اُداسي چھائی

ھوئي ھے، ھر شخص اُداس ھے اور ھر طرف ویرانی ھي ویرانی نظر آتي ھے - کنور نے یہ حال دیکھہ کر پوچھا تو معلوم ھوا کہ یہاں کے راجا کي ایک لڑکي تھی وہ یکایک غائب ھوگئي، اُس وقت سے راجا پرجا سب مغموم اور پریشان ھیں - آخر جب کنور نے چنپاوتی کو ماں باپ سے ملایا تو ان کي جان میں جان آئي اور سارے شہر میں خوشیاں منائي گئیں - راجا اور راني نے کنور کی بڑی خاطر و مدارات کي اور حال معلوم ھونے پر اُسے بہت تسلي دی اور کہا کہ غم نہ کر، تو جس لیے پریشان ھے وہ تجھے بہت جلد مل جاے گی -

چنپاوتي کی ماں نے مدمالتي کو بلا بھیجا - وہ اپني سہیلی سے مل کر بہت خوش ھوئی - چنپاوتی کي ماں نے ترکیب سے مدمالتي کا حال پوچھا اور ایسي ھمدردی سے باتیں کیں کہ اُس نے اپني ساری حقیقت کہہ سنا ی - تب اس نے چپکے سے مدمالتي اور منوھر کو ملا دیا - یہ دونوں بچھڑے ھوے آپس میں ملے تو دنیا و مافیہا کو بھول گئے - جب مدمالتی کو بہت دن ھوگئے تو اس کی ماں نے مدمالتي کو بلانے کے لیے اُس کی ایک سہیلي کو بھیجا - چنپاوتي کی ماں نے اُسے کسي کام پر لگادیا - پھر دوسری آئي پھر تیسری - مگر وہ ٹالتی رھی - یہ حال دیکھہ کر مدمالتي کی ماں کو طرح طرح کے وسواس آنے لگے - آخر اُس سے صبر نہ ھوسکا اور خود پہنچی - آتے ھی کہنے لگی بہن! مالتي کہاں ھے، مجھے اس کی صورت دیکھے بغیر چین نہیں - اس نے کہا چترسال میں ھے - میں ابھی بلاے لاتی ھوں - ماں سے صبر نہ ھوسکا خود بھی اس کے پیچھے پیچھے ھولی - جب چنپاوتی کی ماں نے چترسال کے دروازے پر مڑ کر دیکھا تو کیا دیکھتی ھے کہ سریکا

(مدمالتي کي ماں) بھي آ پہنچي ھے۔ اس نے کہا بہن تمہیں تکلیف کرنے کي ضرورت نہیں میں بلا لاتي ھوں۔ سریکا کو شبہ ھوا کہ دال میں کچھہ کالا کالا ھے، وہ بھي اندر گیسي چلي آئي۔ دیکھا کہ مدمالتی اور منوھر گلے میں بانہیں ڈالے بیٹھے ھیں۔ دیکھتے ھی تن بدن میں آگ لگ گئي۔ گلاب کا شیشہ قریب ھي رکھا تھا، اس میں سے کچھہ گلاب نکال ایک ایسا منتر پڑھ کر مدمالتي پر چھینٹا مارا کہ وہ طوطي بن کر اُڑ گئي۔ اب جو دیکھا کہ چڑیا اُڑ گئی تو رونے پیٹنے لگی۔ مگر اب کیا ھوتا ھے —

یہ طوطی فراق کی ماری جنگلوں میں پھرتی اور چھپ چھپ کر رھنے لگی۔ اتفاق سے جس روز یہ ایک باغ میں جاکر اُتری وھاں ایک راجا کا بیٹا جس کا نام چندر سین تھا شکار کھیلتا ھوا پہنچا۔ اس کی نظر جو طوطی پر پڑی تو وہ اسے بہت بھائی اور اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ جیتی پکڑ لو، خبردار جو اسے کچھہ بھی ایذا پہنچی۔ ان لوگوں نے بہتیری کوشش کی، کسی طرح دام میں نہ پھنسی۔ آخر خود کنور نے ایک خوبصورت جال لگایا۔ طوطی کو اس کی محبت پر رحم آیا اور خود جال میں آگئی۔ اب چندر سین کو طوطي سے اس قدر الفت ھوگئی کہ کسي وقت اپنے سے جدا نہ کرتا تھا۔ مگر اسے مغموم دیکھہ کر خود بھي مغموم رھتاتھا۔ ھر چند وہ اسے کھلانا پلانا چاھتا تھا مگر وہ کچھہ کھاتی پیتي نہ تھی۔ آخر کنور نے بھي کھانا پینا چھوڑ دیا۔ جب طوطی نے یہ دیکھا تو ناچار اس نے زبان کھولی اور سمجھانا شروع کیا۔ وہ کسي طرح نہ مانا اور کہا کہ تو سچ سچ اپنا حال بتا ورنہ میں اپنی جان دیدوں گا۔ تب طوطي نے اپنا سارا حال جو گزرا تھا بیان کردیا۔ اس سے وہ اس قدر متاثر ھوا کہ

اس نے کہا کہ میں تیرے کنور کو جہاں کہیں بھی ہوگا ڈھونڈھ کر لاؤں گا اور تجھ سے ملاؤں گا - دوسرے ہی دن اس نے باپ سے پردیس میں شکار کھیلنے کی اجازت لی اور فوج اور ساز و سامان لے کر نکلا - طوطی کا پنجرہ ساتھ تھا - چلتے چلتے مہارس نگر پہنچے - دیکھا کہ اس دیس کی حالت بہت خراب اور ویران ہے - شہر سنسان اور لوگ پریشان حال ہیں - ایک باغ میں پہنچ کر جو جنگل سے بدتر تھا ایک بوڑھی مالن سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ راجا کی کنیا غائب ہوگئی ہے راجا رانی اور سارے لوگ غم و الم میں مبتلا ہیں - یہ کہہ کر وہ ضعیفہ رونے لگی - چندرسین نے بہت کچھ تسلی دی اور پنجرہ کھول کر اس کا نام و نشان بتایا - وہ خوشی سے باغ باغ ہوگئی اور خبر لے کر راجا کے پاس پہنچی - دونوں دوڑے آئے اور چندرسین سے ملے اور بڑی خاطر تواضع کے ساتھ گھر لے گئے - اور طوطی کا جادو اتارا اور وہ پھر انسان ہوگئی - بچھڑے ہوے ملے اور اس کے ماں باپ چندرسین کے بہت ہی ممنون ہوے - لیکن مدمالتی پر عشق کا جنون سوار تھا اور وہ منوہر کے فراق میں سخت بے تاب اور بے قرار تھی اور روز بروز اس کی حالت خراب ہوتی جاتی تھی - چندرسین نے جب یہ دیکھا تو اس کے ماں باپ سے کہا کہ اگر تم کہو تو میں منوہر کو ڈھونڈھ لاؤں ورنہ مدمالتی کا جینا دشوار ہے - وہ اس بات سے بہت خوش ہوے اور اقرار کیا کہ ہم اس معاملے میں ہرگز خلاف نہ کریں گے —

مدمالتی کے گم ہوجانے کے بعد سے دھرم راج اور سورمل کے دلوں میں نفاق پیدا ہوگیا تھا اب جو مدمالتی آگئی تو دل سے کینہ جاتا

رہا اور ایک خط لکھہ کر چندرسین کے ہاتھہ بھیجا - چندرسین جب خط لے کر سورمل کے پاس پہنچا تو وہ خوشی کے مارے پھولا نہ سمایا اور چندرسین کو راجا اور رانی نے اپنی آنکھوں پر بٹھایا - وہاں جاکر معلوم ہوا کہ مدمالتی کے جاتے ہي منوہر کی حالت ابتر ہوگئی اور جنون کی حالت میں کہیں نکل گیا بہتیرا ڈھونڈا کہیں پتا نہ لگا - یہ لوگ افسوس کے ساتھہ یہ ذکر کر ہي رہے تھے کہ ایک ملازم دوڑتا ہوا آیا اور کہنے لگا کہ منوہر بازار میں دیوانہ وار پھرتا ہوا نظر آیا ہے - لڑکے اس کے پیچھے تالیاں بجاتے ہیں اور لوگوں کا آس پاس ہجوم ہے - یہ سنتے ہی سورمل اور چندرسین دوڑتے ہوے گئے اور اسے لے کر آے - جب اسے مدمالتی کی واپسي کی خبر سنائی تو وہ ان کے پانووں پر گر پڑا - تب اسے نہلا دھلا کر کپڑے پہنائے اور سورمل اور چندرسین منوہر کو لے کر مہارس نگر چلے - اُن کے آنے کي خبر ہوئي تو دھرم راج پیشوائی کے لیے گیا اور بڑی تعظیم و تکریم سے لے کر آیا - سارے شہر میں خوشی کي لہر دوڑ گئی - شادی کي تو تھیر ہي چکي تھي ' خوب خوب جلسے ہوے - شادی کے بعد منوہر اپني دلہن کو لے کر کنچن نگر کي طرف روانہ ہوگیا - وہاں یہ عیش وعشرت سے رہنے لگے - مدمالتي چندرسین سے بے حجابانہ ملتي تھي لیکن چنپاوتي چہرے پر نقاب ڈالے رہتي تھي - اتفاق سے ایک روز اس نے چنپاوتي کو دیکھہ لیا - دل و جان سے عاشق ہوگیا - اور حالت کچھہ سے کچھہ ہوگئي - جب یہ کیفیت مدمالتي اور منوہر پر ظاہر ہوئي تو انھوں نے چنپاوتي کے والدین سے گفتگو کر کے ان دونوں کي شادی کر دی —

اب منوہر اور چندرسین کو اپنے اپنے وطن کی یاد آئي اور اجازت

لے کر روانہ ہوے۔ منوہر اور مدمالتی بہت سے شہر اور ملک طے کرکے کنک گیر کے قریب پہنچے۔ بکرم کو جو معلوم ہوا کہ کوئی راجا لاؤ لشکر لیے چلا آرہا ہے تو اس نے جنگ کی تیاری کی۔ جب اس کا قاصد غنیم کے کیمپ میں خبر لینے کو پہنچا تو معلوم ہوا کہ یہ تو کنور ہیں۔ پھر کیا تھا جنگ کا سامان سامان عیش و عشرت ہوگیا اور بچھڑے باپ بیٹے ملے، ماں کے پاس آئے اور وہ دونوں کو دیکھ کر باغ باغ ہوگئی اور سارے ملک میں خوشی و خرمی کا سماں نظر آنے لگا —

اس مثنوی میں بھی اردو فارسی کی اکثر مثنویوں کی طرح دیووں اور پریوں اور سحر و طلسمات وغیرہ کا ذکر پایا جاتا ہے۔ قطع نظر اس کے یہ مثنوی دکنی اردو میں خاص امتیاز رکھتی ہے —

علاوہ حسن شاعری اور زور کلام کے جس کا ذکر آگے آئے گا اس میں بعض ایسی خصوصیتیں ہیں جو اس سے قبل کی مثنویوں میں کم پائی جاتی ہیں۔ مثلاً وہ ہر عنوان کے شروع میں ایک شعر لکھتا ہے جس میں اس باب کے مطالب کا خلاصہ آجاتا ہے۔ تمام عنوانات کے اشعار ایک ہی بحر اور قافیے میں ہیں۔ اگر ان تمام اشعار کو ایک جاکر لیا جاے تو ایک قصیدہ ہوجاتا ہے جس میں سارے قصے کا خلاصہ آجاتا ہے۔ سومن اور وجدی وغیرہ نے بھی اپنی مثنویوں میں اس طرز کی پیروی کی ہے۔ مثال کے طور پر ابتدا کے دو شعر یہاں لکھے جاتے ہیں:

ثنا صانع کی ہے جن اس کتاب عشق کا بانی
دیا ہے حسن کوں خلعت کے ہر یک جز پہ عنوانی
رکھیا ہوں گلشن عشق اسم اس رنگیں قصے کا میں
کرے جس چھب کے پھولاں پر فلک شوقوں سے گلدانی

اکثر باب کے شروع میں مختلف قدرتی مناظر کا جلوہ دکھاتا ہے اور قصے کے ضمن میں جو بعض حالات اور واقعات پیش آتے ہیں ان کی تصویر خوب کھینچتا ہے - مثلاً جہاز کے سفر میں کشتی کا حال ' باغ اور پرندوں کی کیفیت ' شادی بیاہ کا حال ' برف باری کی کیفیت' کہانوں کی تفصیل وغیرہ - اسی طرح طلوع و غروب آفتاب ' چاندنی کا سماں موقع موقع سے خوب بیان کیا ہے —

انسانی جذبات کی کیفیت بھی ہر موقع پر بڑی خوبی سے دکھائی ہے —

اکثر ابواب کے خاتمے پر نصیحت آمیز اشعار لکھے جاتا ہے —

کلام میں طول ضرور ہے - وہ ایک ابلتا ہوا چشمہ ہے جس کا روکنا مشکل ہے —

یہاں اس مثنوی کے بعض مقامات کا انتخاب دیا جاتا ہے - اس مثنوی نیز اس کے بعد علی نامے اور تاریخ اسکندری کے انتخابات میں نے کسی قدر ضرورت سے زیادہ دے دئے ہیں - اس سے مضمون طویل ہوگیا ہے لیکن اس سے میرا مقصد یہ ہے کہ چونکہ یہ کتابیں عام طور پر دستیاب نہیں ہوتیں خاص کر آخری دو کتابیں ' جن میں سے علی نامہ کا ایک آدھ نسخہ تو خیر یورپ میں کہیں مل بھی جاتا ہے لیکن تاریخ اسکندری کا نسخہ سوائے میرے کتب خانے کے کہیں نہیں ہے - اس لیے ان انتخابات سے نصرتی کے کلام اور زور بیان کے صحیح اندازہ کرنے میں بہت مدد ملے گی —

نصرتی کا قاعدہ ہے کہ وہ اپنی مثنویوں میں حمد بھی اسی ڈھنگ کی لکھتا ہے جس رنگ کی مثنوی ہوتی ہے - چونکہ گلشن عشق ایک

عشقیه مثنوی هے اس لیے حمد کے اشعار بهی اُسی رنگ میں رنگے هوئے هیں —

صفت اس کی قدرت کی اول سراؤں   دهریا جس نے یو گلشن عشق ناؤں
کیا کر گرم عشق کا تس ابیال *   یو باغ آفرینش کا پکڑیا جمال
عجب کوئی توں اے باغبان جہاں   که صنعت میں تجهه چل سکے نا زباں
رنگا رنگ جے گل یو بن باس هے   او هر گل میں تجهه عشق کی باس هے
اپس حسن دیکهلا هر یک تیار هور   هریک دل میں پاڑیا هے کئی بهانت شور
کدهیں نور یوسف کوں دے شب چراغ   دیا عشق کا تس زلیخا په داغ
کدهیں پاڑ شیریں سوں خسرو کو کام   کیا کوه کن کوں وفا میں تمام
کدهیں نیه لیلیٰ کے امی: دل میں بیس §   پهریا هو کے مجنوں گنوا بد کو قیس
کهتے پهول ایسے کهلایا هے هور   اجهوں § بن میں تس بلبلاں کا هے شور
دیا عشق کوں تونچه عزت کمال   تهیں هے جمیلٌ و؟ یحب الجمال
نظارے میں عارت نظر باز کوں   دسے هر طرت تیری قدرت کا سوں
زمیں توں قداعهٔ مصور کیا   فلک کا توں انور مرقع کیا
فلک کے زنکاری یو صفحے کو توں   دیوے زیب نت سرخ سر لوح سوں
کدهیں تس میں بوٹا سونہری ° دهرے   کدهیں تس میں لیا گل روپیری ** بهرے
نه کس سار ++ توں کوی نه تجهه سار هے   صفت بهی تری مثل تجه ‡‡ بهار §§ هے
توں باقي فنا جگ یو لاریب هے   توانا تهیں عالم الغیب هے
اتها تونچ $$ اول هور آخر تهینچ   سمجتا سو مخفي و ظاهر تهینچ

---

* ابر - † ڈالا هے - ‡ بهت - § کهسا - $ ابهي - ° سلهری - ** روپهلي -
†† مانند - ‡‡ سے - §§ باهر - $$ توهی —

ترے نور کا شعلہ ھر آ گہت ا چھے — گپت تونچ ؛ ھور تو نچ پر گت § ا چھے
ھمیں کیا جو ھمنا تہی کچھہ ھوے بات — کہ جو اصل جیو ھے سو و تیرے ھات
تہیں دل کے عالم کو کیتا وسیع — فلک عقل کا تونچ کیتا وسیع
دیا عقل سا جیو کوں یار شفیق — اُسے تیں دیا پانچ حس کر رفیق
جہاں پر وری میں کرے اوپر — دھرے دوست دشمن پہ توں یک نظر
سیویں ؟ مسجد ی ھور دیری تجھے — منگیں دل سوں سب میت ° وبیری تجھے
توں جگ میت** ھے ھور ناتے سوں پاک — توں مطلوب طالب ترے لاک لاک

منا جات کے چند شعر ملاحظہ کیجیے

الٰہی تہیں جگ کوں داتار ھے — کرم محض تجھہ پر سزاوار ھے
غریباں پہ بخشش میں نیارا سو تونچ — منگے تے †† بہی آئی ‡‡ دینہارا سو تونچ
الٰہی میں اس جگ میں گم نام تہا — ادک §§ پختہ کاراں میں ات ¶¶ خام تہا
عنایت کیا آسمانی °° مجھے — بچن کی دیا در فشانی مجھے
ھر یک در بہی شاھاں کے لائق دیا — بہا نور تن تھے بہی فائق دیا
رتن دیکھتے لوگ لیا تا سو میں — سمجتے ھیں کوی کان تھے پایا سو میں
میرا سینہ خالیچ یک کہن * ھے پن — بھرے فیض تجھ پل میں کئی لک رتن
میرے من کا طوطی تو بے کام ھے — کرانا تو بات اِس کو الہام ھے
سخن دل میں اُپجا نہارا ††† تہیں — زبان پر اُسے لیا نہارا تہیں
میرا من تو تہا خارزار یک جنگل — کیا باغ تیرے عطا کا چ جل
رنگا رنگ پھلبن جو ھیں بے قیاس — وو ھر گل کوں دے معرفت کی ‡‡‡ بباس

---

† وجود - ‡ پوشیدہ - $ ظاھر - § پوجیں - ° دوست - ** عالم دوست - †† سے - ‡‡ بہت - $$ ' §§ نہایت - °° بلندی - * کان - ††† پیدا کرنے والا - ‡‡‡ خوشبو -

نہالاں خیالاں کے بن کے تمام
دو لنہار رکہ تجہ ہوا میں مدام

رنگیلا یو ہر یک نزاکت کا پات
پسارِیا جو ہے تیری رحمت کوں ہات

او ہر ہات رحمت سوں کر پور توں
عطا کر سو نور و ہ علی نور توں

دے ایسا سخن کے جہاں میں قلم
جو الہام کی فوج کا ہوے علم

دیکھاؤں جو تجہ تھے جے خیال
کہ اُس شعر کو عین سحر حلال

ہر یک حرف تیں کر دیکھا جام جم
معانی میں تس بہور مسیحا کا دم

نعت

زہے نا سور سید المرسلیں
کہ آخر ہے وے شافع المذنبیں

عجب آفرینش کے دریا کا در
کہ جس نور تھے بحر ہستی ہے پر

ذول * رکھیہ + یہ خلقت کے ایدل تورییج ‡
وہی پہول ہے آخر جو اول ہے بیج

تہیں حق سے نت ہمزباں ہمکلام
تجے قاب قوسین ادنیٰ مقام

تہیں لامکاں کے دھنی کا انیس
توں بے مثل بے شبہ کا ہم جلیس

زباں سوں اسو لک گہر سنج تونچ
دھرے سینہ حق راز کا گنج تونچ

جتے مرسلاں میں تو اپروپ ہے
او طالب ہے تو حق کا مطلوب ہے

منقبت کے بعد حضرت بندہ نواز کی تعریف بھی بڑی عقیدت سے کی ہے - چند اشعار یہاں لکھے جاتے ہیں —

زباں دھو کے پہول نیر * سوں مکھہ میں لاؤں
یو سید محمد حسینی کا ناؤں

---

* نہا ' جدید - + درخت - ‡ فریفتہ ہو - * عرق گلاب —

جتے عاشقاں میں اچھے سر فراز
جتے جگ کا مخدوم بندہ نواز

نصرت تجھے مخزن عین کا
پروتا ہے توں آس دارین کا

کیا پل میں فیروز شاہ کو تباہ
گھڑی مینچہ سلطان احمد کوں شاہ

جو کوئی تجھہ محبت کے ماتے اھیں
وہ دنیا میں رہ دین پاتے اھیں

دکن کي عجب بہتور حال ہے
کہ جس بیچ تجھہ خوابگہ پاک ہے

اس کے بعد علی عادل شاہ کي مدح ہے ' پہلے ھي شعر میں اُسے اپنا اُستاد کہتا ہے " پیچھے پیر کے وصف اُستاد ہے " - اسي میں بادشاہ کي سخن سنجي اور سخن گوئی کي بھي تعریف ہے - وہ اشعار اس سے پہلے نقل ھو چکے ھیں —

رکھنہار ناموس عزت کوں تونچ   بڑا سب تے اب عقل و ھمت کوں تونچ
زھے نوجوان عقل میں پیرتوں   بڑا دوربیں نیک تدبیر توں
زمانے کا سررشتہ سانديا + تہیں   توتا چرخ کا تہات باندیا تہیں
اتہا عشق ذرہ ھوا تجہ تھے سور   ھر یک شے میں اپنا دیکھا یا ظہور
دیا عشق کي بات کوں توں سواد   کیا کہنہ قصہ زمانے نے یاد
زمانے کی میں یاد گاري بدل   لکھیا قصہ تجہ ناؤں سوں میں نول

+ پورا کرتا ہے - ‡ جوڑا —

حسب حال میں لکہتے ہیں —

سخن کا محل ہے زہے پائدار رہنہار ہے جگ میں جم برقرار
بندیا جن عمارت یو بنیاد سوں قیامت تلک نہ دھلے باد سوں

اس کے بعد اپنے والد اور اپنی تربیت اور بادشاہ کی قدر دانی وغیرہ کا ذکر ہے جس کا بیان اس سے قبل آچکا ہے —

حسب حال کے بعد عقل کی تعریف میں کچھہ اشعار لکھے ہیں

بزرگاں کا یو نقل حجت اہے کہ العقل نصف الکرامت اہے
کنا بلکہ فوق الکرامت سدا کہ اس عقل سوں ہم پچہانے خدا
اچھے عقل یک دولت ناپدید اچھے عقل مشکل کی حل کی کلید
چلے عقل تے دین دنیا کے کام دونو جگ میں عاقل دسے نیک نام

آگے چل کر کہتا ہے کہ شعر وسخن کی روشنی عقل ہی کے طفیل میں ہے۔ یہ سب تعریفیں کرتے کرتے آخر میں کہتا ہے:

اتّل عقل کا گرچہ کچ مست ہے ولے عشق شرزہ زبردست ہے
کہ جس ٹہار پر ہوے شرزے کی چال تو اس ٹہار کچ کا چلے کیا مجال

یہیں سے دوسرا باب عشق کی مدح میں شروع ہوجاتا ہے اور اس کے اوصاف اور کارستانیوں کے بیان میں خوب خوب شعر کہے ہیں —

کر نہار امرت کو شرمندہ عشق
دھرے نانوں سو جگ میں نت زندہ عشق

بقا کی جسے جگ میں شاہی اچھے
اجل جس کے گھر کا سپاہی اچھے

اتھے داغ میں جس کے مرھم سوں درد
اگن جوش انگے * جس کے لگتی ھے سرد
سدا فکر نوسکیہ † ھو جس پاس اچھ
رگت ‡ نیر، ھوران جسے ماس اچھ

دلاں کا ھے اے عشق توں بادشاہ
جہاں تر ھے سو وانچہ تجیہ تخت گاہ
دوا راہ کا تجہہ سو کالا دسے
اندھا راج ° تیرا اوجالا دسے

کیا سر خوشی جگ میں مشہور تونچہ
خرابات عالم کیا پور ¶ تونچہ
تیرا خار بہتر ھے گلذار تھے
تیرا ور ـ ھے دیوانہ ھشیار تھے

دلاں کوں اگن کوئیل تجہہ تے ھوا
انجو ‡‡ تس اپر تیل تجہہ تے ھوا
چڑاوے ستی کوں ترا سے مدن
دیکھاوے تسے آگ کر پھولبن

جلا فا ھوس سوں مرا دھیان ھے
سورج تجہہ ھوا کا سوریا §§ پان ھے
نصیحت کو تجہہ شہر میں غدر ھے
ترے ملک میں صبر بے قدر ھے

---

* آگے - † نو آموز - ‡ خون - § پانی - ° اندھیرا ¶ معمور - ‖ غالب -
‡‡ آنسو - §§ آفتابی —

اب میں نصرتی کے کلام سے ایسے نمونے دیتا ہوں جن سے اس کی واقعہ نگاری یا جذبات و کیفیات کی قدرت معلوم ہو۔ قصے کی روداد تو آپ پڑھ چکے ہیں، اس مقام کا خیال کیجئے جب درویش راجا کی بھیک لینے سے انکار کرتا ہے اور خالی چلا جاتا ہے اور راجا فقیرانہ لباس پہن کر اس کی تلاش میں نکلتا ہے —

پھرا کر* سو شاہی کرے+ بھیس کوں
چلیا یوں سنیاسی ہو پردیس کوں

اب فقیری کے اوازمات اُس نے اسی نوعیت کے بیان کیے ہیں جو دیا شنکر نسیم کا رنگ ہے۔اگر وہ اس بیان کو لکھتے تو یقیناً اسی طرح لکھتے۔ یعنے محنت کی گدڑی زیب بدن کی، توکل کی کچکول ہاتھہ میں لی، قناعت کی راکھہ بدن پر ملی اور آہ کا سنکھہ ساتھہ لیا وغیرہ وغیرہ —

کلنتھا‡ سخت محنت اب گل§ کیا	سو کچکول ثابت توکل کیا
چڑایا سو تن پر قناعت کی راک$	سنکے¶ کر لیا آہ کے دم کی ہاک**
صبوری کے مدرے دیا گوش کوں	کیا حلم زنبیل ادک†† ہوش سوں
یو راحت کوں دنیا کی مرکان‡‡ کر	لیا راکھنے پگ تلیں آن کر
لیا حرص کے پھاوڑے کوں بغل	جلانے ہوس کی دھونی نت سگل
کمر بستہ ہمت کا بھاری کیا	اتل قصد کے ہت$$ سو تاری¶¶ لیا
دھرن جلد ہر کام میں تیز ہات	لیا خوش خیالاں کے چیلے سنگات

* بدل کر - + کے - ‡ گدڑی - § گلے - $ راکھہ - ¶ سنکھہ - ** آواز، شور-
†† بہت ‡‡ مرگ چھالا - $$ ہاتھہ - ¶¶ ڈنڈا —

راجا ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے جب درویش تک پہنچتا ہے تو اُس پر فضا مقام کا سماں کھینچتا ہے۔ کہ اس سبز زمین میں حوض بھرے بھرے ایسے پیارے معلوم ہوتے تھے جیسے ہرے طبق میں شراب بھرے پیالے۔ چمنوں میں چھوٹ پانی نہیں بہہ رہا تھا بلکہ جام سے شراب سے لبریز ہو رہا تھا اور وہ شراب بہہ بہہ کر درختوں کے رگ و پے میں پہنچ رہی تھی جس کی مستی سے درخت مدھوشی کے عالم میں جھوم رہے تھے۔ کنول کی خوبصورت کلیاں ایسی بھلی معلوم ہوتی تھیں جیسے چینی شیشوں میں رنگ برنگ شراب۔ زمین جا بجا خوبصورت پیالوں سے بھری ہوئی تھی گویا صبا کے ساقی نے ان سے بزم کو آراستہ کر رکھا تھا۔ سنبل نے اپنی زلفیں چھوڑ رکھی تھیں اور پھولوں کی ڈالیاں معشوقوں کی طرح مست جھوم رہی تھیں۔ جب سارا بن (باغ) مستی سے بے حس ہوگیا تو باد صبا نے از راہ تفنن خاص ادا سے کلیوں پر ٹھنڈا پانی چھڑکا اور وہ مخمور (چمن) کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ پھر بزم از سر نو تازہ ہوگئی اور راگ رنگ کا دور شروع ہوا۔ ہوا نے مطرب بن کر پتوں کا دت بجانا شروع کیا اور کوئلیں اور پپیہے تانیں اڑانے لگے۔ مور ناچنے لگے کبوتروں نے قلا بازیاں کھائیں، فاختہ کو کو کرنے لگی وغیرہ وغیرہ۔ اب نصرتی کے اصل اشعار سنیے —

شہیں حوض پر ہر چمن میں ہرے طبق سبز میں جام جوں مے بھرے
بہتا تھا نہ چھنا ں میں چو گرد آب او لبریز تھا جام تے تس شراب
وہی ہو ہر یک رکھ کے تن میں اثر متے* ہو کے جھولتے تھے ات بے خبر

---

* مست

سہاوریں کلیاں یوں کنول کیاں سرنگ ۔ کوپلیاں چمن کیاں ہے بھریاں رنگ رنگ
پیالیاں سے خوش بوئیں چھاپی جا بجا ۔ رکھی بزم سب بھر او ساقی صبا
لتاں چھوڑ سنبل کی خوش بال کیاں ۔ نگاراں تو لیں مست پھول تال کیاں
رہی ٹک ہو جب بن خماری کے سات ۔ صبا باؤ کے ہت سوں ہنسنے کے دہات
ڈالیاں پر تھیتا ابرست جذب سوں واں ۔ ہنسا تس سکر اُنیندیاں کی نمیں
کریں بزم کو تازہ* پھر بید رنگ ۔ دھرے جشن میں سر تے*خوش راگ رنگ
ہو مطرب پون برگ کا دت بجائی ۔ پپیا و کوئل نوی تان اُچائی
سو سرحاں دیوں کھینچ سر خوش گلا ۔ کریں کوک کوکے دلاں مبتلا
لگے ناچنے مور ۱ ہو بے خبر ۔ کریں حال او تن نکل رقص پر
ہوا دھر کبوتر - ملا تان میں آے ۔ پراں جوڑ تالیاں سوں دستک بجاے

دیکھیئے طلوع آفتاب اور دن کے نکلنے کو کس طرح بیان کرتا ہے - صبح نے جب شرق کے پل کے بند کا (جو دریاے ظلام پر بندھا ہوا تھا) توڑ ڈالا تو نور کا سیلاب اُبلتا ہوا نکلا اور دنیا میں چاروں طرف پھیل گیا - اس عالم کا حوض غدیر جو خالی پڑا تھا اس میں ہر طرف سے سونے کا پانی بھر دیا - فلک نے اپنے چھاتی سے سیاہی کو دھویا اور زرین لباس سے جگمگانے لگا - خلقت کی آنکھوں کے کواڑ کھلے اور رات بھر کے جو مخمور تھے انہوں نے اپنے ہوش حواس درست کیے —

صبح شرق کے پال کے پل تے تیوک ۔ نکالیا جو کنچن کے جب تم تے کوک
اُبلتا نکل نور کا نیر تب ۔ ہو آمیز عالم میں چوندھیر سب
تھی تھا سو یو جگ کا حوض غدیر ۔ بھریا شش جہت بیچ کنچن کا نیر
سیاہی کوں چھاتی تے دھویا فلک ۔ زر افشاں کسوت سوں پکڑیا جھلک

* از سر نو - ۱ مور - ۲ تالا بازیاں -

کواڑاں کھولے خلق کی نین کے دھری سدہ جو سدھور تھے رین کے
سورج کا طلوع تو آپ نے دیکھہ لیا اب چاند کی جلوہ فرمائی
ملاحظہ کیجئے - اس میں نصرتی نے اپنی شاعری کا زور دکھایا ہے —

توبن تی او نیلاب مغرب میں رخش
نکل آئی نس * ہو ہتو† فیض بخش
چندر پاک چپاتی تے دھوئے غبار
سورج کا ہوا آئینہ تابدار
دیے جلوہ خوش نسپتی ‡ کے حضور
کیا پردہ پردہ نشیناں تھے دور
دینے جوش پر نور سیلاب کا
ہوا تھا کوا چاند سیماب کا
گگن پر نہ ہر تیار تارا دسے
کٹورے بھریا سب او پارا دسے
صفائی سوں چندنے کے چارو رخن
جھلکتی تھی بھوئیں صاف ابرک ذمن
فلک اور زمین پر اتبی نور میں
چھپیا تھا جتا مشک کافور میں
مگر کھم پہ چادر مرصع کی ست
زمین پر بچھاے تھے اجلا تکت
پوں اپ وطن میں دھریا تھا قرار
نہ کوئی پات ہلتا اتھا اس منجھار

راتنے اپنا مشکی گھوڑا مغرب کے دریامیں ڈالا
اور فیض بخش دوست بن کر نکلی
پاک چاند نے اپنی چھاتی سے غبار دھویا
اور سورج کا آئینہ (بدر) روشن ہوا
تاجدار سب کے حضور میں جلوہ دکھانے کے لئے
سب پردہ نشینوں نے پردے اٹھا دیے
پرنور سیلاب کے جوش دینے کے لیے
چاند سیماب کا کنواں بن گیا تھا
آسماں پر کہیں کوئی تارا نظر نہ آتا
وہ بالکل ایک پارا بھرا کٹورا معلوم ہوتا تھا
چاندنی کی براقی سے چاروں طرف
زمین ابرک کی طرح چمک رہی تھی
زمین اور آسماں نور سے بھر پور تھے
جس قدر بھی سیاہی تھی وہ سب کافور میں چھپ گئی تھی
ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا آسمان پر مرصع چادر
تان دی ہے اور زمین پر صاف شفاف چادر بچھی ہوئی تھی
اُس وقت کوئی پتا تک نہیں ہلتا تھا
شاید ہوا وہاں سے رخصت ہوگئی تھی

* رات - † دوست - ‡ سردار شب -

سہاتے تھے یوں پہول پہل ڈال پر | ڈالیوں پر پہول پہل ایسے بھلے معلوم
پیالے ہیں چینی کے جوں دود بہر | ہوتے تھے جیسے دود بھرے چینی کے پیالے
کہڑا تہا سب اس دھات حوضاں میں نیر | حوضوں میں پانی اس طرح ساکت کھڑا تہا
سگر دود کا کر رکہے تہے پنیر | گویا دودھ کا پنیر بنا کر رکھ چھوڑا ھے

کنور کے ھجر کی حالت بہت تفصیل سے بیان کی ھے ' بعض وقت طول عیب کی حد تک پہنچ جاتا ھے - چند شعر اس مقام کے لکھے جاتے ھیں —

نہ سن سات کہنا مجھے بات بہاے | نہ کسی سے بات کرنے کو جی چاھتا ھے
نہ کوئی بات بولے تو سن خوش لگاے | نہ کسی کی بات سن کر جی خوش ہوتا ھے
دسے دیس تو نس اندھاری مجھے | دن رات سے بھی زیادہ کالا معلوم ہوتا ھے
رین کالے دوزخ تھے کاری مجھے | اور رات دوزخ سے بھی زیادہ تاریک
انکھیاں کہولتا ہوں تو یک تل نہ بہاے | آنکھیں کھولنا ایک لحظے کے لیے بھی نہیں
وگر مونچتا ہوں تو یوں خوت آئے | بھاتا اور اگر بند کرتا ہوں تو ڈر ھے کہ
کہ مت پہر پڑے خواب دندی سوں سنگ | پھر وھی دشمن جان خواب میں نہ آجاے
ستے پہر کے خرمن میں من کے اوزنگ | اور میرے دل کے خرمن میں آگ نہ لگا دے
پڑیا آہ ماھی نمن مجھ رھنا | مجھے مچھلی کی طرح پڑا رھنا پڑتا ھے
گنواتا زباں ہور نہ چک مونچنا | زبان بند آنکھیں کھلی ہوئی

جب کنور اپنے ساتھیوں کو لے کر کشتی میں سوار ہوتا ھے تو دریا پر کشتی کی روانی کی کیفیت کسی قدر تفصیل سے بیان کرتا ھے - چند شعر نقل کیے جاتے ھیں —

چلیاں جل پہ کشتیاں ڈھل اس حال میں | کشتیاں پانی پہ اس طرح جا رھی تہیں
ڈھلاتے دیں پارے کو جوں تہال میں | جیسے کوئی پارے کو تھال میں رکھہ ڈھلکاتا

کہیں بحر کو خلق کالا بدل
ہور اس تیز کشتیاں کو بجلیاں چپل
سبک مہ کی کشتی فلک بحر پر
چلے کیا کہ اس تے بھی یو جلد تر
اُٹھے موج گر نیا سنے کف بکف
کنارے پڑے لیا اپس مکہ میں کف
بندے باؤ جب یک یکس سوں پیریاں
بلند موج سوں چڑ ابر کیاں سیڑیاں
چڑنت میں نو حرتی جلیں ماہ لگ
اترنے میں اترن سو ماہی تلگ
جتیا کچھہ جو کشتی کو جھولا لگے
وہ جھولا دریا کوں ہنڈولا لگے
دس آوے سو دیکھیں تو جو پھیر جب
اُپر آسماں ہور تلیں نیر سب

ہے گویا یہ بحر کالا بادل ہے اور کشتیاں تیز بجلیاں۔ جس طرح بحر فلک پر چاند کی ہلکی پھلکی کشتی چلتی ہے یہ اس سے بھی تیز تھی۔ اگر موج اس سے دور کی - رط دندہ کر دوڑے تو تک کر کنارے پر جا پڑے گی اور منہ میں کف آ جائیں گے۔ ہوا جب زور سے چلتی ہے تو اونچی موجیں جو ... ان کے لیے سیڑھیاں بن جاتی ہیں۔ چڑھتے وقت وہ (کشتی) آسمان تک پہنچ جاتی ہے اور اترتے وقت ماہی تک ... جب دیکھتے ہیں تو چاروں طرف کیا نظر آتا ہے۔ اوپر آسمان اور نیچے پانی

اس کے بعد شاعر نے سمندر کی مخلوق کا حال بیان کیا ہے اور طرح طرح کے جاندار جو اس میں آباد ہیں ان کا ذکر نام لے لے کر کیا ہے —

اسی مسافرت میں ایک مقام ایسا آتا ہے جہاں انتہا درجے کی سردی تھی اور برف باری اور غضب تھی - اس سمے کا بیان طول طویل ہے صرف چند شعر لکھے جاتے ہیں :

اتھا نزع میں جیو ہر بات کا
کلیاں میں نہ تھا خندہ خوش دھات کا

ہر پتے کی جان نزع کی حالت میں تھی
کلیوں میں بھی اب ہنسی کا کوئی نشان باقی نہ تھا

نه سکتي تهي هو کونپلي سر فراز	کونپلاوں میں اتنا دم نه تها که سر اُٹها سکیں
نه تک هوسکے بیل کا هت دراز	اور نه بیل هاتهه دراز کر سکتي تهي
چهپیاں سوکلیاں اور توپن لعات	کلیوں نے تڑپ اور لعات اوڑھ رکھا تھا (یعنے پتوں میں
هوا تها سو اس پر بهي یخ کا غلات	چھپ گئی تھیں) اور ان پر یخ کا غلاف چڑھا ہوا تھا
بندی تهی هوا راه پر یخ کي سد	هوا نے رستے میں یخ کی سد باندھ رکھی تھی
اسے دات جانے نه تها کس بهی حد	اور کسی کي قدرت نه تهي که ادهر جاے
مگر سور کے نور کے تیں گگن	شاید سورج کی گرمی سے آسمان نے
نپا یا اتها اصل نورے ذهن	چونے کی ایک بهٹی پیدا کر دی تهی
نکل تسته جا سب هر یالی کے بال	جس کي وجه سے سبزی کے سب بال اُڑ گئے تهے
اتها بهوئیں کی سر چاے چاتے کا حال	اورز میں کا حال گنجے سر کا ساهو گیا تها
پڑیا تها نه دریا میں موجاں سوں شور	یه دریا میں موجوں کا شور نه تها بلکه
اتها ذیر اوبلتا هو بهوئیں گرم زور	زمیں کے سخت گرم هوجانے سے پانی اُبل رها تها

اسی عنوان سے شاعر گرمی کی شدت بیان کرتا چلا جاتا هے اور طرح طرح کے استعارے اور تشبیهیں استعمال کرتا هے - کنور جب چنپاوتی کے باغ میں جاتا هے تو باغ کے حسن و خوبی ' پهولوں کی بهار ' اور پرندوں کے چهچهانے کا ذکر تقریباً آتهه صفحوں میں کرتا هے اور شاعری کا پورا زور دکهاتا هے - اس میں مختلف قسم کے پهولوں اور طرح طرح کے پرندوں کے نام لیتا اور ان کے حسن و جمال کا بیان کرتا هے - اس طویل بیان کا انتخاب بهت مشکل هے - صرف چند شعر لکهتا هوں —

فرح بخش یک سبز تر باغ تها
فلک کو هر یک پهول جس داغ تها

ستیں عکس سو تس ملور چمن
ستارے بھر یا ہوے ہر یا گگن
دیکھت مسکتیں گلرخاں ہر کلی
کریں دل کو خوباں کی گل گد گلی
چلدر گل تے چلدر کی چھاتی پہ داغ
گل سور تے سور کا زرد باغ
گل اورنگ کا تختہ یوں روت کا
کہ جوں پاچ میں کام یا قوت کا
اوڑے تو پنکھی تس کدھن پر جیتک
پڑے برت سوں پر ہو گولا اتک
سو ویسے پہ کیوں آدمی جاے چل
پڑے پانوں دھر تیچ سر لگ پگل

اگر یہ نورانی چمن اپنا عکس ڈالیں
تو ستاروں بھرا آسماں ہرا ہو جاے
جس کی ہر کلی کو دیکھ کر گلرخ مسکرانے لگیں
اور جس کے پھول حسینوں کے دل میں گدگدی پیدا کریں
گل چاندنی سے چاند کی چھاتی پر داغ تھا
اور سورج مکھی سے سورج کا باغ زرد
گل اورنگ کا تختے پر ایسی بہار تھی
کہ جیسے زمرد میں یاقوت کا کام
اگر کوئی پرندہ اس طرف اڑنے
کا قصد کرے تو اس کے پر برف سے ڈل کے گر پڑیں
سو ایسی حالت میں آدمی کیونکر چل سکتا ہے
وہاں پانو رکھتے ہی چوٹی تک پگل جاتا ہے

اس کے مقابلے میں تمازت اور دھوپ کا رنگ ملاحظہ کیجئے —

جوانی سوں تھی دھوپ بھر روت میں
سورج تھا مگر آخر حوت میں
نہ کہہ سور بل اگ کا بادل اتھا
نہ وو دھوپ یک آتشیں جل اتھا
مگر کھینچ دوزخ کے دریا تے نیر
برستا اتھا جگ پہ جلتاچ تھیر
کرن ہیں سو سب جل کی دھاریاں دسیں
ہریک ذرہ قطرات باراں دسیں

گرمی کا آغاز شباب تھا شاید
سورج حوت کے آخری درجے میں تھا
اسے سورج نہ کہو بلکہ وہ آگ کا بادل تھا
وہ دھوپ نہ تھی بلکہ آگ کا پانی تھا
شاید دوزخ کے دریا سے کھولتا ہوا پانی کھینچ آیا تھا
جو متواتر اس دنیا پر برس رہا تھا
کرنیں سب اس پانی کی دھاریاں معلوم ہوتی ہیں
اور ہر ذرہ بارش کا قطرہ

زمیں تے فلک لگ سب یک دھات سوں
بھرے سرور آتش کی برسات سوں
لگی مارنے جب سراباں کی موج
چلی چوکدھن تب حرارت کی فوج
بھری یوں حرارت ہر یک تن منجھار
نہ ستلا سما سک اوبل آئی بہار
پڑی تھی نہ کیں چھاؤں ہر تن تے ڈھل
او نکلی سو ستلا بھٹی تے اگل
دھڑک دھک ادک اگ کے ہر صبح و شام
گگن سرخ تانبے نمن ہوے تمام
برستی تھی یوں دھوپ جگ پر کڑک
سو کوہ و زمیں رہے تھے چھاتی تڑک

زمیں سے آسماں تک ایک وضع پر
آگ کی برسات سے تالاب بھرے ہوے تھے
جب سرابوں کی موج چلنے لگی تو
ہر طرف حرارت کی فوج چلنے لگی
ہر ایک کے تن بدن میں حرارت اسطرح بھر گئی
کہ سیتلا اندر نہ سما سکی اور باہر نکل آئی
یہ جو بدن پر چیچک سی نظر آتی تھی یہ چھاؤں نہ تھی
بلکہ سیتلا تھی جو بھٹی یعنی بدن سے باہر نکل آئی تھی
ہر صبح و شام آگ کے شعلے بھڑک رہے تھے
اور آسماں سرخ تانبا ہو رہے تھے
جہان پر دھوپ یوں کڑک کر برس رہی تھی
کہ پہاڑ اور زمین کی چھاتی تڑقی جاتی تھی

اس کے بعد پرندوں کا ذکر، ایک ایک کا نام لے کر، بڑی تفصیل سے کیا ہے اور ان کے رنگ روپ اور دوسری خصوصیتوں کو عجب شاعرانہ رنگ میں بیان کیا ہے۔ نمونے کے طور پر صرف چند شعر نقل کیے جاتے ہیں —

پتھمبر بندی زرد پیلک نے کھول
پتیاں گھوت اوڑی دھدور شال کھول
سلونی خوش الحان کویل سیاہ
کری سام کسوت ادک خوش نگاہ
تیتوری رنگی پاؤں مہندی سوں سب

پیلک نے زرد ریشم کے کپڑے پہنے
اور کنگھی کر کے (طوس) شال اوڑھی
کالی سلونی اور خوش الحان کویل نے
سیاہ دلفریب لباس پہنا
تتیری نے پانوں مہندی سے رنگے

کری پان طوطی نے کھا لعل لب
کوا چور گشتی کمل تازہ اوز
کرے گشت الدگاں کو نا جاے چوز
پنکھیرو پہ ستنے کو رنگ صبحکا
کیتے گل کے کا نسے بھر یا رنگ ما

اور طوطی نے پان کھا کر لب رنگین کیے
چور کوا نیا کالا کمل اوڑھ کر
دیواروں کے ارد گرد گشت لگا رہا ہے
صبح ہوتے پرندوں پر رنگ پھینکنے کے لئے
چاندنے شب کے وقت کتنے ہی پھولوں کے کاسے بھر دیے یعنی شبنم سے

اب ہر پرندے کے رنگ بتاتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ رنگ انہیں کہاں سے ملے۔ مثلاً

لے لالہ کے کا نسے کسنبا بھرے
سرنگ اپنی سرخاب چولی کرے
لے شب گوش تے صندل و ارگجا
لیا کہک قمریاں نے کسوت بھجا
پیالیاں میں بلبل ہوئی پیشہ مست
دہیں سرخ کے نین لالی سوں مست
اتھے کوئلاں مست ہو ہانک سار
اتھی کوک کوکیاں تے بے اختیار
سر آلخ کا جا دم کوں بوتر نے لگیا
گنوا ہوش اوتن نے لڑنے لگیا
کولاتے پراں سات دستک بجا
کولا تیاں لگے مارنے جا بجا
کلا فر کے گل کیاں قلونیاں جو کھاے
فصاحت سوں رانویاں نے باتاں میں آے

لالے کے کاسے لے کر اس میں کسنبا بھرا
اور اس سے سرخاب نے اپنی چولی سرخ رنگی
شب گوش (پرندہ) سے صندل اور ارگجا لیا
اور اسسے کہک اور قمری نے اپنا لباس بھگویا (رنگا)
پیالہ نوشوں میں بلبل پیش پیش تھی
اور سرخے کی آنکھیں لالی سے مست تھیں
کوئلیں مست ہو ہو کر چہچہا رہی تھیں
اور کوکے بے اختیار ہو کر کوک رہے تھے
لقا کبوتر کا سر دم سے جا لگا
اور لوتن مدہوش ہو کر لڑنے لگا
گرہ باز پروں سے دستک بجا رہے تھے
اور جگہ جگہ قلابازیاں کھا رہے تھے
طوطے قرنفل کے پھولوں کے حبوب
کھا کھا کر بڑی فصاحت سے باتیں کر رہے تھے

اس بیان میں نصرتی نے بیسیوں ایسے پرندوں کے دکنی نام لکھے ہیں جن کی شناخت میں بڑی مشکل پڑتی ہے۔ لیکن یہ بیان تصنع اور آورد سے خالی نہیں —

اب میں ایک ایسے مقام کے اشعار نقل کرتا ہوں جسے پڑھ کر نصرتی کے شاعرانہ کمال کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے کہ جب کنور چنپاوتی کو دیو کی قید سے چھڑا کر اُس کے گھر لے آتا ہے اور یہ خوشخبری سن کر مدمالتی اور اس کی ماں چنپاوتی کے ہاں آتی ہیں۔ ایک دن چنپاوتی کی ماں (جو مدمالتی کی خالہ ہے) مدمالتی کو باغ میں الگ لے جاتی ہے اور باتوں باتوں میں کہتی ہے کہ ہمیں جو بیٹی کے درشن نصیب ہوے یہ سب تیرے قدموں کی بدولت ہے اور ہم تیرے بہت ہی ممنون احسان ہیں۔ مدمالتی یہ سنکر اس کا منہ دیکھنے لگی کہ یہ آپ کیا کہتی ہیں، میرا اس سے کیا تعلق! - اس نے کہا میں قسم کھاتی ہوں کہ جو کچھ میں نے کہا ہے وہ بالکل سچ ہے۔ اس پر مدمالتی نے کہا کہ آخر یہ کیا معما ہے فرمائیے تو سہی۔ تب اس نے کہا اچھا پہلے میں تم سے ایک بات پوچھتی ہوں اس کا سچ سچ جواب دینا اور کوئی بات مجھ سے چھپانا نہیں، اس کے بعد میں یہ معما حل کردوں گی۔ مدمالتی نے کہا پوچھئے۔ اس نے پوچھا کہ کچھ دن ہوے کسی رات کو یکایک تمہاری سیج پر ایک حسین جوان آگیا تھا اور پھر تم میں باہم محبت ہوگئی تھی۔ یہ کیا بات تھی، ذرا مجھ سے کھول کے بیان کرو - مدمالتی یہ سن کر بہت برہم ہوی اور کہا آپ میری بڑی ہیں اور ماں کی برابر ہیں۔ آپ کو ایسی باتیں نہیں کہنی چاہئیں۔

۱۳۷۱

اس پر اس نے کہا میں خدا نخواستہ، تجھے الزام نہیں دیتی ' تو بڑی نیک دل نیک صفات ہے - مگر تو کیا مجھے دلاسہ سمجھی ہے جو اس قدر بگڑ بیٹھی - تو نے جو وعدہ اپنے چاہنے والے سے کیا ہے اسے پورا کر وہ ہزاروں مصیبتیں اور آفتیں جھیل کر یہاں آیا ہے - اس دکھی کے حال پر رحم کر - کیا تم نے ایک دوسرے کو نشانی نہیں دی تھی ؟ اب سچی بات سے کیوں مکرتی ہو ؟ مدمالتی اور بگڑتی ہے اور کہتی ہے کسی کی کیا مجال کہ مجھ تک پہنچ سکے - تمھیں جھوٹ بولتے شرم نہیں آتی - شاید بیگانی لڑکی سمجھ کر یہ جرأت کی ہے - اور اُٹھ کر چلنے لگی تو خالہ نے جھٹ اس کا دامن پکڑ لیا اور کہا او ہوری مکار! مجھے جل دیتی ہے - اچھا بتا تو یہ موتیوں کی مالا کس کی ہے ؟ پھر ایک انگوٹھی دکھا کر پوچھتی ہے کہ پہچان تو یہ کس کی ہے ؟ پھر وہ سارا قصہ بیان کرتی ہے کہ کنور نے کس شجاعت اور بہادری سے دیو کو مارا اور چنپاوتی کو چھڑا کر لایا - ہم اس کے احسان سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتے - اب تو اپنا وعدہ پورا کر اور اپنے وصل سے اسے شاد کام کر - مدمالتی کا دل تو پہلے ہی سے بھرا ہوا تھا ' شرم کو بالائے طاق رکھ اپنے درد دل کو بیان کرتی ہے - یہاں نصرتی نے بلا شبہ اپنی شاعری کا کمال دکھایا ہے اور ایسی حالت میں دل پر جو گزرتی ہے اس کیفیت کو اس خوبی اور سچائی کے ساتھ لکھا ہے کہ بے اختیار تعریف کرنے کو جی چاہتا ہے - کہیں تو اس نے فطرت انسانی کی اس صداقت کو دکھایا ہے جو میر حسن کی مثنوی میں نظر آتی ہے اور کہیں وہ نسیم کی طرح تصنع اور تکلف سے کام لیتا ہے - گلشن عشق

میں یہ دونوں رنگ نظر آتے ہیں ۔ کہتا ہے کہ جب اُس پر یہ بات کھل گئی کہ دایہ کو سارا راز معلوم ہے تو اس کی یہ حالت ہو گئی ـــ

هتوتے او جب هت کا بارا چھٹا	جب دوست کی یاری کا ذکر چھڑا
سو تن من میں تب سر تے دھڑ کا اٹھا	تو اس کے تن من میں آگ بھڑک اٹھی
نچھل موم با تہاں نس استخواں	هڈیاں خالص موم بتیوں کی طرح سے
سلگ تن کے فانوس میں رھے نہاں	تن کے فانوس میں جلنے لگیں
سو پر تاب اهک روپ سارا هوا	اس کا جمال گرمی سے چمکنے لگا
سرب سرخ تن جو انگارا هوا	اور اس کا سرخ بدن انگارے جیسا ہو گیا
دهری جوش دهک سوں درونے کی دیگ	اس آگ سے دل کی دیگ ابلنے لگی
سو پکنے لگیا دل کلیجے سوں بیگ	اور کلیجا پکنے لگا
نکل بہار جلنے او ساساں کی بھاپ	آهوں کی بھاپ باهر نکلنے لگی
چلیا جل اوبل چک سوں آپس تے آپ	اور آنکھوں سے آنسو خود بخود بہنے لگے
کیتک وقت پر جوش جروا کے سب	تھوڑی دیر تک اس نے اپنے جوش کو ضبط کیا
کھی کھول پھول پھا نک سے نرم لب	اور پھر برگِ گل سے نرم لبوں سے کہنا شروع کیا

اب اپنا درد دل اس طرح بیان کرتی ہے

کہ اے سائی کیا ری کری اب توں گھات	اے اماں! تونے مجھے یہ کیا دکھ دیا ہے
جو کاڑی میرے پاس دشمن کی بات	کہ اس دشمن کا ذکر چھیڑ دیا
نہ کہہ ساؤ اس بل کھنوری اھے	اسے سا ھو نہ کہو وہ تو غارت گر لٹیرا ہے
دلاں کی پھبے اس کوں چوری اھے	دلوں کی چوری اسے سزاوار ہے
چھپے چھند سوں کینا اچنبک پچھاں	محض فریب سے نادر مال کو پہچان کر
ادی رات کوں بھاکے جاتا ہے کہاں	آدھی رات کے وقت لوٹ کے لے گیا

سمجتا ہے ایسی وہ جادو گری
نہنا جس کا شاگرد اچھے سامری
نجانوں کہ کیا سحر کرنے نظیر
یکایک دوڑا ستیا مجہ مندھیر
جگا کر اپس مکہ کی مشعل کی تاب
ستم چھین لیتا میٹھی مجتے خواب
دو جیتی ہو جب کھول دیکھی نین
ہوا تس اجالے سوں بے تاب من
وہیں عشق کی سوز لا بار بار
میرے دل کوں دیتا ادک بے قرار
پھرم بھر کی بھا کر میرے بس منے
بھولا کر لیا کھینچ آپس منے
یو مجہ دل کا دھن مینچ مجہ ہات سوں
اسے کارتی سوز کے گھات سوں
گھلوری پن اس دھات حالی کیا
سرب لوٹ من تن کوں خالی کیا
پڑی نیند یکایک وو جب بھول تات
صبا ہوے پہ جب کھول دیکھی نین
دسیا نیں سو یک تل بھی مجہ تن میں من
لوٹے جاکے تن من کا کھنا سکل
بیٹھی ہوکے مفلس دیوالا نکل

وہ جادوگری کا ماہر ہے
سامری اس کا ادنیٰ شاگرد ہے
نہ معلوم کیسا عجیب جادوگر کے
اس نے یکایک میرے محل پر دھاوا کیا
اپنے مکھ کی مشعل کی روشنی سے
اس نے عمداً میری خواب شیریں چھین لی
پریشان ہو کر جب میں نے آنکھ کھولی
تو اس کے اجالے سے میرا من بے تاب ہوگیا
فوراً عشق کا سوز بار بار اٹھا کر
میرے دل کو نہایت بے قرار کردیا
میرے دل میں کچھ ایسا جادو ڈال دیا
کہ مجھے خود فراموش کر کے اپنی طرف
کھینچ لیا میرے دل کی دولت میرے ہاتھ
سے سوز کا دکھ دے کر چھین لی
فی الحال اس طرح غارت گری کی
کہ سب کچھ لوٹ میرا تن من خالی کردیا
جب آنکھ لگ گئی اور بھول غالب آگئی
صبح ہوئی پر جب آنکھ کھول کے دیکھا
تو تن میں دل کا نام و نشان نہ تھا
تن من کی ساری دولت لٹ گئی
اور میں مفلس دیوالیا ہوکر رہ گئی

ولے اُن لگایا سو مشعل کی سوز
ادک ہوے پلپل کوں مجھ تن میں روز
برہ کی اوبالاں جو ہے تن سنبھار
ادک جوش سوں جیو کوں ہوے کوند بار
اوسا سان نہ کچھ مک سٹر بھاسکوں
نہ چک تھے انجھو بہار تک لیا سکوں
یکت نت رہوں غم سوں کر سر تلار
نہ کوئی بانٹ لیوے میرے دل کا بار
تلے دن تو ہرکیوں سہیلیاں سنگات
پڑے بن بجر سل ہو سینے پہ رات
زرایں اگن تن پہ سارے لگیں
گلاں سیج کے مجہ انگارے لگیں
چندر مجہ اوپر زہر کا ہوایاغ
دیوے ہرستارا میرے دل پہ داغ
ادک سوز لگ مجہ تاپنا پڑے
اُسی گھات کے بام تپ نا پڑے
نسنگ زور سوں چوٹ اُسا سان کا باؤ
دیوے جوش سوں دل کے دریا کوں تاؤ
تریاں نین کی تب ابلنے لگیں
امنڈ تن کی خشکی پہ چلنے لگیں
ہوی سیج اور جل سمندر نمن
پڑے تس گھڑی سخت غوطے میں من

لیکن وہ جس نے یہ آگ لگائی تھی
وہ لحظہ بہ لحظہ میرے دل میں کھبا جاتا تھا
جدائی کی آگ جو تن بدن میں لگی ہوئی ہے
اس کے بیحد جوش سے دل منقبض رہتا ہے
نہ منہ سے آہ نکال سکتی ہوں
اور آنکھ سے آنسو باہر لاسکتی ہوں
ہمیشہ تنہا اور غم سے سرنگوں رہتی ہوں
کوئی ایسا نہیں جو میرے دل کے بوجھ کو بانٹ لے
دن تو جوں توں سہیلیوں کے ساتھ کٹ جاتا ہے
لیکن رات چھاتی پر پہاڑ ہو جاتی ہے
لباس وغیرہ بدن پر آگ معلوم ہوتے ہیں
اور سیج کے پھول انگارے
چاند میرے لیے زہر کا پیالہ ہے
اور ہر ہر ستارا میرے دل پر داغ دیتا ہے
سوزش دروں سے میں تڑپتی رہتی ہوں
اور اس دکھ بغیر مجھے قرار بھی نہیں
آہوں کا طوفان اس زور سے چلتا ہے
کہ دل کا دریا اس سے سخت جوش میں آجاتا ہے
تب آنکھوں کی مچھلیاں (آنسو) ابلنے لگتی ہیں
اور امنڈ کر تن کی خشکی پر چلنے لگتی ہیں
اس سے ساری سیج سمندر کے پانی کی طرح ہو جاتی ہے
اس وقت دل سخت غوطے کھانے لگتا ہے

بھاری صبا دیکھتے دوڑ آئے	یہ دیکھتے ہی بھاری صبح دوڑتی آتی ہے
پکڑ ہات دیتے کوں کڑ کے لگائے	اور ہاتھ پکڑ کر دیئے کو کنارے لگا دیتی ہے
رین کل مکھی سنگ تو بر آئے نا	سیاہ روشب سے صحبت گوارا نہیں
دیکھوں زرد رو دن کوں بھی بھاے نا	اور نہ زرد رو دن کا دیکھنا بھاتا ہے
اچھے نس تو دوزخ تے کالی کٹھن	رات دوزخ سے بھی زیادہ تاریک اور کٹھن ہے
دسے دن تو روز قیامت کا دن	اور دن قیامت کا دن ہے
مرے سر تلیں یوں کٹھن ماہ و سال	یہ کٹھن زمانہ اس طرح مجھ پر گزرتا ہے
خدا بن کہوں کس سوں مجھ دل کا حال	خدا کے سوا اپنے دل کا حال کس سے کہوں
کہ ناچار اچھے رو ریا کے بدل	ناچار پاس خاطر کے لیے
سو ہنس کھیل گھا سکیاں میں سگل	میں سہیلیوں میں ہنس کھیل کے وقت گزار دیتی ہوں
جو دیکھوں نجھا تو دسے نین میں	غور سے دیکھتی ہوں تو آنکھوں میں نظر آتا ہے
جو بولوں بچن تو بسے بین میں	اور جو بات کرتی ہوں تو آواز میں دکھائی پڑتا ہے
گرا چلتا تو کچھ بھی مرے ہاتھ بس	اگر میرے بس میں کچھ بھی ہوتا
تو اس وقت یک تل لے ناکر الس	تو میں اسی وقت بلا تامل
سو ھر کیوں وو دل چور کا کھوج پوچ	کسی نہ کسی طرح اس دل کے چور کا سراغ لگاتی
پھر اُس لوٹ لیتی محبت سوں ووچ	اور محبت کے زور سے اُسے لوٹ لیتی

ایک دوسرے مقام پر بھی اسی کیفیت فراق کو بیان کیا ہے جس کے چند شعر یہاں نقل کیے جاتے ہیں —

نہ سکتی تھی رہ جو جنی بای تل	وہ جو ماں کے بغیر ایک لحظہ نہ رہ سکتی تھی
نہ بھاوے سکیاں وو جو بیٹھیں تو مل	اور سہیلیوں کے بغیر جسے چین نہ آتا تھا
بچن ان کے دل پر اُسے بار ہوئے	اب ان کی باتیں اُسے ناگوار ہوتی تھیں
جو تسقے خال ذکر دلدار ہوے	کہ اس سے ذکر دلدار میں خلل آتا تھا

ہو باول ادک جوں پئے پر شراب
پوچھے کوئی اُسے کچھ، تو دے کچھ جواب
رکھے گرچہ تس ٹھار ناچار تن
دھرے جیوں کوں پن آپنے یار کن
دوجا دھیان تس دل انگے پست اچھے
نت اپنیچ اپیں حال میں مست اچھے
لبہ میں وہی یاد کرتیں بچن
او تھے بول یکایک سوتا جوں سپن
دھرے بانہہ اپس اپنے سینے سوں تنگ
کہ گلہار تھے وصل کے یار سنگ
چوسے لب کا اپنیچ اپن رنگ رس
شکر ہوے تھے امرت تے شربت سرس
زباں سے ہووے اس کوں کر ہمکلام
نکالے نہ چک غیر کا مکھ تے نام
لگیا تھا کر اپنا سو تس تن کو تن
اپس چھاؤں کوں نا لگن دے چرن
رہیا تھا کہ اس روپ اپس چک بھتر
نہ لگنے دیوے آرسی کی نظر
تس اوکلتی ناکل پڑے چک اُسے
اُسی بیچ تھا روز سکھ دکھ اُسے
پیا باج سنگار کام آے نا
نہ کچھ غم کے پیرایہ بن بھاے نا

جیسے کوئی شراب پی کر پاگل ہو جاتا ہے
اُس سے پوچھتے کچھ ہیں اور جواب کچھ دیتا ہے
اگرچہ وہ بظاہر یہاں ہے
لیکن جی اس کا یار میں ہے
کوئی دوسرا خیال اس کے سامنے ہیچ تھا
اور وہ ہمیشہ اپنے حال میں آپ مست تھی
لبوں پر اُسی کی باتیں تھیں
جیسے کوئی خواب میں سوتے سے بول اٹھے
وہ اپنے بازو اپنے سینے سے لپٹائے رکھتی تھی
کہ وصل کے روز یہ یار کے گلے کے ہار تھے
اپنے لبوں کو خود ہی چوم چوم کر مزہ لیتی
کہ وہ آب حیات سے بھی زیادہ شیریں تھے
وہ اُسی سے ہمکلام رہتی تھی
اور بھولکر بھی زبان سے کسی دوسرے کا نام نہ لیتی تھی
چونکہ اپنا بدن اس کے بدن کو لگا تھا
اس لئے وہ اپنے سایہ کو بھی اپنا قدم نہیں لگنے دیتی تھی،
چونکہ اسکا جمال کبھی اپنی آنکھوں میں رہا تھا
اِسلیے آئینے کی نظر بھی اُسے نہ لگنے دیتی تھی
اُس بیقرار کو بھولے سے بھی قرار نہ آتا تھا
اسی میں روز اس کا سکھ دکھ تھا
بغیر محبوب کے سنگار بیکار ہے
اور غم کے پیرایہ بغیر کوئی چیز نہ بھاتی تھی

نہ کوئی یک علاج اُس کو صحت کرے
دوگن درد کوں پھر نصیحت کرے
کتی تھی سو ار کچھ بھی اول بچن
سنے پر سہیلیاں کا بھرتا تھا من
وہ سب ھات سے طرح دیتی چلی
چپی کے چپ دل تے لیتی چلی

اُسے کوئی علاج کارگر نہ تھا
نصیحت سے اس کا درد اور بڑھتا تھا
پہلے وہ کچھ کچھ باتیں بھی کرلیتی تھی
جن کو سن کر اس کی سہیلیوں کا دل بھر آتا تھا
اب وہ بھی موقوف ھو گئیں
اور اب خاموش دل ھی دل میں گھٹتی تھی

شادی کی مجلس میں راگ رنگ کا ذکر کیا ھے ۔ چند شعر اس مقام کے بھی نقل کئے جاتے ھیں —

طرب بخش مطرب میٹھے تان اُچائیں
سوکیانی بجا گیان ھور گن سے گائیں
یتا کچھ بلندی دھری خوش سبد
دیکھیں پھاڑ پردے کو زھرہ لبد
چتر نازنیں پاتراں چھند باز
جو تھیاں لاڈ خوبی سوں عاشق نوار
لٹکتیاں چلیں چھب کی جب چاؤ سوں
خمیں قد جو بن بار کے تاؤ سوں
لبد سحر کا حقہ لبد انہار
سبد بدکوں افسوں ھو لیجا نہار
ھریک چھب میں دھرتیاں ھزاراں سوزیب
ھریک فن میں کرتیاں ھزاراں فریب
وو کس کاس تھاریاں رہیاں چین بند
دیکھانے ارت بھاؤ سوں چھپ کے چھند

سرور بخش مطربوں نے میٹھی تانیں لینی شروع کیں
اور گویوں نے گیان اور گن سے گانا بجانا شروع کیا
خوش آواز کی بلندی ایسی تھی
کہ ھر زہرہ جبینیں پردے پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رھی تھی
پر ھنر جادو کار نازنین ناچنے والیاں
ھزار ھا خوبیوں سے عاشق کا دل چھیننے والی تھیں
جب وہ ناز و ادا سے مٹکتی چلتی تھیں
تو جوبن کے بار سے ان کے قد خم ھوجاتے تھے
جادو کار لب فریفتہ کرنے والے تھے
اور آواز کے افسوں سے عقل گم تھی
ایک ایک ادا میں ھزاروں زیبائشیں
اور ایک ایک فن میں ھزاروں جادو تھے
وہ کسی کسائی آراستہ کھڑی تھیں
اور ارت بھاؤ سے ادا کے ھنر دکھا رھی تھیں

لگی ناچنے آجو ہر کن بھری
اپس فن میں اُڑتی دسے جوں پری
کیاں یوں میٹھا راگ رنگ رس بھرا
بسر سد سہک سیر چند ر ہریا
فلک چرخ کیانے کی گت بھول گیا
سورج کے جوریاں کا بہتا جل رہیا
پون کا ترنگ ہو رہیا کہنہ لنگ
ہوا کند تر تیز اگن کا فرنگ
دیا سوز کالے سے ققنوس کوں
رولایاں دیکھا ناچ طاؤس کوں
لجایاں تماشے سوں گیانیاں کے من
بھولایاں نزاکت سوں سب انجمن

ہر ایک کن بھری جب ناچنے لگی
تو اپنے فنکے زور میں پری کیطرح اُڑتی دکھائی دیتی تھی
جب میٹھا رسیلا راگ گایا
تو سہک سیر چاند کی بھی عقل کم ہو گئی
آسمان گھومنے کی گت بھول گیا (کھڑا رہ گیا)
اور سورج کے جھونوں سے بہتا جل رک گیا (بہتا جل سے مراد شعاعیں ہیں)
ہوا کا گھوڑا لنگڑا ہو کے رہ گیا
اور آگ کی تیز تلوار کند ہو گئی
کالے سے ققنوس کے دل میں سوز پیدا کردیا
اور ناچ دکھا کر طاؤس کو رلا دیا
ان کے تماشے سے اہل ہنر شرمندہ
اور انکی نزاکت سے اہل انجمن خود فراموش ہوگئے

اس کے بعد دعوت کے کھانوں کا ذکر کیا ہے، شاید ہی کوئی کھانا، ترکاری، پکوان اور پھل بچا ہو۔ یہ بیان طویل ہے اور اس کا نقل کرنا بے مزہ ہوگا۔ کھانوں کے بعد آتش بازی کا نمبر آتا ہے۔ یہاں بھی نصرتی حسب عادت تمام آتش بازیوں کا بیان نام لے لے کر کرتا ہے۔ غرض شادی کے جتنے لوازم اور رسوم ہیں ان سب کا ذکر دل کھول کر کیا ہے۔ اس میں اُس نے ہر موقع کے مناسب اس قدر الفاظ استعمال کئے ہیں کہ اس سے اس کی وسعت معلومات اور قدرت زبان کا اندازہ ہوتا ہے۔ جی تو چاہتا ہے کہ بعض بعض حصے نقل کیے جائیں لیکن طوالت کے خوف سے نظر انداز کرتا ہوں —

قصہ ختم ہونے کے بعد خاتمۂ کتاب ہے جس میں بادشاہ کی مدح اور اپنی مثنوی کی تعریف اور اس کی خصوصیت بیان کی ہے۔ اپنی کتاب کی خوبی اور بادشاہ کی قدردانی کا ذکر اس طرح کرتا ہے —

کیا ہوں کتاب اب یو تصنیف میں	بھریا تس میں تیری جو تعریف میں
دُرونے * کا ات † فکر سوں کھود کھن ‡	نکالیا ہوں کئی رنگ برنگی رتن
یتے جوہراں میں جو کاڑیاں ہوں آج	سمج لیو نہ پایا ہوں دقت کے باج
جو سب نس § فلک کھاے خونی جگر	تو یک بہار لاتا ہے روشن گہر
رہنا کر مشقت کی اپنی پچھاں	شفق کر دکھاتا ہے لہو کی نشان
کتا ہوں مشقت مری کھول میں	گہر کیں نہ رکیتا ہوں بے تول میں
ہر یک سخت الماس کوں کر تلاش	بنایا ہوں کئی بار پھر پھر تراش
ہر یک نگ پہ جڑنے رتن بو معن	کیا ہوں کتی بار اپس لہو کا جل
ہر یک سطر ہے گرچہ فیلم کی لڑ	معانی کے ہیں لعل یکس یک تے $ چڑ
مرا لعل ہر یک دیکھت نامدار	کیے ہیں رتن پارکوں ** سب قرار
اچھا لے ¶ تو جیتا یہ جاوے بلند	و نائقد دینا بی ہے سود مند
دیکھو مول اس لعل کا کیا چڑیا	اچھا لیا سو طاق فلک پر دڑیا
اتا شاہ بن مول کن لے سکے	جو ہر لعل کا یوں بہا دے سکے۔

---

* دل ' باطن۔ † نہایت۔ ‡ کان۔ § رات۔ $ بڑہ چڑہ کر۔
** پرکھنے والا ¶ جوہریوں کا یہ قاعدہ ہے کہ لعل کو ناخن سے حرکت دیتے ہیں اور جس قدر وہ زیادہ اوپر کو جاتا ہے اسی قدر اس کی زیادہ قیمت ہوتی ہے —

شہا کوئی متاع اس کے نا سار * اچھے یو لت جگ میں جگ رھنہار اچھے

اس کے بعد بتاتا ھے کہ میں نے اس کتاب کے لکھنے میں کیا کیا هنر اور حکمتیں کی ھیں —

خصوصاً جو میں قصۂ بے مثال کہ الحق ھے سجہ فہم کا یک خیال
سری طرح کے تیز تازی کے تیں یوں سوں کرنہار بازی کے تیں
ابلقا سو دیگ آپ نے تھان میں لے آیا سو قصے کے میدان میں
نہ سجہ دل سنگیا تیوں پورایا اوسے نہ جوں تھا دکھانا دکھایا اوسے
نہ ھر تھار دیتا ھوں جولان میں توپک چپ چلایاں ھوں گردان میں
دھر اس شعر کی اصل خوبی کا بیاؤ نکا لیا ھوں قصہ کی شاخاں تے تاؤ
لنبی بات کوکیں کیا مختصر کہیں مختصر کوں بدھایا سدور
کہیں چپ روایت کیا حسب حال کہیں طبع کے لے چلایا خوش خیال
کہیں بول گت سینچ صافی کیا کہیں وقت موشکافی کیا
بندیا ارت کیں ھر کسی فہم کا رکھیا بیاؤ کیں بادشہ وھم کا
بکت فن ھے آسان شہ تعبہ اکل کہ ھے توں کر نہار مشکل کوں حل

آخر میں کتاب کا نام اور سنہ تالیف کو نظم کیا ھے

محبت کی پاباس ھر ٹھاؤں میں رکھیا گلشن عشق کر ناؤں میں
دھریا اس کی تاریخ یوں ھجرتی مبارک یو ھے ھدیۂ نصرتی

اس سے سنہ ۱۰۶۸ ھجری نکلتے ھیں —

مجھے یو تو ھے جیوتے پیاری کتاب کہ ھے عشق سوں پر یہ ساری کتاب

اور اس کے بعد دعا پر کتاب کا خاتمہ ھو جاتا ھے —

---

* سانند —

میرے پاس اس کتاب کے کئی نسخے ہیں لیکن سب سے قدیم سنہ ۱۰۹۳ ھ یعنی تالیف سے ۲۵ سال بعد کا ہے۔ اس میں کتاب کے ختم پر ایک رباعی بھی درج ہے جو بلا شبہ نصرتی کی ہے اور اس مثنوی کی تعریف میں ہے —

جے گل ہے نزاکت کا نول اس بن میں یک رنگ پیالا اہے اپس فن میں
ہو طبع معطر دے رنگین نظر جن سیر کرے عشق کے اس گلشن میں

(باقی)

اُردو شاعری کا مطالعہ

از

(مولوی وحیدالدین سلیم مرحوم)

اگر آپ اُردو شاعري کے تمام دفتر کا مطالعہ کریں تو اُس میں سب سے زیادہ آپ کو غزلوں کا انبار نظر آئے گا - اس کے بعد مسدسوں کا ایک بڑا ذخیرہ ملے گا - پھر مثنویوں کا اور اس کے بعد آپ قصیدوں کا ایک مجموعہ دیکھیں گے - مگر اس تمام دفتر کو اگر آپ غور و فکر سے دیکھیں تو هر زمانے کے شعرا کے کلام میں آپ کو کچھہ ایسي خصوصیات ملیں گي جو ایک کو دوسرے سے ممتاز کرتی هیں - انھیں خاص اور مابہ الامتیاز باتوں کا مطالعہ درحقیقت اُردو شاعري کا مطالعہ هے —

سب سے پہلے آپ کو شاعر کے کلام کا بیروني مطالعہ کرنا چاهیے - یعني یہ دیکھنا چاهیے کہ اس کلام کی ظاهری ساخت کیسي هے - اُس کي شکل کس قسم کی هے - آپ اُس کے لفظي تار و پود ' نحوی ' عروضي و بیاني خصوصیات پر بھي نظر ڈالیں —

اس کے بعد آپ اس کلام کا اندروني مطالعہ کریں ' یعنی یہ دیکھیں کہ وہ کلام کس قسم کے خیالات پر حاوی هے شاعر کن خاص معاني کا بار بار اعادہ کرتا هے اور وہ اکثر کن خاص افکار کے دایرہ کے اندر گھومتا هے —

اندرونی مطالعہ کے بعد اس بات پر بھی غور کرنا چاھیے کہ اس کلام کا تعلق شاعر کے ذھن سے کیا ھے - یعني عام طور پر شاعر اپنے کلام کو کیونکر سر انجام کرتا ھے - اس منزل پر پہنچ کر آپ کو معلوم ھوگا کہ یورپ کے شعرا کي نفسیات سے ھمارے شعرا کی نفسیات جدا گانہ ھے - پھر خود ھمارے شعرا اپني اپنی خاص ذھنیت کے لحاظ سے ایک دوسرے سے جدا ھیں —

اس کے بعد آپ کو غور سے دیکھنا چاھیے کہ زیر مطالعہ کلام پر ملکي یا غیر ملکي ادبیات کا کیا اثر پڑا ھے - یعنی اس بات کي جستجو کرني چاھیے کہ شاعر کے خیلات و افکار میں بیرونی اثر کہاں تک ھے اور اس کا ماخذ کیا ھے —

اس کے علاوہ آپ کو اس بات کا سراغ بھي لگانا چاھیے کہ شعر کا تعلق شاعر کي زندگي سے کیا ھے - یعنی شاعر کی سیرت کي جھلکیاں شعر میں کہاں تک ھیں - اس مطالعہ کے لیے ضروری ھے کہ آپ شاعر کي سوانح زندگي کا بھی مطالعہ کریں - اور شاعر کي سیرت اور اس کے کلام میں مطابقت کي تلاش کریں —

سب سے آخر میں اس امر پر غور کي نظر ڈالني چاھیے کہ شعر کا تعلق شاعر کے زمانہ اور اس کے ماحول سے کیا ھے —

اگر اس طریقہ سے آپ تمام اُردو شعرا کے کلام کا زمانۂ قدیم سے زمانۂ حال تک مطالعہ کریں اور اُن کي خصوصیات قلمبند کرتے جاؤیں تو آپ برائے ایقان دیکھیں گے کہ کس طرح رفتہ رفتہ زبان میں انقلاب ھوتا گیا ھے - کس طرح گرامر بدلتي گئي ھے - کس طرح خیالات میں تغیر ھوتا گیا ھے - کس طرح شاعری کي عروضي اور بیاني خصوصیات منقلب ھوتی

گئی ہیں۔ کس طرح ایک ادب کا اثر دوسرے ادب پر دوڑتا گیا ہے۔ کس طرح ماحول کے بدلنے سے شاعروں کی نفسیات بدلتی گئی ہیں۔ یہ مطالعہ درحقیقت نہایت دلچسپ ہے —

مثال کے طور سے اول بیرونی مطالعہ کو لیجئے۔ فرض کیجیے کہ آپ ولی کے کلام کا مطالعہ کررہے ہیں۔ آپ کو صاف طور سے نظر آئے گا کہ اس کے کلام میں ہندی الفاظ کا استعمال بمقابلہ آج کل کی شاعری کے بہت زیادہ ہے۔ وہ بہادر کی جگہ جودھا' طاقت کی جگہ بران۔ آنکھ کی جگہ نین۔ دکھائی دینا کی جگہ دسنا۔ دیدار کی جگہ درس اور درسن۔ آنسو کی جگہ انجھو۔ آئنہ کی جگہ درپن۔ جدائی کی جگہ برہ۔ سورج کے جگہ سور۔ محبت کی جگہ پریم۔ پانوں کی جگہ پگ۔ تسبیح کی جگہ سمرن۔ بھولنا کی جگہ بسرنا۔ کھانے کی جگہ بھوجن۔ دنیا کی جگہ سنسار۔ آگ کی جگہ اگن۔ رات کی جگہ رین وغیرہ الفاظ بے تکلف استعمال کرتا ہے۔ وہ معشوق کے لیے سجن موہن۔ پیتم۔ سندر۔ پی۔ پیو۔ پیا۔ سریجن۔ ساجن۔ لالن وغیرہ الفاظ لاتا ہے —

آپ دیکھیں گے کہ ولی کے زمانہ کی گرامر آج کل کی گرامر سے مختلف ہے۔ وہ ابتدا۔ فضیلت۔ روا۔ قدر۔ شہرت۔ زنجیر۔ رسید وغیرہ کو مذکر اورتار اور خواب مخمل وغیرہ الفاظ کو مونث لاتا ہے۔ فعلوں کے گردان کے علاوہ ضمایر اور روابط میں بھی فرق ہے۔ وہ ہم کی جگہ ہمن کہتا۔ تم کی جگہ تمن' تہلا' میں کی جگہ موں۔ منیں۔ سے کی جگہ سیں۔ سوں۔ ستی۔ یہ کی جگہ یو۔ اور کی جگہ ہور۔ اندر یا میں کی جگہ بھیتر۔ دوسرا کی جگہ دوجا۔ اپنے کی جگہ اپس۔ مجھ کو۔ میرا اور تجھ کو۔ تیرا کی جگہ مجھ

اور تجهه ۔ جس نے کی جگه جن نے ۔ تبوں کی جگه تدهان ۔ کبهی کی جگه کدهیں ۔ تجهه جیسا کی جگه تجهه سارکا ۔ جس طرح کی جگه جیونکو اتنا کی جگه ایتا ساتهه کی جگه سنگات وغیرہ الفاظ لاتا هے ۔ فاعل کی علامت نے اس کے کلام میں اکثر نہیں آتی ۔ ایک خاص بات ولی کے کلام میں آپ کو یه بهی نظر آئے گی که وہ فارسی عربی الفاظ کے ساتهه هندی لفظوں کو مضاف کر دیتا هے ۔ مثلاً غنچهٔ مکهه ۔ جامِ نین ۔ نور نین آب نین ۔ روز نہان وغیرہ ۔ ترکیب توصیفی میں بهی وہ اسی قسم کے الفاظ کو بے تکلف جوڑ دیتا هے ۔ مثلاً شہریں بچن ۔ شکر بچن ۔ گلدسته خوش پاس ۔ عطف کی فارسی واو دو هندی لفظوں کے درمیان لے آتا هے مثلاً دن و رات —

اس زمانه کا املا بهی آج کل کے املا سے علیحدہ هے ۔ مثلاً کو کو کوں سا کو سیا ۔ نکلا کو نکلیا ۔ کرنا کو کرناں ۔ تو کو توں ۔ جوں کو جیوں اور اتنا کو اتناں لکهتے تهے —

ایک خصوصیت ولی کے کلام میں آپ کو یه نظر آئے گی که وہ بہت سے متحرک الفاظ کو ساکن اور ساکن کو متحرک کر دیتا هے ۔ مثلاً رین اور نین کو رَین اور نَین ۔ زلف کو زلَف شمع کو شمَع ۔ فکر کو فکَر ۔ قفل کو قفَل ۔ غرض کو غرُض وغیرہ —

هندی ادب کے تلمیحی الفاظ بهی آپ کو ولی کے کلام میں نظر آئیں گے ۔ مثلاً پاتال ۔ باسک ۔ رام ۔ لچهمن ۔ سیتا ۔ کشن ۔ بدری ۔ ارجن کا بان ۔ کامروپ کا جادو ۔ لیلاوتی وغیرہ —

ایک خصوصیت ولی کے کلام میں آپ کو یه دکهائی دے گی که وہ وزن شعر میں بعض حروف کو اکثر گرا دیتا هے ۔ مثلاً کئی کی جگه کی ۔

هوئی کی جگه ئی ۔ اے کی جگه آ ۔ انکھیاں کی جگه اکھاں ۔ صفحه کی جگه صفا ۔ نزیک = نزدیک کی جگه نزک ۔ انجهو کی جگه ادهو ۔ نهیں کی جگه نی ۔ اندهیاری کی جگه ادهاری ۔ پوجن هاری کی جگه پجن هاری ۔ کهوں کی جگه کوں ۔ دوجے کی جگه دجے ۔ دنیا کی جگه دنا ۔ هوے کی جگه هو ۔ سورج کی جگه سرج ۔ کیونکوت کی جگه کیکرت ۔ معلوم کی جگه معلم ۔ دیکھے کی جگه داهے ۔ کوئی کی جگه کی ۔ میٹھے کی جگه مٹھے ۔ سوتے کی جگه سُنے ۔ توٹا کی جگه تتا ۔ پھیکا کی جگه پھکا ۔ بھیتر کی جگه بھتر ۔ رهتا هے کی جگه رتا هے ۔ جنگل کی جگه جگل ۔ غصه کی جگه غصه ۔ زنجیر کی جگه زجیر لاتا هے ۔ ع اور ح اور ہ بهی وزن میں بعض موقعوں پر بے تکلف گرا دیتا هے ۔ مثلاً عاشق کی عین حیرت کی ح اور هوا کی ہ —

قافیه ردیف کے لحاظ سے اگر آپ ولی کے کلام پر نظر ڈالیں گے تو آپ دیکھیں گے که اس میں سنگلاخ زمینیں بهی موجود هیں جس کو لکھنؤ میں انشا اور مصحفی نے اور دهلی میں نصیر اور ذوق نے زیادہ رواج دیا ۔ غزلوں کے بعض مجموعے آپ کو ایسے نظر آئیں گے که ان کے قافیے ردیفوں کے ساتھه حروف تهجی کی ترتیب سے بالقصد جوڑے گئے هیں اور وہ زمینیں محض مشق سخن کے لیے اختیار کی گئی هیں ۔ مثلاً ی کی جو ردیف دیوان میں هے اس میں ے کو ردیف قرار دے کر اول ایسا قافیہ اختیار کیا گیا هے جس کے آخر میں الف هے ۔ مثلاً ادا هے ۔ هوا هے ۔ پهر ایسے قافیے کے ساتهه اس ردیف کو جوڑا هے جس کے آخر میں ب هے ۔ مثلاً کمخواب هے ۔ سیراب هے ۔ اسی طرح بالترتیب ت ۔ ج ۔ د ۔ ر ۔ س وغیرہ کے قافیے ی تک لائے گئے هیں —

اگر اسی طرح مختلف شاعروں کے کلام کا مطالعہ کرتے کرتے آپ میر و کے سودا کے زمانے تک پہنچیں گے تو آپ کو اُس زمانے کی گرامر بھی آج کل کی گرامر سے کسی قدر مختلف نظر آے گی - مگر اس قدر نہیں جس قدر کہ سلطان قلی قطب شاہ اور ولی کے زمانے کی گرامر - میر کی شاعری کے متعلق جو کچھہ میں بیان کر چکا ہوں اُس میں اُس زمانے کی زبان اور گرامر کی تفصیل کی جا چکی ہے - اس کے علاوہ میر کی اس خصوصیت پر بھی آپ کو نظر رکھنی پڑے گی کہ وہ ہندی بحریں خاص کر استعمال کرتا ہے مثلاً پتا پتا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے - جانے نہ جانے گُل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے - اِن بحروں میں اُس کی غزلیں خاص کر نہایت دلچسپ ہیں اور جس طرح فارسی کا مشہور ہندوستانی خیال بلند شاعر بیدل خاص خاص لمبی بحروں میں اپنا خاص کمال دکھاتا ہے اور ان بحروں میں کوئی شاعر اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا - یہی حال میر کا ان ہندی بحروں میں ہے - سودا کی شاعری میں یہ خصوصیت آپ کو نظر آے گی کہ وہ غزلوں میں قصیدہ کی زبان یعنی عربی فارسی ترکیبیں زیادہ استعمال کرتا ہے اور قصیدہ کی طرح غزلوں میں بھی سنگلاخ زمینیں اختیار کرتا ہے —

اگر آپ بالفرض انشا اور مصحفی کے دیوانوں کا مطالعہ کریں تو اُن میں بہت سی سنگلاخ زمینیں آپ کو ملیں گی - انشا کا کلام کہیں صاف نظر آے گا اور کہیں اُس کی زبان کھچڑی دکھائی دے گی - یعنی وہ ان تمام زبانوں کے الفاظ جا و بیجا لاتا ہے جن کو وہ جانتا ہے -
اگر آپ ناسخ کا دیوان ذرا اٹھالیں اور اس کو مطالعہ کرنا شروع کریں تو معلوم ہوگا کہ یہ شاعر گرامر کے خلاف ایک قدم نہیں

اٹھاتا - جیسے تلے الفاظ لاتا ہے - جو الفاظ اور جو ترکیبیں اُس نے
ترک کردی ہیں اُن کا قدم قدم پر خیال رکھتا ہے - اُس نے اپنے لیے
زبان کی خاص حدود مقرر کرلی ہیں - اُن سے کبھی باہر نہیں نکلتا -
عام بول چال بہت کم استعمال کرتا ہے - وہ ایک ایسی زبان بولتا ہے
جو بالکل فارسی زبان کا عکس ہے - وہ تخیل میں آزاد نہیں ہے - بس
اُنھیں مضامین پر قانع ہے جن کو اُس کی بجبر اختیار کی ہوئی
زبان ادا کرسکے - ناسخ کے کلام کا بغور مطالعہ کرنے والا اُس کے زبان
کو دیکھ کر ایک ہی نظر میں خشک اور کٹھل کہہ دے گا - بر خلاف اس کے
آتش کی زبان میں اس کو شگفتگی نظر آے گی - وہ لکھنؤ کی عام
بول چال کا بھی خیال رکھتا ہے - عربیت یا فارسیت اُس کے کلام پر غالب
نہیں ہے - وہ گرامر کی اس قدر پروا نہیں کرتا جس قدر کہ ناسخ کرتا
ہے - اُس کی زبان کی حدود ناسخ کی نسبت ذرا وسیع ہیں - رند
اس سے بھی زیادہ عام بول چال کا پابند ہے - اس کے کلام کا مطالعہ
کرنے والا اُس زمانے کی اُس زبان سے اچھی طرح واقف ہوسکتا ہے جو
لکھنؤ میں عام طور پر مستعمل تھی - اُس پر عربیت یا فارسیت مطلق
غالب نہیں - رشک اور امانت کے دیوان اُٹھا کر دیکھو تو معلوم ہوگا کہ یہ
شاعر سر سے پاؤں تک ضلع جگت اور رعایت لفظی میں ڈوبے ہوے ہیں -
متاخرین لکھنؤ میں سے اسیر اور امیر بھی رعایت لفظی کے مرض میں
مبتلا ہیں - مگر امیر نے آخر زمانے میں اپنا قدیم انداز چھوڑ دیا تھا اور
داغ کے کلام کی شہرت نے محاورہ بندی اور سادہ بیانی پر آمادہ کر
دیا تھا - تاہم یہ نئی طرز نبھہ نہ سکی —

دہلی کے شعرا میں سے نصیر حد سے زیادہ سنگلاخ زمینوں پر چلنے

کے عادی ہیں اور اُن کا اثر ذوق پر بھی پڑا۔ مگر ذوق اور ظفر نے محاورہ بندی کا خاص شیوہ اختیار کیا ہے۔ اُن کی شاعری کا مقصد بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ عام بول چال اور محاورات کو روشناس کریں۔ اس بنا پر اُن کے کلام میں جس قدر محاورے اور ضرب المثلیں پائی جاتی ہیں اتنی کسی شاعر کے کلام میں نہیں۔ لغت نویس اُنہیں کے کلام سے ان چیزوں کی سند پیش کرتے ہیں۔ مگر ذوق کے شاگرد داغ نے آخر زمانے میں محاورہ بندی کو اپنی شاعری کا مقصد نہیں رکھا تھا۔ وہ قدیم شاعر جرأت کی طرح واردات معاملہ کو سیدھی سادھی عام بول چال میں روانی کے ساتھہ ادا کرنا پسند کرتے تھے۔ اُن کے کلام میں بجائے محاورات کے روزمرہ کا استعمال زیادہ ہے۔ مومن خاں عام بول چال اور محاورات کی پروا نہیں کرتے تھے۔ اُن کے کلام میں محذوفات زیادہ ہیں۔ وہ آدھی بات زبان سے نکالتے ہیں اور آدھی دل میں رکھتے ہیں۔ اس لیے اُن کا کلام سمجھنے میں اکثر لوگوں کو دقت پیش آتی ہے۔ اُن کے اس خاص انداز کی پیروی کسی سے نہ ہو سکی اگرچہ کوشش بہت لوگوں نے کی۔ غالب بھی زبان کے عام محاورات کی پروا نہیں کرتے۔ وہ خیال کو مقدم سمجھتے ہیں اور اس کے لیے زبان خود تیار کرتے ہیں۔ عام بول چال کا لباس اپنے خیال کو پہنانا نہیں چاہتے۔ ان کے قدیم انداز میں فارسیت غالب ہے اور خیال بند شاعروں کی ترکیبیں بار بار آتی ہیں۔ اضافتوں کی بھرمار ہے۔ مگر جب وہ اس طرز کو ترک کرتے ہیں اور صاف بیانی پر آمادہ ہوتے ہیں تو پھر بھی ذوق کی طرح محاورہ اور بول چال کو اپنی شاعری کا مقصد نہیں بناتے۔ اُن کا ہر خیال خود بخود ایک مناسب اور موزوں سانچے میں ڈھل جاتا ہے اور جو زبان اس

طرح پیدا ہوتی ہے وہ عام لوگوں کی بول چال سے جداگانہ نظر آتی ہے۔ غالب کے بعد حالی بھی عام بول چال اور محاورات کے پھندے میں گرفتار نہیں ہوئے۔ ان کی شاعری کا محور بھی خاص خیالات کا اظہار ہے اور ان کے خیالات ایسی زبان اختیار کرتے ہیں جو عام بول چال سے ممتاز ہے۔ حالی مستقل نظمیں ترکیب بندوں ترجیع بندوں قطعوں اور مثنویوں کی شکل میں اکثر لکھتے ہیں اور ان کے ہاں برخلاف دیگر شعرا کے مسلسل غزلیں بھی ہیں۔ حالی کے بعد سب سے زیادہ شہرت اقبال کی ہوئی ہے۔ اقبال نے فارسی زبان کی تعلیم معقول حاصل کی ہے۔ اُن کی زبان پر فارسی ترکیبیں بہت چڑھی ہوئی ہیں۔ وہ اپنے خیالات کو زیادہ تر استعاروں اور تشبیہوں میں ادا کرتے ہیں۔ اُن کے کلام میں جو فارسی ترکیبیں بار بار آتی ہیں وہ نہایت دلکش اور موزوں ہیں۔ اردو زبان کی عام بول چال کی وہ بھی پروا نہیں کرتے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اُن کے خیالات کی دنیا نرالی ہے۔ وہ غالب کی طرح گہرے فلسفیانہ خیالات ادا کرنا چاہتے ہیں جن کے قد و قامت پر عام بول چال کا لباس ٹھیک نہیں اُترتا۔ ناواقف لوگ الزام لگاتے ہیں کہ اُن کو اُردو زبان نہیں آتی۔ غالب اور اقبال میں فرق یہ ہے کہ فارسی ترکیبیں غالب کے قدیم کلام میں جس قدر ہیں اس قدر اُن کے بعد کے کلام میں نہیں ہیں۔ مگر قدیم کلام میں فارسی ترکیبیں حد اعتدال سے زیادہ ہیں اور ان کی زیادتی کے سبب اُردو کلام بالکل فارسی ہوگیا ہے اور اس کے لیے ایک آدھ لفظ کی تبدیلی کی ضرورت ہوتی ہے۔ برخلاف اس کے اقبال کے کلام میں فارسی ترکیبیں اس قدر افراط

سے نہیں ہیں کہ ان کے کلام کو اردویت سے خارج کردیں - ان کا کلام بدستور اردو رہتا ہے اور وہ ترکیبیں بجاے خود نہایت خوشنما اور موزوں معلوم ہوتی ہیں - اضافتوں کی بھیڑ بھی غالب کے قدیم کلام میں جس قدر ہے اس قدر اقبال کے کلام میں نہیں ہے اس لیے بھی ان کا کلام اردویت کے دایرہ سے نہیں نکلا - غالب کے کلام اور اقبال کے کلام دونوں کو بالمقابل رکھہ کر اگر ان کی فارسی ترکیبیں چن لی جائیں تو اقبال کی فرہنگ غالب کی فرہنگ سے زیادہ سیر اور وسیع ہوگی - چنانچہ دونوں کے کلام سے اس قسم کی ترکیبیں چن لی گئی ہیں اور دونوں کی فرہنگیں تیار کرلی ہیں —

زمانۂ حال کے دیگر شعرا کے کلام میں جن کا کلام اخباروں اور رسالوں میں چھپتا رہتا ہے شکل و ساخت کے لحاظ سے کوئی خاص بات نہیں ہے - البتہ ایک شاعر آزاد انصاری ہیں جو مولانا حالی کے شاگردوں میں ہیں - ان کے کلام کا ایک خاص انداز ہے - وہ دو دو شعروں کا ایسا جوڑ رکھتے ہیں جس میں پہلے شعر کے پہلے مصرع کا قافیہ دوسرے شعر کے پہلے مصرع کے قافیہ سے ملتا ہے اور دوسرے مصرعوں کا قافیہ وہی ہوتا ہے جو غزل کی اصلی زمین کے مطابق ہے اور یہ ان کے کلام کا عام انداز ہے - یہاں مثال کے طور پر اُن کے چار شعر لکھے جاتے ہیں جن میں سے پہلے دو شعروں کا ایک جوڑ ہے اور دوسرے دو شعروں کا دوسرا جوڑ ہے - غزل کی عام زمین ہے بسمل دیکھتے جاؤ - مایل دیکھتے جاؤ —

وہ نظریں جو کبھی اک بیوفا سے لڑکے نازاں تھیں
اب ان کو اپنی بدبختی کا قایل دیکھتے جاؤ

وہ آنکھیں جو کبھی پروانۂ رخسار جاناں تھیں
اب اُن کو گریۂ حسرت میں شاغل دیکھتے جاؤ

وہ الفت جس کے استحکام پر دنیا کو حیرت تھی
اب اُس کو مثل رنگ خام زایل دیکھتے جاؤ

وہ بدبخت محبت جس کی فطرت ہی محبت تھی
اب اُس کو صبر کرلینے کے قابل دیکھتے جاؤ

بیک نظر معلوم ہوگا کہ علاوہ اس خاص انداز کے جس کا اشارہ کیا گیا ہے ان اشعار میں تشابہ ترکیب بھی ہے۔ یعنی پہلے شعر کے پہلے مصرع کی ترکیب دوسرے شعر کے پہلے مصرع کی ترکیب سے ملتی جلتی ہے۔ اسی طرح پہلے شعر کے دوسرے مصرع کی ترکیب دوسرے شعر کے دوسرے مصرع کی ترکیب سے مشابہ ہے۔ آزاد کا خاص انداز جو عام طور سے اُن کے کلام میں پایا جاتا ہے حالی سے ماخوذ ہے۔ یہ انداز حالی کے کلام میں کہیں کہیں ہے۔ آزاد نے اس انداز کو پسند کرکے اُس پر اپنے عام کلام کی بنیاد رکھی ہے۔ اسی طرح تشابہ ترکیب کا انداز غالب کے کلام میں کہیں کہیں پایا جاتا ہے —

انہیں سوال پہ زعم جنوں ہے کیوں لڑیے ہمیں جواب سے قطع نظر ہے کیا کہیے
حسد سزائے کمال سخن ہے کیا کیجے ستم بہائے متاع ہنر ہے کیا کہیے

تعقید سے کوئی شاعر نہیں بچا۔ یعنی لفظوں کو ہیر پھیر کر نظم میں اس طرح رکھنا کہ عام بول چال کی ترکیب سے اُس کی ترکیب مختلف

ہوجاے ۔ مگر آزاد انصاری حقوق الوسع تعقید سے بڑی بچتے ہیں اور اکثر ایسی طرحیں اپنے لیے تجویز کرتے ہیں جن میں تعقید کی ضرورت نہ پڑے ۔ مشاعروں میں جو طرحیں اُن کے منشا کے مطابق نہیں ہوتیں اُن پر طبع آزمائی نہیں کرتے ۔ ان قیود کے اختیار کرنے سے آزاد کا کلام بہت مقبول ہوا ہے ۔ مگر افسوس یہ ہے کہ خیال کو اُنھوں نے اپنی شاعری میں مقدم نہیں رکھا ۔ اس بنا پر ان کا اکثر کلام لفظوں کا کھلونا ہے ۔ شکل و ترکیب اُن کے کلام کی عام شعرا کے کلام کی شکل و ترکیب سے بے شک جدا گانہ ہے ۔ مگر خیال کی گہرائی اور بلندی کا پتہ نہیں ہے ۔ زمانۂ حال کے دیگر شعرا میں شکل و ترکیب کے لحاظ سے بڑی دوئی ندرت نہیں ہے ۔ البتہ بعض شعرا ایسے ہیں جنھوں نے اپنے ہر خیال کو استعاروں اور تشبیہوں کے سانچوں میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے ۔ مگر اُن کے لیے ضروری ہے کہ وہ اگر کلام کی شکل و ترکیب پر استعارہ و تشبیہ کا ملمع چڑھانا چاہتے ہیں تو خیال میں بھی بلند پروازی دکھائیں ۔ ورنہ اُن کا کلام زندہ نہیں رہ سکتا ـــ

اگر آپ مثال کے طور پر شعر کا اندرونی مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ سودا مدح و قدح کا استاد ہے ۔ اُس کے قصاید اس مضمون کے لحاظ سے اس قدر بلندی پر واقع ہوے ہیں کہ اُردو کا کوئی شاعر اُس کا مقابلہ نہیں کرسکتا ۔ ذوق نے آخر زمانے میں قصاید لکھنے میں ضرور شہرت حاصل کی ۔ مگر سودا سے اُس کا مقابلہ نہیں ہوسکتا ۔ قصاید کی تمہیدیں اُن کا اہم جز ہیں ۔ انھیں تمہیدوں میں قصیدہ گو شاعر اپنا کمال دکھاتے ہیں ۔ چونکہ قصیدوں میں خارجی شاعری اور داخلی شاعری دونوں ہوسکتی ہیں اس لیے یا تو ان میں سوسائٹی کے حالات کا مرقع کھینچ کر

دکھایا جاتا ہے - یا حکیمانہ خیالات بیان کیے جاتے ہیں - ذوق کے ایک
آدھ قصیدہ کے سوا کسی قصیدہ کی تمہید میں حکیمانہ خیالات کا اظہار
نہیں ہوا - مگر سودا کے قصاید میں یہ عنصر زبان ہے - اس کے قصاید
کی اکثر تمہیدیں ان بلند خیالات سے لبریز ہیں - ذوق کو خارجی شاعری
کی ہوا بھی نہیں لگی - برخلاف اس کے سودا نے اپنے قصاید میں متعدد موقعوں پر
خارجی شاعری کا کمال دکھایا ہے - میر سب سے زیادہ ممتاز شاعر ہے جس نے اپنی
شاعری میں اپنے اندرونی اور قلبی واردات کی سچی تصویریں کھینچی ہیں - اس
باب میں کوئی شاعر اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا - اسی سبب سے غزل جو داخلی
شاعری کے لیے موزوں سانچہ ہے اس میں آج تک اس شاعر کا جواب پیدا
نہیں ہوا - میر حسن نے مثنوی میں اور ان کے پوتے انیس نے مرثیہ میں
خارجی اور داخلی شاعری کے ایسے کمال دکھاے ہیں کہ ان دونوں قسم کی
شاعریوں کا اُن پر خاتمہ ہوگیا - غزل گو شعرا میں آتش خود داری اور
فقیر منشی کے خیالات اپنے کلام میں زیادہ تر ادا کرتا ہے - ناسخ روکھے
پھیکے انداز میں اخلاقی خیالات کو صایب کی مثالیہ شاعری کا لباس پہناتا
ہے - رند عاشقانہ جذبات کی جھلکیاں دکھاتا ہے - امیر نے آخر زندگی
میں عاشقانہ جذبات کی تصویر کھینچنی چاہی اور داغ کی تقلید میں اپنے
رستے سے ہٹ کر دوسرے رستے پر چلنا چاہا - مگر کامیاب نہ ہوے کیونکہ
یہ خیالات اُن کی زندگی اور سیرت کے خلاف تھے - امیر نہایت مقدس آدمی تھے -
اور جو کچھہ وہ داغ کی تقلید میں کہتے تھے اُن کی زبان پر زیب نہیں دیتا
تھا - ایک شخص نے اُن کے کلام میں سے جو آخری دیوان سے انتخاب کیا گیا ہے
ایسے اشعار کثرت سے چنے ہیں جن میں معشوقوں کی چھاتیوں کا ذکر
ہے - ان اشعار میں جو شوخ اشارات ہیں وہ بازاری لوگوں کی زبان سے

البتہ موزوں معلوم ہوتے ہیں - امیر کے چہرہ پر مطلق نہیں کھلتے - اُن کے شاگردوں سے ریاض نے خاص شہرت رندانہ خیالات میں حاصل کی ہے اور اس کے اشعار اکثر لوگوں کی زبان پر ہیں - ریاض کی زندگی میں لا اُبالی پن ہے - وہ امیر کی طرح مقدس زندگی نہیں رکھتا اس لیے جو رندانہ جذبات اُس نے ظاہر کیے ہیں وہ اُس کی زندگی سے الگ بھگ ہیں - جرأت کے کلام میں معاملہ بندی ہے اور اس صنف سخن میں اس کو خاص شہرت ہوئی ہے - نظیر اکبر آبادی نے عام لوگوں کے میلوں ٹھیلوں اور ان کے حالات و خیالات اور مشاغل زندگی کی ایسی سچی اور صحیح تصویریں کھینچی ہیں کہ کوئی شاعر اس کا مقابلہ اس باب میں نہیں کر سکتا - عام شعرا نے اس کی زبان کو تسلیم نہیں کیا - مگر یہ اُن کی غلطی ہے - کیونکہ جب وہ عوام کی زندگی کا نقشہ کھینچنا چاہتا ہے تو بجز اس کے کوئی چارہ نہیں کہ وہ انہیں کی زبان اور انہیں کی بول چال اختیار کرے - اگر کبھی ہمارے تنقید نگاروں کی آنکھیں کھلیں تو اس شاعر پر اس قدر تبصرے لکھے جائیں گے جتنے کہ انگریزی زبان کے مشہور شاعر و ڈراما نویس شکسپیر پر لکھے گئے ہیں - ڈاکٹر فالن نے نظیر کو ایشیا کا شکسپیر بتایا ہے اور اس صداقت میں شک کرنے کی مجال نہیں —

دلی کے شعرا میں درد اور مظہر صوفیانہ خیالات اور مومن خاں رقابت اور رشک کا مضمون خاص طور سے ادا کرتے ہیں - ذوق اور نصیر کا کوئی خاص مضمون نہیں جس کو انہوں نے اپنے کلام کا محور بنایا ہو - غالب بھی رشک کا مضمون مومن کے طرح اکثر جگہ ادا کرتے ہیں - مگر زیادہ تر ان کا وہ کلام مقبول ہوا ہے جس میں اُنہوں نے اپنے بلند خیالات خود

داری اور جذبی آزادی کے ادا کیے ہیں اور ان کو فلسفیانہ لباس پہنایا ہے۔ داغ معاملہ بندی کا استاد ہے - وہ روزمرہ کے پیرایے میں عاشقانہ واردات کو اس خوبی سے ادا کرتا ہے کہ اُس کی تعریف نہیں ہوسکتی ہے۔ اس کا اکثر کلام لوگوں کی زبانوں پر ہے اور اس کی قبولیت کا گر یہی ہے کہ اُس نے اس خاص صنف میں جو کچھہ کہا ہے وہ اُس کی اصلی زندگی کا پرتو ہے اور وہ اس کے دلی جذبات ہیں جو عام زبان کا سانچہ اختیار کر کے لوگوں کے سامنے پیش ہوے ہیں۔ حالی مصلحانہ دماغ رکھتے ہیں۔ اُن کی طبیعت حساس ہے۔ وہ اپنی قوم کی موجودہ تباہی کا خاص اثر اپنے دل میں محسوس کرتے ہیں۔ وہ جب قوم کی ذلت اور نکبت کا کوئی واقعہ سنتے ہیں تو بیتاب ہوتے ہیں اور جس طرح آنسو آنکھوں سے بے اختیار ٹپکتے ہیں اسی طرح درد آلود الفاظ اُن کی زبان سے بے اختیار نکلتے ہیں۔ اُنھوں نے تمام عمر اپنی قوم کا دکھڑا رویا اور اس درد ناک لے میں اس راگ کو بار بار گایا کہ اُن کی آواز نے تمام قوم کو تڑپا دیا اور افراد قوم میں عام طور سے کہرام برپا کر دیا اور اُن کو اپنی زندگی کے بدلنے اور زمانہ کے مطابق اپنے تئیں لئے سانچے میں ڈھالنے پر مجبور کر دیا - حالی کی مثال ترکی شاعر نامق کمال کی ہے جس نے اُنہیں کی طرح اپنی قوم کو ترکوں کا گذشتہ عروج اور موجودہ تنزل دکھا کر زندہ رہنے اور بیدار ہونے پر کمربستہ کر دیا۔ اب تک جو ترکی قوم با وجود صدیوں کی کشمکش اور مصیبت کے اپنے پاؤں پر کھڑی ہے یہ اسی شاعر کی شاعری کا پرتو ہے۔ ہماری قوم میں بھی ہندوستان کے اس سرے سے اس سرے تک خیالات کا جو تلاطم برپا ہے وہ حالی کے زندہ کن کلام کا فیض ہے -

نامق کمال نے ترکی شاعری میں انقلاب پیدا کر دیا تھا پہلے ترکی شعرا یا تو عاشقانہ جذبات ادا کیا کرتے تھے یا تصوت کے رنگ میں غرق تھے۔ اس شاعر کے بعد یکایک ترکی شعرا بیدار ہوے۔ انھوں نے بھی نامق کمال کی طرح قومیت کی روح پھونکنے کی کوشش شروع کردی۔ یہی حال حالی کا ہے۔ اُن کے کلام نے بھی اردو شاعری میں نئی زندگی پیدا کردی۔ سیکڑوں چھوٹے موٹے شاعر انہیں کے نغموں کو دھرانے لگے۔ مگر ان شعرا میں سے صرف دو شاعروں نے اپنے زندہ رھنے کا سامان مہیا کیا۔ باقی کسی شاعر کے کلام میں زندہ رھنے کی قابلیت نہیں تھی۔ ان دو شاعروں میں ایک تو اکبر الہ آبادی ھیں جنھوں نے قوم کی زندگی پر ظریفانہ انداز میں تنقید کی۔ دوسرے اقبال ھیں جنھوں نے فلسفیانہ انداز اختیار کیا اور اس پیرایہ میں قوم کو بیدار کرنے کا تہیہ کیا۔ چونکہ ان دونوں شاعروں کے انداز کلام مخصوص تھے اور حالی سے جداگانہ تھے اس لیے ان کے کلام کو مقبولیت حاصل ھوئی۔ ان نامور شعرا کی شاعری کبھی مر نہیں سکتی۔ ان میں سے اکبر کا کلام اس سبب سے کہ ظریفانہ انداز میں ھے اس نے عام و خاص سب کے دلوں کو گھیر لیا ھے۔ مگر اقبال کا کلام خاص تعلیم یافتہ لوگوں کی زبان پر ھے کیونکہ وہ فلسفیانہ پر مغز خیالات ھیں اور عام لوگوں کی پرواز خیال ان کے بلند افکار تک نہیں پہنچ سکتی۔ دوسری وجہ یہ بھی ھے کہ اکبر نے عام بول چال میں اپنے خیالات ادا کیے ھیں اور اقبال نے ایسی زبان میں شاعری کی ھے جو فارسی نما ھے اور جس سے عوام آشنا نہیں۔ اقبال نے اب اب اردو کو چھوڑ کر فارسی زبان ھی میں شاعری شروع کردی ھے تاکہ ھندوستان کے علاوہ دیگر ملکوں کے مسلمان

بھی ان کے خیالات کو سمجھہ سکیں اور اس سے متاثر ہو سکیں۔ ہندوستان کے فارسی داں مسلمان ان کے اس کلام کو سمجھتے ہیں۔ عام مسلمان جو فارسی نہیں جانتے ان کی سمجھہ سے یہ کلام باہر ہے۔ مگر افغانستان اور ایران کے لوگ عام طور سے اس کلام سے اثر پذیر ہو سکتے ہیں اور ترک اور تاتاری بھی ان کے کلام کے صحیح مخاطب ہو سکتے ہیں۔ اقبال کا فارسی انداز بیان اختیار کرنا اردو زبان کے لیے سراسر بد قسمتی ہے۔ مگر وہ اپنی مصلحت کو خود ہی بہتر جانتے ہیں —

خاص خاص شعرا کے کلام کی اندرونی خصوصیات کے علاوہ اگر لکھنؤ اور دہلی کے شعرا کا کلام مجموعی طور پر اٹھاکر دیکھو تو ان دونوں مقامات کی شاعری میں ایک خاص امتیاز نظر آتا ہے۔ لکھنؤ کے شعرا زیادہ تر خارجی مضامین غزل میں باندھتے رہے ہیں اور دہلی کے شعرا عام طور پر داخلی مضامین کی طرف متوجہ رہے ہیں۔ اس وقت نہ دہلی میں کوئی بڑا شاعر ہے۔ نہ لکھنؤ میں۔ ابھی چند روز ہوے ہیں کہ داغ کی دہلی میں اور امیر مینائی کی لکھنؤ میں شہرت تھی۔ ان دونوں کے روپوش ہونے کے بعد لکھنؤ میں صفی اور عزیز اور دہلی میں بیخود اور سایل رہ گئے ہیں اور یہ چاروں شاعر داغ اور امیر کے درجے پر نہیں ہیں سایل اور بیخود دونوں داغ کے انداز میں شاعری کرتے ہیں۔ مگر عزیز اور صفی نے لکھنؤ کے دبستان شاعری کو بالاے طاق رکھدیا ہے۔ لکھنؤ میں جو رعایت لفظی اور صنعت پرستی کا زور تھا اس کو ان شاعروں نے ترک کر دیا ہے۔ لکھنؤ کی شاعری میں جو پہلے خارجی مضامین کی بھر مار ہے اس سے بھی ان شعرا نے توبہ کرلی ہے۔ یہ دونوں شاعر اب غالب کے دبستان میں داخل ہو گئے۔

میں جب لکھنؤ میں مسلم گزٹ کی اڈیٹری کر رھا تھا تو لکھنؤ کے مشاعروں میں شریک ھونے کا اکثر اتفاق ھوتا تھا۔ میں اسی بات کو دیکھ کر حیران رہ گیا تھا کہ وھاں عام طور پر تمام شعرا غالب کی پیروی کر رھے تھے اور اپنے تئیں اسی کے دبستان کا متعلم بتاتے تھے۔ تا ھم دھلی کے شعرا کے مقابلہ میں ایک خصوصیت لکھنؤ کے شعر میں موجود تھی اور وہ یہ کہ موت، نزع کی حالت، جنازہ اور قبر کے متعلق مضامین ان کی غزلوں میں عام طور سے آتے تھے اور اب بھی یہ خصوصیت لکھنؤ کے شعرا کے کلام میں پائی جاتی ھے۔ اس کا اثر عام طور سے اودھ اور یوپی کے شعرا پر پڑا ھے۔ ان سب کے کلام میں بھی یہ مضامین خاص طور سے باندھے جاتے ھیں۔ کوئی شاعر ایسا نہیں جس کی ھر غزل میں دو تین شعر اس رنگ کے نہ ھوں۔ مشاعروں میں جب کوئی شاعر اپنا کلام پڑھتا ھے تو سب کی نظریں اس طرف لگی رھتی ھیں کہ کب کوئی شعر اس رنگ کا اس کے کلام میں آتا ھے اور جب ایسا شعر سنائی دیتا ھے تو شور و تحسین بلند ھوتا ھے۔ اس کی وجہ بجز اس کے اور کچھہ نہیں ھے کہ لکھنؤ میں مرثیہ کی شاعری کو عروج ھوا۔ دھلی کے شعرا کو اس صنف شاعری سے کوئی تعلق نہیں رھا۔ لکھنؤ میں اب مرثیہ کی شاعری کا زور گھٹ گیا ھے اور کوئی باکمال شاعر اب وھاں ایسا نہیں ھے جس نے اس صنف میں نام پیدا کیا ھو۔ حالانکہ وھاں کی پبلک اب بھی اُنھیں دردناک خیالات کے سننے کی طالب ھے۔ اسی طبعی خواھش کا اقتضا ھے کہ وھاں کے موجودہ شعرا نے غزل میں نزع اور موت کا دردناک منظر دکھانے کی کوشش کی ھے۔ مثال کے طور پر میں یہاں لکھنؤ کے زندہ شاعر عزیز کے کلام کا اقتباس پیش کرتا ھوں:

نزع میں پھرتی ہوئی آنکھوں کو
ترا افسون نظر یاد آ گیا

ستم ہے لاش پر اُس بے وفا کا یہ کہنا
کہ آنے کا بھی کسی کے نہ انتظار کیا

کسی نے نزع کی یوں گتھیوں کو سلجھایا
سرھانے بیٹھ کے ہر سانس کا شمار کیا

اب تک ہیں یاد روح کو آثار نزع کے
ماتھے پر اک شکن تھی کلیجے میں درد تھا

آ کے دیکھے نزع میں کھنچتے جو میرے ھاتھ پاؤں
اُن رو شوخی ایک انگڑائی سی لے کر رہ گیا

مری میت پہ کس دعوے سے وہ کہتے ہوے آے
ھٹا دینا ذرا ان رونے والوں کو ھٹا دینا

یہ کہہ کر قبر پر پھر یاد اپنی کر گئے تازہ
ارے اے مرنے والے اب مجھے دل سے بھلا دینا

ھجوم عام ہے بالیں پہ سب غمخوار بیٹھے ہیں
وہ خود جب سے قریب بستر بیمار بیٹھے ہیں

ہر اک ھچکی میں کیوں کر کُھل رہے ہیں موت کے عقدے
فقط وہ دیکھنے یہ حالت بیمار بیٹھے ہیں

اُس کی شام غم پہ صدقے ہو مری صبح حیات
جس کے ماتم میں تری زلفیں پریشاں ہو گئیں

نہ پوچھو دم کے رکنے کا سبب تم نزع میں مجھ سے
کہا ہو زندگی بھر ضبط جس نے رائگاں کیوں ہو

دم آخر مریض غم کے بالیں تک چلے آو
کسی کی عمر بھر کی جانفشانی رائگاں کیوں ہو

کھڑے بالیں پہ وہ ہنستے ہیں اپنا دم نکلتا ہے
برے وقت اے فلک کوئی کسی کا کم نکلتا ہے

شب غم نزع کی بڑی سختیوں کا کرلیں اندازہ
نکل اے آہ یوں سینے سے جیسے دم نکلتا ہے

وداع دل ہجوم آرزو میں کیا کہوں تجھ سے
بھرے گھر سے جنازہ جیسے اے ہمدم نکلتا ہے

وہ وقت آیا کہ اب سینے میں ہر دم ہوک اٹھتی ہے
نفس کہتے ہیں جس کو وہ بہت ہی کم نکلتا ہے

بنا ہے مرکز تاثیر غم بیمار کا چہرہ
یہ عالم ہے کہ منہ پھیرے ہوئے عالم نکلتا ہے

ہماری بیکسی کی موت تھی عبرت کا افسانہ
جسے دیکھو شریک مجلس ماتم نکلتا ہے

رگیں کھنچنے سے جذب عشق کا اندازہ کرتے ہیں
وہ کیا جانیں ابھی کن مشکلوں سے دم نکلتا ہے

دیکھیوں تو جذب حسرت دیدار وقت نزع
اے روح یوں نکل کہ تماشا کہیں جسے

کیا کہوں کیا نہ کہوں ہستی موہوم کا راز
نزع میں پوچھتے ہیں کیا ہے حقیقت تیری

نزع میں پرتو رخ تال کہ روشن ہو نگاہ
اب دکھائی نہیں دیتی مجھے صورت تیری

جب کفن لائے ھیں بیمار محبت کے لیے
صبح اُس وقت ھوئی ہے شب فرقت تیری

دم اُکھڑتا ہے کسی کا اور وہ بیٹھے ھیں خموش
دیکھ لے یہ منظر عبرت کسے اب ھوش ھے

آئیے نزع کا ھنگام ھے اب
مشورہ آپ سے کچھہ کرنا ھے

بالیں پہ میرے کہہ کے کسی نے یہ کھولے بال
دیکھیں تو امتیاز اسے شام و سحر میں ھے

گھبرائیے نہ ختم ھے بیمار شام عمر
بس تھوڑی دیر اور طلوع سحر میں ھے

کہتی ھے روح نزع میں رستہ دکھا چکے
جاتے ھیں ھم خود آپ وھاں وہ تو آچکے

یہ وصیت آخری ھے اسے سن لیں سب احبا
کوئی دل کا ذکر کرتا نہ سر مزار آے

رگیں کھنچنے لگیں اب نزع کا ھنگام آتا ھے
وہ جائیں ورنہ ان کے سر پہ سب الزام آتا ھے

یہ سناٹا یہ تاریکی یہ گورستاں یہ ویرانی
تمھیں اے سونیوالو کس طرح آرام آتا ھے

یہ کیا تھا یوں تو وہ دیکھا کیے دم توڑنا میرا
مگر انگڑائی لی اک روح نکلی جب مرے دل سے

کہتے ھیں وقت نزع وہ بیمار ھجر سے
ختم اک نفس میں شرح تمنا کرے کوئی

میت بیمار هجراں دیکھنے سے فائدہ
نقش کچھہ دھندلے سے هیں بگڑی هوئی تصویر کے

دیکھیے تو چہرۂ بیمار سر کا کر کفن
آج هیں دشمن بھی شاکی آپ کی تاخیر کے

نزع میں کس کو بھلا تاب شکیبائی هے
جب وہ آئے هیں تو کچھہ جان میں جان آئی هے

تھی صبح اور ستارے کچھہ جھلملا رهے تھے
بیمار شام فرقت دنیا سے جا رهے تھے

دم توڑتا نہیں کوئی بیمار اس طرح
شاید شریک موت کسی کی ادا بھی هے

هستی کے رخ کو پھیر دیا روزگار نے
کروٹ جو لی مریض شب انتظار نے

انگڑائی لے کے کس نے یہ چٹکائیں انگلیاں
دو هچکیوں میں ختم جو بیمار هو گئے

یہ کہہ کر سرهانے مرے آ کے بیٹھے
هٹو چارہ سازو کہ اب وقت کم هے

اگر کہیں وہ دم واپسیں چلے آتے
هم ایک سانس میں تفصیل آرزو کرتے

کہتی هے روح آئی هیں جتنی کہ هچکیاں
اتنی هی میں نے ٹھوکریں کھائی هیں راہ کی

غرض کہ آج کل لکھنؤ کا هر شاعر اور موجودہ دبستان لکھنؤ کا هر پیرو اس بات کی کوشش کرتا هے کہ غزل میں بجائے خارجی مضامین کے

جن کا لانا زمانۂ سابق میں ضروری تھا داخلی مضامین داخل کرے۔ مگر اس کے ساتھ ھی نزع، موت، جنازہ اور قبر وغیرہ کے متعلق خیالات بھی ضرور لائے۔ دھلی کے شعرا نے اپنے کلام میں اس قسم کا کوئی التزام نہیں رکھا —

لکھنؤ میں مرثیہ کی شاعری کو زوال آچکا ھے۔ اگرچہ موجودہ مرثیہ گو شاعر صبح کا منظر، گرمی کا سماں، اندھیری رات کی کیفیت، گھوڑے اور تلوار کے متعلق مبالغے، مدینہ سے کوچ کرنے کا عالم، رستے کی تکلیفیں، رفقائے امام کی جاں نثاریاں، فریق مخالف کی ستمگاریاں، اھل بیت کا عزیزوں کی موت پر بین وغیرہ مضامین اب بھی اپنے مرثیوں میں بیان کرتے ھیں؛ مگر حقیقت یہ ھے کہ یہ تمام مضامین انیس اور ان کے دیگر معاصر شعرا کمال کے درجے کو پہنچا چکے ھیں۔ اب کوئی گوشہ ان مضامین میں باقی نہیں رھا۔ اس بنا پر آج کل کے زندہ مرثیہ گویوں نے اپنے لیے ساقی نامہ کا ایک نیا کھانچہ پیدا کیا ھے اور ان میں سے ھر ایک اس بات کی کوشش کرتا ھے کہ ساقی نامہ میں اپنا کمال دکھائے۔ مگر یہ مضمون بھی چند روزہ ھے۔ مثال کے طور پر یہاں ساقی نامہ کا ایک بند جو عارف کے مرثیہ سے لیا گیا ھے پیش کیا جاتا ھے —

ھاں ساقی مہرو کوئی جام آج پلا پھر
میں جس کا ھوں مشتاق وہ مے شیشے سے لا پھر
وہ آئینۂ طبع مصفا کو جلا پھر
ھونٹوں سے چھلکتے ھوے ساغر کو ملا پھر

لکھتا ہوں وغا ساقی کوثر کے حلف کی
چھوٹتی بھی اگر ہے ہو تو رندان نجف کی

شعر کہنے کے وقت اردو شاعر کی نفسیات کیا ہوتی ہے اس پر توجہ کرنے سے پہلے یہ امر واضح ہونا چاہئے کہ یورپ کی شاعری کا اقتضا اور ہے اور ہماری شاعری کا اقتضا اور۔ یورپ میں شاعر کے نزدیک خیال قافیہ پر مقدم ہے۔ برخلاف اس کے ہمارے ہاں قافیہ خیال پر مقدم ہے۔ اس اختلاف کے سبب یورپ کے شاعر اور ہمارے شاعر کی نفسیات میں بڑا اختلاف ہوگیا ہے۔ یورپ کی قدیم زبانیں یونانی اور لاطینی بہت وسیع تھیں اور ان میں قافیے کے الفاظ کثرت سے مل سکتے تھے۔ تاہم انہوں نے ادائے خیال میں رکاوٹ پیدا ہونے کے لحاظ سے نظم عاری کو رواج دیا تھا۔ یورپ کی موجودہ زبانوں میں سے جرمنی' فرنچ اور انگریزی بھی وسیع ہیں اور ان میں بھی قافیے کے الفاظ بہت موجود ہیں۔ تاہم وہ بھی نظم عاری لکھہ جاتے ہیں۔ لمبی نظمیں اکثر اسی رنگ میں ہیں۔ وسیع زبانوں میں قافیے کے الفاظ بکثرت ملنے سے خیال کے ادا کرنے میں بہت کم دشواری پیش آ سکتی ہے۔ تاہم مسلسل اور طویل خیالات میں ایک گونہ رکاوٹ پیدا ہوتی ہے اور قافیے بہ تکلف لانے پڑتے ہیں۔ اس بنا پر باکمال شعرا نے ادائے خیال کو مقدم سمجھہ کر ضرورت کے وقت اس رکاوٹ کو دور کر دیا ہے۔ عربی زبان میں بھی الفاظ کی کثرت ہے اور قافیے کثرت سے ملتے ہیں۔ یہاں تک کہ لغت نویسوں نے لغت کی ترتیب میں جہاں ابتدائی حروف کا خیال رکھا ہے وہاں آخری حروف کا بھی لحاظ

کیا ھے اور دنیا کی تمام ڈکشنریوں کے برخلاف عربی کی ڈکشنریوں میں آخر کا حرف باب بنایا گیا ھے اور ابتدائی حرف کو بطور فصل کے رکھا ھے - عربی کی لغت کو بہ یک نظر دیکھنے سے پتہ چل جاتا ھے کہ ان کی زبان میں شاعری کرنا کس قدر آسان ھے - جو قافیہ آپ اختیار کریں اُس کے ھموزن الفاظ آپ کو آسانی سے بہت سے مل جائیں گے - ایام جاھلیت کی شاعری عام طور پر قصاید کی شکل میں ھے - ھر قصیدہ میں ایک قافیہ اول سے آخر تک ھے اور ادائے خیال میں جو روانی ان شعرا کے کلام میں ھے اس سے یہ نتیجہ صاف طور پر نکلتا ھے کہ ھر خیال کے ادا کرنے کے وقت مناسب قافیہ شاعر کے ذھن میں آسانی سے آجاتا ھے —

فارسی زبان میں الفاظ اس کثرت سے نہیں ھیں کہ مناسب قافیے آسانی سے ھر خیال کے ادا کرنے کے وقت مل جائیں - یہ زبان بذات خود وسیع نہیں ھے - جب سے عربی زبان نے اس زبان پر اثر ڈالا ھے اُس میں الفاظ کی تعداد بڑھ گئی ھے - تاھم جس کثرت سے عربی زبان میں ھموزن الفاظ مل جاتے ھیں اُس کثرت سے اس زبان میں نہیں ملتے - یہی وجہ ھے کہ جس طرح اہل یورپ نے لمبی داستانوں کے لیے نظم عاری کا طریقہ اختیار کیا ھے اہل ایران نے ایسی داستانوں کو مثنوی کی شکل میں ادا کیا ھے - مثنوی میں ھر شعر کے لیے صرف دو قافیے تلاش کرنے پڑتے ھیں - جو اکثر آسانی سے مل جاتے ھیں —

ھندوستان کی قدیم شاعری میں بھی لمبی داستانوں کے لیے یہی شکل اختیار کی گئی ھے - قصیدہ کی شکل میں ایسے طویل واقعات ادا نہیں ھوسکتے کیونکہ اس کی بنیاد ایک قافیہ پر ھوتی ھے اور اگرچہ عربی

زبان میں هموزن الفاظ کثرت سے مل جاتے هیں تاهم یه بات ممکن نہیں ہے که ایک قافیے پر ساری داستان کی بنیاد رکھی جائے ۔ یہی سبب ہے که عربی زبان میں ابھی منظوم داستانیں نہیں ملتیں ۔ مثنوی کی شکل ایرانیوں نے اختیار کی ہے ۔ عربی میں مثنویاں نہیں لکھی گئیں ۔ اگر عربی زبان میں مثنوی کی شکل اختیار کی جاتی یا نظم عاری کا طریقه چل پڑتا تو پھر اس زبان میں بھی ایلیڈ اور شاهنامه جیسی منظوم داستانیں مل سکتی تھیں ۔ عرب کی عشقیه طویل شاعری بھی قصیدہ کی شکل میں ہے ۔ اگر ایرانی بھی اس قسم کی شاعری قصیدہ کی شکل میں کرتے اور تمام نظم کی بنیاد ایک قافیے پر رکھتے تو کام چل سکتا تھا ۔ مگر افسوس ہے که اُنھوں نے قافیه کے ساتھ ردیف کا دم چھلا لگا دیا ۔ چونکه غزلیں اکثر گانے کے کام میں آتی هیں اس بنا پر ایرانیوں نے خیال کیا که قافیه کے ساتھ ردیف کا التزام نظم میں زیادہ موسیقیت پیدا کرے گا اور ردیف اور قافیه هر شعر میں آکر سننے والوں کے کانوں میں زیادہ متوازن معلوم هوں گے ۔ یه لے یہاں تک بڑھی که بغیر ردیف کی غزلیں پسند نہیں آتی تھیں ۔ اگر فارسی زبان کے دیوان اُٹھا کر دیکھو تو ایسی غزلیں بہت کم ملیں گی جن میں قافیه هی قافیه هو اور ردیف نه هو ۔ یہی باعث ہے که عشقیه خیالات کا مسلسل طور سے بیان کرنا غزل کی شکل میں مشکل هوگیا ۔ قافیه اور ردیف ادائے خیال پر مقدم هوگئے ۔ ایک شعر کا مضمون دوسرے شعر کے مضمون سے جداگانه هونے لگا ۔ یعنی ایک شعر سے دوسرے شعر کو کوئی تعلق نہیں رہا ۔ اگر ایک شعر میں معشوق کی جدائی کی شکایت ہے تو دوسرے شعر میں وصال حاصل هونے پر خوشی

کا اظہار ہے۔ اگر ایک شعر میں دنیا کی مذمت بیان کی گئی ہے تو دوسرے شعر میں اس کی تعریف ہے۔ نظم کی یہ ایسی عجیب شکل ہے کہ دنیا کی کسی زبان میں اس کی مثال نہیں ملے گی۔ اس سے تمام شعرا مجبور ہوگئے کہ مسلسل غزلیں نہ لکھیں۔ فارسی شعرا کے دیوانوں میں مسلسل غزلیں اس قدر کم ملتی ہیں کہ اُن کا عدم وجود برابر ہے۔ ایران کی شاعری اسی حالت میں تھی کہ وہ ہندوستان میں پہنچی۔ اول یہاں کے شعرا نے خود فارسی زبان میں اسی طریقہ کی غزلیں لکھنی شروع کیں۔ پھر جب اُردو میں شاعری کا آغاز ہوا تو اسی طریقہ کی نقل اس زبان میں بھی کی گئی۔ اب تک غزل کا یہی طریقہ ہمارے ملک میں جاری ہے۔ اسی طریقہ کے سبب ہمارے شعرا جب غزل لکھنے بیٹھتے ہیں تو پہلے اس غزل کے لیے بہت سے قافیے جمع کرکے ایک جگہ لکھ لیتے ہیں پھر ایک قافیہ کو پکڑ کر اس پر شعر تیار کرنا چاہتے ہیں۔ یہ قافیہ جس خیال کے ادا کرنے پر مجبور کرتا ہے اُسی خیال کو ادا کر دیتے ہیں۔ پھر دوسرے قافیہ کو لیتے ہیں۔ یہ دوسرا قافیہ بھی جس خیال کے ادا کرنے کا تقاضا کرتا ہے اُسی خیال کو ظاہر کرتے ہیں گو کہ یہ خیال پہلے خیال کے برخلاف ہو۔ اگر ہماری غزل کے مضامین کا ترجمہ دنیا کی کسی ترقی یافتہ زبان میں کیا جائے جس میں غیر مسلسل نظم کا پتہ نہیں ہے تو اُس زبان کے بولنے والے نودس شعر کی غزل میں ہمارے شاعر کے اس اختلاف خیال کو دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں۔ ان کو اس بات پر اور بھی تعجب ہوتا ہے کہ ایک شعر میں جو مضمون ادا کیا گیا ہے اُس کے ٹھیک برخلاف دوسرے شعر کا مضمون ہے۔ کچھ پتہ نہیں چلتا کہ شاعر کا اصلی خیال کیا ہے۔ وہ پہلے خیال

کو مانتا ھے یا دوسرے خیال کو - اُس کی قلبی صدا پہلے شعر میں ھے یا دوسرے شعر میں - مولانا حالی نے اپنے دیوان کے دیباچہ میں خیالات شاعرانہ کے اس اختلاف و تناقض کا عذر کیا ھے - وہ لکھتے ھیں کہ "جس طرح ایک فلسفی یا مورخ کی تصنیف میں اختلاف پایا جانا اس تصنیف کو عیب لگاتا ھے اسی طرح شاعر کے کلام کو عیب نہیں لگاتا - بلکہ اس کا بیساختہ پن ظاھر کرتا ھے جس کو شاعری کا زیور سمجھنا چاھیے - فلسفی یا مورخ ھر ایک چیز پر اس کے تمام پہلو دیکھ کر ایک مستقل رائے قایم کرتا ھے اور اس لیے ضرور ھے کہ اس کا بیان جامع و مانع ھو - لیکن شاعر کا یہ کام نہیں ھے بلکہ اس کا کام یہ ھے کہ ھر ایک شے کا جو پہلو اُس کے سامنے آئے اور اس سے کوئی خاص کیفیت پیدا ھوکر اُس کے دل کو بے چین کردے اُس کو اُسی طرح بیان کرے - پھر جب دوسرا پہلو دیکھ کر دوسری کیفیت پیدا ھو جو پہلی کیفیت کے خلاف ھو اُس کو اُس دوسری کیفیت کے موافق بیان کرے - وہ کوئی فلسفہ یا تاریخ کی کتاب نہیں لکھتا تاکہ اس کو حقایق و واقعات کے ھر ایک پہلو پر نظر رکھنی پڑے - بلکہ جس طرح ایک فوٹو گرافر ایک ھی عمارت کا کبھی روکار کا کبھی پچھیت کا کبھی اِس ضلع کا اور کبھی اُس ضلع کا جدا جدا نقشہ اُتارتا ھے اسی طرح شاعر حقایق و واقعات کے ھر ایک پہلو کو جدا جدا رنگ میں بیان کرتا ھے - پس ممکن ھے کہ شاعر ایک ھی چیز کی کبھی تعریف کرے اور کبھی مذمت اور ممکن ھے کہ وہ ایک اچھی چیز کی مذمت کرے اور بری چیز کی تعریف کیونکہ خیر محض کے سوا ھر چیز میں شر کا پہلو اور شر محض کے سوا ھر شر میں خیر کا پہلو موجود ھے -

عقل، علم، زہد، دولت، عزت اور آبرو عموماً ممدوح و مقبول سمجھی جاتی ہیں۔ مگر شعرا نے اُن کی جابجا مذمت کی ہے۔ اسی طرح دیوانگی، نادانی، رندی، فقر، ذلت اور رسوائی عموماً مذموم و مردود گنی جاتی ہیں۔ لیکن شعرا اُن کے اکثر مداح رہتے ہیں، —

"شاعر ایک ہی چیز کی کبھی ایک حیثیت سے ترغیب دیتا ہے اور کبھی دوسری حیثیت سے اس سے نفرت دلاتا ہے۔ وہ کبھی قدما کے مقابلے میں اس لیے کہ وہ استاد اور موجد فن تھے اپنے تئیں ناچیز و بے حقیقت بتاتا ہے اور کبھی اس لیے کہ اُس نے اُن کی دولت میں کسی قدر اپنی کمائی بھی شامل کی ہے جو اُن کے پاس نہ تھی اپنے تئیں اُن پر ترجیح دیتا ہے۔ وہ کبھی دنیا کی اس لیے تحقیر کرتا ہے کہ وہ دارالغرور اور دارالمحن ہے اور کبھی اس کی بڑائی اور عظمت اس لیے بیان کرتا ہے کہ وہ مزرعۂ آخرت ہے۔ وہ ایک ہی گورنمنٹ کی کبھی اس کی خوبیوں کے سبب سے ستایش کرتا ہے اور کبھی اس کی ناگوار کارروائیوں کے سبب شکایت" —

شاعرانہ خیالات کے اختلات و تناقض کی اس توجیہہ کو جو مولانا حالی نے بیان کی ہے ہم صحیح خیال نہیں کرتے۔ یہ تو سچ ہے کہ شاعر کے سامنے ایک شے کا جو پہلو آے اور اس سے جو کیفیت اُس کے دل پر طاری ہو اُس کو ہو بہو بیان کرنا اس کا فرض ہے۔ مگر یہ کیونکر ہوسکتا ہے کہ اس کیفیت کے طاری ہونے سے پانچ منٹ بعد اُسی شے کا دوسرا پہلو اُس کے سامنے اس طرح آے کہ ایک متضاد و متناقض کیفیت پیدا کردے اور اُس کو مجبور کردے کہ وہ فوراً دوسرا متناقض خیال اُسی زور اور اُسی جوش سے بیان کرے جس زور اور جوش سے کہ

اس نے پہلے خیال کو بیان کیا تھا - فوٹو گرافر اپنے کیمرے کو چشم زدن میں ایک طرف سے دوسری طرف موڑ دیتا ہے- اور دوسری پلیٹ پر دوسرا عکس اتار لیتا ہے - مگر ذہن انسانی کی یہ کیفیت نہیں ہے- اس پر ایک واقعے کا عکس جو سامنے ہے پڑتا ہے اور اس سے ایک خاص کیفیت پیدا ہوتی ہے- یہ کیفیت اس انسان کو بیتاب کرتی ہے کہ وہ اس کے متعلق اپنے جذبہ کو بیان کرے- جب تک یہ کیفیت اس کے ذہن سے محو نہ ہو جائے اس کے بر خلاف دوسرے واقعے سے کوئی بے چین کر نے والی کیفیت اس کے ذہن میں پیدا نہیں ہو سکتی - ذہنی پلیٹ سے پہلے واقعے کا عکس یا تو مٹ جانا چاہئے - یا اس قدر دھندلا پڑ جانا چاہئے کہ گویا وہ کبھی محسوس ہی نہیں ہوا تھا - تب ممکن ہے کہ متضاد واقعہ اپنا عکس ڈال کر دوسری بیتابانہ کیفیت پیدا کر سکے - ایک ہی سانس میں دنیا کی مذمت اور اس کی مدح کسی شاعر کے ذہن میں ایسے جوش کے ساتھ پیدا نہیں ہو سکتی کہ وہ اس کو اظہار خیال پر مجبور کردے - ایک ہی غزل کے ایک شعر میں دنیا کی مذمت اور دوسرے شعر میں اس کی مدح اور اسی طرح کے اور متناقض و متضاد خیالات اس قدر جلد بیان کرنا شاعری کو بیشک عیب لگاتا ہے اور اس سے صاف طور پر سمجھ میں آتا ہے کہ یہ دونوں خیال جو ایک دوسرے کے برخلاف ہیں اس کی ذہنی کیفیت کا پرتو نہیں ہیں - بلکہ یہ ایک مصنوعی اظہار خیال ہے جس پر شاعر قافیہ اور ردیف کے اقتضا سے مجبور ہوا ہے - یہ کیونکر ممکن ہے کہ شاعر ایک لمحہ میں ایک ہی چیز کی ترغیب دلا کر دوسرے لمحہ میں اس چیز سے نفرت دلائے - یہ انسان کی طبعی نفسیات کے برخلاف ہے - ہاں یہ بات بے شک ممکن ہے کہ ایک زمانہ میں شاعر مثلاً دنیا کو رغبت کی

نگاہ سے دیکھتا تھا اور اس کی ہر شے اس کے دل پر ایک دلفریب عکس ڈالتی تھی اور اس کے جذبات کو رنگین کرتی رہتی تھی۔ اس زمانہ میں اگر شاعر اپنی اس ذہنی کیفیت کو بیان کرتا تو اس کا بیان سرتاپا دنیا کی دلکش کیفیتوں کی تصویر ہوتا۔ اور اس سے سننے والوں کو ترغیب ہوتی کہ وہ بھی شاعر کی طرح دنیا کے دلچسپ رنگوں کا نظارہ کریں اور اس سے پورا لطف اٹھائیں۔ پھر اگر شاعر کو پے در پے ناکامیوں سے اور دل شکن واقعات کے مسلسل پیش آنے سے دنیا کی طرف سے نفرت ہو جاتی اور بیزاری کا جذبہ اس کے دل میں شد ومد سے پیدا ہو جاتا تو اس دوسرے زمانہ میں وہ اپنی اس ذہنی کیفیت کو مایوسانہ لہجہ میں بیان کرسکتا تھا اور اس کا اثر بھی سننے والوں پر ضرور ہوتا۔ کیونکہ شاعر کا بیان اس حالت میں بھی اس کی ذہنی کیفیت کی سچی تصویر ہوتا اور اس میں بھی صداقت اور جوش موجود ہوتا۔ پس ایک لہجہ کے بعد دوسرے لہجہ میں شاعر کے اختلاف بیان اور تناقض خیالات سے اس کا بیساختہ پن ظاہر نہیں ہوتا۔ اور نہ یہ بات شاعری کا زیور ہے۔ بلکہ اس سے صداقت شعری پر حرف آتا ہے اور اس کے دل کی اصلی کیفیت کا اظہار نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کی شاعری کے مصنوعی اور غیر حقیقی ہونے کی خبر دیتا ہے اور بتاتا ہے کہ شاعر فقط نقال ہے۔ اس کی شاعری اس کی دل کی آواز نہیں ہے۔ وہ مختلف خیالات کو جو شعرا نے زمانۂ سابق میں وقتاً فوقتاً بیان کیے ہیں بغیر اس کے کہ اپنی ذہنی کیفیت کی مہر ان پر لگائے محض نقل و تقلید کے انداز سے بیان کرتا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ شاعری کا سخت عیب ہے اور اس سے شاعری کی زینت نہیں ہوتی

بلکہ تخریب ہوتی ہے ۔ یہ شاعری نہیں بلکہ قافیہ پیمائی ہے ۔ شاعر کسی فوری خیال یا اپنی کسی ذہنی کیفیت کو بیان کرنا نہیں چاہتا بلکہ ہر قافیہ جس خیال کے اظہار پر اس کو مجبور کرتا ہے بے پروائی سے اس کو باندھ جاتا ہے اور اس کی پروا نہیں کرتا کہ جو خیالات وہ جلد جلد بیان کر رہا ہے ان میں کس قدر اختلاف یا تناقض ہے۔ یہی مقام ہے جہاں ہمارے شاعر کی نفسیات یورپ کے شعرا کی نفسیات سے مختلف ہو جاتی ہے ۔ یعنی یہاں خیال پر قافیہ مقدم ہے اور وہاں قافیہ پر خیال کو مقدم سمجھتے ہیں —

یورپ اور ہندوستان کے شعرا کی عام نفسیات میں جو اختلاف ہے اس کے علاوہ خاص خاص شعرا کی نفسیات بھی ہمارے ہاں جدا گانہ ہے اور یہ ہر ایک شاعر کے طبعی اقتضا کے موافق ہے ۔ ایک گروہ شاعروں کا ہمارے ہاں ایسا ہے جو رات دن زبان باندھنے کے درپے رہتا ہے ۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو روز مرہ کی ترکیبوں اور زبان کے محاوروں کو روشناس کرے ۔ یہ ترکیبیں اور محاورے ظاہر ہے کہ بجز ان عام خیالات کے جو عام لوگوں کے دلوں میں گزرتے رہتے ہیں اور جن کے لیے وہ ترکیبیں اور محاورے وضع کیے گئے ہیں کسی نئے اور اعلی خیال کو ادا نہیں کر سکتے ۔ اس بنا پر اس گروہ کے شعرا پیش پا افتادہ خیالات کو باندھنے پر مجبور ہیں ۔ ذوق انہیں شعرا کے گروہ میں داخل ہے جیسا کہ ایک مضمون نگار نے رسالۂ اردو میں اس کی اور غالب کی شاعری کا مقابلہ کر کے دکھایا ہے —

اس قسم کے شعرا دانستہ ایسی زمینیں غزلوں کے لیے انتخاب

کرتے ہیں جن میں ردیف کوئی فعل ہو یا فعل کے مشتقات میں سے ہو۔ پھر کوشش کرتے ہیں کہ اس فعل کے ساتھ مختلف لفظوں کے ملانے سے جتنے محاورات بنتے ہیں حتی الوسع اُن سب کو باندھ دیں۔ مثلاً ایک شاعر نے غزل کی ردیف "اُٹھایا" اختیار کی ہے۔ "اُٹھانا" کے ساتھ مختلف لفظوں کے ملانے سے جو محاورے بنے ہیں وہ حسب ذیل ہیں اور اس شاعر نے ان سب محاوروں کو اس غزل میں باندھ دیا ہے۔ داغ اُٹھانا۔ فتنہ اُٹھانا۔ آنکھ اُٹھانا۔ سر اُٹھانا۔ قدم اُٹھانا۔ ہاتھ اُٹھانا۔ بیڑا اُٹھانا۔ نقاب اُٹھانا۔ ناز اُٹھانا۔ باگ اُٹھانا۔ ایذا اُٹھانا۔ طوفان اُٹھانا۔ لطف اُٹھانا۔ مصیبت اُٹھانا۔ مونھہ اُٹھانا —

ایک غزل کی ردیف ہے "اُڑاتے"۔ اس میں شاعر نے حسب ذیل محاورے کھپائے ہیں —

خاک اُڑانا۔ لطف اُڑانا۔ نشانہ اُڑانا۔ رنگ اُڑانا۔ پرزے اُڑانا۔ چٹکیوں میں اُڑانا۔ خاکا اُڑانا —

ایک غزل کی زمین ہے "بگڑا"۔ اس میں یہ محاورے لائے گئے ہیں۔ کام بگڑنا۔ مونھہ بگڑنا۔ نقشہ بگڑنا۔ مزاج بگڑنا۔ چلن بگڑنا۔ بدن بگڑنا —

"پکڑے" کی ردیف میں ایک شاعر نے حسب ذیل محاورے خرچ کیے ہیں۔ گوشہ پکڑنا۔ زبان پکڑنا۔ ہاتھ پکڑنا۔ سر پکڑنا۔ رات پکڑنا۔ دودن نہ پکڑنا۔ دل میں جگہ پکڑنا۔ دل پکڑنا۔ کان پکڑنا۔ بات پکڑنا۔ دامن پکڑنا۔ قدر پکڑنا۔ "توڑے" کی ردیف میں ایک شاعر نے ان محاوروں کو استعمال کیا ہے۔ توبہ توڑنا۔ دل توڑنا۔ کمر توڑنا۔ ہمت توڑنا۔ پاؤں توڑنا۔ بدن توڑنا۔ عرش کے تارے توڑنا —

ایک غزل کی ردیف ہے "کھا چکے" - اس میں یہ محاورے کھپائے گئے ہیں - شکست کھانا - دھوپ کھانا - رحم کھانا - قسم کھانا - فریب کھانا - بل کھانا - پیچ و تاب کھانا - غصہ کھانا - غوطہ کھانا - مغز کھانا - تلوار کھانا - زخم کھانا - ٹھوکر کھانا - کان کھانا - رشک کھانا - جوش کھانا —

ایک مرثیہ گو شاعر نے اپنے سلام کی ردیف "کھینچتے ہیں" رکھی ہے - اس نے اس سلام میں اُن محاوروں سے کام لیا ہے :-

خنجر کھینچنا - خمیازہ کھینچنا - دامن کھینچنا - ہاتھ کھینچنا - پاؤں کھینچنا - طول کھینچنا - تصویر کھینچنا - شکنجے میں کھینچنا - اپنے تئیں دور کھینچنا - سختیاں کھینچنا - سر کو آسمان تک کھینچنا - ایذا کھینچنا - رگ رگ سے جان کھینچنا - باگ کھینچنا - دار پر کھینچنا - انتظار کھینچنا - نقشہ کھینچنا - خجالت کھینچنا - کسی چیز پر قلم کھینچنا —

ایک غزل کی ردیف ہے "نکالیے" - اس میں شاعر نے یہ محاورے صرف کیے ہیں - ارمان نکالنا - دل کا بخار نکالنا - مونھ سے اُف نہ نکالنا - اشاروں میں کام نکالنا - وحشت میں پاؤں نکالنا - عیب نکالنا - نام نکالنا - آنکھیں نکالنا - بل نکالنا - راہ نکالنا - تدبیر نکالنا - شعر کی زمین نکالنا - دل سے کھٹکا نکالنا - کسی کا ذکر نکالنا - آرزو نکالنا - بات بات میں شر نکالنا - جوہر نکالنا - پر پرزے نکالنا - قدم نکالنا - نیا رنگ نکالنا - مطلب نکالنا - سر نکالنا —

غرض کہ اس قسم کے شعرا ہمیشہ اس بات کے درپے رہتے ہیں کہ جہاں تک ممکن ہو زبان کے محاوروں، روز مرہ کی ترکیبوں اور ضرب المثلوں کو اپنے کلام میں کھپائیں - اُن کو شاعرانہ تخیل یا اعلیٰ خیالات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا - ظفر کے چاروں دیوان اسی قسم کی شاعری

سے بھرے ہوے ہیں ۔ آج کل کے بہت سے شاعر بھی جو مشاعروں میں شریک ہوتے ہیں رات دن اسی دھن میں مبتلا رہتے ہیں ۔ برخلاف اس کے دوسری قسم کے شعرا وہ ہیں جو باوجود ردیف قافیے کی پابندی کے اعلی خیالات اور لطیف حسیات کے ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ مگر یاد رکھنا چاھئے کہ عام طور پر ایسے شعرا آسان ردیفیں اختیار کرتے ہیں اور ایسے قافیے لاتے ہیں جن میں خیالات کا ادا کرنا مشکل نہ ہو ۔ میر ' درد اور غالب اسی گروہ میں داخل ہیں ۔ اگرچہ اپنے زمانہ کے اقتضا سے وہ کبھی کبھی دوسری قسم کی زمینیں اختیار کرنے پر مجبور ہوے ہیں ۔ مگر عام میلان ان کا وہی ہے جو بیان کیا گیا ۔ حالی کے زمانہ سے جو شاعری میں انقلاب ہوا اس کے اقتضا سے فطرت نگار شاعروں نے قافیہ پیمائی چھوڑ دی ہے ۔ وہ غزل کی طرح اکثر ایک ردیف پر قناعت نہیں کرتے ۔ یا تو بغیر ردیف کے صرف قافیہ اپنی نظموں میں لاتے ہیں اور قافیہ ایسا اختیار کرتے ہیں جس کے ہم وزن الفاظ کثرت سے ہوں ۔ مثلاً رواں ۔ تپاں ۔ زمیں جبیں ۔ دریا ۔ صہبا ۔ لاتا ہے ۔ کھاتا ہے ۔ رفتار ۔ گفتار ۔ کہاں ۔ جہاں ۔ قلم ۔ حرم ۔ تحریر ۔ تصویر ۔ دیواں ۔ عریاں ۔ ملت ۔ قدرت ۔ بہار ۔ غبار ۔ چمن ۔ سخن ۔ بسمل ۔ کامل وغیرہ ۔ یا ردیف بہت چھوٹی اختیار کرتے ہیں جو ادائے خیال میں خلل انداز نہ ہو مثلاً پر ۔ میں ۔ سے ۔ کو ۔ ہے ۔ ہیں ۔ ہو ۔ تھا ۔ تھی ۔ تھے ۔ کا ۔ کے ۔ کی ۔ لے ۔ تک وغیرہ ۔ یا ترکیب بند کی شکل میں اپنے خیالات کو ادا کرتے ہیں اور ترکیب بند میں ہر بند کے اشعار کی تعداد برابر نہیں رکھتے ۔ جو خیال ایک بند کے جتنے اشعار میں ادا ہو جائے اتنے اشعار پر قناعت

کرتے هیں - یا مثنوی کے طرز میں اداے خیال کی کوشش کرتے هیں - فارسی زبان کے شعرا نے مثنوی کی بحریں حسب ذیل رکھی هیں اور اکثر مثنویاں انھیں بحروں میں لکھی گئی هیں - (اول) هزج مسدس مقصور جس کا وزن هے مفاعیلن مفاعیلن مفاعیل آخر کا رکن مفاعیل کی جگہ فعولن بھی هو جاتا هے - اس بحر میں جامی کی یوسف زلیخا ' نظامی کی شیریں خسرو ' زلالی کی مثنوی ' ناصر علی کی مثنوی اور غنیمت کی مثنوی نیرنگ عشق لکھی گئی هے —

(دوم) هزج مسدس اخرب مقبوض مکفوف جس کا وزن هے مفعول مفاعلن مفاعیل اور مفاعیل کی جگہ فعولن لانا بھی جائز هے - اس بحر میں فیضی کی مثنوی نلدمن ' خاقانی کی مثنوی تحفة العراقیین اور نظامی کی مثنوی لیلیٰ مجنوں لکھی گئی هے —

(سوم) رمل مثمن جس میں صدر اور ابتدا سالم هیں اور حشو مخبون هے اور عروض اور ضرب مخبون و محذوف هیں - اس کا وزن هے فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن - اس بحر میں مہر نجات کی مشہور مثنوی گُل کُشتی لکھی گئی هے —

(چہارم) رمل مسدس محذوف جس کا وزن هے - فاعلاتن فاعلاتن فاعلن - آخر رکن فاعلات بھی هو جاتا هے - اس بحر میں مولانا روم کی مثنوی معنوی ' شیخ فریدالدین عطار کی مثنوی منطق الطیر اور بہاءالدین آملی کی مثنوی نان و حلوا لکھی گئی هے —

(پنجم) بحر سریع مطوی موقوف جس کا وزن هے - مفتعلن مفتعلن فاعلان آخر کا رکن فاعلن بھی آسکتا هے - اس بحر میں امیر خسرو کی مثنوی قران السعدین ' نظامی کی مثنوی مخزن اسرار نیز مثنوی مطلع الانوار

لکھی گئی ہے —

(ششم) بحر خفیف مسدس جس میں صدر و ابتدا سالم اور باقی مقطوع - اس میں اگر عروض فعلن آئے اور ضرب فعلات یا فعلان یا اس کے برعکس عروض فعلات یا فعلان آئے اور ضرب فعلن آئے تو دونوں صورتیں جایز ہیں - اس کا وزن ہے - فاعلاتن مفاعلن فعلن - فعلن کی جگہ فعلات یا فعلان بھی آسکتا ہے - اس بحر میں مثنوی نام حق ' مثنوی ساقیہامہ ' نظامی کی مثنوی ہفت پیکر ' امیر خسرو کی مثنوی ہشت بہشت اور حکیم سنائی کا حدیقہ لکھا گیا ہے —

(ہفتم) بحر متقارب مثمن مقصور یا محذوف اس کا وزن ہے فعولن فعولن فعولن فعول - آخری رکن فعول کی جگہ فعل بھی لایا جا سکتا ہے - اس بحر میں فردوسی کی یوسف زلیخا ' فردوسی کا شاہنامہ ' سعدی کی کریما ' سعدی کی بوستاں ' نظامی کا سکندر نامہ اور ملا ہاتفی کا ظفر نامہ لکھا گیا ہے —

(ہشتم) بحر متدارک مثمن مقطوع جس کا وزن ہے فعلن فعلن فعلن فعلن - اس بحر میں میر کی مثنوی جوش عشق لکھی گئی ہے - مگر اس وزن میں میر نے طرح طرح کے تغیر کیے ہیں - کہیں تو بالکل یہی وزن رکھا ہے کہیں فعل فعولن فعل فعولن - کہیں فعلن فعلن فعل فعولن کہیں فعل فعولن فعلن فعلن - کہیں فعلن فعل فعولن فعلن - فارسی کی کوئی مثنوی اس بحر میں مشہور نہیں - مولانا حالی کی مثنوی مناجات بیوہ بھی اسی بحر میں ہے —

(نہم) بحر متقارب مثمن اثلم جس کا وزن ہے فعلن فعولن فعلن فعولن - اس بحر میں مولانا حالی نے اپنی مثنوی کلمۃ الحق لکھی ہے - فارسی میں کوئی مثنوی

اس بحر میں مشہور نہیں - مگر زمانۂ حال کے شاعرانہ انقلاب نے شعرا کو مثنوی کی ان بحروں پر محدود اور قانع نہیں رکھا - وہ تقریباً تمام بحروں میں مثنوی لکھتے ہیں- اس سے اظہار خیال کے لیے میدان بہت وسیع ہوگیا ہے - شاعر کو ہر شعر کے سرانجام کرنے میں صرف دو قافیے سوچنے پڑتے ہیں جو موقع پر نہایت آسانی سے خیال میں آجاتے ہیں اور خیال کے تسلسل اور روانی میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی - یہ آخری طریقہ یعنی مثنوی کے پیرایہ میں ادائے خیالات آج کل زیادہ مقبول ہوتا جاتا ہے - اور چونکہ مثنوی کی اُن بحروں پر شاعروں نے ادائے خیال کو محدود نہیں رکھا جو قدیم زمانے سے مسلمہ ہیں اس لیے اس طریقہ میں وسعت اور گنجایش زیادہ نکل آئی ہے - مولانا حالی نے برکھارت، نشاط امید، حب وطن، مناجات بیوہ، کلمۃ الحق وغیرہ مثنویاں چھوٹی ہی بحروں میں لکھی ہیں - مگر آج کل مثنوی کے لیے طویل بحریں اختیار کرنے کا میلان پایا جاتا ہے —

یہاں مثال کے طور پر زمانۂ حال کی مثنویوں کے دو دو شعر درج کیے جاتے ہیں —

اُس ہال کے اندر حوض جو تھا فوارے اُس میں اچھلتے گئے
دھاریں جو ہوئیں پانی کی رواں دھاروں سے راگ نکلتے گئے
پھر گھنگروؤں کی چھم چھم کی صدا اُس ہال کے فرش سے آنے لگی
یہ ناچ کی دھن کچھ سازوں کو بجنے کے لیے اُکسانے لگی

تارے سے ہیں چمکتے ہوئے یاسمن کے پھول
حیران ہیں جن کو دیکھ کے سارے چمن کے پھول

ہیں لمبی لمبی ڈالیاں چھائی زمین پر
چھتری سی ہے جاہوں نے بچھائی زمین پر

بعض اُودے ہیں، مگر بعض ہیں پیلے شہتوت
کیا ہی قدرت نے بنائے یہ رسیلے شہتوت
لذت بادۂ کوثر ہے تو شہتوت میں ہے
شہد جنت کا مزا گر ہے تو شہتوت میں ہے

پیپل کے ہر درخت پہ طوطوں کے ہیں پرے
چونچیں ہیں لال لال بدن ہیں ہرے ہرے
چھوتے پھلوں کو پھینکتے ہیں وہ کُتر کُتر
مینھ سا برس رہا ہے زمیں پر پٹر پٹر

یاں ہوا آزاد ہے موجیں یہاں آزاد ہیں
سب پرند آزاد ہیں سب مچھلیاں آزاد ہیں
حسن لیتا ہے یہاں ابھریں پڑا چاروں طرف
ہے خوشی چاروں طرف اور ہے ضیا چاروں طرف

میں ہوں شمع محفل زندگی میرا نام عہد شباب ہے
مرا سانس بادِ بہار ہے مری چال موج شراب ہے
مری عمر کی ہیں جو ساعتیں ہوئی عشرتوں میں تمام ہیں
یہی قہقہے یہی چہچہے مری زندگی کے پیام ہیں

ہے میرے دل میں بھی یہ تمنا یوں ہی رہوں بے نام و نشاں
اہل جہاں سے دور رہوں اور دور ہوں مجھ سے اہل جہاں
کشمکش جذبات سے مرا دامن عصمت چاک نہ ہو
پاک رہوں اور پاک ہی جاؤں گور میں مرے گو خاک نہ ہو

اے شیکسپیر اے دل انساں کے مصور
فطرت کے مظاہر ترے دل پر ہوے ظاہر
وسعت میں تری روح سمندر سے بڑی ہے
رفعت میں نظر تیری ستارں سے لڑی ہے

ملک کا سرمایۂ بقا ہے انہیں سے
قوم کا سامان ارتقا ہے انہیں سے
گر ثمر شاخ آرزو ہیں تو یہ ہیں
جوہر شمشیر آبرو ہیں تو یہ ہیں

اے آریو آؤ قدم رکھو ان حسن بھرے گلزاروں میں
جنت کے مزے لوٹو کیے سدا اس پاک زمیں کی بہاروں میں
تم گنگ و جمن کے کناروں پر شہر اپنے نئے آباد کرو
کاکا کے بھجن کر کرکے ہون ہو جاؤ مگن دل شاد کرو

وہ راگ جسے ہنگام سحر گاتی ہے ہوا گلزاروں میں
وہ راگ جسے چشموں کی زباں کرتی ہے ادا کہساروں میں

وہ راگ جو ہے موجوں کو رواں اس وحشت خیز سمندر میں
وہ راگ شراب تند بھری ہے جس کے بھنور کے ساغر میں
وہ راگ جسے گا گا کے سدا آتے ہیں پرندے مستی میں
وہ راگ چھپی ہے جس کی صدا ہر رینگنے والی ہستی میں
اُس راگ نے اپنی الاپوں سے لبریز کیے ہیں کان مرے
پھر جاگ اُٹھے ہیں مرے جذبے پھر زندہ ہوے ارمان مرے

خون اُس کی نگاہوں سے ہر لحظہ ٹپکتا ہے
ہے ہاتھہ میں جو چاقو بجلی سا چمکتا ہے
ہے کاٹتا اک دم وہ سر سبز نہالوں کو
ر دم اُن پہ نہ کیوں آئے سب دیکھنے والوں کو

جب نیم کی شاخیں ٹھنڈی ہوا کھا کھا کے تھرکنے لگتی ہیں
پھر زریں کرنیں سورج کی پتوں پہ چھکنے لگتی ہیں
پتوں کی رگوں میں نیم کا رس ہے دوڑتا پوری سرعت سے
یہ ریشہ دوانی دیکھہ کے میں تصویر بنا ہوں حیرت سے

مرے دل میں اُٹھتے ہیں ولولے کہ ہوں کاش باد بہار میں
کبھی غنچے پر ہو مرا گزر کبھی پھول سے ہوں دوچار میں
کبھی گلشنوں کو بتاؤں میں وہ جو ضابطے ہیں سنگار کے
کبھی بلبلوں کو سکھاؤں میں وہ جو زمزمے ہیں بہار کے

ہے طبع رواں دب کر جھگھت میں کچل جاتی
برگوں کے تلے آکر ہے گھاس بھی جل جاتی
جو ذہن کہ خلوت میں کر سکتے تھے ایجادیں
جلوت میں وہ جب پہنچے سب کر گئیں بنیادیں

لطف ہوا سے بو پہ بو پھیل رہی فضا میں ہے
معجزہ نو بہار کا جلوہ گر اس ہوا میں ہے
عکس مشام پر مگر جب نہ پڑے شمیم کا
کیجئے کس سے تذکرہ تازگی نسیم کا

سرہانے اک مریض مرے ہے شمع زرد جل رہی
برنگ مور ناتواں ہے نبض اس کی چل رہی
یکا یک اُس کے چہرے پر جھلک سی آکے رہ گئی
جو زندگی کی موج تھی وہ تلملا کے رہ گئی

وہ گُلوں کی روشنی سے نظاروں کا دنگ ہونا
وہ برنگ باغ رضواں چمنوں کا رنگ ہونا
وہ شمیم عطر گُل کا سر رہ گزر مہکنا
وہ نسیم مشک چین کا لب غنچہ سے لپکنا

کس قدر بلندی پر تھا کبھی مکاں میرا
شاخ سبز طوبیٰ پر تھا اک آشیاں میرا

حوریں کس مسرت سے گود میں بٹھاتی تھیں
زمزمے مرے سن کر خود بھی سر ہلاتی تھیں

یہ زمیں پر چمنستاں وہ بلندی پہ ستارے
مرے دل سے کوئی پوچھے تو یہ جلوے ھیں تمھارے
کبھی خوشبو کی اگر لہر سی پاتا ھوں فضا میں
تو سمجھتا ھوں کہ تم بال سکھاتے ھو ھوا میں

صبح یوں ھی آے گی شام یوں ھی آے گی
گردش دور زماں رنگ یوں ھی لاے گی
زمزمے مرغ چمن یوں ھی سدا گائیں گے
پھول یوں ھی باغ میں رنگ نیا لائیں گے

ھے حادثوں میں پنہاں حکمت کا اک اشارا
جراحیاں ھیں گویا قدرت کی آشکارا
نشتر سے حادثوں کے چیرے نہ گر وہ پھوڑے
فاسد مواد اُن کو زندہ کبھی نہ چھوڑے

سمندر اے دل خالق کے اضطراب سمندر
چھپے تو رکھتا ھے کیا انقلاب سینے کے اندر
غرور عقل بشر کے تو بو چکا ھے تو لاشے
اب اور دیکھیے کیا کیا دکھائے کا تو تماشے

جولاں گہہ اظہار لیاقت اسے کہیے
گہوارۂ تعلیم فصاحت اسے کہیے
ذہنوں کی ترقی کا جو میداں ہے تو یہ ہے
آداب تمدن کا دبستاں ہے تو یہ ہے

ایک ہنگامہ تھا برپا مرے ارمانوں میں
برق مضطر کی تڑپ تھی مری شریانوں میں
صرصر رنج کے جھونکے جو گذر جاتے تھے
دفتر قلب کے اوراق بکھر جاتے تھے

کیا برق و باد کا طوفاں تھا تھی جس سے فضا میں پڑی ہل چل
اب تو ہی نشانی ہے باقی طوفاں کی اے تنہا بادل
دل تیری گرج سے دہلتے تھے لرزہ تھا پڑا جانداروں میں
گویا تھا سمندر ٹوٹ پڑا پانی کی اپکتی تھیں دھاریں

اس بہشت زندگی سے نوجواں غافل نہ ہوں
عیش کے مشتاق ہیں تو طیش پر مایل نہ ہوں
لذت اخلاق شیریں اُن کو چکھنی چاہیے
من و سلوا کی حفاظت ان کو رکھنی چاہیے

لہجۂ بلبل کو فریاد زغن ہونے نہ دیں
نغمۂ وحدت کو شور ما و من ہونے نہ دیں
سیل کی کھیتی پہ پانی سیل کا پھرنے نہ دیں
مہر کے خرمن پہ بجلی قہر کی گرنے نہ دیں

جس کو دیکھا تھا کبھی گلشن وہ گلخن ہو نہ جائے
جس کو سمجھے تھے کبھی مسکن وہ مدفن ہو نہ جائے

صرصر دوزخ کو اس فردوس میں چلنے نہ دیں
نخل طوبیٰ کی جگہ زقوم کو پھلنے نہ دیں

نوح کی کشتی پہ طوفاں کا اثر ہونے نہ دیں
جنت آدم میں شیطاں کا گذر ہونے نہ دیں

تیوروں پر لطف کے غصے کے بل آنے نہ دیں
عہد میں الفت کے کلفت کا خلل آنے نہ دیں

روسی ناول

پہلا دور

فیوڈر میخائلووچ دستئیف سکی

از

(جناب محمد مجیب صاحب بی - اے 'آکسن')

دستئیف سکی کی شخصیت اور تصانیف کے خاص انداز کو نظر میں رکھیئے تو یہ واقعہ بھی معنی خیز ہے کہ وہ ایک ہسپتال میں پیدا ہوا' اور ایسے خاندان میں جس کی آمدنی اور خرچ کا تناسب کسی صورت سے اطمینان بخش نہیں تھا - اُس کے باپ کو' جو ہسپتال میں ایک معمولی عہدے پر نوکر تھا' اپنے افلاس کا بہت شدید احساس تھا' اور اسے آئندہ کے بارے میں اتنے اندیشے تھے کہ وہ ہمیشہ مایوس اور مغموم رہتا اور ایک لمحے کی خوشی اور بے فکری بھی اپنے اوپر حرام سمجھتا - بچوں کی تربیت اسی رنگ میں ہوئی' اور یہ بات شروع سے اُن کے ذہن نشین کردی گئی کہ زندگی کھیل نہیں ہے' اور اُنھیں اپنی ذمہ داریوں کا بوجھ سنبھالنے اور دنیا کی مصیبتوں کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہونا چاہیے - ماں کی زندہ دلی اور خوش مزاجی اس فضا کی افسردگی اور غمگینی کو جو باپ کے فلسفۂ زندگی

نے پیدا کی تھی کم نہ کرسکی ۔ اور بچپن ھی سے دستہ ئف سکی کے مزاج کے توازن میں کچھہ خلل پڑگیا ۔ ممکن ھے اگر اسے ھم عمر بچوں کے ساتھہ مل کر کھیلنے کا موقع ملتا تو اُس کے باپ کی تعلیم کا اثر کسی قدر زائل ھوجاتا، اور اس کی نشوو نما میں کوئی خاص رکاوٹ نہ ھوتی، مگر وہ اس نعمت سے بالکل محروم رھا ۔ سوا ان چند دنوں کے جب سارا خاندان ماسکو کے قریب ایک گانوں میں چلا جاتا تھا، دستہ ئف سکی کا سارا بچپن مکان کے چند کمروں میں گذرا ۔ جب اسکول جانے کے دن آئے تب بھی اُسے قید سے رھائی نہیں ملی ۔ وہ اپنے بھائی میخائیل کے ھمراہ اسکول جاتا ۔ اُسی کے ساتھہ واپس آتا، اور اُسے دوسرے لڑکوں کی صحبت سے پرھیز کرنے کی سخت تاکید تھی ۔ باپ نے جو کچھہ کیا نیک نیتی سے کیا لیکن اس تربیت نے دستہ ئف سکی کے مزاج اور طبیعت میں ایسی خامیاں پیدا کردیں جنھیں وہ آگے چل کر بھی دور نہیں کرسکا —

اسکول کی تعلیم ختم کرنے کے بعد دستہ ئف سکی پیٹر برگ کے انجینیرنگ کالج میں داخل ھوا اور سنہ ۱۸۴۳ میں اس کو اسی محکمہ میں ملازمت مل گئی ۔ لیکن ملازمت سے اس کی طبیعت بہت جلد گھبرا گئی ۔ اسے انشاپردازی کی مطلق مشق نہیں تھی ۔ اُس کی تعلیم سائنس اور ریاضیات میں ھوئی تھی ۔ مگر اس کے باوجود اس نے انشاپردازی کو کسب معاش کا ذریعہ بنانے کا ارادہ کیا اور ناول لکھنے لگا ۔ اس کی پہلی کوشش بہت کامیاب ثابت ھوئی اور اس کے پہلے ناول " غریب آدمی " (سنہ ۱۸۴۶) کا ادبی حلقوں میں بہت چرچا ھوا ۔ دستہ ئف سکی نے اس کامیابی کی بنا پرجو امیدیں باندھیں وہ غلط ثابت ھوئیں اور " غریب آدمی " کے بعد

اس نے چودہ و چار افسانے شایع کیے وہ عام طور سے اُس کے مداحوں کو بھی پسند نہیں آئے۔ اسی زمانہ میں وہ پتراشف سکی کے حلقے کا رکن بن گیا جس میں اشتراکیت کی تعلیم پر بحث ہوا کرتی تھی اور جس کے اراکین زیادہ تر اشتراکی تھے - سنہ ۱۸۴۹ میں کسی جرم کی بنا پر جس سے ادارے کے نوجوان اراکین خود بھی واقف نہیں تھے ' سب کو موت کی سزا کا حکم دیا گیا - آخر وقت میں جب ان بیچاروں کو گولی مارنے کی ساری تیاریاں ہو چکی تھیں انھیں اطلاع دی گئی کہ زار کی عنایت سے ان کے لیے موت کے بجاے سائبیریا میں جلا وطنی اور قید با مشقت کی سزا تجویز کی گئی ہے - ایک دو روز میں دستہ ئفسکی اور " مجرموں " کے ساتھہ سائبیریا روانہ کر دیا گیا - یہاں وہ چار سال قید خانے میں رہا ' اور اس کے بعد جبری فوج میں بھرتی کر دیا گیا - پیٹر برگ آنے کی اجازت اسے سنہ ۱۸۵۹ ع کے آخر میں ملی - دستہ ئفسکی کو بچپن میں جیب خرچ کے طور پر ایک پیسہ بھی نہیں دیا جاتا تھا ' اور جب وہ اسکول میں داخل ہوا تب بھی اس کی جیبیں ہمیشہ خالی رہیں - اس وجہ سے اسے خرچ کرنے کا ڈھنگ بالکل نہیں آیا - وہ اپنی آمدنی نہایت بے طریقے سے اڑا دیتا تھا ' اور زیادہ تر اسی سبب سے بہت تکلیفیں اُٹھاتا رہا - قید اور جلا وطنی نے اس کے افلاس کو اور بھی بڑھا دیا - جب وہ سائبیریا سے واپس ہوا تو اس پر بہت قرضہ ہو گیا تھا ' اور کتابیں لکھنے کے سوا قرض ادا کرنے کی کوئی صورت نہیں تھی - سنہ ۱۸۶۰ ع کے دوران میں اس نے اپنا ناول " بیکسی اور مظلوم " لکھا اور سنہ ۱۸۶۱ ع میں اپنے بھائی میخائیل کی شرکت میں ایک ماہوار رسالہ " زمانہ " جاری کیا - اس رسالے میں اس نے اپنی قید

کے حالات "مُردوں کے گھر" کے عنوان سے بہ اقساط شائع کیے۔ اس وقت تک وہ خاصا مشہور ہوگیا تھا۔ "زمانہ" بہت جلد ہر دلعزیز ہوگیا، اور دستہ ئف سکی کو اتنی آمدنی ہونے لگی کہ وہ اپنے قرض کا کچھہ حصہ ادا کرے۔ مگر سنہ ۱۸۶۳ میں ریاست کے حکم سے رسالہ بند کرا دیا گیا۔ دستہ ئف سکی ایک نیا رسالہ جاری کرنے کا انتظام کر رہا تھا کہ اس کے بھائی کا انتقال ہوگیا اور علاوہ اس قرضے کے جو وہ چھوڑ گیا تھا اس کے بیوی بچوں کی پرورش بھی دستہ ئف سکی کے سر پڑ گئی۔ اس کی پریشانیوں اور ذمہ داریوں کی کوئی انتہا نہیں تھی، مگر اس نے کسی نہ کسی طرح سے رسالے کے لیے سرمایہ فراہم کیا اور سنہ ۱۸۶۴ میں "دور" کے نام سے اسے جاری کردیا۔ یہ رسالہ بھی ریاست نے ایک سال کے اندر بند کرا دیا، اور دستہ ئف سکی پر اس قدر قرضہ ہوگیا کہ قید خانے سے بچنے کے لیے وہ روس سے فرار ہوگیا۔ سنہ ۱۸۶۵ کی گرمیوں میں وہ جرمنی کے شہروں میں آوارہ گردی کرتا رہا۔ مگر افلاس نے وہاں رہنا بھی دشوار کردیا اور وہ اسی سال پھر روس واپس آگیا "جرم اور سزا" (۱۸۶۶) لکھہ کر اس نے اپنے قرضے کا بوجھہ کچھہ ہلکا کیا، مگر قرضداروں کے تقاضوں نے اسے ایسا تنگ کیا کہ اگلے سال وہ پھر یورپ چلا گیا۔ اگر وہ کفایت شعاری سے رہتا تو ممکن تھا اسے اس کا موقع ملتا کہ ایک دو سال میں ناولیں لکھہ کر اپنی مالی حالت کسی قدر ٹھیک کرلے، مگر جوا کھیلنے کی عادت نے اس کا امکان نہیں رہنے دیا۔ دستہ ئف سکی چار سال یورپ میں رہا، کبھی جرمنی، کبھی سوئستان، کبھی فرانس میں اور اس عرصہ میں دو لمبے ناول "مجذوب" (۱۸۶۸ - ۱۸۶۹) اور "بہوت

پریت " (۱۸۷۰ - ۷۱) لکھے - لیکن چاروں سال فاقہ مستی میں گذرے یہاں تک کہ اکثر کپڑے اور جوتے رھن رکھنے کی نوبت آ جاتی تھی - اتفاق سے اس کی نئی بیوی جس سے اس نے یورپ جانے سے پہلے شادی کی تھی، ایسی باسلیقہ اور کفایت شعار نکلی کہ بری عادتوں کے باوجود دستہ ئف سکی کی حالت کسی قدر سنبھل گئی اور سنہ ۱۸۷۱ میں جب اسے روس میں گذر اوقات کرنے کی صورت نظر آئی تو وہ واپس چلا آیا - اسے صرف دس سال اور جینا نصیب ھوا، مگر بیوی کے حسن انتظام کی بدولت یہ عرصہ مقابلتاً آسودگی میں بسر ھوا - اس کے ناولوں نے اسے تالستائی کے دوش بدوش روسی انشاپردازوں کا سرتاج بنا دیا تھا - سنہ ۱۸۸۱ میں اس نے شاعر پشکن کی برسی میں ایک تقریر کی جس نے اس کی شہرت کو عروج پر پہونچا دیا - اسی سال موت نے اسے اچانک آ گھیرا، اور اس کی عظمت کا یہ ایک ادنیٰ ثبوت تھا کہ اس کا جنازہ اس شان سے اٹھا جس پر بادشاہ بھی رشک کر سکتے تھے —

دستہ ئف سکی کی مزاجی کیفیات کا اثر اس کی تصانیف کے ھر صفحہ پر ظاھر ھوتا ھے اور انہیں سمجھنے کے لیے اس کی شخصیت کے تمام پہلوؤں سے واقف ھونا لازم ھے - بچپن میں وہ ھم عمر بچوں کی صحبت سے محروم رکھا گیا تھا - بڑے ھونے کے بعد بھی وہ اپنے ساتھیوں سے الگ رھتا تھا، کچھ اس وجہ سے نہیں کہ وہ غریب تھا اور اس کے ساتھی امیر، بلکہ محض اس لیے کہ وہ صحبت سے گھبراتا تھا، اور مہذب زندگی کے رسوم و آداب سے بالکل ناواقف تھا - اپنے بھائی میخائیل کے سوا اُس نے کبھی کسی سے دل کھول کر یا بے تکلفی سے باتیں نہیں کیں - اُس کے دل میں

دوسروں کی طرف سے بیجا شبہے پیدا ہوجایا کرتے تھے، اور اس میں صاف گوئی کا اتنا مادہ بھی نہیں تھا کہ اپنی بدگمانی کو ظاہر کرکے لوگوں کو اس کے رفع کرنے کا موقع دے۔ ایسے اشخاص بھی ہوتے ہیں جو تنہائی کی زندگی میں خوش رہتے ہیں، لیکن دستہ‌ئف سکی میں یہ بات بھی نہیں تھی، اس لیے کہ اسے اپنی طبیعت پر مطلق قابو نہیں تھا، خرچ کی تنگی کے باوجود جب کبھی اُس کے ہاتھہ میں روپیہ آتا تو وہ فضول چیزوں میں پانی کی طرح بہا دیتا، اور جب ضرورتیں ستاتیں تو کُڑھا کرتا یا اپنی قسمت کو روتا۔ ایسی وہمی اور کمزور طبیعت والے آدمی کو دوستی سے بہت سہارا مل سکتا ہے، اور عموماً ایسے لوگ دوستی پیدا بھی کرلیتے ہیں۔ دستہ‌ئف سکی نے جب ملازمت ترک کرکے انشاپردازی شروع کی اور اپنا پہلا ناول لکھا تو ماسکو کے ادبی حلقوں میں اُس کے بہت سے ایسے قدر شناس تھے جو اُس سے دوستانہ تعلقات قائم کرنا چاہتے تھے، لیکن دستہ‌ئف سکی نے اُن کے لیے اس رشتے کا نباہنا بہت ہی دشوار کردیا۔ وہم کے ساتھہ ہی اس کی طبیعت میں خودپسندی بھی بہت تھی، وہ ذرا سا اختلاف بھی برداشت نہیں کرسکتا تھا، اور ہر وقت ہر شخص کی نسبت یہ بدگمانی رکھتا تھا کہ وہ میرا مذاق اُڑا رہا ہے یا مجھہ پر رشک کرتا ہے یا میری رسوائی اور بدنامی چاہتا ہے۔ بے لن سکی، جو دستہ‌ئف سکی کے پہلے ناول "غریب آدمی" کی اشاعت کے زمانے میں روس کا ادبی رہبر مانا جاتا تھا، دستہ‌ئف سکی کا بڑا مداح اور اُس کے ہنر کا سچا قدرداں تھا۔ لیکن محض اس بنا پر کہ "غریب آدمی" کے بعد جو دو چار افسانے دستہ‌ئف سکی نے لکھے ان کی اُس نے حسب

دلخواہ تعریف نہیں کی ، دستہ ئف سکی اس سے نہ صرف خفا ہوگیا بلکہ اُس کے تمام احسان بھلا کر لوگوں سے اس کی جھوٹی شکایتیں کرنے لگا۔ ماسکو کی ایک ادبی مجلس میں اُس کے ہم عصر ناول نویس تورگے نف نے جو اس کے طرز کو پسند نہیں کرتا تھا "غریب آدمی" کے ہیرو جے دوش کن کی ایسی نقل اتاری کہ وہ دستہ ئف سکی سے بہت مشابہ معلوم ہونے لگا ، اور دستہ ئف سکی اس بات پر اتنا ناراض ہوا کہ اُس نے تورگے نف ہی سے نہیں بلکہ ان تمام لوگوں سے جو وہاں موجود تھے ملنا چھوڑ دیا ، اور جب کبھی رستہ چلتے مڈبھیڑ ہوجاتی تو منہ پھیر لیتا ۔ اگر اس معاملے میں وہ اپنی بات کا پکا ہوتا اور اپنی بے نیازی ثابت کردیتا تو نقصان کے ساتھ ساتھ اس کی شخصیت کو کچھ فائدہ بھی پہنچتا ، اور اس کی طبیعت میں مضبوطی اور خود داری پیدا ہوجاتی - لیکن فضول خرچی کی وجہ سے وہ ہمیشہ مالی دشواریوں میں مبتلا رہتا تھا ، اور اکثر اُسے انہیں لوگوں سے مالی امداد لینا پڑتی تھی جن کی طرف سے اس کے دل میں ہزاروں بدگمانیاں اور شکایتیں تھیں - غیرت و حمیت اور مجبوری کی اس کشمکش نے دستہ ئف سکی کی طبیعت کا توازن بالکل بگاڑ دیا ۔ اپنی بری عادتوں اور سیرت کی کمزوریوں کے احساس نے اُسے اپنی نظروں میں اتنا حقیر کردیا کہ گو دوسرے اسے مدمغ سمجھتے تھے مگر وہ خود اچھی طرح سے جانتا تھا کہ دنیا کی نگاہوں میں اپنی عزت قائم رکھنے کی جو کوشش میں کررہا ہوں وہ بے کار ہے لیکن اس کا اقرار کرنا اُسے کسی طرح گوارا نہیں تھا - سیرت اور مزاج کی ان خامیوں نے دستہ ئف سکی کے لیے چین سے رہنا دشوار کردیا ، اور سوا عمر کے آخری دس بارہ

سال کے جب اس کی بیوی نے اُسے اپنے قابو میں کرلیا تھا، بالکل اُسی طرح جیسے بچپن میں اُس کے ماں باپ نے، دستہ ئفسکی کے لیے زندگی ایک عذاب تھی —

دستہ ئفسکی کی سیرت پر غور کرتے ہوے ہمیں دو باتوں کا اور خیال رکھنا چاہیے کیونکہ ان کا اس کے فلسفۂ حیات سے بہت گہرا تعلق ہے :- ایک تو موت سے وہ مڈبھیڑ جب اس کے قتل کا حکم دیا گیا تھا، دوسرے اس کا مرگی کا مرض، جس کے پہلے دورے سائبیریا میں ہوے۔ موت سے مڈبھیڑ کا قصہ دستہ ئفسکی نے اپنے بھائی کو ایک خط میں لکھا ہے۔

"آج ۲۲ دسمبر * کو، ہم سب سمیدنوت سکی † چوراہے پر پہنچائے گئے۔ وہاں ہمیں سزا کا حکم سنایا گیا، چومنے کے لیے صلیب دی گئی ہمارے سروں پر خنجر توڑے گئے اور اس کے بعد ہمیں وہ سفید قمیصیں پہنا دی گئیں جو ہمارا کفن ہونے والی تھیں۔ تب ہم میں سے تین کے ہاتھ کھمبوں سے باندھ دیے گئے اور وہ سزا کی تکمیل کے لیے کھڑے کیے گئے۔ میں صف میں چھٹا تھا، ہم تین تین کرکے مارے جانے والے تھے، اس لیے میری زندگی کے صرف چند لمحے باقی تھے ... مجھے بس اتنی فرصت تھی کہ پلش چے ئف اور دوروت سے جو میرے پاس تھے گلے مل لوں، اور رخصت ہولوں۔ لیکن اسی وقت سپاہیوں کو (جو گولی چلانے والے تھے) واپسی کا حکم ملا، وہ تینوں جن کے ہاتھ کھمبوں سے

---

* ۱۸۴۹ع -   † ایک مقام جہاں پر عموماً مجرموں کو گولی ماری جاتی تھی —

بند ھے تھے رھا کردیے گئے اور ھمیں زار کا فرمان سنایا گیا جس میں اُس نے ھماری جان بخشی کی تھی ..." دستہ‌ئفسکی کے ساتھیوں میں سے ایک پاگل ھوگیا ' اور خود دستہ‌ئفسکی کی کیفیت جنون سے کچھہ کم نہیں تھی۔ ان چند لمحوں میں اس کے دل پر جو کچھہ گذری وہ اس نے کئی ناولوں میں ضمناً بیان کیا ھے ' اور اس سے هم کو معلوم ھو جاتا ھے کہ اس حادثے کے بعد اس کی وھی حالت تھی جو ایک بڑے درخت کی ھوتی ھے جب کوئی زلزلہ اس کی جڑیں اس طرح سے ھلادے کہ وہ نہ تو اتنا کمزور ھو کہ گر پڑے یا غذا نہ پہنچنے سے سوکھہ جاے ' نہ اتنا مضبوط کہ زمین سے پوری غذا حاصل کرے اور پھر سرسبز اور شاداب ھو جاے۔ دستہ‌ئفسکی کا فلسفہ اور اس کے احساسات اس واقعہ کے بعد کبھی ایک "طبعی" انسان کے سے نہیں ھوسکتے تھے ' اور اس کی نظر میں زندگی کی کبھی وہ صورت نہیں ھوسکتی تھی جو "طبعی" انسان کی نگاھوں میں ھوتی ھے۔ مرگی کے مرض نے اس کی ذھنیت کو طبعی حالت سے اور بھی دور کر دیا —

دستہ‌ئفسکی کے ناولوں میں کئی ایسے کیریکٹر ملتے ھیں جو اسی "مقدس مرض" میں مبتلا ھیں ' اور ان کے بیان سے اس کیفیت کا کچھہ اندازہ ھوتا ھے جو دستہ‌ئفسکی پر دورے سے پہلے گذرتی تھی۔ "بھوت پریت" میں ایک شخص کہتا ھے : "کچھہ ایسا معلوم ھوتا ھے کہ میں نے گویا یکبارگی کُل کائنات کا اندرونی نظام سمجھہ لیا اور کہا : " ھاں ' یہ بالکل ٹھیک ھے !...... یہ محض ایک پر اثر کیفیت نہیں ھے ' بلکہ ایک مسرت ھے جس کی کوئی انتہا نہیں۔ دل پر سب سے زیادہ دیرپا نقش اِس بات کا ھوتا ھے کہ میں جو کچھہ دیکھتا ھوں

اور میرے جو احساسات ہوتے ہیں وہ بالکل صاف اور روشن ہوتے ہیں' اور ہر احساس ایک عجیب و غریب مسرت پیدا کرتا ہے۔ اگر یہ حالت پانچ سکنڈ سے زیادہ قایم رہے تو میری روح اس کی تاب نہ لا سکے اور یقیناً ہلاک ہو جاے"۔ دستہ ئف سکی کو ان دوروں کے آتے وقت کائنات اور وجود کی اصلیت جس شکل میں نظر آتی تھی' کائنات کے جو راز اس پر فاش ہو جاتے تھے' اُس کے فلسفے میں بہت اہمیت رکھتے ہیں' انہیں کی وجہ سے اسے اُس جستجو کا سودا ہوا جو اُس کے ناولوں کا اصل موضوع ہے' اور یہ جستجو اِس سوال سے شروع ہوتی ہے کہ آیا یہ کیفیت ایک بیماری ہے' یا ایک حقیقت جو کبھی کبھی اپنی ایک جھلک دکھلا جاتی ہے —

دستہ ئف سکی جس حقیقت کی تلاش میں نکلا وہ اس کے خیال میں خارجی زندگی اور بیرونی اثرات سے بہت کم تعلق رکھتی تھی۔ اسی وجہ سے اُس کے ناولوں میں "واقعات" کا بہت کم ذکر ہے' انسان کی اندرونی کیفیات بہت تفصیل سے بیان کی گئی ہیں' ان کی اہمیت پر اتنا اصرار کیا گیا ہے کہ وہ ناول کی ساری فضا پر چھا جاتی ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ ان کے سوا ہستی کا اور کوئی پہلو ہی نہیں۔ روز مرہ زندگی میں ان کیفیتوں کا جو دستہ ئف سکی کے ناولوں میں ایک معمولی چیز قرار دی گئی ہیں' شاذ و نادر ہی تجربہ ہوتا ہے اور جس قسم کے انسانوں سے اس کی دنیا آباد ہے وہ ہمیں اپنی دنیا میں شاید ہی کبھی دکھائی دیتے ہوں۔ اس بنا پر بعض لوگ جو دستہ ئف سکی کی عظمت سے انکار نہیں کرتے اسے مزاج اور ذہن کی بیماریوں کا محقق اور "پاگل خانے کا شیکسپیر" ٹھیراتے ہیں۔ یہ ایک حد تک صحیح

ہے ، کیونکہ دستہ ئف سکی نے علم نفسیات میں بہت سی معلومات کا اضافہ کیا ہے ' اور نفسیات کے عالموں کو خوابوں کی ماہیت سمجھنے میں اس کی تصانیف سے بہت مدد ملی ہے - " دھری شخصیت " کا مظہر بھی سب سے پہلے اسی کی تصانیف میں نظر آتا ہے ' اور نفسیات کے ماہروں نے بعد کو اس کے متعلق جو کچھ معلوم کیا وہ محض دستہ ئف سکی کے بیان کی تصدیق ہے - خواب یا دھری شخصیت محض ایک مثال ہے ' دستہ ئف سکی نے " بیماری " کے بہانے سے نفس انسانی کے هزار ها راز فاش کیے هیں - حقیقت کے ناگوار پہلو پر پردہ ڈالنا حفاظت نفس کی طرح انسان کی ایک جبلی خواهش ہے - اهل علم ان رازوں سے اس لیے ناواقف رہے هیں کہ یہ انسانی شخصیت کی تہ میں چھپے رهتے هیں ' ان کا احساس وجدان کے ذریعہ سے هوسکتا ہے ' علم کی ان تک رسائی نہیں —

نقادوں نے دستہ ئف سکی کو بیمار ذهن اور روگی فطرت کا محقق بنا کر اس کی تصانیف کو بالکل اور هی حیثیت دے دی ہے ' دستہ ئف سکی خود حقیقت نگار هونے کا دعوی کرتا تھا ' اور اسے یقین تھا کہ جو شخص بے معنی روزمرہ زندگی اور واقعات کا پردہ اٹھا کر دیکھے گا اسے حقیقت اسی شکل میں نظر آئے گی - اپنے خطوط میں اس نے جا بجا اس مسئلے پر اپنے خیالات ظاهر کیے هیں-ایک جگہ وہ لکھتا ہے " حقیقت نگاری کا مفہوم جو میرے ذهن میں ہے همارے معمولی " حقیقت نگاروں " اور نقادوں کے خیالات سے بالکل مختلف ہے - معاذ الله ! اگر کوئی وہ ساری کیفیتیں جو ان گذشتہ دس سالوں میں هم روسیوں کے دلوں پر گزری هیں صاف صاف بیان کردے ... تو یہی حقیقت نگار چیخ اٹھیں گے کہ یہ محض خبط ہے ! لیکن اس بیان کی حقیقت میں کلام نہیں هوسکتا ! ایسی هی حقیقت نگاری سچی اور کھری

ہو سکتی ہے' وہ جو عام طور سے رائج ہے محض سطحی اور حقیر ہے"۔
یوں ہم سمجھ سکتے ہیں کہ دستوئفسکی کے ناولوں پر "بیماری" کی فضا کیوں چھائی رہتی ہے۔ وہ عام نفسیات کے لیے ذخیرہ جمع کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔ اسے اس کی فکر ہے کہ کسی طرح انسانی زندگی اور انسانی ہستی کی اصل حقیقت معلوم کرے' اور جیسے ایک سائنس کے عالم کو انسانی جسم کے نظام اور کاروبار کا پتہ اسی وقت چلتا ہے جب اس نظام میں کوئی خلل پیدا ہو' دستوئفسکی بھی بیماری اور بیماروں کو حقیقت تک پہنچنے کا ذریعہ بناتا ہے۔ انسان اگر تندرست اور خوش حال ہو تو اپنی خواہشوں اور آرزؤں میں مبتلا رہتا ہے اسے اتنی مہلت نہیں ملتی کہ اپنی ہستی کے معنوں پر غور کرلے' اور وہ اس کی ضرورت محسوس ہی نہیں کرتا۔ لیکن غربت' مصیبت' اور بیماری میں اس کی توجہ جسمانی زندگی سے ہٹ جاتی ہے اور تب وہ مجبور ہوتا ہے کہ اپنی ہستی کا مقصد' کائنات میں اپنے وجود کا مصرف کسی طرح اپنے آپ کو سمجھائے' اور پھر اپنی گذشتہ اور آئندہ زندگی کے متعلق کوئی فیصلہ کرے۔ دستوئفسکی کا موضوع ایسے ہی انسانوں کے خیالات اور احساسات ہیں' اور اسی وجہ سے خود حقیقت نگاری کا یہ تقاضا تھا کہ اس کے کیرکٹر مصیبت زدہ یا کسی نہ کسی لحاظ سے "بیمار" ہوں' سکون اور نجات حاصل کرنے کو تڑپ رہے ہوں اور انھیں خارجی زندگی کے ان مسائل اور معاملات سے کوئی سروکار نہ ہو جو تندرست انسان کے ذہن پر حاوی ہوتے ہیں۔ دستوئفسکی کے فلسفۂ زندگی کا یہ اصول ذہن نشین کرکے ہم اس کی تصانیف پر سلسلہ وار غور کرسکتے ہیں —

اس کا پہلا ناول " غریب آدمی " اور دوسرا " بیکس اور مظلوم "
چند افسانے جو اس نے سنہ ۱۸۴۰ اور سنہ ۱۸۴۹ کے درمیان لکھے " سدا
سہاگی " " ماموں جان کا خواب " اور " ستیے پان چی کوو و " اس کی
تصانیف کا ایک جداگانہ حصہ ہیں ' اور موضوع کے اعتبار سے اُن
ناولوں سے بہت مختلف ہیں جن کا سلسلہ " مردوں کے گھر" سے شروع
ہوتا ہے ۔ لیکن دستہ ئف سکی کا طرز ان شروع کی تصانیف میں بھی
وہی ہے جو بعد کے ناولوں میں پایا جاتا ہے ' اور ان میں بھی اس
کی قوت ادراک اور انسانی سیرت کے وجدانی علم کا وہی عالم ہے ۔
" غریب آدمی " گوگول کے افسانے " لبادے " سے ملتا جلتا ہے ' اس
کا ہیرو بھی خاکسار اور مسکین ہے ' ایک " بیچارہ " جس کا حال سن کر
ترس آتا ہے ' لیکن " غریب آدمیوں " کی اور " لبادے " کی حقیقت
نگاری میں یہ بڑا فرق ہے کہ گوگول نے جگ بیتی سنائی ہے اور
دستہ ئف سکی نے آپ بیتی ' گوگول نے مصوری کا کمال دکھایا ہے اور
دستہ ئف سکی نے مشاہدۂ نفس کا ' گوگول کا ہیرو روسی قوم کا ایک
فرد ہے ' دستہ ئف سکی کا ہیرو جے دوش کن ' جس کے دل پر خودی کا اتنا
احساس بھی باقی نہیں رہا ہے کہ وہ اپنی سنگدل معشوقہ کی اجازت
کے بغیر ہنسے یا خوش ہوسکے ' خود دستہ ئف سکی کی ایک خاص ذہنی
کیفیت کا مجسمہ ہے ۔ نقاد بےلن سکی نے " غریب آدمی " کو پڑھ کر
ٹھیک کہا تھا ' جے دوش کن کی ہستی کوئی نادر شے نہیں ہے ' بلکہ
روسی زندگی کا ایک عام اور عبرت انگیز مظہر ہے ۔ " بیکس اور مظلوم "
میں بھی دستہ ئف سکی نے بڑی حد تک آپ بیتی سنائی ہے ' اس کا ہیرو
دانیا ایک ناول نویس ہے ' اور اس کی سیرت دستہ ئف سکی سے بہت

مشابہ ہے۔ ناول کا قصہ بہت دردناک ہے۔ ایک بڑے رئیس زمیندار وال خوت سکی نے، جو عیاش اور بدمعاش ہے اور جسے معصوم لڑکیوں کو دھوکا دے کر بے حرمت کرنے میں خاص لطف آتا ہے، اپنی جائداد کے مستعد اور ایماندار منتظم ایخ مے نف کو جھوٹے الزام لگا کر نکال دیا ہے اور اس پر کئی ہزار روبل غبن کرنے کا دعوی دائر کردیا ہے۔ بیچارہ ایخ مے نف مقدمے کی پیروی کے لیے پیٹر برگ آتا ہے، اور یہاں اس پر ایک اور مصیبت نازل ہوتی ہے۔ اُس کی لاڈلی بیٹی نتاشا گھر چھوڑ کر وال خوت سکی کے لڑکے ال یوشا کے ساتھ بغیر نکاح کئے بیوی کی طرح رہنے لگتی ہے۔ ناول نویس دانیا جس نے ایخ مے نف کے گھر میں پرورش پائی تھی اور جو خود نتاشا سے بہت محبت کرتا تھا اپنا فرض سمجھتا ہے کہ نتاشا کے جذبۂ محبت کا احترام کرے اور اسے اس حرکت کے برے نتائج سے جہاں تک ہوسکے بچائے۔ نتاشا کے افسانے کا انجام یہ ہوتا ہے کہ ال یوشا اپنے باپ کے کہنے سے ایک مالدار لڑکی سے شادی کرلیتا ہے اور دانیا بڑی مشکل سے نتاشا کے ماں باپ کو اسے اپنے گھر واپس بلا لینے پر آمادہ کرلیتا ہے۔ نتاشا اس معاملے میں پھر بھی خوش قسمت رہی "بیکس اور مظلوم" میں ایک اور لڑکی نے لی کا قصہ بھی ہے، جس کی عزت اور زندگی وال خوت سکی کے ہاتھوں تباہ ہوئی۔ اُس کے باپ نے مرتے دم تک اسے معاف نہیں کیا اور لڑکی بھی دل میں شکایت لیے ہوئے دنیا سے گئی —

"بیکس اور مظلوم" کی داستان میں دستہ ئف سکی نے ایک تو یہ دکھایا ہے کہ انسان فاعل مختار ہونے کا جو دعوی کرتا ہے، اُس کی دراصل کوئی حقیقت نہیں، اور دوسرے یہ کہ فلسفیوں نے جو

حکم لگایا ہے کہ ہر انسان اپنی بھلائی چاہتا ہے ' اکثر غلط ثابت ہوتا ہے ' "بیکس اور مظلوم" ان بیچاری ہستیوں کے درد دل کی کہانی ہے جو اپنے پاک جذبات کو دنیاوی اغراض اور "بھلائی" کی خواہش پر نثار نہیں کرسکتی ہیں ' اور محض اس وجہ سے کہ ان کے دل پاک ہیں اور اُن کے جذبات قوی ' اُنہیں دنیا میں ہر طرح کی رسوائی اور ذلت اُٹھانا پڑتی ہے ۔ یہی مجبوری کسی قدر ظریفانہ انداز سے " سدا سہاگی " میں دکھائی گئی ہے ۔ تروسوت سکی ' ایک خوش حال آدمی ' فطرتاً شادی کرنے پر مجبور ہے ' اس کی بیویاں اسے ہمیشہ دھوکا دیتی ہیں اور بیوفائی کرتی ہیں اور اسے یہ معلوم بھی ہے ' لیکن پھر بھی وہ شادیاں کرتا رہتا ہے اور ایسی ہی عورتوں سے جن کی تلون مزاجی اور عیش پسندی انہیں وفادار نہیں رہنے دیتی ۔ علم نفسیات کے رو سے ایک خواب جو اس ناول میں بیان کیا گیا ہے ' بہت اہمیت رکھتا ہے ۔ ایک مرتبہ ول چانی نوت ' جس کا تروسوت سکی کی بیوی سے یارانہ تھا ' تروسوت سکی کے ساتھ ایک کمرہ میں سو رہا تھا ۔ اس نے خواب دیکھا کہ ایک شخص خنجر لیے ہوئے اس کے پلنگ کی طرف آہستہ آہستہ آرہا ہے ۔ جب وہ پاس پہنچ گیا تو اُس نے ول چانی نوت کے گلے پر خنجر مارا '

---

* دستہ ئف سکی کی لڑکی لیوبوف دستہ ئف سکیہ کا بیان ہے کہ اس ناول میں دستہ ئف سکی نے آپ بیتی سنائی ہے ' اور اس کی پہلی بیوی جس سے اس کی سائبیریا میں شادی ہوئی تھی ' تروسوت سکی کی بیویوں کی طرح عیاش اور بیوفا تھی ۔ لیکن لیوبوف دستہ ئف سکیہ نے اپنے باپ کی سوانح عمری میں اس قدر الٹی سیدھی باتیں لکھی ہیں کہ اس کے قول پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا ۔

اور ول چانی نوت نے وار سے بچنے کے لیے اپنا ہاتھہ سامنے کر دیا ۔ اس وقت اس کی آنکھہ کھل گئی ۔ اس نے دیکھا کہ اس کی انگلیوں سے خون بہ رہا ہے اور تروسوت سکی اس کے پاس کھڑا ہے ۔ اگر ول چانی نوت نے خواب نہ دیکھا ہوتا تو تروسوت سکی کا خنجر اُس کے گلے پر پھر جاتا —

" سدا سہاگی " دستہ ئف سکی نے سنہ ۱۸۷۰ میں لکھی ' اور یہ اس کے پہلے طرز کی آخری تصنیف ہے ۔ سنہ ۱۸۶۲ میں " مُردوں کے گھر " کی تصنیف کے ساتھہ اس کی ناولوں کا وہ سلسلہ شروع ہوتا ہے جس کا موضوع انسان کی شخصیت اور اُس وجود کے گہرے اور پیچیدہ مسائل ہیں ۔ وہ روحانی یا جذباتی مجبوری جو نتاشا جیسی شریف اور شائستہ لڑکی کو بداخلاق عورتوں کے زمرے میں شامل کر دیتی ہے ان ناولوں میں بہت زیادہ شوخ رنگوں میں نظر آتی ہے ' اپنی بھلائی کی طرف سے بے پروائی اور دنیاوی اغراض کی تحقیر جو نتاشا اور نے لی کی ماں محسوس کرتی ہیں ایک شیطانی ضد اور تکبر میں منتقل ہو جاتی ہیں جو خیر و شر کے معیار کو پلٹ دیتا ہے ۔ لیکن ہم ان مسائل کو اُسی وقت سمجھہ سکتے ہیں جب ہم دستہ ئف سکی کے فلسفے کی تدریجی نشو و نما پر غور کر لیں —

دستہ ئف سکی کے خیالات کی محرک دراصل ان لوگوں کی شخصیتیں تھیں جن سے اس نے سائبیریا کا قیدخانہ یا " مردوں کا گھر " آباد پایا ۔ اس ناول کا ہیرو قید خانے سے رخصت ہوتے ہوئے کہتا ہے : " کتنوں کی زندگی ' کتنوں کی طاقت ان دیواروں میں دفن رہی اور بے کاری میں ضائع ہوئی ! ۔ اس جوانی اور اس قوت کو دنیا آخر کسی نہ کسی مصرف میں تو لا ہی سکتی تھی ۔ میں اس معاملے میں

اپنے خیالات ظاہر کیے بغیر نہیں رہ سکتا : یہ بدقسمت لوگ غالباً ہماری قوم کے سب سے زیادہ مضبوط ارادہ رکھنے والے آدمی اور کسی نہ کسی لحاظ سے اُس کے سب سے زیادہ ہونہار افراد تھے۔ ان کی ساری جسمانی اور روحانی طاقت ضائع ہو رہی ہے۔ یہ آخر کس کی خطا ہے ؟" ۔ فقط یہ کہہ دینا کہ یہ لوگ مجرم ہیں اور اپنے جرم کی سزا بھگت رہے ہیں صرف ناکافی نہیں بلکہ غلط ہے ' یہ غلط نہ ہوتا تو اس مسئلے میں کوئی دشواری یا پیچیدگی نہ ہوتی ۔ دستدئیف سکی نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ ایسے مجرم جنھوں نے ضعیف بڈھوں اور معصوم بچوں کا انتہائی بے دردی سے خون بہایا تھا ' اپنی حرکتوں پر بالکل نادم نہیں ہوے ' بلکہ اکثر یہ محسوس ہی نہیں کرتے کہ انھوں نے کسی قسم کی غلطی کی ہے ' اور کبھی کبھی تو ان کا ضمیر انھیں یقین دلاتا ہے کہ انھوں نے جو کچھہ کیا وہ ٹھیک کیا ۔ جب ان لوگوں کو اپنی معصومیت کا اتنا یقین ہے اور ان کی سزا ایسی بے تاثیر تو ہم یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ یہ لوگ مجرم ہیں یا قید خانے میں اپنے جرم کی سزا پا رہے ہیں۔ اور اگر ہم یہ تسلیم کرلیں کہ یہ لوگ بالکل بے خطا ہیں یا اگر بے خطا نہیں تو انھیں سزا دینا ہمارے امکان سے باہر ہے ' تو پھر مظلوم معصوموں کی فریاد کو بیجا قرار دینا ہوگا ' یا اِس کا اقرار کرنا ہوگا کہ انسانی فطرت کسی قانون کی پابند نہیں کی جا سکتی ' قانون بنانا محض حماقت ہے اور کسی مذہبی یا اخلاقی معیار کا سہارا ڈھونڈھنا انسان کی ایک مضحک کمزوری —

دستدئیف سکی کو علم اور عقل پر زیادہ اعتبار نہیں تھا۔ جرم و سزا کی منطق کے اس چکر نے اسے اور بھی یقین دلا دیا کہ زندگی کے گہرے

مسائل کا فیصلہ کرنا عقل کے امکان سے باہر ہے - اگر ہم جرم کی حقیقت معلوم کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں مجرم کی شخصیت ' اس کے جذبات سے ' اور اس کے شعور کے ان پوشیدہ محرکوں سے واقف ہونا چاہئے جو ان جذبات کو پیدا کرتے ہیں - " پاتال کے مراسلات " میں جو اس نے ۱۸۶۴ میں شائع کی ' اس نے پہلی بار انسانی شعور پر بحث کی ' اور اس سوال کا ایک حد تک جواب دیا جو " مردوں کے گھر " میں رہنے سے اس کے دل میں پیدا ہوا تھا - " مراسلات " کے دو حصے ہیں ' پہلے میں اس کا فرضی مصنف اپنا فلسفۂ حیات بیان کرتا ہے ' دوسرے میں اپنی زندگی کے چند واقعات جو اس کے فلسفے کو اور واضح کردیتے ہیں —

" پاتال کے مراسلات " کا مصنف پوچھتا ہے : " وہ کون تھا جس نے پہلی بار یہ کہا ' پہلی بار اس بات کا اعلان کیا ' کہ انسان محض اس وجہ سے ذلیل اور مضر حرکتیں کرتا ہے کہ اُسے اپنی بھلائی کی تمیز نہیں ؛ اور اگر اس کا دماغ روشن کردیا جائے ' اس کی آنکھیں کھول دی جائیں ' کہ وہ اپنے حقیقی مقاصد ' اپنے سچے مفاد سے واقف ہو جائے تو وہ فوراً ذلیل اور مضر حرکتیں کرنا چھوڑ دے گا ' فوراً اچھا اور شریف بن جائے گا ... اس لیے کہ اچھائی میں اسے اپنا فائدہ نظر آئے گا ... یا یوں کہیے کہ اچھائی کرنا اس کے لیے ناگزیر ہوجائے گا ! ... مگر ان ہزارہا مثالوں کا کیا کیا جائے جو اس کی شہادت دیتی ہیں کہ انسان جان بوجھ کر ' یعنی اپنے مفاد کو پوری طرح سمجھتے ہوئے بھی اس سے قطع نظر کرکے ایک دوسرا راستہ اختیار کرتا ہے ... ایک کٹھن نامعقول راستہ جس پر اسے اندھیرے میں ٹٹول ٹٹول کر چلنا پڑتا ہے - اس سے یہ

نتیجہ نکلتا ھے کہ اسے یہ خود سری اور خود رائی اپنے مفاد سے زیادہ پسند ھے ... مفاد! مفاد ھوتا کیا ھے؟ کیا اسے آپ ٹھیک ٹھیک سمجھانے کی ذمہ داری لے سکتے ھیں کہ انسان کا مفاد کس بات میں ھے اور کس میں نہیں؟ ... کیا مفاد کی جو صورتیں تصور کی گئی ھیں وہ بالکل قابل اعتبار ھیں؟ ... انسان ھمیشہ اور ھر جگہ ' خواہ وہ کوئی بھی ھو ' وھی کرنے سے خوش ھوتا رھا ھے ' جو اس کی طبیعت چاھتی ھے ' اس بات سے ھرگز نہیں جو اس کی عقل اس سے کہتی ھے یا جس میں اسے اپنا فائدہ نظر آتا ھے : انسان کی ایسی خواھشیں بھی ھو سکتی ھیں جو اس کے مفاد کے خلاف ھوں بلکہ کبھی کبھی اپنا فائدہ نہ چاھنا اس کے لیے قطعاً ضروری ھو جاتا ھے .. انسان کو حاجت ھے - آزاد اور خود مختار خواھشوں کی ' اس آزادی اور خود مختاری پر خواہ اسے کچھ بھی نثار کرنا ھو ' اس کا انجام چاھے کچھ ھی ھو ... عقل ' حضرات ' ایک اچھی چیز ھے ' اس میں کوئی کلام نہیں ' لیکن عقل محض عقل ھے ' اور وہ صرف انسان کی ذھنی قوت کو کام میں لاتی ھے ' لیکن خواھشوں میں انسان کی پوری شخصیت ' کا اظہار ھوتا ھے ' جس میں عقل مع اپنی تمام سرگردانیوں کے شامل ھے ... "

غرضکیہ انسان کا سب سے قوی جذبہ خودی کا اثبات اور کائنات میں اپنی اھمیت جتانے کی خواھش ھے - یہ خواھش اس کے خیر و شر کے معیار کو تہ و بالا کردیتی ھے ' اس کی عاقبت اندیشی ' اس کی عقل کا منہ چڑھاتی ھے - " پاتال کے مراسلات " کا مصنف بھی دراصل اسی خواھش کا شکار بنا ھے ؛ زندگی کی نعمتوں سے محروم رھتے رھتے

اس کا مذاق اس قدر بگڑ گیا ہے کہ اسے اپنی ذلت اور رسوائی میں مزہ آنے لگا ہے - وہ " مراسلات " کے دوسرے حصے میں یہ قصہ سناتا ہے کہ اس نے ایک مرتبہ چکلے میں جاکر ایک لڑکی کو سمجھایا کہ اسے اپنا پیشہ چھوڑ دینا چاہئے ' اور جب وہ کچھہ روز بعد اس کے پاس آئی اور اپنا پیشہ ترک کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو اس نے لڑکی کو بے عزت کرکے چھوڑ دیا - یہ کمینی حرکت کچھہ کلھی فلسفے کا نتیجہ نہیں تھی ' بلکہ اس جذباتی قوت کا اظہار جسے اپنے اثبات کی اور کوئی صورت نصیب نہیں ہوئی تھی - " مراسلات " کے مصنف کو اپنی حرکت پر بہت سخت صدمہ ہوتا ہے ' لیکن اپنے نزدیک اس کے لیے کوئی چارہ نہ تھا - دنیا بھر میں وہ ذلیل سمجھا جاتا تھا ' ایک بار اسے بھی اپنی شخصیت جتانے کا موقع ملا اور اس نے ایک ہستی کو اپنے سے بھی زیادہ ذلیل کر کے اس موقع سے فائدہ اٹھایا - اگر اس کی حرکت سے ایک بیچاری لڑکی کے دل پر چوٹ لگی تو افسوس کی بات ہے مگر وہ بھی تو ایسے موقع کا انتظار کرتے کرتے عاجز آ گیا تھا —

اسی طرح دستہ ئفسکی نے " مردوں کے گھر " میں" ایک مجرم کا قصہ بیان کیا ہے جس نے اپنی نیکی ' فرماں برداری اور حلم کی بنا پر قید خانے میں شہرت حاصل کرلی تھی ' اور قید خانے کے حاکموں نے اسے قیدیوں کی ایک جماعت کا سردار بنا دیا تھا - ایک دن اس پر یکایک جنون سا سوار ہو گیا ' اور اس نے ایسی حرکتیں کیں کہ اسے مجبوراً دیوانوں کی طرح زنجیروں سے جکڑ دینا پڑا - دستہ ئفسکی اِس واقعے کی بس یہی تشریح کرسکا کہ اس مجرم نے برسوں اپنے جذبات کو دبایا تھا اور انھوں نے آخر کار اِس خطرناک طریقے پر

اپنا زور دکھایا - اس مجرم نے لوگوں کے سر پھوڑے' " پاقاں کے مراسلات" کے مصنف نے ایک غریب لڑکی کا دل دکھایا ' دونوں حرکتیں ایک سی ھیں ' ان کا محرک ایک ھی ھے ۔ " مراسلات " کے مصنف نے تو کہہ دیا ھے کہ میں اس کا قائل نہیں کہ انسان اپنی بھلائی چاھتا ھے اور جو کوئی بھی اپنی شخصیت محسوس کرتا ھے اس کا قائل نہیں ھوسکتا - " مراسلات" کا مصنف کمزور کھسیانا آدمی تھا ' لیکن وہ " قوی شخصیتیں جو بیمار ھوکر مجرم بن جاتی ھیں " دراصل سب اسی کی طرح اپنی شخصیت ظاھر کرنے کی فکر میں مبتلا ھوتی ھیں - دستہ‌یف‌سکی کو رفتہ رفتہ یقین ھوگیا کہ جرم کا مظہر جو مسائل ھمارے سامنے پیش کرتا ھے وہ دراصل نفسیات کے ․ ․ ․ نہیں ھیں - ان کا تعلق ایمان اور کفر ' تسلیم اور بغاوت سے ھے - خود دستہ‌ئف‌سکی دین عیسوی کا پیرو تھا ' وہ حضرت عیسیٰ کی شخصیت اور خیر و شر کے اِس معیار کو جو اُنھوں نے قایم کیا تھا معیار مطلق سمجھتا تھا - لیکن اس کے دل میں شکوک تھے ' ایسے شکوک جنھیں عقل اور دلیلیں دور نہیں کرسکتیں ' اور جب تک یہ موجود تھے اُسے کسی قسم کے روحانی سکون کی اُمید نہیں ھوسکتی تھی - وہ تمام روحانی کشمکش اور نزاع ؛ انسانی شخصیت کو نامعلوم راستوں سے درجۂ کمال تک پہنچانے کی وہ تمام کوششیں جن پر دستہ‌ئف‌سکی نے اپنے ناولوں میں بحث کی ھے دراصل عکس ھیں اُس کے اپنے شکوک کا - اور نتیجے میں اِس دنیا اور اُس کے مسلمہ اخلاق اور فلسفۂ حیات کو تہ و بالا کرکے ایک نئی دنیا اور نیا اخلاقی نظام قائم کرنے کی آرزوؤں کا جو اس کے دل میں امنڈتی تھیں - مرگی کے دورے سے پہلے کائنات جس شان سے دستہ‌ئف‌سکی کو نظر آتی تھی

اس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے - یہ اس کی بصیرت اور ادراک اور روشن ضمیری کی انتہا تھی ' ایک دیدار جس کے لیے اس کی روح للچایا کرتی تھی ' ایک کیفیت جس نے اس کی نگاہوں میں انسان کے مستقبل کو عجیب دلکش صورت دیدی تھی - اس کے ساتھ ہی دستہ ئفسکی کو انتہائی پستی کا بھی تجربہ ہوا کرتا تھا ' اس پر دیوانگی کے لمحے گذرتے تھے جب شیطانی خواہشیں اس کا دل ہلا دیتی تھیں اور وہ اپنی وحشت سے پناہ مانگتا تھا - وہ مظہر جو نفسیات کی اصطلاح میں " دہری شخصیت" کہلاتا ہے اور جسے دستہ ئفسکی نے دریافت کیا تھا ' در اصل اُن متضاد کیفیتوں اور امنگوں کا مجسمہ ہے جو دستہ ئفسکی اپنی طبیعت میں محسوس کرتا تھا - بہرحال اس کے لیے کائنات اور انسانی سیرت کے اسرار معلوم کرنے کا یہی طریقہ ممکن تھا کہ وہ اپنے آپ کو جرم اور شک کا مجسمہ بنالے' جرم اور شک اور انکار میں تشکیل زندگی کی جو قوت ہو اُسے آزمائے' اور اس دنیا کو بگاڑ کر اگر کوئی بہتر دنیا بن سکتی ہو تو بنائے - چنانچہ " جرم اور سزا " اور " بھوت پریت " میں دستہ ئفسکی نے جرم اور انکار اور بغاوت کے فلسفۂ حیات پر غور کیا ہے ' اور اپنے زمانے کے چند واقعات کو پلاٹ کے طور پر رکھہ کر مجرم ' منکر اور باغی لوگوں کی نفسی کیفیات اور ان کی جد و جہد کا انجام دکھایا ہے - انسانی شخصیت کے اظہار کا ایک رنگ یہ ہے ' دوسرے پر " مجذوب " اور " برادران کرمازوف" میں بحث کی جاتی ہے ' اور ہمیں ان چار ناولوں پر اسی ترتیب سے نظر ڈالنا چاہئے —

۱۸۶۱ کے بعد منکریت (Nihilism) کی تحریک نے بہت زور پکڑا *

---

* اس پر ایک آئندہ باب میں بحث ہوگی -

اور "منکروں" نے عوام میں بیداری پیدا کرنے کے ساتھہ ھی روس کو اندرونی دشمنوں سے پاک کرنے کا سلسلہ بھی شروع کیا - معمولاً ریاست کے بڑے عہدہ داروں پر حملے کیے جاتے تھے' لیکن ۱۸۰۵ میں ایک طالب علم نے کسی بوڑھی عورت کو جو سود پر قرضہ دیا کرتی تھی مار ڈالا اور عدالت میں بیان کیا کہ میں نے بڑھیا کو مار کر کوئی جرم نہیں کیا بلکہ ھزاروں غریب آدمیوں کو ایک بلا سے نجات دلائی ھے اور ایسے لوگوں کو مار ڈالنا جو اپنے ھم جنسوں کو تکلیف پہنچائیں قوم اور انسانیت کی ایک قابل قدر خدمت ھے - دستہ ئفسکی پر اس واقعے کا' اور اس جرم کی منطق کا بہت اثر ھوا' "جرم اور سزا" میں اصل بحث اسی پر ھے کہ جرم خیر کا ذریعہ ھو سکتا ھے یا نہیں' اور اگر کوئی شخص انسانی مفاد کے ارادے سے خون بہاے تو وہ انسانیت کو' اور اپنی ذات کو فروغ دے سکتا ھے یا نہیں —

"جرم و سزا" کا ھیرو راس کول نی کوف ایک ھونہار مگر بہت غریب طالب علم ھے جو یہ عقیدہ رکھتا ھے کہ کسی بلند نصب العین یا اعلیٰ فلسفۂ حیات پر جانیں نثار کرنا کوئی جرم نہیں اور تاریخ میں اس کے ھزارھا ثبوت ملتے ھیں کہ جن شخصیتوں نے زندگی کو ایک بہتر شکل دی ھے کبھی خون بہانے سے نہیں ڈری ھیں - اپنی ذات کے لیے وہ اِس عام اصول سے یہ خاص نتیجہ نکالتا ھے کہ اُسے ایک بڑھیا کو جس کے پاس اُس نے کچھہ چیزیں گرو رکھائی تھیں اور جو بہت مالدار تھی' مار کر نقد روپے پر قبضہ کرلینا چاھئے' اور یہ دولت حاصل کر کے ایک نئی زندگی شروع کرنا چاھئے جس میں اسے اپنے حوصلے پورے کرنے کا بہتر موقع ملے - کچھہ کشمکش کے بعد وہ ایک دن جا کر کلھاڑی

سے اِس بڑھیا کا سر پھوڑ دیتا ہے اور اسی کے ساتھ اس کی چھوٹی بہن کا جو اتفاق سے کمرے میں آجاتی ہے۔ ان دونوں کو مار کر اور نوٹوں کی ایک تھیلی چرا کر وہ گھر بھاگ جاتا ہے۔ اِس نے جرم نہایت بھونڈے طریقہ سے کیا تھا، اور یہ اُس کی خوش قسمتی تھی کہ کسی نے اسے دیکھا نہیں۔ لیکن وہ اپنے اصل ارادے کو عمل میں نہیں لا سکا، اُسے بہت جلد معلوم ہو گیا کہ جرم کرنا آسان ہے، مگر اسے ایک نئی زندگی کی بنیاد بنانا بہت مشکل ہے، اور جن تاریخی شخصیتوں نے خون بہاکر اپنی زندگی کو فروغ دیا ان کی سرشت ہی کچھ اور تھی۔ راس کول نی کوف کے جرم نے اُس کے حوصلوں کا خون چوس لیا، اس کے ارادے کی قوت چھین لی، منزل مقصود کو اس کی نظر سے چھپا دیا۔ یہ کوئی اتفاقی بات نہیں تھی۔ راس کول نی کوف دل سے اخلاقی خیر و شر کے معیار کا قائل نہیں تھا، جب تک اس کا جرم محض ایک ارادہ تھا اُسے یہ خیال رہا کہ میں ایک اصول کے ماتحت عمل کر رہا ہوں، میری کوششوں کا ایک مقصد ہے۔ بڑھیا کو قتل کرتے ہی اس کا مقصد پورا ہو گیا، اور وہ نئی زندگی جو دور سے اس مرحلے کو طے کرنے کے بعد شروع ہوتی ہوئی نظر آرہی تھی قریب پہنچنے پر سراب کی طرح فضاے نامحدود میں غرق ہو گئی —

قتل کے بعد راس کول نی کوف کے روحانی ڈراما کا دوسرا حصہ شروع ہوتا ہے۔ وہ اپنی منطق کا اس قدر قائل تھا کہ اس کے دل میں کسی قسم کی پشیمانی یا قصور کا احساس نہیں پیدا ہوا، لیکن اس کی وجہ سے اُس کی روحانی تکلیف اور بھی بڑھ گئی، کیونکہ اگر وہ اپنے آپ کو مجرم نہیں مانتا تھا تو اِس کے معنی یہ تھے کہ اخلاقی قانون اور خیر

و شر کا وہ معیار جس کی خاطر اس نے بڑھیا کو قتل کیا تھا ' اور جسے وہ اپنی نئی زندگی کا سنگ بنیاد بنانا چاہتا تھا'' دراصل کچھ بھی نہیں ' محض ایک خیال خام ہے ۔ اِس احساس نے اس کے نفس میں ایک روحانی اور اخلاقی خلا پیدا کر دیا جسے برداشت کرنے کی اِس کول نکوت میں ہمت نہ تھی ' اور جسے دراصل کوئی بھی برداشت نہیں کر سکتا ۔ اِس خلا سے خوف کھا کر اس نے ان تاریخی ہستیوں میں شامل ہونے کا حوصلہ چھوڑ دیا جن کی پیروی میں اُس نے بڑھیا کو قتل کیا تھا ' اور اس کی آرزو کرنے لگا کہ کسی طرح سے عوام کی ذہنیت اختیار کر لے ' اور اپنے دل میں اِس معیار کو پھر قایم اور استوار کر دے جس پر عوام کا فلسفۂ حیات مبنی ہوتا ہے ۔ اس نے سونیا سے اپنے جرم کا اقبال کیا ۔ سونیا ایک غریب ' مسکین اور پاک دل لڑکی تھی جس نے اپنی سوتیلی ماں اور بھائی بہنوں کو فاقے سے بچانے کے لیے مجبوراً ایک ذلیل پیشہ اختیار کیا تھا اور وہ نہ صرف ایثار کا ایک پر درد مجسمہ تھی بلکہ اُس عقیدت کا ایک اعلیٰ نمونہ جو انسان میں روحانی تکلیفیں برداشت کرنے کی حیرت انگیز قوت پیدا کر دیتی ہے ۔ سونیا کے کہنے سے اِسکول نی کوف نے اپنے جرم کا اقبال کر لیا ' اور اُس کی سزا بھگتنے کے لیے بھی آمادہ ہو گیا ' لیکن پھر بھی وہ اپنے دل میں خطا کا احساس نہیں پیدا کر سکا ' اپنی منطق کی خامی کا قایل نہیں ہوا ' اور اپنی ناکامی کا الزام اپنی پست ہمتی اور اِس بڑھیا پر لگاتا رہا جسے اس نے قتل کیا تھا ۔ اس کی ذہنیت میں انقلاب اُس وقت ہوا جب وہ سائبیریا میں ڈیڑھ سال رہ چکا تھا ۔ اُس نے ایک خواب دیکھا کہ ایشیا کی طرف سے ایک نئے قسم کا طاعون آیا ہے جو ہزاروں بستیوں کو ویران کر رہا ہے '

اِس بیماری کے جراثیم بھی نئی قسم کے ہیں ' ان میں عقل اور ارادے کی قوت ہے اور جس کسی کے جسم میں وہ اپنا گھر کر لیتے ہیں وہ فوراً پاگل ہو جاتا ہے اور اپنے آپ کو سب سے عقلمند ' روشن ضمیر اور بلند حوصلہ سمجھنے لگتا ہے - اس خبط میں مبتلا ہونے سے لوگوں میں ایک دوسرے کی بات سمجھنے ' ایک دوسرے کا احترام کرنے کی صلاحیت نہیں رہتی ' وہ آپس میں لڑنا شروع کر دیتے ہیں ' جانیں ضائع ہونے لگتی ہیں ' زندگی تہ و بالا ہو جاتی ہے اور چند برگزیدہ ہستیوں کے سوا دنیا میں کوئی باقی نہیں رہتا - اِس خواب نے راس کول نی کوت کو اِس اصول کے آخری اور لازمی نتیجے سے آگاہ کر دیا جس پر عمل کرنے کا اسے حوصلہ تھا - اسے یقین ہوگیا کہ اگر ہر شخص اثبات خودی کو زندگی کا مقصد بنائے ' ایک برگزیدہ شخصیت بن بیٹھے اور ہر قسم کا جرم اپنے لیے روا رکھے تو انسانی زندگی ناممکن ہے - اثبات خودی کا اصول غلط ہے ' اس پر زندگی تعمیر نہیں ہو سکتی ' بلکہ جو کچھ انسان نے اپنی محنت اور تکلیفوں سے تعمیر کیا ہے وہ بھی نیست و نابود ہو جائے گا - اس خواب کے بعد راس کول نی کوت کا دل انسانی ہمدردی اور محبت سے لبریز ہو جاتا ہے ' اِس میں نہ غرور رہتا ہے نہ خود رائی ' اور سونیا اور وہ ایک نئی زندگی کے خوابوں سے اپنی مصیبت کے دن روشن کرتے ہیں —

اِس کول نی کوت کے اصول کی غلطی " جرم و سزا " کا ایک پہلو ہے - اس کا دوسرا پہلو شعور اور جذبات کی وہ کیفیتیں ہیں جو ہر دلیل سے زیادہ اِس کول نی کوت کی گمراہی عیاں کرتی ہیں - ناول کے شروع ہی میں ہم کو معلوم ہو جاتا ہے کہ گو اِس کول نی کوت نے جرم کا پختہ ارادہ کرلیا ہے اور ہر وقت اپنے آپ

کو یہ یاد دلا کر کہ ایک مہم اُس کے درپیش ہے اپنے دل کو مضبوط کرتا رہتا ہے، نہ تو اُس کی ذہنیت ایک مجرم کی سی ہے نہ سرشت۔ بڑھیا کو قتل کرنے سے پہلے وہ ایک خواب دیکھتا ہے کہ بہت سے کسان نشے میں ایک دبلی کمزور گھوڑی کو بے دردی سے پیٹ رہے ہیں، اور بیچاری کو پیٹتے پیٹتے مار ڈالتے ہیں۔ اس خواب کے بعد وہ اپنا ارادہ ترک کر دیتا ہے، اور ارادہ ترک کرتے ہی اس کے دل پر سے ایک بوجھ اُتر جاتا ہے، اُس کی طبیعت صاف ہوجاتی ہے اور زندگی اس کی نظروں میں ایک دل فریب شکل اختیار کر لیتی ہے۔ لیکن سڑک پر جاتے ہوئے وہ کہیں سن لیتا ہے کہ بڑھیا چھہ بجے شام کو گھر پر ہوگی، اور اس پر پھر قتل کے ذریعے سے اپنی شخصیت کو فروغ دینے کی آرزو اپنا جادو کر دیتی ہے۔ وہ بڑھیا کو قتل کرتا ہے، مگر اس جرم کا اس پر جو اثر ہوا اور اس کے علاوہ سونیا اور اُس کے شرابی باپ اور دیوانی سوتیلی ماں کے ساتھ جو سلوک وہ کرتا ہے، یہ سب اس کا ثبوت ہیں کہ وہ طبیعتاً نہایت شریف، بھولا اور محبت والا آدمی ہے اور اس کے دل میں انسانی ہمدردی کا بہت قوی جذبہ ہے۔ مجرم میں یہ اوصاف نہیں ہوتے، اور جس میں یہ اوصاف ہوں اسے مجرم نہ بننا چاہیے۔ لیکن اِس کول نی کوف نے جرم کے فلسفۂ حیات کا اپنی طبیعت پر بہت گہرا رنگ چڑھا لیا تھا، اسے اپنی طبیعت کا اصل رنگ یاد ھی نہیں رہا، اور اس طرح وہ بھلائی کرنے کے باوجود اس مسرت اور اس روحانی تقویت سے محروم رہا جو بھلائی کرنے سے انسان کی شخصیت کو ہوتی ہے —

"جرم و سزا" میں سونیا کی شخصیت انسانی شعور کی تاریک

اور طوفانی فضا میں کچھه روشنی پیدا کرتی هے اور منزل مقصود کی ایک جهلک دکها دیتی هے' "بهوت پریت" میں اتنی تسکین بهی نهیں ملتی۔ "جرم و سزا" کی طرح اس ناول کا اصل قصه بهی بهت مختصر هے۔ ستات روگن' کریل لوت' ورخوونسکی اور شاتوت سربرآورده رکن هیں ایک جماعت کے جو روس میں اخلاقی اور معاشی انقلاب پیدا کرنا چاهتی هے۔ انقلاب پیدا کرنا کوئی آسان کام نهیں' مگر یه نوجوان' جن کے اصل رهبر ستات روگن اور اس کا پٹهو ورخوونسکی هیں' اپنے آپ کو یقین دلاتے هیں که اُنهیں عنقریب کامیابی هونے والی هے' اور جب ستات روگن اور ورخوونسکی آخر میں دیکهتے هیں که ان کی جماعت مایوس هوکر منتشر هونے والی هے تو وه شاتوت پر جس کے خیالات میں کچهه تبدیلی هوئی هے' غداری کا الزام لگا کر اُسے بڑی بے دردی سے مار ڈالتے هیں۔ کریل لوت پهلے هی خودکشی کرچکا هے۔ اس جرم کے بعد ورخوونسکی غائب هوجاتا هے اور ستات روگن بهی خودکشی کرلیتا هے۔ دستهٔ ئف سکی نے اس داستان کا جو پس منظر رکها هے اور جو ضمنی قصے اس میں جابجا چهوڑتے جاتے هیں' وه اس کو بظاهر بهت پیچیده بنا دیتے هیں' اور یه خیال هوتا هے که یه ساری رام کهانی محض هذیان هے۔ لیکن جو لوگ انقلابی جماعتوں کے اندرونی کاروبار سے ذرا بهی واقفیت رکهتے هیں یا جن پر وه کیفیتیں گذر چکی هیں جب جذبات میں هیجان هوتا هے' دل میں امنگیں جوش کرتی هیں' انسان هر وقت اپنی شخصیت کا پورا زور دکهانے پر تلا رهتا هے' مگر اسے اپنی طاقت اور قابلیت دکهانے کا کوئی موقع نهیں ملتا' اور اس کے حوصلے اندر هی اندر گهٹ گهٹ کر ره جاتے هیں؛ ایسے لوگ فوراً تسلیم کرلیں گے

کہ دستدئف سکی نے حقیقت نگاری میں کمال دکھلایا ہے' اور یہاں ہی انسانی شعور کی کیفیات کے علم کا خزانہ لٹایا ہے —

" بھوت پریت " منکریت کے فلسفۂ حیات اور ضمناً یورپ کی مادیت کا بھانڈا پھوڑنے کے لیے لکھی گئی تھی - دستدئف سکی نے اس مسئلے پر دو پہلوؤں سے غور کیا ہے' ایک ظاہری' دوسرا باطنی - ایک وہ جس کا تعلق عام تہذیب اور تمدن سے' دوسرا وہ جس کا تعلق انسانی شعور اور انسانی شخصیت کی گہری ذاتی ضروریات سے ہے - ستاف روگن کریل نوف' ورخوونسکی' شاتوت سب باغی ہیں' جن میں ورخوونسکی نے معاشرتی نظام کے خلاف بغاوت کا جھنڈا کھڑا کیا ہے' اور کریل نوف اور ستاف روگن نے انسان کے اخلاقی اور مذہبی معیار اور کائنات کے کل نظم و نسق کے خلاف اعلان جنگ کیا ہے - ورخوونسکی جیسے لوگ ہر انقلابی جماعت میں نظر آتے ہیں' وہ ایک کمینی مگر مضبوط طبیعت کا آدمی ہے' ایک مجرم جسے صرف ایذا پہونچانے میں نہیں بلکہ لوگوں کو دھوکا دینے میں اور اوہام میں مبتلا کرنے میں لطف آتا ہے' جو ایک نظام کو تہ و بالا کرکے دوسرا کسی اعلیٰ غرض سے نہیں قائم کرنا چاہتا' بلکہ محض تباہی اور بربادی کا منظر دیکھنے کے لیے - کریل نوف اور ستاف روگن سرکشی اور اثبات خودی کی مثالیں ہیں' اور ان کی روحانی سرگذشت اس ناول کا دوسرا اور گہرا پہلو ہے —

کریل نوف اور ستاف روگن دونوں باغی ہیں' دونوں نہ خدا کی خدائی تسلیم کرتے ہیں نہ انسان کی انسانیت - کریل نوف ایک موقع پر کہتا ہے : " اگر خدا ہے تو ہر بات اس کے حکم سے ہوتی ہے اور میں

اس کے احکام کی تعمیل پر مجبور ہوں - لیکن اگر خدا نہیں ہے تو میں قادر مطلق ہوں اور اپنی قدرت دکھانے پر مجبور ہوں" اور چونکہ اُسے خدا کا وجود تسلیم کرنا منظور نہیں وہ اپنی قدرت دکھانے کے خبط میں مبتلا ہو جاتا ہے - انسان کے وجود کا مقصد اس کے خیال میں یہ ہے کہ وہ اپنی قدرت کا اظہار کرے اور اسے تعجب ہوتا ہے کہ لوگ عام طور سے اپنے اس اہم فرض سے غافل ہیں ' جب کہ " ساری دنیا محض ایک فریب ہے ' اور اس کی بنیاد فریب اور انسانی ہستی کی تحقیر پر ہے ' جب کہ دنیا کے سارے آئین جھوٹے ہیں اور شیطانوں کا تماشا" - خود کشی سے قبل وہ اپنی حرکت کو جائز اور خودداری کا صریحی تقاضا ثابت کرتا ہے " مجھے تعجب ہوتا ہے سب لوگ کیسے بلا تامل جیتے رہتے ہیں - کیا اس دنیا میں ایک بھی ایسا مرد آدمی نہیں ہے جو خدا کے وجود کا خاتمہ کر کے اور اپنی شخصیت کی آزادی کا معتقد ہو کر اپنی ہستی کے سب سے نازک معاملے میں خود مختاری جتانے کی ہمت کر سکے ؟ یہ تو ویسی ہی بات ہے جیسے کسی فقیر کو ورثے میں اشرفیوں کی تھیلی ملے ' اور وہ یہ یقین نہ کر سکے کہ وہ اس کا مالک بننے کے قابل ہے - میں اپنی خود مختاری ثابت کرنا چاہتا ہوں' میں اسے ثابت کروں گا ' چاہے مجھے ایک بھی پیرو یا شریک کار نہ ملے - مجھ پر لازم ہے کہ اپنے گولی مار لوں ' کیونکہ اپنے ہاتھوں فنا ہونا خود مختاری کی انتہا ہے " - ستاف روگن کی شخصیت دوسرے قسم کی ہے ' اس کی بغاوت کا اندازہ کچھ اور ہے - اسے کسی وجود یا قوت کا احساس نہیں جو کائنات پر حاوی اور اس کے نظام کی روح و رواں قرار دی جاسکے ' وہ باغی ہے ' مگر اِس وجہ سے نہیں

کہ وہ کسی عقیدے یا اصول کی بنا پر سر تسلیم خم کرنا غلط سمجھتا ہے، بلکہ محض اس وجہ سے کہ بغاوت اور سرکشی اس کی سرشت میں ہے ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ستاؤروگن کو اپنے دل میں اور کل کائنات میں ایک خلا نظر آتا ہے، زندہ ہونے اور کل ہستی کا ایک جزو ہونے کا وہ شعور جو انسان کو کائنات سے وابستہ رکھتا ہے اور اس کی زندگی کو ایک خود رو عمل بنا دیتا ہے ستاؤروگن کے ذہن میں معدوم ہو جاتا ہے، اور وہ ایک ڈوبتے ہوئے آدمی کی طرح ہر طرف سہارے کے لیے ہاتھ پیر مارتا ہے ۔ وہ کوشش کرتا ہے کہ اپنے روحانی خلا کو کسی قوت کا میدان عمل بنائے، اپنی بے مقصد زندگی کے لیے کوئی مقصد تلاش کرے اور یوں انسانی زندگی اور کائنات سے اپنا ٹوٹا ہوا رشتہ دوبارہ قائم کرلے، لیکن اسے کامیابی نہیں ہوتی ۔ اس کی باغی فطرت اسے اجازت نہیں دیتی کہ وہ کسی کو اپنا سردار یا شریک کار بنائے، اس کا ادراک ہر وقت اسے بتاتا رہتا ہے کہ وہ تمام مقاصد جن میں وہ یا اور لوگ مصروف ہیں محض ڈھکوسلے ہیں ۔ یوں وہ اپنی قوت کو تعمیر کے کام میں نہیں لا سکتا اور چونکہ سکون فطرتاً ناممکن ہے اس لیے یہ قوت تباہی اور بربادی کا ایک خطرناک ذریعہ بن جاتی ہے لیکن شاعر لیرمنتوف کے شیطان کی طرح ستاؤروگن کو برائی کرنے میں اور دوسروں کو دکھ پہونچانے میں کوئی لطف نہیں آتا، اسے معلوم ہے کہ میرے مقاصد بھی ویسے ہی لغو اور ہیچ ہیں جیسے اچھے مقاصد، اور اسے کسی قسم کی تسلی دینے کی طاقت نہیں رکھتے ۔ ستاؤروگن نے پہلے شہوت پرستی اختیار کی، اور یہ چاہا کہ اپنی پوری شخصیت کو اس میں محو کردے ۔ لیکن اس کی شہوت پرستی زبردستی کی تھی

اس میں ستاف روگن کو نہ کسی قسم کی لذت حاصل ہوی نہ شہوانی حرکتوں پر کوئی ندامت ہوئی ' اور وہ خلا جسے وہ اس طرح سے پر کرنا چاہتا تھا ویسا کا ویسا ہی رہا ۔ اس ناکامی کے بعد ستاف روگن ملکروں میں شامل ہوگیا کہ شاید دوسروں کی طرح اس پر بھی کوئی بھوت سوار ہو جائے ' یا وہ کسی خبط میں مبتلا ہو جائے ۔ ملکریت کی تعلیم سے اسے مطلق کوئی عقیدت نہیں تھی ' لیکن اس نے انتہائی عقیدت ظاہر کی اور اس کی بھی کوشش کی کہ دوسروں کا عقیدہ پختہ ہو جائے ۔ یہاں بھی وہ ناکام رہا ' اور اس کے عقیدت مندوں کے جوش اعتقاد کا اس کے دل پر کوئی اثر نہیں ہوا ۔ پھر اسے اپنی شخصیت کی قوت جتانے کی سوجھی ' اس نے ایک لنگڑی ' بد قطع اور مجنون عورت سے شادی کرکے اس کا ہر جگہ اعلان کیا ' اپنے آپ کو انتہائی سکون قلب کے ساتھ بھری محفل میں رسوا کرایا ' بغیر آنکھ جھپکائے ایک حریف کے پستول کا سامنا کیا ۔ یہ دوا بھی بے اثر رہی ۔ اس کے بعد ستاف روگن نے عشق کے سایہ میں پناہ لینا چاہی ' مگر اس جذبے میں بھی وہ روحانی خلا ' جس سے وہ بچنا چاہتا تھا اسے ستاتا رہا ۔ اب اس سے گریز کرنے کی کوئی صورت باقی نہیں رہی تھی کیونکہ موت کے ذریعے سے نجات پانے کا خیال بھی اسے ایک ڈھکوسلا نظر آیا ۔ اس نے اپنے آخری خط میں لکھا " مجھے معلوم ہے کہ یہ بھی شرمندگی کا باعث ہوگی ۔ خود فریبی کی ترکیبوں میں ایک اور مہمل ترکیب " ۔ مگر آخرکار اس نے رہائی کی یہی تدبیر اختیار کی —

" جرم و سزا " اور " بھوت پریت " میں دستہ ئفسکی نے دکھا دیا کہ اثبات خودی سے ' شخصیت کامل نہیں بن سکتی ' کیونکہ

اس خط میں وہ تمام ذریعے جو انسان کو کامل بنا سکتے ہیں معدوم هو جاتے هیں ' اور انسان یا تو اس کول نکوت کی طرح اپنی تنہائی برداشت نہیں کر پاتا اور خیر و شر کے معیار کی عدم موجودگی سے بے بس ہو جاتا ہے ' یا اس کی زندگی اور خیالات میں ویسا هی بھیانک خلا پیدا ہو جاتا ہے جیسے ستاف روگن کی زندگی میں ' اور وہ دیوانوں کی طرح ادھر اُدھر بھٹکنے لگتا ہے۔ لیکن اثبات خودی کے علاوہ بغاوت کی اور وجوہ بھی ہو سکتی ہیں ' ایسے انسان بھی خدا کی خدائی اور کائنات کے نظام کو تسلیم کرنے سے انکار کر سکتے ہیں جن کی بغاوت میں اپنی کوئی غرض نہیں ' جو اپنی شخصیت کا بیجا فروغ نہیں چاہتے ' جو تکبر کے زعم میں دوسروں کو اپنے مقاصد پر نثار کرنا منطق سے صحیح نہیں ثابت کرتے ۔ یہ باغی دو قسم کے ہیں ' ایک تو وہ جو مظلوم ہیں ' دوسرے وہ جنھیں اوروں کی بیکسی اور مظلومیت کا احساس ہے ۔ " مجذوب " میں نستاسیافلی پوفنا اور " برادران کرمازوف " میں ایوان ان دونوں کی مثالیں ہیں —

نستاسیا فلی پوفنا کا باپ ایک نہایت شریف آدمی تھا جس کی ساری عمر ناگہانی مصیبتوں کا سامنا کرتے گذری ۔ اس کی تقدیر کا آخری وار یہ تھا کہ اس کی عدم موجودگی میں اس کے گھر میں آگ لگ گئی ' اس کی دو بچیاں تو بچ گئیں مگر اس کی بیوی مع کل گھر گرہستی کے جل گئی ۔ اس صدمہ نے اسے ہلاک کر دیا ' اور اس کی دونوں بچیاں لاوارث ہوگئیں ۔ توتس کی قریب کے ایک خوشحال زمیندار نے رحم کھا کر بچیوں کی پرورش اپنے ذمہ لے لی ' اور ان کی تعلیم کا انتظام کر کے انھیں اپنی کسی غریب رشتہ دار کے سپرد

کردیا - بڑی بچی تو چند سال بعد مرگئی - چھوٹی نستاسیا زندہ رهی ' اور جب اس کی عمر بارہ سال کی هوئی تو توتسکی نے دیکھا کہ وہ حسن اور ذهانت میں یکتا هے ' اور اس سن رسیدہ عیاش کے منہ میں پانی آگیا - اس نے نستاسیا کی تعلیم کا اور بہتر انتظام کردیا ' اور جب وہ سولہ سال کی هوگئی تو اپنے ایک دور افتادہ گانو میں ایک مکان بنوایا ' اسے خوب آراستہ کیا ' اور اس میں نستاسیا کو اپنی مدخولہ بنا کر رکھہ لیا - اس کے خیال میں نستاسیا بہت خوش اور مطمئن تھی ' نستاسیا کے دل کی کیفیت کا پتہ اس کو تب چلا جب چار سال بعد اسے ایک شریف لڑکی سے شادی کرنے کا حوصلہ هوا اور وہ نستاسیا سے پیچھا چھڑانے کی تدبیریں سوچنے لگا - نستاسیا اس کے ارادہ کی خبر سن کر تن تنہا گانو سے نکل کر پیٹربرگ پہنچی ' اور پہلی هی گفتگو میں توتسکی کو معلوم هوگیا کہ اسے ایک سیدھی سادی لڑکی سے نہیں بلکہ ایک بیحد چالاک اور بے باک عورت سے سابقہ هے جس کے دل پر اتنے زخم لگ چکے هیں کہ اب اسے زخموں کا کوئی خوف نہیں ' جو دکھہ سہتے سہتے دیوانی هوگئی هے ' اور جسے اپنی زندگی کے بگڑنے کی مطلق پروا نہیں هے - توتسکی کو اندیشہ تو ضرور تھا کہ اب نستاسیا پر قابو رکھنا اس کے بس کی بات نہیں ' لیکن پھر بھی وہ نستاسیا کو راضی رکھنے کی کوشش کرتا رها - جس وقت " مجذوب " کا قصہ شروع هوتا هے ' نستاسیا پیٹربرگ میں پانچ سال رہ چکی تھی ' توتسکی نے اس کے لیے ایک شوهر تلاش کیا تھا اور وہ اور اس کا دوست جنرل اے پانچن نستاسیا کو اس سے شادی کرنے پر آمادہ کر رهے تھے اور

پچھتر ہزار روبل جہیز میں دینے کا لالچ دے رہے تھے۔ نستاسیا کو معلوم تھا کہ وہ شخص جس سے یہ اس کا نکاح کرانا چاہتے ہیں محض روپیہ کی لالچ میں شادی کر رہا ہے اور جہیز کا روپیہ ان دنیاداروں کے خیال میں بڑی سے بڑی قیمت ہے جو ایک عورت کی عزت اور آبرو کی ہوسکتی ہے۔ یہ آخری بے حرمتی، ایک ایسا صدمہ تھی جسے وہ برداشت نہ کرسکی، اور اس دنیا اور ان اخلاقی معیاروں کا منہ چڑانے کے لیے جو ایسا ظلم روا رکھتے تھے اس نے اپنی پچیسویں سالگرہ کے دن ایک محفل میں جس میں توتس کی اور اے پانچن دونوں موجود تھے اپنے آپ کو ایک لاکھ روبل کے بدلے روگوژن، ایک خبطی تاجر کے ہاتھ بیچ دیا، اور توتس کی اور اس کی دی ہوئی دولت اور آسائش کو خیر باد کہہ کو روگوژن اور اس کے شہدوں کے ساتھ چل دی —

اسی محفل میں نواب لف نکولایوچ میشکن "مجذوب" کا ہیرو، جسے کوئی دماغی مرض تھا، اور جو اُسی دن اچھا ہوکر سوئستان سے واپس ہوا تھا، بن بلائے پہنچ گیا تھا۔ محفل میں جانے سے پہلے اس نے اتفاق سے نستاسیا فلی پوفنا کی تصویر دیکھہ لی تھی، اور اتفاق سے دونوں کی ملاقات بھی ہوگئی تھی۔ میشکن کو نستاسیا کی آنکھوں میں ایک باغیرت دل کے درد، پاک آرزوؤں کی تباہی کے غم، اور انسانی فطرت کے کمینہ پن کی شکایت ایسی موثر شکل میں نظر آئی کہ اس کا دل بیتاب ہوگیا، اور اس نے اپنا فرض سمجھا کہ نستاسیا کے پاس جاکر اپنے سر کو اُس کے قدموں پر رکھہ دے، اور اس کے درد اور غم اور شکایتوں کو رفع کرنے کے لیے وہ جو کچھہ کرسکتا تھا اور کرنا چاہتا تھا اُس

کا وعدہ ایک ناچیز تحفے کے طور پر پیش کرے - اس نے اپنا ارادہ پورا کیا، نستاسیا کو یقین دلایا کہ باوجود توتس‌کی کی مدخولہ رہنے، اور آوارگی اور بداخلاقی کی بنا پر بدنام ہونے کے وہ در اصل معصوم اور بے گناہ ہے، اسے وہ واقعات یاد دلائے جب اس نے ایسی شرافت اور غیرت دکھائی تھی جس کا شائبہ بھی اس کے معترضوں میں نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ہی میشکن نے کہا کہ میں شوہر کی حیثیت سے تمام عمر آپ کی خدمت، عزت اور دل جوئی کرنے کو تیار ہوں۔ لیکن نستاسیا اب "بغاوت" پر تل چکی تھی، میشکن کی باتوں کا اور اس کے وعدے کا اس کے دل پر بہت اثر ہوا، مگر اس نے میشکن کی تجویز منظور نہیں کی۔ وہ بہت کچھ برداشت کرچکی تھی، اب اس نے تہیہ کرلیا تھا کہ ہر صورت میں اپنی آزادی محفوظ رکھوں گی، اور جس دنیا نے مجھے بے بس پاکر رسوا کیا اس میں طوفان برپا کرکے اپنی طاقت دکھاؤں گی۔ محفل میں اپنے آپ کو روگوژن کے ہاتھ بیچنے کے بعد وہ اس ارادے پر قائم رہی۔ کچھ دن روگوژن کے ساتھ عیاشی کرکے وہ پیٹر برگ سے بھاگ کر ماسکو میں رو پوش ہوگئی، کیونکہ روگوژن اُس سے شادی کرنا چاہتا تھا؛ پھر جب روگوژن نے اس کا پیچھا کیا تو نستاسیا نے میشکن کے پاس پناہ لی، اور میشکن نے اُس سے نکاح کرنا چاہا تو آخر وقت میں اسے چھوڑ کر روگوژن کے پاس پھر بھاگ گئی۔ یہی واقعہ دو بار پیش آیا، اور آخری دفعہ جب وہ روگوژن کے قبضے میں آئی تو اس نے اسے مار ڈالا "مجذوب" کا آخری سین یہ ہے کہ روگوژن، میشکن کو، جو نستاسیا کی تلاش میں ہے، اس کمرے میں لے جاتا ہے جہاں اس نے نستاسیا کے سینے میں چاقو بھونک دیا تھا،

اور میشکن کو اس کی لاش دکھاتا ہے، پھر دونوں بہکی بہکی باتیں کرتے ہیں؛ اور آخر میں جب دوسرے دن لوگ دروازہ توڑ کر اندر گھستے ہیں تو یہ دیکھتے ہیں کہ روگوژن اور میشکن دونوں پاس بیٹھے ہیں، روگوژن کو سرسام ہوگیا ہے اور وہ رہ رہ کر چلا اُٹھتا ہے، میشکن پھر اِسی دماغی بیماری میں مبتلا ہوگیا ہے جس سے وہ اچھا ہوکر روس آیا تھا، اور اب بالکل پاگل ہے؛ یہ منظر اس قدر پر درد، وحشت انگیز اور دل ہلا دینے والا ہے کہ کوئی صاحب دل اسے پڑھ کر اپنے ہوش وحواس برقرار رکھنے کا دعویٰ نہیں کرسکتا —

نواب میشکن کا دوبارہ پاگل ہوجانا دلیل ہے اس کی ناکامی کی، اور اس کی ناکامی میں خود دستہ ئفسکی بھی شریک ہے، کیونکہ میشکن انسان کامل کا پہلا مجسمہ ہے، جو دستہ ئفسکی نے بنایا اور بنا کر آزمائش کے لیے دنیا کے میدان عمل میں کھڑا کیا۔ میشکن آئین عیسوی کا سچا پیرو ہے، گو وہ مذہب پر گفتگو نہیں کرتا، اس کے دل میں محبت اور ہمدردی کے سوا کسی اور جذبے کی گنجائش نہیں۔ اس کا سلوک بھی ہر وقت ہر ایک کے ساتھ ویسا ہی ہے جیسے حضرت عیسیٰ کے ایک سچے پیرو کا ہونا چاہیے۔ پہلے پہل اس کی انتہائی سادگی اور سادہ لوحی دیکھ کر لوگ اُسے دیوانہ سمجھتے ہیں، لیکن اسے اپنی پاک دلی، بے نفسی اور بے ریائی ثابت کرنے میں دیر نہیں لگتی اور لوگ خود بخود اس کا احترام کرنے لگتے ہیں۔ اس کی مردم شناسی اور موقع شناسی، دنیاوی نعمتوں سے بے نیازی، لوگوں کی فطرت اور ان کی نیت کا وجدانی علم اسے راست گوئی اور راست بازی کے نقصانات سے محفوظ رکھتا ہے، اور اس کا ذہن اس قدر قوی اور روشن ہے کہ

کبھی کوئی اسے بیوقوف نہیں بنا سکتا ' کو اس کی طبیعت ایسی ھے جس پر دنیا داروں کا خوامخواہ ھنسنے کو جی چاھتا ھے - میشکن نے وہ تمام مرحلے بغیر کسی خاص دشواری کے طے کر لیے جن سے آئین عیسوی کے سچے پیرو کو گذرنا پڑتا ھے ' اس نے لوگوں کو ایک دوسرے سے محبت کرنا ' خطاؤں سے در گذر کرنا ' سچ بولنا ' دوسروں کا بھلا چاھنا سکھایا - اُس نے اپنے اعمال سے یہ ثابت کر دیا کہ اس کی پیروی دنیاوی اغراض کے لیے بھی مضر یا مخدوش نہیں ' جیسا کہ عام طور سے سمجھا جاتا ھے - لیکن نستاسیا پر اس کی شخصیت کا مطلق اثر نہ ھوا ' اور یہ ناکامی اس کی تباھی کا سبب ھوئی ' کیونکہ نستاسیا کو خدا سے اور دنیا سے خوش نہ کر سکنا گویا یہ تسلیم کرنا تھا کہ دل کے بعض دکھ ایسے ھوتے ھیں جن کی دوا مسیحا کے پاس بھی نہیں - میشکن کی ناکامی کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ انسان کو اپنے اوپر پورا اختیار ھوتا ھے ' اور اسے کوئی اس پر بھی مجبور نہیں کر سکتا کہ اپنی بھلائی چاھے - عموماً انسان اپنے آپ کو مجبور سمجھتا ھے ' اور اس مجبوری کا احساس اس قدر قوی ھوتا ھے کہ اُسے اپنے اختیار کی مطلق خبر ھی نہیں ھوتی - لیکن اگر کسی انسان کو ویسے ھی روحانی صدمے پہنچیں جیسے نستاسیا نے برداشت کیے اور وہ بیزار ھو کر اپنے کل اختیار کو عمل میں لائے تو اُسے کوئی قابو میں نہیں لا سکتا ' پھر نہ مسیحی ایثار اور محبت کام آتی ھے نہ دنیاداروں کی نصیحتیں اور عقل سلیم کی ھدایتیں * —

---

* دستہ ئف سکی کے خیالات کو سلسلے سے بیان کرنے میں ھمیں " مجذوب " -

(بقیہ نوٹ بر صفحۂ آئندہ)

انسان کا اپنے اختیار کو استعمال کرنا کوئی ایسی نادر بات نہیں ہے - نستاسیا فلی پوفنا کی طرح ہر اخلاقی پابندی کا انکار کرنے والے بہت کم ہوے ہیں ' اور اختیار کی بدولت اپنی ذات کو نقصان پہنچانے والے اور بھی کم - عموماً انسان رسم و رواج ' اخلاقی معیار اور مذہبی احکام کی پابندی سے اُسی وقت انکار کرتا ہے جب ان پر عمل کرنا اسے اپنی ذات کے لیے مضر معلوم ہوتا ہے - اس صورت میں ہم اس کی سرکشی کو غلط اور صحیح ' جائز اور ناجائز قرار دے سکتے ہیں ' لیکن جب اسے وہی شکایتیں ہوں جو نستاسیا کو تھیں ' اس کا دل ویسا ہی ہو ' آرزوئیں وہی ' تو پھر ہر شخص جس میں ہمدردی کی ذرا بھی صلاحیت ہے ' اس پر الزام لگانا ' یا اس کے رویّے کو ناجائز قرار دینا ظلم

پر ناول کی حیثیت سے غور کرنے کا موقع نہیں ملا - لیکن در اصل "مجذوب" میں فلسفہ بہت کم نمایاں ہے - زندگی اور انسانی فطرت کی مصوری کے اعتبار سے وہ دستوئفسکی کا بہترین ناول قرار دیا جا سکتا ہے - جنرل اے پانچن کی لڑکی اگلایا شوخ ' حسین ' تنک مزاج ' دلیر ' جو میشکن سے شادی کرنا چاہتی ہے اور آخر میں نستاسیا فلی پوفنا کے ہاتھوں شکست کھاتی ہے ' لے نجف ' خوشامد خوروں کا سرتاج ' جوہر رئیس کے نسب نامے اور کمزوریوں اور عیاشیوں سے کامل واقفیت رکھتا ہے ! اپولت ' ایک ذہنی باغی جو بڑی دھوم سے ثابت کرتا ہے کہ دنیا رہنے کے قابل جگہ نہیں - اور بڑے جوش اور عقیدت سے اعلان کرتا ہے کہ میں خودکشی کرنے والا ہوں ' مگر آخر وقت میں اس کا پستول نہیں چلتا اور اسے لوگوں کو سمجھانا پڑتا ہے کہ مجھے ناکامیابی پستول کی خرابی سے ہوئی ' اس میں میری ہمت کا قصور نہیں ہے ؛ یہ اور ان کے علاوہ اور بہت سے کیریکٹر ہیں جن کی صورتیں اور مشاغل بیان کرنے میں دستوئفسکی نے مصوری کے کرشمے دکھائے ہیں - لیکن ان کرشموں کی عظمت کا پورا اندازہ ناول پڑھنے ہی سے ہو سکتا ہے ' یہاں اُسے واضح کرنے کی گنجائش نہیں —

سمجھے گا۔ نواب میشکں همدردی اور ایثار کا مجسمہ تھا۔ اِس لیے اُس نے کبھی نستاسیا پر نکتہ چینی نہیں کی، همیشہ اس کے روبرو اپنے آپ کو اور ساری دنیا کو قصوروار بتاتا رہا؛ اور آخر میں جب نستاسیا نے اپنے اختیار کی بدولت جان کھوئی تو میشکن کو اس کی تباھی پر اتنا صدمہ ہوا کہ وہ خود بھی پاگل ہوگیا۔ " مجذوب " کا یہ انجام دستہ ئف سکی کی نزاکت احساس اور نکتہ رسی کی بہت گہری دلیل ھے، مگر گمراہ کا جان کہونا ، اور رھنما کا دیوانہ ھوجانا جبر و اختیار کے اخلاقی معمے کو حل نہیں کرتا ۔" برادران کرمازوت " کے پڑھنے سے معلوم ھوتا ھے خود دستہ ئف سکی کو یقین ھوگیا کہ اگر مفروضہ انسان کامل درد کی صدا سن کر اسی طرح تڑپ اُٹھے اور بد حواس ھوجائے جیسے نواب میشکن تو اس کا انجام دیوانگی کے سوا اور کچھہ ھو نہیں سکتا ۔ اس لیے اُس نے انسان کامل کا ایک اور مجسمہ بنایا؛ درد کی صدا ویسی ھی دلسوز رکھی، مگر اپنے هیرو کے دل کو پگھل جانے کی کمزوری سے بچالیا۔ " برادران کرمازوت " میں درد کی صدا اوان کرمازوت بلند کرتا ھے ، اور وھی باغی بھی ھے ، الک سے ئی (الیوشا) کرمازوت ، اس کا چھوٹا بھائی مسیحی اوصاف کا نیا مجسمہ ھے —

" برادران کرمازوت ، دستہ ئف سکی کا سب سے لمبا ناول ھے ، لیکن پھر بھی اسے نامکمل سمجھنا چاھیے ، کیونکہ دستہ ئف سکی کا ارادہ تھا کہ اُس کے سلسلے کو جاری رکھے ، اور الیوشا (الک سے ئی) کرمازوت کی مفصل سرگذشت بیان کرے۔ دستہ ئف سکی کو موت نے آگھیرا اور وہ اپنا ارادہ پورا نہ کرسکا ، جس کی وجہ سے الیوشا کی شخصیت کا صرف خاکہ سا بن کر رہ گیا ، اور اس کے ذریعہ سے دستہ ئف سکی نے

تشکیل زندگی کے جو دل فریب منصوبے باندھے تھے وہ پورے نہیں ہوسکے - ناول کا دوسرا پہلو، جس میں شک اور بغاوت نئے رنگ میں دکھائی گئی ہے، بہت زیادہ مکمل ہے، اوان کرمازوت کا فلسفہ بہت وضاحت سے بیان کیا گیا ہے، اور ناول کی موجودہ شکل میں وہی اس کا سب سے زیادہ دلچسپ پہلو ہے - الیوشا اور اوان کرمازوت کے علاوہ ان کا بڑا بھائی متیا (دمتری کرمازوت)، ان کا باپ، فیوتوورپا فلووچ کرمازوت سمبر حیں کوت، فیوتوورپا فلووچ کا حرامی لڑکا، اور ایک رھبان زوسیما ناول کے ممتاز کیرکٹر ھیں، اور ناول کا بہت بڑا حصہ ان کی سرگذشت سنانے میں صرف ھوتا ہے، اس ناول کے نسوانی کیرکٹر، بہت کمزور ھیں، اور نستاسیا فلی پوفنا، اگلایا، "بیکس و مظلوم" کی ھیروئن نتاشا، یا "جرم و سزا" کی ھیروئن سونیا کے مقابلے میں وہ مصنوعی اور بے جان معلوم ھوتے ھیں —

فیوتوورپا فلووچ کرمازوت ایک عیاش، بدطینت، خود غرض اور بے حیا آدمی ہے - جس کے ساتھہ کسی قسم کی انسانیت برتنا محال ہے، اور وہ ایک کسوٹی ہے جس پر دستہ‌ئف سکی نے اس کے تینوں بیٹوں کی فطرت کا امتحان لیا ہے - متیا، اس کا سب سے بڑا لڑکا، دل کا بہت اچھا مگر آوارہ اور شرابی ہے، اُسے اپنی طبیعت پر مطلق قابو نہیں ہے، اور وہ شروع سے کھلم کھلا اپنے باپ کی جان لینے کی قسمیں کھاتا رھتا ہے - اوان کرمازوت کا بھی خیال ہے کہ ایسے آدمی کو جینے دینا ایک جرم ہے، لیکن وہ اپنے خیال کو بے تکے پن سے ظاھر نہیں کرتا، وہ متیا کی طرح فضول خرچ نہیں ہے، اِسے باپ سے روپیہ مانگنے کی ضرورت نہیں ھوتی، اس لیے وہ اس مسئلہ پر خیر و شر

کے بلکہ تر مسائل کی تہہ میں غور کرتا ہے۔ اس میں اتنا جوش نہیں ہے کہ اپنے خیالات پر عمل کرنے کے لیے بیتاب ہو، مگر جیسا کہ آگے چل کر بیان ہوگا؛ فیودور پاؤلووچ کے حق میں اس کے خیالات متیا کے ارادوں سے کچھ بہتر نہیں - الیوشا اپنے دونوں بھائیوں سے مختلف ہے۔ وہ باپ سے لڑتا جھگڑتا نہیں، اس کی نسبت اچھے یا برے خیالات نہیں رکھتا، اور گو اُسے بھی باپ کی حرکتوں پر بہت صدمہ ہوتا ہے، وہ خاموشی سے کنارہ کش ہوجاتا ہے۔ ایک روز اچانک فیودور پاؤلووچ اپنے کمرہ میں مراہوا پایا جاتا ہے، اور حالات کچھ ایسے ہیں کہ متیا پر شبہہ ہوتا ہے۔ متیا اس رات کو چھپ کر اس کے کمرہ تک آیا تھا، لیکن اُسے یکبارگی خیال ہوا کہ میں اپنے باپ سے اس قدر نفرت کرتا ہوں کہ اُسے مارڈالوں تو کوئی تعجب نہیں، اور اس خیال نے اس کے دل میں اتنی وحشت پیدا کردی کہ وہ بھاگ گیا۔ اُس کے لیے اپنی بیگناہی ثابت کرنا دشوار کیا ناممکن تھا، اور آخر میں اسے سزا بھی ہوگئی، لیکن باپ کا قاتل وہ نہیں تھا بلکہ سمبرحیا کوف، فیودور کو پاؤلووچ کا حرامی لڑکا جو اس کے یہاں ملازم تھا۔ جرم کی منطق اور مجرم کی نیت کا اوان کرمازوف کے خیالات سے بہت گہرا تعلق تھا۔

ایک مرتبہ سارا کرمازوف خاندان رہبان زوسیما کی کوٹھری میں جمع تھا۔ رہبان کو معلوم ہوا تھا کہ اوان نے کچھ عرصہ پہلے ایک مضمون میں کلیسا اور ریاست کے باہمی تعلقات پر بحث کرتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ "اگر انسان کی روح کو بقا نہیں ہے تو نیکی کا بھی حقیقت میں کوئی وجود نہیں"۔ یہ سن کر رہبان زوسیما نے کہا کہ "اگر تمہارا یہی عقیدہ ہے تو تم یا تو بڑے خوش

نصیب ہو یا پھر بہت بدنصیب ... تمھارے دل میں ابھی اس مسئلے کا قطعی فیصلہ نہیں ہوا ہے، اور یہی بات تمھیں سب سے زیادہ دکھ پہنچائے گی، کیونکہ تم کو ہروقت خیال رہے گا کہ اس مسئلے کا قطعی فیصلہ ہو جانا چاہئیے "۔ دراصل یہ مسئلہ اوان کو ہر لمحہ پیچ و تاب میں رکھتا ہے، اور اس کے دل میں کانٹے کی طرح چبھتا رہتا ہے۔ روح کی بقا کا سوال اور بہت سے مسئلوں سے وابستہ ہے جو اوان کے دل اور دماغ کو مصروف رکھتے ہیں اور اُسے کسی عقیدے پر استقلال سے قائم رہنے کا موقع نہیں دیتے۔ اوان کو اپنی عقل اور دانائی پر گھمنڈ نہیں، وہ خدا کے وجود پر بحث نہیں کرتا، بلکہ شروع ہی سے اُسے تسلیم کرلیتا ہے۔ وہ یہ بھی مان لیتا ہے کہ خدا کے وجود کی طرح تقدیر کی مصلحتوں کو سمجھنا عقل کے امکان سے باہر ہے۔ وہ یوم جزا کا معتقد ہے، اسے یقین ہے کہ اس روز انسان کے اعمال کا حساب ہوگا، اور خدا کے عدل و انصاف، اور اس کی رحمت کا جلوہ نظر آئے گا۔ لیکن اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو بغاوت پر، یا جیسے کہ وہ خود کہتا ہے "خدا کو نہایت ادب کے ساتھ اپنے داخلے کا ٹکٹ واپس دے دینے پر" مجبور پاتا ہے۔ اُسے منظور نہیں کہ انسانی اخلاق کو عذاب اور ثواب کے قانون پر منحصر کیا جائے، ثواب کی امید میں انسان سے بے شمار تکلیفیں اٹھانے اور دکھ سہنے کو کہا جائے۔ اور پھر وہ گناہ کرے تو اُسے سزا دی جائے۔ ممکن ہے علت اور معلول کے نظریے سے ثابت کردیا جائے کہ انسان خود اپنی مصیبت اور دکھ کا ذمہ دار ہوتا ہے، مگر اس توضیح سے کسی کا دکھ درد رتی برابر بھی کم نہیں ہوتا، اور جس شخص کو دوسروں کے درد کا احساس ہو اور

جو اس درد کو بالکل مٹانا چاہتا ہو، اُسے علت و معلول کے نظریے سے کیا تسلی ہو سکتی ہے۔ اوان کو اپنے اعتراضات کا کہیں بھی خاطر خواہ جواب نہیں ملا ہے پھر بھی وہ اس پر تیار ہے کہ اپنا دل مضبوط کرکے ان لوگوں کے دکھ درد کو نظر انداز کرے جو سزا و جزا کے قانون سے واقف ہیں جو کچھ کرتے ہیں جان بوجھ کر کرتے ہیں اور یوں سزا کے مستحق ہوتے ہیں، لیکن اوان کہتا ہے کہ دنیا میں صرف سمجھدار لوگوں کو نہیں بلکہ معصوم اور بے گناہ بچوں کو بھی بے انتہا اذیتیں پہنچتی ہیں۔ ان کا کوئی سبب نہیں، اور انہیں دیکھتے ہوے کوئی شخص بھی جس کے دل میں ذرہ بھر محبت اور درد ہے اس دنیا میں رہنا اور اس کے نظام کو تسلیم کرنا گوارا نہیں کر سکتا۔ "میں یہ سمجھ سکتا ہوں کہ لوگ سب یکساں گنہگار ہوتے ہیں، میں یہ بھی جانتا ہوں کہ ان کی مصیبتوں کا ان کے گناہوں سے بہت گہرا تعلق ہے، لیکن بچے تو مجرم اور گنہگار نہیں ہو سکتے، اور اگر دراصل وہ بھی اپنے والدین کی بدکرداریوں میں شریک ہوتے ہیں تو جس منطق سے یہ شرکت ثابت کی جاتی ہے وہ اس دنیا کی منطق نہیں اور میری سمجھ میں نہیں آ سکتی"۔ اس سے کچھ پہلے وہ کہہ چکا ہے: "اگر سب کو دکھ سہنا اس وجہ سے لازمی ہے کہ پھر دائمی مسرت حاصل کرسکیں اور زندگی میں کامل ہم آہنگی قایم ہو سکے● تو پھر براہ کرم

● عیسائیوں کا یہ عقیدہ ہے کہ دین عیسوی کی سچی پیروی کی جاے تو دنیا میں کامل ہم آہنگی قایم ہوجاے گی۔ یہ بھی ایک عقیدہ ہے کہ قیامت کے روز اُن نیک لوگوں کو جنھوں نے حق کے لیے اپنی ساری مصیبتیں صبر سے برداشت کی ہیں، خدا کی مشیت کے تمام راز معلوم ہو جائیں گے۔ اِس روز گویا حق کی فرماں روائی ہوگی —

یہ تو بتاؤ کہ بچوں پر دکھہ سہنا کیوں لازمی ہے؟" اوان نے ادھر اُدھر سے واقعات یہ دکھانے کے لیے جمع کئے ہیں کہ بچوں کے ساتھہ کیا کیا ظلم کیا جاتا ہے، وہ کس بے بسی سے خدا سے دعا مانگتے ہیں، اور ان کے معصوم دلوں کو کیسے کیسے صدمے پہنچتے ہیں۔ ان کے درد سے اوان کو اس قدر تکلیف ہوں ہے کہ وہ روز جزا کو، اس بصیرت کو، جو قیامت کے دن مشیت کے کل راز واضح کردے گی اور ہر دل سے کدورت اور شکایت دھو ڈالے گی، اور اس وعدے کو کہ دنیا میں جو بیگناہ دکھہ سہے گا اسے جنت کی مسرت اجر میں ملے گی، اپنے دل کی تسلی کے لیے کافی نہیں پاتا۔ وہ کہتا ہے: "میں تلافی چاہتا ہوں... قیامت کے روز نہیں، جو خدا جانے کب ہوگا اور کہاں، بلکہ اسی دنیا میں اور ابھی، تاکہ میں اسے سمجھہ سکوں، میری اپنی آنکھیں اسے دیکھہ سکیں..." اس خوف میں کہ کہیں آخرکار قیامت کے روز پاک دلوں کی محبت کا جلوہ دیکھہ کر وہ خود بھی خدا کی شان میں گیت گانے لگے، وہ کہتا ہے: "جب تک موقع ہے میں اپنے آپ کو ہر طرح سے بند اور محفوظ کرلوں گا، اور تب کہدوں گا کہ مجھے بلند روحانی ہم آہنگی کی حاجت نہیں۔ یہ بلند ہم آہنگی بہت گراں ہے۔ اگر یہ اُس... مظلوم بچی * کے آنسوؤں کے مول ملے جس نے اپنی ننھی ننھی مٹھیاں سینے پر ماریں اور اس گندی کوٹھڑی میں ایسے

---

* اوان اس سے پہلے اسی بچی کا قصہ سنا چکا ہے۔ بچھونا گندا کرنے کی سزا میں ماں باپ نے سردی کے موسم میں اس کے کپڑے اتار کر اور اسی کے چہرے پر گو لیپ کر پاخانے میں بند کر دیا، اور خود جا کر چین سے سو رہے —

آنسو بہا کر جن کا کسی نے بدلہ نہیں لیا ا پنے " پیارے اللہ میاں " سے دعائیں مانگیں کہ مجھے مصیبت سے چھڑاؤ ' بہت گراں ملی' کیونکہ بچوں کے آنسوؤں کا کوئی بدلہ نہیں لیا گیا - اور ان کا بدلہ لینا لازمی ہے ' کیونکہ اس کے بغیر ہم آہنگی بھی نہیں ہوسکتی - لیکن ان کا بدلہ لیا جائے تو کس صورت سے ... کیا اس طرح سے کہ مجرموں کو سزا دی جائے ' سزا دینے سے کیا فائدہ ؟ ... دوزخ کے عذاب سے کیا کام چل سکتا ہے جب یہ بچے جتنا دکھ سہہ سکتے تھے سہہ چکے ہیں - اور پھر یہ ہم آہنگی اور حق کی فرماں روائی کیسی جس کے ساتھ ساتھ جہنم کا عذاب بھی ہے : میں تو چاہتا ہوں سب کی خطائیں معاف کرنا ' سب کو محبت سے گلے لگانا ' میں چاہتا ہوں دنیا سے دکھ کو مٹا دینا - اور اگر بڑوں کے دکھ کے ساتھ بچوں کا دکھ بھی شامل کرنا ضروری ہے کہ حق کی پوری قیمت دی جا سکے تو میں پہلے ہی سے باصرار کہے دیتا ہوں کہ حق کی ہرگز اتنی قیمت نہیں ہو سکتی - ... میں نہیں چاہتا ' ہم آہنگی اور حق کی فرماں روائی' اور نہیں اس وجہ سے چاہتا کہ مجھے انسان سے محبت ہے - میں حق کی حکمرانی نہیں تسلیم کروں گا ' میں اس دکھ میں محو رہوں گا جس کا کوئی بدلہ نہیں لیا گیا ہے - میں یہی بہتر سمجھتا ہوں کہ اپنے اس دکھ پر جس کا کوئی بدلہ نہیں لیا گیا ہے ' اپنی شکایتوں ' اور شکایتوں کے پیدا کیے ہوے غصے پر قائم رہوں ' چاہے میں غلطی ہی پر کیوں نہ ہوں - ہم آہنگی اور حق کی فرماں روائی کی قیمت بہت اونچی لگائی ہے - میری جیب میں اتنے دام نہیں کہ داخلے کا ٹکٹ خرید سکوں - اس لیے میں داخلے کا ٹکٹ بلا تامل فوراً واپس کردوں گا - اور اگر میں ایماندار آدمی ہوں تو جس قدر جلد ممکن ہو مجھے ٹکٹ واپس کردینا چاہئے - الیوشا *

میں خدا کے وجود سے انکار نہیں کرتا، صرف اپنا ٹکٹ نہایت ادب کے ساتھہ واپس دے رہا ہوں "—

اوان کی بغاوت اور اس کی شکایتوں پر اگر واقعی غور کیا جائے تو اُس سکون اور اطمینان کو خیر باد کہنا ہوگا جو مذہب اور عقیدے کے ذریعے سے انسان حاصل کرتا ہے۔ الیوشا، اوان کا چھوٹا بھائی جس میں مذہب کا سچا جذبہ ہے، اور جو دین عیسوی کا مخلص پیرو ہے اپنے پختہ عقیدے کے باوجود اوان کی کسی دلیل کو رد نہیں کرتا اور نہیں کرسکتا ۔ آخر میں، جب حضرت عیسیٰ کی شخصیت پر گفتگو ہوتی ہے، اور الیوشا حضرت عیسیٰ کے ایثار کو معصوموں کے درد کا کفارہ ثابت کرنا چاہتا ہے۔ تو اوان اسے ایک مضمون سناتا ہے جو اُس نے کچھہ عرصے پہلے لکھا تھا۔ اس مضمون کا عنوان "اسقف اعظم" * ہے، اور اس میں رومن کیتھلک کلیسا کا ایک بڑا عہدہ دار حضرت عیسیٰ کو، جو دوبارہ دنیا میں آئے ہیں، قید کر دیتا ہے اور قید خانے میں جاکر اُنھیں سمجھاتا ہے کہ اُس نے اُنھیں کس وجہ سے قید کیا ہے اور دوسرے روز زندہ جلادینے کی سزا کیوں دے گا۔ اسقف کسی شبہے میں نہیں ہے، اسے بالکل یقین ہے کہ اُس کا قیدی حضرت مسیح کے سوا اور کوئی نہیں، مگر اس کی وجہ سے وہ اپنے قیدی کو سزا دینے پر اور بھی

---

* الکسے ئی کرمازوت، اوان کا چھوٹا بھائی جو اس تقریر میں اس کا مخاطب ہے —

* اس مضمون کا مفصل ترجمہ رسالۂ "جامعہ" بابت سنہ ۱۹۲۸ میں شائع ہوچکا ہے —

تل جاتا ہے، اس لیے کہ اُسے دین عیسوی اور خود حضرت عیسیٰ کی ذات سے بہت شکایتیں ہیں۔ رات کو وہ اپنے قیدی حضرت عیسیٰ کے پاس جاتا ہے، اُنھیں وہ تین ترغیبیں * یاد دلاتا ہے جن سے شیطان نے اُنھیں بہکانے کی کوشش کی تھی، اور اس پر بہت لعنت ملامت کرتا ہے کہ انھوں نے شیطان کا کہنا نہیں مانا۔ پہلی ترغیب یاد دلا کر اسقف کہتا ہے: "تجھے معلوم ہے کہ صدیاں گذرتی جائیں گی اور نوع انسانی اپنی عقل اور علم کے ذریعے سے اس کا اعلان کرے گی کہ انسان مجرم نہیں ہوتے۔ اور ظاہر ہے گناہگار بھی نہیں، صرف بھوک کے مارے ہوتے ہیں۔ اور پھر اگر روحانی غذا † کے نام سے تیرے پیرو ہزار اور دس ہزار ہوں گے تو ان لاکھوں اور کروڑوں ہستیوں کا کیا انجام ہوگا جن میں اتنی قوت نہیں کہ روحانی غذا کی فکر میں اپنے پیٹ کی بھوک بھول جائیں۔ یا تجھے صرف تیرے ہزار دس ہزار بلند حوصلے اور قوی ارادے والے پیرو عزیز تھے، اور باقی، کروڑ دو کروڑ،

---

* پہلی ترغیب یہ تھی کہ شیطان نے حضرت عیسیٰ سے کہا کہ "ان پتھروں کو حکم دے کہ روٹی بن جائیں" مگر حضرت عیسیٰ نے جواب دیا کہ "انسان صرف روٹی کے سہارے نہیں جیتا ہے"۔ تب شیطان نے حضرت عیسیٰ کو ایک اونچے مینارے پر لے جا کر کھڑا کردیا اور کہا کہ اگر تجھے خدا پر بھروسہ ہے تو نیچے کود پڑ۔ حضرت عیسیٰ نے جواب دیا کہ خدا کی آزمائش کرنا منع ہے۔ آخر میں شیطان اُنھیں ایک اونچے پہاڑ کی چوٹی پر لے گیا اور کل روئے زمین کا منظر دکھا کر کہا کہ اگر تو میری پرستش کرنے پر راضی ہوجائے تو میں تجھے ساری دنیا کا بادشاہ بنا دوں گا۔ حضرت عیسیٰ نے خفا ہوکر اُسے اپنے سامنے سے بھگا دیا —

† یعنی سچی روحانیت اور عقیدت جس کی طرف حضرت عیسیٰ نے اپنے جواب میں اشارہ کیا تھا کہ "انسان روٹی کے سہارے نہیں جیتا" —

بلکہ ساحل کی ریت کی طرح بے شمار انسانی ہستیاں جو کمزور ہیں
مگر تجھ سے محبت رکھتی ہیں، صرف اس مسرت کی ہیں کہ تیرے بلند
حوصلے اور مضبوط ارادے والوں کا تختۂ مشق بنیں؟" اسقف کا عقیدہ
ہے کہ اگر حضرت عیسیٰ نے لوگوں کے پیٹ بھرنے کا ذمہ لیا ہوتا اور
اُنھیں روحانی غذا پر پالنے کی فکر نہ کرتے تو بہت کامیابی ہوتی
اور انھوں نے نوع انسانی کی محبت کا دعویٰ ثابت کر دیا ہوتا۔
لیکن اگر اُنھیں یہ منظور نہیں تھا تو انھیں انسان کی رہبری کا وہ
دوسرا طریقہ اختیار کرنا چاہیے تھا جس کی طرف شیطان نے اشارہ
کیا تھا: یعنی معجزہ، اِس لیے کہ غذا کے برابر اگر انسان کی کوئی
ضرورت ہے تو یہ کہ اُس کے ضمیر کا کوئی محافظ بن جائے۔ اور ضمیر
کا محافظ وہ اسی کو بنائے گا جو معجزے کے ذریعے سے اس کے ذہن پر
جادو کردے۔ اسقف حضرت عیسیٰ سے پوچھتا ہے "کیا تو بھول گیا تھا
کہ انسان چین آرام کو، بلکہ موت کو، بھی اس پیچ و تاب سے زیادہ
قابل برداشت سمجھتا ہے جس میں خیر و شر میں تمیز کرنے کی ذمہ داری
اسے مبتلا کر دیتی ہے۔ ضمیر کی آزادی کی انسان کو بہت ہوس
ہوتی ہے، لیکن یہ آزادی اس کی سب سے بڑی مصیبت بھی ہو جاتی
ہے... دنیا میں تین قوتیں ہیں، صرف تین، جو ہمیشہ کے لیے ان
کمزور باغیوں کے ضمیر کو قابو میں لاسکتی ہیں اور اسے فریفتہ کر کے
ان لوگوں کی مسرت کا ذریعہ بن سکتی ہیں، اور یہ تین قوتیں ہیں
معجزہ، مذھبی اسرار، اور اقتدار - تونے پہلے دوسرے اور تیسرے
سب سے انکار کر دیا اور اپنی ذات کو اس انکار کی ایک مثال بنا
دیا... تجھے امید تھی کہ تیری پیروی کرتے ہوئے انسان اپنی عقیدت

کے استحکام کے لیے خدا کی ذات کو کافی سمجھے گا اور اسے معجزہ کی حاجت نہیں ہوگی - لیکن کیا تجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ جہاں انسان نے معجزے سے بے نیازی ظاہر کی وہ خدا سے بھی پھر گیا ' کیونکہ انسان کو حق کی اس قدر تلاش نہیں ہوتی جتنی معجزے کی ... ہم نے تیری تحریک کی اصلاح کرکے اسے معجزے' مذہبی اسرار اور اقتدار پر قائم کردیا۔ اور ان لوگوں کو اس پر بہت خوشی ہوئی ... " —

عام انسان کے ' اور اس شخص کے نقطۂ نظر سے جو عام انسانی فطرت کو سمجھتا ہے آئین عیسوی پر اِس سے زیادہ بھاری اعتراضات نہیں کیے جا سکتے جو اسقف اعظم نے اپنے قیدی کو سنائے ' اور ان اعتراضات کو اگر ان دلیلوں میں شامل کر دیا جاے جن کی بنا پر اوان نے کائنات اور زندگی کے نظام کو تسلیم کرنے سے انکار کیا تھا تو عقیدت اور مذہب کی جڑ کٹ جاتی ہے - لیکن جیسا کہ اوان خود تسلیم کرتا ہے -" باغی ہوکر جینا مشکل ہے ' اور میں جینا چاہتا ہوں "- اس سے کچھ پہلے وہ کہہ چکا ہے : " میں زندہ رہنا چاہتا ہوں ' اور زندہ ہوں ' خواہ یہ میری منطق کے خلاف ہی کیوں نہ ہو - میں کائنات کے نظام کو درست نہیں مانتا تو کیا حرج ہے ' مجھے وہ کونپل تو عزیز ہے جو بہار میں پھوٹ نکلتی ہے - مجھے اِس نیلے آسمان سے تو محبت ہے ' میری سرشت میں وہ چیز تو ہے جو کبھی کبھی کسی سے خاص شخصی لگاؤ پیدا کر دیتی ہے ' اور معلوم نہیں ہوتا کیوں' میں انسان کی بعض کوششوں کی دل سے قدر کرتا ہوں جن کے مطلب اور مقصد سے زمانہ ہوا مجھے کوئی عقیدت نہیں رہی ... اس میں عقل اور منطق کو دخل نہیں ' اس محبت میں اِنسان کی کل ہستی شامل ہوتی ہے ' یہاں تک کہ اس کا معدہ اور آنتیں بھی ' یہ محبت گویا

نئی نئی حاصل کی ہوئی قوت کا جوش ہے " اوان کی بدقسمتی یہی ہے کہ وہ یہ نہیں طے کر پاتا کہ زندہ رہنے کی خواہش زیادہ قوی ہونی چاہیے یا زندگی کے معنی اور مقصد سمجھنے کی، اور چونکہ اس کی طبیعت غور و فکر کی طرف زیادہ مائل ہے، اس کشمکش کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی ذہنی " بغاوت " کے باوجود زندہ رہنا کمینہ پن قرار دیتا ہے، اور مذہب و اخلاق سے اس قدر بددل ہو جاتا ہے کہ عملی زندگی میں ان مخدوش اصولوں کو اپنا معیار بناتا ہے کہ " سب کچھ جائز ہے "- اور ہر شخص جس بات کی چاہے خواہش کر سکتا ہے، حتیٰ کہ دوسرے کی موت بھی۔ اس معیار کے مطابق خاندانی معاملات کے متعلق وہ یہ رائے قائم کرتا ہے کہ " دو درندے ایک دوسرے کو پھاڑ کھائیں گے " اور اپنے بڑے بھائی اور باپ کی جانی دشمنی رفع کرنے کی مطلق کوشش نہیں کرتا - سمبرحیاکوت نے جو اس کے باپ کے قتل کی فکر میں تھا، اِس کی بے پروائی اور بے تعلقی دیکھ کر اسے مشورہ دیا کہ چند روز کے لیے پاس کے ایک گاؤں چرماش‌نیا چلے جاؤ اس خیال سے کہ اگر اوان اپنے باپ کا قتل نہیں چاہتا ہے تو وہ یہ مشورہ منظور نہیں کرے گا، کیونکہ سب کو معلوم تھا کہ تین چار روز کے اندر کوئی بڑا حادثہ ہونے والا ہے - اوان چرماش‌نیا کے بجائے ماسکو چلا گیا - وہاں جب اسے خبر ملی کہ اس کا باپ مار ڈالا گیا ہے اور اس کے بڑے بھائی پر قتل کا الزام لگایا گیا ہے تو وہ فوراً واپس آیا - پہلے اسے یقین تھا کہ باپ کو اس کے بڑے بھائی نے مارا ہے، لیکن سمبرحیاکوت سے تین چار مرتبہ گفتگو کرنے کے بعد اسے معلوم ہوا کہ اصل مجرم وہ خود ہے، کیونکہ اس کا ماسکو چلا جانا سمبرحیاکوت کے لیے گویا قتل کی

اجازت تھی۔ ایوان نے یہ کہہ تو دیا تھا کہ" دو درندے ایک دوسرے کو پھاڑ کھائیں گے" لیکن جب اس کا اپنے اصول کے نتائج سے سامنا ہوا اور سمیردیاکوف نے اسے یقین دلا دیا کہ جرم میں بڑی حد تک آپ بھی شریک ہیں تو ایوان کو بہت سخت صدمہ ہوا، اور اس صدمے نے اُسے دیوانہ کر دیا۔ یہ ہوا انجام اس کی "بغاوت" کا۔

ایوان کا چھوٹا بھائی الیوشا اپنے دل میں اسی قدر درد اور انسانی ہمدردی رکھتا ہے جتنی ایوان، مگر اُس کی شخصیت بغاوت کی طرف مائل نہیں ہوتی اور عملی زندگی میں شرکت کرنے سے انکار نہیں کرتی، اس وجہ سے کہ درد اور انسانی ہمدردی کے ساتھ ہی الیوشا کی طبیعت میں محبت اور ایثار کا ایک قوی جذبہ ہے جو اُسے دوسروں کی خدمت کرنے پر مجبور کرتا ہے، اور دوسروں کی خدمت کرنے سے اور ان کے دلوں میں محبت کے بیج بونے سے اُسے ایسی تسلی اور تسکین حاصل ہوتی ہے، اپنے عقیدے کی سچائی کے اُسے ایسے کُھلے ثبوت ملتے رہتے ہیں کہ شک اور انکار کی گنجائش نہیں رہتی۔ دل کی وہ خالص بھلائی، پرائے دکھ کی داستان سن کر بے چین ہو جانے اور تڑپ اٹھنے کی وہ پیاری صفت جس نے نواب میشکن کو سیانے سے دیوانہ بنا دیا تھا، اُس کی سرشت میں بھی موجود ہے، مگر ایک شدید مذہبیت کے بھیس میں، جو اسے ان اوصاف کے خطرناک پہلو سے محفوظ رکھتی ہے، اور اس کی شخصیت کے لیے ایک مضبوط سہارا بن جاتی ہے، الیوشا عیسائی ہے، بہت سچا عیسائی، جس کے نہ دل میں کمزوری ہے نہ عقیدے میں، وہ آئین عیسوی کا پیرو بھی ہے اور شیدائی بھی، اور اسے خاص تقویت اس بات سے حاصل ہوتی ہے کہ اس کی عقل مشکل پسند اور

نکتہ چیں نہیں ہے۔ اس کی شخصیت نواب میشکن کی طرح جادو کرنا نہیں جانتی، لیکن نواب میشکن کے مقابلے میں بہت زیادہ محکم اور مضبوط ہے۔ الیوشا روسی قوم، روسی مذہب، اور مذہبیت کی اعلیٰ ترین پیداوار ہے، اور اسے اپنی سر زمین اور ماحول سے بہت گہرا اور سچا لگاؤ ہے، اس کی سیرت اور وہ اصول جن پر وہ تعمیر کی گئی ہے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ دستہ ئفسکی بغاوت، انکار اور شک کے تمام مراحل طے کر کے منزل مقصود پر پہنچ گیا تھا۔ اثبات خودی، غرور اور سرد مہری، جو اثبات خودی کا لازمی نتیجہ ہوتی ہے، انسانی شخصیت کو کامل نہیں بنا سکتی۔ شخصیت کا فروغ صرف ایثار کے دم سے ہوسکتا ہے، لیکن اگر اس ایثار کے ساتھ دل میں قوت برداشت نہ ہو تو کوئی شخصیت اس درد کی تاب نہ لا سکے گی جو زندگی کے مشاہدے اور تجربے سے ہر نیک دل میں اٹھتا ہے، اور وہ اس اختیار کے ہاتھوں شکست کھائے گی جو ہر انسان کو اپنے دکھ اور سکھ کی فکر کرنے کے لیے ازل سے ملا ہے۔ ایثار کی راہ پر بھی انسانی شخصیت صرف اپنے بل بوتے پر نہیں چل سکتی، اسے مدد اور تقویت کی حاجت رہتی ہے، اور یہ اسے صرف مذہب سے، اور مذہبی رہنماؤں کے ایثار کی مثالوں سے حاصل ہوسکتی ہے۔ افسوس ہے دستہ ئفسکی "برادران کرمازوت" کی داستان ختم نہ کر سکا، اور اسے الیوشا کی شخصیت کی پوری شان دکھانے کا موقع نہیں ملا۔ لیکن ہم دیکھ سکتے ہیں الیوشا نے ایسے انداز سے میدان عمل میں قدم رکھا ہے، ایسے شوق اور عقیدت سے اپنا پیغام سنانا، اور محبت اور ایثار کا بیج بونا شروع کیا ہے کہ وہ ضرور ایک روز کامیاب ہوگا۔ الیوشا کی کامیابی، اور اس کی شخصیت کا

کامل بن جانا محض دین عیسوی کے برحق ہونے کا ثبوت نہیں ' بلکہ ہر مذہب ' ہر جماعت کے لوگوں کے لیے ایک نمونہ ' ایک روشن مثال ہے ۔ کیونکہ ہر جگہ آسمان وہی ہے زمین وہی ' دل وہی اور درد وہی ۔ اصل مشکل ہے خدمت کا حوصلہ پیدا کرنا ' اس حوصلے میں محو ہو جانا ' خودی کو بیخودی میں ڈھونڈھنا اور پانا ۔

" ایک مضحک آدمی کا خواب " دستہ ئف سکی کا ایک مختصر اور عجیب سا افسانہ ہے جس میں اس کا خاص فلسفۂ حیات بہت اچھی طرح سے بیان کیا گیا ہے ۔ ایک شخص جو خود کشی کرنے والا ہے خواب دیکھتا ہے کہ وہ ایسے ملک میں پہنچا جہاں کے باشندے بالکل معصوم تھے اور ان کے دل ایسے پاک تھے کہ انھیں یہ شخص جس کا دنیا میں ہر وقت بڑی بیدردی سے مضحکہ اڑایا جاتا تھا کسی طرح مذاق اور تضحیک کا سزاوار نہیں معلوم ہوا ۔ اپنا تعجب اور خوشی ' اور ان لوگوں کی انتہائی نیکی اور خوش اخلاقی ظاہر کرنے کی غرض سے اُس شخص نے ان لوگوں کو اُس دنیا کا سارا حال سنایا جس میں وہ پیدا ہوا تھا ' اور اپنے دل کی ساری شکایتیں بیان کردیں ۔ مگر اسے حیرت ہوئی کہ یہ لوگ افسوس کرنے کے بجاے دنیا والوں پر رشک کرنے لگے ' گناہوں کا مزا چکھنے کے لیے انھوں نے معصومیت کو خیرباد کہی' رفتہ رفتہ وہ تمام برائیاں جن کی انھیں خبر ملی تھی اختیار کرلیں ' اپنی زندگی کو درہم برہم کردیا اور اپنے آپ کو طرح طرح کی مصیبتوں میں مبتلا کردیا ۔ یہ دردناک منظر دیکھ کر مضحک آدمی اپنی حرکت پر بہت نادم ہوا ' اور گو اب یہ لوگ بھی اس پر ہنسنے اور اس کی تحقیر کرنے لگے تھے ' اس نے تہیہ کیا کہ میں اپنی غلطی کے کفارے

میں اپنی زندگی ان لوگوں کی خدمت اور ان کو راہ راست پر لانے کی کوشش میں صرف کروں گا ۔ اس افسانے میں دستہ ؤف سکی نے جبر و اختیار کے مسئلے کو پھر چھیڑا ہے اور یہ دکھایا ہے کہ انسان کے دل میں تجربے اور علم کا پھل چکھنے کا کتنا شوق ہوتا ہے ۔ اس کی ہدایت کے لیے یہ بتا دینا کافی نہیں ہے کہ اس کا نفع کن باتوں میں ہے اور نقصان کن باتوں میں، اور اسے صحیح مسرت اور نجات حاصل کرنے کے لئے کون سا مسلک اختیار کرنا چاہئے ۔ انسان برے اعمال کے نتائج سے ڈرتا بھی ہو تو ان سے باز نہیں آتا، کیونکہ اسے زندگی کا مزہ اسی میں ملتا ہے کہ جو اس کا جی چاہے وہی کرے ۔ ہر شخص کے سامنے نیکی اور سلامت روی کی ہزاروں مثالیں موجود ہوتی ہیں، ہر شخص یہ بھی دیکھتا ہے کہ خود رائی اور بے اعتدالی کی سزا کبھی کبھی ضرور ملتی ہے، پھر بھی راہ راست پر چلنے والے بہت کم ہوتے ہیں اور غلطی اور گمراہی سے دنیا تاریک اور دوزخ کا نمونہ بنی رہتی ہے ۔ نوع انسانی کے رہنماؤں کو صدمے پہنچے ہیں اور ان کی تعلیم بے اثر رہی ہے تو اسی وجہ سے کہ انسان اپنے اختیار کا غلط استعمال کرتا ہے، اپنے سے زیادہ سمجھدار لوگوں کی نصیحت کا کیا ذکر ہے اسے خود اپنی عقل کی ہدایت پر عمل کرنا ناگوار ہوتا ہے جب تک اسے راست روی میں وہی مزہ نہ ملے جو اپنی مرضی پر چلنے میں ملتا ہے ۔ عقل پرست لوگ مذہب کے غیر عقلی پہلو پر بہت اعتراض کیا کرتے ہیں، لیکن مذہب کی بنیاد جذبات پر رکھنے اور نیک جذبے کو صحیح رائے پر ترجیح دینے میں بڑی مصلحت ہے، کیونکہ اس سے راست روی میں ایک خاص کشش اور نیک زندگی میں ایک قوت

پیدا ہوجاتی ہے —

دستہ ئف سکی کے ناولوں پر جو مختصر اور نامکمل بحث یہاں کی گئی ہے اس سے بھی ظاہر ہوجاتا ہے کہ علم، اخلاق، فلسفے اور مذہب کے نقطۂ نظر سے وہ کس قدر بلند پایہ اور بیش بہا تصانیف ہیں۔ وہ محض قصے کہانیاں نہیں ہیں، محض انسانی زندگی کی حقیقت نما تصویریں نہیں ہیں، ان کا شمار دراصل ان الہامی کتابوں میں ہونا چاہئے جنہوں نے ایک قوم کے جاں بہ لب عقیدوں اور حوصلوں میں جان ڈال کر ویرانوں کو آباد کیا ہے اور ایک نئی دنیا تعمیر کی ہے۔ ایک انگریزی نقاد کا خیال ہے کہ "دستہ ئف سکی نے فن ناول نویسی کا خاتمہ کردیا" اور یہ اس اعتبار سے بالکل صحیح ہے کہ دستہ ئف سکی نے اپنے ناولوں میں جو مقاصد پیش نظر رکھے ان سے بڑھ کر حوصلہ کرنا ناول نویس کے لیے ممکن نہیں۔ اس نے ایک فن کو جو ہمیشہ سے دلچسپی فراہم کرنے کے لیے وقف رہا تھا حق کا پیغام بر بنادیا، اور آرٹ اور مذہب کو اس بلندی پر پہنچادیا جہاں وہ دونوں ایک ہوجاتے ہیں۔ دستہ ئف کے پلاٹ سب اُلجھے ہوے ہیں، سیدھا سادہ قصہ سنانے کی اس میں صلاحیت ہی نہیں تھی۔ اکثر جگہ اس نے معمولی باتوں کو جو ناول کے موضوع سے کوئی خاص تعلق نہیں رکھتی ہیں بہت بے جا طوالت دے دی ہے، اور اس کی زبان میں ایک ہذیانی کیفیت ہے جو ان موقعوں پر نہایت ناگوار ہوتی ہے جہاں وہ موضوع کے لحاظ سے ضروری اور موزوں نہیں۔ خالص ادبی خوبیوں کا اس کے یہاں نام تک نہیں۔ اس کی کل تصانیف میں شاید ہی دو

چار جملے ایسے ملیں جو پیچیدہ نہیں ہیں، اور الفاظ کے انتخاب میں اس نے عام طور سے فصاحت کا خون کیا ہے۔ تورگینف کی طرح وہ کسی کی سیرت یا صورت اس طرح نہیں بیان کرسکتا کہ اس کی تصویر آنکھوں میں پھر جائے، اس نے گوگول کی طرح اپنے ناولوں اور ان کے اشخاص کو قومی رنگ میں نہیں رنگا ہے۔ لیکن دستہ ئف سکی کا ایک ناول پڑھنے کے بعد ان دونوں کے ادبی کمالات نظر سے گر جاتے ہیں، "وہ ایک بڑا آرٹسٹ ہے جسے ادنی کمالات کا دماغ نہیں"۔ ادبی دنیا میں اگر کوئی اس کا ہم پلہ قرار دیا جاسکتا ہے تو تالستائی، اور تالستائی کو بڑے سے بڑے ناول نویس استاد مانتے ہیں۔ لیکن تالستائی میں وہ سوز، وہ درد، وہ تڑپ نہیں ہے جو دستہ ئف سکی کے دل میں تھی، اس کے ناولوں کو پڑھ کر دل میں وہ ہیجان نہیں اُٹھتا جو دستہ ئف سکی کے ناول پیدا کر دیتے ہیں، وہ طوفان برپا نہیں ہوتا جس سے پرانی دنیا بگڑتی اور نئی دنیا بنتی ہے —

بعض غلط فہمیاں

از

(جناب پنڈت منوہر لال زتشی صاحب، ایم۔ اے)

رسالہ اردو کے حصہ ۵۱ (جولائی سنہ ۱۹۳۳) میں ڈاکٹر گریہم بیلی کی انگریزی کتاب، اردو لٹریچر کا تبصرہ چھپا ہے۔ میں اس تبصرہ کا ایک ٹکڑا ذیل میں نقل کرتا ہوں —

" ایک انگریز اپنے سیاحت نامے میں لکھتا ہے کہ اہل ہند ہمیں حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور اس کے ثبوت میں اس نے یہ امر پیش کیا ہے کہ یہ لوگ ہمیں (انگریزوں کو) طنزاً گورا (یعنی گھوڑا) یا گھوڑ سلٹہا کہتے ہیں۔ یورپی شخص کی زبان سے گھ اور ڑا کا تلفظ ادا نہیں ہوتا۔ وہ گورا اور گھوڑا کو ایک ہی طرح بولتا ہے اس سے یہ مغالطہ ہوا۔ یہی حال ان یورپی محققین کے ہاتھوں "کھڑی بولی" کا ہوا۔ یہ لوگ "کھڑی" اور "کھری" میں فرق نہیں کر سکتے؛ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ کھڑی کے معنی پاک صاف شستہ اور عام مستند زبان سمجھتے رہے۔ ہمیں اس سے خوشی ہوئی کہ ڈاکٹر صاحب نے اس مغالطے کو رفع کیا ہے لیکن اصل غلطی میں یہ بھی مبتلا ہیں۔ کھڑی اور کھری کا فرق انھوں نے بہت صحیح بتلایا ہے۔ لیکن معنی تقریباً وہی رکھے ہیں

جو کھڑی کے ہیں یعنی مروجہ عام مستند (standard) زبان - اور دوسرا غضب یہ کیا ہے کہ کھڑی بولی کو ایک خاص زبان قرار دیا ہے اور اس کی دو شاخیں بتلائی ہیں ایک ہندی اور دوسری اردو - ڈاکٹر صاحب کا یہ خیال صحت سے اسی قدر بعید ہے جس قدر ان کے پیشرو یورپی محققین کا - کھڑی بولی کے معنی ہندوستان میں عام طور پر گنواری بولی کے ہیں جسے ہندوستان کا بچہ بچہ جانتا ہے وہ نہ کوئی خاص زبان ہے اور نہ زبان کی کوئی شاخ " -

اس طرح کے مغالطے فرنگیوں کو ضرور ہوے ہیں - ڈاکٹر فیلن ہندوستانی زبان کے مشہور محقق ہیں اور ان کے لغات دور دور مشہور ہیں اور سچ یہ ہے کہ بڑے کام کی کتابیں ہیں۔ مگر ایک جگہ ان کو بڑی ٹھوکر لگی۔ اپنی لغت " اے نیو ہندوستانی انگلش ڈکشنری (A New Hindustani - English Dictionary) کے صفحہ ۱۰۷۷ پر ' سگا ' کے تحت میں ایک فقرہ لکھتے ہیں ' یہ تمھارے سگوں میں ہے ' اور اس کا ترجمہ انگریزی میں کرتے ہیں ؟ Is he one of your dogs

ایک دوسرے محقق سر جارج گریرسن ہیں اور انھوں نے واقعی جیسی محبت اور کاوش ہماری زبانوں کے سمجھنے اور سمجھانے میں کی ہے ویسی کوئی کم کرے گا مگر ان سے بڑی غلطی ہوئی اور بڑی فاش غلطی ہوئی - گریرسن صاحب کی ایک کتاب ہے دی ماڈرن ورنیکلر لٹریچر آف ہندوستان (The modern vernacular literature of Hindustan) اس میں ایک مقام پر ہندی کے مشہور شاعر سورداس کا ذکر ہے - سورداس سری کشن جی کے بڑے بھگت تھے - چونکہ اندھے تھے اس واسطے جو کچھ وہ کہتے تھے ایک کاتب لکھا کرتا تھا - ایک روز کاتب موجود نہ تھا - کہا جاتا ہے کہ سری کشن جی اپنے بھگت کے سچے پریم سے اس قدر خوش

تھے کہ اس دن وہ خود تشریف لاے اور کاتب کی جگہ سورداس جی کے اشعار لکھنے لگے - سورداس جی ان کو دیکھہ تو سکتے نہ تھے مگر انہوں نے یہ محسوس کیا کہ آج کا کاتب ایسا چابک دست ھے کہ اس سے پہلے کہ شاعر کے منہ سے الفاظ نکلیں وہ ان کو لکھہ لیتا ھے - معلوم ھوتا ھے کہ وہ اس بات کا انتظار ھی نہیں کرتا کہ الفاظ منہ سے ادا کئے جاتے - بلکہ جیسے ھی خیال ذھن میں آتا ھے وہ اس کو معلوم کرلیتا ھے - سورداس جی نے سمجھہ لیا کہ ایسا کاتب سواے سری کشن جی کے دوسرا نہیں ھوسکتا اور انہوں نے کاتب کا ھاتھہ پکڑ لیا - مگر کرشن جی ھاتھہ جھٹک کر غائب ھوگئے - اس وقت سورداس جی نے کہا —

کر * چھٹکاے جات ھو دربل † جان کے مو نہوں ‡
ھردے § سے جو جاوگے مرد بکھانو †† تو ھی

معنی صاف ھیں سورداس جی فرماتے ھیں کہ مجھے کمزور سمجھہ کر میرا ھاتھہ جھٹک کر آپ چلدیے میں تب جانوں کہ آپ مرد ھیں کہ جب آپ میرے دل سے چلے جائیے - اب ملاحظہ کیجیے کہ مرد کے لفظ کو بجاے جوان مرد اور بہادر سے تعبیر کرنے کے گریرسن صاحب اس کے معنی انسان یا آدمی کے لیتے ھیں - اور کیسی کیسی ٹھوکریں کھاتے ھیں گریریسن صاحب کی شرح یہ ھے —

Thou thrustest away my hand and departest, knowing that I am weak (and pretending that thou art but a man), But not till thou departest from my heart will I confess thee to be a mortal.

اور سنئیے معنی تو یہ سمجھے مگر ثنا و صفت کس قدر کرتے ھیں -

Sur Das then uttered a poem still extant, and in my opinion by far his

---

* کر - ھاتھہ - † دربل - کمزور - ‡ مونہی - مجھہ کو - § ھردے - دل -
†† بکھانو - بیان کروں —

highest flight, the leading idea of which is that though a mortal might thrust him away, no one but God could tear himself from the poet's heart.

تحسین ناشناس اسی کو کہتے ہیں —

جناب نواب نصیر حسین خاں خیال داستان اردو لکھ رہے ہیں۔ لاہور سے اِس سال ایک سالنامہ شایع ہوا ہے کاروان کے نام سے ۔ اس رسالے میں اسی کتاب کا ایک حصہ چھپا ہے جس کی سرخی ہے محکوم کا اثر حاکم پر ۔ جناب خیال فرماتے ہیں —

" ان ادیبوں کی زبانوں پر فارسی لفظیں چڑھ گئیں اور ہمارے بہاری نے آنکھوں کی تعریف میں اپنے بے مثل دوہے امیں ہلاہل مدہ بھرے سیت شام رت نار ۔ جیت مرت جھک جھک پرت جہ چتوت یکبار ۔ میں فارسی کو بڑی محبت سے یاد کیا اور شام یعنی سانجھ کی بہار دکھادی اور اس یکبار پر ہزار بار ہماری نظر اٹھ جاتی تو حیرت کی جگہ نہیں ہے "

یہ دوہا بہت مشہور ہے اور بہاری سے منسوب کیا جاتا ہے مگر اس میں شام کے لفظ کے معنی سانجھ کے نہیں ہیں ۔ یہ لفظ شیام ہے جس کے معنی سانولے کے ہیں اور یہاں مراد آنکھوں کی سیاہی ہے جس کو شاعر نے ہلاہل یعنی زہر سے تشبیہ دی ہے —

اردو کے تبصرہ نگار کو بھی " کھڑی بولی " کے متعلق غلط فہمی ہوئی ہے ۔ صوبجات متحدہ (United Provinces) میں پہاڑی علاقے کی بولیوں کو اور چھوٹے چھوٹے مقامی اختلافات کو چھوڑ کر ہندی کی چار زبانیں بولی جاتی ہیں۔ گورکھپور بنارس وغیرہ مشرقی اضلاع میں بھوج پوری، اودھ

اور اس کے آس پاس الہ آباد تک اودھی ' متھرا اور اس کے نواح میں برج بھاشا اور دلی میرٹھ اور ان کے قرب و جوار میں کھڑی بولی - بعض محقق اس تعداد میں قنوجی کا اضافہ کرتے ھیں - ھندی کی شاعری زیادہ تر اودھی اور برج بھاشا میں تھی - اودھی میں رامچندر جی کے بھگتوں کی مثلاً تلسی داس اور برج بھاشا میں کرشن جی کے بھگتوں کی مثلاً سور داس - کھڑی بولی پہلے نثر کے واسطے استعمال ھوتی تھی- للوجی لال نے فورٹ ولیم کلکتہ میں بیٹھہ کر انیسویں صدی کے آغاز میں پریم ساگر لکھی-اس کے دیباچے کی عبارت ملاحظہ ھو

" ایک سمے ویاس دیو کرت شری مد بھاگوت کے دشم اسکندھ کی کتھا کو چتر بھج مشر نے دوھے چوپائی میں برج بھاشا کیا سو پا تھہ شالا کے لیے .... سمبت ۱۸۶۰ میں سری للوجی لال کوئی برھمن گجراتی سہر او دیچ آگرے والے نے وس کا سار لے یا منی بہا شا چھوڑ دلی آگرے کی کھڑی بولی میں کہہ نام پریم ساگر رکھا "

ھندی کے محققین کہتے ھیں کہ چونکہ ھندی کی یہ شاخ دلی کے نواح میں بولی جاتی تھی اس واسطے اردو کی بنیاد اس پر رکھی گئی ھے اور اردو دراصل ھندی کی اس شاخ کی ایک ترجم شدہ شکل ھے اسی وجہ سے ھندی کی اور شاخوں سے کھڑی بولی اردو سے قریب تر ھے - ھندی نثر کی تصنیفات زیادہ تر کھڑی بولی ھی میں ھوئیں اور اب نظم کے واسطے بھی ھندی کے شعرا اس زبان کو استعمال کرتے ھیں -

صوبجات متحدہ کی جن زبانوں کا میں نے ذکر کیا ان میں گرامر کا کہیں کہیں اختلاف ھے مثلاً

اردو	کھڑی بولی	برج بھاشا	اودھی	بھوج پوری
ہونا	ہونا	ہونو	ہوب	ہوئیل
ہوا	ہویا	بھیو	بھوا	بھئیل
ہوگا	ہوگا	ہوے گو	ہوئی	ہوئی

مگر اس کی تفصیل کا نہ یہ موقع ہے نہ اس کی ضرورت ۔ جن صاحبوں کو شوق ہو تصانیف ذیل کا ملاحظہ کرکے اپنا اطمینان کرسکتے ہیں

(۱) ہندی ساہتیہ کا اتہاس مصنفہ پنڈت رام چندر شکل (انڈین پریس الہ آباد)

(۲) ہندی بھاشا اور ساہتیہ مصنفہ بابو شام سندر داس (انڈین پریس الہ آباد)

(۳) گرامیں ہندی مصنفہ بابو دھیرندر ورما (ساہتیہ بھون لمیٹڈ الہ آباد)

(۴) ہندی بھاشا کا اتہاس مصنفہ بابو دھیرندر ورما (ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد)

(نوٹ ۔ فاضل مضمون نگار کی یہ تحریر بہت دلچسپ ہے ۔ آخر میں انھوں نے کھڑی بولی کے متعلق بحث فرمائی ہے ۔ اردو کے تبصرہ نگار کی رائے میں کھڑی بولی سے مراد وہ بولی ہے جو شستہ اور ادبی زبان نہیں ۔ یعنے اس لفظ کا استعمال شستہ اور ادبی زبان کے مقابلے میں ہوتا ہے ۔ آج کل بھی یہ لفظ انھیں معنوں میں یعنی گنواری بولی کے لیے بولا جاتا ہے ۔ یہ کوئی خاص زبان یا کسی زبان کی شاخ نہیں ہے ۔ للو جی لال نے بھی غالباً انھیں معنوں میں یہ لفظ استعمال کیا ہے ۔ یعنے وہ بولی جو شستہ نہ تھی اور شاعری میں استعمال نہیں ہوتی تھی ۔ یورپی محققوں کو اس سے مغالطہ ہوا اور انھوں نے اسے ایک خاص زبان قرار دیا ۔ جن محققوں کا حوالہ فاضل مضمون نگار نے دیا ہے انھوں نے بھی یورپی محققوں کی تقلید کی ہے ۔ اڈیٹر)

حافظ شیراز کی زندگی پر نئی روشنی

اعتراض کا جواب

از

جناب بشیر احمد ڈار

یہ مضمون، مولوی احتشام الدین کے اعتراض کے جواب میں لکھا گیا ہے جو رسالہ اردو اکتوبر سنہ ۳۰ ء میں شائع ہوا تھا۔ اس مضمون میں صرف انہی اعتراضات کا جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے جن کا تعلق خواجہ حافظ کی زندگی اور شاعری کے ساتھ زیادہ گہرا ہے —

(۱) میں نے خواجہ حافظ کی تاریخ ولادت اور عمر کے سلسلے میں، حافظ اسلم صاحب پر اعتراض کیا تھا۔ میں نے تنقید میں صرف اپنے پہلے مضمون کی طرف اشارہ کردیا تھا جو اردو جنوری سنہ ۲۹ ء میں شائع ہوچکا تھا۔ جہاں میں نے حافظ اسلم کے قیاس کی حقیقت کو واضح طور پر بیان کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہاں میں نے یہ ثابت کیا تھا کہ یہ قیاس غلط ہے۔ دلائل کے لیے مندرجۂ بالا مضمون کا حوالہ کافی ہے لیکن معترض نے بھی حافظ صاحب کے قیاس کی تائید میں ایک اور قیاس دوڑایا ہے۔ البتہ اس کی حقیقت اس جگہ واضح کرنی ضروری ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ " مظفر،

کے عہد میں جب قریب دو سال شراب بند رہ کر دوا بن گئی اور شجاع کے شروع دور میں کھلی تو حافظ کی عمر چالیس سال تھی چنانچہ فرماتے ہیں -

چہل سال رنج و غصہ کشیدیم و عاقبت تدبیر ما بدست شراب دو سالہ بود

اس بیان میں کئی ایک غلطیاں ہیں —

(۱) مظفر کا عہد صرف دو سال نہ تھا بلکہ سنہ ۷۵۴ ھ سے لے کر سنہ ۷۶۰ ھ تک تھا یعنی تقریباً چھہ سال - معترض کو دو سال کا خیال شاید حافظ کے مندرجۂ بالا شعر کے الفاظ "دو سالہ" سے ہوا ہے جو بالکل غلط ہے شراب دو سالہ سے مراد محض شراب کہنہ ہے —

بلکہ در حقیقت اس شعر یا غزل میں حافظ نے اس واقعہ کی طرف کہ مظفر نے شراب بند کردی تھی اور شاہ شجاع نے کھولنے کی اجازت دے دی تھی کوئی اشارہ موجود نہیں اور اگر بقول معترض ہے تو پھر رنج و غم کا زمانہ تو صرف چند سال ہونا چاہئے تھا یعنی صرف وہی زمانہ جب کہ شراب بند رہی (چھہ سال یا بقول معترض دو سال) نہ کہ چالیس سال - لیکن در اصل اس غزل یا شعر میں اس واقعہ کی طرف کوئی اشارہ نہیں —

(ب) معترض کا اس شعر سے یہ اندازہ لگانا کہ شاہ شجاع کی تخت نشینی کے وقت حافظ کی عمر چالیس سال تھی، غلط ہے - غزل سے کسی طرح بھی معلوم نہیں ہوتا کہ حافظ نے یہ غزل شاہ شجاع کے واسطے یا اس کے زمانے میں لکھی - غزل کے آخری دو اشعار ہیں —

آں شاہ تند حملہ کہ خورشید شیر گیر پیشش بروز معرکہ کمتر غزالہ بود

دیدم کہ شعر دلکش حافظ بہ مدح شاہ ہر بیت ازاں سفینہ بہ از صد رسالہ بود

ان اشعار سے تو ظاہر ہے کہ کسی بادشاہ کی مدح کی گئی ہے اور الفاظ سے یہ بھی اندازہ ہوسکتا ہے کہ شاید امیر مظفر کی تعریف ہو۔ لیکن ہم وثوق سے پھر بھی نہیں کہہ سکتے کہ ان اشعار میں حافظ نے کس کی طرف اشارہ کیا ہے اور اگر ہم معترض کے قیاس کو تھوڑی دیر کے لئے تسلیم بھی کرلیں یعنی یہ کہ یہ اشعار شاہ شجاع کے متعلق ہیں تو پھر کیا معترض اس سے یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ یہ شاہ شجاع کی تخت نشینی کے وقت لکھے گئے تھے؟ کم از کم ظاہری شواہد تو اس بیان کی تائید سے بالکل قاصر ہیں —

(۲) اس کے بعد میں نے مظفر کی فتح شیراز کی تاریخ سنہ ۷۵۴ ھ لکھی تھی اور شاہ شجاع کی تخت نشینی کی تاریخ سنہ ۷۶۰ ھ - لیکن معترض کے نزدیک یہ دونوں غلط ہیں۔ پیشتر اس کے کہ میں اس کا جواب لکھوں یہ بھی بیان کردینا مناسب سمجھتا ہوں کہ خود حافظ اسلم صاحب کے مطابق بھی وہ تاریخیں جو میں نے دی ہیں، ٹھیک ہیں۔ چنانچہ حیات حافظ صفحہ ۲۰ پر کہتے ہیں کہ "سنہ ۷۵۴ ھ میں امیر مظفر نے اس کو غافل پا کر حملہ کردیا اور دوسری جگہہ صفحہ ۲۳ میں رقم طراز ہیں کہ "اس (مظفر) کے بیٹے شاہ شجاع نے جب دیکھا کہ عنقریب ملک میں بغاوت ہونی چاہتی ہے تو امراء لشکر کے ساتھہ متفق ہو کر سنہ ۷۶۰ ھ میں مظفر کو گرفتار کر لیا ... اور خود تخت سلطنت پر بیٹھا ..." —

اب ہمیں اصل معاملہ کی طرف رجوع کرنا چاہئے تاکہ "صحیح تاریخ کی فاش" غلطیاں جو تنقید میں رہ گئی ہیں ان کو معترض کے اعتراض کی روشنی میں واضح کیا جاے —

معترض کہتا ہے کہ شاہ ابو اسحاق سنہ ۷۵۰ ھ میں قتل کیا گیا اور اس کی تائید میں دیوان حافظ سے دو قطعات تاریخ پیش کئے ہیں —

(۱) سنبل و سرو وسمن، یا سمن و سوسن و گل   ہست تاریخ وفات شہ سنبل کا کل
جمعہ و بست و یکم ماہ جمادی الاول   درپسیں بود کہ پیوستہ شد از جزو بہ کل

یہ قطعہ نقل کرنے کے بعد آپ فرماتے ہیں کہ "آخری بیت کے آخری لفظ کل سے اعداد کا مجموعہ سنہ ۵۰ یعنی سنہ ۷۵۰ بر آمد ہوتا ہے۔ لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ آپ کی تحقیق کا پہلا جزو بالکل غلط ہے۔ شعر کے مطالعے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ پہلے شعر کا پہلا مصرع تاریخ کے لئے ہے نہ کہ آخری شعر کے دوسرے مصرع کے آخری الفاظ۔ پھر لطف مزید یہ کہ لفظ کل سے صرف پچاس نکلتے ہیں۔ ان سے سنہ ۷۵۰ ھ کا اندازہ لگانا بالکل غلط ہے۔ اصل تاریخ دیکھنی ہو تو پہلے شعر کا پہلا مصرع ملاحظہ ہو۔ مگر معترض نے جس طرح یہ مصرع نقل کیا ہے وہ بالکل غلط ہے۔ عام دواوین میں یہ مصرع یوں ہے "بلبل و سرو وسمن یا سمن و لالہ و گل"۔ اب اگر ان حروف کو گنا جائے تو تاریخ سنہ ۷۵۸ ھ نکل آتی ہے۔ اس بیّن دلیل کی موجودگی میں قطعہ کو مسخ کرنا غلطی ہے —

(ب) ذرا دوسرے قطعہ کو بھی دیکھ لیجئے —

بروز کاف و الف از جمادی الاول   بہ سال ذال و دگر نون جاعل الاطلاق
الخ ...

اس شعر کے آخری مصرع سے تاریخ نکلتی ہے۔ اگر (ذ) اور (ن) کے اعداد کو جمع کیا جائے تو سنہ ۷۵۰ ھ نکلتے ہیں لیکن یہ بالکل غلط ہے۔ پہلی دلیل تو یہ ہے کہ پہلا قطعہ اس کے خلاف شہادت دے رہا ہے۔

اگر ہم پہلے قطعہ کو ویسے ہی رہنے دیں جیسے معترض نے درج کیا ہے تو پھر بھی ان سے سنہ ۷۵۰ ھ نہیں نکلتا - معترض کا فرض تھا کہ وہ اس تضاد کو سلجھانے کی کوشش کرتے لیکن بجائے اس کے انھوں نے قیاس دوڑایا اور لفظ کل ہی سے (جس کے عدد صرف ۵۰ ہوتے ہیں) سنہ ۷۵۰ ھ بنا کھڑے کئے - دوسری دلیل یہ ہے کہ اس شعر کا مصرع ثانی عام دیوانوں میں غلط چھپا ہوا ہے - ایک قلمی نسخہ دیوان حافظ (جو پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے) میں یہ مصرع یوں درج ہے - " بہ سال ذال و دو نون و حا علی الاطلاق " یعنی اگرچہ لکھا "حا" تھا لیکن کسی کاتب نے " دا" کو نون کے نقطہ سے ملا کر علیحدہ لکھ دیا اور بجائے " ... و حا علی الاطلاق " کے " جاعل الاطلاق" بنا دیا - چنانچہ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ کے لئے ہمیں ذال اور نون کے علاوہ ' ح ' بھی جمع کرنی ہوگی جس سے سنہ ۷۵۸ ھ نکلتے ہیں —

واقعہ صرف اتنا ہے کہ سنہ ۷۵۴ ھ میں ابو اسحاق کو شیراز میں شکست ہوئی وہاں سے وہ اصفہان بھاگ گیا جہاں تھوڑی دیر بعد مظفر نے حملہ کیا اور آخر کار سنہ ۷۵۸ ھ میں قتل ہوا - اس بیان کے لئے اگر معترض نے حیات حافظ ہی دیکھ لی ہوتی تو معاملہ صاف ہو جاتا —

اس کے بعد آپ فرماتے ہیں - " الغرض ان قطعات تاریخ سے قطعاً ثابت ہے کہ ناقد نے چار پانچ سال پیشتر جو واقعات گذر چکے تھے ان کو چار پانچ برس بعد قرار دیا ہے " افسوس ہے کہ یہ فیصلہ خود ان کے حق میں وارد ہوتا ہے لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ فرق تو در حقیقت آٹھ برس کا تھا -

میں نے ابواسحاق کی وفات سنہ ۷۵۸ ھ قرار دی تھی اور ان کے دعوے کے نزدیک یہ سنہ ۷۵۰ ھ ہے اور ان آٹھ برس کے فرق کو چھوڑ کر آپ چار پانچ برس کیسے کہہ سکتے ہیں؟ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں کچھ خاص غرض پنہاں ہے۔ اگر معترض کا حساب درست ہو تو جہاں سنہ ۷۵۸ ھ کی بجائے سنہ ۷۵۰ ھ ہے تو یقیناً سنہ ۷۶۰ ھ جو شاہ شجاع کی صحیح تاریخ تخت نشینی ہے، سنہ ۷۵۲ ھ ہونی چاہئے اور پھر حافظ کی پیدائش معترض کے حساب سے (۵۲-۴۰=۱۲) سنہ ۷۱۲ ہونی چاہئے - لیکن یہ تو حافظ اسلم کے بیان کے بالکل منافی ہے اور یہی وہ وجہ تھی جس نے معترض کو مجبور کیا کہ بجائے آٹھ سال کے صحیح فرق کے صرف چار پانچ سال کا فرق پیش کرے اور اس سے شاہ شجاع کی تاریخ تخت نشینی سنہ ۷۵۵ قرار دیکر، چالیس کو اس میں سے منہا کرے تاکہ سنہ ۷۱۵ ھ نکل آئے - اور یہی وہ سنہ ہے جو حافظ اسلم نے خواجہ حافظ کا سنہ پیدائش لکھا ہے - لیکن سب سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ معترض نے اول تو خود حافظ اسلم کی روایت کی تردید کی اور اس کے برعکس شاہ شجاع کی تاریخ تخت نشینی سنہ ۷۵۵ ھ بتاتے ہیں لیکن بعد میں اپنی غلطی تاریخ کی بنا پر، حافظ اسلم کی پیش کردہ تاریخ ولادت کی حمایت کرتے ہیں - یہ بڑی سخت غلطی کا ارتکاب ہے —

ان سب پر طرہ یہ ہے کہ جس شاعر کی بنا پر معترض نے اپنے تمام دلائل پیش کئے ہیں وہ کچھ ایسا موہوم سا ہے کہ اس سے کسی خاص واقعے کیطرف اشارہ نہیں پایا جاتا (جیسے کہ ابھی اوپر دکھایا گیا ہے) اس لئے آپ کا سب قیاس محض ہوا در ہوا رہ جاتا ہے - ٹھیک تاریخ ولادت سنہ ۷۱۵ ھ نہیں، سنہ ۷۲۶ ھ ہے - اس کے متعلق جتنے دلائل میں نے پیش کئے ہیں ان کے لئے رسالہ اردو بابت جنوری سنہ ۲۹ ع کیطرف اشارہ کردینا کافی ہے —

(۳) حیات حافظ کا تاریخی حصہ بہت کچھہ قابل ترمیم ہے - چنانچہ تنقید میں ' میں نے چند ایک ایسی اغلاط کو ظاہر کیا تھا - خاصکر تاریخ اینجو کے سلسلے میں مولف نے بہت غلطیاں کی ہیں - اس زمانے کی تاریخ اگرچہ بذات خود بے معنی ہو لیکن حافظ کی زندگی کے متعلق جس شخص کو صحیح اندازہ لگانا ہو اس کے لئے ضروری ہے کہ ان تاریخی حالات کو واضح طور پر معلوم کرے - اگر مولف حیات حافظ نے اسے چھوڑ دیا تو میرے نزدیک یہ اُن کی کتاب کے نقائص میں سے ایک نقص ہے - تاریخ اینجو پیچیدہ سہی لیکن نہ اتنی طویل جیسا کہ معترض نے اس کا نقشہ کھینچا ہے - اگر حافظ اسلم اس کو اپنی کتاب میں درج کرلیتے تو سوائے ایک دو صفحوں سے زیادہ جگہ درکار نہ ہوتی - مگر کم از کم یہ فائدہ تو ضرور ہوتا کہ کتاب کا تاریخی حصہ بھی صاف اور درست ہوجاتا اور مزید لطف یہ ہے کہ ان اغلاط کو پڑھنے کے بعد بھی معترض اصرار کرتا ہے کہ جو کچھہ مولف حیات حافظ نے لکھا وہی درست ہے —

پھر معترض نے ابن بطوطہ اور روضۃالصفا وغیرہ کی سندوں کے مقابلے کی گفتگو کو چھیڑا ہے - ہم مانتے ہیں کہ ہمعصر کی بات زیادہ قابل غور ہوتی ہے لیکن اگر وہ راوی ہی معتبر نہ ہو تو پھر اس کی روایت کی حقیقت بے معنی رہ جاتی ہے - چنانچہ میں نے تاریخ اینجو کے سلسلے میں ' فٹ نوٹ میں صاف صاف وجوہ پیش کئے تھے جن کی بنا پر ہم ابن بطوطہ کی روایت قبول نہیں کرسکتے - معترض کو چاہئے تھا کہ ان وجوہ کو بے بنیاد ٹھیراتے اور پھر دعوے کرتے کہ حافظ اسلم کا بیان درست ہے ؛ لیکن یہ کام اُن سے نہ ہو سکتا تھا اور نہ ہوا - خود حافظ اسلم نے بھی

شاید یہ بیان ابن بطوطہ سے نہیں لیا - کیونکہ انھوں نے اپنے ماخذ کیطرف کوئی اشارہ نہیں کیا اور یہ نقص حیات حافظ میں ہر جگہ موجود ہے - جب ہم کو صحیح ذریعے سے معلوم ہوجائے کہ ابن بطوطہ کے نوشتہ کاغذات سب ضائع ہوگئے تھے اور جو کچھہ اُسے یاد رہا ' صحیح یا غلط ' وہی اس نے لکھہ ڈالا تو اس سے اُس کے بیان کردہ واقعات کا اعتبار ضائع ہوجاتا ہے اور پھر ان سب پرطرہ یہ ہے کہ موجودہ سفر نامہ ' ابن بطوطہ کے پر از نقائص سفر نامے کا ایک خلاصہ ہے - اس سے ابن بطوطہ کی روایت کا غیر معتبر ہونا واضح ہے - علاوہ ازیں ابن بطوطہ عربی ہونے کی حیثیت سے ایرانی طریقۂ بودوماند سے نا واقف تھا - یہ اجنبیت بھی سفر نامے کیلئے باعث نقص ہے - اگر معترض اس روایت کو قبول کرتے ہیں تو چاہئے تھا کہ وہ وجوہ پیش کرتے لیکن اس نے اس معاملے کو چھوا تک نہیں - چنانچہ اب معلوم ہوا کہ یہ معاملہ محض " اختلاف روایت " کی بنا پر چھوڑا نہیں جا سکتا - روایتیں اگرچہ دو ہیں لیکن حافظ اسلم کو چاہیے تھا کہ دونوں کو پیش کرتے اور پھر ان میں سے ایک کو پسند کرنے کی وجوہ بیان کرتے - ایک روایت کا غیر معتبر ہونا ہم ثابت کرچکے ہیں - اس لئے معاملہ صرف اختلاف روایت کا نہیں بلکہ ایک طرف درست روایت کا قبول کرنا اور دوسری طرف بالکل غیر معتبر روایت کا قبول کرنا ہے - اس کے بعد وہ انسائکلو پیڈیا آف اسلام اور فارس نامہ ناصری پر اعتراض شروع کرتے ہیں - مولفان انسائیکلوپیڈیا نے صاف لکھا ہے کہ ہم نے جو کچھہ لکھا ہے وہ شیرازنامے سے ماخوذ ہے اور شیراز نامہ خود ابواسحق کے ایک ہمعصر کی تصنیف ہے - یہ درست ہے کہ حیات حافظ کی تصنیف کے وقت انسائیکلو پیڈیا موجود نہ تھا اور جو چیز حافظ اسلم کو نہ مل سکی وہ انہوں نے درج نہیں کی - لیکن

اس سے حافظ اسلم کی کتاب غلطی سے بری الذمہ نہیں ہوسکتی کیونکہ اگر وہ کسی پرانی مستند فارسی تاریخ کا مطالعہ کرتے تو یہ غلطیاں اُن کی کتاب میں موجود نہ ہوتیں - فارس نامۂ ناصری کے متعلق بھی معترض نے عجیب قیاس دوڑایا ہے - اس کتاب کا نام شاید آپ نے سنا نہ ہوگا فوراً سمجھہ لیا کہ یہ فرس نامۂ رنگین ہوگا جو گھوڑے کے علاجوں کے متعلق ہے - اب ذرا اندازہ لگائیے کہ یہ قیاس کیسا غلط ہے - اگر قیاس ہی دوڑانا تھا تو کسی تاریخ کا نام لے دیا ہوتا - میں فارس نامۂ ناصری کو تاریخ کے سلسلے میں پیش کررہا ہوں اور آپ اسے گھوڑوں کے علاجوں کی کتاب بتا رہے ہیں —

اس کے بعد معترض نے پھر ابواسحق کے قتل اور شاہ شجاع کے تخت نشین ہونے کی تاریخ کیطرف اشارہ کیا ہے اور بزعم خود سنہ ۷۵۰ ھ اور سنہ ۷۵۵ ھ کو ٹھیک سمجھکر ' روضۃ الصفا اور اسلامی انسائیکلو پیڈیا کی اسناد پر بھی شک کیا ہے - لیکن میں ابھی دکھا چکا ہوں کہ یہ دونوں تاریخیں غلط ہیں - اگر وہ صرف قطعات حافظ پر ہی اکتفا کرتے تو انہیں اپنے اعتراض کی حقیقت معلوم ہوجاتی - کیونکہ جیسا کہ پہلے دکھایا جاچکا ہے - ایک قطعے سے سنہ ۷۵۸ ھ نکلتا ہے - لیکن معترض ' خدا جانے کس وجہ سے - اس کو فراموش کرگئے اور ایک غلط طبع شدہ قطعے پر اپنے اعتراض کی بنا رکھی - پھر ایسے غلط عام کی بنا پر ' روضۃالصفا اور شیراز نامہ جیسی مستند تواریخ پر شک کرنا بہت بڑی جسارت کا کام ہے —

(۳) معترض کا چھٹا اعتراض بے معنی ہے - میرے نقطۂ نگاہ سے حافظ اسلم نے تاریخی غلطی کی اور دوسری جگہ اس کی تردید بھی کردی - لیکن معترض ' حافظ اسلم کے دوسرے بیان کو پڑھتے نہیں اور پہلے بیان

کی غلطی پر اڑ بیٹھتے ہیں —

میں نے اپنے دعوے کی تائید میں حبیب السیر کی عبارت درج کی تھی لیکن معترض کے نزدیک اس کتاب کی کوئی وقعت نہیں کیونکہ اسی عبارت میں ہی ابواسحق کی شکست شیراز کی تاریخ سنہ ۷۵۴ ھ درج ہے اور معترض کے نزدیک یہ تاریخ سنہ ۷۵۰ ھ ہے لیکن جیسا کہ پہلے دکھایا جا چکا ہے معترض نے اس معاملے میں غلطی کی ہے۔ سنہ ۷۵۴ ھ کے لئے نہ صرف حبیب السیر کی سند لاسکتے ہیں بلکہ خود 'حافظ اسلم' کے نزدیک بھی یہی سن درست ہے۔ اگر محض سن کی وجہ سے حبیب السیر کی سند غلط ٹھیرائی جاسکتی ہے تو 'حیات حافظ' کی سند تو بہ درجۂ اولیٰ غلط ہوگی اس کے بعد معترض کے 'حیات حافظ' کو صحیح ثابت کرنے کے دعوے کتنے بے معنی رہ جاتے ہیں —

معاملہ صرف اتنا ہے کہ 'ابو اسحق' پر جب امیر مظفر نے (سنہ ۷۵۴ ھ میں) حملہ کیا تو 'حافظ اسلم' نے ایک جگہ تو لکھا کہ یہ حملہ 'ابو اسحق' کی بے خبری میں ہوا اور دوسری جگہ اس کا با خبر ہونا بیان کیا۔ میں نے تاریخ کے حوالے سے ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ 'ابو اسحق' بے خبر نہیں تھا مگر معترض کا دعویٰ ہے کہ وہ بے خبر تھا اور اپنے دعوے کی دلیل میں 'حافظ' کا مندرجۂ ذیل شعر پیش کرتے ہیں: —

دیدی آں قہقہۂ کبک خراماں حافظ کہ ز سر پنجۂ شاہین قضا غافل بود

لفظ "غافل" سے استدلال کیا گیا ہے۔ لیکن اس بیان میں معترض نے دو جگہ سخت ٹھوکر کھائی ہے: —

(الف) پہلی غلطی تو سن کی ہے۔ یہ شعر 'ابو اسحق' کی وفات کے بعد

لکھا گیا اور اس کا سن وفات سنہ ۷۵۸ ھ ہے جیسا کہ حافظ کے
قطعات سے ثابت ہے۔ اس لیے اس شعر سے سنہ ۷۵۴ ھ کے حملۂ
شیراز کے متعلق کسی بات کا استنباط کرنا بالکل غلط ہے —

(ب) دوسری غلطی شعر کے معنی کے متعلق ہے۔ "ترک خراماں" سے ہم 'ابو اسحق' کی طرف اشارہ سمجھہ سکتے ہیں چونکہ غزل میں اس کے ما قبل شعر میں 'ابو اسحق' کا نام موجود ہے لیکن "شاہین قضا" سے 'مظفر' کا اندازہ لگانا محال ہے۔ آخری مصرع کے معمولی معنی ہیں کہ "وہ اپنی موت سے بے خبر تھا" موت کی بے خبری سے حملے کی بے خبری کا قیاس کرنا بالکل غلط ہے —

(۴) معترض کا آٹھواں اعتراض بھی پہلے اعتراضات کی طرح غلط ہے۔ 'حیات حافظ' میں لکھا ہے کہ "حاجی قوام الدین حسن نے خواجہ 'حافظ' کے لیے ایک مدرسہ قائم کردیا تھا" میں نے رسالہ اُردو جنوری سنہ ۲۹ ع میں اس خیال کی تردید کی تھی۔ چنانچہ میں نے اس کا اعادہ فضول سمجھا اور تنقید میں اسی مضمون کی طرف اشارہ کر دیا۔ مگر معترض نے وہ مضمون پڑھا نہیں اور یونہی اعتراض شروع کر دیا —

میں نے اپنے تردیدی مضمون میں اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ 'حافظ' کا واقعی ایک مدرسے سے تعلق تھا۔ 'حافظ' کے علم و فضل کے متعلق دیوان میں کافی شہادت موجود ہے۔ اور میں نے اس سے کبھی انکار نہیں کیا۔ اس کے علاوہ واقعی خواجہ 'حافظ' اور حاجی قوام الدین حسن کا تعلق بھی تھا۔ اگر معترض میرے مذکورۂ بالا مضمون پڑھ لیتے تو کم از کم انھیں اتنے اشعار جمع کرنے اور رسالۂ اُردو کے دو تین صفحات

ضائع کرنے کی ضرورت نہ رہتی۔ مدرسے میں درس و تدریس اور آپ کا فضل و علم ایک طرف اور حاجی قوام الدین حسن سے تعلق دوسری طرف — یہ دونوں تسلیم شدہ باتیں ہیں۔ لیکن اب سوال یہ ہے: آیا یہ مدرسہ جس میں حافظ درس دیتے تھے، حاجی 'قوام الدین حسن' کا بنایا ہوا تھا؟ مولف 'حیات حافظ' نے اس کا جواب اثبات میں دیا ہے۔ لیکن میرے نزدیک اس کا جواب نفی میں ہے۔ معترض کا اعتراض تب حق بجانب ہوتا جب وہ یہ ثابت کرتے کہ یہ مدرسہ واقعی 'حاجی قوام الدین حسن' کا بنا کردہ تھا۔ لیکن وہ یہ ثابت کرنے سے قاصر ہیں —

'خواجہ حافظ' کا واقعی ایک مدرسے سے تعلق تھا جس میں وہ درس دیتے رہے۔ لیکن وہ مدرسے حاجی 'قوام الدین عبد اللہ' کا مدرسہ تھا جو شاہ 'شجاع' کے زمانے کا آدمی تھا۔ اور وہ مدرسہ خود شاہ 'شجاع' کے حکم سے بنایا گیا تھا۔ تاریخ کی کتب میں کسی ایسے مدرسے کا مذکور نہیں جو حاجی 'قوام الدین حسن' نے صرف خواجہ 'حافظ' کے لیے تیار کیا ہو۔ پھر آپ فرماتے ہیں: "... مگر یہ تردید (یعنی مدرسۂ حاجی قوام کے "قیاس" کی تردید) رسالۂ اُردو کے جنوری نمبر کا محض حوالہ دے دینے سے اس مضمون میں ثابت نہیں ہو جاتی۔ اس کو ملاحظہ کئے بغیر بھی حاجی قوام الدین حسن کے اس سلوک کی روایت (نہیں بلکہ "قیاس" کہنا چاہیے) کو بہ وجوہات چند قریب باور کیا جا سکتا ہے" صفحہ ۴۷۳—۷۴ —

اس بیان میں اول تو یہ غلطی ہے کہ معترض کو بغیر مضمون پڑھے کوئی حق حاصل نہ تھا کہ وہ میری تنقید پر اعتراض کرتے۔ کیا یہی وہ اُصول ہے جس کی وہ اُردو دانوں میں کمی کے متعلق سرتا پا گریاں و نالاں

ھیں؟ دوسروں پر یہ اعتراضات کہ تنقید کے صحیح مفہوم سے بھی ان کو بے بہرہ سمجھنا اور آپ کی یہ حالت کہ مخالف کے دلائل سنے بغیر ھی اس پر اعتراضات کی فہرست تیار کرنا —

دوسری غلطی یہ ھے کہ جو اشعار معترض نے اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کئے ھیں وہ بالکل آپ کے دعوے کی تقویت نہیں کرتے۔ آپ فرماتے ھیں: "حاجی قوام کا انتہا درجہ غنی اور متمول ھونا لہذا ایک مدرسے کی تعمیر پر قادر ھونا اس کے قطعۂ تاریخ وفات موجودہ دیوان حافظ کے پہلے ھی شعر سے مسلم ھے۔ "سرور اھل غنائم" کو تین دیواروں پر ایک سائبان ڈال دینا کیا مشکل تھا..." اس میں کوئی شک نہیں کہ حاجی 'قوام' امیر تھا' سخی تھا' سب کچھ تھا۔ لیکن اس قطعۂ تاریخ یا کسی اور شعر سے جو معترض نے دیوان 'حافظ' سے اکٹھے کئے ھیں' یہ بالکل ظاھر نہیں ھوتا کہ حاجی قوام نے ان کے لیے مدرسہ بنایا تھا —

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ اشعار خواجہ 'حافظ' اور حاجی قوام کے تعلقات خوش کی خبر دیتے ھیں۔ لیکن وہ تعلقات کیسے تھے؟ یہی کہ حاجی 'قوام' کے دربار سے آپکو بہت زیادہ وظیفہ ملتا رھتا تھا۔ اور اس لیے آپ نے ان کی تعریف بہت جگہ کی ھے۔ تقریباً ھر جگہ حاجی قوام کی تعریف بخشش و جود سے وابستہ ھے۔ اس سے البتہ یہ عقدہ کھل جاتا ھے کہ خواجہ 'حافظ' کو امیروں کے دربار سے وظیفہ ملا کرتا تھا اور اس کے صلے میں آپ ان کی تعریف بھی کیا کرتے تھے۔ اس مضمون کے متعلق مفصل بحث کچھ تنقید میں گزر چکی ھے اور کچھ ابھی آے گی۔ انشاالله —

(۵) معترض نے اب امیر 'مظفر' اور شاہ 'شجاع' کے تعلقات پر بحث

شروع کی ہے ۔ امیر 'مظفر' کے کیریکٹر کے متعلق جو کچھہ 'حافظ اسلم' نے لکھا ہے وہ درست ہے ۔ وہ سخت طبیعت کا آدمی تھا ۔ اس نے کئی مجرموں کو بڑی بے رحمی کے ساتھہ قتل کیا تھا ۔ خود 'حافظ' کا شعر موجود ہے :—

سروراں را بے گنہ می کرد حبس گردناں را بے سخن سر می برید

لیکن ان سب باتوں کے باوجود تاریخ کے اوراق عام بغاوت سے بالکل خاموش ہیں اگر کوئی بغاوت ہوتی تو یقیناً حبیب السیر اور روضۃ الصفا ، جیسی مستند کتب تاریخ میں ان کا مذکور ضرور ہوتا ۔ روضۃ الصفا کے صاف الفاظ موجود ہیں کہ چونکہ امیر 'مظفر' اپنے فرزند شاہ 'شجاع' سے اس کی شراب خوری اور عیاشی کی وجہ سے ناراض تھا اور چاہتا تھا کہ اپنے چھوٹے بیٹے کو ولی عہد مقرر کرے ' اس لیے شاہ 'شجاع' نے اپنے باپ کو اندھا کردیا اور خود تخت پر بیٹھہ گیا ۔ اب معترض کے اعتراض کو بھی سنیے ۔ آپ فرماتے ہیں : " امیر مظفر " کی سخت گیری ' بے رحمی ' ناحق کشی ' دشنام دہی ...... اس کا نتیجہ اگر حیات حافظ میں عام بغاوت کا ہو جانا لکھہ دیا گیا تو یہ کوئی بعید از قیاس نہیں ...... اس بیان کے بعد پھر وہی معاملہ چھڑ جاتا ہے ۔ معترض کا " قیاس " ایک طرف اور تاریخ کی شہادت دوسری طرف ۔ آپ جس کو چاہیں قبول کر سکتے ہیں ۔ اس کے بعد آپ اپنے قیاس کو صحیح ثابت کرنے کے لیے کئی اور قیاسات اور مثالیں پیش کرتے ہیں ۔ آپ یوں رقمطراز ہیں ۔ " مولف حیات حافظ کے یہ سب قیاسات انہی عبارات کے بین السطور میں پڑھے جا سکتے ہیں جو تنقید میں تردید کے طور پر پیش ہوئی ہیں ... ممکن ہے کہ معترض کو اس واقعے کے متعلق کوئی خاص اطلاع ہو لیکن اگر ظاہری آنکھیں اور

انسانی دماغ کا کام ہے تو یقیناً ہم ان عبارات میں کوئی اشارہ عام بغاوت کی طرف نہیں پاتے۔ البتہ یہ چیز واضح ہے کہ شاہ شجاع کی نیت یقیناً خود غرضی پر مبنی تھی۔ اور امیر مظفر کی اس سے ناراضگی کی وجہ تعیش اور شراب خوری تھی —

آپ پھر فرماتے ہیں کہ " شجاع کے پاس خود کوئی فوج و سامان نہ تھا۔ باپ کی ہی قوت و حشمت تھی۔ شجاع نے اس کی سازش سے ایسے قوی بازو باپ کو چشم زدن میں اسیر کرلیا یہ بغیر اس کے ممکن نہیں ہوسکتا کہ مظفر کی سختیوں اور گالیوں سے سب نالاں اور برگشتہ ہوچکے تھے۔ یہ بیان غلط در غلط ہے - اول تو شاہ شجاع نے کسی فوج کے ساتھہ باپ کا مقابلہ نہیں کیا تھا۔ واقعہ صرف اتنا ہے کہ جب امیر مظفر قرآن کریم کی تلاوت کررہا تھا' شاہ شجاع نے موقع پاکر اس کو پکڑ لیا اور قید کرکے آنکھیں نکال ڈالیں۔ دوسرے' ایسا واقعہ ایک عادل اور نرم مزاج بادشاہ کے ساتھہ بھی پیش آسکتا ہے۔ ہندوستان کی تاریخ میں جلال الدین خلجی بڑا عادل اور نرم مزاج بادشاہ تھا۔ وہ سخت گیر نہ تھا' ظالم نہ تھا' دشنام گو نہ تھا۔ رعایا اس سے نالاں نہ تھی' لیکن باوجود ان سب خوبیوں کے اس کے بھتیجے علاءالدین خلجی نے اسے قتل کرڈالا۔ اور یہ فعل محض خود غرضی پر مبنی تھا۔ یہی حال شاہ شجاع اور امیر مظفر کا ہے۔ شجاع کا فعل تمام تر خود غرضی پر مبنی تھا اور امیر مظفر کا اس کو تخت سے محروم کرنے کا ارادہ اس کی بدمعاشی' شراب خوری اور دیگر ایسی ہی غیر اسلامی حرکات کی وجہ سے تھا —

اس کے بعد آپ رقمطراز ہیں کہ " شاہ شجاع اس بغاوت کے

وقت ... قید قفس میں تھا - لوگوں نے ھی اس کو قید سے نکال کر اپنا سردار بنایا ' تخت پر بٹھایا ... '' بڑے افسوس کی بات ھے کہ معترض بھی حافظ اسلم کی طرح اپنے ماخذ کو بیان کرنے کا عادی نہیں - کسی تاریخی کتاب میں یہ واقعہ درج نہیں - دیوان حافظ کی نہ کسی غزل اور نہ کسی قطعے سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ھے - اور نہ حافظ اسلم نے ھی اس واقعے کی طرف اشارہ کیا ھے - معلوم نہیں معترض نے اس واقعے کو کہاں سے نقل کیا ھے !

(۹) دسواں اعتراض حافظ کی شاعری کے متعلق ایک اہم سوال ھے - کئی اشخاص کا خیال ھے کہ حافظ نے کوئی قصیدہ نہیں لکھا - اس زمرے میں حافظ اسلم اور معترض دونوں شامل ھیں - لیکن میں نے اپنی تنقید میں صاف بتادیا ھے کہ حافظ نے کئی قصیدے لکھے ھیں - البتہ یہ دلیل کہ چونکہ یہ قصیدے عبید زاکانی ' خواجو اور سلمان کے ھاں نہیں ملتے اس لیے ضروری حافظ کے ھیں ' بہت کمزور ھے - مگر اس کے باوجود بھی ھم اس سے انکار نہیں کرسکتے کہ یہ قصیدے حافظ کے ھیں - کیونکہ کئی پرانے نسخوں میں موجود ھیں - خود محمد گلندام نے دیباچے کو ختم کرکے یہ الفاظ لکھے ھیں :

" وھو من نتائج طبع اللطیف فی القصائد فی مدح خواجہ محمد ... ''

اور اس کے بعد ایک قصیدہ درج کیا ھے جو قوام الدین والدنیا محمد بن علی کی تعریف میں ھے - اگر اس عبارت کو غور سے دیکھا جائے تو اس کی کافی شہادت ھے کہ حافظ نے اس قصیدے کے علاوہ دوسرے قصیدے بھی لکھے - چنانچہ دیوان میں ھمیں مندرجۂ بالا قصیدے کے

علاوہ کئی اور قصائد بھی ملتے ھیں - ایک ابواسحق کی مدح میں' ایک شاہ شجاع کی مدح' ایک جلال الدین تو رانشاہ اور ایک شاہ منصور کی مدح میں - ان کے علاوہ کئی قطعات بھی ھیں جن میں حافظ نے وزیروں اور امیروں کی تعریف کی ھے اور اُن سے وظیفہ طلب کرنے کے لیے تقاضا کیا ھے —

آپ فرماتے ھیں کہ خاقانی' انوری' منوچہری' سلمان ساوجی' عرفی وغیرہ کے قصائد کے مجلدات ضخیم ھیں - ان کے مقابلے میں حافظ کے قصائد کا کوئی مجلد نظر نہیں آتا - اس سے آپ یہ نتیجہ اخذ کرتے ھیں کہ انھوں نے کوئی قصیدہ تصنیف ھی نہیں کیا - کتنی ناقص دلیل ھے - اگر انھوں نے خاقانی وغیرہ کی طرح قصائد کی کوئی ضخیم جلد تصنیف نہیں کی تو کیا اس سے یہ مطلب ھے کہ انھوں نے تھوڑے قصائد بھی نہیں لکھے؟ زیادہ کی نفی سے ضروری نہیں کہ تھوڑے کی بھی نفی ھو جاے - زمانے کا اقتضا تھا - خاقانی وغیرھم کے زمانے میں بادشاہ تھے - درباری شاعر تھے وہ قصیدے کہتے تھے - لیکن حافظ کے زمانے میں زیادہ امن نہ تھا - ابواسحق کے زمانے میں ان کی شاعری ابھی ترقی پر نہ تھی - اور شاہ شجاع کو حافظ سے کوئی عقیدت نہیں تھی * البتہ شاہ منصور کو حافظ سے عقیدت تھی - اسی کا نتیجہ ھے کہ تمام دیوان میں بہت زیادہ تعریف شاہ منصور کی پائی جاتی ھے - حتیٰ کہ ساقی نامے میں بھی حافظ نے اسی کی تعریف کی - اور ساقی ناموں کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ کسی شاعر نے ساقی نامے میں بھی بادشاہ کی مدح سرائی کی ھو - لیکن شاہ منصور کے علاوہ ابواسحق' شاہ شجاع'

---

* دیکھو حیات حافظ مصنفۂ اسلم صاحب جیراج پوری —

سب کی تعریف میں قصیدے کہے حتیٰ کہ ان بادشاہوں کے وزیروں ' قوام الدین والد نیا محمد ابن علی ' جلال الدین تورانشاہ کی مدح میں بھی قصائد موجود ہیں —

اسی سلسلے میں بہتر ہوگا اگر حافظ اسلم کے خیالات پر بھی نئے سرے سے روشنی ڈالی جائے —

اس میں کوئی شک نہیں کہ دیوان حافظ میں دوسرے شعراء کے بہت سے اشعار موجود ہیں۔ لیکن اس کے دفعیے کے لیے یہ بہتر بچاؤ نہیں ہوسکتا کہ بہت سی وہ چیزیں جو حافظ کی ہیں ' ان کو بھی دیوان حافظ سے خارج سمجھا جائے۔ حافظ اسلم نے اپنی کتاب حیات حافظ میں یہی غلط رویّہ اختیار کیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ "غزلوں کے علاوہ اور جو چیزیں مثلاً قصیدے ' ترکیب بند ' ترجیع بند ' مغنی نامہ ' ساقی نامہ وغیرہ ہیں۔ ان سب کا صحیح نسخوں میں پتہ نہیں ہے ..." ص ۹۵۔ خدا جانے حافظ اسلم کے نزدیک صحیح نسخہ کون سا ہوسکتا ہے ؟ آپ نے جو معیار پیش کیا ہے وہ صرف قدامت کا ہے۔ یعنی وہ نسخہ جو دوسرے نسخوں سے زیادہ قدیم ہو۔ مثلاً قصائد کے سلسلے میں آپ فرماتے ہیں (ص ۵۷) کہ برٹش میوزیم میں دیوان کے پرانے قلمی نسخے جس قدر موجود ہیں تقریباً سب بلا قصیدہ ہیں۔ لیکن ذرا ڈاکٹر ریو (Rieu) کی فہرست کتب جلد دوم کا ملاحظہ فرمائیے :-

سب سے پرانا دیوان جو برٹش میوزیم میں موجود ہے سنہ ۸۵۵ ھ کا ہے جس میں غزلیات ' مثنویات ' قطعات اور رباعیات سب کچھ موجود ہیں۔ البتہ قصائد نہیں —

اب اس بیّن ثبوت کی موجودگی میں حافظ اسلم کے بیان کی حقیقت

بالکل بے معنی رہ جاتی ہے - اگر بعض نے دیوان حافظ میں بہت کچھہ داخل کردیا ہے تو حافظ اسلم اس کے بالکل برعکس کئی چیزوں کو نکال دینے پر تلے ہوے ہیں۔ ساقی نامہ' خواجہ حافظ کی تصنیف ہے اور اس کی شہادت عبدالنبی کی تصنیف میخانہ ہے جو جہانگیر کے زمانے کا آدمی ہے۔ اُس نے خواجہ حافظ کے ساقی نامے کو تسلیم کیا ہے۔ اور حافظ اسلم تو اس کو بھی دیوان سے خارج کررہے ہیں! اب رہا معاملہ قصائد کا اس کے متعلق حافظ اسلم کا فیصلہ صاف ہے کہ حافظ نے کوئی قصیدہ نہیں لکھا - اس کے لیے آپ ڈاکٹر ریو (Rieu) کی فہرست کتب کی مدد لیتے ہیں - فرماتے ہیں - " برٹش میوزیم میں دیوان کے پرانے قلمی نسخے جس قدر موجود ہیں تقریباً سب بلا قصیدہ ہیں - یہ بیان غلط ہے - اپنی تائید میں حافظ اسام فرماتے ہیں : " مثلاً ابوالفتح شیخ محمد بنی اسرائیل ساکن کول کا لکھا ہوا نسخہ جمادی الاول سنہ ۱۰۲۰ ھ کا بلا قصیدے کے ہے - عبدالرشید بن مولانا عبداللطیف ترکمان دھلوی کا نسخہ جو ۱۰۵۳ ھ کا لکھا ہوا ہے بلا قصیدے کے ہے - ... الخ "- لیکن ذرا ڈاکٹر ریو (Rieu) کی فہرست کا بھی ملاحظہ فرمائیے —

(۱) دیوان حافظ - سنہ ۸۵۵ ھ - جس میں غزلیات' مثنویات' قطعات اور رباعیات ہیں —

(۲) دیوان حافظ - ۹۲۱ ھ [Add. 7760] جس میں قصائد (جو مصرع " زدلبری نتواں لاف زد بہ آسانی ' سے شروع ہوتا ہے) - مثنویات - غزلیات - رباعیات - سب موجود ہیں —

(۳) دیوان حافظ - سنہ ۹۸۳ ھ جس میں غزلیات ' قصائد (جو مصرع " شد عرصۂ جہاں چوں بہشت برین جواں " سے شروع ہوتے ہیں)

وغیرہ موجود ھیں —

(۴) دیوان حافظ ۱۰۲۰ھ - اس میں البتہ قصائد موجود نہیں —

اس شہادت کی موجودگی میں ذرا حافظ اسلم کے بیان کو پڑھیے تو فوراً معلوم ھو جاے گا کہ آپ نے جہاں اپنے مطلب کے مطابق کوئی بیان دیکھا وہ لے لیا اور باقی چھوڑ دیا - ۱۰۲۰ھ کے دیوان میں قصائد موجود نہیں اور اس سے آپ تمام قصیدوں سے انکار پر اُتر آتے ھیں - آپ کو یہ خیال نہیں آیا کہ اِسی فہرست میں ۹۲۱ھ اور ۹۸۳ھ کے دیوان بھی ھیں جن میں قصائد موجود ھیں —

لیکن ان سب سے زیادہ قابل غور شہادت خود محمد گلندام کی ھے جو اوپر درج کی جاچکی ھے - ان شہادتوں کی موجودگی میں ' حافظ اسلم اور معترض کے خیالات کو تسلیم کرنا بڑا مشکل ھے —

گیارھویں اعتراض میں ' معترض ' حافظ کی مدافعت کرتے وقت بڑے جوش میں آجاتے ھیں - فرماتے ھیں کہ حافظ غزلوں کے آخر میں صرف چند بیت تعریف کی زائد کر دیتے تھے اور بس - لیکن جیسا کہ ھم دکھا چکے ھیں انھوں نے قصائد بھی لکھے —

اس کے بعد آپ بارھویں اعتراض میں یوں رقمطراز ھیں کہ ھر وہ شعر جو خواجہ حافظ نے کسی بادشاہ کی مدح میں لکھا ' خوشامد اور جھوٹ سے بری ھے - اس کے لیے آپ نے ایک شعر کی مثال پیش کی ھے —

مظہر لطف ازل ' روشنی چشم امل جامع علم و عمل ' جان جہاں شاہ شجاع

اس شعر میں " جامع علم و عمل " ھی معترض کے اعتراض کو غلط بنانے کے لیے کافی ھے - آپ نے حبیب السیر کے فقرے پر جو ھنگامہ اور

عارضی عمل کے متعلق لکھا گیا تھا اپنی دلیل قائم کی ہے - حالانکہ تاریخ کی واضح شہادت ہے کہ وہ شرابی تھا اور اس لیے بے عمل - آپ فرماتے ہیں : "حافظ صاحب کا شعر تو غور سے لفظاً و معناً دونوں طرح صحیح اور واقعہ کے مطابق ثابت ہوا لیکن مدعی کے دعوے میں سوائے پھونک کے کیا نکلا ؟ " —

میں اس کے جواب میں اپنی طرف سے کچھ نہیں کہنا چاہتا ۔ دیوان سے مثالیں پیش کر کے دکھانا چاہتا ہوں کہ معترض کا یہ بیان کس حد تک درست کہلا سکتا ہے —

قوام الدین محمد ابن علی کی تعریف میں یوں فرماتے ہیں :

اگر نہ گنج عطاے تو دستگیر شود همه بسیط زمیں رو نہد بہ ویرانی

توئی کہ صورت جسم ترا هیولی نیست چو جوهر ملکی در لباس انسانی

پہلے شعر میں' اس کو اتنا سخی قرار دیا جاتا ہے کہ تمام روے زمیں کے انسان اسی کی سخاوت سے زندہ ہیں - اگر وہ آج ان کی روزی بند کردے تو سب کے سب فنا ہوجائیں - نعوذ باللہ یہ شان ربوبیت تو صرف خداے ذوالجلال' رب العالمین کی ہے - کسی بندے کو اس صفت سے متصف کرنا کتنا ظلم ہے اور اس پر بھی معترض فرماتے ہیں کہ حافظ کے مدحیہ اشعار خوشامد سے پاک ہوتے ہیں —

دوسرے شعر میں اس کی پاکی کو اتنا بڑھاتے ہیں کہ اس کو مادی جسم کی آلودگی ہی سے مبرا قرار دیتے ہیں یعنی وہ انسان ہی نہیں - لفظ "توئی" صاف ظاہر کرتا ہے کہ تمام دنیا میں سوائے تیرے کوئی ایسا شخص نہیں جو اس صفت میں ممدوح کا مقابلہ کرسکے - سیرت و عادات میں فرشتہ ہونا تسلیم شدہ بات ہے - لیکن جسمانی حیثیت

سے کسی کو فرشتہ کہنا یعنی اس کو مادی جسم سے ہی مبرا قرار دینا بالکل خوشامد اور مبالغہ ہے!

ساقی نامہ کے وہ اشعار جو حافظ نے منصور کی مدح میں کہے ہیں، ملاحظہ ہوں —

نہ تنہا خراجت دهند از فرنگ که مهراج باجت فرستد ز زنگ
اگر ترک و هندست وگر روم و چین چو جم جمله داری به زیر نگین
همائیست چترت همایون نظر که دارد بسیط زمین زیر پر ... الخ

شاہ منصور بیچارا سنہ ۷۸۹ ھ میں تیمور کے شیراز سے واپس لوٹ جانے کے بعد شیراز پر قابض ہو بیٹھا۔ اور سنہ ۷۹۵ ھ تک حکمراں رہا۔ یعنی کل چھ برس۔ اس زمانے میں کوئی شک نہیں تاریخ اس کی تعریف میں رطب اللسان ہے۔ خاص کر اس کا سلوک خواجہ حافظ کے ساتھ بہت ہمدردانہ تھا۔ لیکن اس کی حکومت کا دائرہ سوائے شیراز یا اس کے علاوہ دو چار اور پرگنات کے کچھ زیادہ نہ تھا۔ اس بنیاد پر کہنا کہ ترک و ہند، روم و چین سب اس کے ماتحت ہیں یقیناً مبالغہ آمیز ہے۔ حتی کہ ان تسخیر شدہ ممالک میں فرنگ (تمام یورپ) اور زنگ (حبش) کا نام بھی شامل کرلیا گیا ہے۔ لیکن آخری مصرع میں تو یہ مبالغہ حد سے بھی زیادہ تجاوز کر گیا۔ شاعر کہتا ہے کہ نہ صرف ترک و ہندوستان، نہ صرف روم و چین، نہ صرف فرنگ و زنگ بلکہ دنیا کا ہر خطہ شاہ منصور کے زیر نگیں ہے۔ ممکن ہے کہ معترض اپنے قیاسات کو استعمال میں لاکر ان اشعار کی کوئی نئی تاویل پیش کر سکیں اور ثابت کر سکیں کہ یہ اشعار بھی لفظاً و معناً حقیقت کے مطابق ہیں۔ اگر ایسا ہے تو ہمیں انتظار کرنا چاہیے —

(۱۱) آپ فرماتے ہیں:

تخت نشینی کے قریب ایام کی غزل میں اس (شاہ شجاع) کو جیسا وہ اس وقت تک تھا کہدینا کوئی خوشامد نہ تھی۔ اس سے وہ حرکات کے آخر عہد کی جن کی بنیاد پر تنقید میں اس کو محض شرابی کا خطاب دے دیا گیا ہے۔ ظہور میں آنے میں ہنوز سالہا سال کا عرصہ درمیان میں تھا ..." صفحہ ۷۵۹

اول تو یہ فیصلہ کرنا کہ وہ غزل جس میں حافظ نے شاہ شجاع کی تعریف میں یہ شعر کہا ہے:

مظہر لطف ازل ' روشنی چشم امل جامع علم و عمل ' جان جہاں شاہ شجاع

شاہ شجاع کے ابتدائے ایام میں لکھی گئی کسی طرح فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ خود دیوان حافظ میں اس کے لیے نہ کوئی دلیل ہے اور نہ کوئی وجہ۔ ثانیاً آپ فرماتے ہیں کہ وہ تخت نشینی کے وقت تک بالکل جامع علم و عمل تھا۔ لیکن یہ غلط ہے۔ کیا یہ واضح نہیں ہو چکا کہ خود امیر مظفر کی حیات میں اس نے کئی دفعہ شراب پی اور جس کے باعث اس کا باپ اس سے ناراض تھا؟ معاملہ صاف نظر آرہا ہے کہ حافظ نے شاہ شجاع کی اس حالت میں تعریف کی جب کہ وہ شراب نوش بھی تھا۔ اس مدافعت کا آخری پہلو آپ یوں بیان فرماتے ہیں کہ حافظ نے جب دیکھا کہ شاہ شجاع نے شراب نوشی شروع کردی ہے تو اس کو نصیحت بھی کی۔ لیکن یہ درست نہیں۔ معترض کی شاہ شجاع کے آغاز عہد اور آخر عہد کی تفریق بالکل غلط ہے۔ شاہ شجاع؛ شہزادگی کے زمانے سے لے کر آخر عہد تک شراب پیتا رہا —

(۷) میں نے حافظ کے قصائد کی مثال پیش کرتے وقت وہ قصیدہ

پیش کیا تھا جو قوام الدین محمد بن علی کی تعریف میں کہا گیا تھا اور جس کی صحت کے لیے میں نے خود محمد گلندام کی شہادت پیش کی ہے۔ اسی قصیدے میں سے میں نے تنقید میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ اس میں حافظ نے کافی مبالغے سے کام لیا اور دلیل میں جو اشعار پیش کیے تھے ان کو تو معترض نے بالکل چھوڑ دیا۔ اسی لیے میں نے ان کو دوبارہ اس جواب میں درج کر دیا ہے تاکہ ناظرین کو صحیح رائے قائم کرنے کا موقع مل جائے لیکن ان میں سے ایک مندرجۂ ذیل شعر لیتے ہیں:

هزار سال بقا بخشدت مدایح من چنین متاع نفیسے بچون تو ارزانی

اس شعر کی تشریح میں آپ فرماتے ہیں۔ "اس میں کوئی خوشامد قوام الدین علی کی نہیں ہے۔ اگر کچھ نکلتی ہے تو اس مضمون میں کہ "میرے کلام کے طفیل و تصدق میں تیرا نام بھی ہزار برس تک قائم رہ سکے گا۔ اس کی کچھ تحقیر ہی نکلتی ہے ..."۔

میں آپ کی اس تشریح سے بالکل متفق ہوں۔ لیکن میں یہ سوال کرنے کی جرات کرتا ہوں کہ مندرجۂ ذیل اشعار مدیحہ کی نسبت آپ کی کیا رائے ہے!

به یمن دولت منصور شاهی علم شد حافظ اندر نظم اشعار

شعرم به یمن مدح که صد ملک دل کشاد گوئی که تیغ تست زبان سخنورم

گر به دیوان غزل صدر نشینم چه عجب سالها بندگی صاحب دیوان کردم

کیا ان اشعار میں بھی ممدوح کی تحقیر ہے؟ کیا واقعی حافظ کا نام شاہ منصور، شاہ شجاع اور صاحب دیوان اور دیگر بادشاہوں کی بدولت زندہ ہے؟ افسوس حافظ کو ہر فارسی اور غیر فارسی دان جانتا ہے لیکن ان بادشاہوں سے صرف چند تاریخ دانوں کے علاوہ کوئی واقف نہیں —

لیکن اگر دیوان حافظ کے قصائد میں مبالغہ و خوشامد دیکھنی ہو تو معترض کے بارھویں اعتراض کا جواب جو میں نے اوپر درج کیا ہے وہ ذرا غور سے ملاحظہ فرمائیں تو معاملہ صاف نظر آجائے گا —

پھر آپ یوں رقمطراز ہیں : " تنقید میں یہ شائستہ الفاظ کہ :- حافظ بھی قصیدہ خوانی میں ایسا ہی تھا جیسے کہ دوسرے شاعر! یہ تنقید کرنا نہیں تنقید کی ٹانگ توڑ دینا ہے " —

محمد گلندام کی شہادت کے ہوتے ہوئے ، نہ معترض اور نہ حافظ اسلم ہی اس بات سے انکار کرسکتے ہیں کہ حافظ نے قصائد لکھے۔ اور ان قصائد سے مبالغہ آمیز اور خوشامدانہ اشعار باوجود یکہ معترض نے ان کو چھپانے کی بہت کوشش کی ، نمایاں کرکے دکھائے جاچکے ہیں - اس کے بعد صرف ایک اور سوال رہ جاتا ہے اور وہ یہ کہ جو طریقہ پہلے فارسی شعراء مثلاً خاقانی ، انوری وغیرہ نے قصائد لکھتے وقت ملحوظ رکھا تھا وہی حافظ نے بھی ذہن میں رکھا - قصیدے میں ، ممدوح کی تعریف میں زمین وآسمان کے قلابے ملادئے جاتے ہیں اور بعد میں دعا دی جاتی ہے اور دعا میں اپنی حاجت بیان کی جاتی یا حاجت روائی کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے - تنقید میں ، میں نے زیادہ مثالیں دینے سے احتراز کیا تھا لیکن معترض کے اعتراض کے جواب میں مجبور ہوں کہ وہ مثالیں جو دیوان حافظ میں جابجا پھیلی ہوئی ہیں ناظرین کے سامنے پیش کروں —

(الف) شاہ نصرۃ الدین یحیی کو شاہ شجاع نے یزد کا علاقہ سپرد کیا تھا لیکن شاہ شجاع کے مرتے ہی اس نے شیراز پر حملہ کیا مگر ناکام رہا - سنہ ۷۸۹ ھ میں تیمور نے شیراز فتح کرلیا لیکن چند وجوہات کی بنا پر وہ سمرقند واپس چلا گیا - جاتی دفعہ وہ شاہ یحیی کو

شیراز کا گورنر مقرر کر گیا ۔ مگر تیمور کے جانے ہی کی دیر تھی کہ شاہ منصور نے اسے بھگادیا —

اسی شاہ یحییٰ کی تعریف میں کئی قصائد حافظ نے لکھے ہیں جن کو میں ذیل میں درج کرتا ہوں ۔ سب سے پہلے غزل میں آپ ذکر کرتے ہیں :—

اے بسا با ساکنان شہر یزد از ما بگو — کاے سر ناحق نشناساں گوئے میدان شما
گرچہ دوریم از بساط قرب، ہمت دور نیست — بندۂ شاہ شمائیم و ثنا خوان شما
اے شہنشاہ بلند اختر، خدا را ہمتے — تا ببوسم ہمچو گردون خاک ایوان شما

کیا انہی اشعار سے حافظ کا استغناء اور بے پروائی ثابت کی جاتی ہے؟ کیا اسی کو بے نیازی اور ماورائے حاجت دنیاوی تصور کیا جاتا ہے؟ کوئی شک نہیں کہ حافظ بنگال نہیں گئے ۔ مگر کیوں؟ اس لیے نہیں کہ وہ دنیا پر لات مارے ہوئے تھے ۔ اس لئے نہیں کہ وہ جاہ و حشمت سے متنفر تھے ۔ اس لیے نہیں کہ وہ صوفی تھے یا قناعت پسند تھے ۔ اصلی وجہ یہ ہے کہ فطرتاً آرام پسند اور زندگی کی جد و جہد سے گریزاں رہنے کی کوشش کرتے رہتے تھے ۔ ملاحظہ ہو —

دمے باغم بسر بردن جہاں یکسر نمی ارزد — بمے بفروش دلق ما کزیں بہتر نمی ارزد
بس آساں می نمود اول غم دریا بہ بوئے سود — غلط گفتم کہ ہر موجش بصد گوہر نمی ارزد
الخ

حافظ نے بڑی کوشش کی کہ شاہ یحییٰ ان کی طرف التفات کرے لیکن مقصد میں کوئی کامیابی نہ ہوئی ۔ چنانچہ فرماتے ہیں —

دل منہ اے جان من بر وعدۂ شاہ و وزیر
کس نمیداند کہ کارش از کجا خواہد کشاد

رد تو کل کن نمیدانی کہ نوک کلک من
نقش ہر صورت کہ زد رنگے دگر بیروں فتاد

شاہ ہرموزم ندیدہ و بے سخن صد لطف کرد
شاہ یزدم دیدہ و مدحش گفتم و ہیچم نداد

خدا را ملاحظہ فرمائیے - کیا اب بھی یہ دعوی درست نہیں کہ حافظ نے دیگر شعراء کی طرح قصیدہ خوانی کی ؟ کیا حافظ کے اپنے واضح الفاظ " مدحش گفتم " کافی شہادت نہیں ؟ بے شک حافظ نے توکل و استغنا کی تعلیم دی لیکن یہ تعلیم ہی تھی - کیا ان مندرجۂ بالا اشعار سے استغنا استنباط ہوتا ہے ؟

شاہ یحیی کی تعریف میں ان کے علاوہ ایک پوری غزل دیوان میں موجود ہے - ملاحظہ فرمائیے —

دارائے جہاں نصرت دیں خسرو کامل — یحیی بن مظفر ملک عالم و عادل
اے آنکہ در اسلام پناہ تو کشودہ — بر روئے جہاں روزنۂ جان و تن و دل
تعظیم تو بر جان و خرد واجب و لازم — انعام تو بر کون و مکاں فائض و شامل
روز ازل از کلک تو یک قطرہ سیاہی — بر روے مہ افتاد کہ شد حل مسائل
خورشید چوں آں خال سیہ دید بہ دل گفت — اے کاش کہ من بودمے آں بندۂ مقبل
شاہا فلک از بزم تو در رقص و سماع است — دست طرب از دامن ایں سلسلہ مگسل
مے نوش و جہاں بخش کہ در زلف کمندت — شد گردن بد خواہ گرفتار سلاسل
چوں دور فلک یکسرہ بر منہج عدل است — خوش باش کہ ظالم نبرد راہ بہ منزل

حافظ قلم شاہ جہاں مقسم رزق است
از بہر معیشت مکن اندیشۂ باطل

اس غزل کے مطالعے سے معلوم ہوگیا ہوگا کہ حافظ کی قصیدہ خوانی کس حد تک دوسرے فارسی شعرا کی طرز پر ہے - معترض بڑے جوش و خروش کے ساتھ حافظ کا شعر پیش کرتے ہیں —

ما آبروے فقر و قناعت نمی دهیم با بادشاہ بگوے کہ روزی مقدر است

لیکن ذرا اس کے ساتھہ مندرجۂ بالا غزل کا آخری شعر بھی پڑھ ڈالیے کہ نصرۃ الدین یحییٰ کی قلم روتی تقسیم کرنے والی ھے۔ کیا یہی وہ فقر و قناعت ھے؟ اور کیا اسی کے لیے بادشاہ کو کہا گیا ھے کہ " روزی مقدر است؟"

میں نے شاہ یحییٰ کی تعریف کے متعلق مدحیہ اشعار درج کیے ھیں۔ جب شاہ یحییٰ جیسے معمولی بادشاہ کی تعریف میں حافظ اتنے مدحیہ اشعار جمع کر سکتا تھا تو شاہ شجاع شاہ منصور کی تعریف میں تو جو کچھہ لکھا جائے جائز ھے —

(ب) شاہ منصور کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھا ھے۔ وہ بھی ملاحظہ فرمائیے —

جوزا سحر نہاد حمائل برابرم یعنی غلام شاهم و سوگندمی خورم

شاها من ار بہ عرض رسانم سریر فضل مملوک آں جنابم مسکین ایں درم

من جرعہ نوش بزم تو بودم هزار سال کے ترک آبخور کند ایں طبع خوگرم

یہ شعر ذرا غور سے ملاحظہ فرمائیے —

گر بر کنم دل از تو و بردارم از تو مہر آں مہر بر کہ افگنم آں دل کجا برم

یعنی حافظ کے نزدیک، اگر کوئی هستی ایسی هو سکتی ھے جس سے وہ محبت کر سکتا ھے تو وہ شاہ منصور ہے۔ کیا

منصور بن محمد غازی ست حرزمن وزایں خجستہ نام بر اعدا مظفرم

یعنی شاہ منصور کا نام ھی اتنا متبرک (اسم اعظم) ھے کہ اس کے ورد سے وہ اپنے دشمنوں پر فتح پا لیتا ھے

عهد الست من همہ با مہر شاہ بود در شاهراہ عمر ازیں عهد بگزرم

یعنی عام انسانوں کا عہد الست تو خدا کی ربوبیت کو تسلیم کرنا تھا - لیکن حافظ کا عہد الست ' صرف شاہ منصور کی وفاداری تھا - اور اسی کے باعث اس نے تمام زندگی بسر کی —

اور آخری اشعار بھی ملاحظہ فرمائیے :

شعرم بہ یمن مدح کہ صد ملک دل کشاد
گوئی کہ تیغ تست زبان سخنورم
حافظ بہ جان دعائے تو گوید بہ صبح و شام
بر ایں سخن گوا ہست خداوند اکبرم

ساقی نامہ میں بھی حافظ نے بدعت قائم کی - اس سے پہلے کسی شخص نے ساقی نامہ میں کسی بادشاہ کی مدح نہیں کی تھی - حافظ پہلا شاعر ہے جس نے ساقی نامے میں بھی مدح سرائی کو نہ چھوڑا - اس مدح کے بعض اشعار میں اوپر کسی اور بیان کے دوران میں درج کر آیا ہوں - اس جگہ صرف آخری اشعار درج کرتا ہوں —

بجائے سکندر بماں سالہا | بدانا دلی کشف کن حالہا
چو دریاے وصفت ندارد کنار | ثنا را کنم بر دعا اختصار
ازاں پیشتر کاوری درضمیر | ولایت ستاں باش و آفاق گیر
زماں تا زماں از سپہر بلند | بفتحے دگر باش فیروز مند

(ج) ذرا اب شاہ شجاع کے قصیدے کے الفاظ بھی سن لیں

شد عرصۂ جہاں چوں بساط ارم جواں | از پر تو سعادت شاہ جہانیاں
خاقان شرق وغرب کہ در غرب و شرق اوست | صاحبقراں و خسرو شاہ خدایگاں
خورشید ملک پرور و سلطان دادگر | دارائے عدل گستر و کسرئے نشاں
سلطان نشان عرصۂ اقلیم سلطنت | بالا نشین مسند ایوان لا مکان

دارائے دھرشاہ 'شجاع' آفتاب ملک خاقان کامگار و شہنشاہ نوجوان
حکمش رواں چو باد براطرات بحر و بر مہرش رواں چوروح براعضائے انس وجان
بے طاعت تو جان نگراید بہ کالبد بے نعمت تو مغز نہ بندد در استخوان
با پائے جلال تو افلاک پائمال و زبحر جود دست تو در دھر داستان
اے خسرو رفیع جناب منیع قدر رے داور عدیم مثال و عظیم شان

آخر کے دعائیہ اشعار بھی ملاحظہ ہوں :—

اے ملہمے کہ در صف کر و بیان قدس فیضے رسد بہ خاطر پاکت زمان زمان
دادہ فلک عنان ارادت بدست تو یعنی کہ من کیم بمراد خودم رسان
خصت کجاست درتہ پاے خودت فگن یار تو کیست بر سر و چشم منش نشان
ھم کارم من بخدمت تو منتظم ھم نام من بہ مدحت تو گشتہ جاودان

کیا آخری شعر کا بھی یہی مطلب ھے کہ 'حافظ' کے طفیل شاہ 'شجاع' کا نام روز آخر تک رھے گا؟ کیا اس سے بے انتہا خوشامدانہ لہجہ مترشح نہیں ھوتا کہ شاہ 'شجاع' کے مدحیہ قصیدہ کی بدولت 'حافظ' کا نام زندۂ جاوید ھوگا —

آخر میں' میں 'حافظ' کے دو قطعات بھی پیش کرتا ھوں۔ ملاحظہ ھو :—

(۱)

بہ سمع خواجہ رساں اے رفیق وقت شناش بہ خلوتے کہ دراں اجنبی صبا باشد
لطیفۂ بمیاں آر و خوش بخنداں نش بہ نکتۂ کہ دلش را دراں رضا باشد
پس انگہے ز کرم آں قدر پرس ز لطف کہ گر وظیفہ تقاضا کنم روا باشد

(۲)

شاھا مبشرے ز بہشتم رسیدہ است رضواں سریر و حوروش و سلسبیل موے

خوش لفظ و پاک معنی و موزوں و دلفریب صاحب جمال و نازک و خوب و لطیفه گوے
گفتم دریں سرا چه ز بهرچه آمدی گفتا ز بهر مجلس شاه غریب جوے
اکنوں ز صحبت من مفلس بجاں رسید نزدیک خویس خواس و کام دلش بجوے

طوالت کے خوف سے میں اس سلسلے کو یہاں ختم کرتا هوں —

(۸) میں نے تنقید میں وه اشعار جو 'حافظ' نے شاه 'شجاع' کی خوشامدانه مدح میں لکھے تھے ' پیش کئے تھے - ان کے آخری اشعار یه هیں —

محل نور تجلی ست راے انور شاه چو قرب او طلبی در صفاے نیت کوش
بجز ثناے جلالش مساز ورد ضمیر که هست گوش دلش محرم پیام سروش
رموز مصلحت خویش خسرواں دانند گداے گوشه نشینی تو حافظا مخروش

ان اشعار کا سمجھنا هر فارسی داں کے لیے آسان هے —

(۱) بادشاه کی روشن راے ' نور تجلی کا محل هے- اگر تو اس (یعنی بادشاه) کا قرب چاهتا هے تو نیت کو صاف رکھه —

(۲) سواے اس کی مدح کے اور کسی چیز کو اپنے ضمیر کا ورد مت بنا کیوں که اس کا دل جبرئیل؏ کے پیام (یعنی الهام و وحی) کا رازدار هے ... الخ —

ان اشعار سے نه صرف خوشامد کی بو آتی هے بلکه اس کے ساتھه مبالغه بھی موجود هے- ایک بادشاه کو جو خاص کر شراب نوشی به مداومت کرتا هو ' جبرئیل؏ کے پیام کا حامل سمجھنا پرلے درجے کی خوشامد نہیں تو اور کیا هے! لیکن چونکه معترض کا مطلب فوت هوتا تھا اس لیے فرماتے هیں که یه ترجمه هی غلط هے- اشعار بالکل سیدھی عبارت میں هیں لیکن پھر بھی فرماتے هیں :—

"بادشاہ محل نزول نور تجلی ہوتا ہے اور (خدا) کا قرب چاہیے تو صفائے قلب میں سعی جاری رکھے۔ سوائے اس کی ثنائے جلال کے دل کا وظیفہ کچھ نہیں ہونا چاہیے کیوں کہ دل کے کان محل نزول الہام ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ قلب صاف ہوگا تو انسان اپنے ارادوں میں ملہم من اللہ ہوتا رہے گا اور اچھی ہی بات اس کے دل میں آئے گی" —

اب ان اشعار کے ملاحظے کے بعد ان دونوں ترجموں کا مقابلہ کرنا چاہیے—

اول تو میں نے تنقید میں جو شعر پیش کئے تھے ان میں معترض نے بے جا اور بغیر کسی دلیل کے ایک تحریف کردی ہے۔ مثلاً دوسرے شعر کا دوسرا مصرع میں نے یوں لکھا تھا "کہ ہست گرش دلش ... الخ" — لیکن معترض نے "دلش" کو "دلت" بنا دیا اور اس تحریف کے لیے کوئی دلیل، کوئی شہادت پیش نہیں کی حالانکہ تمام مطبوعہ اور غیر مطبوعہ دواوین اس بارے میں متفق ہیں —

دوم۔ پہلے شعر کے دوسرے مصرع میں جو ضمیر "او" موجود ہے اس کا مرجع "رائے انور شاہ" ہے جس حالت میں وہ معنی جو میں نے کئے ہیں (یعنی اگر تو اس یعنی بادشاہ کا قرب چاہتا ہے الخ) ٹھیک بیٹھتے ہیں۔ لیکن اس کے برعکس آپ نے "او" کو "خدا" کی طرف راجع کیا ہے جیسا کہ آپ کے ترجمہ سے ظاہر ہے۔ لیکن یہ بالکل غلط ہے۔ یہی غلطی آپ نے دوسرے شعر کے ترجمہ میں بھی کی۔ ضمیر متصل "ش" جو دو بار موجود ہے، اسی "رائے انور شاہ" کی طرف راجع ہے۔ لیکن معترض اس کو بھی "خدا" کی طرف راجع سمجھتے ہیں—

لیکن سب سے بڑی دلیل جو میں اپنی تائید میں پیش کر سکتا

ہوں، حافظ کے تیسرے شعر کا پہلا مصرع "رموز مصلحت خویش خسروان دانند" ہے۔ اس مصرع سے صاف اور واضح طور پر ٹپکتا ہے کہ جو کچھ اوپر کہا جا چکا ہے وہ "بادشاہ" کے متعلق ہے۔ ان شواہد کی موجودگی میں بالکل اُلٹے معنی کرنے، حافظ کی شاعری کا کمال نہیں بلکہ تنقیص ہے۔ اور پھر ایسی جسارت کے بعد آپ اس معنی کو عظیم الشان اور مفید گُل سمجھتے ہیں :—

حافظ تو ختم کن کہ ہنر خود عیاں شود
با مدعی نزاع و محابا چہ حاجت است

—— * ——

مرزا غالب کا غیر مطبوعہ خط

موسومہ نواب انوارالدولہ سعدالدین خاں بہادر

متخلص بہ شفق تلمیذ حضرت غالب

پیرو مرشد کیا حکم ہوتا ہی احمق بنکر چپ ہو رہوں یا جو ازروے کشف یقینی مجھہ پر حالی ہوا ہے وہ کہوں - اول رجب میں نوازشنامہ آپ نے کب بھیجا آخر میرے پاس پہنچ ہی گیا یہ جو اب بھیجا اگر روانہ ہوا ہوتا تو وہ بھی پہنچ گیا ہوتا بہر حال محبت کی گرمی ہنگامہ ہے- یہ جملہ محض آرایش عنوان نامہ ہے - عمرت دراز باد کہ اینہم غنیمت است۔ پندارونکا اجراے پنسن اور اہل شہر کی آبادی مسکن یہاں اس صورت پر نہیں ہے جیسی اور کہیں ہے اور جگہ سیاست ہي منجملہ ضروریات ریاست ہے یہاں قہر الہی ہے منشاء تباہی ہی خاص میری پنسن کے باب میں گورمنٹ سے رپوٹ طلب ہوی ہی ابناے روزگار حیران ہیں یہ بھی ایک بات عجب ہوئی ہے رپوٹ کی روانگي کي دیر ہے چند روز اور بھی قسمت کا پھیر ہے دلی علاقۂ لفتنٹ گورنر سے انقطاع پاگئی اور احاطۂ پنجاب کے تحت حکومت آگئی رپوٹ یہاں سے لاہور اور لاہور سے کلکتے جائے گی اور اسی طرح پھیر کھا کر نوید حکم منظوری آئے گی - فعل لازم کو جب متعدی کیا چاہئے تو پہلے مضارع میں سے مصدر بنالیا چاہیے گشتن مصدر اصلی گردد مضارع گردیدن مصدر

مضارعی گردانیدن وگردانیدن مصدر متعدی موافق اس قاعدہ کے کردن کا متعدی کنانیدن و کنانیدن ہے نه کرانیدن - کرانیدن تو کرانے کی فارسی ہے جیسے چلانے کی فارسی چلایدن اور یه شوخی طبع وظرافت ہے نه اس میں صحت ہے نه لطافت ہے - کرانیدن غلط اور کنانیدن صحیح گشتن کو گشتانیدن اور رستن کو رستانیدن نه کہینگے بلکه گردیدن وروئیدن بناکر گردانیدن وررویانیدن لکھینگے بلغا کے کلام میں کردن کا متعدی شاید کہیں نه آیا ہو اگر آیا ہوگا تو کنانیدن آیا ہوگا کرانیدن ٹکسال باہر ہے ۱۲ تذکیرو تانیث کا دایرہ بہت وسیع ہے - دہی - بعض کہتے ہیں دہی اچھا بعض کہتے ہیں دہی اچھی - قلم - کوئی کہتا ہی قلم ٹوٹ گیا - کوئی کہتا ہے قلم ٹوٹ گئی فقیر دہی کو مذکر بولتا ہی اور قلم کو بھی مذکر جانتا ہے علیٰ ہذا القیاس شنگرت بھی مذبذب ہے کوئی مذکر اور کوئی مونث کہتا ہے میں تو شنگرت کو مونث کہونگا - خلاصه یه که اس ہیچمدان کے نزدیک کردن کا متعدی کنانیدن ہے اور شنگرت مونث ۱۲ خداوند، آئین بندہ پروری بھول نجاؤ گاہ گاہ نامه و پیام بھیجتے رہو - کیا میں یه نہیں لکھہ سکتا که میں نے اس عرصے میں دو خط بھیجے اور آپ نے ایک کا جواب نہیں لکھا ہاں یه عرض کرتا ہوں کے آج صبح کو آپ کا خط آیا ادہر پڑھا ادہر جواب لکھا سچ یوں ہے که ڈاک میں اکثر خطوط تلف ہوتے ہیں بیرنگ پر ضایع ہونیکا گمان کم ہے اس دستور کا بادی اور بانی میں ہوتا ہوں - یه خط بیرنگ بھیجتا ہوں آپ بھی اب جب کبھی بغرض محال خط بھیجئے تو بیرنگ بھیجئے زیادہ حد ادب - عرضداشت غالب - نگاشتهٔ چهارشنبه سیوم شعبان ونهم مارچ سال حال ۱۲ —

ولی کے سنہ وفات کی تحقیق

از

ادیٹر

ولی کا سنہ وفات اب تک غیر متحقق ہے - اردو شعرا کے جس قدر تذکرے اس وقت تک دستیاب ہوے ہیں وہ سب اس بارے میں خاموش ہیں - البتہ مولوی عبدالجبارخاں مرحوم مولف تذکرۂ شعراے دکن نے اس کا سنہ وفات سنہ ۱۱۵۵ ھ لکھا ہے لیکن کوئی حوالہ یا ثبوت پیش نہیں کیا - بعض حال کے مصنفین نے اِسی کو صحیح سمجھ کر نقل کردیا ہے - بعض صاحبوں نے اس شعر سے —

دل ولی کا لے لیا دلی نے چھین　　جا کہو کوئی محمد شاہ سوں

یہ استنباط کیا ہے کہ ولی محمد شاہ کے زمانے میں تھا - محمد شاہ کا سنہ جلوس ۱۰۳۱ ھ ہے - لیکن یہ قطعی طور سے ثابت ہے کہ یہ شعر ولی کا نہیں - میرے پاس ولی کے بارہ قلمی دیوان موجود ہیں ان میں کہیں یہ شعر نہیں اور نہ کسی اور دیوان (قلمی یا مطبوعہ) میں یہ شعر یا اس شعر کی غزل پائی گئی - اور لطف یہ ہے کہ بعض مرتب دیوان جو اس شعر کو سند میں پیش کرتے ہیں، خود ان کے مرتب کردہ دیوانوں میں یہ شعر نہیں پایا جاتا - اصل میں یہ شعر مضمون کا تذکرۂ گلشن گفتار (سنہ ۱۱۶۵ ھ)

اور چمنستان شعرا نے مضموں کے ذکر میں اس طرح نقل کیا ہے —

اس گدا کا دل لیا دلی نے چھین جا کہو کوئی محمد شاہ سوں

اسی قسم کی ایک دوسری غلط فہمی بھی ہوی جس سے ولی کا محمد شاہ کے عہد میں ہونا ثابت کیا گیا ہے - مصحفی نے اپنے تذکرے میں شاہ حاتم کی زبانی یہ بیان کیا ہے کہ " روزے پیش فقیر نقل می کرد کہ در سنہ دویم فردوس آرامگاہ دیوان ولی درشاہجہاں آمدہ و اشعار بر زبان خورد و بزرگ جاری گشتہ " * - بعض اصحاب نے اس بیان کو دیکھہ کر غلطی سے یہ سمجھہ لیا کہ ولی محمد شاہ کے عہد میں دلی گیا تھا - حالانکہ اس میں صاف طور پر دیوان کے پہنچنے کا ذکر ہے نہ کہ دلی کے جانے کا -

یہ سب تذکرہ نویس لکھتے ہیں کہ ولی دلی گیا تھا لیکن سوائے قائم کے کسی نے صحیح سنہ اس کے دلی جانے کا نہیں بتایا - قائم لکھتا ہے کہ وہ عالمگیر کے ۴۴ سنہ جلوس † (سنہ ۱۱۱۲ ھ) میں دلی گیا - اس کا دو بارہ دلی جانا جیسا کہ بعض صاحبوں نے بیان کیا ہے ' ثابت نہیں ہوتا - غالباً اُس شعر سے جو اوپر نقل کیا گیا ہے یہ غلطی پیدا ہوی —

ایک مدت کی جستجو کے بعد اب یہ امر پایۂ تحقیق کو پہنچا ہے کہ ولی کی وفات سنہ ۱۱۱۹ ھ میں ہوی - اس کی شہادت ہمیں ذیل کے قطعۂ تاریخ سے ملتی ہے جو کتب خانۂ جامع مسجد بمبئی کے قلمی نسخۂ دیوان ولی (نشان ۴۲۷۹) کے خاتمے پر درج ہے —

مطلع دیوان عشق سید ارباب دل والي ملک سخن صاحب عرفاں ولی

---

* تذکرہ ہندی صفحہ ۸۰

† مخزن نکات صفحہ ۱۰

سال وفاتش خرد از سرالہام گفت باد پلدہ ولی ساقی کوثر علی

اس دیوان کی کتابت ۲۱ سنہ جلوس محمد شاہی میں ہوئی اور کاتب کا نام شہسوار بیگ ہے —

اس کے بعد اس امر کی مزید صحت و توثیق احمد آباد کے ایک خانگی کتب خانے کی بیاض سے ہوگئی - اور اس اثنا میں یہ بھی معلوم ہوا کہ اس قطعہ کے مصنف مولوی حسن مفتی ہیں —

ولی کی زندگی اور کلام کے متعلق ابھی اور کئی امور مشتبہ اور تحقیق طلب ہیں - یہ فی الحال زیر تحقیق ہیں اور آیندہ وقتاً فوقتاً ان پر بحث کی جاے گی —

تبصرے

ادب

متفرقات

سالنامے

أردو کے جدید رسالے

— * —

تبصرے

ادب

نقد الادب

(تالیف جناب حامداللہ افسر صاحب نول کشور
پریس لکھنؤ - مجلد ' قیمت دو روپے)

مولانا حالی کے بعد سے ادبی تنقید کی طرف توجہ ہونے لگی اور اس مبحث پر متعدد تالیفیں اور تحریریں شایع ہوئیں۔ جناب حامداللہ افسر صاحب کی یہ تالیف خاص اس فن پر ہے۔ اس میں انہوں نے مغربی اور مشرقی خیالات کو سمونے کی کوشش کی ہے۔ اصل میں یہ مختصر کتاب ہاسل ورس فولڈ کی تالیف Judgment in Literature کا چربہ ہے۔ البتہ قابل مولف نے اردو ادبیات کی مناسبت سے کہیں کہیں تصرف کردیا ہے۔ خاص کر آخری باب جس میں اردو کے اصناف سخن یعنی غزل ' مثنوی ' قصیدے اور مسدس کی حقیقت اور ان کی خصوصیات بیان کی ہیں۔ مبتدیوں

کے لیے یہ کتاب فن تنقید پر رہ نمائی کا کام دے سکتی ہے - ہر مضمون کو بہت صفائی اور خوبی سے بیان کیا ہے —

نوادر

(یعنی مجموعۂ لطائف و ظرائف مولفۂ جناب مرزا محمد
عسکری صاحب بی - اے لکھنوی - صفحات ۲۵۲ قیمت
ایک روپیہ - مولف یا الناظر بک ایجنسی لکھنؤ
سے مل سکتی ہے)

یہ بڑی پر لطف کتاب ہے - قابل مولف نے ہر طبقے اور گروہ کے دلچسپ لطیفے بڑی تلاش سے جمع کر دیے ہیں - اس میں شعرا و حکماء معلم اور موذن، احمق اور عورتیں، ڈاکٹر اور طبیب، چور اور پرخور غرض ہر قسم کے لوگ آگئے ہیں - آخر میں اشخاص کا ایک انڈکس بھی دیا ہے - جو لوگ اسے پڑھ کر لطف اٹھائیں گے وہ مولف کی محنت اور جستجو کی داد دیں گے —

اردو زبان اور ادب

(یعنی اردو سروے کمیٹی کی رپورٹ مولفہٗ و مرتبہ
جناب مولوی سید ضامن علی صاحب ایم - اے، صدر
شعبہ اردو، الہ آباد یونیورسٹی - ہندوستانی
اکاڈیمی الہ آباد سے مل سکتی ہے)

ہندوستانی اکاڈیمی کی کونسل کی ایک قرارداد کے بموجب ایک کمیٹی اس غرض سے قایم کی گئی کہ اردو زبان کے ادب کی جانچ پرتال کی

جائے کہ اسے کس قسم کی تصانیف کی ضرورت ہے - اس کمیٹی کے صدر جناب سید ضامن علی اور سید مسعود الحسن صاحب ایم۔اے اور رشید احمد صاحب صدیقی رکن تھے - یہ اسی کمیٹی کی رپورٹ ہے —

اس رپورٹ کے تین حصے ہیں - پہلے حصے میں زبان کی ابتدا اور اس کی تدریجی ترقی کا بیان ہے۔ دوسرے حصے میں اردو ادب کی موجودہ اور آیندہ ضرورت اور اکاڈیمی کی طرز عمل کی بابت تجاویز ہیں - تیسرے حصے میں ابتدا سے لے کر اس وقت تک جو کتابیں اردو میں لکھی گئی ہیں ان کی فہرست بقید سنہ تصنیف ہے —

کتاب کا نام بڑا ہے مگر اس کے اعتبار سے کام بہت کم ہے - تینوں حصے ناقص اور نامکمل ہیں اور یہ رپورٹ محض سرسری اور ناکافی ہے - اس کام کو بخوبی انجام دینے کے لیے بہت زیادہ محنت، تلاش اور وقت کی ضرورت ہے —

روح ادب

(مولفۂ جناب سید حید رعباس حیدر، منشی کامل، بی - اے رام نگر بنارس اسٹیٹ - صفحات ۵۰ چھوٹی تقطیع - قیمت آٹھ آنے)

اس میں مولف نے کچھ ایسے الفاظ جمع کیے ہیں جو غلط بولے یا لکھے جاتے ہیں - مگر بعض جگہ انھوں نے زیادتی کی ہے - ہر زبان کا یہ قاعدہ ہے کہ غیر زبان کے الفاظ جب اس میں داخل ہوتے ہیں تو اکثر اوقات ان میں کچھ نہ کچھ رد و بدل ہوجاتا ہے - قابل مولف کا یہ کہنا کہ جمعدار غلط ہے اور جماعہ دار صحیح اور رسالدار غلط اور رسالہ دار

صحیح درست نہیں - لچار ترکیب کے لحاظ سے غلط ہو لیکن یہ ہندیوں کا تصرف ہے اور صحیح ہے - ناچار اور لاچار کے مفہوم میں بھی فرق ہے۔ جو الفاظ استعمال میں آگئے ہیں اور عام و خاص کی زبان پر جاری ہیں انہیں اردو میں صحیح اور فصیح خیال کرنا چاہئے گو اصل کے اعتبار سے غلط ہی کیوں نہ ہوں۔ بہر حال اس کے مطالعہ سے پڑھنے والے کو بہت سے الفاظ کی صحت ہو جائے گی —

خاقانیءِ ہند

(مولفہ جناب میاں محمد رفیق خاور ایم - اے
مطبوعہ عالمگیر پریس لاہور۔ قیمت ایک روپیہ)

یہ ذوق کی شاعری پر مفصل تنقید ہے - پہلا باب اصول تنقید پر ہے ، دوسرا سوانح حیات پر ، تیسرا ماحول اور اس کے اثرات ، چوتھا ، وجدان ملکات اور شخصیت ، پانچواں ، آرٹ اور چھٹا باب موازنۂ ذوق و غالب پر ہے —

مولف پر جوش ، مستعد اور قابل نوجوان ہیں - لیکن اپنی طبیعت پر قابو نہیں - ان کا مطالعہ اور نظر وسیع ہے ، لکھنے کا سلیقہ رکھتے ہیں ، اردو زبان کے دلدادہ ہیں ، فارسی کا اچھا ذوق ہے اور بہت اچھے تنقید نگار ہو سکتے ہیں بشرطیکہ مصنف ہونے کے شوق میں عجلت نہ کریں - اس کتاب میں عجلت کے آثار شروع سے آخر تک نظر آتے ہیں ، اسی وجہ سے ترتیب خیالات اور طرز بیان اکھڑا اکھڑا سا ہے —

ذوق کو کوئی بھی اعلیٰ درجے کا شاعر نہیں مانتا - اس بات کے ثابت کرنے میں کہ ذوق بڑا شاعر نہیں تھا، اس قدر دردسری اور اس قدر طول طویل مباحثوں کی ضرورت نہ تھی - اس میں ان کی محنت اور کاوش کا بہت سا حصہ رائگاں گیا - تنقید نہایت ضروری اور اچھی چیز ہے - تنقیص کے اظہار کا بھی ڈھنگ ہوتا ہے - لیکن اس طرح ہاتھ دھو کر کسی کے پیچھے پڑ جانا جس سے معلوم ہو کہ جیسے کوئی ذاتی بغض و عناد ہے، تنقید نگار کے لیے زیبا نہیں - بری چیز کو دیکھ کر بیشک غصہ آتا ہے لیکن غصے کا اظہار بری طرح نہیں ہونا چاہئے - وہی باتیں جو فاضل مولف نے ذوق کے خلاف لکھی ہیں سلیقے سے بھی لکھی جا سکتی تھیں اور اس حالت میں یہ کتاب اور زیادہ قابل مطالعہ ہو جاتی - مولف نے جوش نفرت میں ہر امر کو جو ذوق کے خلاف ملا یا اس کے کلام سے انھوں نے اخذ کر کے دکھایا ہے بغیر تحقیق اور غور کے لکھ دیا ہے - مثلاً

" آپ نے اپنے مذہب کی تصریح نہیں کی - چونکہ بادشاہ حنفی اور وہ شیعہ، اس لیے آپ نے اپنے تشیع کا کھل کر اظہار نہ کیا "

" مذہب کے لحاظ سے ذوق متشدد شیعہ ہے " —

" ذوق ایک مدت تک لذائذ دنیوی کے دلدادہ رہے، ان میں سے ایک مے نوشی ہے " —

یہ واقعات اگر مولف نے اپنی تحقیق سے دریافت کیے ہیں تو اپنے ماخذوں کا حوالہ دینا چاہئے تھا اور اگر ذوق کے بعض اشعار سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے تو درست نہیں - ہمارے غزل گو شاعر اس قسم کی سینکڑوں باتیں لکھ جاتے ہیں جن کو ان کی ذات یا عقائد سے کوئی تعلق نہیں ہوتا —

مولف نے منجملہ دیگر اعتراضات کے ذوق پر رکاکت اور عامیانہ پن کا بھی سخت اعتراض کیا ہے اور یہ بالکل صحیح ہے لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ خود مولف کی تحریر بعض اوقات اسی حد تک جا پہنچی ہے کہیں یہ کلام ذوق کے گہرے مطالعے کا اثر تو نہیں —

زبان اور محاورے اور اسی قسم کی دوسری بحثیں اس کتاب میں ضمنی طور پر آگئی ہیں۔ مثلاً انہوں نے بعض الفاظ اور محاوروں کو محض اس لیے سوقیانہ یا عامیانہ قرار دیا ہے کہ وہ ذوق نے استعمال کیے ہیں ورنہ اور کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔ جو فہرست مولف نے دی ہے اس میں متعدد ایسے لفظ اور محاورے ہیں جو ہر معقول پسند شخص استعمال کر سکتا ہے۔ لفظ نہ رکیک ہوتا ہے نہ متین۔ یہ صرف استعمال پر منحصر ہے۔ اس قسم کے اور بھی بہت سے امور ہیں جو قابل بحث ہیں لیکن اس کے لیے نہ موقع ہے نہ گنجائش ہے —

مولف ذہین، پر جوش، ادب سے ذوق رکھنے والے اور قابل شخص ہیں اور بہت ہونہار معلوم ہوتے ہیں لیکن دو بڑے دشمن ان کی تاک میں لگے ہوئے ہیں ایک مصنف ہونے کا شوق دوسرا عجلت۔ اگر ان سے کبھی چھٹکارا ہو گیا تو بڑا کام کریں گے —

گاندھی نامہ

(مصنفہ میاں محمد رفیق صاحب خاور ایم۔ اے۔ قیمت ایک روپیہ چار آنے۔ مصنف سے باغبانپورہ، لاہور کے پتے سے مل سکتا ہے)

شاید مہاتما گاندھی کی یہ پہلی منظوم سوانح عمری ہے۔ قابل مصنف

نے اس میں بہت صاف ستھرے طرز میں عقیدت کے ساتھہ گاندھی جی کے حالات پہلی بار ولایت جانے تک کے نظم کئے ہیں - کہیں کہیں فسانے کا رنگ بھی دیدیا ہے لیکن اس سے حقیقت حال پر کچھہ اثر نہیں پڑتا ' بلکہ وہ اس کا ممد ہوجاتا ہے - طویل بیانیہ نظم میں ہر جگہ شعر کی خوبی قائم رکھنا مشکل ہوتا ہے - اس لیے کہیں کہیں خامیاں بھی نظر آتی ہیں لیکن وہ نظم کی روانی اور بیاں کی صفائی کے سامنے قابل لحاظ نہیں - شاعر کو خود بھی شبہہ ہے کہ ممکن ہے کہ کہیں کہیں " صوری و معنوی اسقام رہ گئے ہوں ' اسقام کا رہ جانا کوئی بڑا عیب نہیں لیکن جو عذر اس کے متعلق انھوں نے پیش کیا ہے وہ اگر نہ لکھتے تو بہتر تھا - مثلاً " ابھی نظم کا ایک شعر بھی تحریر نہیں ہوا تھا کہ اس کی افواہ بعض ادب پرست اصحاب تک پہنچ گئی ' اُن کے لامتناہی سلسلۂ خطوط اور فرمائشوں نے ہمیں عجب مصیبت میں ڈال دیا اور ہم مجبور ہوگئے کہ نظم کو کم سے کم وقت میں پایۂ تکمیل تک پہنچا دیں " یا یہ کہ " چونکہ لکھتے وقت ہمارے پاس کوئی عمدہ ڈکشنری نہ تھی اور نہ کوئی ایسا قابل شخص موجود تھا جس سے ہم مشورہ کرسکتے اس لیے عجب نہیں کہ نظم میں بہت سے الفاظ اور قوافی وغیرہ غلط یا محاورے کے خلاف ہوں " اس تمام طول طویل معذرت کے جواب میں یہ پرانا برجستہ فقرہ کہا جاسکتا ہے کہ " شعر گفتن چہ ضرور " -

شاعر کو کوئی خارجی قوت شعر کہنے یا کسی نظم کو قبل از وقت تکمیل کرنے پر مجبور نہیں کرسکتی - اگر اتفاق سے کوئی ایسی آسمانی سلطانی آفت نازل ہوجائے تو خیر وہ دوسری بات ہے - لیکن یہ مجبوریاں جو بیان کی گئی ہیں ' انھیں پڑھ کر شاعر کی سادہ دلی پر ہنسی بھی آتی ہے اور اُس سے ہمدردی بھی پیدا ہوتی ہے —

تغلق نامۂ امیر خسرو

(مرتبۂ مولوی سید ہاشمی صاحب ' سلسلۂ مخطوطات فارسیہ ' حیدرآباد دکن)

اگر مردے کا زندہ کرنا کرامات ہے تو تغلق نامے جیسی نایاب و ناپید کتاب کا کھوج لگانا اور شایع کرنا اس سے کچھہ کم نہیں ۔ آج سے نہیں کئی صدی سے اس کتاب کا صرف نام ہی نام تھا اور کہیں پتا نہ تھا ۔ اب بزم مخطوطات فارسی (حیدر آباد دکن) کی بدولت چھپ کر شایع ہوگئی ہے ۔ بزم کا یہ بہت بڑا اور قابل ناز کارنامہ ہے ۔مولوی سید ہاشمی صاحب نے اس کی تہذیب و تصحیح میں بہت محنت کی ہے اور شروع میں کتاب کی تاریخ ' اس کے متعلقہ حالات اور اس کی اہمیت پر بہت اچھا مقدمہ لکھا ہے اور آخر میں کتاب کا پورا خلاصہ بھی دیدیا ہے ۔ حضرت امیر نے اس کتاب میں بڑا کمال یہ کیا ہے کہ زبان کی فصاحت و سلاست اور بیان کی خوبی اور ندرت کے ساتھہ تاریخی واقعات کا ذکر اس صحت اور احتیاط کے ساتھہ کیا ہے کہ اس عہد کی تاریخیں بھی اس سے قاصر ہیں ۔ اس مثنوی میں سلطان قطب الدین کے قتل ' خاندان علائی کی تباہی ' خسرو خاں کی چند روزہ بادشاہی ' تغلق کی سرتابی ' دہلی پر چڑھائی اور فتحیابی ' خسرو خاں کی گرفتاری اور قتل کے حالات ہیں ۔ حضرت امیر کی یہ آخری مثنوی ہے اور اس میں ان کی استادانہ پختگی صاف نظر آتی ہے ۔ میں اُن کی اس مثنوی کوادبی لحاظ سے بھی بڑے پایہ کی خیال کرتا ہوں ۔ یہ ان بے مزہ صنایع بدایع اور بے لگام تخیل سے پاک ہے جو فارسی کی اکثر مثنویوں کا مایۂ ناز ہیں ۔ حضرت امیر نے اس مثنوی میں

واقعات کی صورت بحیثیت شاعر اور مورخ کے بڑی صفائی کے ساتھ کھینچی ہے ۔ کتاب ہر لحاظ سے قابل قدر ہے اور اس کے لیے ہم سب کو بزم مخطوطات فارسی کا بہت ممنون ہونا چاہئے ۔ یہ اس سلسلے کی پہلی کتاب ہے اور خوشی کی بات ہے کہ اس کی ابتدا ایسی نایاب اور بے مثل مخطوطے سے ہوئی —

مغل اور اردو

اردو زبان کے دلدادہ جناب نواب سید نصیر حسین خاں خیال کو اس وقت سے جانتے ہیں جب انہوں نے ۱۹۱۶ ع میں انجمن ترقی اردو کے سالانہ جلسے میں اپنا خطبہ " داستان اردو " کے نام سے پڑھا ۔ یہ خطبہ در اصل اردو زبان کی تاریخ کا سرسری خاکہ تھا ۔ اردو داں طبقے میں اس کا جو ذرا کچھ چرچا ہوا وہ محض اس وجہ سے کہ اس وقت تک تاریخ ادبیات اردو کا مواد زیادہ روشنی میں نہیں آیا تھا ۔ لیکن اب اس موضوع پر کئی مشہور ادیبوں نے تحقیقات شروع کر دی ہے اور اس قدر عجیب و غریب نتائج بر آمد ہو رہے ہیں کہ کبھی سان گمان بھی نہ تھا کہ تاریخ زبان اردو کے میدان میں اس قدر وسعت ہوگی ۔ حال کی تحقیقات اور مزید امکانات پر نظر کرتے ہوے حضرت خیال کی یہ کتاب بہت ہی ابتدای کوشش معلوم ہوتی ہے جو ہر طرح نا مکمل اور غیر کافی ہے اور طرح طرح کی غلط فہمیوں اور غلطیوں سے بھری ہوی ہے —

" مغل اور اردو " جناب خیال کے خطبے (داستان اردو) کا ایک باب ہے جو تھوڑے بہت اضافہ و ترمیم کے ساتھ شایع کیا گیا ہے ۔ اس میں لائق

مولف نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ ہندوستان کے حکمران مغل خاندان نے اردو کی ترقی و توسیع میں کیا کام کیا —

فاضل مولف کو اپنے مقصد میں بہت کم کامیابی ہوئی ' وہ اس موضوع کو کما حقہ نہ نبھا سکے۔ اس میں طرح طرح کی غلطیاں اور خامیاں ہیں —

فاضل مرتب نے اُردو کا تعلق مغل حکمرانوں کے ساتھ دکھانے کی غرض سے بہت سی باتیں جمع کردی ہیں اور بعید سے بعید واقعات کو لاکر کسی نہ کسی طرح اپنے موضوع سے متعلق کر دیا ہے۔ مثلاً عالم گیر کی تعلیم نوازی ' علمی سرپرستی کی کئی مثالیں دی ہیں ' اور چھ سات صفحوں میں اس کا ذکر کیا ہے لیکن کوئی مدلل ثبوت اس بات کا نہیں دیا کہ عالم گیر نے اُردو پر کیا احسان کیا؟ بے حوالہ و سند ایک دو ٹھیٹ ہندی کہاوتیں لکھ دی ہیں کہ عالم گیر نے کسی موقع پر ان کو زبان سے ادا کیا تھا —

احمد شاہ بادشاہ کا ذکر بارہ صفحوں پر کیا لیکن کہیں یہ نہیں بتایا کہ بادشاہ کو راست اُردو زبان سے کیا تعلق تھا —

اسی طرح دوسرے بادشاہوں کے تذکرے لکھے لیکن یہ ثابت نہ کر سکے کہ ان بادشاہوں نے اُردو زبان کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ اگر فاضل مولف اپنی پرانی معلومات پر اکتفا نہ کرتے اور اپنے دائرۂ تحقیق کو زیادہ وسیع کرتے تو ان قیاس اور بعید از کار باتوں کو ہیر پھیر سے اور پھیلا پھیلا کر لکھنے کی ضرورت نہ ہوتی۔ ہم ان حکمرانوں کے متعلق چند باتیں لکھتے ہیں اُمید ہے کہ اس سے ہمارے اس بیان کی تصدیق ہو گی کہ حضرت خیال کی تحقیق ادھوری ' ناقص اور خیالی ہے —

عالم گیر کا کوئی فقرہ حضرت خیال کو نہیں ملا۔ ہم ایک مثال دیتے ہیں جس سے معلوم ہوگا کہ اس نے فارسی سوال کا جواب اُردو میں دیا ہے۔

بساتین السلاطین میں لکھا ہے کہ جب عالم گیر نے بیجاپور فتح کیا تو وہاں کے علما کی ایک جماعت عالم گیر کی خدمت میں حاضر ہوئی اور سوال کیا کہ ایک اسلامی سلطنت کو اس طرح زیر و زبر کرنے کی کیا وجہ تھی؟ بادشاہ مسلمان ہے اس سے کوئی ایسا فعل سرزد نہیں ہوا کہ منافی شان اسلام ہو۔ عالم گیر نے جواب دیا کہ بے شک یہ سب درست ہے لیکن بادشاہ نے سیواجی مرہٹے کو اپنے دربار میں پناہ دی اور وہ ایسا شخص ہے کہ اگر حرم میں بھی پناہ لے تو گردن زدنی ہے۔ عالم گیر کے اصل الفاظ یہ ہیں—

"اگر حرم میں بھی آچھد تو کشتنی" —

احمد بادشاہ کا بارہ صفحوں پر ذکر ہے لیکن کہیں یہ اشارہ بھی نہیں کہ بادشاہ خود شاعر تھا۔ تذکرۂ شورش میں اس کا ذکر بحیثیت شاعر موجود ہے ملاحظہ ہو فہرست مرتبہ اسپرنگر صفحہ ۱۹۱ —

اگر فاضل مولف اپنے مطالعے کو زیادہ وسعت دیتے اور صبر و تحمل اور ضبط و تمکین سے اپنی تحقیقات میں مشغول ہوتے تو ضرور ان کو مستند مواد مل جاتا اور اس سے ان کی کتاب زیادہ محققانہ اور مستند ہو جاتی —

لایق مولف نے تاریخ و تذکرے کی ضروری اور مستند کتابوں کا مطالعہ نہیں کیا اور اس ناواقفیت کے باوجود غیر مستند غیر صحیح واقعات کو بڑے شد و مد کے ساتھ پیش کیا ہے۔ معمولی، پامال اور غیر معتبر روایتوں کو اس وثوق اور بے باکی سے نافذ کرنا چاہا کہ تاریخی حقایق مسخ و مجروح ہو کر رہ گئے —

فاضل مولف کو یہ تک نہیں معلوم کہ شاہ ولی اللہ اشتیاق اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی دو مختلف بزرگ ہیں۔ وہ ان دونوں کو ایک

سمجھتے ہیں' ان دونوں سے ان کی مراد شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ہے چنانچہ انہوں نے اس کا ذکر دو جگہ کیا ہے —

" مولانا شاہ ولی اللہ صاحب علیہ الرحمہ نے ۱۱۵۰ ھ میں قرآن کا ترجمہ گو فارسی میں کیا مگر ان مرحوم نے بھی اردو کے بڑھتے ہوے زور کو آخر تسلیم کرلیا اور اشتیاق تخلص اختیار کر کے اس زبان کو بھی پاک اور اس کے مشتاقوں کو فرحناک کرنے لگے " - صفحہ ۱۱۲ —

" جناب شاہ ولی اللہ صاحب اشتیاق علیہ الرحمہ نے سنہ ۱۱۵۰ ھ میں قرآن پاک کا ترجمہ فارسی میں کیا - مگر اب پچاس برس کے اندر اندر اردو نے فارسی کی جگہ لے لی - ان کے صاحبزادے جناب شاہ عبدالقادر صاحب نے .... اب اس کلام کے معنی اردو میں بیان کرنا شروع کئے " —

اب جب کہ بہت سے تذکرے شایع ہو چکے ہیں اور تاریخ ادب کی تحقیق میں بڑی سہولت ہوگئی ہے اس پر بھی فاضل مولف نے اس غلطی کا ارتکاب کیا جو اس نواح میں علی لطف نے تقریباً ڈیڑھ سو سال قبل نہایت تبہم الفاظ میں کیا تھا —

اگر لایق مولف میر اور قایم کے تذکرے دیکھہ لیتے تو اس غلط فہمی کا شکار نہ ہوتے - اشتیاق کے متعلق میر اور قایم کے بیانات یہ ہیں —

" مردے بود ذی علم از اولاد شیخ الف ثانی - نبیسۂ شاہ محمد گل - مولد او سر ہند است - در کوٹلہ فیروز شاہ سکونت داشت - درویش متوکل - گاہے فکر ریختہ می کرد " (نکات الشعرا) —

" باوجود مذاق عالی چاشنی فقر داشت - در کوٹلہ فیروز شاہ

سکونت داشت ۔ انزوا گزیدہ اوقات عزیز بیاد الہی بسر می برد ...... چیزے از قبیل فارسی بر سبیل تفنن فکر می کرد۔ بندہ روزے بخدمتش حاضر شدم ، حرفہاے با مزہ می گفت۔ مدت هفت سال شد کہ بدار البقا انتقال نمود "۔ (مخزن نکات)۔

ان اطلاعات سے ظاہر ہے کہ یہ سر ہندی بزرگ شیخ مجدد الف ثانی کی اولاد سے تھے۔ سنہ ۱۱۹۱ ھ میں وفات پا چکے تھے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا انتقال سنہ ۱۱۷۶ ھ میں ہوا ہے۔ تاریخی مصرع ہے :—

او بود امام اعظم دین۔ لایق مولف نے سنہ ۱۱۸۰ ھ لکھا ہے۔ محدث دہلوی بے شک شاعر تھے لیکن فارسی کہتے تھے۔ 'امین' تخلص تھا۔ (ملاحظہ ہو حیات ولی افضل المطابع)۔ محدث دہلوی نے قرآن پاک کا ترجمہ فتح الرحمن فی ترجمۃ القرآن کے نام سے کیا تھا نہ کہ اشتیاق سرہندی نے شاہ عبدالقادر اشتیاق سرہندی کے صاحبزادے نہ تھے بلکہ حضرت شاہ ولی اللہ کے—

اس قسم کی ایک نادر ہوا بات فدوی لاہوری کے متعلق لکھی ہے۔ "یہ جب ہندو تھے تو مکند رام بنے رہے اور مسلمان ہونے پر محمد حسن ہوگئے۔ بادشاہ (احمد شاہ) کی تعریف میں انہوں نے ایک قصیدہ عرض کر کے گذارا۔ اس کی بڑی قدر ہوئی حضور نے ہزار روپیہ نقد اور گھوڑا اور تلوار انعام دی۔ سودا سے اور ان سے بڑے معرکے رہے ہیں"—

فدوی تخلص کے کئی شاعر ہوے ہیں۔ تذکرہ نویسوں کے بیانات ان کے متعلق زیادہ صاف نہیں۔ اس تخلص کے ایک دو شاعروں کے متعلق کئی شبہات ہیں۔ اس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔ یہاں ہمیں یہ دکھانا ہے کہ فاضل مولف نے جس فدوی کا ذکر کیا وہ یہ فدوی نہ تھا۔ نو مسلم فدوی ایک نہایت عامی اور اوباش شخص تھا۔ شوق اور مصحفی نے اس کو عامیانہ وضع ،

زیادہ گو، جنگ جو، نوکر پیشہ بے اندیشہ لکھا ہے۔ یہ غلط ہے کہ اس نے "عمر دلی میں گزار دی" یہ عرصے تک زندگی میں نواب محمد یار خاں امیر کی سرکار میں رہا (تذکرہ مصحفی)۔ اس کے بعد فرخ آباد گیا جہاں سودا سے شاعرانہ مجادلہ کیا۔ سودا نے خود لکھا ہے —

اے بیابان نحسوت کے غول　　بستیوں کو نہ کر تو ڈانوا ڈول
فرخ آباد کے محلوں میں　　حد سے باہر تو کر چکا ہے کلول

احمد شاہی دربار کا فدوی دوسرا شاعر ہے جس کے متعلق سرور نے لکھا ہے کہ وہ سرکار احمد شاہ میں سوانح نگاری کی خدمت پر مامور تھا۔ شاہ گھسیٹا کا شاگرد تھا۔ ملکا ملکہ درانی کے بعد عظیم آباد چلا گیا۔ لاہور کا ایک اور شاعر میر محمد حسین تھا جس کا تخلص فدوی تھا۔ یہ حسینی سید تھا اور جوانی میں لاہور سے دہلی چلا آیا تھا۔ آبرو سے شعر میں اصلاح لیتا تھا۔ قدیم لاہوری فدوی یہی شاعر ہے (سرور و مصحفی)۔ ان دو شاعروں میں سے کسی ایک کو احمد شاہ نے انعام وغیرہ سے سرفراز کیا ہوگا۔ نو مسلم فدوی لاہوری بعد کا شاعر ہے جیسا کہ شوق نے اس کو میر و مرزا کے بعد کے طبقے میں شریک کیا ہے۔ اس تخلص کے اور بھی دو شاعر ہیں جن کا ذکر قائم، عشقی، میر حسن اور قاسم نے کیا ہے لیکن سرفرازی و انعام کا کوئی قرینہ ان کے بیانات سے ان کے متعلق نہیں پایا جاتا۔

ولی دکھنی کا ذکر لایق مولف نے اپنی ناواقفیت کے باوجود اس حقارت سے کیا ہے کہ ان کی بے باکانہ دلیری پر حیرت ہوتی ہے —

"ہمارے تذکروں میں میاں ولی (دکھنی) اردو کے باوا آدم کہے جاتے اور کم نظری کی وجہ سے آج تک وہ سراہے جاتے ہیں مگر ایک ولی کیا کئی ولی نے زبان کی یہ کرامت کبھی نہیں دکھلائی۔ حق یوں ہے کہ ولی محمد شاہ

کے شروع زمانے میں اپنا دیوان بغل میں دبائے' گھوڑے کھڑے کی شناخت کے لئے دکن سے دلی کے ٹکسال گھر تک آئے اور اردو سیکھنے لگے" —

فاضل مولف نے تذکرہ نگاروں کی "کم نظری" کا ذکر فرمایا ہے لیکن حیرت ہے کہ ایک قدیم تذکرہ نگار کے بیان پر نظر ڈالنے کی زحمت گوارا نہیں فرمائی - قایم کا تذکرہ چھپ چکا ہے اس نے ۱۱۶۸ ھ میں صاف طور سے لکھا ہے کہ ۱۱۱۲ ھجری (۴۴ سنہ جلوس عالم گیر) میں ولی دھلی گئے تھے - محمد شاہ کی تخت نشینی سے ۱۲ سال قبل (یعنی ۱۱۱۹ ھ میں) ولی کی وفات ہوئی ہے - کسی قدیم مستند تذکرے میں ولی بہ عہد محمد شاہ دھلی جانے کا ذکر نہیں - مصحفی نے بحوالۂ حاتم لکھا ہے کہ سنہ دوم جلوس محمد شاہ میں ولی کا دیوان شاہ جہاں آباد پہنچا اور وہاں کے حلقۂ شعرا میں ہل چل ڈال دی اور اس کے اشعار لوگوں کی زبانوں پر جاری ہوگئے - اس کا اثر عرصے تک رہا - شاہ حاتم نے محمد شاہ کی وفات کے آٹھ سال بعد عالم گیر ثانی کے تیسرے سنہ جلوس میں لکھا ہے کہ " در ریختہ ولی را استاد می داند " - ایسی صورت میں ولی کا عہد محمد شاہی میں دھلی جانا اور زبان سیکھنا کہاں مستنبط ہوتا ہے - اس عامیانہ غلطی کو لایق مولف نے تسلیم کر کے بڑے رزق سے پیش کیا ہے اور اس کے باوجود دوسروں کو " تنگ نظری " کا الزام دیا ہے - ولی کا عہد محمد شاہ میں دھلی پہنچنے اور وہاں کی زبان سیکھنے کا خیال دو وجوہ سے پیدا ہوگیا ہے پہلی وجہ تو وہ ہے جو رسالہ ھذا کے مندرجہ مضمون " ولی کے سنہ وفات کی تحقیق " میں بیان ہوی ہے - دوسری وجہ میر' قایم اور شوق وغیرہ کے بیانات ہیں جن میں شاہ گلشن برہان پوری کی اس ہدایت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ انہوں نے ولی کو ریختہ میں طبع آزمائی کرنے کی طرف توجہ دلائی - ولی سنہ ۱۱۱۲ ھ میں دھلی پہنچا

اور سنہ ۱۱۱۹ ھ میں فوت ہوگیا۔ ایسی صورت میں نہ تو یہ عہد محمد شاہی ہے اور نہ یہ لازم آتا ہے کہ سنہ ۱۱۱۲ ھ کے بعد ریختہ میں طبع آزمائی کر کے سنہ ۱۱۱۹ ھ تک اس قدر ضخیم دیوان چھوڑ گیا۔ ولی کا سنہ ۱۱۰۹ ھ سے قبل ریختہ میں طبع آزمائی کرنا ثابت ہے جیسا کہ ذیل کے شعر سے ظاہر ہے —

پڑے سن کر اوچھل جیوں مصرع برق
اگر مصرع لکھوں ناصر علی کوں

ناصر علی ۱۱۰۹ ھ میں فوت ہوا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ولی اس سے قبل طبع آزمائی کرتا تھا اور اس کی تردید ہوتی ہے کہ عہد محمد شاہ میں شاہ گلشن کی ہدایت سے ریختہ میں طبع آزمائی کی —

لایق مولف کی نظر میں اردو زبان ترقی کے مدارج اور اس کے ارتقائی رجحانات نہیں ہیں۔ مختلف دوروں اور صدیوں میں اس زبان کے کیا رجحانات تھے اس کی ترقی و توسیع کے کیا اسباب تھے ان تمام ضروری علمی اور اصولی نظریوں سے ہمارے فاضل مولف لا علم ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے زبان کی تدریجی ترقی کا کوئی خاکہ پیش نہیں کیا۔ اس کمزوری کی وجہ سے وہ مختلف دوروں کی لسانی کیفیات میں تمیز نہ کرسکے —

مثلاً ہم تین مختلف اقتباسات پیش کرتے ہیں —

لایق مولف نے اکبر سے ذیل کے اشعار منسوب کئے ہیں —

پوچھی جو گھڑی منجھ سے براہ عادت
تو وصل کو ساعت کی نہیں کچھ حاجت
ہو جاتی ہے ملنے سے مبارک ساعت
ساعت کا بہانہ نہیں خوش ہو ساعت

مولف ذیل کے اشعار کو نور جہاں بیگم کے مصنفہ تسلیم کرتے ہیں —

دیں جگہہ زخم جفا کو دل صد چاک میں ہم
دیکھیں گر کچھہ بھی وفا اس بت بیباک میں ہم
نقش پا کی طرح اے راحت جان عاشق
تیرے قدموں سے جدا ہو کے ملے خاک میں ہم

ذیل کے اشعار کے متعلق لایق مولف کا دعوی ہے کہ اردو ہیں اور " یہی وہ زبان تھی جو اس صدی (اواخر گیارھویں صدی ہجری ' عہد عالم گیر) میں بولی اور سمجھی جاتی تھی " —

دلی سہر سہاؤنا اور کنچھن برسے نیر
سب کے کنت بتور کے لے گئے عالم گیر
بیٹھی رہو کرار سے من میں راکھو دھیر
ابکہ بچھڑے تب ملیں جب بوھریں عالم گیر

ان نمونوں سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ اکبر و جہانگیر کے عہد کی زبان سے ہم قریب ہیں اور عالم گیری عہد کی زبان سے بہت دور - کیا مولف اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ عہد اکبر و جہانگیر میں وہی زبان بولی جاتی تھی جو آج ہم بول رہے ہیں اور کیا عالم گیر کے زمانے کی زبان نے ترقی کرکے تین پشتوں کے بعد یہ شکل اختیار کرلی تھی کہ سہر (شہر) کنچھن (سونا) نیر (پانی) کنت (خاوند) جیسے ٹھیٹ انگھڑ ہندی الفاظ استعمال ہونے لگے تھے - اصل یہ ہے کہ جس زبان کو لایق مولف اکبر و جہانگیر کے دور کی زبان سمجھتے ہیں وہ عہد محمد شاہی کی زبان ہے - اس میں مطلق شبہ نہیں کہ یہ اشعار اکبر اور نور جہان سے غلطی سے منسوب ہوگئے ہیں - اور جس زبان کو وہ عالم گیری عہد کی زبان کہتے ہیں وہ خالص ہندی ہے اور آج بھی کم و بیش

اسی طرح رائج ہے —

اگر لایق مولف زبان کے فطری ارتقا کی باریکیوں سے واقف ہوتے تو ضرور ان اشعار کے زمانے کے تعین میں اس قدر فاش غلطی نہ کرتے ۔ اس کوتاہی کے باوجود فاضل مولف کی یہ الٹی زبردستی کسی طرح روا نہیں ۔ وہ عہد عالمگیر کی تہیمت ہندی کے متعلق فرماتے ہیں کہ اسے سوا اردو کے کچھہ اور سمجھنا زبان کے اتار چڑھاو اور اس کے مدارج سے لاعلمی ہے —

لایق مولف نے سنی سنای باتوں پر اکتفا کرلیا ہے اور مستند ماخذوں کے مطالعے کی زحمت گوارا نہیں فرمائی محمد شاہ بادشاہ سے یہ شعر منسوب کیا ہے ۔

پیری میں نہ کس طرح کروں سیر جہاں کی
دن ڈھلتے ہی ہوتا ہے تماشہ گذری کا

گردیزی ، شفیق اور سرور نے یہ شعر محمد صالح آگاہ سے منسوب کرکے اس طرح نقل کیا ہے —

پیری میں کرو سیر جہاں کی تو مزا ہے
دن ڈھلتے ہی ہوتا ہے تماشا گذری کا

اگر فاضل مولف چمنستان شعرا پر ایک نظر ڈالتے تو ان کو محمد شاہ کے آٹھہ شعر مل جاتے ۔ اور اس غلطی کا شکار نہ ہوتے —

لایق مولف نے غالباً عمداً یہ کوشش کی ہے کہ ماخذوں کے حوالوں سے کتاب آلودہ اور بوجھل نہ ہونے پاے ۔ اکثر مشتبہ ، تحقیق طلب اور مختلف فیہ امور کے متعلق بھی حوالے نہیں دیے اور چند چیزیں تو اس طرح پیش کی ہیں کہ گویا ان سے قبل معرض تحقیق میں آئی ہی نہ تھیں ۔ صفحات ۷۳ تا ۸۱ پر کوبل کتھا کے متعلق بڑی طویل بحث کی ہے اور اس کے نثری دیباچے کا ایک طویل اقتباس بھی درج کیا ہے اور حوالہ اس طرح دیا

ہے کہ گویا یہ ان کی ذاتی تحقیق ہے حالانکہ اقتباس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مولف نے تاریخ شعرائے اردو (ترجمہ فیلن و کریم الدین) کے حالات ۵۷ تا ۶۱ سے حرف بحرف نقل کیا ہے - اس نقل میں ایک لفظ کی بھی کمی بیشی نہیں - اگر یہ مولف کی ذاتی تلاش ہوتی تو اقتباس کے انتخاب میں کچھ تو فرق ہوتا' لیکن یہاں ایک نقطے کا بھی فرق نہیں حالانکہ قلمی نسخوں کے رسم الخط وغیرہ میں کافی فرق ہو جاتا ہے - شاید یہ بھی تو اردو کی کوئی قسم ہو —

فاضل مولف ایک کہنہ مشق ادیب ہیں - ان کی طرز تحریر کے متعلق کسی کو یہ گمان بھی نہیں ہوسکتا تھا کہ وہ زبان کی علمی تاریخ کے لیے ناموزوں و نامناسب ہوگی - کتاب کے موضوع کے لیے ایک سنجیدہ و پختہ اسلوب ادا کی ضرورت ہے - قلم پر ضبط و قابو چاہیے - جب ہم اس نظر سے کتاب کو دیکھتے ہیں تو بڑی مایوسی ہوتی ہے - اس میں ضبط و متانت اور تمکین و تحمل کے آثار بہت کم ہیں، کتاب میں جا بجا خطیبانہ جوش اور واعظانہ بلند آہنگی ہے اور اکثر جگہ ڈرامائی زبان میں اثر پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے میں ایک دو مقام نقل کرتا ہوں " شاہ عالم آپ کے شاہانہ اخلاق اور آپ کی رعایا پروری پر ہندوستان قربان ! آپ نے صرف یہاں کی زبان کو نہیں سرفراز بلکہ اپنی رعیت کو بھی ہمیشہ نوازا - ایک برہمنی آپ کی بہن اور شہزادیوں کی پھوپھی بنی - اس کے ہاتھ سے آپ نے راکھی بندن بندھوایا اور ہندو مسلم رشتے کو مضبوط کر دکھایا " —

" یہ تھا اس وقت کے امرا کا روزمرہ اور یہ تھی وہ ٹکسالی اردو جو ہمہ شما کے گھروں میں نہیں بلکہ ان امیروں کے

محلوں میں پلی اور وہاں سے نکل کر ہمارے شعرا کے منہ میں پڑی - نواب کی ایک غزل اور سن لو ' سردھنو اور داد دو " —

" اکبر بادشاہ! ہم آپ کی بے تعصبی کو کیونکر بھول سکتے اور آپ کے اس وفادار کو کس طرح فراموش کر سکتی - آپ کی پاک و صاف روح پر فاتحہ پڑھتے اور آپ کو سلام کرتے ہیں - قبول کیجئے! " -

اس طرز ادا اور اسلوب بیان کو نبھانے کی غرض سے لایق مولف کو جگہ جگہ تشبیہات و استعارات سے کام لینے اور صنایع بدایع کے استعمال کرنے میں پورا زور مارنا پڑا اور طرز ادا کے ایسے سانچے وضع کرنے پڑے جن میں جدت و ندرت نظر آے - لایق مولف کو اس میں خاطر خواہ کامیابی نصیب نہیں ہوی - صنایع بدایع کے الجھیڑے میں پھنس کر لایق مولف نے جملوں کی صحیح ساخت اور ان کی معنویت کی پروا نہیں کی اور جگہ جگہ اپنے خیال کو اس انداز میں ادا کیا کہ جدت کی جگہ بدعت نے لے لی - ان کی بھی چند مثالیں سن لیجیے —

" میرضاحک بھی اسی خزاں دیدہ باغ (دلی) کے وہ گل اور میرحسن بھی اُسی اُجاڑ چمن کے وہ پھول ہیں جو حضرت دھلی کو بھرے دل سے رخصت کرتے اور فیض آباد کے سے گلزار میں قدم رکھہ کر اردو کے پودے کو سینچتے ہیں " —

اس خوبصورت جملے کا تجزیہ کیجئے تو اس کی معنویت عجب مضحکہ خیز ہوجاتی ہے - " گل " اور " پھول " " پودے کو سینچے - " ہوے نظر آتے ہیں - یہ دیکھہ کر ہمیں بڑی حیرت ہوی کہ لایق مولف نے بعض محاورے اور الفاظ اس طرح استعمال کئے ہیں کہ ان کی صحت ہر طرح مشتبہ ہے - اساتذہ کی تصانیف میں ان کا استعمال کبھی اس طرح نہیں ہوا جس طرح

حضرت خیال نے کیا ہے —

" اس ملک کا خون اس ابدالی کے منہ میں لگ چکا تھا "؛

منہ میں خون الگنا نہیں منہ کو خون لگنا ہے —

" بادشاہ خوش اور رعیت پھولوں نہ سماتی " ص ۱۰

" بادشاہ ... باغ باغ ہوتا، پھولوں نہ سماتا " ص ۱۱

محاورہ پھولے نہ سمانا ہے یہ فعل پھولنا سے ہے لفظ پھول (بمعنی گل) سے نہیں —

" عمدۃ الملک تھوے کی دو پیالیاں بنا کر اور کشتی میں رکھ کر حضور میں لائے لیکن سوچے کہ دو میں سے کس بادشاہ کے آگے پہلے پیالی رکھوں " —

سوچنا متعدی فعل ہے اس کے ساتھ بصیغہ ماضی " نے " کا استعمال ہوتا ہے —

" یہ زبان اہل ہند ... زمین ہند کا وہ عام میوہ تھی جو بزار میں لایا اور مزے لے لے کر کھایا گیا "

لایق مولف نے اس کتاب میں اور کئی جگہ بازار کو بزار ہی لکھا ہے۔ بول چال میں شاید عوام کے علاوہ خواص بھی بولتے ہوں لیکن تحریری زبان اور ادب میں یہ بازار ہی استعمال ہوتا ہے —

" زبانوں سے الفت اور رعایا کی بھاکھا پر رغبت اس خاندان کا آئین رہا ہے " —

رغبت کے ساتھ " سے " استعمال ہوتا ہے۔ بھاکھا سے رغبت فصیح ہے —

ان نقائص اور خامیوں کے باوجود لایق مولف نے نہایت دلیری سے

بعض قدیم واجب التعظیم ادیبوں کو لعن طعن اور سب و شتم کا ہدف بنایا ہے - ان میں مرحوم آزاد دہلوی سب سے زیادہ مورد ملامت ہیں - آزاد مرحوم کی آب حیات اپنی بعض واقعاتی غلطیوں کے باوجود اردو زبان میں ایک خاص پایہ رکھتی ہے - تاریخ کی حیثیت سے نہ سہی افسانے کی حیثیت ہی سے اس کو دیکھیے - اس کی زبان اور اس کا اسلوب بیان اس قدر شستہ و رفتہ، سلیس و پاکیزہ اور دلچسپ ہے کہ ہمارے ادب میں اس کی بہت کم مثالیں ہیں - آزاد مرحوم کا یہ کیا کم احسان ہے کہ اس نے سب سے پہلے تاریخ ادب کے لکھنے کا ڈول ڈالا اور ہمیں یہ خیال سجھایا - بے شک آزاد کی غلطیوں کو دکھائیے لیکن اس پر لعن طعن کی بوچھار نہ کیجیے اور خصوصاً نا روا اور بیجا - لایق مولف نے اس مرحوم کے متعلق لکھا ہے —

"آزاد مرحوم کی روح نہ شرمائے، افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ وہ اپنی انشا پردازی کی دھن میں آنکھیں بند کر لیتے اور اپنے قلم کو آزاد کر دیتے ہیں" —

"ہمارے آزاد، اپنی قصہ گوئی میں اکثر بہت بڑھ جاتے اور ادھر اُدھر نہیں دیکھتے" "آزاد مرحوم اپنے مورخ ہونے کے مدعی نہیں اس لئے وہ تاریخی غلطیاں کر جائیں تو قابل معافی ہیں مگر تذکرے کی غلطیاں اور پھر اس طرح کی داستان سرائیاں لایق معافی نہیں"

لایق مولف آزاد مرحوم کی جن غلطیوں سے خفا ہیں ان میں سے اکثر آج صحیح ثابت ہو رہی ہیں - اس کتاب میں آب حیات کی جن غلطیوں کا ذکر کیا گیا ہے ان میں سے سوائے ایک آدہ کے سب صحیح ہیں - ان کا تفصیلی ذکر یہاں طوالت کا باعث ہے - اور کیا " مغل اور اردو " اس

قسم کی غلطیوں سے پاک ہے ۔ بھی عیوب اس کتاب میں نہایت بھونڈے طریقے سے موجود ہیں ۔ ہم نے اوپر دکھایا ہے کہ اس میں لفاظی ہے ' غیر معتبر واقعات ہیں ۔ تحقیق و تدقیق کے ہمت آزما محنت و عمل سے حضرت خیال کوسوں دور ہیں ۔ ان کی کتاب خیالی اور قیاسی باتوں کا مجموعہ ہے ' جس میں افسانے کی پوری شان ہے ۔ اپنی اصل کتاب کا نام جو انہوں نے " داستان اردو " رکھا ہے غالباً اسی بنا پر یہ اردو زبان کی علمی تاریخ نہیں " خیالی " داستان ہے —

(چ)

ہندی شاعری

از

ڈاکٹر اعظم کریوی شائع کردہ ہندوستانی ایکاڈمی
الہ آباد یو۔ پی قیمت دو روپے

جس طرح چلتی ہوئی ریل گاڑی کی کھڑکی میں سے آدمی پہاڑ ' جنگل' کھیت اور ندیوں کے بڑے بڑے نظاروں کی ایک ہلکی سی جھلک دیکھہ لیتا ہے اسی طرح اس کتاب کے مطالعے سے ہندی کے پرانے شعرا کی شاعری کی ایک ہلکی سی جھلک نظر آجاتی ہے ۔ کتاب کے دیکھنے سے جہاں یہ بات صاف نظر آتی ہے کہ مولف ایک زندہ دل اور شاعرانہ طبیعت رکھنے والے آدمی ہیں وہاں اس سے بھی زیادہ نمایاں یہ بات نظر آتی ہے کہ انہیں ہندی شاعری سے کماحقہ واقفیت نہیں ہے ۔ یہ واقفیت ایسی ہی ہے جیسے

سرسری اور سطحی کہا جاسکتا ہے - انہوں نے ہندی کے بعض اہل قلم حضرات کو ہندی شاعروں کے بارے میں ایسا مستند (حکم) مان لیا ہے کہ وہ ان کی آراء کو ان شاعروں کے بارے میں لکھہ دینا ہی کافی سمجھتے ہیں - " چند بردائی " کی زبان کا جو نمونہ انہوں نے دیا ہے وہ ایسا نہیں ہے جس سے " چند بردائی " کی زبان کا تھوڑا سا بھی صحیح اندازہ ہوسکے - ہندی شعرا میں انہوں نے گوسائیں تلسیداس کی شاعری کے بہت سے عمدہ نمونے دیے ہیں لیکن سورداس کا انہوں نے بالکل برائے نام ذکر کیا ہے - حالانکہ برج بھاشا کی سادگی اور شیرینی جیسی سورداس کی شاعری میں نظر آتی ہے ویسی کسی پرانے ہندی شاعر کے کلام میں نہیں ملتی - انہوں نے اور بھی ہندی شعرا کا جو حال لکھا ہے وہ بالکل ہی مختصر اور معمولی ہے اور اُن کے کلام کے جو نمونے دیے ہیں وہ پر لطف تو ہیں لیکن ان کی ترتیب میں کوئی خاص دل کشی نہیں ہے —

انہوں نے اپنی کتاب میں لکھا ہے " متھرا اور مغربی علاقوں کی پراکرت کا نام برج بھاشا (متھرا کی زبان) ہے - " یہ بات صحیح نہیں ہے - متھرا کے علاقے کی پراکرت کو شورسینی پراکرت کہتے ہیں اور اسی شورسینی پراکرت سے برج بھاشا پیدا ہوی ہے لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے کہ اُسی پراکرت کا نام برج بھاشا ہے - انہوں نے اسی طرح کی اور بہت سی باتیں لکھی ہیں جو قابل قبول نہیں معلوم ہوتیں —

پھر بھی جس مقصد کے لیے یہ کتاب لکھی گئی ہے وہ نہ صرف قابل تعریف ہے بلکہ قابل تقلید بھی ہے - اس کتاب کے لکھنے کا منشا یہ ہے کہ اردو داں طبقے کو ہندی شاعروں سے روشناس کرایا جائے تاکہ وہ بھی انہیں سمجھنے اور ان کی داد دینے کے قابل ہوسکے - اس میں شک نہیں کہ اس کتاب

سے اردو داں حضرات ہندی شاعری کا کچھ نہ کچھ ضرور لطف اٹھا سکیں گے —
(و - د)

کبیر صاحب

(مولفہ پنڈت منوہر لال زتشی - شائع کردہ ہندوستانی
اکیڈمی الہ آباد یو - پی قیمت دو روپے)

— —

ہم نے اس کتاب کا نہایت شوق سے مطالعہ کیا - مولف نے کبیر کو ایک خالص مذہبی آدمی خیال کرکے اُن کے کلام پر تنقید کرنے کی کوشش کی ہے - ایک طرف تو انہوں نے مذہب کی تعریف بالکل سائنٹفک طور پر لکھی ہے اور دوسری طرف کبیر کے حالات لکھتے ہوے انہوں نے اُن سب باتوں کا حوالہ دیا ہے جن سے کبیر ایک مافوق البشر ہستی معلوم ہوتے ہیں انہیں کبیر کے بارے میں ہندی کتابوں سے جو کچھ مسالا ملا ہے اُسے اُسی طرح اپنی اس کتاب میں نقل کردیا ہے - اس کی اچھی طرح چھان بین نہیں کی ہے - کیا اچھا ہوتا اگر وہ کبیر کی زندگی کے حالات بھی اسی طرح تحقیق کرکے لکھتے جس طرح انہوں نے مذہب کے متعلق سائنٹفک طریقے پر تحقیق کرکے لکھا ہے —

"ہندو مذہب کا ارتقا" انہوں نے بہت کچھ خیالی بنیاد پر لکھا ہے نہ کہ تاریخی واقعات کی بنیاد پر - آج ہندوستان بھر میں کبیر کی شہرت اس لیے نہیں ہے کہ اُن کی وجہ سے "کبیر پنتھ" چل پڑا - مذہبی نقطۂ نظر سے ہندوستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں کی معاشرتی زندگی پر کبیر کا کوئی

خاص اثر نظر نہیں آتا - لیکن انہوں نے اپنی باتوں کو جس غور و خوض ' باریک بینی اور روز مرہ کی چلتی ہوئی عام فہم اور سیدھی زبان میں لکھا ہے اس وجہ سے وہ ہندی ادبیات اور ہندوستان کے ایک انمول رتن بن گئے ہیں - ڈاکٹر رویندر ناتھہ ٹگور کی کتاب One Hundred Poems of Kabir کے مقدمے میں Evelyn Underhill نے ٹھیک لکھا ہے :-

" But his wonderful songs survive, the spontaneous expressions of his vision and his love and it is by these, not by the didactic teachings associated with his name, that he makes his immortal appeal to the heart."

" لیکن اس کی حیرت انگیز نظمیں زندہ ہیں - وہ اس کی محبت اور تخیلات کی قدرتی شاہکار ہیں- ہمارے دلوں پر انہیں کا گہرا اور لافانی اثر پڑتا ہے نہ کہ اُن پند آمیز تعلیمات سے جو کبیر سے نامزد ہیں "-

کبیر کی زبان میں کسی قسم کا تصنع نہیں ہے- اس سے یہ سمجھہ لینا بڑی غلطی ہوگی کہ کبیر زبان سے ناواقف تھا - کبیر کی زبان دل کی زبان ہے ' جذبات کی زبان ہے اور اسی لیے وہ راست دل پر اثر کرتی ہے - آج کبیر کے کلام کا کتنا ہی حصہ کہاوتوں کی شکل میں آ چکا ہے جو خواص و عوام کے نوک زبان ہے - اس جلاہے نے اپنے دل کو اپنے جذبات کے تانے بانے میں بُن کر ہندی زبان کا جو قماش تیار کیا ہے اس کی قدر ایک تاج محل ' اجنتہ اور ایلورا کی بے مثل صناعی سے کسی طرح کم نہیں ہے - اس کتاب میں کبیر کے شاعر ہونے کے متعلق بہت ہی کم لکھا گیا ہے اور اس نقطۂ نظر سے اس کے دلی جذبات کی تشریح کرنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے - اگر اس

کتاب کے مولف کبیر کے اس پہلو پر تفصیل سے غور کرتے تو کتاب کی قدر و منزلت بڑھ جاتی لیکن چونکہ اب تک اردو زبان میں کبیر پر کوئی اچھی کتاب موجود نہیں ہے اس لیے امید ہے کہ یہ کتاب اس کمی کو ایک حد تک پورا کرے گی —

(ر - د)

متفرقات

کلید قرأت

(یعنی تجوید کی پہلی کتاب - مولفۂ خلیل احمد صاحب فاضل دینیات جمالیہ عربک کالج ، پرمبور بارکس - مدراس)

اس مختصر رسالے میں صحیح قرأت کے اصول سبقوں میں تقسیم کرکے لکھے گئے ہیں - ہر سبق کے آخر میں سوالات بھی دیدیے ہیں - تجوید کی یہ کتاب بہت آسان اور سلیس زبان میں لکھی گئی ہے - اس فن کے مبتدیوں کے لیے بہت کار آمد ہے —

سالنامے

کارواں

مرتبہ جناب مجید ملک صاحب ۔ چابک سواراں ' لاہور

(قیمت دو روپے آٹھ آنے)

کارواں عید کے چاند کی طرح سال میں ایک بار نمودار ہوتا ہے اور اس کے دیکھنے سے وہی خوشی ہوتی ہے جو ایک روزہ دار مسلمان کو عید کا چاند دیکھنے سے ہوتی ہے - یہ بہت سی خوبیوں کا مجموعہ ہے اور لکھائی چھپائی کی نفاست مضامین کے تنوع اور خاص کر تصاویر و نقاشی کے انتخاب کے لحاظ سے اردو میں تو کیا شاید ہندوستان کی کسی دوسری زبان میں بھی اپنا نظیر نہیں رکھتا - اس رسالے نے اردو میں صناعی اور ادب کو ملانے کی کوشش کی ہے اور بڑی بات یہ ہے کہ اس وصل میں خوش مذاقی کو مدنظر رکھا ہے - میں اب اس کے ظاہر و باطن پر ایک سرسری سی نظر ڈالتا ہوں —

سب سے پہلی چیز اس کا سرورق ہے ' اس میں ابھیائی صناعی کو اس کے رنگ میں ظاہر کیا ہے اور بلاشبہ دل کش ہے - اس کے بعد فاضل مرتب کے "سخنہائے گفتنی" اور ناگفتنی" دونوں پڑھے - انہیں لکھنے کا بہت اچھا سلیقہ ہے لیکن ان میں " گفتنی" کے ساتھ ناگفتنی باتیں بھی آگئی ہیں - یہ ' اور بعض اور مضمون بھی اس رسالے میں ایسے درج ہوگئے

جن میں "اخباری" جھلک نظر آتی ہے - خدا کے فضل سے لاہور میں بہت سے اخبار ہیں اور ان میں گنجائش بھی کافی ہے - ان کے راقم اگر ان اخباروں میں خامہ فرسائی کرتے تو زیادہ اچھا ہوتا - ایسی چیزیں کاروان کی شان کے خلاف ہیں اور جو مقصد اس نے پیش نظر رکھا ہے اس سے گری ہوئی ہیں - قابل اڈیٹر کو اپنی قوت فیصلہ سے کام لینا چاہیے اور قلم پر نہیں جانا چاہئے - میں اگر کارواں کا اڈیٹر ہوتا تو ان میں کے کئی مضمون روز اخباروں یا ماہانہ رسالوں میں تقسیم کردیتا - لکھنے والے اور اڈیٹر دونوں خوش ہوجاتے - اُن کی خاصی شہرت ہوجاتی اور یہ مضامین فراہم کرنے کی سردردی سے بچ جاتے - لیکن اس کے ساتھ ہی ہمیں اڈیٹر کی مجبوریوں کا بھی خیال رکھنا چاہئے - اُن کی یہ شکایت بالکل بجا ہے کہ "ہندوستان میں مضمون نگار کا حلقہ اس قدر محدود ہے کہ سال میں دو مرتبہ بھی اعلیٰ پائے کا رسالہ نکالنا قریب قریب ناممکن کے ہے" - اور ان کا یہ کہنا بھی بالکل درست ہے کہ مسلم قابلیت کے حضرات سے "ہم بار بار اصرار بھی نہیں کرنا چاہتے' کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ ہمارے اصرار سے مجبور ہوکر اگر وہ لکھ بھی دیں گے تو غالباً وہ کاروان کے معیار پر پورا نہ اُترے گا"- اس سچے قول کی تصدیق خود رسالے سے بھی ہوتی ہے کہ بعض مضمون ایسی ہی حالت میں لکھے گئے ہیں اور وہ کاروان کے معیار کے مطابق نہیں - یہ مجبوری ہے اور اس سے بچنا مشکل ہے —

خیر' سخن ہائے گفتنی اور ناگفتنی " کے بعد رسالۂ سال گزشتہ کی طرح سر اقبال کے اردو شعر سے شروع ہوتا ہے جو انہوں نے خاص اسی رسالے کے لئے عطا فرمایا ہے - گزشتہ سال آپ نے غزل عنایت فرمائی تھی اور اس سال یہ شعر یہ کہہ کر عنایت فرمایا " تم غزل لے کر کیا کرو گے '

میں تمھیں ایک ہی شعر دیتا ہوں لیکن ایسا شعر جسے بیسیوں اشعار سے بہتر جانتا ہوں" —

نمود تری نمود اُس کی، نمود اُس کی نمود تری
خدا کو تو بے حجاب کردے! خدا تجھے بے حجاب کردے

کاروان بہت خوش نصیب اور قابل رشک ہے۔ سر اقبال کے قلم سے جو کچھ نکلے (خاص کر اردو میں) وہ سرآنکھوں پر رکھنے کے لائق ہے۔ شعر اچھا ہے خاصا ہے لیکن اس میں نہ تخیل ہے نہ جدت اور نہ شاعرانہ صناعی۔ مگر اقبال کا ہے، اور یہ کافی ہے —

رسالے کے پڑھنے کے بعد اس بات کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ باوجود اُن موانعات اور مشکلات کے جو اس پایے کے رسالے کے لیے مضامین فراہم کرنے میں پیش آتی ہیں، کارواں کے کار فرماؤں اور کار پردازوں نے ادب و تاریخ کے محققانہ مضامین، فسانے، نظمیں، ڈرامے، مزاحیہ مضمون، صناعی اور جدید فوٹوگرافی کے عمدہ اور نفیس نمونے جس طرح اس میں جمع کردیے ہیں وہ بہت قابل تعریف ہے۔ ان کی ہمت، محنت اور سلیقے کی داد نہ دینا ظلم ہوگا۔ خاص کر اسلامی کوزہ گری، اردو ڈرامے کی مشکلیں، پنجاب میں اردو کا ایک فراموش شدہ ورق، مسلمانوں میں مصوری کا ارتقا پڑھنے اور غور کرنے کے قابل ہیں۔ ترجمے کے لیے بعض فسانے بھی اچھے انتخاب کیے ہیں۔ آرٹ کے نمونے بھی اس سال بے مثل ہیں، انھیں دیکھ کر واقعی روح تازہ ہوتی ہے اور بڑی خوبی یہ ہے کہ علاوہ مغل اور راجپوت مصوری کے روس، جاپان، ہالینڈ، جرمنی کے مصوروں کے بھی شہاکار موجود ہیں۔ مجھے چغتائی کا قلندر بہت پسند ہے اس کی آنکھیں اور اس کا رنگ ڈھنگ بہت ہی خوب اور نمایاں ہے۔ جدید فوٹو گرافی کے نمونے ایسے اچھے پہلے کسی رسالے

میں نہیں آے —

آخر میں اردو مطبوعات پر تبصرے ھیں اگر چہ ان تبصروں میں کوئی خاص بات نہیں تاھم انھوں نے اس ضروری چیز کو فراموش نہیں کیا۔ اگر یہ چیز نہ ھوتی تو ایک کمی رھتی —

غرض یہ رسالہ ادب و صحافی کا ایسا اچھا مرقع ھے کہ اگر میں اسے اردو سالناموں کا سرتاج کہوں تو بالکل بجا ھے —

سالنامۂ نیرنگ خیال (لاھور) قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

نیرنگ خیال نے سالنامے کی ایسی چاٹ لگادی ھے کہ اب اردو کے اکثر رسالے سالنامے شایع کرنے لگے ھیں اور جستجو اور محنت کر کے اچھے اچھے مضمون، فسانے اور نظمیں جمع کر کے شایع کرتے ھیں - طباعت کی نفاست کا بھی خیال رکھتے ھیں اور تصویریں شایع کرنے کی بھی کوشش کرتے ھیں - نیرنگ خیال مسلسل کئی سال سے، علاوہ بعض خاص نمبروں کے، سالنامہ شایع کر رھا ھے - سنہ ۳۴ کا سالنامہ بھی گزشتہ نمبروں کی طرح خاصا ضخیم ھے اور ھر طرح کے سنجیدہ اور مزاحیہ مضمون، فسانے اور نظمیں اور تصویریں موجود ھیں - تعجب یہ ھے کہ قابل مرتب لوگوں سے اس قدر مضامین کیونکر حاصل کرلیتے ھیں - یہ سالنامہ بھی تین سو صفحے کے لگ بھگ جا پہنچا ھے جس میں سبھی کچھ ھے - تاریخ بھی ھے، ادب بھی ھے،

غزلیں بھی ہیں نظمیں بھی ہیں، فسانے اور فسانہ نما مضمون، اور نثر تو اس کی خصوصیت ہے - اور لکھنے والے بھی معمولی نہیں - بہرحال بہت اچھا مجموعہ ہے اور نیرنگ خیال کی بڑی تعریف ہے کہ اس نے اردو داں طبقے اور اپنی برادری میں ایک خاص شوق پیدا کردیا ہے اور دوسری بات یہ ہے جو اس نے خود ہی لکھدی ہے کہ وہ "فرقہ پرستی (اور اتنا میں اپنی طرف سے اضافہ کرتا ہوں کہ صوبہ پرستی) کی لعنت سے پاک ہے" نیرنگ خیال مقبول بھی ہے اور اس کے مقبول ہونے کی وجوہ بھی ہیں —

سالنامۂ ساقی - (دہلی) قیمت ایک روپیہ

ساقی بھی ہر سال اپنا سالنامہ شایع کرتا ہے اور سنہ ۳۴ کا سالنامہ گزشتہ سالناموں سے بہتر ہے - اگرچہ ضخامت میں وہ اردو کے ماہانہ رسالوں کے بعض سالناموں سے مقابلہ نہیں کر سکتا لیکن مضامین کے لحاظ سے وہ کسی سے ہیٹا نہیں - یہ ضرور ہے کہ ایسے مضامین جن کے لیے غور و فکر کی ضرورت ہو کم ہیں مگر لطف اور دلچسپی کی چیزیں بہت سی جمع ہیں - دو چار تصویریں بھی ہیں جو اعلیٰ درجے کی تو نہیں مگر پھر بھی بہت اچھی ہیں - ان میں دو ہندی مسلمان مصوروں کی ہیں اور خوب ہیں، اور تین فوٹو جاپانی آرٹ ہیں —

سالنامۂ ادبی دنیا- لاہور - قیمت آٹھ آنے

یہ سالنامہ بھی مضامین کا اچھا مجموعہ ہے خاص کر جناب کیفی (پنڈت برجموہن دتاتریہ) کا مضمون تذکیر و تانیث ' محمد حسین صاحب ادیب کا " برہمنی مذہب پر دراوڑی اثر" اور سید حسین برنی صاحب کا " سلاطین دہلی کے عہد میں ہندوؤں کی حالت " اور حفیظ ' اختر' امجد' کیفی' آزاد ' عابد ' فاخر کی نظمیں پڑھنے کے قابل ہیں --

ادبی دنیا نے اس سالنامے میں سنجیدہ ادبی مضامین کے جمع کرنے میں جو کوشش کی ہے وہ تعریف کی مستحق ہے - شروع میں " آئینۂ عالم " کے تحت میں تازہ علمی معلومات بہم پہنچائی ہیں - سالنامہ بحیثیت مجموعی دلچسپ ہے —

اُردُو کے جدید رسالے

شاہجہاں

(اڈیٹر سید ولایت حسین دہلوی و اسعدالاشرقی دہلوی
کٹرہ پریاں دہلی - سالانہ چندہ تین روپے

یہ نہم ماہی رسالہ دہلی سے حال میں شایع ہوا ہے - علمی اور ادبی مضامین ہوتے ہیں - جناب پنڈت برجموہن دتاتریہ صاحب کیفی کا مضمون' آزاد مرحوم پر بہت خوب ہے - فسانے اور نظمیں بھی ہیں - رسالہ دلچسپ اور مطالعے کے قابل ہے —

دبستان

(اڈیٹر غلام سرور فگار و رحیم اللہ خاں شاد سیالکوٹ ‘
پنجاب - سالانہ چندہ تین روپے)

یہ ماہانہ سیالکوٹ سے شایع ہوتا ہے - زیادہ تر ادبی مضامین ‘ فسانے اور نظمیں ہوتی ہیں - ایک حصہ بچوں کے لیے ہے - بادۂ کہن کے عنوان کے تحت میں بعض ادبی بحثیں ہوتی ہیں - گلہائے تازہ کے عنوان سے بعض رسالوں یا کتابوں سے چھوٹے چھوٹے انتخاب درج کیے جاتے ہیں —

فطرت

(مدیر اعزازی ادیب الملک حضرت یوسف بلخی ایم - اے ‘
دوسرے مدیر صبا رشیدی بی - اے اور منظور عالم عاصی -
راج گیر (پٹنہ) قیمت سالانہ تین روپے آٹھ آنے)

اس ماہانہ رسالے میں تاریخی اور نظم و نثر کے مضامین درج ہوتے ہیں - تنقیدی تحریریں بھی پائی جاتی ہیں - رسالہ مصور ہے - خیالی مضمون اور فسانے بھی ہوتے ہیں —

علی گڑھ میگزین

اس میگزین نے آل احمد سرور صاحب کی اڈیٹری میں بہت اچھی ترقی کی ہے۔ اکتوبر کا رسالہ گوناگوں مضامین سے پر ہے۔ اس میں علمی ادبی، تنقیدی مضامین کے علاوہ اچھی اچھی نظمیں اور بعض فسانے بھی ہیں۔ مدیر صاحب قابل مبارک باد ہیں کہ انہوں نے قابل قابل حضرات سے مضامین حاصل کیے ہیں۔ حجم بھی پہلے سے زیادہ ہے اور ۲۴۹ صفحے کا ہے۔ کتابوں پر تبصرے بھی غور سے لکھے گئے ہیں۔ بعض مضامین تحقیق اور خوبی کے لحاظ سے خاص طور پر مطالعے کے قابل ہیں۔ مثلاً مولانا سید سلیمان ندوی کا مضمون "ہندوستان میں ہندوستانی"۔ علاوہ مضامین کی بوقلمونی اور خوبی کے چھپائی لکھائی بھی قابل تعریف ہے۔

گشتی چٹھی

حضرت غالب دہلوی کے قدر شناسوں کی خدمت میں -

جناب من '

تسلیم - یہ امر بلا شبہہ موجب مسرت ہے کہ غالب کے اردو خطوں اور رقعوں کی اشاعت بہت کافی و وافی ہوی اور ہو رہی ہے ' چنانچہ " اردوے معلیٰ " اور " عود ہندی " کے مختلف ایڈیشن دہلی ' لاہور ' آگرے ' لکھنو ' الہ آباد وغیرہ سے شائع ہوے - مگر ساتھہ ہی اِس کے کمال افسوس کی بات یہ ہے کہ اِن دونوں کتابوں میں سے ایک کا بھی کوئی ایڈیشن ایسا نہیں کہ اسقام و اغلاط سے پر نہ ہو --

کتابت کی غلطیوں اور چھاپے کی خرابیوں سے قطع نظر ' کبھی کوئی کوشش اِس بات کی بھی نہیں کی گئی کہ یہ جواہر پارے تاریخی ترتیب کے لحاظ سے مرتب کیے جائیں اور اِن کے متعلق ایسا تاریخی مواد اکٹھا کیا جاے جس سے اس ہمارے مایۂ ناز شاعر اور نثار کی صحیح تصویر نظر کے سامنے آئے - اگر اب بھی اِس طرف توجہ نہ کی گئی تو دس بیس برس بعد ضروری تاریخی مواد کا فراہم ہونا محال ہو جاے گا - اِس خیال نے مجھے اس کام پر آمادہ کیا اور میں نے باوجود اپنی بے بضاعتی کے عملی کوشش شروع کردی -

خدا کا شکر ہے کہ دو تین برس کے کام کا نتیجہ بہت ہمت افزا رہا : —

(۱) غالب کی کچھہ تحریریں ایسی جمع ہوگئیں جو اب تک نہیں چھپی ہیں ۔ ان میں بعض اصل رقعے غالب ہی کے هاتھہ کے لکھے ہوے ہیں ـ

(۲) جو رقعے وغیرہ ملک کے مختلف رسالوں میں وقتاً فوقتاً شائع ہوے وہ بھی اکٹھا ہوگئے ہیں —

(۳) " اردوے معلی " اور " عودِ ہندی " کے مختلف مطبوعہ نسخوں کا مقابلہ اور تنقیح کر کے متن کی تصحیح کرلی گئی ہے ، گو کہ ابھی تک اصل رقعے دستیاب نہیں ہوے —

(۴) جو رقعے " اردوے معلی " اور " عودِ ہندی " یا مختلف رسالوں میں آگئے ہیں اُن کے علاوہ بھی ملک میں غالب کی بہت سی تحریریں مختلف خاندانوں میں یقیناً محفوظ ہیں ، جن میں سے صرف بعض کا پتا چلا ہے ۔ انھیں کے حاصل کرنے میں آپ حضرات سے میں مدد چاہتا ہوں ؛ تاکہ جہاں تک ایسی تحریریں مل سکیں غالب کے اردو رقعات کی مجوزہ اشاعت میں شامل کرلی جائیں ۔ اب غالب کے قدر شناسوں اور اپنے ہمدردوں سے میری درخواست ہے کہ وہ : —

(الف) غالب کا کوئی خط ، رقعہ یا اور کسی قسم کی کوئی تحریر (اور اگر اصل کا هاتھہ آنا ممکن نہ ہو تو اُس کی صحیح نقل) بہم پہنچائیں ، یا کم سے کم اُس کا ٹھیک پتا بتلائیں —

(ب) جو تحریریں " اردوے معلی " یا " عودِ ہندی " وغیرہ میں شائع ہوچکی ہیں اُن کے اصل جہاں کہیں محفوظ ہوں اُس سے اطلاع بخشیں —

(ج) غالب کے موسومۂ ذیل مکتوب الیہم میں سے جس کسی کے جو کچھہ حالات معلوم ہوسکیں اُنھیں (مع اپنے ماخذ کے حوالے کے) مجھہ تک

پہنچانے کی تکلیف گوارا فرمائیں ۔
غالب کے اصل رقعے اگر زیادہ تعداد میں مل گئے تو اُن کے عکس ایک الگ کتاب کی صورت میں شائع کیے جائیں گے ؛ اگر کم تعداد میں ہاتھ آئے تو اُن کے عکس اِسی مجموعے میں شامل کردیے جائیں گے ۔ جن حضرات سے مجھے کسی قسم کی مدد ملے گی اُن کا شکریہ کتاب کے دیباچے میں عرض کیا جائے گا —

خاکسار

مہیش پرشاد (مولوی فاضل) ، اُستاد عربی و فارسی و اردو ہندو یونیورسٹی

بنارس ۱۶ - ستمبر سنہ ۱۹۳۲ ء

غالب کے مکتوب اِلیہ

جن کے حالات دریافت طلب ہیں

(۱) - منشی غلام بسم اللہ
(۲) - مولوی احمد حسن خاں ، مینا ، مرزا پوری
(۳) - حکیم سید احمد حسن مود ودی
(۴) - میر احمد حسن ، موکش
(۵) - منشی ہرگوبند - سہائے
(۶) - سید بدرالدین ، فقیر
(۷) - لالہ کیول رام ، ہشیار
(۸) - مولوی کرامت علی
(۹) - میر بندہ علی ، عرف میرزا میر
(۱۰) - میر افضل علی ، عرف میرن صاحب
(۱۱) - مرزا یوسف علی خاں ، عزیز
(۱۲) - مولوی عزیزالدین
(۱۳) - نواب میر ابراہیم علی خاں ، وفا
(۱۴) - منشی حبیب اللہ ، ذکا (حیدرآبادی)
(۱۵) - منشی ہیرا سنگھ

تازہ ترین مطبوعات انجمن ترقی اردو

۱ - مخزن شعرا - گجرات کے اردو شعرا کا تذکرہ، مصنفۂ فائق مرحوم
مع مقدمہ مولانا مولوی عبدالحق صاحب مجلد ایک روپیہ چار آنے -

۲ - تذکرۂ گردیزی - تذکرۂ شعراے اردو مصنفۂ فتح علی حسینی گردیزی
قیمت مجلد ایک روپیہ چار آنے —

۳ - اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیاے کرام کا کام - مصنفۂ
مولانا مولوی عبدالحق صاحب - غیر مجلد آٹھہ آنے —

۴ - مرهٹی زبان پر فارسی کا اثر - مصنفۂ مولانا مولوی عبدالحق
صاحب - غیر مجلد آٹھہ آنے —

۵ - مرحوم دهلی کالج - مصنفۂ مولانا مولوی عبدالحق صاحب - غیر مجلد
ایک روپیہ آٹھہ آنے —

۶ - داستان رانی کیتکی - مصنفۂ انشاالله خاں انشا مرحوم - غیر مجلد
چار آنے —

۷ - ترکوں کی اسلامی خدمات اور ان کی زبان و ادبیات - غیر مجلد ایک روپیہ آٹھہ آنے -

۸ - جنگ نامۂ عالم علی خان اور نظام الملک - (نظم) - غیر مجلد چھہ آنے -

حسب ذیل کتابوں کے دوسرے ایڈیشن تیار ہو گئے ہیں —

۱ - فلسفۂ تعلیم مجلد دو روپے - غیر مجلد ایک روپیہ بارہ آنے

۲ - رهنمایان هند مجلد دو روپے - غیر مجلد ایک روپیہ بارہ آنے

۳ - امراے هنود مجلد تین روپے آٹھہ آنے - غیر مجلد تین روپے

(کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں هیں)

هندستانی اکیڈیمی کا سہ ماہی رسالہ

هندستانی

جنوری ' اپریل ' جولائی ' اکتوبر میں شائع هوتا هے —

زیر نگرانی

۱ — پروفیسر ڈاکٹر تارا چند ' ایم - اے - ' ڈی - فل —

۲ — " عبدالستار صدیقی ' ایم - اے - ' پی ایچ - ڈی —

۳ — " سید مسعود حسن صاحب رضوی ' ایم - اے —

۴ — منشی دیا نرائن نگم صاحب - بی - اے —

مدیر

مولوی اصغر حسین صاحب " اصغر "

مشہور علماء اور مصنفین کے مضامین همیشه شائع هوتے هیں - چندہ

سالانه پانچ روپے - ایک نمبر کی قیمت ۱ روپیه ۴ آنے

علاوہ محصول ڈاک

رسالے کے پرانے پرچے بھی مل سکتے هیں —

مطبوعات اکیڈمی اور دیگر کتب کے لیے فہرست طلب کیجیے

کتابستان

ماهر کتابیات

هندستانی اکیڈیمی کی تمام اُردو مطبوعات کے واحد ایجنٹ

۱۷ - سٹی روڈ ' الہ آباد

اردو

جلد ۱۴	اپریل سنہ ۱۹۳۴ ع	حصہ ۵۴

انجمن ترقی اردو کا سہ ماہی رسالہ

اورنگ آباد (دکن)

اردو

اپریل سنہ ۱۹۳۴ ع

فہرستِ مضامین

خطبات گارساں دتاسی

اتیارھواں خطبہ

مترجمہ

(جناب ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب، ڈی۔ لٹ

[پیرس] پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد دکن)

حضرات!

میں ہر سال اپنے خطبۂ افتتاحیہ میں آپ صاحبوں کے سامنے اُس ذھنی تحریک کا ذکر کیا کرتا ھوں جو ھندوستان میں اپنا اثر دکھا رھی ھے۔ خاص کر میں نے اپنے موضوع کو ھندوستانی زبان تک محدود کرلیا ھے جس میں ھندوؤں اور مسلمانوں دونوں کي تہذیب کے عناصر شامل ھیں۔ میں اپنے اُستاد جان شیکسپیر کی طرح لفظ 'ھندوستانی' کو ھندی اور اُردو دونوں کی مجموعی حیثیت کے لئے استعمال کرتا ھوں۔ میرے ان خطبات میں غالباً ھر اس شخص کو دلچسپي ھوگی جو ذھن انسانی کی ترقی کا مطالعہ کرنا چاھتا ھے۔ مجھے یہ کہتے ھوے خوشی ھو رھي ھے کہ اھل ھند نے پچھلے سال میں ترقی کی راہ میں ایک قدم اور

آگے کی جانب بڑھایا ہے اور مجھے توقع ہے کہ دوسروں کو بھی یہ سن کر خوشی ہوگی —

برھم سبھا * کی اھمیت برابر ھر سال بڑھتی جا رھی ھے اور اس کا حلقۂ عمل وسیع ھوتا جا رھا ھے - ھندو لوگوں کی یہ ایک اصلاحی انجمن ھے جس کا مقصد یہ ھے کہ قدیم ھندی معتقدات کو پھر سے زندہ کیا جاے - صرف کلکتہ میں اس وقت تقریباً دو ھزار خاندان اس سبھا میں شامل ھو چکے ھیں- اس کے علاوہ ھزارھا ھندو ایسے ھیں جنھوں نے اس سبھا کے پیغام کو کان دھر کے سنا ھے اور بت پرستی سے احتراز کرنے لگے ھیں- ان میں سے اکثر نے اصولی طور پر ذات پات کے امتیاز کو بھی ترک کرنے کا عھد کرلیا ھے لیکن عملی طور پر ابھی انھوں نے قدم آگے نھیں بڑھایا + —

اس انجمن کو اگر فروغ حاصل ھوا تو ھندوستان کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ھوگا - اس تحریک کی بدولت یہ ممکن ھوگا کہ مغربی تھذیب اور قدیم ھندی روایات میں ایک قسم کا امتزاج پیدا ھو - اس سے ھندو معاشرت کی اصلاح ھوگی - اس میں کوئی مضائقہ نھیں کہ یہ کام مسیحیت کی بجاے اس کی روشنی کے عکس سے پایۂ تکمیل کو پھنچے - ممکن ھے برھم سبھا کے برھمن ارکان کو اس میں شبہ ھو کہ انھوں نے مسیحیت کی تعلیم سے فیض حاصل کیا ھے لیکن بھر حال حقیقت

---

* اس انجمن کو برھمو سماج بھی کھتے ھیں - اس کے متعلق ڈیلی ٹیلیگراف مورخہ ۲ مئی سنہ ۱۸۶۸ ء میں ایک نھایت دلچسپ مضمون شایع ھوا ھے -

+ انڈین میل مورخہ ۱۳ اپریل سنہ ۱۸۶۸ ء —

حقیقت ھی رھتی ھے *—

اس انجمن کا جشن سالگرہ ۲۴ جنوری کو منایا گیا۔ راجه رام موھن راے نے اس انجمن کو ۳۸ سال کا عرصه ھوا قائم کیا تھا۔ اس تقریب کے سلسلے میں بابو کیشاب چندر کے مکان سے جلوس روانه ھوا جو در اصل فی الوقت ھندو موحدین کا مرکز سمجھا جاتا ھے۔ بابو صاحب کی عمر ۲۵ سال ھے اور وہ اس تحریک کے سر گروہ ھیں۔ جلوس مرزا پور کی طرف روانه ھوا جہاں ایک نئے مندر کی اس موقع پر بنا ڈالی جا رھی تھی۔ خاص اس موقع کے لئے دعائیں لکھی گئی تھیں جنھیں لوگ گاتے جاتے تھے۔ ھر ایک کے ھاتھه میں ایک چھوٹی سی جھنڈی تھی جس پر سنسکرت زبان میں عبارتیں لکھی ھوئی تھیں۔ یه عبارتیں اس تحریک کے معتقدات سے تعلق رکھتی تھیں۔ مرزا پور پہنچنے کے بعد مندر کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ اس رسم کی ادائگی کے وقت بھجن گاے گئے۔ شام کے وقت ایک جلسه منعقد ھوا جس میں بابو صاحب نے تقریر کی۔ اس تقریر میں جن خیالات کا

---

* کولونیل چرچ کرانیکل میں (اپریل سنه ۱۸۶۸ع) کلکته کے ایک برھمن کا خط شائع ھوا ھے جس نے مسیحی مذھب قبول کر لیا ھے۔ وہ برھمو سماج کے ارکان کو دعوت دیتا ھے که جہاں انھوں نے ایک قدم آگے بڑھا یا ھے وھاں ایک اور سہی۔ وہ انھیں یه بھی بتلاتا ھے که ان کی تحریک مسیحی ماحول کی رھین ملت ھے اور یه کہنا افسانے سے زیادہ وقیع نہیں که برھمو سماج اصلی ھندو تعلیم پر مبنی ھے۔ بنارس کے ایک اور دوسرے برھمن نے جس کا نام نہیمیا گورہ ھے اور جس نے مسیحی مذھب قبول کر لیا ھے، ابھی حال میں کیتھولک مذھب کی حمایت میں ایک رساله شائع کیا ھے اور اس میں بھی برھمو سماج کے متبعین سے خطاب کیا گیا ھے۔ اس رسالے میں عذاب کے ابدی ھونے پر بھی بحث کی ھے اور برھمو سماج کے دعووں کا جواب دیا ھے۔ کولونیل چرچ کرانیکل - ستمبر سنه ۱۸۶۸ ع —

اظہار کیا گیا وہ مسیحی تعلیم سے بہت ملتے جلتے تھے تقریر کے ختم ہونے پر ایک بھجن پڑھا گیا اور جلسہ برخاست ہوا —

بابو کیشاب چندر نے کچھہ دنوں بعد بمبئی میں ایک جلسے میں جس میں منتخب لوگ شریک تھے اپنی انجمن کے متعلق تقریر کی اور نہایت خطیبانہ انداز میں ان اُصول پر روشنی ڈالی جن پر انجمن کی بنا ڈالی گئی ہے*۔ اپنی تقریر کے دوران میں بابو صاحب نے خدا کی ذات کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوے بتلایا کہ اس کا علم انسان کی عقل سے باہر ہے۔ بابو صاحب نے خدا کا جو تصور پیش کیا وہ اس سے مختلف نہیں تھا جو سینٹ پال نے ایتھنز کے لوگوں کے روبرو پیش کیا تھا۔ جس مقام پر آپ کی یہ تقریر ہوئی اُس کے اِرد گرد ہندوؤں کے بتخانے ہیں جہاں وشنو، شیو، گنیش، ہنومان، لکشمی اور پاربتی کی پوجا کی جاتی ہے۔ اس گرد و پیش میں آپ نے بت پرستی کے خلاف تبلیغ کی اور بتلایا کہ گونگے بتوں کے آگے سرجھکانے سے بھلا کیا فائدہ؟۔ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ توحید دراصل انسانی اخلاق کا سر چشمہ ہے۔ حضرت مسیح نے بھی توحید ہی کی تعلیم دی تھی۔ پھر آپ نے اس امر پر خاص کر زور دیا کہ معاشری مسائل کا بھی عقیدۂ توحید سے گہرا تعلق ہے۔ توحید میں اعتقاد کی بدولت بنی نوع کی وحدت کا تصور انسان کے دل میں پیدا ہوتا ہے۔ جب آدمی خدا کی

* بابو صاحب نے بمبئی میں جس انجمن کے زیر اہتمام تقریر کی اس کا نام "پرارتھنا سماج" ہے۔ پچھلے سال میں نے انجمن "وید سماج" کی نسبت ذکر کیا تھا۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں انجمنوں کے مقاصد مشترک ہیں —

وحدانیت پر ایمان رکھتا ہے تو وہ ذات پات کی تقسیم پر یقین نہیں رکھ سکتا۔ اس اعتقاد کی وجہ سے عدل و مساوات وجود میں آتی ہے۔ چنانچہ توحید کا ماننے والا قبل از بلوغت شادیوں، عورتوں کو گھروں میں بند رکھنے، بچوں کو قربان کرنے اور مذہبی جکڑ بندیوں کو کبھی تسلیم نہیں کر سکتا جو ہندوستان کی تباہی کا باعث ہورہے ہیں۔ بابو صاحب کے الفاظ ہیں کہ "اگر خدا کی وحدانیت پر میرا اعتقاد پکا ہے تو جبلی طور پر میں نہ صرف ہندوؤں کو بلکہ مسلمانوں، پارسیوں اور اہل یورپ کو اپنا بھائی سمجھوں گا" —

اسی جگہ دوسرے جلسے میں بابو صاحب نے عبادت کی حقیقت کے متعلق اظہار خیال کیا اور بتلایا کہ سچی عبادت وہ ہے جو دل سے کی جاے۔ الفاظ کو حفظ کر لینے یا انہیں بار بار دھرانے سے کوئی فائدہ نہیں اس واسطے کہ بسا اوقات لوگ ان الفاظ کے معنی تک سے بے خبر ہوتے ہیں۔ اپنی وسیع مشربی کا ثبوت دینے کے لئے آپ نے شاستروں میں سے سنسکرت زبان میں چند دعائیں پڑھیں پھر اس کے بعد انجیل، زند اوستا اور قرآن سے چند دعائیں پڑھیں۔ آخر میں آپ نے کہا "اب ہم سبھوں کو دعا کرنی چاہئے کہ ہندو پارسی اور مسلمان کی تفریق اٹھ جاے اور جس قدر اور دوسرے فرقے ہیں جن کے باعث ہم میں نفاق پیدا ہوگیا ہے، دنیا سے مٹ جائیں! —

موصوف نے بنارس میں اسی موضوع پر ایک تقریر کی جس میں بنگالی عورتوں نے بھی شرکت کی جو حجاب ڈالے ہوے تھیں * -

---

* اے ایس شیرنگ کی کتاب "مقدس شہر بنارس" صفحہ ۲۲۴ —

پچھلے مارچ کے مہینے میں موصوف نے ڈھاکے میں ڈھائی سو ھندوؤں کے جلسے کی صدارت کی- جلسے کی کارروائی کا افتتاح انجمن کے بنیادی اصول پڑھنے سے کیا گیا- یہ اصول بالکل وھی ھیں جو "وید سماج" کے ھیں* حسب ذیل دفعات میں یہ اُصول بیان کئے گئے ھیں —

(۱) اوم+ - ھر چیز کے وجود سے پہلے خدا موجود تھا- کائنات کو اس کی مشیت نے پیدا کیا-

(۲) وھی سب کا مالک ھے اور اُسی نے سب کو پیدا کیا- وہ ھر جگہ موجود ھے وہ قادر مطلق ھے- اس کو کوئی دیکھہ نہیں سکتا- اس کی ذات کا انحصار کسی پر نہیں اور نہ کوئی اس کی برابری کرنے والا ھے- وہ نیکیوں کا سرچشمہ ھے اور عقل کا منبع-

(۳) اصل ایمان یہ ھے کہ اس کی ذات سے محبت کی جاے اور نیک اعمال کئے جائیں-

(۴) دنیاوی اور روحانی فلاح صرف اس کی بندگی سے حاصل ہو سکتی ھے-

---

* میں نے ۲- دسمبر سنہ ۱۸۶۷ ع کے خطبے میں ان کی نسبت تذکرہ کر دیا ھے —

+ یہ ایک پر اسرار فتحائیہ ھے جس کو ھندو لوگ اپنی تحریرات کے شروع میں لکھا کرتے ھیں- اس کی بڑی عالمانہ توجیہیں کی گئی ھیں " بنگال ایشیا ٹک سو سائٹی کی کارروائی" مورخہ ستمبر سنہ ۱۸۶۶ ع میں مسٹر جے بیمز، ایچ بلوکمان اور راجندرلال مترنے اس پر اسرار لفظ کے متعلق اپنی اپنی راے کا اظہار کیا ھے-

اِن بنیادی عقاید کے پڑھنے کے بعد ایک دعا پڑھی گئی جس میں قدیم اصنام پرستی اور ھمہ اوستی خیالات کی جھلک پائی جاتی ھے - اس دعا کے ابتدائی الفاظ یہ ھیں " اوم - اے مالک ھم تیری پرستش کرتے ھیں - تو آگ میں اور پانی میں، پودوں میں اور تناور درختوں میں اور کل کائنات میں جاری و ساری ھے" + —

اس دعا کے بعد ایک دوسرے بابو صاحب نے تقریر کی جس میں حکومت برطانیہ کی تعریف کی اور کہا کہ اس کے سایۂ عاطفت میں اھل ھند کو ضمیر کی آزادی کا حق حاصل ھے - اس حکومت کی برکتوں میں سے ایک یہ ھے کہ ملک میں تعلیم کا رواج بڑھ رھا ھے - ھندو لوگ اس تعلیم کے ذریعے سے اپنی عظمت پارینہ کو حاصل کرسکتے ھیں جس نے انھیں تمام دنیا کی اقوام میں ممتاز حیثیت دے دی تھی -

برھمو سماج کے ایک جلسے کا یہ حال جو کلکتہ میں منعقد ھوا تھا، ایک شخص نے چشم دید بیان کیا ھے جو " بمبئی ٹائمز " میں شایع ھوا ھے - " جس مکان میں جلسہ منعقد ھوا وہ باھر سے دیکھنے میں زیادہ عالیشان نہیں ھے - وہ ایک گلی میں واقع ھے جہاں سے ھر وقت لوگ گزرتے رھتے ھیں - اس مکان کے بڑے کمرے میں پہونچنے کے لئے دو سیڑھیوں پر چڑھنا پڑتا ھے - یہ کمرہ لمبا ھے اور اس میں لکڑی کی بنچیں بچھی ھوئی ھیں - دیواروں پر کسی قسم کی تحریریں یا مقولے آویزاں نہیں دکھائی دیتے - بیچ میں ایک اونچی جگہ ھے جس کے چاروں طرف جالی لگی ھوئی ھے اور جس کا فرش سنگ مرمر کا ھے - فرش کے ایک حصے پر ایک قالین بچھا ھوا ھے -

---

+ باقی دعا میں اسی خیال کو پھیلایا ھے -

اس جگہ سے الٹی جانب ایک چوکی پر دو برھمن پالتھي مارے بیٹھے ہوے تھے اور ان کے پاس دعاؤں اور بھجنوں کی کتابیں رکھی ہوئی تھیں - سامنے ایک تخت پر ایک گانے والا بیٹھا تھا- اس کے پیچھے قدیم برھمو سماج کے صدر کے بیٹے بابو دیندر ناتھ ٹگور ھارمونیم بجا رھے تھے * شروع میں عبادت کی رسم ادا ہوئی اور پھر اس کے بعد اپنشدوں میں سے سنسکرت زبان میں بعض حصے پڑھے گئے - پھر ایک برھمن نے ایک مختصر سی تقریر کي - ازاں بعد گانے والے نے دعائیں ھارمونیم کے سروں کے ساتھہ گانا شروع کیں جلسہ ختم ہونے پر لوگ فوراً کمرے سے باھر نکل کر اپنے اپنے گھروں کو چل دیے - مجھے یہ کہنا پڑتا ہے کہ اس ساری کارروائی میں مجھے جذبات کي گرم جوشی نام کو بھی کہیں نظر نہ آئی - سب لوگ اپنی اپني جگہ پر بیٹھے ہوے تھے اور برابر ڈیڑہ گھنٹے تک جب تک جلسہ ہوتا رھا نہ کوئی اُٹھا ' نہ کوئی سوکا اور جھکنے کا تو وھاں ذکر ھی نہیں تھا - ھاں ' حاضرین ' جن کی تعداد سو کے قریب تھي نہایت توجہ کے ساتھہ سب کچھہ سنتے رھے اور کبھي کبھي یہ معلوم ہوتا تھا کہ ان لوگوں کے دل اعتقاد سے لبریز ھیں - نہ کمرے میں اور نہ آس پاس کہیں اور کوئی عورت موجود نہ تھی ' —

برھمو سماج کے ارکان نے حکومت کو ایک عرضداشت پیش کي ھے

---

* مس کارپنٹر نے جو ریورنڈ لانٹ کارپنٹر کی بیٹی ھیں ' اپنے ایک خط میں لفظ " قدیم " کی تصریح کی ھے - اس خط سے معلوم ہوتا ھے کہ اصل میں برھمو سماج تحریک کے لیڈر دیبندر ناتھہ ٹگور تھے جو دوارکا ناتھہ ٹگور کے بیٹے تھے اور رام موھن رائے کے جگری دوست تھے - ان سے میری پیرس میں ملاقات ہوئی تھی - رام موھن رائے نے دیبندر ناتھہ ٹگور سے علحدگی اختیار کرنے کے بعد ایک زیادہ وسیع المشرب فرقے کی بنا ڈالی -

جس میں یہ درخواست کی ہے کہ ان کي مخصوص رسوم کے مطابق جو شادیاں کي جاڈیں انہیں حکومت تسلیم کرے - لیکن اس کے ساتھہ هي بابو کیشاب چندر نے اپنی ایک تقریر میں اس امر کی تصریح کردی کہ برھمو سماج کی تحریک اس خیال کی تائید نہیں کرتي کہ وہ هندو اور مسلمان جنھوں نے اپنے عقاید کلیتاً ترک کردیے هیں یا وہ لوگ جو ھمہ اوستي فلسفے یا افادیت کے قائل هیں' یا مشککوں یا عقل پرستوں کو بھي اس قانون کے تحت لایا جاے جو دراصل صرف انہیں کے فرقے کے لئے مخصوص هونا چاهئے - ان کی تحریک کو دوسروں کے خیالات کے ساتھہ گڈ مڈ نہ کرنا چاهئے * —

چماروں کي ذات هندوؤں کے نزدیک نہایت ذلت کی نظر سے دیکھی جاتي هے - صوبۂ شمالی مغربی کے چماروں کو جب اس ذلت کی زیادہ برداشت نہ رهي تو انہوں نے ترک وطن کا فیصلہ کیا - چنانچہ تقریباً چار لاکھہ آدمیوں نے اپنے دیس کو چھوڑ کر 'چھینگڑہ' میں توطن اختیار کیا جو دریاے مہا ندی کے قریب ایک سطح مرتفع هے ۱ - ان میں سے صرف چار سو چمار ایسے هیں جنھوں نے اپنے آبائي پیشے کو جاري رکھا هے- باقیوں نے کاشتکاري شروع کردي هے - ان میں سے بیشتر "ست نامي" تحریک کے ساتھہ وابستہ هوگئے هیں - چنانچہ اکثر نے ذات پات کی تفریق اور بت پرستی کو ترک کردیا هے اور اب وہ ایک خدا پر اعتقاد رکھتے هیں - اس اصلاحي تحریک کا مقصد یہ هے کہ هندوؤں

---

* انڈین میل مورخہ ۲۷ اگست سنہ ۱۸۹۸ ع —

۱ ٹائمز مورخہ ۲۰ اکتوبر سنہ ۱۸۹۸ ع -

میں عبادت کا شوق پیدا کیا جاے' حقہ چلم ترک کرائی جاے اور شراب اور دوسری نشہ آور اشیا سے احتراز کی تعلیم دی جاے* —

پچھلے موسم بہار میں بنگالیوں نے "چیت میلے" کے نام سے ایک بہت بڑا اجتماع منعقد کیا جس کا مقصد یہ تھا کہ مختلف مذہب والوں اور مختلف ذات والوں کے درمیان بھائی چارا پیدا کرنے کی کوشش کی جاے تاکہ اس سے عام ملکی فلاح و بہبود کی سبیل نکلے - چنانچہ اس میلے کے موقع پر ایک کمیٹی کے سپرد یہ کام کیا گیا ہے کہ وہ اس مقصد کے حاصل کرنے کے ذرائع تلاش کرے - نیٹو اوپنین (Native Opinion) مورخہ ۱۲ اپریل سنہ ۱۸۶۸ ع میں لکھا ہے کہ اس کمیٹی کی پہلی کوشش یہ ہوگی کہ ذات پات کی تفریق کو مٹائے جس کی وجہ سے اہل ہند میں اتحاد پیدا ہونا ناممکن ہے - یہ کوشش نہایت مبارک ہے اور یورپین لوگوں کو اس کی جس قدر ہوسکے ہمت افزائی کرنی چاہئے —

آج کل پنجاب میں ایک ہندو شخص نے جس کا نام رام سنگھ ہے اصلاحی تحریک شروع کی ہے- یہ تحریک زیادہ تر سکھ طبقے تک محدود ہے اور کہا جاتا ہے کہ کچھ مسلمانوں نے بھی اس کی اتباع شروع کر دی ہے - یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس کے پیرووں کی تعداد تقریباً ایک لاکھ کے پہنچ چکی ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ اصلاحی تحریک مذہبی نہیں سیاسی نوعیت رکھتی ہے —

---

* ایچ ایچ 'ولسن' نے اپنی کتاب 'یاد داشت متعلق فرقہ ہاے ہنود' میں ست نامیوں کی نسبت دلچسپ حالات لکھے ہیں صفحہ ۳۳۶ (جدید ایڈیشن) —

+ انڈین میل مورخہ ۱۴ دسمبر سنہ ۱۸۶۷ ع نیز ۹ جولائی سنہ ۱۸۶۸ ع -

تہذیب و تمدن کا جو ہمارا معیار ہے اس کے مطابق اہل ہند ترقي کر رہے ہیں - سعدي کا قول بالکل درست ہے کہ "انسان کو اپني صلاحیتوں کي نشو و نما کرني چاہئے - صندل کي لکڑي میں اگر خوشبو نہ ہو تو وہ سوائے جلانے کے اور کس کام کی ہوسکتی ہے" —

اہل ہند کی ترقی کا حال ایک ہندوستانی اخبار کی زبانی سنئے * - "آج سے دس سال قبل اہل ہند کا عام دستور تھا کہ وہ اپنی زندگی بیکاري میں گذارتے تھے - لیکن اب حالت بالکل بدل گئی ہے - بچے پڑھنے لکھنے میں مشغول نظر آتے ہیں ، جوان لوگ اپنے کام دھندے میں منہمک رہتے ہیں اور یہاں تک کہ بوڑھے بھی اس طرح بے فکری سے نہیں رہتے جیسے کہ پہلے رہا کرتے تھے - پہلے مزدور اپنی کاہلی کی وجہ سے قوت لایموت کو محتاج تھے لیکن اب اپنی مشقت کے بل پر انہیں سب کچھ حاصل ہے - تعلیم کی ترقی اور ترویج ، تجارت کا فروغ اور ریلوں کی وجہ سے نقل و حرکت اور رسل و رسائل کے باعث اہل ہند کی زندگی میں غیر معمولی تغیر پیدا ہوگیا ہے" - لیکن اس کے بعد ہی یہ ہندوستانی اخبار افسوس کے ساتھ لکھتا ہے کہ "شراب نوشی کا رواج روز بروز بڑھتا جاتا ہے - ہندو معتقدات کے ماننے والے کم ہوتے جاتے ہیں - چنانچہ اب ان مذہبی رسوم کی پابندی ترک کی جا رہی ہے جن پر شاستروں کے مطابق عمل پیرا ہونا ہر ہندو کا فرض ہے - دن میں تین دفعہ جو ہندوؤں کو عبادت کرنی چاہئے اس کی کسی کو پروا نہیں رہي - اب گھی کے چراغ کوئي نہیں جلاتا - دیوتاؤں کی مورتیوں کو

---

* سوم پرکاش - ۳۰ جولائی —

اب لوگ صندوقوں میں بند کرکے رکھنے لگے "—

ہندوستانی اخبارات میں * والیان ملک اور اُمرا کے متعلق اس قسم کے مضامین دیکھنے میں آتے ہیں کہ وہ تعلیم حاصل کرنے کی طرف سے بے توجہی برت رہے ہیں۔ اگر یہ لوگ تاریخ اور دوسرے علوم سے واقفیت حاصل کریں تو خود انہیں اس سے بہت فائدہ ہوگا - اس طبقے کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کے لئے اہل یورپ کے امرا کی مثال پیش کی جا رہی ہے کہ انہیں باوجود اپنے اعلیٰ نسب و شرف کے متفرق علوم سے واقفیت حاصل کرنے کا کس قدر شوق ہوتا ہے - لیکن ہندوستانی اخبارات میں بعض روشن خیال نوابوں کا بھی ذکر ملتا ہے مثلاً نواب رامپور جن کا نام کلب علی خان ہے نہایت تعلیم یافتہ شخص ہیں۔ ان کی علم پروری کے دیسی اخبارات معترف ہیں - میرٹھ کے اخبار میں ان کی مدح میں ۸۰ اشعار کا قصیدہ نقل کیا ہے - اسی طرح مہاراجہ کپور تھلہ کا شمار روشن خیال مہاراجوں میں کیا جاتا ہے - موصوف نے ابھی حال میں دس ہزار روپیہ بطور عطیہ دیا ہے تاکہ روز مرہ کی زبان کے توسط سے مغربی علوم کو رواج دیا جائے ۱ —

دیسی امرا کے علاوہ برطانوی حکومت بھی دیسی زبانوں کی ہمت افزائی کر رہی ہے جس پر اس کو مبارک باد دینی چاہئے - دراصل ہندوستانی لوگ اس کے متعلق بہت عرصے سے مطالبہ کر رہے تھے - حکومت کے اس فعل سے اہل ہند کے دل میں برطانیہ کے ساتھ محبت پیدا ہو گئی

---

* دیکھئے اودھ اخبار ۱۸ اگست سنہ ۱۸۶۸ ع —

۱ انڈین میل مورخہ ۹ اپریل سنہ ۱۸۶۹ ع —

هے - وهي برطانیه جس کی نسبت یونانی مورخ پروکوپ (Procope) کا خیال تھا که وه " سانپوں سے پٹا پڑا هے اور جهاں ممالک فرنگ (یعنی فرانس) کے سرے هوؤں کی ارواح رات کے وقت بھیجی جاتی هیں - ان ارواح کو ملاح لوگ اِس کنارے سے اُس پار لے جاتے هیں - ان ملاحوں کا کام هی بس یه هے " —

سر اسٹرافورڈ نارتھه کوٹ کے جدید مجوزه قانون کی رو سے هندوستانیوں کو سول سروس میں داخل هونے کا موقع ملے گا اور انهیں ان سب امتحانوں کی منزلوں سے نهیں گذرنا پڑے گا جن سے هر انگریز کو گذرنا پڑتا هے —

یه واضح رهے که بے شمار هندوستانی ایسے هیں جو انگریزي زبان کی تحریر و تقریر پر کامل قدرت رکھتے هیں - ان میں سے ایک کولا پور کے مهادیو گوبند راناڈے هیں جو بمبئی کے الفنسٹن کالج میں انگریزي ادب کے پروفیسر مقرر کئے گئے هیں - وه اس خدمت کے لئے نهایت موزوں شخص ثابت هوے هیں * —

جونا گڑه کی ریاست کے ولی عهد شهزادهٔ بلند اختر کی بسم‌الله کی تقریب میں ۲۲ جولائی سنه ۱۸۶۸ ع میں ایک جلسه منعقد هوا جس میں نواب جونا گڑه کے اعزا و اقارب کے علاوه اعلیٰ عهده داروں ' امرا ' شیوخ اور علماے شهر نے شرکت کی - شهزادے کے استاد محمد خیرات علی نے اردو میں اس موقع پر ایک تقریر کی جو اوده اخبار مورخه ۱۸ اگست سنه ۱۸۶۸ ع میں چھاپی گئی هے - اس تقریر کے بعض اجزا کا ذیل میں

* هوم ورڈ میل مورخهٔ ۱۰ فروری سنه ۱۸۶۸ ع —

ترجمہ درج کیا جاتا ہے —

" شہزادۂ ولیعہد کی بسم اللہ کے موقع پر میں علم کی تعریف میں چند کلمات بیان کرنا چاہتا ہوں - کسی دانشمند کا قول ہے کہ ہر علم مفید ہے - جاننا نہ جاننے سے ہر حالت میں بہتر ہے - آپ سب تعلیم و تعلم کو پسندیدگی کی نظروں سے دیکھتے ہیں - آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ خدائے عز و جل نے کائنات میں جس قدر اشیا پیدا کی ہیں ان میں علم کا مرتبہ سب سے بلند ہے - علم کے ذریعے سے انسان کو ذی حیات اشیا کی تکوین و تشکیل، ان کا طریق زندگی اور ان کے خصائص کا پتہ چلتا ہے - علم ایک طرح کی روشنی ہے اور جہالت بمنزلۂ تاریکی ہے - علم کائنات ہستی کی جان ہے - بغیر اس کے وہ ایک بے جان جسم سے زیادہ حیثیت نہیں رکھہ سکتی - علم سے انسان ہدایت پاتا ہے بغیر اس کے وہ بھٹکا بھٹکا پھرتا ہے - علم دولت ہے اور جہالت افلاس، علم عزت ہے اور جہالت ذلت، علم سے انسان سربلندی حاصل کرتا ہے اور جہالت اسے گڑھے میں گراتی ہے - انسان کو، عقل و تمیز کے باعث جن سے وہ اچھائی برائی میں فرق کرتا ہے، اشرف المخلوقات کہا گیا ہے - بغیر علم کے عقل و تمیز کی روشنی حاصل نہیں ہوسکتی - اچھائی اور برائی کے درمیان آدمی علم ہی سے فرق کرسکتا ہے - علم ہی سے انسان انسان بنتا ہے - علم ہی کی بدولت اسے اس کا حال معلوم ہوتا ہے کہ وہ کہاں سے آیا ہے اور اسے کہاں جانا ہے - اگر انسان اپنے تئیں سمجھہ لے تو گویا اس کو ذات باری تعالیٰ کی معرفت حاصل ہوگئی - علم اور اپنی ذاتی صلاحیت کے ذریعے انسان کائنات فطرت کے رموز و اسرار سے واقفیت حاصل کرسکتا ہے - اس کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ خداوند تعالیٰ اپنی قوت سے کیونکر تمام کائنات

کے کارخانے کو چلاتا ھے- غرض کہ انسانی نطق کی یہ طاقت نہیں کہ علم کی کماحقہ تعریف کرسکے جس کی بدولت دین و دنیا کے مسائل کا حل کیا جاتا ھے —

" علم کی قسموں میں سے ایک فلکیات ھے جس کے ذریعے ستاروں کی رفتار اور ان کی گردش' ان کا طلوع و غروب اور ان کے عروج و زوال کا حال معلوم ھوتا ھے- سورج سے دنیا کو حرارت اور زندگی حاصل ھوتی ھے- اسی پر موسموں کے تغیر و تبدل کا دارومدار ھے- قطب ستارہ اور قطب نما کے ذریعے اور اس کی مدد سے آپ جہاز رانی کرسکتے ھیں اور سمندروں کی راہ سے ممالک غیر کی سیر کرسکتے ھیں- ان کے رسوم و علوم کا حال معلوم کرسکتے ھیں اور ایک ملک سے دوسرے ملک میں تجارتی مال لے جاسکتے ھیں- ایک زراعت کا علم ھے جس کی بدولت غلے اور پھل پھلواری حاصل کی جاسکتی ھے جو انسان کی غذا کے کام آتی ھے- علوم کی تعداد حد شمار سے باھر ھے- اگر ان سب کا یہاں ذکر کیا جاے تو طول کلام ھوگا... حیوانات نباتات اور جمادات سب انسان کی خاطر تخلیق کئے گئے ھیں- ان کے ذریعے ھم اپنی ضروریات پوری کرسکتے ھیں اور حظ بھی حاصل کرسکتے ھیں- ھم جس طرح چاھیں انہیں استعمال کرسکتے ھیں- تندرستی میں بھی اور حالت بیماری میں بھی —

" علوم کو ھم دو قسموں میں تقسیم کرسکتے ھیں- علوم دینی اور علوم دنیاوی - ان دو شقوں کے علاوہ اور تیسری کوئی ھو ھی نہیں سکتی- ایک کے ذریعے ھم خدا کی معرفت حاصل کرتے ھیں اور دوسرے کے ذریعے فطرت کے راز ھم پر منکشف ھوتے ھیں- انسان کو چاھئے کہ وہ ان علوم کے حاصل کرنے کی سعی کرے اور اس کے ساتھ اس کا اعتراف کرتا

رهے که بغیر خدا کی مشیت کے انسان کچھه نہیں کرسکتا - اس کا کرم هو تو انسان علم حاصل کرسکتا هے - خدا کی سب سے بڑی نعمت عقل هے جس کا تعلق انسان کے دماغ سے هے - علم سے عقل کو جلا هوتی هے - اگر انسان تحصیل علم کے لئے ساعی نه هو تو اس کی روح کو زنگ لگ جاتا هے - علم سے انسان کی عقل میں روشنی پیدا هوتی هے' جہالت کي تاریکیاں دور هوتی هیں اور اشیا کي حقیقت معلوم هوتی هے —

" ویسے تو علم حاصل کرنا هر کس و ناکس کے لئے ضروری هے لیکن خاص کر انہیں اس کی اور بھی زیادہ ضرورت هوتی هے جنہیں خدا نے انسانوں کی حکومت عطا کی هے - انہیں چاهئے که خوش انتظامی اور اپنی رعایا کی فلاح و بہبود کو سمجھنے کے لئے تحصیل علم کریں تاکه ان کے لشکر اور عام مخلوق ان سے خوش رهے - ان کا فرض هے که تعلیم کو رائج کرنے کی حتی‌الهقدور کوشش کریں - اس سے ان کی رعایا کو بھی فائدہ هوگا اور خود ان کا نفع بھی اس میں هے - اسی طرح عندالضرورت وہ اپنی رعایا کی امداد پر بھروسه کرسکیں گے -

مذهب و معاشرت کی ان اصلاحی تحریکوں کا ذکر کرنے کے بعد جن کی ابتدا خود هندوستانی لوگوں نے کی هے' هم مسیحی مذهب کي تبلیغ و اشاعت کے متعلق کچھه کہنا چاهتے هیں که یه بھی اهل هند کے لئے نہایت اهم اور اصلاحي کام هے - مسحي مذهب کي صداقت کا اعتراف اور اس کي ترقي اس قدر تیزي کے ساتھه نہیں هو رهي هے جیسي که توقع کي جاتی هے - لیکن یه ضرور هے که اسي ضمن میں جو کچھه کام کیا جا رها هے وہ نہایت ٹھوس هے —

" سالنامۂ تبلیغ و اشاعت " میں هندوستان کے کل کیتھولک لوگوں کی تعداد ۸ لاکھه بتلائی گئی هے- اس میں سے ایک لاکھه ۶۰ هزار سیلون میں هیں جیسا که وهاں کے اسقف نے واضح کر دیا هے جن کا نام ڈاکٹر بون جان هے جو دراصل میدیا (Medea) کے بزرگ کلیسا هیں- آپ کو اس کی خاص فکر رهتی هے که دیسی عیسائیوں کو تعلیم و تلقین کریں اور ان کے دینی حقوق کی نگهه داشت کریں *—

مسیحیت کی تعلیم و تلقین سب سے پہلے هندوستان میں سینٹ طامس نے کی تھی- پھر ان کے بعد ایک اور دوسرے طامس اور فرانسوا زیویر نے مسیحی مذهب کا پیغام اهل هند کو پهنچایا- آج اس وقت همارے زمانے میں بھی پرجوش مبلغین مسیحیت هندوستان میں جوش و خلوص کے ساتھه کام کر رهے هیں- قدیم شرک و کفر کے ماننے والوں اور جدید فطرت پرستی کے علم برداروں کے مقابلے میں ان مبلغین مسیحیت کو هر جگه کامیابی هو رهی هے- جیسا که انجیل مقدس میں هے : " صداقت پسند دلوں کے لئے تاریکی میں روشنی ظاهر هو جاتی هے " † اور " اب وقت آگیا که وه جو روحانی اعتبار سے مرچکے هیں خداوند کے فرزند کی آواز کو کان دهر کے سنیں ‡- ایک سه پهر کی عبادت کے وقت کی دعا کے الفاظ یه هیں : " اگرچه حضرت مسیح دنیا سے کوچ کر گئے لیکن ان کی روح مقدس هر لمحه کلیسا میں نئی زندگی پیدا کرتی رهتی هے- کلیسا

---

* " Answers to the questions proposed by the Sub-Committee of education of Ceylon " - by Rev. Ch. Bonjean, Colombo, 1867.

† Ps. CXI. 4.

‡ سینٹ جان کی انجیل -

ان کا جسم باطنی هے - وہ باطنی طور پر کلیسا میں موجود هیں - کلیسا کے اعضا و جوارح کو ان کے دم سے زندگی حاصل هوتی هے اور اس کے هر فعل پر ان کا اثر موجود هوتا هے" —

مسٹر کلارک نے اپنے ایک خط مورخه ۱۳ فروری سنه ۱۸۶۸ ع میں شهر امرتسر کے چرچ مشن کے متعلق بعض اطلاعات بهم پهنچائی هیں - ان کے الفاظ یه هیں: "مسیحیت کی ترقی آهسته آهسته هو رهی هے لیکن اس سے همت نهیں هارنی چاهئیے - هم عدم توجهی اور کفر و شرک کے سرد سمندر سے چاروں طرف گهرے هوے هیں - مسیحیت کی لهر پر جو شخص آجاتا هے وہ نجات کے کنارے لگ جاتا هے - اس کی تعلیم میں ایک ایسی قوت موجود هے که اهل فکر اس کی بدولت ابدیت کے صراط مستقیم پر پهنچ سکتے هیں" ... —

اسکاتستان کے آزاد کلیسا کی شاخ جو ناگپور میں قایم کی گئی هے مسیحی تهذیب و تبلیغ کا کام کمال خوبی کے ساتهه انجام دے رهی هے - اس شاخ کے قایم کرنے والے ایک نهایت ذی علم اور انسانیت پرست شخص هیں جن کا نام ای بشپ هے - لاهور کا امریکی مشن بهی خوب پهل پهول رها هے - لاهور میں اس مشن نے جو کالج قایم کیا هے اس کے طلبه کے تقسیم انعام کے جلسے میں سر ڈانلڈ مک لیوڈ نے صدارت کی - موصوف نے دوران تقریر میں اس امر پر زور دیا که دیسی زبانیں جو دیهات میں بولی جاتی هیں ان کو ترقی دینے کی کوشش کرنی چاهئیے - آپ نے یه بهی فرمایا که ان زبانوں سے پوری واقفیت مسیحیت کی تبلیغ و اشاعت کے لئیے بهی ناگزیر هے - مسیحیت کا پیغام دیهاتیوں تک پهنچانے کے لئیے ضرورت اس امر کی هے که ان کی زبان میں رسالے لکهوا کر تقسیم

کرائے جائیں *—

شہر سیہور میں جو بیگم صاحبه بھوپال کی حدود حکومت میں واقع هے، چالیس هزار روپے کے خرچ سے ایک کلیسا تعمیر کیا گیا هے - اس رقم کا بیشتر حصه خود بیگم صاحبه بھوپال اور هلکر والی اندور نے اپنے پاس سے دیا هے - دیسی اُمرا نے بھی چندے سے اس کام میں مدد دی + —

انگلی کن (Anglican) کلیسا جن میں هر اتوار کے روز خطبه و عبادت کا انتظام کیا جاتا هے، تعداد میں برابر بڑھ رهے هیں - ان میں روزانه عبادت بھی هوتی هے - (انڈین میل، ۷ مارچ سنه ۱۸۶۸ ع) —

دهلی میں ایک طبی مشن ابھی حال میں قائم هوا هے جس کا مقصد یه هے که اهل هند کی مستورات کے علاج کا علحدہ انتظام کیا جائے اور اس کے ساتھه ان میں مسیحی تعلیم کی نشر و اشاعت کی جائے - ایک خاتون اس کام میں شریک هیں جن میں وہ سب اوصاف بدرجۂ اتم موجود هیں جو اس قسم کے کام کرنے والوں میں هونے چاهئیں - وہ زنانے میں آتی جاتی هیں اور انھوں نے دیسی عورتوں کو تعلیم دے کر بیماروں کی تیمار داری وغیرہ کے کام سکھا دیے هیں - چنانچه اس مشن کو توقع سے زیادہ کامیابی هو رهی هے - مشن کے اس کام کی بدولت دهلی کی بہت سی غریب عورتوں کے لیے آمدنی کا ایک سہارا هوگیا —

میرے پچھلے خطبے کے بعد ۱۲ دسمبر سنه ۱۸۶۷ ع کلکته کے بزرگ

---

* Colonial Church Chronicle مورخه ستمبر سنه ۱۸۶۸ع میں اس کا اعلان کیا گیا هے که صوبجات شمالی و مغربی میں تبلیغ و اشاعت کی غرض سے "اِنجمن ترقی علوم مسیحی" اُردو زبان میں رسائل تیار کروا رهی هے -

+ انڈین میل، مورخه ۵ مارچ سنه ۱۸۶۸ ع -

کلیسا نے جوسارے ہندوستان اور سیلون کے سہا پادری ہیں؛ اپنی پہلی تقریر میں اپنے ہم مذہبوں کی حالت کا جائزہ لیا اور ان کے لیے راہ عمل پیش کی۔ موصوف نے اس تقریر کی نقل مجھے بھی بھیج دی ہے۔ اس کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ پچھلے سال موصوف نے چالیس مختلف مقامات میں بپتسما کی رسم ادا کی، پچیس جلسے منعقد کرائے، مدرسوں اور کالجوں کا معائنہ کیا، چوبیس اسپتالوں اور چار قیدخانوں میں گئے، تین نئے کلیساؤں کی افتتاحی رسم ادا کی اور نو قبرستانوں میں دعا کے لئے گئے۔ موصوف کے ان مشاغل کو دیکھتے ہوے آپ کے جوش مذہبی کا پتہ چلتا ہے۔ آپ بلا تکلف دیسی لوگوں کی زبان میں گفتگو کرتے ہیں اور خاص کر اُردو پر آپ پورے طور پر حاوی ہیں۔ آپ نے اپنی تقریر کے دوران میں مسیحی مذہب کے مبلغوں کو اس ضرورت کا احساس کرایا کہ وہ ملکی زبانیں محنت سے سیکھیں تاکہ دیسی لوگوں کے ساتھہ اپنا تعلق قائم کر سکیں۔ آپ نے کہا کہ اہل ہند کے توہمات میں تو کمی پیدا ہو رہی ہے لیکن وہ ابھی مسیحی مذہب قبول کرتے ہوے ہچکچاتے ہیں۔ موصوف کے الفاظ یہ ہیں: ”یہ سچ ہے کہ اہل ہند مسیحی مذہب کے اُصول و عقاید کی پاکیزگی کو تسلیم کرتے ہیں اور حضرت مسیح کی پاک زندگی اور ان کی سیرت کو بہ نظر استحسان دیکھتے ہیں لیکن جب وہ خود مسیحی مذہب کے نام لیواؤں کو دیکھتے ہیں تو ان کی زندگی کو ان کے مذہبی اُصول کے منافی پاتے ہیں۔ ان حالات کو دیکھہ کر وہ ایک طرح کی روحانی کشمکش میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور ان کے دل کی بے چینی اور بڑہ جاتی ہے۔ یورپ میں آج کل عقل پرستی کا دور دورہ ہے؛ چنانچہ اس کا اثر ہمیں اہل ہند پر بھی نظر آتا ہے۔ جب وہ دیکھتے ہیں کہ خود مسیحی لوگ اپنے

مذہب کی پیروی نہیں کرسکتے تو ایسا مذہب قبول کرنے سے کیا فائدہ' جہاں تک کہ مادیت کے نظریوں کا تعلق ہے میں ذاتی طور پر ماہین کا ہم خیال ہوں کہ "ان نظریوں پر عمل کرنے سے انسانی فطرت نہایت پست ہوجاتی ہے - مادیت کے نظریوں اور قدیم زمانے کے نظریۂ تناسخ میں کوئی فرق نہیں ہے جس کی وجہ سے انسان تقدیر کا قائل ہو کر زندگی سے مایوس ہوجاتا ہے - ہند اوستانی فلسفے میں بھی یہ خیال ملتا ہے - میرا خیال ہے کہ موجودہ نظریے بہت دن تک نہیں چل سکیں گے جس طرح وہ قدیم زمانے میں بہت دن تک نہ چل سکے" - میں اور دوسرے مسیحیوں کی طرح دعا کرتا ہوں کہ ایسا ہی ہو —

" خطروں سے انسانی اعتقاد میں نئی جان پڑتی ہے - آدھی
رات کا اندھیرا ایمان کے لئے روز روشن کی طرح ہے " —

ریورنڈ پروفیسر بنرجی اور بابو کہندر موھن ٹگور کے اہتمام سے کلکتہ میں ایک دیسی عیسائیوں کی انجمن قایم ہوئی ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ جن ہندوستانیوں نے مسیحی مذہب قبول کرلیا ہے ان کو پاک باز زندگی کی تلقین کی جاے اور ان کے حقوق کا تحفظ کیا جاے - یہ دونوں حضرات پہلے ہندو تھے * —

اس سال کے دوران میں بعض ممتاز مسلمان مسیحیت کے حلقے میں داخل ہوے ہیں - چنانچہ دھلی کے شاہی خاندان کی بعض شہزادیوں کے بپتسمے کی رسم ابھی حال میں منائی گئی ہے —

اودھ اخبار مورخہ ۲ جولائی میں یہ خبر درج ہے کہ ایک نہایت

---

* (Colonial Church Chronicle) مورخہ اکتوبر سنہ ۱۸۶۸ ع

سر برآوردہ اور عالم فاضل ھندو نے جس کا نام بابو رام ناتھہ ھے ' اسلام قبول کر لیا ھے - ھندوستان میں ھندوؤں کا حلقۂ اسلام میں داخل ھونا باعث تعجب نہ ھونا چاھئے اس واسطے کہ قرآن میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے انجیل کی بعض صداقتوں کو شامل کرلیا ھے - چنانچہ یہی صداقتیں ھیں جنھیں دیکھہ کر ھندو گمراھی کو چھوڑنے پر آمادہ ھوجاتے ھیں - اس باب میں میں اُن ارباب قلم سے اختلاف رکھتا ھوں جو ھندوؤں اور مسلمانوں کے معتقدات کو گڈ مڈ کردیتے ھیں یا مسلمانوں کو ھندوؤں سے بھی بد تر سمجھتے ھیں - انھیں معلوم ھونا چاھئے کہ اسلام دراصل مسیحیت ھی کی ایک شاخ اور اس کی تعلیمات کی غلط توجیہ کا نام ھے حالانکہ ھندوؤں کا دھرم اھل یونان و روما کے مذھب کی طرح اصنام پرستی پر مبنی ھے جس کو مسیحیت نے تباہ کیا - ھندوؤں کے بت ان بتوں کی طرح ھیں جنھیں سینٹ پال نے پامال کیا اور ان کے توھمات تو اھل یونان و روما کے توھمات سے بھی گئے گذرے ھوے ھیں - یہ سچ ھے کہ ھندوستان میں آکر اسلام نے اپنے ھندو گرد و پیش کا اثر قبول کیا ھے اور اس کی اصلی سادگی پر بھی بٹہ لگ گیا ھے —

اخبار عالم مورخہ ۲۱ مئی سنہ ۱۸۶۸ ع میں ایک عجیب و غریب واقعہ درج ھے - مسیحی مبلغین اور مسلمان مولویوں نے ایک موقع پر باھم یہ طے کیا ھے کہ وہ آپس میں مل کر مباحثہ کریں گے اور اگر مبلغین مسیحیت کے دلائل تشفی بخش ھوے تو مولوی ان کا مذھب قبول کرلیں گے ورنہ وہ اسلام کے حلقے میں اپنے تئیں شامل کرلیں گے - مجھے اس کا علم نہیں کہ اس مباحثے کا کیا نتیجہ نکلا - لیکن بھر نوع مجھے اس کا کامل یقین ھے کہ مسلمان کبھی یہ تسلیم نہیں کریں گے کہ وہ مباحثے میں ھار گئے -

مسلمانوں اور ھندوؤں کو کامل طور پر اس کی آزادی حاصل ھے کہ وہ اپنے عقائد کی تبلیغ کریں جس طرح مسیحی مشنری کرتے ھیں - مسلمان لوگ خاص کر اس آزادی سے پورا فائدہ اٹھا رھے ھیں - چنانچہ دھلی کے گلی کوچوں میں ان کے واعظ جلسے منعقد کرتے ھیں اور اپنے دین کی حمایت میں مسیحی مشنریوں کے اعتراضات کا جواب دیتے ھیں اور اپنے مذھب کی فضیلت ثابت کرتے ھیں - دھلی کے مسلمان پنجاب کے شیعہ لوگوں کی طرح مہدی موعود کا ذکر نہیں کرتے - پنجاب کے شیعوں کا خیال ھے کہ سنہ ۱۲۸۶ ھجری مطابق ۱۸۶۹ ع میں امام مہدی کا ظہور ھوگا جو سنہ ۲۶۶ ھ مطابق سنہ ۸۷۹ ع میں اس دنیا سے رو پوش ھو گئے تھے - امام مہدی قیامت سے پہلے ظاھر ھو کر مسلمانوں کو غیروں کے جوے سے نجات دلائیں گے —

'بدیا بلاس' کے پڑھنے سے معلوم ھوتا ھے کہ دھلی میں مسیحی مبلغین کے ھندوؤں اور مسلمانوں سے خوب مباحثے رھے - لیکن چونکہ مباحثے کے سلسلے میں دل خراش باتیں کی گئیں اور گالی گلوج تک نوبت آگئی تو مجسٹریٹ نے اس قسم کے جلسوں کو ممنوع قرار دیدیا ھے - لیکن ھر فرقے کو اس کی اجازت باقی ھے کہ وہ اپنے مذھبی عقائد کی نشر و اشاعت کرے لیکن اس طریقے سے کہ کسی دوسرے کے مذھب کی تذلیل اور کسی کی دل آزاری نہ کی جاے- ھندوؤں کے پنڈت اور مسلمانوں کے علما مشنری لوگوں کی طرح برابر اپنے مذاھب کی حمایت میں جلسے منعقد کر رھے ھیں- اودھ اخبار کے مدیر نے بھی اپنے اخبار میں اس کے متعلق اظہار خیال کیا ھے کہ جس وقت سے انگریزی حکومت اودھ میں قایم ھوئی ھے اس وقت سے برابر مسلمانوں کو چاھے وہ سنی ھوں یا شیعہ یہ حق حاصل رھا ھے کہ وہ بھی مشنریوں کی طرح لکھنو میں اپنے جلسے منعقد کریں اور ان کے

اعتراضات کا جواب دیں۔ حکومت اس معاملے میں مطلق دخل اندازی نہیں کر رہی ہے۔ یہ مضمون ان الفاظ پر ختم ہوتا ہے۔ "ہمیں پوری توقع ہے کہ ہندو پنڈت اور مسلمان علما اپنے اپنے شہروں میں دھلی، اور لکھنو کی طرح، اپنے مذہب کی حمایت میں جلسے منعقد کریں گے اور اس امر کا خاص لحاظ رکھیں گے کہ مسیحی مذہب کے متعلق بیجا بد گوئی اور طعن سے احتراز کیا جاے گا"۔

پچھلے سال میں عماد الدین کے مسیحیت قبول کرنے اور ان کی اس تصنیف کے متعلق ذکر کرچکا ہوں جس میں انھوں نے اسلام کی تکذیب کی ہے۔ اس کتاب کا نام "تحقیق الایمان" ہے۔ مجھے اس کا ایک نسخہ پہنچ چکا ہے اور ان کے مشرف بہ مسیحیت ہونے کا حال بھی ان کی ایک تصنیف سے معلوم ہوا *۔ اس تصنیف کے شروع میں ایک دیباچہ ہے جس میں مصنف نے اپنی زندگی کے حالات قلمبند کئے ہیں۔ بعض بعض جگہ تعلی سے کام لیا ہے۔ لیکن اس قسم کی تحریرات صرف مشرقی ممالک ہی کی خصوصیت نہیں ہیں۔ یہ پوری تحریر لطف سے خالی ہے۔ موصوف نے اپنا مذہب بدلنے کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ بالکل درست معلوم ہوتا ہے۔ موصوف کہتے ہیں کہ پندرہ سال کی عمر سے مجھے مذہبی تحقیق و جستجو کا شوق پیدا ہوا اور اس غرض سے میں نے علما اور فقرا کی صحبت اختیار کی تاکہ ان کی تعلیم سے فیض حاصل کیا جاے۔ میں نے مسجدوں اور خانقاہوں کی خاک چھانی، فقہ اور حدیث کی تحصیل کی۔ لیکن جب سے مسیحی مذہب کے متبعین سے ملنے جلنے کا موقع ملا اس وقت سے مجھ پر یہ کھلا کہ مذہب اسلام کے

---

* موصوف نے اپنے مسیحی مذہب قبول کرنے کا حال "واقعات عمادیہ" میں لکھا ہے۔ آپ ایک ماہوار اخبار کے مدیر بھی ہیں جس کا حال آگے آے گا۔

حقائق پر شبہ کیا جاسکتا ہے - جب میں نے اپنے یہ شبہات علما کے سامنے پیش کئے تو انہوں نے تیوریوں پر بہت کچھہ بل ڈالے اور بعض نے اپنے استدلال سے میری تشفی کی کوشش کی - اس کے بعد میں نے مذھبی تحقیق کو ترک کیا اور علم و ادب کی تحصیل میں مشغول ہو گیا - لیکن شبہات میں کوئی کمی پیدا نہ ہونا تھی نہ ہوئی - اس پر میں نے صوفیا کا مسلک اختیار کرنا چاہا اور مراقبے میں رھنے لگا - میں نے کھانا پینا بہت کم کردیا، رات رات بھر قرآن کی تلاوت کیا کرتا تھا اور صرف ان مسلمانوں کی صحبت میں جاتا تھا جو اپنے اتقا کی وجہ سے مشہور تھے - پنجم وقتہ نماز کے علاوہ میں نے تہجد اور چاشت کی نماز بھی شروع کردی - اولیا کے مزاروں پر زیارت کے لیے جاتا تھا اور راھبوں کی طرح جنگلوں میں زندگی بسر کرنے لگا - تصوف کی ایک کتاب میں نظر سے گذرا کہ کاغذ کے پرزوں پر اللہ تعالیٰ کے نام لکھہ کر ان میں جو کا آٹا بھر کے پڑیاں بنا کر دریا میں پھینکو تاکہ مچھلیاں کھا لیں - مدتوں اس پر عمل کیا لیکن نہ مراقبے سے، نہ عبادت سے اور نہ کسی اور ذریعے سے دل کو اطمینان نصیب ہوا - قرآن کی وہ آیات جن میں دوزخ کی نسبت حالات بیان کئے گئے ھیں میرے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکنے لگیں - میں نے ان کا مقابلہ حضرت مسیح کی تعلیم اور ان کے مذھب کے معتقدات سے کیا —

اس وقت تک عمادالدین اسلامی عقاید کو تسلیم کرتے تھے بلکہ آگرہ کی شاھی مسجد میں مشنری (Pfander) کے خلاف تقریریں کرتے تھے اور اس کے اعتراضات کا جواب دیتے تھے - مشنری (Pfander) کی کتابوں سے جو ھندوستانی زبان میں لکھی گئی ھیں سارے ھندوستان میں ھل چل

مچ گئی ہے اور ہر طرف سے ان کے جوابات دئے جا رہے ہیں —

آخر آہستہ آہستہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ اسلامی علما عمادالدین کی تسکین کرنے سے عاجز ہوگئے - وہ اب اپنے کمرے میں سب سے الگ بیٹھ کر رویا کرتے تھے - اس دوران میں ان کو ایک مسلمان فاضل مولوی صفدر علی کے مسیحیت قبول کرنے کا علم ہوا - اس کا اثر یہ ہوا کہ عمادالدین نے بھی انجیل مقدس اور متعلقہ کتب کا مطالعہ شروع کر دیا - اسے مسٹر مکنٹوش سے جو ایک نہایت ہمدرد اور فاضل انگریز تھے بڑی مدد ملی - موصوف لاہور کے نارمل اسکول کے ناظم تھے - بالآخر پورے غور و خوض کے بعد عمادالدین نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ مسیحی مذہب قبول کرلے - ریورنڈ ٹی آر کلارک سے بھی اس معاملے میں مدد ملی - میں ریونڈ کلارک کی بیوی کے خط کے متعلق اوپر ذکر کر چکا ہوں - ریورنڈ کلارک کے ہاتھ پر عمادالدین نے ۲۹ اپریل سنہ ۱۸۶۶ ع کو بپتسما قبول کیا اور انہیں وہ روحانی عافیت حاصل ہوئی جس سے عرصے سے وہ محروم تھے —

پچھلے سالوں میں ہندوستان میں جو علمی اور ادبی انجمنیں قایم ہوئی ہیں وہ برابر اپنا کام کئے جا رہی ہیں - ان میں سب سے اہم علیگڑھ والی انجمن ہے جس کے بانی سید احمد خاں، صدرالصدور بنارس ہیں جنھوں نے اپنی اس تصنیف کے باعث خاصی شہرت حاصل کرلی ہے جو انہوں نے انجیل مقدس کی تعلیمات کے متعلق لکھی تھی - یہ انجمن، انجمن اسلام سے مختلف ہے جس کی نسبت میں ابھی ذکر کروں گا * -

* ۳ دسمبر سنہ ۱۸۶۷ ع اور ۱۸۶۷ والے خطبوں میں میں نے غلطی سے ان دونوں انجمنوں کو آپس میں گڈمڈ کردیا ہے —

اس کو مذہبی معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں - اس کی رکنیت ہندؤں اور انگریزوں کے لئے بھی ممکن ہے - اس انجمن کا مقصد وحید یہ ہے کہ مغربی علوم و فنون کو اردو میں ترجمے کے ذریعے رواج دیا جاے - تاکہ ان تک ہر ہندوستانی کی رسائی ہو سکے —

اس انجمن کی مطبوعات کی ساتویں جلد میرے پیش نظر ہے - یہ آر - اس - برن کی کتاب " Outlines of modern farming " کا اردو میں ترجمہ ہے - اس کا نام " رسالۂ علم الفلاحت " ہے - اس کتاب میں تصاویر بھی ہیں اور ترجمے میں حواشی کا اضافہ کیا گیا ہے (*) - اس انجمن کے اخراجات کی کفالت ارکان کے عطیات سے ہوتی ہے - اس انجمن نے ایک علحدہ فنڈ اس غرض سے قایم کرنا شروع کیا ہے کہ ہندوستانی نوجوانوں کو بغرض تعلیم یورپ بھیجنے کا انتظام کیا جاے تاکہ مغرب میں جو کچھہ بھی جاننے کے لایق ہے اس کو ہندوستانی نوجوان سیکھیں اور اپنے ملک کو ترقی کی شاہراہ پر گامزن کریں (۱) - یہ خبر بھی مشہور ہے کہ خود سید احمد خاں کا انگلستان جانے کا قصد ہے - آپ اس انجمن کے بانی ہیں اور آپ اس سال پھر اس کے معتمد اعزازی مقرر کئے گئے ہیں - سید احمد خاں ایک نہایت جید عالم ہیں - آج کل آپ ایک فہرست تیار

(*) یہ کتاب ۲۵۴ صفحات پر مشتمل ہے - یہ لیتھو میں نہیں بلکہ ٹائپ میں چھاپی گئی ہے - سید احمد خاں کے مطبع میں اسی انجمن کی کتابیں طبع کی جاتی ہیں - کچھہ دنوں سے ایک اخبار بھی اس مطبع سے شائع ہونا شروع ہوا ہے جس کی نسبت آگے ذکر آے گا —

(۱) اخبار عالم، مورخہ ۲ اپریل سنہ ۱۸۶۸ ع —

کرنے میں مشغول ہیں جس میں اردو زبان کی سب کتابوں کا حال درج ہوگا - گویا یہ فہرست کیا ہوگی زبان اردو کی تاریخ ہوگی - اس کے ساتھ آپ نے ایک " اردو لغت " کا کام بھی شروع کرادیا ہے - اس لغت میں اردو زبان کے سب محاورے درج ہوں گے (*) - یہ فہرست اور لغت دونوں انجمن کے سلسلۂ مطبوعات میں شامل ہوں گی - ان کے علاوہ قدیم اردو شعرا کے انتخابات اردو اور فارسی شاعری اور خطابت پر کتب تصنیف کرائی جائیں گی - انجمن کے پروگرام میں یہ بھی داخل ہے کہ عربی اور فارسی کی تاریخیں اور دیگر مشہور کتب کا اردو میں ترجمہ کرایا جاے (†) - اس انجمن کی طرف سے متعدد انگریزی کتابوں کے ترجمے شائع ہو چکے ہیں - یہ بھی اس کے مقاصد میں شامل ہے کہ مغربی علوم صحیحہ اور منطق پر اردو میں تصانیف لکھائی جائیں - میں سمجھتا ہوں یہ صرف تجربتاً کیا جا رہا ہے اس لئے کہ مغربی اور ایشیائی نقطۂ نظر میں اس قدر فرق ہے کہ یہ کام بہت دشوار معلوم ہوتا ہے - لیکن ممکن ہے کہ یہ تصانیف موجودہ حالت میں ان مصنفوں کے لئے مفید ثابت ہوں جو آئندہ ہندوستان میں جنم لیں گے —

(*) میں نے یہ معلومات ۲۲ مئی کے اس انجمن کے رسالے سے حاصل کی ہیں جس میں راجہ جے کشن داس کی پوری رپورٹ درج ہے جو انہوں نے ۹ مئی کے عام جلسے میں پڑھی تھی - موصوف انجمن کے معتمد ہیں —

(†) ان کتابوں میں حسب ذیل شامل ہیں :- تاریخ یمینی ، تاریخ ابوالفضل ، تاریخ الماثر ، (غالباً تاریخ تاج الماثر مراد ہے ، مترجم) ، طبقات ناصری ، تاریخ فیروز شاہی ، تاریخ تیمور ، انتخاب تاریخ ابن خلدان —

بهت عرصے سے مجھے " رسالۂ انجمن لاهور" نهیں ملا - اس انجمن کا مقصد بهی یه هے که مفید علمی معلومات کی نشر و اشاعت کی جاے (*)- میں خود اس انجمن کا رکن هوں - اس انجمن کی جانب سے ۳۲ رسالے شائع هو چکے هیں - ایک رسالے کو " اخبار عالم " نے پورا نقل کر دیا هے (+)- اس کا عنوان " جانداروں کے ارتقا کی کڑیاں " هے - اس رسالے میں مختلف جانوروں کی اقسام کے متعلق بحث کی گئی هے - مکهی سے لے کر هاتهی ، اونٹ اور مگر مچهه ، سب هی کے متعلق کچهه نه کچهه اس میں موجود هے (‡)- اس رسالے کے شروع میں لکها هے که " بعض جانور انسان سے بڑے هوتے هیں اور ان کی عمریں بهی اس سے زیادہ هوتی هیں لیکن وہ عقل سے محروم هوتے هیں - اس عقل کی بدولت انسان خدا تک پهنچ سکتا هے "- مولف رساله نے خاص کر اس فرق کی صراحت کی هے جو انسان اور جانور میں پایا جاتا هے - اسی ضمن میں مولف نے لکها هے که چهوٹے چهوٹے جانوروں کی جبلی قوت مدرکه بڑے جانوروں سے زیادہ ترقی یافته هوتی هے - غرض که اس رسالے میں اسی قسم کے مباحث هیں جن کے متعلق میں زیادہ تفصیل نهیں دینا چاهتا —

(*) ۱۰ ستمبر سنه ۱۸۶۸ ع کے " اخبار عالم " سے معلوم هوا که نواب سکندر علی خان رئیس مالیر کوٹله نے ایک هزار روپے کے علاوہ جو انهوں نے انجمن کو پهلے دیے تهے ، ایک لاکهه روپے کا عطیه مرحمت فرمایا هے - اس اخبار سے یه بهی معلوم هوا که نواب صاحب موصوف عنقریب انگلستان کے سفر کے لئے روانه هونے والے هیں اور اپنے بڑے صاحبزادے کو تعلیم کے لئے همراہ لے جائیں گے جن کی عمر ۱۲ سال هے —

(+) " اخبار عالم " مورخه ۱۴ نومبر سنه ۱۸۶۷ ع - (میرٹهه)

(‡) یه رساله " اخوان الصفا " کی طرح هے جس کا میں نے " Les ani maux " کے نام سے ترجمه کیا هے —

ایک اور دوسرے رسالے کے مرتب کا خیال ہے کہ ہندوستان میں تہذیب و تمدن کی ترقی محض خیالی ہے - اصلیت میں اس کا کوئی وجود نہیں (*)- اس کے الفاظ یہ ہیں - " یہ بہت دشوار ہے کہ دیسی لوگوں کی ذہنیت سے ان کے قدیم تعصبات علحدہ کئے جائیں اور ان خلاف فطرت رسوم کو معدوم کیا جاے جو ہندوستان کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی ہیں - سواے اس کے کوئی صورت نظر نہیں آتی کہ خدا اپنی قدرت سے یکایک ہندوستان کے حالات بدل دے - یہ درست ہے کہ بعض مقامات پر اسکول اور کالج قایم کئے جا رہے ہیں لیکن ان سے کوئی فائدہ نہیں - تھوڑی بہت تعلیم حاصل کرنے کے بعد جب کسی ہندوستانی کو لکھنا پڑھنا شُد بُد آجاتا ہے تو اس کی تمام تر کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ نوکری حاصل کرلے چاہے وہ ادنی درجے ہی کی کیوں نہ ہو - نوکری مل جانے کے بعد لکھنا پڑھنا سب ختم ہو جاتا ہے - اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ درحقیقت ان لوگوں کو علم حاصل کرنے کی سچی خواہش نہیں ہوتی - اگر کسی کو پڑھنے سے دلچسپی ہوئی تو وہ قصے کہانیوں کی کتابیں پڑھتا ہے - مثلاً بدر منیر ' بکاولی ' اور باغ و بہار وغیرہ - فی الوقت اس کی کوئی توقع نظر نہیں آتی کہ ہندوستانی لوگ تاریخ ' اخلاق اور فلسفہ کی کتابوں کو رغبت کے ساتھ پڑھیں - دراصل ضرورت اس کی ہے کہ مذکورۂ بالا موضوعوں پر وہ کتابوں کا مطالعہ کریں - بڑے افسوس کی بات ہے کہ حکومت کی جانب سے دھلی میں سنہ ۱۸۴۰ ع میں جو ترجموں کا سلسلہ شروع ہوا تھا وہ جاری نہ رہ سکا اور ان کی اشاعت کا کام

(*) رسالہ نمبر ۲۵ —

بند ہو گیا (*) "۔

پچھلے سالوں کی طرح اس سال بھی ۸ ذیقعدہ سنہ ۱۲۸۲ ھجری مطابق ۴ مارچ سنہ ۱۸۶۸ ع کلکتہ کے ٹاؤن ھال میں انجمن اسلام کا جلسۂ عام منعقد ھوا - اس میں مختلف مضامین پڑھے گئے اور بعض نادرالوجود اشیا کی نمائش کی گئی - جلسے میں وائسرائے بہادر، لفٹنٹ گورنر بنگال، دیسی امرا اور انگریزوں کے بعض سر بر آوردہ لوگوں نے شرکت کی - مدیر "اخبار عالم" نے اس امر پر اظہار تاسف کیا ھے کہ وہ اس سالانہ جلسے میں شریک نہ ھو سکے - موصوف کو انجمن کے مقاصد سے ھمدردی ھے اور آپ نے اس کی اکثر موقعوں پر بہت تعریف کی ھے اور یہ خواھش ظاھر کی ھے کہ کیا اچھا ھوتا اگر ھندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں اس قسم کی انجمنیں قایم ھو جاتیں تاکہ علوم و فنون اور ادب کو ترقی دی جاے اور ھندوستان کے تمول و فلاح میں اضافہ کیا جاے —

۳۱ مارچ کو بنگال کی "انجمن علم عمرانی" (Social Science Association) کا ایک جلسہ کلکتہ میں منعقد ھوا - اس جلسے میں دیسی امرا و روسا کے علاوہ بہت سے انگریزوں نے بھی شرکت کی جو سیول اور فوج دونوں صیغوں سے تعلق رکھتے تھے (†) - گزشتہ جون کے مہینے میں اس انجمن کے

(*) سنہ ۱۸۴۰ ع میں میرے دوست ایف بوتروس (F. Boutros) پرنسپل دھلی کالج اور ان کے جانشین ڈاکٹر اے اسپرنگر کے زیر اھتمام انگریزی کتب کا اردو میں ترجمہ شروع کیا گیا تھا اور حکومت نے اس کام کی سرپرستی اپنے ذمے لی تھی - چنانچہ متعدد کتب کے تراجم شائع ھوے جن کی ھندوستان میں اس وقت تک بہت قدر ھوتی ھے - افسوس ھے کہ یہ سلسلہ عرصے تک جاری نہ رہ سکا - ھماری خواھش ھے کاش کہ پھر کوئی اس کام کو شروع کرے —

(†) اخبار عالم، مورخہ ۱۶ اپریل سنہ ۱۸۶۸ ع -

" مجلۂ علمیه " کا دوسرا نمبر شائع هوا هے - اس میں صدر جلسے کا خطبه درج هے اور اس کے علاوہ ملکی تجارت و صنعت ' صفائی ' تہوار اور اسی قسم کے دوسرے مسائل پر مضامین هیں - ایک مضمون تعلیم مسلمانان هند پر اور ایک تعلیم نسواں پر هے - یه مضامین اس لئے دلچسپی کا باعث هیں که ان کے لکھنے والے خود هندوستانی هیں - ایک مضمون میں ریو رنڈ جے لانگ نے بنگال کی کہاوتوں کو جمع کر دیا هے (*) -

اس انجمن نے متعدد اهم سوالات کا اعلان کیا هے اور قابل اور اهل لوگوں سے ان کے جواب مانگے هیں - ان سوالات کے ذریعے سے تعلیم و تعلم ' لڑکوں اور لڑکیوں کے مدارس اور ایسے مدارس قایم کرنے کے لیے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی گئی هے جهاں لڑکے اور لڑکیاں ساتھه مل کر تعلیم حاصل کریں (+) —

سنه ۱۸۹۱ ع میں مہاراجه بنارس اور مہاراجه وزیانگرم کے زیر سرپرستی ایک " مجلس مباحثه " قایم هوئي هے جو ایک خالص علمی جماعت هے - یہاں مذهبي اور سیاسی مسائل پر بحث کي اجازت نہیں هے - اس میں اعلی خاندانوں کے هندو اور مسلمان دونوں شریک هیں جنهیں هندو یا اسلامي ادب سے دلچسپی هے - ان کے علاوہ بعض یورپین بهي اس مجلس میں شریک هوگئے هیں - اس مجلس کے جلسے هفته وار منعقد هوا کرتے هیں اور مختلف مسائل پر تقریروں کا انتظام کیا جاتا هے - تقریر کے بعد ارکان مجلس کو متعلقه مسائل پر بحث و گفتگو

(*) هوم ورڈ میل ' مورخه ۲ مئی سنه ۱۸۶۸ ع -

(+) انڈین میل , ۲۷ فروری سنه ۱۸۶۸ ع —

اجازت ہوتي ہے - جس طرح ہماري یوروپین انجمنوں میں ہوتا ہے اس مجلس میں بھی ارکان کو اس کا پورا موقع حاصل رہتا ہے کہ وہ اپنے خیالات کی نشو و نما کرسکیں —

یہ مجلس بھي "انسٹیٹیوت آف فرانس" کي طرح پانچ حصوں میں منقسم ہے : تعلیم ' عمرانی ترقي ' فلسفہ و ادب ' علوم و فنون اور قانون - اس مجلس کے ہر شعبے کا صدر یوروپین ہے لیکن معتمدین ہندوستانی ہیں - بدقسمتی سے میں اب تک اس انجمن کی مطبوعات سے ناواقف ہوں - میرے پیش نظر "مجلہ علمیہ" کا بس ایک نمبر ہے جس کے متعلق میں ذکر کرچکا ہوں - اس میں سنہ ۶۵ - ۱۸۶۴ ع کي رپورت شامل ہے اور اس کے علاوہ ۳۷ مضامین ہیں جو سب کے سب ' سوائے ایک کے ' ہندوستانیوں کے قلم سے لکھے ہوئے ہیں - ان میں سے بیشتر مضامین اردو یا ہندی میں ہیں - سب مضمونوں کا کم و بیش اس موضوع سے تعلق ہے کہ ہندوستانی لوگوں کي ذہن اور اخلاقی ترقی کے واسطے نئی راہیں نکالی جائیں —

ان مضامین کے بعض عنوان یہ ہیں : تعلیم نسوان کے فوائد ' پردے کی خرابیاں ' یوروپین لوگوں سے ملنے سے کیا علمی فائدے حاصل ہوتے ہیں ' ہندوستان میں علوم طبیعی کی ترقی ' سنسکرت خطابت ' عربی فلسفہ اور ہندوؤں کی موسیقی وغیرہ - ہندوستانی زبان سے دلچسپی رکھنے والوں کے ایسے حسب ذیل عنوان ہیں : ہندی کی اہمیت ' اردو کی ابتدائي کتب اور فارسی رسم الخط کا بہ مقابلہ رومن خط قابل ترجیح ہونا - ماہ جون میں انجمن کا جو جلسہ منعقد ہوا تھا اس میں یہ مسئلہ بھی زیر بحث رہا کہ نوجوانوں کو جسماني ورزش کی اہمیت جتانی چاہئے

جیسے قدیم اهل یونان کا دستور تها (*) —

ابهی حال میں اعلان هوا هے که لکهنو میں "انجمن تهذیب" کے نام سے ایک علمی اور ادبی حلقه قایم هوا هے جس کے مقاصد کم و بیش وهی هیں جو بنارس کی انجمن کے هیں - اس انجمن میں عام سیاسی مسائل ' قوانین ' رسوم ' علوم و فنون اور موجودہ هندوستانی ادب کے متعلق بحث و گفتگو هوا کرے گی - اس انجمن کے اصلی کارکن پنڈت اور منشی لوگ هیں - اس انجمن کے معتمد شیو نرائن هیں جنهوں نے اردو اور هندی کے اخبارات سے درخواست کی هے که وہ انجمن کی مطبوعات کے معاوضے میں انجمن کو اپنا اخبار بهیجا کریں —

اسی قسم کی متعدد انجمنیں هندوستان کے بڑے بڑے شهروں میں قایم کی جارهی هیں یه سب دراصل نتیجه هے اس تعلیم کا جو هندوستانی لوگوں کو سرکاری یا مشن کے مدارس میں دی جارهی هے - ان انجمنوں کے قیام سے یه فائدہ هوا هے که اهل هند میں تحقیق و جستجو کا مادہ پیدا هورها هے اور ان میں علم حاصل کرنے کا شوق پیدا هو رها هے - † دهلی کی انجمن کے قواعد و ضوابط رساله "دهلی سوسائٹی" کے نام سے شائع هوے هیں - یه قوائد و ضوابط اُردو میں هیں اور پیارے لال نے انهیں ترتیب دیا هے —

میرٹهه میں ایک "انجمن فلکیات" قایم هوئی هے جس میں ۵۰

(*) اودہ اخبار مورخه ۲۳ جون سنه ۱۸۶۸ ع —

† Trubner's Literary Record مورخهٔ فروری سنه ۱۸۶۸ ع میں بهی اس قسم کی راے کا اظهار کیا گیا هے - میں اس راے سے بالکل متفق هوں —

ارکان شریک ہیں- اس کے قواعد و ضوابط میرے پیش نظر ہیں جو اُردو میں ہیں اور نہایت سلیس زبان میں لکھے گئے ہیں - فی الحال اس انجمن کی طرف سے ایک ماہوار رسالہ شائع ہوگا جس میں انجمن کی تمام کارروائیوں پر تبصرہ ہوا کرے گا - ارکان انجمن کا خیال ہے کہ کچھہ عرصے بعد ایک مستقل علمی مجلہ شائع کیا جاے گا —

لاہور ہندوستان کے اور دوسرے شہروں سے اپنی علمی و ادبی خدمت کے باعث سبقت لے گیا - یہاں پہلے سے ایک علمی انجمن موجود ہے اور اس کے علاوہ اور دوسری متعدد جماعتیں ہیں جو علم و ادب کی خدمت انجام دے رہی ہیں - "جامعۂ مشرقیہ" کے قیام کی وجہ سے اور زیادہ مدد ملے گی- مسٹر لیپل گرفن (Lepel Griffin) کا خیال ہے کہ وہ ایک "انجمن ہمالیہ" قایم کریں جس کے پیش نظر یہ مقصد ہوگا کہ ہمالیہ پہاڑ کے متعلق جہاں تک ممکن ہے معلومات فراہم کی جائیں- اس باب میں علم نسل، لسانیات، آثار قدیمہ اور مذہب کے متعلق خاص تحقیقات کی جاے گی —

لاہور میں ایک "انجمن حیوانات" بھی قایم ہوئی ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ دنیا کے مختلف ممالک کے حیوانات کے نمونے جمع کئے جائیں اور ان کے خصائل و عادات کا مقابلہ اور تحقیق کی جاے —

میں سال گزشتہ اس عرض داشت کے متعلق ذکر کر چکا ہوں جو صوبجات شمال و مغربی کے ہندوستانی باشندوں نے کلکتہ یونیورسٹی کے نام بھیجی تھی جس کو سر اے گرانٹ ہندوستان کی کیمبرج سے تعبیر کرتے ہیں اس لئے کہ بمبئی یونیورسٹی ان کے نزدیک ہندوستان میں

بمنزلۂ آکسفورڈ ہے *- اس عرض داشت کا مضمون یہ تھا کہ جس طرح مغربی علوم میں یونیورسٹی سند عطا کرتی ہے اسی طرح مشرقی علوم کے لئے سند ہونی چاہئے- لیکن اس عرض داشت کو یونیورسٹی کی سنڈیکیٹ نے مسترد کردیا- اب ان عرض داشت بھیجنے والوں نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ اپنی علحدہ یونیورسٹی قایم کریں گے جس میں مشرقی علوم کی ہندوستانی میں تعلیم دی جاے گی †- اس یونیورسٹی کو "مشرقی یونیورسٹی" کے نام سے موسوم کیا جاے گا اس لئے کہ یہاں خاص کر قدیم ہند کی السنہ و ادب کی تعلیم کا انتظام کیا جاےگا اگرچہ اس کے ساتھ دوسرے علوم کی بھی تعلیم دی جاے گی- چونکہ تینوں صوبوں کی یونیورسٹیاں مغربی طرز کی ہیں اور ان میں انگریزی میں تعلیم دی جاتی ہے' اس لئے اپنی خصوصیت کے لحاظ سے اس کو مشرقی کہا جاےگا ‡- اگر اس یونیورسٹی کو قائم کرنے میں کامیابی ہوئی تو پوری توقع ہے کہ ہندوستانی زبان کی نشاۃ ثانیہ کے لیے راستہ صاف ہو جاے گا اور اُردو زبان میں مشرقی

---

* موصوف صوبۂ بمبئی کے ناظم تعلیمات تھے اور آج کل اڈنبرا یونیورسٹی میں پرنسپل ہیں —

† دیکھئے "بنگال ایشیا تک سوسائٹی کی کارروائیاں" سنہ ۱۸۷۶ع صفحہ ۱۲۰-

‡ انگریز پرستی کے خلاف اس وقت ہندوستان میں ایک رد عمل نظر آتا ہے - واقعی یہ بات قابل افسوس ہے کہ ہندوستانیوں کو انگریزوں سے بھی زیادہ صاحب بننے پر فخر ہوتا ہے اور ان کی جامعات میں فاتحوں کی زبان اختیار کی جا رہی ہے- چنانچہ مولوی وحیدالدین جو انگریزی تعلیم کے حامیوں میں سے ہیں اور جنہوں نے اپنے خرچ سے چھوٹے بچوں کے لئے ایک مدرسہ بھی قایم کیا ہے جہاں انگریزی کی تعلیم کا انتظام کیا گیا ہے' اس انگریز پرستی کے خلاف بطور مثال پیش کئے جاتے ہیں —

مذاق کے مطابق محاوروں اور استعاروں کو باقی رکھتے ہوے مغربی خیالات کی ترویج ہو سکے گی - گویا اُردو مغربی خیالات کے ساتھہ تطابق کی کوشش کرے گی اور جدید تصورات و افکار کی بدولت ایک نئی زندگی وجود میں آئے گی —

ہم سر ڈی مک لیوڈ لفٹنٹ گورنر پنجاب کے دلی طور پر ممنون ہیں کہ صاحب موصوف نے اپنی ایک تقریر کے دوران میں فرمایا کہ ہندوستانیوں کی یہ کوشش بجا اور درست ہے کہ وہ اپنی اور اپنے آبا و اجداد کی زبان کو سرکاری نظام تعلیم میں کما حقہ اہمیت دلانا چاہتے ہیں- آپ نے فرمایا کہ سرکاری عہدہ داروں کو اپنی دیسی زبان پر پوری قدرت حاصل کرنی چاہئے بالخصوص وہ جن کے تفویض تعلیم دینے کا کام ہے ان کے لئے دیسی زبان سیکھنا ناگزیر ہے- اس کی یقیناً ضرورت ہے کہ بعض اُستادوں کو انگریزی کی مہارت حاصل ہو لیکن بہر حال عوام کی تعلیم ان کی زبان ہی میں ممکن ہے - وہ لوگ جو عوام کو تعلیم دینے کی غرض سے مقرر کئے جائیں ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ عوام کی زبان میں اظہار خیال کر سکیں تاکہ اس طرح سے مغربی اور مشرقی علوم کے امتزاج کی شکل پیدا ہوسکے - اگر یہ اساتذہ مشرقی کلاسک پر حاوی ہوں اور مشرقی نقطۂ نظر رکھتے ہوں تو وہ دراصل اُردو کے جدید ادب کو پیدا کر سکتے ہیں جو اہل مغرب اور اہل مشرق کے باہمی میل جول کے باعث جنم لے گا —

میرے ایک پرانے شاگرد استین کار (Stein Karr) نے جو کلکتہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہیں ' جلسۂ تقسیم اسناد کے موقع پر تقریر کرتے ہوے یونیورسٹی سنڈیکیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوے کہا تھا کہ اس میں

کوئی هرج نہیں کہ ایک چوتھی یونیورسٹی هندوستان کے کسی بڑے شہر میں قایم کی جاے اور لاهور کی مشرقی جامعہ کے مجوزہ لائحۂ عمل کو اختیار کیا جے۔ آپ نے هندوستان کے همدرد کی حیثیت سے یہ الفاظ فرماے * "اس کی بظاهر کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ سنسکرت میں لوگ ڈاکٹر کی ڈگری حاصل نہ کریں، عربی میں تکمیل کی سند نہ پائیں اور هندی میں بی۔اے نہ کرسکیں۔ ان اسند کی بھی وهی قدر و قیمت هے جو انگریزی کی هے اور حقیقت یہ هے کہ هندوستانیوں کے نزدیک ان زبانوں کی انگریزی سے زیادہ اهمیت هے۔ یہ ایک خیال خام هے کہ انگریزی کبھی بھی سارے هندوستان کی مشترک زبان هوسکے گی۔ جس طرح مغلوں کی عمل داری کے ساتھ فارسی مٹ گئی ‡ کسے معلوم کہ انگریزی کا بھی یہی حشر نہیں هونے والا هے"۔

لاهور میں جو مشرقی جامعہ قایم کی گئی هے اسے خاطر خواہ کامیابی

---

* انڈین میل مورخہ ۹ اپریل سنہ ۱۸۶۹ ء۔

† عربی کے ذکر پر مجھے یاد آیا کہ مسٹر ڈاول نے جو میرٹھ کے حلقے کے ناظر تعلیمات هیں، حکومت کے ایما پر ایک "عربی اردو" لغت تیار کرانا شروع کی هے۔ یونیورسٹی کے طلبہ جو امتحانات کی تیاری کرتے هیں انہیں اس لغت سے بہت مدد ملے گی اور ان کے علاوہ هر هندوستانی اور هر مسلمان اس سے استفادہ کرسکے گا۔

‡ میرے خیال میں یہ دعوی پورے طور پر صحیح نہیں هے اس لئے کہ فارسی زبان هندوستان سے بالکل مٹ نہیں گئی۔ هاں فارسی میں لوگ گفتگو نہیں کرتے لیکن اب بھی فارسی میں لوگ اسی طرح هندوستان میں لکھتے هیں جیسے یورپ میں لاطینی میں۔

ہو رہی ہے * - پنجاب ایک بڑا صوبہ ہے جس کی آبادی ایک کروڑ ۷۰ لاکھ نفوس پر مشتمل ہے - مہاراجہ کشمیر نے اس جامعہ کے قیام کے لئے ایک لاکھ روپے کی رقم عطا کی ہے - کشمیر وہی خطہ ہے جس کے متعلق طامس مور نے لکھا ہے " کون ہے جس نے وادی کشمیر کے گلابوں کا ذکر نہیں سنا جو دنیا میں اپنی نظیر آپ ہیں اور کون ہے جس نے وہاں کے مندروں، غاروں، اور چشموں کا ذکر نہیں سنا ہے جو ایسے صاف و شفاف ہوتے ہیں جیسے عاشق کی آنکھیں جس کے دل میں معشوق کی صورت بسی ہوتی ہے (لالہ رخ) - ہمیں پوری توقع ہے کہ پنجاب کے دوسرے والیان ملک مہاراجہ کشمیر کی تقلید کریں گے - مہاراجہ پٹیالہ نے بھی اس جامعہ کے قیام و استحکام کے لئے ۵۰ ہزار روپیہ کا عطیہ دیا ہے - راجہ جھند اور راجہ نابھا دونوں نے گیارہ گیارہ ہزار روپیہ دیا ہے - سردار صاحب کالسیا نے تین ہزار روپیہ دیا ہے - راجہ بلسپور اور رئیس ناھن دونوں نے پانچ پانچ سو روپے دیے ہیں - مہاراجہ کپورتھلہ نے دو ہزار روپے سالانہ دینے کا وعدہ کیا تھا لیکن اب انہوں اس رقم کے علاوہ بھی دس ہزار روپے اور دیے ہیں، اور دوسرے والیان ملک نے بھی اپنا سالانہ چندہ بہ نسبت پہلے کے دو چند کردیا ہے اور بعضوں نے بڑی بڑی رقموں کا وعدہ کیا ہے - سب والیان ملک محسوس کر رہے ہیں کہ اس جامعہ کے قیام سے اہل ہند کی روشن خیالی میں اضافہ ہوگا - لاہور کے باشندوں نے بھی

---

* اس طرح ڈاکٹر لیٹنز کی خواھشیں پوری ہوں گی - موصوف آج کل دردستان کشمیر اور تبت ادنی کے متعلق تصانیف لکھنے میں مصروف ہیں - آپ ان علاقوں کی السنہ کے متعلق تحقیق کر رہے ہیں جن کے متعلق کسی نے پہلے کوئی کام نہیں کیا - آپ کا خیال ہے کہ یہ السنہ سنسکرت سے نکلی ہیں —

اس جامعہ کے ساتھ اپنی ہمدردی صرف زبانی جمع خرچ سے نہیں کی ہے بلکہ وہ عملی طور پر چندے میں شریک ہو رہے ہیں اور اپنی دلچسپی کا اظہار کر رہے ہیں *-

یہ جامعہ معلوم ہوتا ہے اب باقاعدہ قایم ہو گئی ہے - چنانچہ "اودھ اخبار" کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس یونیورسٹی کی ایک کمیٹی بنادی گئی ہے جس میں ہندوستانی اور یورپین دونوں شریک ہیں - اس کمیٹی میں ڈاکٹر لیٹنز بہ حیثیت رکن ہیں - اس یونیورسٹی کی تحریک کے حامیوں کا ایک جلسہ بتاریخ ۹ ستمبر لاہور میں منعقد ہوا تھا تاکہ اس پر غور کیا جاے کہ لاہور کے گورنمنٹ کالج کی مجوزہ یونیورسٹی کے نصاب کے متعلق ہمدردی کیونکر حاصل کی جاے اور اس کالج میں مشرقی علوم کی ہمت افزائی کے لئے کیا تدابیر اختیار کی جائیں - چنانچہ فیصلہ یہ ہوا کہ اس کالج کو سولہ سو روپے سالانہ کی رقم دی جاے تاکہ وہاں اردو اور فارسی کی تعلیم کا انتظام کیا جاے اور ان دونوں زبانوں کا شوق پیدا کرنے کی غرض سے طلبہ کو وظائف دیے جائیں بشرطیکہ حکومت اس رقم کی دگنی رقم اسی مقصد کے لئے کالج کو دینا منظور کرے -

صوبے کے مرکزی مقامات میں عجائب خانوں کے قایم کرنے کی جو تجویز تھی اس کے موافق لاہور میں ایک بڑا عجائب خانہ قایم کیا گیا ہے + گورنر جنرل بہادر نے آثار قدیمہ کے متعلق ایک رپورٹ مرتب کرنے کی تجویز منظور کی ہے جس میں ہندوستان کے مختلف صوبوں کی ایسی

---

* صرف پچھلے جون کے مہینے میں لاہور کی پبلک نے نو سو گیارہ روپے چندے کے لئے جمع کئے - ہوم ورڈ میل مورخہ ۱۴ ستمبر سنہ ۱۸۶۸ ع -

+ اخبار عالم مورخہ ۲۱ نومبر ۱۸۶۷ ع -

عمارتوں کا حال جو تاریخی اهمیت رکھتی هیں' تفصیل سے درج هوگا۔ آثار قدیمه میں بعض تین هزار سال پرانے هیں حکومت اس امر کی کوشش کرے گی که ان کی حفاظت کا انتظام کیا جاے۔ ان آثار کی تصاویر بنائی جائیں گی اور ان کے بلاک تیار کراے جائیں گے —

کپتن هالرائڈ (Holroyd) جو ابھی حال میں پنجاب کے ناظم تعلیمات مقرر هوے هیں دس سال تک به حیثیت ناظر مدارس کام انجام دے چکے هیں۔ میجر فلر (Fuller) کی غیر موجودگی میں وہ نظامت کا کام کرچکے تھے۔ دراصل موصوف سے زیادہ اهل اس خدمت کے لئے اور کوئی نہیں مل سکتا۔ اپنے پیشرو کی رسم کے مطابق آپ نے ۲۵ مارچ کو دهلی کے دیسی مدارس کے طلبه کو تقسیم انعامات کے لئے ایک دربار منعقد کیا۔ اس موقع پر آپ نے هندوستانی میں نہایت روانی کے ساتھ ایک تقریر کی اور دوران تقریر میں میجر فلر اور مسٹر هتن کے انتقال پر ملال کا خاص طور پر ذکر کیا جو دهلی کالج کے ڈائرکٹر تھے *۔

پنجاب کی طرح صوبجات شمالی و مغربي کے باشندوں کي بھی یه تمنا هے که دهلی میں ایک مشرقی یونیورسٹی کی بنا ڈالی جاے جہاں کے شاهی محلات آج ویران پڑے هوے هیں -

خیال یه هے که اس جامعه میں اردو میں تعلیم دی جاے گی اور اس زبان کی تحقیق کا خاص انتظام کیا جاے گا اور اس کو اس لایق بنانے کی کوشش کی جاے گی که وہ قدیم زبانوں کی جگه لے سکے۔ جدید تصانیف اور ترجموں کے ذریعے سے اس زبان کے خزانے کو مالا مال کیا جاے گا اور ایک

* هوم ورڈ میل مورخه ۴ مئی سنه ۱۸۶۸ ع -

نئے ہندی یورپی ادب کی بنا پڑے گی - آج کل صوبۂ دھلی کے لفٹننٹ گورنر سر ڈبلو میور ھیں جو خود ایک مشہور مستشرق ھیں جن کی تصانیف ھندوستان اور یورپ میں قدر و منزلت کی نظر سے دیکھی جاتی ھیں - ھمیں پوری اُمید ھے کہ موصوف اس تجویز کے ساتھہ اتفاق کریں گے اور دھلی میں اس ھندی یونیورسٹی کے قیام کو ممکن بنانے میں ھر ممکن کوشش کریں گے —

کلکتہ ، مدراس اور بمبئی کی تینوں صوبجاتی' سرکاری ' یونیورسٹیاں عافیت کے ساتھہ اپنے کام میں منہمک ھیں- نومبر سنہ ۱۸۶۷ ع کے آخری ھفتوں میں بمبئی یونیورسٹی کے امتحانات میں تقریباً پانچ سو طلبہ نے شرکت کی - آبادی کو دیکھتے ھوے یہ تعداد بہت کافی ھے (*) - کلکتہ یونیورسٹی کے امتحانات میں شرکت کرنے والے طلبہ کی تعداد پندرہ سو نو ھے - (۰) یہ یونیورسٹی گیارہ سال سے قایم ھے - اس عرصے میں بارہ ھزار ایک سو اکسٹھہ طلبہ نے امتحانات میں شرکت کی - اس تعداد میں بنگالی' شمالی ھند اور سیلون کے طلبہ شامل سمجھنے چاھئیں (‡) - ان میں سے ایک ھزار دوسو

(*) پچھلے سال امتحان میں شرکت کرنے والے طلبہ کی تعداد ۴۴۰ تھی —

(۰) گزشتہ سال امتحان میں شرکت کرنے والے طلبہ کی تعداد تیرہ سو پچاس تھی —

(‡) " اخبار عالم " مورخہ ۱۲ جنوری سنہ ۱۸۶۸ ع میں درج ھے کہ جن طلبہ نے امتیاز حاصل کیا ان میں یونیورسٹی کالج کا ایک طالب علم لال بہوری سنگھہ خاص طور پر قابل ذکر ھے - اس طالب علم نے میرٹھہ کے مشن اسکول میں تعلیم پائی ھے اور وہ " اخبار عالم " کے لئے انگریزی مضامین کا اردو میں ترجمہ کیا کرتا تھا - اس نوجوان ھندو کی ذھانت اور ادبی ذوق اعلی درجہ کا ھے —

اٹھائیس طلبہ ہندو تھے ' ایک سو تین عیسائی تھے' اٹھاون مسلمان اور ایک سو بیس چھوٹے چھوٹے مذہبی فرقوں سے تعلق رکھنے والے تھے (*) - یہ سب طلبہ ہندوستانی زبان سے واقف تھے لیکن ان میں سے بعض نے اردو' بعض نے ہندی (+) ' بعض نے بنگالی' چند نے فارسی' عربی یا سنسکرت ' بعض نے انگریزی اور بعض نے لاطینی کو اختیاری مضمون کی حیثیت سے لیا تھا - اس سال بی اے کی ڈگری کے لئے دو سو گیارہ طلبہ امتحان میں شریک ہوے حالانکہ سال گزشتہ صرف ایک سو اکتالیس شریک ہوے تھے —

۹ - دسمبر سنہ ۱۸۶۷ ء کو بنارس میں جو یونیورسٹی کا امتحان ہوا اس میں طلبہ کو انگریزی میں مضمون لکھنے کے لئے حسب ذیل موضوع دیے گئے جو یقیناً نوجوان ہندوستانیوں کے لئے اس لئے اور بھی زیادہ دشوار ہونے چاهئیں کہ انگریزی ان کی مادری زبان نہیں ہے (+) - "خدا نے دیہات پیدا کیا اور انسان نے شہر بنایا " (++) - "کیا یہ درست ہے کہ اگر کسی گناہ کے برے نتائج نہ ظاہر ہوں تو وہ گناہ نہیں ہے " —

سر استفورد نارتھ کوت نے اپنی جیب خاص سے کلکتہ یونیورسٹی کو دو ہزار روپے کا عطیہ دیا ہے تاکہ اس سے ان طلبہ کو وظیفہ دیا جاے جو بنگال ' صوبۂ شمالی و مغربی ' پنجاب اور اودہ کے علاقوں میں داخلۂ یونیورسٹی سنہ ۱۸۶۹ ع کے امتحان میں اعلیٰ درجہ پر کامیاب ہوں —

(*) فرینڈ آف انڈیا (ہوم ورڈ میل مورخہ ۱۳ جنوری سنہ ۱۸۶۸ ع) —

(+) اس سال کلکتہ یونیورسٹی کے اردو کے ممتحن ڈاکٹر ایچ بلو کمان اور ہندی کے بابو کرشن کمال بھٹا چارجی مقرر ہوے ہیں —

(+) انڈین میل مورخہ ۲۰ جنوری سنہ ۱۸۶۸ ع —

(++) ایضاً —

سرجان لارنس به حیثیت وائسرا ے هندوستان میں بهت هردلعزیز تهے - ان کے جانے کے بعد لارڈ میو وائسراے مقرر هوے هیں - همیں پوري توقع هے که موصوف بهی دیسی لوگوں میں هردلعزیزی حاصل کرلیں گے - آپ نے پهلا کام یه کیا هے که اپنی مجلس عامله سے اس کی منظوری حاصل کی هے که هر سال نو هندوستانی طلبه بغرض تعلیم انگلستان بهیجے جایا کریں اور ان کی تعلیم کے جمله اخراجات حکومت برداشت کرے - یه طلبه انگلستان کی یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کریں گے اور اپنے دوران قیام میں سول سروس یا کسی اور حکومتی شعبے کے لیے تیاری کریں گے - هر صوبے سے دو طلبه منتخب کئے جایا کریں گے - صوبۂ شمال مغربی سے ایک اور ایک سال چهوڑ کر پنجاب سے ایک طالب علم لیا جاے گا - اسی طرح ایک صوبۂ اودھ سے اور ایک صوبۂ متوسط سے - چهه طالب علموں کو حکومت خود چنا کرے گي - باقی تین مقابلے سے لئے جائیں گے - یه تینوں پریزیڈنسیوں کے طلبه هوں گے (*) —

' اخبار عالم ' مورخه ۶ فروري سنه ۱۸۶۸ ع میں مختلف صوبوں کی تعلیمي حالت کے متعلق تعداد و شمار دیے هیں (+) - هندوستان کي سنه ۱۸۶۵ ع کی تعلیمی حالت حسب ذیل هے —

(*) هوم ورڈ میل ' مورخه ۱۰ اگست سنه ۱۸۶۸ ع —

(+) اسی نمبر میں یه بهی هے که مهاراجه جے پور نے صنعت و حرفت کا ایک مدرسه قایم کیا هے - اس کے لئے ضروری کتابیں اور سائنٹفک آلات یورپ سے منگائے جائیں گے - انڈین پبلک اوپینین میں هے که اسی قسم کے چار اور مدرسے هندوستان کے مختلف حصوں میں قایم هونے والے هیں - ان میں سے ایک لاهور میں هو گا —

بنگال (*) : ۲۷۰۴ مدارس ' ۱۱۷۶۴۴ طلبہ ' ۲۲۰ مدارس نسواں ' ۵۷۱۲ طالبات

صوبہ شمال مغربی: ۹۱۸۴ مدارس' ۱۹۹۲۶۹ طلبہ' ۵۷۴ مدارس نسواں ۱۰۷۰۳ طالبات

پنجاب : ۲۹۶۵ مدارس' ۱۰۱۹۹۳ طلبہ' ۱۰۲۹ مدارس نسواں' ۱۹۵۶۱ طالبات

مدراس (+) : ۱۲۴۵ مدارس' ۳۸۲۵۵ طلبہ' ۱۳۹ مدارس نسواں' ۳۳۱۵ طالبات

بمبئی : ۱۴۱۹ مدارس' ۹۹۸۵۶ طلبہ' ۶۵ مدارس نسواں' ۲۴۳۶ طالبات

اودھ : ۱۶۸ مدارس' ۱۰۰۷۵ طلبہ' ۱۸ مدارس نسواں' ۴۰۶ طالبات

صوبہ متوسط: ۱۴۳۶ مدارس' ۴۶۵۸۵ طلبہ' ۹۲ مدارس نسواں' ۲۳۶۱ طالبات

میسور : ۸۰ مدارس ۵۵۸۳ طلبہ' ۷ مدارس نسواں' (‡)

کل تعداد: ۱۹۲۰۱ مدارس' ۶۱۹۳۶۰ طلبہ' ۲۱۴۴ مدارس نسواں' ۴۴۵۵۴ طالبات

گزشتہ جولائي میں سر ولیم میور(Muir) کھایوں کے پہاڑی علاقے میں تشریف لے گئے تھے - آپ نے اس علاقے کے ان مدارس کا معائنہ کیا جو لندن کے مختلف مشنوں کے خرچ پر چلائے جاتے ھیں - آپ نے مدارس میں انعامات تقسیم کیے - ان درسگاھوں میں ایک ھندوستانی مدرسہ

(*) انگریزی اخبار " اکسپرس " میں جو اعداد و شمار شائع ہوئے ھیں وہ ان سے مختلف ھیں - غالباً وہ سنہ ۱۸۶۶ ع کے ھوں گے - اس کے مطابق مدارس کی تعداد دو ھزار نو سو آٹھہ ھے اور طلبہ کی تعداد ایک لاکھہ اکیس ھزار چارسو اسی ھے —

(+) سنہ ۱۸۶۷ ع کی سرکاری رپورٹ دیکھنے سے معلوم ھوتا ھے کہ صوبۂ مدراس میں تعلیم کو خوب ترقی ھورھی ھے - مارچ کے آخر میں وھاں مدارس کی تعداد ایک ھزار تین سو چھیاسی تھی اور طلبہ کی تعداد ۵۱ ھزار ایک سو آٹھہ تھی - ان میں سے ۳۸ ھزار چھہ سو اٹھاسی ھندو تھے ' ایک ھزار آٹھہ سو بائیس مسلمان تھے اور باقی میں یورپین ' یوریشین اور دیسی عیسائی شامل تھے —

(‡) میسور کی طالبات کی تعداد معلوم نہیں —

ہے ' ایک انگریزی اسکول ہے جس میں صرف لڑکوں کو تعلیم دی جاتی ہے ' ایک میں صرف لڑکیوں کی تعلیم کا انتظام کیا جاتا ہے اور ایک مدرسہ ہے جس میں ہر اتوار کے دن مسیحی عقاید کی تعلیم دی جاتی ہے - ہندوستانی مدرسے میں ۱۲۵ طالبہ ہیں اور انگریزی اسکول میں سو ہیں - سرولیم میور جب ہندوستانی مدرسے میں تشریف لے گئے تو اس موقع پر آپ نے ہندوستانی (اردو) میں تقریر کی اور ہندوستانی طلبہ کو بعض نصیحتیں کیں اور بتلایا کہ انگریزی زبان اور مغربی لبرل علوم کے سیکھنے سے ان کو کیا کیا فوائد حاصل ہوں گے —

اہل یورپ کی آمد سے پہلے ہندوستان میں ایشیا کے دوسرے ممالک کی طرح تعلیم نسوان کی طرف مطلق کوئی توجہ نہیں کی جاتی تھی - در اصل تعلیم نسوان کی طرف سے بے توجہی کا ایک نتیجہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اہل یورپ کے مقابلے میں اہل مشرق ہر اعتبار سے پست ہوتے ہیں - جیسا کہ ٹینیسن نے کہا ہے " جو چیز طبقۂ نسوان کے لیے فائدہ بخش ہے وہ یقیناً مرد کے فلاح و بہبود کا باعث ہوگی ' عورت اور مرد دونوں قعر مذلت میں بھی ساتھ گرتے ہیں اور ساتھ ہی دیوتاؤں کی سی عزت حاصل کرتے ہیں - آزاد بھی ساتھ ہوتے ہیں اور غلام بھی ساتھ ہوتے ہیں " —

در اصل حکومت نے تعلیم نسوان کی جو ہمت افزائی شروع کی ہے اس سے ہندوستانیوں کا فائدہ ہے - حکومت کی طرف سے اس کا انتظام کیا گیا ہے کہ تقاریر کے ذریعے تعلیم نسوان کی تحریک کو فروغ دیا جائے - چنانچہ سنہ ۱۸۵۱ ع سے جب سے کہ حکومت نے اس جانب توجہ کی ہے ' عورتوں میں تعلیم کا رواج برابر بڑھتا جاتا ہے - حکومت اپنے خرچ

سے معلمات کے لئے نارمل اسکول قایم کرا رهی هے اور اس وقت کلکته، بمبئی اور مدراس کے صوبوں میں متعدد نارمل اسکول موجود هیں *۔

باشندگان بمبئی تعلیم نسوان کے باب میں به نسبت اور دوسرے هندوستانیوں کے زیادہ پیش پیش رهے هیں اور ان کی ذهنی اور اخلاقی اصلاح کے لئے برابر کوشاں رهے هیں۔ چنانچه ان کي همدردی کا عملي ثبوت یه هے که گزشته سترہ سال میں انهوں نے اپنے بل بوتے پر ۶۶ اسکول لڑکیوں کی تعلیم کے لئے قایم کئے هیں جن میں اس وقت تقریباً چار هزار لڑکیاں تعلیم حاصل کر رهی هیں†۔ یه بات بھی اس ضمن میں قابل لحاظ هے که تعلیم اور خیرات کے کاموں میں بمبئی کے باشندوں میں پارسی لوگ سب سے زیدہ حصه لیتے هیں اور بہت سے مدرسوں کے اخراجات کا انحصار تمامتر انهیں پر هے۔

لیکن "اخبار عالم" کے مدیر کا خیال هے که بنگال میں، به نسبت هندوستان کے اور دوسرے علاقوں کے تعلیم نسوان کو زیادہ فروغ هو رها هے ‡۔ اپنے اس دعوے کی تائید میں موصوف نے آٹھ ایسی عورتوں کے نام گنائے

* ناگپور میں بھی ایک نارمل اسکول هے جہاں دیسی معلمات کو تیار کیا جاتا هے۔ اس وقت ۲۵ هندوستانی لڑکیاں یہاں تعلیم پا رهی هیں۔ ایک مسلمان خاتون نے جو حاجی بھی هیں، اسی شهر میں مسلمان لڑکیوں کے لئے ایک مدرسه قایم کیا هے۔ موصوفه نہایت روشن خیال اور تعلیم یافته هیں اور اردو اور مرهٹی لکھ پڑھ سکتی هیں۔

† اخبار عالم۔ ۱۹ مارچ سنه ۱۸۶۸ع۔

‡ اخبار عالم مورخه ۲۳ - جولائی سنه ۱۸۶۸ ع

هیں جن کي تصانیف کو خاص شہرت حاصل ہوئی ہے - یہ سب کی سب هندو عورتیں هیں - ان میں سے ایک پٹنه کي هیں ایک بسنت پور کی هیں اور باقی چهه کلکته کي هیں* —

جسٹس فیر نے بیتهون سوسائٹی کے جلسے میں گزشته سال تعلیم نسوان کے موضوع پر خطبه پڑها تها - آپ نے اس بات پر خاص طور پر زور دیا که عورتوں کو خود عورتیں تعلیم دیں اس لئے که ایسے بهت سے مدارس هیں جہاں لڑکیاں تعلیم پاتی هیں اور ان کے منتظم برهمن لوگ هوتے هیں - اس قباحت کو دور کرنے کی بس یہی ایک صورت هے که معلمات کے لئے نارمل اسکول قایم کئے جائیں - یہاں کی فارغ التحصیل معلمات کے هاتهه میں لڑکیوں کی تعلیم دی جا سکتی هے -

صوبهٔ شمال مغربی کے ناظم تعلیمات مسٹر کیمپسن [Kempson] کي پر جوش مساعي کی بدولت وهاں بهی تعلیم نسوان کو برابر ترقی هو رهی هے - اس وقت صرف بریلی میں لڑکیوں کے پندره مدرسے هیں - ان میں دوسو چهیاسی لڑکیاں تعلیم پا رهی هیں - اس امر کا بهي فیصله هو گیا هے که مسلمان لڑکیوں کو اردو میں تعلیم دی جائے گي اور هندو لڑکیوں کو هندی میں - اردو اور هندي دونوں هندوستانی کي شاخیں هیں - دونوں کے درمیان بس طرز تحریر کا فرق هے - یه فرق هندوستانیوں کے مذهبی اختلات پر مبنی هے - جس کي نسبت میں بارها تذکره کر چکا هوں - ان مدرسوں میں استانیاں کام کرتی هیں اور ان کے کام کی نگرانی بهی عورتیں کرتی هیں - هندوستانی

* هوم ورڈ میل مورخه ۱۳ - جنوری سنه ۱۸۶۸ع -

استانیوں کو، چاھے وہ ھندو ھوں یا مسلمان، یه بات پسند نہیں که مرد لوگ اور وہ بھی یورپین معائنے کے لئے ان کے مدرسوں میں آئیں - چنانچه دیکھا گیا ھے که جب کوئی ناظران کے مدرسے کے معائنے کے لئے آتا ھے تو انہیں بہت ناگوار ھوتا ھے اور بعض اوقات وہ اپنی بے بسی پر آبدیدہ ھوجاتی ھیں - چنانچه بنگلور کی مثال موجود ھے - یہاں کے نارمل اسکول کے معائنے کے لئے جو ابھی حال ھی میں قایم ھوا ھے مسٹر رائس، ناظر تعلیمات میسور گئے تھے - موصوف نے اپنے معائنے کے وقت استانیوں اور طالبات کو ھر طرح سے اطمینان دلایا اور لڑکیوں کے لئے مٹھائی تقسیم کرائی جو انہیں بہت مرغوب ھوتی ھے* —

مس کارپنٹر نے اپنی کتاب "ھندوستان میں چھه ماہ"‡ میں تعلیم نسوان کے متعلق بعض دل چسپ تفصیلات دی ھیں جنہیں پڑھ کر ھر اس شخص کو خوشی ھوگی جو ھندوستان کے معاملات کے ساتھه دل چسپی رکھتا ھے - موصوفه نے بھی معلمات کی نہایت زوردار حمایت کی ھے اور لکھا ھے که نوجوان لڑکیوں کی تعلیم بغیر اس کے نہیں ھوسکتی جب تک نئے نارمل اسکول معلمات کی تعلیم کے لئے نه قایم کئے جائیں - چنانچه موصوفه کی اس حمایت نیز بعض سر بر آوردہ

---

* بنگلور ھیرالڈ، مورخه ۸- اپریل سنه ۱۸۶۸ع (دی ٹائمز آف انڈیا) -

‡ اس کتاب پر میں نے مجلهٔ مشرقی میں ایک مضمون بھی لکھا ھے جو ابھی شایع ھوا ھے -

ھندوستانیوں کی کوشش کا یہ نتیجہ نکلا کہ حکومت نے خاص اس غرض کے لئے بارہ ھزار روپے سالانہ کی رقم منظور کی ھے تاکہ صوبوں کے صدر مقامات یعنی کلکتہ، مدراس اور بمبئی میں نارمل اسکول قایم کئے جائیں -

مس کارنپٹر ستمبر میں پھر ھندوستان تشریف لے گئی تویں تاکہ اس کام کی تکمیل کی کوشش کریں جس کی جانب حکومت نے بڑی توجہ مبذول کی ھے - پر جوش نو جوانوں کا ایک وفد ترتیب دیا گیا ھے تاکہ بمبئی پہنچنے پر ان کا استقبال کرے - موصوفہ کا ارادہ ھے کہ اپنا دورہ احمدآباد سے شروع کریں - جو گجرات کا قدیم دارالسلطنت ھے اور جہاں موصوفہ کا خیال ھے کہ ان کی تجاویز کو سب سے زیادہ کامیابی کی اُمید ھے - ھندوستانی عورتوں کی زندگی کو سدھارنے اور اسے بہتر بنانے کے لئے مس کارنپٹر جس خلوص کا اظہار کر رھی ھیں وہ واقعی قابل داد ھے - اس کے ساتھ یہ بڑی واضح رھے کہ موصوفہ مذھبی معاملات میں مطلق کسی قسم کا دخل دینا نہیں پسند کرتیں - یہ کام انھوں نے مشنری لوگوں پر چھوڑ دیا ھے جن کا فرض ھے کہ اپنی تعلیم کے ذریعے ھندوستانیوں کے دلوں کو رام کریں اور مغربی تہذیب و تمدن کے دروازوں کو ان کے لئے کھول دیں -

مسز آر کلارک کے خط سے معلوم ھوا کہ امرتسر میں تعلیم نسوان کی بتدریج ترقی ھو رھی ھے - موصوفہ نے سنہ ۱۸۶۵ ع میں اس شہر میں زنانہ اسکول قایم کیا تھا - ابھی حال میں آپ نے عورتوں کے لئے ایک نارمل اسکول کی بنا ڈالی ھے تاکہ مدارس ابتدائی میں تعلیم ختم

کر چکنے کے بعد ان کے لئے تعلیم کا انتظام ہوجائے جو آیندہ پڑھانے کا کام کرنا چاہتی ہیں۔ مدارس ابتدائی میں جغرافیہ، تاریخ ہند، ریاضی اور صرف و نحو کی تعلیم دی جاتی ہے - املا کی مشق کرائی جاتی ہے : گانے اور کشیدہ کا کام سکھایا جاتا ہے - امرتسر کے مدارس ابتدائی کے طلبہ کی تعداد اس وقت پچیس ہے - مسز کلارک لکھتی ہیں کہ "یہ تعداد بہت حقیر معلوم ہوتی ہے لیکن یہ لحاظ رہے کہ ابھی کام کی ابتدا ہوئی ہے" -

تعلیم یافتہ ہندوستانیوں میں ایسے لوگ موجود ہیں جو موجودہ سرکاری نصاب تعلیم کو اچھا نہیں سمجھتے - چنانچہ ۱۸ اگست سنہ ۱۸۶۸ ع کے "اودھ اخبار" میں اس کے خلاف ایک طویل مضمون درج ہے - اس مضمون میں صراحت کے ساتھ اس امر پر زور دیا گیا ہے کہ ہندوستانی اور یورپین نقطہ ہائے نظر میں زمین آسمان کا فرق ہے ہندوستانیوں کو تعلیم دینے کا ایسا طریقہ اختیار کرنا چاہئے کہ جس کی وجہ سے خود ان کا نقطۂ نظر بالکل پس پشت نہ ڈالدیا جائے - اس مضمون کے الفاظ یہ ہیں! " دراصل ہر ملک کی ذہنی صلاحیت برابر ہوتی ہے لیکن مختلف ملکوں کے باشندوں کے خیالات میں اختلاف ہوتا ہے اور ان خیالات کو ظاہر کرنے کے طریقے جداگانہ ہوا کرتے ہیں - مثلاً اہل مشرق اہل مغرب کی طرح، اپنے خیالات کو سیدھے سادے الفاظ میں ظاہر کرنا پسند نہیں کرتے بلکہ وہ تشبیہ و استعارہ کثرت سے استعمال کرنے کے عادی ہوتے ہیں - اگر اہل یورپ کے خیالات آب و رنگ اور مبالغے کے ساتھ ان کے سامنے پیش نہ کئے جائیں تو وہ

انہیں قبول کرنے میں پس و پیش کریں گے - چنانچہ ہندوستانیوں کو تعلیم دینے میں اس امر کا خاص طور پر لحاظ رکھنا ضروری ہے - اگر تاریخ ہندوستان میں صرف عہدوار اور بڑے بڑے لوگوں کے ناموں کا ذکر ہوگا جیسا کہ اکثر ابتدائی کتابوں میں ہوتا ہے تو اس سے کچھہ حاصل نہ ہوگا بلکہ ضرورت اس کی ہے کہ کتاب کا طرز تحریر ایسا ہو جو جاذب توجہ اور دل کش ہو تاکہ ہندوستانی ذہنیت کو اپیل کرسکے -

ٹیگور کے ادبی مضامین

از

(بلدیو نشی سمر ودیا النکار صاحب)

احساس حسن

عمر کے پہلے دور میں " برھم چریہ " (تجرد کی زندگی) کے ذریعے زندگی کو باقاعدگی اور ریاضت سے نشو و نما دینا چاھئے - اگر ھندوستان کی اس پرانی نصیحت پر عمل کیا جائے تو بعض لوگوں کے دلوں میں یہ خیال پیدا ھوگا کہ یہ تو بڑی کٹھن منزل ھے اس کی بدولت انسان یا تو بڑا شہ زور بن سکتا ھے یا نفسانی قیود سے آزاد ھوکر کوئی بڑا مہا تما بن سکتا ھے - لیکن اس ریاضت میں لذت کی گنجائش کہاں ھے ' ادبیات ' مصوری اور موسیقی کہاں چلی گئی ؟ جب ھر اعتبار سے انسانی ترقی کا خیال رکھا جائے تو حسن کی بحث کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا -

یہ درست ھے حسن لازمی ھے - ریاضت کا منشا خود کشی ھوھی نہیں سکتا - ریاضت کا منشا تو روح کی نشو و نما ھے - حقیقت میں طالب علمی کے زمانے میں برھم چریہ (تجردانہ زندگی) کو قایم رکھنا خشک اور لاحاصل ریاضت نہیں ھے - کسان کسی کھیت کو بنجر زمین بنانے

کے لئے سر مر کر محنت نہیں کرتا بلکہ وہ جب ہل سے کھیت کی زمین کھود ڈالتا ھے' سہاگے سے ڈھیلوں کو کچل کر زمین سطح کردیتا ھے اور کُھرپی سے گھاس اور چھوٹے چھوٹے پودوں کو اُکھاڑ کر کھیت کو بالکل صاف کر دیتا ھے تو ممکن ھے اناڑی لوگ یہ خیال کریں کہ زمین پر ظلم ہو رہا ھے - لیکن پھلوں کی نشو و نما اسی طرح کرنی پڑتی ھے - اسی طرح صحیح طور پر لذت کا حقدار ہونے کے لئے ابتدا میں کتنی کھیتی کی ضرورت ہوتی ھے ' لذت کے راستے ھی میں گمراہ کرنے والی بہت سی رکاوٹیں ھیں - جو شخص ان تمام مصائب سے بچکر معراج کمال پر پہنچتا ھے با قاعدگی اور ریاضت کی اسی کو زیادہ ضرورت پڑتی ھے - لذت کے لئے ھی اس تلخی کو گوارا کرنا پڑتا ھے -

اِنسان کی یہ بد قسمتی ھے کہ اس کا مطمح نظر اکثر اسباب حصول میں دب جاتا ھے - وہ گانا سیکھنا چاھتا ھے' اُستادی سیکھ بیٹھتا ھے - دولت مند ہونا چاھتا ھے لیکن روپیہ جمع کر کے قابل رحم ہوجاتا ھے - ملک کی اصلاح چاھتا ھے مگر کمیٹیوں میں صرف رزولیوشن پاس کر کے خود کو سبکدوش سمجھنے لگتا ھے —

اسی طرح ھم دیکھتے ھیں کہ باقاعدگی اور ریاضت اصلی مقصد کی جگہ لے لیتے ھیں - جو لوگ باقاعدگی اور ریاضت ھی کو منزل مقصود اور ثواب سمجھتے ھیں وہ ان کی ھوس میں لوبھی بن بیٹھتے ھیں اور یہ باقاعدگی اور ریاضت کا لالچ انسان کے چھہ * دشمنوں کے علاوہ ساتواں دشمن بن جاتا ھے —

* ھندو شاستروں کے مطابق انسان کے چھہ دشمن ھیں - کام (جذبات بہیمی) کرود (غصہ) لوبھہ (لالچ) موہ (دنیا سے دلبستگی) اھنکار (غرور) متسر (حسد) -

یہ انسان کی حماقت کی تعریف ہے کہ وہ جب کسی چیز کے جمع کرنے پر آتا ہے تو دم لینا نہیں چاہتا - ولایت کے بعض لوگوں کے متعلق یہ سنا جاتا ہے کہ وہ دیوانوں کی طرح ماک ماک کے ڈاک کے مستعملہ ٹکٹ جمع کیا کرتے ہیں اور اس کام کے لیے تلاش اور خرچ کرنے میں ذرا کمی نہیں کرتے - اسی طرح بعض لوگ جمع کرنے کے نشے میں دیوانے بن کر چینی برتن اور پرانے جوتوں کے اکٹھا کرنے میں لگے ہوے ہیں - منطقۂ شمالی میں جاکر وہاں عین وسط میں جھنڈا گاڑ دینا یہ بھی ان کی اسی قسم کی حرکت ہے - وہاں برفانی طبقوں کے سوا اور کچھ نہیں لیکن دل نہیں مانتا کہ آگے نہ بڑھے - وہ منطقے کے وسطی حصے کے جس قدر قریب جا پہنچتا ہے اسی مقدار سے اسے نشہ چڑھا ہوتا ہے - جو شخص پہاڑ پر جتنے فٹ اونچا چڑھا ہے وہ اُسی کو ایک کمال سمجھتا ہے - اس لا حاصل مقصد کے لیے بعض لوگ خود مرجاتے ہیں اور کتنے ہی مزدوروں کو اپنے ساتھ لے مرتے ہیں اور پھر بھی رکنا نہیں چاہتے —

فضول خرچی اور تکلیف جس قدر زیادہ ہوتی ہے بے معنی اور لاحاصل کامیابی کی عظمت بھی اتنی ہی بڑی معلوم ہوتی ہے - باقاعدگی اور ریاضت کا لالچ بھی تکالیف کی مقدار اور وسعت کے موافق خوشی محسوس کرتا ہے - اگر سخت بستر پر سونے سے ریاضت کی ابتدا کی جاے تو مٹی پر بچھونا بچھا کر ، پھر صرف کمل بچھا کر اور پھر کمل کو بھی چھوڑ کر بالکل مٹی پر سونے کا لالچ رفتہ رفتہ بڑھتا جاتا ہے - ریاضت کو مقصود بالذات سمجھ کر آخر خودکشی تک نوبت آجاتی ہے - اس کا منشا اس کے سوا کچھ نہیں کہ صرف زہد و تقویٰ کی طرف دنیا کو مائل کیا جاے گویا گلے کی پھانسی کو توڑنے کی کوشش میں اس پھانسی

کو اور تنگ کرکے مرنا ہے —

اس لیے اگر ریاضت ہی کو مقصد قرار دے لیا جاے تو سختیوں کا دباؤ اس قدر بڑھ جاے گا کہ فطرت میں سے حسن کا احساس بالکل مفقود ہوجاے گا - اس میں ذرہ برابر بھی شبہ نہیں ہے لیکن کمال ارتقا کے حصول کو مقصد بنا کر اگر ریاضت کی رفتار کو ٹھیک طور پر قابو میں رکھا جاے تو انسانیت کے اعضا میں سے کسی عضو کو بھی نقصان نہیں پہنچتا بلکہ وہ تندو مند ہوجاتے ہیں —

بات یہ ہے کہ ہر قسم کی بنیاد سخت ہوا کرتی ہے اگر وہ سخت نہ ہو تو بوجھ نہیں سہار سکتی - جو چیز کسی شکل کو اختیار کرتی ہے یا کسی چیز کو مُشکّل کرتی ہے وہ سخت ہی ہوتی ہے - انسان کا جسم کتنا ہی نرم کیوں نہ ہو اگر سخت ہڈیوں پر اُس کا تکاؤ نہ ہوتا تو وہ محض مضغۂ گوشت ہی ہوتا اور اس کی کوئی شکل نہ ہوتی - اسی طرح علم کی بنیاد بھی سخت ہے اور مسرت کی بنیاد بھی سخت اگر علم کی بنیاد سخت نہ ہوتی تو وہ محض ایک غیر مسلسل خواب ہوتا اور اگر مسرت کی بنیاد سخت نہ ہوتی تو وہ پاگل پن کا ایک مجنونانہ کھیل ہوتا —

یہی سخت بنیاد ریاضت ہے - اس میں سوچنے کی قوت ہے، طاقت ہے اور سخت استحکام ہے - یہ دیوتا کے مانند ایک ہاتھ سے ذہن بخشتی ہے اور دوسرے ہاتھ سے مار ڈالتی ہے - یہی ریاضت کسی شے کے قائم کرتے وقت جیسی مضبوط ہوتی ہے توڑنے کے وقت بھی ویسی ہی سخت رہتی ہے - حسن سے پوری طرح لذت اندوز ہونے کے لیے اسی ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے ورنہ اگر ہماری حرکات ہمارے قابو میں نہ ہوں

تو جس طرح بچه کھانے کی تھالی کو لے کر روٹی اور ترکاری وغیرہ کو صرف جسم پر مل کر اور مٹی میں بکھیر کر سب تتر بتر کر ڈالتا ھے اور اُس کے پیٹ میں بہت ھی تھوڑا جاتا ھے۔ ٹھیک یہی حالت ھماری اُس سامان کے ساتھہ ھوتی ھے جس سے ھم لذت اندوز ھونا چاھتے ھیں- ھم صرف اُسے اپنے جسم پر چپڑ لیتے ھیں، لذت بخش نہیں بنا سکتے —

حسن کو وجود میں لانا بھی بے قابو تخیل کا کام نہیں ھے- سارے گھر میں آگ لگا کر کوئی شام کا دیا نہیں جلاتا- آگ آسانی سے بے قابو ھو جاتی ھے اس لئے گھر میں روشنی کرتے وقت آگ کو قابو میں رکھنا چاھیئے- دنیا کے میلان کے متعلق بھی یہی بات ھے - دنیاوی میلان کی آگ کو اگر ھم ایک دم پوری طرح جل اُٹھنے دیں تو جس حسن کو صرف رنگین بنانے کے لئے اس میلان کی ضرورت تھی اُسے وہ جلا کر خاک کر ڈالتی ھے - یہی میلان پھول چننے کے لئے جاتا ھے اور انہیں توڑ کر خاک دھول میں ملا دیتا ھے -

یہ بات سچ ھے کہ ھمارا بھوک کا میلان دنیا میں جہاں دستر خوان بچھا کر بیٹھہ جاتا ھے اُس کے نزدیک ھی اکثر حسن کا ایک جلوہ نظر آتا ھے - پھل سے صرف ھمارا پیٹ ھی نہیں بھرتا بلکہ وہ لذت میں بو میں اور شکل میں بھی اچھا ھوتا ھے - اگر وہ مطلق خوش نما نہ ھوتا تو بھی ھم اُسے پیٹ بھرنے کے لئے کھاتے - ھماری اتنی اھم ضرورت کے ھونے پر بھی وہ صرف پیٹ بھرنے کے ھی خاطر نہیں بلکہ حسن سے لذت اندوز ھونے کے خیال سے بھی ھم کو مزہ دیتا ھے - یہ فائدہ ھماری ضرورت کے علاوہ ھے -

دنیا میں حسن کی شکل میں یہ جو ھماری بالائی آمدنی ھے وہ

ہمارے دل کو کس طرف لے جا رہی ہے ؟ اس کی کوشش یہ ہے کہ ہمارے دل کا پھندا ڈھیلا ہوجاے اور بھوک کی سیری کی خواہش ہی ہمارا معبود یا واحد مقصد نہ بن جاے - تیز بھوک آگ بگولا ہو کر کہہ رہی ہے کہ تمھیں کھانا ہی پڑے گا ' میں اور کچھہ سننا نہیں چاہتی- اُس وقت حسن مسکراکر امرت برساتا ہوا ہماری اہم ضرورت کی غصیلی سرخ آنکھوں کو پس پردہ کر دیتا ہے اور پیٹ کی آگ کو دبا کر بہ طریق احسن کھانے کا انتظام کرتا ہے - لازمی غرض میں انسان کے لئے ایک طرح کی بے عزتی ہے لیکن حسن غرض سے بالا ہے- اسی سبب سے وہ ہماری بے عزتی کو دور کر دیتا ہے - حسن ہماری بھوک کی سیری کے ساتھہ ساتھہ ہمیں ایک اور بلندی کی طرف لے جا رہا ہے - اسی لئے ایک دن جو لوگ بالکل وحشی تھے آج وہ انسان بن گئے ہیں ' جو صرف اپنے حواس کا حکم مانتے تھے وہ آج محبت کی طاقت کے قائل ہو گئے ہیں - آج ہم بھوک لگنے پر بھی جانوروں اور جنگلیوں کی طرح جوں توں کرکے کھانے کے لئے نہیں بیٹھہ جاتے - نفاست اور صفائی نہ ہونے پر ہماری کھانے کی خواہش جاتی رہتی ہے - اِس لئے اب ہم میں صرف ایک کھانے ہی کی خواہش نہیں رہی ہے (اس کے علاوہ کچھہ اور بھی ہے) - نفاست نے اس خواہش کو کمزور کر دیا ہے - ہم بچے کو شرم دلا کر کہتے ہیں کہ چھی چھی ' یوں ندیدوں کی طرح کھاتے ہو! اس طرح سے کھانا دیکھنے میں اچھا نہیں معلوم ہوتا- نفاست نے ہمارے اس میلان کو ہمارے قابو میں کر دیا ہے - دنیا کے ساتھہ صرف ہماری غرض کا رشتہ قائم نہ رکھہ کر اُس نے مسرت کے رشتے کو جوڑ دیا ہے - غرض کے رشتے میں ہماری لاچاری ہے ' غلامی ہے ؛ مسرت کے رشتے میں ہماری نجات ہے —

اسی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ آخر کار حسن انسان کو ریاضت کی طرف کھینچ رہا ہے - انسان کو وہ ایک اس قسم کا امرت دیتا ہے جس کے پینے سے انسان بھوک کی سختی پر دن بدن غالب آتا جاتا ہے۔ لوگ نفس کی بے لگامی کو برا سمجھہ کر اُسے چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہیں وہ اُسے بدنما سمجھہ کر دل سے چھوڑنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں —

جس طرح حسن ہمیں آہستہ آہستہ نفاست اور ریاضت کی طرف کھینچ کر لاتا ہے اُسی طرح ریاضت بھی ہماری حسن سے لذت اندوز ہونے والی طاقت کو بڑھا دیتی ہے - جب تک ہمارا دل پوری یکسوئی سے غور کرنے کا عادی نہ ہو تب تک ہم حسن کی گہرائی تک پہنچ کر اُس سے لذت آشنا نہیں ہو سکتے - ایک وفا شعار ' ستی (مخلص) بیوی ہی محبت کا حقیقی لطف اُٹھا سکتی ہے ' ہرجائی عورت کو یہ چیز کہاں نصیب ہے - ستی پن ہی نفس پر قدرت رکھنے والی وہ مستحکم قوت ہے جس سے ہم حسن کے پوشیدہ لطف کو حاصل کر سکتے ہیں - ہماری حسن کی محبت میں بڑی اگر اُس ستی پن کی ریاضت نہ رہے تو کیا ہوتا ہے ! وہ صرف حسن کے باہر ہی باہر مضطرب ہوکر گھومتی رہتی ہے ' مستی کو مسرت سمجھہ کر دھوکا کھاتی ہے اور جسے پاکر وہ ایک دم سب کچھہ چھوڑ کر مطمئن ہو کر بیٹھہ سکتی تھی اس سے محروم ہو جاتی ہے۔ سچا حسن کامل مرتاض ہی کے سامنے جلوہ نما ہوتا ہے ' لالچی اور عیاش لوگوں کے سامنے نہیں - جو لوگ پیٹو ہیں وہ کھانے کا مزا نہیں اُٹھا سکتے۔ پوش * راجہ نے رشی کہار اُتنک سے کہا جاؤ ' زنانہ محل میں جاؤ ' وہاں پٹ رانی کو دیکھہ سکوگے۔ اُتنک محل میں گیا لیکن رانی کو نہ دیکھہ سکا۔

---

* مہابھارت کی ایک کہانی ہے —

ناپاک ہوکر کوئی شخص ستی کو نہیں دیکھہ سکتا - اتنک اس وقت پاک نہیں تھا —

دنیاوی حسن کے شاندار زنانہ محل میں جو ستی لچھمی موجود ہوتی ہے وہ بڑی ہمارے سامنے ہی ہے لیکن پاک نہ ہونے کی وجہ سے ہم اُسے نہیں دیکھہ سکتے - جب ہم عیاشی میں ڈوب جاتے ہیں ' عیش کے نشے میں مست ہوکر گھومتے ہیں تب تھا۔ دنیا کی نورانی لباس والی ستی لچھمی ہماری نظر سے اوجھل ہو جاتی ہے —

اس بات کو ہم مذہبی اور اخلاقی نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ مسرت کے نقطۂ نظر سے (انگریزی میں جسے آرٹ کہتے ہیں) اُسی کا لحاظ کرتے ہوے کہہ رہے ہیں - ہمارے شاستروں میں بھی آیا ہے کہ صرف دھرم کے لئے ہی نہیں بلکہ سکھہ کے لئے بھی نفس کُش ہونا چاہئے - " سکھارتی سنّیتو بھویت " یعنی اگر خواہشات کی تکمیل چاہتے ہوتو اُن کو اپنے قابو میں رکھو - اگر تم حسن سے لذت اندوز ہونا چاہتے ہوتو خواہش نفسانی پر قابو حاصل کرکے دل کو صاف بنا کر سکون حاصل کرلو - اگر ہم خواہش نفس کو قابو میں رکھنا نہیں جانتے تو اس خواہش کی تکمیل کو حسن کی خواہش کی تکمیل سمجھہ کر غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں - جو شے دل کی ہے اُسے دونوں ہاتھوں سے مسل کر سمجھتے ہیں کہ گویا ہم نے اُسے حاصل کر لیا - اسی لئے ہم نے کہا ہے کہ احساس حسن کو صحیح طور پر بیدار کرنے کے لیے برہم چریہ (تجردانہ) زندگی بسر کرنے کی ضرورت ہے —

جن کی آنکھوں میں دھول ڈالنا مشکل ہے وہ فوراً شک زدہ ہوکر کہیں گے افوہ ! یہ تو شاعری ہوگئی - وہ کہیں گے کہ دنیا میں ہم اکثر

یہ دیکھتے ھیں کہ ماھر فن اور ھنر مند لوگ جو حسن کی تخلیق کرتے آے ھیں اُن میں سے اکثر ایسے ھیں جنھوں نے اپنے پیچھے ریاضت کی کوئی مثال نہیں چھوڑی ھے۔ ایسے لوگوں کی سوانح حیات پڑھنے کے قابل نہیں ھیں۔ اس لئے شاعری کو چھوڑ کر حقیقت پر غور کرنا ھمارا فرض ھے —

ھم پوچھتے ھیں کہ ھم کسی چیز کی حقیقت پر اس قدر یقین کیوں کرتے ھیں۔ سبب یہ ھے کہ وہ ھماری نظروں کے سامنے ھے۔ لیکن اکثر صورتوں میں ھم جس چیز کو حقیقی سمجھتے ھیں اُس کے اکثر پہلو ھماری نظر سے پوشیدہ رھتے ھیں۔ کچھ تھوڑا سا ھی دیکھہ کر ھم سمجھہ لیتے ھیں کہ گویا ھم نے سب کچھہ دیکھہ لیا۔ انسانوں سے صادر ھونے والے حقیقی واقعات کو لیجئے۔ ایک آدمی جس چیز کو سفید کہتا ھے دوسرا اگر اُسے مٹیالا کہتا تو مضائقہ نہ تھا لیکن وہ تو اُسے بالکل کالا کہتا ھے۔ نپولین کو کوئی دیوتا کہتا ھے اور کوئی شیطان۔ اکبر کو کوئی دریا دل اور رعایا کا خیر خواہ مانتا ھے اور کوئی اُسے ھندو رعایا کی تباھی کا اصلی سبب بتلاتا ھے۔ کچھہ لوگ کہتے ھیں کہ اِسی چار ورنوں * (طبقوں) کے اُصول نے ھمارے ھندو سماج (معاشرہ) کی حفاظت کی ھے اور بعض کہتے ھیں اسی تقسیم کے اُصول نے ھمیں بالکل تباہ کر دیا ھے۔ اور لطف یہ ھے کہ دونوں فریق اپنی سچائی کی دھائی دیتے ھیں —

حقیقت میں انسان سے صادر شدہ افعال میں ایک ھی جگہ کئی

---

* ھندؤں میں ذات کی تقسیم چار طبقوں میں ھوئی ھے۔ برھمن ' اکشتری ' ویش ' شودر —

کئی متضاد باتیں پائی جاتی ہیں۔ انسان کو نظر آنے والے اجزا میں دو مختلف پہلو نظر آتے ہیں۔ اُن کا پوشیدہ ملاپ نظر نہ آنے والے اجزا میں بے شبہ چھپا رہتا ہے۔ اسی لئے حقیقت مشاہدہ ہی میں نظر نہیں آتی بلکہ اُس میں پوشیدہ رہتی ہے۔ اسی سبب سے اس کے متعلق اس قدر بحث اور جماعت بندی ہوتی ہے اور اسی لئے ایک ہی تاریخ دو مقابل فریقوں کو وکالت نامہ دیتی ہے —

دنیا کے ماہرین فن اور اہل کمال میں بھی جہاں ہم کوئی کم زوری دیکھتے ہیں وہاں اُس کی حقیقی تعریف کرنے کے بعد بھی ہم اُس کے خلاف کچھ نہ کچھ کہنے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔ حسن کی تخلیق کم زوری سے، غیر مستقل مزاجی سے اور نفس کی بے لگامی سے ہوتی ہے، یہ بالکل اجتماع ضدین ہے۔ اگر اس بارے میں کسی سچے واقعے کو بھی ثبوت میں پیش کیا جائے تو بھی ہم کہیں گے کہ نہا۔ گواہوں کو حاضر نہیں کیا گیا ہے اور اصلی گواہ غائب ہے۔ اگر ہم دیکھیں کہ ڈاکوؤں کی ایک جماعت بہت ترقی کر رہی ہے تو اس واقعے کی اصلیت سے یہ کُلیہ قائم نہیں کیا جا سکتا کہ ڈکیتی کا پیشہ ترقی کا ذریعہ ہے۔ یہ بات بغیر کسی دلیل کے کہی جا سکتی ہے کہ ڈاکوؤں کی جو انتہائی ترقی دیکھی جاتی ہے اُس کا اصلی سبب باہمی اتحاد ہے۔ یعنی جماعت میں ایک دوسرے کی خاطر اُصول کی پابندی کی جاتی ہے۔ لیکن جب یہ ترقی تنزل کی طرف مائل ہوجائے گی تو اس تنزل کا سبب اتحاد نہیں ٹھیرایا جا سکتا۔ تب کہا جائے گا کہ دوسروں کے ساتھ ظلم کرنا ہی اُن کے تنزل کا سبب ہے۔ اگر ہم دیکھیں کہ کسی شخص نے بیوپار میں بہت کچھ کما کر اُڑا دیا ہے تو یہ نہیں کہا جائے گا

کہ جو روپیہ اُڑا سکتے ہیں وہی کمانے کا طریقہ بھی جانتے ہیں- لیکن ہم یہ کہیں گے کہ روپیہ کمانے میں وہ آدمی بڑا ہوشیار تھا- اس بارے میں اُس میں نفس کو قابو میں رکھنے اور دور اندیشی کی طاقت دوسروں کی نسبت غیر معمولی تھی، لیکن روپیہ اُڑاتے وقت اُس کا فضول خرچی کا میلان اُس کی روپیہ کمانے کی ہوشیاری پر سبقت لے گیا ہے—

ماہرین فن جہاں حقیقت میں کامل ہوتے ہیں وہاں وہ سرتاص بھی ہوتے ہیں، وہاں خود کامی نہیں چل سکتی- وہاں دل کی تربیت اور ریاضت کا ہونا لازمی ہے- ایسے کامل اور سہابلی لوگ بہت ہی تھوڑے ہیں جو علم ہونے پر بھی اس علم کو سولہ آنے کام میں لگا سکتے ہیں- انسان سے کہیں نہ کہیں لغزش ہو جاتی ہے- سبب یہ ہے کہ ہم سب تنزل سے ترقی کی طرف بڑھ رہے ہیں، کمال ترقی کی آخری حد پر نہیں پہنچے ہیں- لیکن زندگی میں ہم جو کوئی دوامی اور عظیم الشان چیز بناتے ہیں اُسے ہم اپنے اندرونی اخلاقی ادراک کی مدد ہی سے بناتے ہیں، نہ کہ اپنی لغزش کی مدد سے- اہل کمال نے بھی جہاں اپنے ہنر کو نمایاں کیا ہے وہاں اپنی اخلاقی خوبیاں ہی دکھائی ہیں اور جہاں انہوں نے اپنی زندگی کو برباد کیا ہے وہاں اُن کے اخلاق کی کم زوریاں ہی نظر آتی ہیں- وہاں اخلاق کے اُس شاندار مقصد کی طرف جاتے ہوے جو اُن کے دل میں ہے اخلاق ذمیمہ کی رخنہ اندازی سے اُنہیں تکلیف پہنچی ہے- کسی چیز کو بنانے میں نفس کُشی کی ضرورت ہوتی ہے اور بگاڑنے کے لئے نفس کی بے لگامی کی- حقیقی علم کے لئے ریاضت کی ضرورت ہے اور سطحی علم کے لئے نفس پر قابو نہ ہونے کی- تو اس صورت میں یہ بات کہی جاے گی کہ ایک ہی انسان کے اندر حسن کے نشو و نما کی قوت اور اخلاقی قوت کی بےلگامی

ساتھه ساتھه تکمیل پا سکتے هیں - یه تو ایسی هی بات هے جیسے شیر اور بکری ایک هی گھات پر پانی پئیں —

شیر اور بکری ایک هی گھات پر پانی نهیں پیتے - یه بات سچ هے ' لیکن کب ؟ جب شیر بڑی پورا شیر بن جاتا هے اور بکری بڑی پوری بکری بن جاتی هے - بچپن میں دونوں ایک ساتھه کھیل بھی سکتے هیں لیکن بڑے هوجانے پر شیر بڑی بکری پر جھپٹتا هے اور بکری بڑی بھاگنے کی کوشش کرتی هے —

اسی طرح احساس حسن کی حقیقی تکمیل کبھی بھی میلان کی غیر مستقلی اور دل کی بے لگامی کے ساتھه ایک جگه نهیں رہ سکتی - دونوں ایک دوسرے کی ضد هیں —

اگر یه کہا جاے که یه دونوں ضد کیوں هیں ؟ تو اس کا یہی سبب هے - وشوامتر نے خدا کے ساتھه شرط بد کر ایک نئی دنیا پیدا کی تھی وہ اُن کے غصے اور فریب کی مخلوق تھی - اسی لئے وشوامتر کی بنائی هوئی دنیا خدا کی دنیا کے ساتھه میل نه کھا سکی ' اُسے چنوتی (چیلنج) دے کر تکالیف پہنچانے لگی - یه دنیا انمل اور عجیب تھی ' اس لئے اس کائنات کے ساتھه نباہ نه کر سکی ' آخر میں دکھه دے کر اور دکھی هو کر وہ تباہ هو گئی —

اگر همارا میلان خطرناک هو جائے تو وہ خدا کی بنائی هوی دنیا کے مقابلے میں خود هی اپنی دنیا کی تخلیق کرتا هے - اس صورت میں اپنے ماحول کے ساتھه اس کا میل نهیں هوتا - همارا غصه ' همارا لالچ اپنے چاروں طرف اسی طرح کی تمام خرابیوں کو پیدا کر لیتے هیں جن سے چھوٹی چیز بڑی اور بڑی چیز چھوٹی دکھائی دیتی هے - تھوڑی دیر رهنے والی

چیز ہمیشہ رہنے والی نظر آتی ہے اور ہمیشہ رہنے والی چیز پر نظر ہی نہیں پڑتی - ہمارے دل میں جس چیز کا لالچ پیدا ہوجاتا ہے ہم اُس چیز کو اسقدر غلط اہمیت دیتے ہیں کہ وہ دنیا کی بڑی بڑی سچائیوں کو ڈھانک لیتی ہے : چاند، سورج اور تاروں کو ماند کردیتی ہے - اس طرح ہماری مخلوق خدا کے ساتھہ مخالفت کیا کرتی ہے —

خیال کیجئے کہ ایک ندی بہہ رہی ہے اگرچہ اس کی ہر ایک موج آزادی سے سر اُٹھاتی ہے پھر بھی یہ سب موجیں آپس میں مل کر ایک ہی سمندر کی طرف گاتی ہوئی جارہی ہیں - کوئی کسی کو نہیں روکتی - لیکن اسی اثنا میں اگر کہیں بھنور پڑجائے تو یہ سب موجیں ایک ہی جگہ ٹھیر کر پاگل کی طرح گھومنے لگتی ہیں - چلنے میں رکاوٹ ڈال کر ڈبونے کی کوشش کرتی ہیں، تمام ندی کا جو بہاؤ ہے اور جو اُس کا عین مقصد ہے اس میں رکاوٹ پیدا کرکے وہ ایک جگہ ٹھیرتی بھی نہیں اور آگے بھی نہیں بڑھ سکتی —

اگر ہمارا میلان دیوانہ ہوجائے تو وہ ہمیں تمام رجحانات سے ہٹاکر ایک ہی نقطے کے اطراف پھرا کر مار ڈالتا ہے - ہمارا دل اُسی ایک مرکز کے اطراف پابند ہوکر سب کچھہ اُسی کی نذر کردینا چاہتا ہے اور دوسری ہر چیز کو برباد کر دینا چاہتا ہے - اسی دیوانگی میں بعض لوگ ایک قسم کا حسن دیکھتے ہیں - اتنا ہی کیوں، ہم تو سمجھتے ہیں کہ یورپ کا ادبیات اسی بھنور کے رقص دواری کا قیامت خیز جلسہ ہے جس کا کوئی انجام نہیں، جسے کہیں اطمینان نہیں ملتا، گویا اسی حالت میں اُسے ایک خاص راحت معلوم ہوتی ہے، لیکن اِسے ہم تعلیم کی تکمیل نہیں کہ سکتے یہ فطرت کا بگاڑ ہے - ایک تنگ دائرے کے اندر دیکھنے سے جس چیز کو

هم نہایت خوبصورت سمجھتے هیں اُسے جب هم دنیا کی دوسری چیزوں کے ساتھہ ملاکر دیکھتے هیں تو اُس کا بھداپن نظر آجاتا ھے - شرابی شراب خانے میں تمام دنیا کو بھول کر اپنی مجلس کو جنت سمجھہ لیتا ھے لیکن ایک هوشمند ناظر جب اُس مجلس کو تمام دنیا سے مقابلہ کرکے دیکھتا ھے تو اُسے اس کی گندگی کا علم هوسکتا ھے - همارا میلان جب ضد کرتا ھے تو باوجودیکہ اُس میں ایک مصنوعی حسن پیدا هوجاتا ھے پھر بھی اگر هم اُسے وسیع دنیا کے ساتھہ ملاکر دیکھیں تو اس کے بھدے پن کو دیکھنے میں دیر نہیں لگتی - اس طرح جو شخص غوربین نگاهوں سے بڑی چیز کے ساتھہ چھوٹی کو سب کے ساتھہ ملاکر نہیں دیکھہ سکتا وہ جوش هی کو مسرت اور عیب هی کو حسن سمجھنے میں غلطی کرتا ھے - اسی لئے احساس حسن کو کامل طور پر حاصل کرنے کے لئے اطمینان قلب کی ضرورت ھے اور وہ نفس کشی کے بغیر حاصل نہیں هوسکتا —

احساس حسن کی تکمیل کا کیا مقصد ھے ؟ همیں اب اس پر سوچنا چاهئے - یہ دیکھا جاتا ھے کہ جنگلی قومیں جس چیز کو خوبصورت سمجھہ کر اُس کی قدر کرتی هیں متمدن اقوام اُسے نظر انداز کردیتی هیں - اس کا بڑا سبب یہ ھے کہ جنگلی لوگوں کا دل جتنا تنگ هوتا ھے اتنا متمدن لوگوں کا دل تنگ نہیں هوتا - اندر اور باهر ' مقام اور وقت میں متمدن اقوام کی دنیا وسیع ھے اور اس کا هر ایک حصہ عجیب هوتا ھے - اسی وجہ سے جنگلی لوگوں کی دنیا میں اور متمدن لوگوں کی دنیا میں ایک چیز کا ناپ اور تول ایک نہیں هوسکتا -

فن مصوری کے بارے میں جو لوگ اناڑی هیں وہ ایک تصویر کے پردے پر تصویر کی بھڑک ' رنگ اور گول گول شکل کو دیکھہ کر هی خوش هو جاتے هیں - وہ تصویر کو وسیع میدان میں رکھہ کر نہیں دیکھتے - اس

بارے میں اُن میں کوئی اس طرح کی اعلیٰ قوت ادراک نہیں ہے جو اُن کے حواس کی لگام کو تھامے رکھے - ابتدا میں جو چیزیں اُنہیں اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں وہ خود کو انہیں حوالے کردیتے ہیں - شاہی محل کی ڈیوڑھی کے دربان جی کی چپراس اور بھری ہوی ڈاڑھی کو دیکھہ کر وہ اُسی کو سب سے بڑی شخصیت سمجھہ کر مبہوت ہوجاتے ہیں - ڈیوڑھی کو پار کرکے دربار میں جانے کی ضرورت اُنہیں محسوس نہیں ہوتی - لیکن جو لوگ اتنے گاودی نہیں ہیں وہ اتنا جلد مبہوت نہیں ہوتے - وہ جانتے ہیں کہ دربان جي کی ظاہری شان خوب بڑھی چڑھی ہے - اس کے سوا اس میں اور کچھہ بھی نہیں - راجہ کا بڑاپن صرف نظر آجانے کی چیز نہیں ہے ' اُسے بڑے غور سے دیکھنا پڑتا ہے - اسی وجہ سے راجہ کے بڑے پن میں ایک قسم کی طاقت ' اطمینان اور متانت ہے —

اس لئے جو شخص سمجھدار ہے وہ تصویر میں رنگ کی بھڑک کو دیکھہ کر مبہوت نہیں ہوجاتا ' وہ غیر معمولی چیز کے ساتھہ معمولی چیز کا ' بیچ کی چیز کے ساتھہ چاروں طرف کی چیزوں کا اور آگے کی چیزوں کے ساتھہ پیچھے کی چیزوں کا تناسب ڈھونڈھا کرتا ہے - رنگ نظر کو اپنی طرف کھینچتا ہے لیکن تناسب کي خوبصورتی دیکھنے کے لئے دل کی ضرورت ہے اُسے نہایت غور سے دیکھنا پڑتا ہے - اس لئے اس کی مسرت بھی زیادہ گہری ہوتی ہے —

یہي وجہ ہے کہ صاحبان فن نمود و نمائش کو پسند نہیں کرتے اور اسی لئے ان کي تصنیف میں ایک قسم کی درشتی پائی جاتی ہے - ان کے دھرپت میں خیال کی تان نہیں ہوتی - معمولی آدمی ان کی تصنیف کو بیرونی نمائش سے خالی دیکھہ کر ھاتھہ سے رکھہ دیتے ہیں' لیکن خاص لوگوں کے دل

کو اُسی سادگی کی اندرونی عظمت بڑا مزہ دیتی ہے —

اس لئے اگر صرف آنکھوں ہی سے دیکھا جائے اور دل کی نظر ساتھہ نہ ہو تو حسن اچھی طرح نہیں دیکھا جاسکتا - اس اندرونی نظر کو حاصل کرنا خاص قسم کی تعلیم کا کام ہے -

پھر دل کے بھی کئی طبقات ہیں- صرف عقل اور ادراک کے ذریعے ہم جو کچھہ دیکھہ سکتے ہیں اس کے ساتھہ اگر ہم دلی جذبات کو شریک کردیں تو ہماری نظر کی وسعت کچھہ اور بڑہ جاتی ہے — اخلاقی عقل کو ساتھہ کردینے سے آنکھیں بہت دورتک دیکھنے لگتی ہیں اور جب روحانی آنکھیں کھل جاتی ہیں تو پھر منظر کی وسعت غیر محدود ہو جاتی ہے -

اس لئے دیکھنے میں جو چیز ہمارے دل کے بڑے حصے پر قبضہ کرلیتی ہے اُس کو دیکھنے سے ہمیں گہرا اطمینان حاصل ہوتا ہے- پھول کے حسن کی نسبت انسانی چہرہ ہمیں اپنی طرف زیادہ متوجہ کرتا ہے کیونکہ انسانی چہرے میں صرف شکل ہی کا حسن نہیں ہوتا - اُس میں شرار زندگی ' جودت عقل اور دل کا جمال بھی شامل ہوتا ہے - وہ ہماری ہستی ' عقل اور دل پر قبضہ کر لیتا ہے —

انسانوں میں جو اچھے انسان ہیں ' روے زمین پر جو خدا کی شان کرم کے مظہر ہیں وہ ہمارے دل کو اس حد تک اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں کہ ہم خود کو نہیں پاتے ؟ اسی لئے جس شاہزادے (بدھ) نے انسانوں کو دکھہ سے نجات دینے کے لئے راج پاٹ تج دیا اس کی اس خوبی پر انسان نے اتنی نظمیں لکھہ ڈالیں اور اتنی تصویریں بنا ڈالیں کہ جس کی کوئی حد نہیں -

اس جگہہ پر کئی شکی لوگ کہیں گے کہ حسن کی بحث سے یہ تو اخلاق کی طرف نکل گئے - دونوں کو ملانے کی کیا ضرورت ہے - جو اچھا ہے

وہ اچھا ہے اور جو خوبصورت ہے وہ خوبصورت ہے - اچھی چیز ہمارے دل کو ایک طرح کھینچتی ہے اور خوبصورت چیز دوسری طرح - دونوں کا طریقۂ کشش جدا گانہ ہے - اسی لئے زبان میں ان دونوں کے دو نام ہیں - جو چیز اچھی ہے اس کے فوائد ہمیں اس کی طرف مائل کردیتے ہیں اور جو چیز خوبصورت ہے وہ ہمیں کیوں موہ لیتی ہے یہ ہم نہیں جانتے —

اس بارے میں ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ایک سود مند چیز ہمارا بھلا کرتی ہے اس لئے ہم اسے بھلی کہتے ہیں لیکن اتنا کہہ دینے سے پوری بات نہیں ہوتی - دراصل جو چیز بھلا کرنے والی ہوتی ہے وہ ہماری ضرورت کو پورا کرتی ہے اور خوبصورت بھی ہوتی ہے - یعنی سود مندی ہونے کے علاوہ بھی اس میں ایک قسم کی کشش ہوتی ہے جس کا کوئی سبب نہیں ہوتا - علمائے اخلاق اس سود مند چیز کو دنیا میں اخلاقی نقطۂ نظر سے شائع کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور شاعر اسے اس کی ناممکن البیان حسن کی شکل میں لوگوں میں شائع کرتے ہیں —

در اصل ہم جو بہبودی کو خوبصورت کہتے ہیں وہ ضرورت کو پورا کرنے کے خیال سے نہیں - خشکہ ہمارے استعمال میں آتا ہے ' کپڑا ' چھتری اور جوتے وغیرہ بھی ہمارے استعمال میں آتے ہیں ' لیکن وہ ہمارے دل میں حسن کا احساس پیدا نہیں کرتے لیکن لچھمن کا رام کے ساتھ ساتھ بن کو جانا ہمارے دل میں بین کے تاروں کے مانند ایک نغمہ پیدا کردیتا ہے - اسے میٹھی زبان میں ' اچھے اوزان میں خوبصورتی سے سجا کر رکھنا لازمی ہے - اگر چھوٹا بھائی بڑے بھائی کی خدمت کرے تو ایسا نہیں کہتے کہ اس سے سماج کا بھلا ہوتا ہے بلکہ اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں ایک حسن ہے - یہ بات کیوں خوبصورت ہے؟ اس لئے کہ جتنی سود مند چیزیں

ہیں تمام دنیا کے ساتھہ ان کی ایک بڑی گہری مناسبت ہے - تمام انسانوں کے دلوں کے ساتھہ ان کا ایک پوشیدہ تعلق ہے - اگر ہم سچائی کے ساتھہ سودمند چیزوں کی مکمل مناسبت کو دیکھہ سکیں تو پھر حسن ہماری نظروں سے اوجھل نہیں رہتا - رحمدلی خوبصورت ہے ' معافی خوبصورت ہے ' محبت خوبصورت ہے - صدبرگ کنول یا بدر کامل کے ساتھہ اُس سچائی کا مقابلہ کیاجاتا ہے - صدبرگ کنول اور بدر کامل کے مانند اُس میں اور اس کے اطراف کی دنیا میں اس کا حسن سب کیلئے دلکش ہے - وہ سب کے موافق ہے اور سب اُس کے موافق ہیں - ہمارے پرانوں میں لچھمی صرف حسن اور جاہ و حشم کی ہی دیوی نہیں ہے وہ منگل (رفاہ) کی بھی دیوی ہے - حسن کی شکل ہی منگل بہبودی کی شکل ہے اور منگل کی شکل ہی حسن کا جلوۂ کامل ہے —

اب ہم اس بات پر غور کرتے ہیں کہ حسن اور بہبودی کا کہاں میل ہوتا ہے - ہم پہلے ہی دکھا چکے ہیں کہ حسن غرض سے بالا ہے - اسی لئے ہم اُسے الوہیت کہتے ہیں - اسی سبب سے وہ ہمیں محبت میں خود غرضی کے دلدر سے ' چھڑا کر نجات دلاتی ہے —

بہبودی میں ہمیں وہی الوہیت نظر آتی ہے - جب ہم دیکھتے ہیں کہ کسی بہادر آدمی نے مذہب کیلئے اپنی تمام خواہشات ترک کردی ہیں ' جان دیدی ہے تب یہ دیکھہ کر ہماری آنکھوں میں ایک حیرت سما جاتی ہے جو ہمارے سکھہ دکھہ سے اور ہماری غرض سے کہیں بڑی ہوتی ہے بلکہ ہمارے پرانوں کے مقابلے میں بھی بڑی ہوتی ہے - بہبودی اپنے اسی الوہیت کے بل پر نقصان اور تکلیف کی پروا نہیں کرتی - غرض کے فوت ہونے سے اُس کا کچھہ نقصان نہیں ہوتا - اس لئے جس طرح حسن ہم کو اپنی خواہشات سے الگ

ہونے کی ترغیب دیتا ہے، بہبودی بھی یہی کرتی ہے - حسن دنیا کے مختلف واقعات میں الوہیت دکھاتا ہے - بہبودی بھی انسانی زندگی میں وہی کام کرتی رہتی ہے - بہبودی حسن کو صرف آنکھوں سے نہیں دکھاتی، صرف عقل کے ذریعے سے نہیں سمجھاتی بلکہ وہ اُسے بے انتہا وسیع اور عظیم الشان بنا کر انسان کے سامنے لے آتی ہے - بہبودی دراصل قایم رہنے والا اندرونی حسن ہے - اسی وجہ سے اکثر ہم اُسے آسانی سے خوبصورت شکل میں نہیں سمجھہ سکتے - لیکن جب سمجھتے جاتے ہیں تو ہماری روح ایک طوفانی ندی کی طرح متلاطم ہو جاتی ہے - اس وقت ہمیں اس کے مقابلے میں کوئی بھی چیز زیادہ خوبصورت نہیں معلوم ہوتی —

پھول کی پنکھڑیوں، چراغوں کی قطاروں اور چاندی سونے کی تھالیوں سے اگر کھانے کا کمرہ آراستہ ہے تو اچھا ہے لیکن اگر مہمان کو میزبان کی مدارات میں خلوص نظر نہ آے اور اُسے اس دعوت سے کسی قسم کی مسرت نہ ہو تو اُسے یہ تمام آرائش اور زیبائش کبھی اچھی معلوم نہوگی کیونکہ یہی مسرت ہی تو اندرونی الوہیت ہے - مسرت کی میٹھی ہنسی، میٹھے بول اور میٹھا برتاؤ اتنے دلکش ہوتے ہیں کہ اُس شخص کے نزدیک کیلے کے پتے کی قدر سونے کی تھالی سے بڑھ جاتی ہے - یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ہر ایک کے نزدیک اس کیلے کے پتے کی قدر ایسی ہی ہے - بہت سے لوگ دھوم دھام کی دعوت میں بے عزتی سے بھی شامل ہونے کے لئے تیار نظر آتے ہیں اس لئے کہ وہ کھانے سے بڑھکر کسی اعلیٰ حسن کو نہیں جانتے - دراصل کھانا اور آرائش ہی دعوت کے اصلی اجزا نہیں ہیں - کلی کی پنکھڑیاں جس طرح اپنے اندر ہی بند رہتی ہیں اُسی طرح غرض مند انسان کی طاقتیں ہمیشہ اپنی ذات تک محدود رہتی ہیں - ایک دن اُس غرض کے بندھن

کو ڈھیلا کرکے اُن طاقتوں کا رخ جب ہم دوسروں کی طرف پھیر دیتے ھیں توکھلے ھوے پھول کی مانند دنیا پر اُس کی محبت آمیز وسعت چھا جاتی ھے - جو شخص دعوت کے اُس اندرونی ' عظیم‌الشان حسن کو پوری طرح نہیں دیکھہ سکتا وہ کھانے اور پینے کی چیزوں کی کثرت اور آرائش کی نمود ھی کو بڑا سمجھہ لیتا ھے - اس کا بے قابو میلان ' نذرانہ اور کھانے پینے کا بے انتہا لالچ دعوت کے اعلی حسن کو اچھی طرح دیکھنے نہیں دیتا -

شاستر میں کہا ھے " شکتشی بھو شنم اکشما " یعنی عفو ھی طاقتور انسان کا زیور ھے لیکن اظہار عفو میں حسن کو محسوس کرنا ھر ایک کا کام نہیں ھے بلکہ عام اور بے وقوف شخص طاقت کی ھیبت دیکھہ کر ھی اس کے گرویدہ ھو جاتے ھیں - حیا عورت کا زیور ھے لیکن سنگار کے مقابلے میں اس حیا کے حسن کو کون دیکھہ سکتا ھے · اُسے وھی آدمی دیکھہ سکتا ھے جو حسن کا تنگ نظری سے مطالعہ نہیں کرتا - روشنی کی قلیل شعاعیں جب وسیع روشنی میں مل کر خاموش ھو جاتی ھیں تو اس کے عظیم‌الشان حسن کو دیکھنے کے لیے کسی اونچی جگہ کی ضرورت ھے ' حسن کے اِس طرح دیکھنے کے لئے انسان کو تعلیم کی ضرورت ھے - سنجیدگی کی ضرورت ھے اور اطمینان قلب کی ضرورت ھے —

ھمارے ملک کے قدیم شعرا نے حاملہ عورت کے حسن کے اظہار میں کہیں بھی تکلف نہیں کیا ھے لیکن یورپ کے شاعر اس بارے میں کچھہ شرم اور اخلاقی کمزوری محسوس کرتے ھیں - دراصل حاملہ عورت کا جو حسن ھے اس میں آنکھوں کے لیے کوئی جاذبیت نہیں ھوتی لیکن عورت کی تخلیق کا منشا جب تکمیل کے قریب پہنچتا ھے تب اُس کا انتظار ھی عورت کی شکل میں ایک شان پیدا کردیتا ھے - اس نظارے سے آنکھوں کی مسرت اندوزی میں جس قدر کمی ھوجاتی ھے انسانی

عظمت کا خیال اس کی تلافی کردیتا ھے - جو ھلکے بادل برسات کے پورے موسم میں برس کر شردرت (برسات کے ایک دم بعد کا موسم) میں بے وجہ ھوا سے اُڑتے پھرتے ھیں اُن پر جب ڈوبنے والے سورج کی کرنیں پڑتی ھیں تو مختلف رنگوں کے سمے سے آنکھیں چوندھیا جاتی ھیں لیکن اساڑھ کے نئے گھنے بادل جو پر شیر سیاہ گائے کی طرح جلد برسنے والے پانی کے بوجھ سے بالکل سست ھوجاتے ھیں' جن کے الغاروں پانی میں مختلف رنگوں کا چلبلا پن کہیں دکھائی نہیں دیتا - وہ ھمارے دل کو چاروں طرف سے اس طرح بھر دیتے ھیں کہ اُس میں کہیں خلا نہیں رھتا - ان کے چمکدار نیلے پن میں زمین کی حرارت کا ٹھنڈے پڑ جانے' دھان کے کھیتوں کی بے مائگی کا دور ھوجانے اور دریاؤں اور تالابوں کی خشکی کے رفع ھونے کی ایک بڑی امید جھلکتی ھے - یہ امید کامل بہبودی کے حسن بے پایاں میں ساکت و صامت رھتی ھے - کالی داس چاھتا تو اپنی نظم "میگھہ دوتھ" میں بسنت کی ھوا کو مہجور "یکش" کا قاصد بناسکتا تھا - دنیا میں مشہور ھے کہ وہ اس خصوصیت میں ماھر تھا اور خاص طور پر شمال کی طرف جانے کے لیے جنوبی ھوا کو مخالف سمت اختیار نہ کرنی پڑتی لیکن شاعر نے اساڑھ کے پہلے دن کے نئے بادل ھی کو منتخب کیا - اُس بادل کو جو دنیا کی تپش کو دور کرتا ھے کیا وہ صرف عاشق کا سندیسہ ھی معشوقہ کے کان میں کہے گا - وہ تو سارے راستے کی ندیوں' پہاڑوں اور جنگلوں پر ایک عجیب سکون اور تکمیل کی اشاعت کرتا ھوا چلا جائے گا - کدمب (*) پھول لیں گے' جامنوں کے درخت بار دار ھوجائیں

(*) ایک قسم کا درخت جس کے متعلق سنسکرت کے شاعر کہتے ھیں کہ بادل گرجنے سے اُس میں پھول نکل آتے ھیں —

گے ، بگلوں کی قاریں اُڑ چلیں گی ، ندی کا پانی اچھل اچھل کر کنارے کے بید کے جنگل کے ساتھہ ٹکرائے گا اور کانو کی عورتوں کی خالی از غمزہ اور محبت آلود نگاھوں سے اساڑہ کا آسمان اور بھی ٹھنڈا ھوجاے گا ۔ شاعر نے عاشق مہجور کی پیام رسانی کو جب تمام دنیا کی عام بہبودی کے ساتھہ قدم قدم پر کانٹھد لیا ھے تب اُس کے حسن سے لذت اندوز ھونے والے دل کی خواهش کو اطمینان حاصل ھوا ھے —

" کمار سنبھو " (کالی داس کی ایک دوسری نظم) میں شاعر نے بےوقت موسم بسنت کی غیر متوقع مسرت اور " کام دیو " (عشق کا دیوتا) کی عشق کی سحر آفرینی کے وقت " مهادیو " اور " پاربتی " کے ملاپ کو آخری حد تک نہیں پہنچایا ھے ، عورت اور مرد کے مستانہ ملاپ کے ذریعے جو آگ جل اُٹھتی ھے اس قیامت کی آگ پر پہلے شاعر نے سکون کی بارش کی ھے تب ان دونوں کو ملا سکا ھے ۔ شاعر نے پاربتی کے پریم کی سب سے زیادہ نازک اور حسین شکل ریاضت ھی کی آگ سے روشن کرکے دکھائی ھے ۔ اُس کے آگے بسنت کے تمام پھولوں کا حسن ماند پڑ گیا ھے اور کوئل کے منہ پر مہر خاموشی لگ گئی ھے ۔ " ابھجیان شاکنتل " (کالیداس کا مشہور ڈرامہ شکنتلا) میں بھی معشوقہ جہاں ماں بن گئی ھے ، نفسانی خواهش کا چلبلا پن جہاں پے درپے خلفشار میں ساکن ھوگیا ھے ، جہاں ملامت کے ساتھہ معافی بھی شامل ھوگئی ھے وھیں راجہ اور رانی کا ملاپ نتیجہ خیز ثابت ھوا ھے ۔ پہلے ملاپ میں قیامت ھے اور دوسرے ملاپ میں نجات ھے ۔ ان دونوں نظموں میں سکون میں ، بہبودی میں جہاں بھی شاعر نے حسن کا کمال دکھایا ھے وھاں اُس کے رنگ کار برش کی رنگینی میں پھیکا پن آگیا ھے اور بین میں مستی نہیں رھی ھے —

اصل میں حسن جہاں پورے طور پر نشو و نما پاتا ھے وھاں اپنی شوخیاں ترک کر دیتا ھے - وھیں پر پھول اپنے رنگ اور خوشبو کی زیادتی کو پھل کے حسن کی گہرائی میں بدل دیتا ھے اور اسی تبدیلی میں "اسی کمال ترقی میں حسن اور منگل (بہبودی) کا ملاپ ھو جاتا ھے-

جنہوں نے حسن اور منگل (بہبودی) کے اس ملاپ کو دیکھا ھے وہ تعیش کے ساتھہ حسن کو کبھی نہیں ملا سکتے - ان کے زندگی گزارنے کے اسباب معمولی ھوتے ھیں اور وہ احساس حسن کی کمی کے سبب سے نہیں بلکہ زیادتی کی وجہ سے ھوتے ھیں- اشوک کا نشاط باغ کہاں تھا - آج اُس کے شاھی محل کی دیواروں کا نشان تک نظر نہیں آتا لیکن اس کے بنوائے ھوے لات اور استوپ (گنبد نما عمارت) "بدھ گیا" کے "بودھی بت" (برگد کا ایک پیڑ) کے پاس کھڑے ھوے ھیں- ان کی صنعت معمولی نہیں ھے- جس مقدس مقام پر مہاتما بدھ نے انسانوں کو دکھہ سے نجات دلانے کا راستہ نکالا تھا شہنشاہ اشوک نے وھیں مفید عام بڑے منگل کے یادگار مقام میں صنعت کے حسن کو قائم کیا ھے - اُس نے اپنے عیش کو اس طرح پرستش کی بھینٹ نہیں چڑھا یا - اس ھندوستان میں سینکڑوں پہاڑوں کی بلند چوٹیوں اور غیر آباد سمندروں کے کناروں پر کتنے مندر اور حسن کے کتنے مقدس شاھکار نظر آتے ھیں - لیکن ھندو راجاؤں کے نشاط محلوں کا نشان تک نہیں رھا - دارالسلطنت کے شہروں کو چھوڑ کر جنگلوں اور پہاڑوں میں ان تمام صنعتوں اور خوبیوں کے قائم کرنے کا کیا سبب ھے؟ سبب یہ ھے کہ وھاں انسان نے اپنی تخلیق حسن سے اپنے سے بزرگ ھستی کے متعلق اپنی حیرت انگیز عبادت کا اظہار کیا ھے - انسان کا پیدا کیا ھوا حسن اپنے سے بڑے حسن کو دونوں ھاتھہ جوڑ کر کھڑے ھوے سلام کر رھا ھے اور اپنی

پوری عظمت کے ذریعے اپنے سے بہت بڑی ہستی کی خاموشی سے اشاعت کر رہا ہے۔ انسان اپنی پر صلعت خاموش زبان سے کہہ رہا ہے : دیکھو ! اچھی طرح دیکھو!! جو سندر ہے اُسے دیکھو !!! اور جو عظیم الشان ہے اُسے دیکھو!!!! وہ یہ نہیں کہنا چاہتا کہ میں کتنا بڑا عیاش ہوں اسے دیکھو، وہ یہ نہیں کہتا کہ میں اپنی زندگی کے زمانے میں جہاں عیش کرتا تھا اُس جگہ کو دیکھو اور مرنے کے بعد میں جس جگہ مٹی میں مل گیا ہوں اُس جگہ کو دیکھو - ہم نہیں کہہ سکتے کہ قدیم ہندو راجا اپنے نشاط محل اس طرح سجاتے تھے یا نہیں - مگر یہ بات یقینی ہے کہ ہندو قوم نے ان مقامات کی عزت کے ساتھ حفاظت نہیں کی - جن کی عظمت کو پھیلانے کے لئے نشاط محل بنے تھے انہیں کے ساتھ وہ خاک میں مل گئے لیکن جہاں انسانی طاقت اور عبادت اپنے حسن کی تخلیق کو خدا کی شان بہبودی کے بائیں طرف بٹھا کر متبرک ہوئی ہے وہاں دشوار گزار مقامات میں بھی ہم نے اُن حقیر مندروں کی حفاظت کرنے کی کوشش کی ہے - منگل (بہبودی) کے ساتھ ہی حسن کا اور وشنو کے ساتھ ہی لچھمی کا ملاپ کامل ہوتا ہے - دنیا کی تمام تہذیبوں میں یہی جذبہ پوشیدہ ہے - ایک دن ضرور آئے گا جب حسن ذاتی خود غرضی میں بندھا ہوا حسد سے زخمی اور تعیشات سے فرسودہ نہیں ہوگا بلکہ اطمینان اور منگل میں بے لاگ ہوکر جاگ اُٹھے گا - اگر حسن کو ہم اپنی نفسانی خواہش اور لالچ سے ہٹا کر نہ دیکھیں تو ہم اسے پورے طور پر نہیں دیکھ سکتے - بلا تربیت اور بے قابو ہوکر ہم جس حسن کو کامل طور پر نہیں دیکھتے اس سے ہمیں اطمینان نہیں ہوتا بلکہ ہماری نفسانی خواہش بڑھ جاتی ہے - کھانا نہیں ملتا شراب نوشی سے صحت بخش غذا کی طرف سے بھی

ہماری خواہش ھٹ جاتی ھے —

اسی تدرسے اخلاق کے معلم حسن کو دور ھی سے سلام کرنے کی نصیحت کرتے ھیں اور راہ راست پر چلنے سے بھی اس لئے منع کرتے ھیں کہ بعد میں نقصان نہ ھو - لیکن سچی نصیحت یہی ھے کہ حسن سے کامل طور پر لذت اندوز ھونے کے لئے ریاضت پیہم کی ضرورت ھے - برھمچریہ کے قیام کی بھی اسی لئے ضرورت ھے نہ کہ زاھد خشک بننے کے لئے —

جب ریاضت کی بحث چھڑ گئی ھے تو یہ سوال پیدا ھو سکتا ھے کہ اس ریاضت کا مقصد کیا ھے ؟ اور اس کی انتہا کہاں تک پہنچتی ھے - ھم اپنے ظاھری و باطنی حواس کے مقاصد کو سمجھہ سکتے ھیں لیکن احساس حسن نے ھمارے دل میں کیوں جگہ پائی ھے ؟

اس سوال کا جواب دینے کے لئے حسن کا راستہ کدھر کو جارھا ھے اس پر پھر ایک مرتبہ اختصار کے ساتھہ غور کرنے کی ضرورت ھے -

حسن کا احساس جب صرف ھمارے حواس ھی کے ذریعے ھوتا ھے تو ھم جسے حسین کہتے ھیں وہ بالکل صاف معلوم ھونے لگتا ھے یعنی صرف دیکھنے سے ھی آنکھیں اسے سمجھہ لیتی ھیں - وھاں ھمارے سامنے ایک طرف حسن اور دوسری طرف عدم حسن دو متضاد چیزوں کا جوڑا صاف نظر آتا ھے - اس کے بعد جب عقل بھی احساس حسن کی مددگار بن جاتی ھے تب حسن اور عدم حسن کا فرق نہیں رھتا - تب جو چیز ھمارے دل کو کھینچتی ھے ، وہ پہلی نظر میں ناقابل توجہ معلوم ھوئی ھو - آغاز کے ساتھہ انجام کا ، اھم کے ساتھہ غیر اھم کا اور ایک حصے کے ساتھہ دوسرے حصے کا گہرا تطابق دیکھنے سے ھمیں جہاں مسرت حاصل ھوتی ھے وھاں ھم نظر فریب حسن کے خط غلامی کو نہیں

مانتے - اس کے بعد جب مفید عام عقل کا میل ہوجاتا ہے تو ہمارے دل کی حکومت کا دائرہ اور وسیع ہوجا تا ہے اور حسین اور غیر حسین کا فرق اور بھی کم ہوجاتا ہے - اس وقت خیر خواہ عالم ستی عورت حسین نظر آتی ہے صرف شکیل عورت ہی نہیں - جہاں استقلال ' طاقت' معافی اور محبت کی روشنی ہوتی ہے وہاں رنگوں کی نمائش کی ضرورت ہمیں محسوس نہیں ہوتی - " کمارسنبھو " (کالی داس کی ایک نظم) میں بھیس بدلے ہوے " مہادیو " نے ریاضت کرنے والی " پاربتی " کے پاس جب " شنکر مہادیو " کی شکل' عادات اور عمر وغیرہ کی مذمت کی تو " پاربتی " نے کہا :- مماتر بھا و ئیک رسم منہہ اِستِھم" (میرا دل ان کے اندرونی محاسن پر شیدا ہے) اس لئے مسرت کے واسطے کسی اور ذریعے کی ضرورت ہی نہیں - اندرونی محاسن کے رس میں حسین اور غیر حسین کا تفاوت دور ہوجاتا ہے —

تو بھی منگل (افادے یا بہبودی) میں ایک طرح کے دو متضاد پہلو ہیں - منگل کے علم کے لئے اچھے اور برے کے تصادم کی ضرورت ہے لیکن اس طرح کے دو مقابل جوڑوں میں کوئی بھی ختم نہیں ہوسکتا دونوں کا نتیجہ ایک ہی ہوتا ہے دو نہیں - جب تک ندی چلتی ہے تب تک دونوں کناروں کی ضرورت ہوتی ہے لیکن جہاں اس کا چلنا ختم ہو جاتا ہے وہاں صرف بغیر کنارے کا غیر محدود سمندر ہوتا ہے - جب تک دریا رواں ہے تب تک دو مقابل کنارے ہیں لیکن جب اس کی روانی ختم ہوجاتی ہے تو دونوں کناروں کی جوڑی بھی ختم ہو جاتی ہے - آگ جلانے کے وقت دو لکڑیوں کو رگڑنا پڑتا ہے لیکن جب آگ جل اٹھتی ہے تو اِن دونوں لکڑیوں کی آپس کی رگڑ بھی ختم ہو جاتی ہے - ہمارا

احساس حسن بھی ٹھیک اسی طرح اگر احساسات کے مسرت افزا اور رنج دہ اور زندگی کے مفید اور غیر مفید ان دونوں قسم کے تصادم کی دو مقابل جوڑیوں میں چنگاریاں اُڑاتے اُڑاتے اگر ایک دن پوری طرح جل اٹھے تو اس کی جزئیت اور تصادم ختم ہوجاتا ہے۔

تب کیا ہوتا ہے؟ اُس وقت مقابل جوڑیوں کا فرق ناپید ہوجاتا ہے اور سب کچھ حسین ہوجاتا ہے، تب سچ اور حسن ایک ہی ہو جاتے ہیں۔ تب ہم سمجھ سکتے ہیں کہ در اصل سچ کی حقیقی تحصیل ہی مسرت ہے۔ یہی سب سے بڑا اور آخری حسن ہے۔

اس غیر مستقل دنیا میں ہمیں سچ کا مزہ کس جگہ ملتا ہے؟ جہاں ہمارا دل رہتا ہے۔ راستے کے لوگ آتے جاتے رہتے ہیں وہ ہمارے نزدیک سایہ ہیں ہمیں ان کا علم بہت کم ہے اس لئے ہمیں ان کے بارے میں مسرت نہیں ہوتی۔ بھائی ہونے کی حقیقت ہمارے نزدیک اہم ہوتی ہے اور یہی حقیقت ہمارے دل کو سہارا دیتی ہے۔ بھائی کو جس قدر سچائی کے روپ میں ہم جانتے ہیں وہ ہمیں اتنا ہی مسرت دیتا ہے۔ جو ملک ہمارے لئے جغرافیہ کے نام کی حیثیت رکھتا ہے اُس ملک کے لوگ اِس ملک کے لئے جان دے دیتے ہیں۔ وہ ملک کو بہت بڑی سچائی کی شکل میں جان سکتے ہیں اس لئے اس پر جان دے سکتے ہیں۔ جس علم سے ایک جاہل کو ڈر معلوم ہوتا ہے ایک عالم اس میں اپنی پوری زندگی وقف کردیتا ہے۔ بات یہ ہے جہاں ہمیں سچائی حاصل ہوتی ہے وہیں ہم مسرت کو دیکھ سکتے ہیں جہاں ہمیں سچائی پورے طور پر حاصل نہیں ہوتی وہیں مسرت کا فقدان نظر آتا ہے۔ جس سچائی میں ہمیں مسرت حاصل نہیں ہوتی اُسے ہم جانتے تو ہیں مگر اُسے ہم نے حاصل نہیں کیا ہے۔

جو سچائی ہمارے لئے پوری طرح سچ ہوتی ہے اسی سے ہمیں محبت ہوتی ہے اور اُسی میں ہمیں مسرت حاصل ہوتی ہے۔

اس طرح سمجھنے سے احساس حق اور احساس حسن ایک ہو جاتے ہیں۔

انسان کا تمام ادبیات، موسیقی اور فنون لطیفہ دانستہ اور نادانستہ طور پر اسی طرف جارہے ہیں۔ انسان اپنی نظموں میں، تصویروں میں اور صنعت میں سچائی کو نمایاں کر کے پیش کر رہا ہے۔ پہلے جو چیز آنکھوں میں کشش نہیں پیدا کرتی تھی اور اس لئے جس کی ہستی ہمارے لئے حقیقی نہیں تھی شاعر اُسے ہماری نظر کے سامنے لاکر ہماری سچائی اور مسرت کی حکومت کی حد کو وسیع کردیتے ہیں۔ بالکل معمولی اور حقیر چیزوں کو انسان کا ادبیات روز بروز سچائی کی شان میں نمایاں کر کے حسن صنعت سے انہیں اہم بناتا جاتا ہے۔ جو صرف روشناس تھا اُسے بھائی بنارہا ہے، جو صرف نظر کے سامنے آتا تھا اس کی طرف دل کو کھینچ رہا ہے —

آج کل کے شاعر کہتے ہیں - (Truth is beauty , beauty truth.) صداقت حسن ہے اور حسن صداقت ہے۔ ہماری سفید لباس والی، کنول میں رہنے والی دیوی سرسوتی (علم کی دیوی) ایک ہی ساتھ Truth (صداقت) اور Beauty (حسن) کی تصویر ہے - اُپنشد (ویدانت کی کتابیں) بھی کہتی ہیں "آنند روپم امرتم یدوِ بھاتی" یعنی جو کچھ نمایاں ہو رہا ہے وہ اُسی کی مسرت کی شکل ہے، اُسی کی بقا کی شکل ہے - ہمارے پانو کی خاک سے لیکر آسمان کے تاروں تک سب کچھ ہی Truth اور سب کچھ ہی Beauty ہے سب کچھ ہی مسرت اور بقا (آنند روپم امرتم) ہے۔

سچ کے اسی آنند روپ اور امرت روپ کو دیکھ کر اُس مسرت کو نمایاں کرنا ہی ادبیات شعری کا مقصد ہے۔ جب ہم سچائی کو صرف آنکھوں سے

دیکھتے ھیں، عقل کے ذریعے حاصل کرتے ھیں تب نہیں بلکہ جب اُسے دل کے ذریعے حاصل کر لیتے ھیں تب اسے ادبیات میں نمایاں کر سکتے ھیں - تو کیا ادبیات باکمال صنعت کی تخلیق نہیں ھے؟ وہ کیا صرف دل کی ایجاد ھے؟ اس میں تخلیق کا بھی ایک حصہ ھے؛ اسی ایجاد کی حیرت کو اُسی ایجاد کی مسرت کو دل اپنی الوھیت کے ذریعے زبان میں، آواز میں یا رنگوں میں مخصوص کرلیتا ھے۔ اسی میں تخلیق کی مہارت ھے - یہی ادبیات ھے یہی موسیقی ھے اور یہی فن مصوری ھے-

ریگستان کے وسیع ریتلے میدان میں کھڑے ھوکر انسان نے اُس ریگستان کو " دو اھراموں " سے جو اُس کی حیرت کی علامتیں ھیں، نشان زدہ (مخصوص) کر لیا ھے - سنسان جزیرے کے ساحل سمندر کو انسان نے پہاڑ کے جسم میں ایسے غار کھود کر مخصوص بنا دیا ھے جو باکمال صنعت سے پر ھیں اور کہا ھے کہ اِس سے میرے دل کو تسکین ھوی ھے - یہی علامت بمبئی کے " ایلفنٹا کیوز " ھیں - مشرق کی طرف کھڑے ھوکر انسان نے سمندر میں طلوع آفتاب کی عظمت کو دیکھا اور کئی سو کوسوں کے فاصلے سے پتھر لا کر وھاں اپنے ھاتھ جوڑنے کی علامت قائم کردی- یہی " کنارک " کا مندر ھے - سچ کو جہاں انسان نمایاں شکل میں یعنی مسرت اور حیات ابدی کی شکل میں حاصل کرتا ھے وھیں ایک علامت قائم کردیتا ھے یہی علامت کہیں مورتی کہیں مندر، کہیں تیرتھ اور کہیں راجدھانی ھو جاتی ھے - ادبیات بھی اسی قسم کی علامت ھے - تمام دنیا کے جس کسی گھاٹ پر انسان کا دل آکر ٹکراتا ھے وھیں وہ زبان کے ذریعے ایک ھمیشہ رھنے والے تیرتھ کو بنانے کی کوشش کرتا ھے اور اس طرح ساحل دنیا کے تمام مقامات کو وہ مسافروں کے دل کے لیے استعمال

کرنے اور پہنچنے کے قابل بنا دیتا ہے - اس طرح انسان سمندر ، زمین اور آسمان میں ، گرمی بسنت اور برسات میں ، مذھب ، اس کے کارناموں اور تاریخ میں ناممکن البیان حسین علامتیں قائم کرکے انسان کے دل کو سچ کی حسین صورت کی طرف لگاتار بلا رہا ہے - ہر ملک میں ہر وقت یہی علامت ، یہی آواز وسیع ہوتی چلی جارہی ہے - دنیا میں ہر جگہ اگر انسان ادبیات کے ذریعے دل کی ان علامتوں کو قائم نہ کرتا تو یہ دنیا ہمارے لئے کتنی تنگ ہوتی- اس کا ہم خیال بھی نہیں کرسکتے- آج جو یہ آنکھوں دیکھی اور کانوں سنی دنیا وسیع دائرے میں ہمارے دل کی دنیا بن گئی ہے اس، کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ انسان کی ادبیات نے دل کی ایجاد کی علامتوں سے دنیا کو آراستہ کردیا ہے —

سچ تمام دنیا کی چیزوں میں سکون اور حرکت کا تناسب ہے - سچ فعل اور علت کا سلسلہ ہے - اس بات کے بتانے کے لئے دوسرے شاستر ہیں لیکن ادبیات بتلاتا ہے : سچ ہی مسرت ہے ' سچ ہی حیات ابدی ہے - ادبیات اُپنشد کے اس منتر کی آئے دن تشہیر کررہا ہے :-" رسووئی سہہ رسم ہییے وایم لب دھوانندی بھوَتی " یعنی وہ (خدا) رس کی شکل ہے اسی رس کو پاکر انسان مسرور ہوتا ہے —

—*—

مرحوم دھلی کالج

از

(جناب پنڈت منوہر لال زتشی صاحب ایم اے)

مکرمی مولوی عبدالحق صاحب نے رسالۂ اُردو کے سنہ ۱۹۳۳ کے چار نمبروں میں قدیم دھلی کالج کے حالات شائع کرکے اس رسالے کے پڑھنے والوں پر بڑا احسان کیا ھے- ان مضامین میں اس مشہور درسگاہ کے مفصل حالات درج ھیں- دھلی کالج کی تاریخ اُس کے قواعد انتظام، اُس کے مختلف شعبوں کا نصاب تعلیم، اُس کے اساتذہ، اُس کے طلبا، غرض کہ ان مضامین سے کالج کے ھر صیغے کی کیفیت معلوم ھوتی ھے - چوتھے مضمون میں دھلی کالج کے چند ممتاز طلبا کا ذکر ھے اور اسی کی بابتہ مجھے دو تین باتیں عرض کرنی ھیں —

۱ - رسوم ھند کے دو حصے الگ الگ چھپے ھیں- ھر حصے میں چار باب ھیں- پہلے دو باب ھندؤں سے متعلق ھیں اور آخری دو باب مسلمانوں سے - ان میں دونوں گروھوں کے حالات ، رسم و رواج اور عقائد کا ذکر قصوں کے پیرایے میں ھے- جو قصے مسلمانوں سے متعلق ھیں وہ ڈاکٹر ضیاء الدین کی تصنیف ھیں اور جن کا ھندؤں سے تعلق ھے وہ ماسٹر پیارے لال نے لکھے ھیں —

۲ - صفحه ۶۳۶ میں قدیم طلبا کے ضمن میں "دهرم نرائن ابن بشن نرائن" کا ذکر هے - پنڈت دهرم نرائن صاحب عرف هاکسر دهلی کالج کے ممتاز طلبا میں تھے- ملازمت کے سلسلے سے اندور میں اور پھر گوالیار میں رهے- گوالیار میں آپ مہا راجه صاحب مرحوم کے اتالیق تھے- پنڈت دهرم نرائن هاکسر کے پوتے، کیلاس نرائن هاکسر هیں- آپ ریاست گوالیار کے عهائد اعلیٰ میں سے هیں اور هندوستانی ریاستوں کے معاملات میں ایک سچے اور خوش فکر مدبر سمجھے جاتے هیں - پنڈت دهرم نراین نے پولیٹکل اکانومي کی دو کتابوں کا ترجمه کیا تھا - ایک زمانۂ طالب علمی میں دهلی کالج کی ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی کے واسطے اور دوسرا سنه ۱۸۶۸ع میں علی گڈه کی سائنٹفک سوسائٹی کے لئے جو انسٹیٹیوٹ پریس سے سنه ۱۸۶۹ میں شائع هوا - اس دوسري کتاب کا نام اُصول سیاست مدن هے اور اس کے دیباچے میں پنڈت دهرم نرائن فرماتے هیں —

"ارباب سخن نے جو براہ مہربانی میرے رسالے اُصول حکومت * کو زیادہ اس سے که توقع تھی پسند فرمایا اس لئے جرأت هوئی که ایک رساله اُصول انتظام مدن میں ترتیب دیا جاے- اس فن شریف کی ضرورت صرف انهیں لوگوں کو نهیں هے جو اپنے ملک کی ملکی اور معاشرت کی حالت کو بهتر کرنا چاهتے هیں بلکه ان کو بھی جو انتظام امور خانه داری میں کامیاب هونے کی تمنا رکھتے هیں- باوجود اس قدر بکار آمد هونے اس علم کے ملک ایشیا میں اس کو وہ وسعت حاصل

* Principles of Government.

نهیں هوئی جو هونی چاهئیے تهی- راقم نے به ایام طالب علمی ویلنڈ صاحب کے مختصر رسالے کا ترجمه زبان اُردو میں کیا تها اور اس کو سوسائٹی اشاعت علوم مفیدہ نے که به اعانت مدرسه دهلی کے ترویج علوم میں مصروف تهی سنه ۱۸۴۵ میں چهپوایا تها مگر چونکه اس زمانے میں ترقی کے ایسے مختصر رسالے سے رفع هونا ضرورت کا نظر نه آیا اس لئے راقم نے ارادہ کیا که کوئی ایسی کتاب تالیف کی جاے جو جمیع اُصول کو اس فن کے حاوی هو .... اور چونکه بعد مطالعه چند کتابوں کے یه یقین هو گیا که موشگافی اور ترتیب میں کوئی مصنف مل صاحب * سے گوے سبقت نهیں لے گیا اس لیے انهیں کی کتاب کی ترتیب کا پابند رهنا قرین صواب نظر آیا اور انهیں کی کتاب کا مقالۀ اول که تیرہ باب کو مشتمل هے نذر ارباب سخن کیا جاتا هے "—

اس دیباچے کے پهلے فقرے سے جسے میں نے اوپر نقل کیا هے معلوم هوتا هے که پنڈت دهرم نرائن نے کوئی کتاب اُصول حکومت پر بهی لکهی تهی اور جناب مولوی عبدالحق صاحب اپنے مضمون میں لکهتے هیں که انهوں نے "کچهه حصه تاریخ انگلستان کا بهی ترجمه کیا" مگر یه کتابیں میری نظر سے نهیں گذریں غالباً یه اب نایاب هیں- 'اُصول سیاست مدن' البته کچهه عرصه هوا علی گڈہ کالج کی ڈیوٹی شاپ سے مل جایا کرتی تهی- معلوم نهیں اب بهی مل سکتی هے یا نهیں—

۳ - مجهے تعجب هوا که دهلی کالج کے طلبا کے ضمن میں پنڈت موهن لال

---

* John Stuart Mill.

کا ذکر نہیں۔ پنڈت دھرم نرائن اور پنڈت موتی لال کی طرح (جن کا ذکر مولوی عبدالحق صاحب کے مضمون میں ہے) پنڈت موھن لال بھی کشمیری پنڈت تھے - دھلی کالج میں سلسلۂ تعلیم ختم کر کے سرکار انگریزی کے ملازم ھوے - ان کے باپ کا نام راے بدھ سنگھ اور دادا کا نام راجہ منی رام تھا- ان کے والد مانسٹوارٹ الفنسٹن کے ساتھہ پشاور گئے تھے اور پنڈت موھن لال نے نہ صرف پشاور، کابل، بلخ، بخارا اور ایران کا سفر کیا بلکہ وہ یورپ بھی تشریف لے گئے - ایران میں ان کو نائٹ آف دی پرشین آرڈر آف دی لائن اینڈ دی سن * کا خطاب ملا تھا - انگلستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائرکٹروں کی طرف سے ان کی خاطر و مدارات کی گئی اور جرمنی میں ملک پرشیا کے بادشاہ فریڈرک ولیم چہارم کو اپنی ایک تصویر عنایت کی - بزرگوں سے سنا ھے کہ فرنگستان کے لوٹنے کے بعد دھلی کی کشمیری پنڈت برادری نے پنڈت موھن لال کو شامل کرنے میں کچھہ حجت کی اس تنگ خیالی کا نتیجہ وھی ھوا جو اس زمانے میں ھونا چاھئے تھا یعنی یہ کہ پنڈت موھن لال مسلمان ھوگئے اور اپنا نام آغا حسن خاں رکھہ لیا پنڈت کسی مسلمان گھرانے میں شادی بھی کی ان کے ایک لڑکے صوبجات متحدہ کے محکمۂ پولس میں ملازم تھے - پنڈت موھن لال کی دو انگریزی کتابوں سے میں واقف ھوں دونوں سنہ ۱۸۴۶ ع میں لندن میں چھپی تھیں - ایک امیر دوست محمد خاں والی کابل کی لائیف دو جلدوں میں اور دوسری ان کے سفر کی کہانی جس کا نام انگریزی میں Travels ھے اور جس کے شروع میں پنڈت موھن لال کے حالات مسٹر سی - ای -

---

* Knight of the Persian Order of the Lion and the Sun.

ترے و لین کے لکھے ہوے درج هیں —

دهلی کالج کے دو اور طلبا کا ذکر کردوں- ایک سر تیج بہادر سپرو کے دادا پنڈت رادھا کشن سپرو - پنڈت رادھا کشن فارغ التحصیل هونے کے بعد کچھه دن تک دهلی کالج میں ریاضی کے ٹیچر تھے - اس کے بعد ڈپٹی کلکٹر هوگئے - غدر سنہ ۵۷ ع کے زمانے میں آپ بجنور میں سید احمد خاں صاحب کے ساتھه تھے پنشن پانے کے بعد دهلی میں اور پھر الہ‌آباد میں رها کرتے تھے - دوسرے پنڈت بشمبھر ناتھه صاحب — تعلیم ختم کرنے کے بعد پہلے آپ آگرہ کی بر صدر دیوانی عدالت میں اور پھر الہ‌آباد کے هائی کورٹ میں وکالت کرتے تھے اور اس زمانے کے ممتاز وکلا میں تھے کانگریس کے شریک تھے اور جب سنہ ۱۸۹۲ ع میں الہ‌آباد میں دوسری مرتبہ کانگرس کا اجلاس هوا تو آپ استقبالی کمیٹی کے صدر تھے - کئی برس تک صوبجات متحدہ اور اس کے بعد وائسراے کی کونسل کے ممبر رهے - خوش قسمت تھا وہ کالج جس نے ایسے ایسے نامور طلبا پیدا کئے —

---

* C. E. Trevelyan.

لطیفۂ فرقت

از

(جناب محمد اظہار الحسن صاحب بی۔ اے، ال ال۔ بی (علیگ) وکیل غازی آباد)

مشرقی شاعری کی اصناف سخن میں سب سے زیادہ کارآمد صنف مثنوی ہے۔ مسلسل نظم ہونے کے باعث اس میں ہر قسم کے جذبات، خیالات اور واقعات کی تصویر کھینچی جاسکتی ہے اور غزل قصیدہ، ہجو، مسدس، مخمس، ترجیع بند، غرض کہ جملہ اصناف سخن کا کام مثنوی سے لیا جاسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی بہترین نظمیں مثنوی میں لکھی گئیں۔ سنسکرت کی مہابھارت، فارسی کا شاہنامہ اور اُردو کی سحرالبیان جیسی نظمیں اسی صنف میں ہیں۔

اُردو شاعری کا غالب حصہ غزل تک محدود ہے اور شاید ہی کوئی شاعر ایسا گزرا ہو جس نے غزل نہ کہی ہو؛ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اردو شاعری کی ابتدا ہی غزل سے ہوتی ہے۔ پھر بھی مثنوی لکھنے کا رواج اُردو شاعری میں بہت پرانا ہے۔ چنانچہ اول اول دکن میں قطب شاہ وغیرہ اور دہلی میں آبرو جیسے بزرگوں نے مثنوی لکھنی شروع کی۔ میر و سودا اور اثر نے بھی مثنویاں لکھیں جو کافی مشہور ہوئیں۔ جعفر علی حسرت نے ایک مبسوط مثنوی "طوطی نامہ" لکھی جس میں رزم اور بزم دونوں کا امتزاج ہے مگر قبول عام نصیب نہ ہوا۔

ان کے بعد میر حسن کا نمبر آتا ہے جن کی مشہور عالم مثنوی کی سحر بیانیاں آج بھی ارباب ادب اور اصحاب ذوق سلیم سے خراج تحسین وصول کرتی ہیں - لکھنؤ میں مثنوی کا رواج بہت بعد کو ہوا - لکھنؤ اسکول کی پہلی مثنوی پنڈت دیا شنکر نسیم کی گلزار نسیم ہے - گلزار نسیم کو وہ قبول عام نصیب ہوا کہ اس کی اشاعت کے تھوڑے ہی عرصے کے بعد متعدد مثنویاں لکھی گئیں جن میں قلق کی طلسم الفت اور شوق کی زہر عشق کو بقاے دوام کا خلعت حاصل ہوا اور ماضی قریب میں منشی احمد علی شوق کی مثنویوں سے نسیم آنجہانی کی یاد تازہ ہوئی- اردو مثنوی کی ابتدا دکن سے ہوئی، عروج دہلی میں ملا، لیکن حق یہ ہے کہ اس صنف کو لکھنؤ نے اس کمال پر پہنچایا کہ مسدس (مرثیہ) کی طرح یہ بھی خاص لکھنو کی چیز بن گئی —

اس وقت جس چیز کو قارئین کرام کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں وہ بھی ایک مثنوی ہے جو نسیم کے ایک ہم وطن اور ہم قوم بزرگ پنڈت دیبی پرشاد کول المتخلص بہ فرقت نے گلزار نسیم کی تصنیف کے ۱۹ برس بعد سنہ ۱۲۷۳ ھجری میں لکھی تھی اور جو مطبع مہدی میں طبع ہوئی تھی- پنڈت دیبی پرشاد کے والد کا نام پنڈت ٹھاکر پرشاد تھا - آپ کشمیریوں کے مشہور فرقے کے نونہال تھے جو اپنی علم دوستی اور اردو نوازی کے لئے مشہور ہے - امانت لکھنوی سے تلمذ حاصل تھا - افسوس ہے کہ اس سے زیادہ حالات فرقت کے دستیاب نہیں ہوے - بہار گلشن کشمیر اور بہار سخن دونوں میں نام، ولدیت، سکونت، تخلص اور شاگردی کے بیان پر اکتفا کر لیا گیا ہے - بلکہ بہار سخن میں تو تخلص بھی فرقت کی جگہ فرحت لکھا ہے - مثنوی کے سرورق سے بھی بس اتنا ہی معلوم ہو سکا - خود

مثنوی میں کوئی ذکر ان کی اپنی ذات کے متعلق نہیں ملتا ـــ

اردو میں مثنویاں تو متعدد لکھی گئیں لیکن عام طور پر محض تفریح طبع کے لئے۔ کسی کسی نے تصوف اور نعت و منقبت کی طرف بھی توجہ کی ورنہ زیادہ تر تو حسن و عشق کی داستانیں اور جن اور پریوں کے قصے ھی مثنویوں کے موضوع رھے۔ زیر نظر مثنوی شہر آشوب کے قسم کی چیز ھے۔ یہ ایک محروم تخت و تاج شہر یار واجد علی شاہ اختر کی خدمت میں عقیدت کے چند پھول اور لکھنؤ کے لٹے ھوے سہاگ پر رنج و غم کے چند آنسو ھیں جو صفحات قرطاس پر ٹپک پڑے ھیں۔ لکھنؤ اور دھلی کی سلطنتوں کی بدانتظامیوں اور ان کے فرماں رواؤں کی غیر ذمہ داریوں کے متعلق کچھ بھی کیوں نہ کہا جاے لیکن یہ واقعہ ھے کہ رعایا کے قلوب میں ان کے لئے عزت و احترام اور محبت و عقیدت کے جذبات موجزن تھے۔ اب بھی لکھنؤ میں ایسے لوگ موجود ھیں جو آصف الدولہ کا نام لے کر اپنی دوکانیں کھولتے ھیں۔ فرقت نے اپنی مثنوی میں ان لوگوں کی ترجمانی کی ھے جو واجد علی شاہ کی تباھی کو لکھنؤ کی تباھی سمجھتے تھے۔ فرقت کو دربار اختری سے کوئی تعلق نہ تھا۔ وہ سلطان عالم کے قریب پہنچنا ضرور چاھتے تھے لیکن یہ تمنا ان کے دل کے دل ھی میں رھی۔ چنانچہ لکھنؤ اور لکھنؤ والوں کی تباہ حالی کے ذکر کے بعد کہتے ھیں ـــ

جو گزری سبھوں پر وہ میں نے کہی   و لیکن تمنا یہ دل میں رھی
زمانے کو حضرت نے بخشے خطاب   ھوا بزم شہ میں نہ میں باریاب
خیال قدمبوس ھر آن تھا   مجھے مدتوں سے یہ ارمان تھا
کہ سلطان عالم کے پہنچوں قریب   نہ دیدار گُل شد بہ بلبل نصیب

واجد علی شاہ کے محروم تخت و تاج ہونے سے ان کو اپنی نوکری کا الم نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ دربار سے متعلق نہ تھے، ہاں ایک غم تھا اور وہ یہ کہ اودھ کے اس بدنام حکمران کے زیر سایہ ہلسی خوشی گزر اوقات ہو جاتی تھی لیکن اس کے مہذب جانشینوں کے عہد میں آبرو سنبھالنا بھی دشوار ہو گیا تھا - یہی چیز تھی جس نے ان کو اپنے جذبات نظم کرنے پر مجبور کردیا —

سبھوں کو تو ہے نوکری کا الم	ہمیں ہے فقط شہ کے جانے کا غم
کہ تھا کچھ تعلق نہ سرکار سے	نہ واقف تھے ہم شہ کے دربار سے
مگر عیش و عشرت میں بایکدگر	خوشی سے تھی اوقات ہوتی بسر
سو وہ اِس زمانے میں دشوار ہے	خیال اپنی عزت کا ہر بار ہے

انتزاع سلطنت کے بعد یہ تجویز کی گئی کہ ایک شاہی ڈیپوٹیشن بسر کردگی جنابۂ عالیہ ملکہ کشور صاحبہ انگلستان جاکر کمپنی کے مظالم کی فریاد پارلیمنٹ کے ارکان اور وزرائے سلطنت برطانیہ کے روبرو کرے اور خود فرماں روائے مملکت کے حضور میں شرف باریابی حاصل کر کے تخت و تاج کے لئے استغاثہ پیش کیا جائے - خیال یہ تھا کہ ملکۂ وکٹوریہ عورت ذات ہونے کی وجہ سے شاید جنابۂ عالیہ کے کہنے سننے سے متاثر ہو جائیں اور ظلم رسیدوں کی داد مل جائے- جنابۂ عالیہ سلطان عالم واجد علی شاہ کی والدۂ محترمہ بڑی عقل و فہم کی خاتون تھیں - امور سلطنت میں ہمیشہ جنابہ عالیہ سے مشورہ کیا جاتا تھا - غرض بڑے ارمانوں اور امیدوں سے شاہی فریادیوں کا یہ قافلہ لکھنؤ سے چلا - بنگال پہنچ کر سلطان عالم کو ناسازی مزاج کی وجہ سے کلکتہ ٹھہر جانا پڑا اور جنابۂ عالیہ' ولی عہد سلطنت (مرزا کیوان قدر ہمایوں جاہ قیصر حشم حامد علی بہادر) اور جرنیل صاحب

(مرزا سکندر حشمت دارا مرتبت محمد جواد علی بہادر سلطان عالم کے برادر اصغر) کے همراہ " بنگال " نامي جہاز پر سوار ہوکر جون سنہ ۱۸۵۶ ع میں انگلستان سدھاریں - سلطنت کے ایک قدیم وفادار ملازم میجر برت اور منشی مسیح الدین خاں بطور مہتمم و منتظم ساتھہ تھے - غرض بڑے حشم و خدم اور کر و فر کے ساتھہ یہ قافلہ عدن اور قاہرہ ہوتا ہوا انگلستان کے بندرگاہ سود ھمپٹن (Southampton) پہونچا - ساحل پر انگلستان والوں کا ایک جم غفیر زیارت کا مشتاق موجود تہا - اتفاقاً جس زمانے میں جنابۂ عالیہ کا ورود انگلستان میں ہوا ملکہ وکٹوریہ کو دارالحکومت سے باہر جانا تہا - چنانچہ جنابۂ عالیہ کو باریابی کے انتظار میں قیام کرنا پڑا- اس دوران میں اراکین پارلیمنٹ اور وزراے سلطنت سے جرنیل صاحب اور منشی مسیح الدین خاں کی ملاقاتیں استرداد سلطنت کے سلسلے میں ہوئیں - ملکہ معظمہ کي واپسی کے بعد جنابۂ عالیہ کو شرف باریابی عطا ہوا اور صاحب تخت و تاج ملکہ محروم افسر و اورنگ مہماں کے ساتھہ بڑے لطف و مودت سے پیش آئیں اور تفصیلی ملاقات کا وعدہ فرمایا - دارالعوام میں مقدمے کی پیشی کی اجازت بھي مل گئی تھی کہ اتنے میں سنہ ۵۷ ع کی شورش کی خبریں پہنچیں جن سے اهل انگلستان کے طرز عمل میں یکا یک انقلاب ہوگیا اور یہ خیال کیا جانے لگا کہ انتزاع سلطنت اودھ هی غدر کا باعث ہوا - غرض سارا کیا ہوا خاک میں مل گیا —

فرقت نے اپنی مثنوی میں جنابۂ عالیہ کے ورود انگلستان اور اراکین دولت کے ساتھہ جرنیل صاحب اور مرزا ولیعهد بہادر کی ملاقات کا بیان لکھا هے - اس وقت تک ملکہ وکٹوریہ سے ملاقات نہ ہونے پائي تھی - اس زمانے میں اردو اخبارات کی ابتدا تھی - صحیح اور مفصل خبروں کی اشاعت

کا انتظام کیا ہوتا ' فرقت نے جو کچھہ سنا اس کو نظم کردیا ـــ

یہ مثنوی ایک مختصر سی نظم ہے کل ۲۹۴ اشعار ہیں جو ایک ہفتے میں موزوں ہوگئے تھے آخر میں چند قطعات تاریخ میں امانت نے بھی لائق شاگرد کی حوصلہ افزائی یوں کی ہے :

کہا شہر آشوب فرقت نے ایسا دو بالا ہوئی شوکت و شان عالم
اسے پڑھ کےھر دل کو ہوتی ہے صحت پڑے درد فرقت ہے درمان عالم
صفائی جو بندش کی دیکھی سراسر بنی آئینہ چشم حیران عالم
امانت نے کی سال کی فکر جس دم جگر ھل گیا بہر سلطان عالم
نکل آئی تاریخ اس طرح لب سے یہ پر درد ہے مثنوی جان عالم

انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ محکوم میں حاکم کی تقلید کا جذبہ پیدا ہوجاتا ہے - دیکھہ لیجئے ہندوستانی تعلیم ' تہذیب اور تمدن پر مغرب کا کتنا زبردست اثر پڑا ہے - تعلیم یافتہ اور ' مہذب ' طبقے کی معاشرت بالکل انگریزی ہو گئی ہے - پرانے رسم و رواج قریب قریب مٹ گئے ہیں اور جو باقی ہیں وہ بھی دستبرد زمانہ کی نذر ہوتے جارہے ہیں- یہ حال تو اس وقت ہے جب موجودہ حکمران قوم محکوموں سے مجلسی اور معاشرتی تعلقات رکھنا پسند نہیں کرتی اور ہندوستان کو عارضی قیام گاہ سے زیادہ وقعت نہیں دیتی ہے - ظاہر ہے کہ ہندو تہذیب و معاشرت پر اسلامی تمدن کا اثر کتنا زبردست ہوا ہوگا جب کہ مسلمانوں نے صدیوں تک یہاں اس طرح حکمرانی کی کہ یہیں کی ایک قوم بن گئے اور ہندؤں کے ساتھہ رہنے سہنے مرنے جینے اور شادی بیاہ کے تعلقات پیدا کر لئے - یہی وجہ تھی کہ اردو کے سرمایۂ مشترک ہونے کے باوجود اس زبان کی تصانیف میں اسلامی رنگ غالب ہوگیا تھا ـــ

بالخصوص لکھنؤ میں تو بظاہر ہندو اور مسلمانوں میں کوئی امتیاز نہ تھا - اس زمانے کے مسلمان اہل قلم اپنی تصنیفات کو حمد و نعت سے شروع کیا کرتے تھے - ان کی تقلید میں غیر مسلم مصنفین نے بھی یہی روش اختیار کی - لطیفۂ فرقت کی ابتدا بھی حمد سے ہوتی ہے - بعض شعر اچھے نکالے ہیں —

وہ دانا وہ قادر وہ ستار ہے وہ ایزد وہ رحماں وہ غفار ہے
کوئی اس کی صنعت تو دیکھے ذری ہوا پر رکھا چرخ نیلو فری

اس کے بعد حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی منقبت میں چند شعر ہیں - مثنوی لکھنے والوں کا ایک یہ قاعدہ بھی تھا کہ بادشاہ وقت کی تعریف میں بڑی چند شعر لکھا کرتے تھے - فرقت نے زوال سلطنت کے بعد مثنوی لکھی تھی اس لئے مدح بادشاہ کے بجاے " مناجات درگاہ جناب باری میں واسطے ترقی مدارج سلطان عالم کے " لکھی —

اس مثنوی کے متعلق ایک امر کسی قدر تعجب خیز ہے - فرقت امانت کے شاگرد تھے اور امانت رعایت لفظی اور ضلع جگت کے لئے بدنام ہیں - قدرتی طور پر فرقت کا رجحان طبع بھی اسی طرف ہونا چاہئے - اس کے علاوہ صنائع ، بدائع ، تکلف ، تصنع اور آورد لکھنؤ کے رنگ سخن کا امتیاز ہیں - لطیفۂ فرقت کی تصنیف سے صرف انیس سال قبل پنڈت دیا شنکر نسیم اسی طرز کلام میں گلزار نسیم لکھ کر اپنے معراج کمال کا ثبوت دے چکے تھے - اندریں حالات یہ توقع ہونی چاہئے تھی کہ فرقت گلزار نسیم کو پیش نظر رکھ کر مثنوی لکھنے کے لئے قلم اٹھائیں گے - لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا بلکہ میر حسن کی سحرالبیان کو اپنا نمونہ

بنایا - سحرالبیان کا مطلع ہے :

کروں پہلے توحید یزداں رقم　　جھکا جس کے سجدے کو اول قلم

فرقت نے انہی دونوں قافیوں میں مطلع نکالا ہے —

صفت پہلے فرقت کر اس کی رقم　　کہ جو ہے خداوند لوح و قلم

مثنوی کی بحر بھی وہی رکھی ہے جو سحرالبیان کی ہے بلکہ کہیں کہیں میر حسن کے اشعار بھی داخل کر لئے ہیں -

مسلسل نظم کے لئے بیان کی صفائی، سادگی اور تسلسل لازمی چیزیں ہیں - میر حسن کی سحرالبیان کی مقبولیت کا بڑا راز یہی ہے کہ اس کی زبان سادہ اور بیان مطابق فطرت ہے - تکلفات لایعنی کو اس میں دخل نہیں دیا گیا - دلکش اور صاف عبارت میں واقعات نظم کردیے ہیں جن کو ہر شخص پڑھتا اور سمجھتا ہے - صنایع بدائع کی الجھنوں سے دماغ پریشان نہیں ہوتا - فرقت نے اسی انداز سخن کے تتبع کی کوشش کی ہے - اور مثنوی کے بیشتر حصے میں یہ بات پائی جاتی ہے - مناجات کے اشعار جوش بیان اور سادگی زبان کی وجہ سے کافی دلکش ہو گئے ہیں - یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے اپنی واردات اور محسوسات کو نظم کا جامہ پہنایا ہے - لفظ لفظ سے محبت و عقیدت ٹپکی پڑتی ہے - دیکھئے کس حسرت سے کہتے ہیں :

رعیت کی حالت بہت ہے تباہ　　شتابی سے آے مرا بادشاہ

... ...

پھرے باغ میں وہ شہ نامدار　　چمن سے خزاں جاے آے بہار

چمک پر جہاں کا ستارا رہے　　نہ گردش میں اختر ہمارا رہے

جلو میں وہی چتر شاہی رہے　　سدا سر پہ ظل الٰہی رہے

چھٹے غم کی ظلمت سے وہ خوش صفات سکندر کو مل جائے آب حیات

.. ..

کوئی شہ کے آنے کا پھر طور ہو نہ چرخ اختر کا پھر دور ہو

ولی عہد بہادر کی زبانی ملک کی تباہی کا نقشہ یوں کھینچا گیا ہے:-

ہمیں ہے جب اس درجہ حاصل ملال تو پھر کیا رعیت کا واں ہوگا حال

سفر کرکے ہم آے کس حال سے محرم وہاں ہوگا اک سال سے

ہزاروں نے پیٹے دئے ہوں گے چھوڑ سرے ہوں گے لاکھوں ہی سراپنے پھوڑ

. .. .

ہمارے جو تھے عہد میں واں امیر یقیں ہے ہوے ہوں گے اب وہ فقیر

برا پہلے کہتے تھے جو بد نہاد کریں گے وہ اس عہد میں ہم کو یاد

کتنا موثر شعر ہے! سچ ہے آدمی کی قدر اُس کے بعد معلوم ہوتی ہے - اس ایک شعر میں انقلاب سے قبل اور اس کے بعد کی حالت کا موازنہ کس اختصار اور بلاغت سے کیا گیا ہے —

اگر پوری مثنوی اسی طرز میں لکھی جاتی تو یقیناً ایک بلند پایہ نظم ہوتی - لیکن لکھنوی رنگ اور اُستاد کا اثر بالکل زایل ہونے والی چیزیں نہ تھیں چنانچہ کہیں کہیں اس کی جھلک بھی موجود ہے - ولی عہد کے بیان میں آگے چل کر یہ شعر بھی ملتے ہیں :—

وہاں سب حسینوں کو ہوگا ملال نہ وہ حسن ہوگا نہ ان کا جمال

پڑی ہر گی نرگس کی آنکھوں میں خاک جگر ہوگا غنچے کا عبرت سے چاک

جو نہریں رواں تھیں وہاں آبدار بنی ہوں گی سکتے سے آئینہ دار

ستم ہوگا بلبل پہ صیاد کا سدا سامنا ہوگا جلاد کا

پریشاں کئے ہوں گے سنبل نے بال بہار اپنی ہوگی اُسے بھی وبال

بپا ہوگا محشر میان چمن کیا ہوگا سوسن نے نیلا بدن

زبان کی صفائی سے انکار نہیں۔ اعتراض یہ ہے کہ یہ اشعار شاعرانہ لطائف کی حیثیت رکھتے ہیں اور بس۔ ولی عہد کی زبان سے اپنے ملک کی تباہی کا حال اور اس انداز میں دل نہیں مانتا —

مثنوی نگار کے لئے محاکات پر قادر ہونا ضروری ہے۔ مناظر قدرت کا بیان ہو یا جذبات فطرت کا۔ ایک باکمال شاعر کے لئے ضروری ہے کہ جس چیز کا ذکر کرے اس کی ہو بہو تصویر آنکھوں کے سامنے کھینچ دے۔ خارجی حالات کی مصوری کے لئے قوت مشاہدہ کی ضرورت ہے۔ اگر بیرونی مناظر کو غور سے دیکھہ کر ذہن میں جگہ دی جاے اور اس کے ساتھہ ہی بیان پر قدرت حاصل ہو' طرز کلام سادہ اور فطرتی ہو تو یقیناً خارجی مناظر کے عمدہ مرقع پیش کئے جا سکتے ہیں۔ واردات قلبی اور خیالات ذہنی کی نقاشی کے لئے نزاکت احساس' رفعت تخییل اور نگاہ عمیق چاہئے۔ لیکن دونوں صورتوں میں سلاست زبان ناگزیر ہے۔ لفظی اور معنوی صنعتوں کے پردے میں واقعہ نگاری کا حق ادا کرنا آسان کام نہیں۔ بزمیہ اور رزمیہ دونوں قسم کی مثنویوں میں شاعر کو خارجی مناظر اور ذہنی کیفیتوں کی تصویریں پیش کرنے کے موقع آتے ہیں۔ جس سے بہ احسن وجوہ عہدہ برآ ہونے میں اس کا کمال مضمر ہوتا ہے —

فرقت نے مناجات میں جہاں سلطان عالم کی واپسی کی تمنا کا اظہار کیا ہے وہاں ضمنی طور پر جلوس شاہی کا نقشہ بھی کھینچا ہے۔ سب سے آگے نوبت ہوتی تھی' اس کے پیچھے نقیب ترقی دولت و اقبال کی صدائیں لگاتے چلتے تھے جن کا پیچھے نیزہ بردار سواروں کے دستے ہوتے تھے پھر ارکان دولت کے نرغے میں خود جہاں پناہ ہوا دار پر سوار ہوتے تھے جس کو تیز رفتار کہار لیکر چلتے تھے —

سواری میں تڈنکا بجے جا بجا نقیب آکے دیں پھر جلو میں صدا
چلیں اپنے کندھوں پہ نیزے دھرے سواروں کے آگے پرے کے پرے
پروں کا کرے سایہ ہر ایک پری لگائے یہ خورشید چتر زری
قدمبوس اقبال ہو پھر شتاب فلک دوڑ کر چوم لے پھر نقاب
رہے حافظ اوج حق کا ولی ملایک پڑھیں سر پہ ناد علی
ہوادار لیکر چلیں پھر کہار وہ گھوڑوں پہ ہوں پھر ہوا کے سوار
برابر برابر تسلسل رہے مسلسل پرا شکل کاکل رہے
رہیں اس کو گھیرے امیر و وزیر ستاروں میں جیسے ہو بدر منیر

اختری جلوس کا اچھا خاصا عکس ہے لیکن افسوس ہے کے فرضی بیانات کے شوق میں شاعر کو یہ لحاظ بھی نہ رہا کہ یہ اشعار خواہ مخواہ تسلسل بیان میں خلل انداز ہوتے ہیں —

دوسرا موقع انتزاع سلطنت کے بعد لکھنو کی تباہی ہے - الحاق اودھ تاریخ عالم میں انقلاب کی حیثیت رکھتا ہے - یوں تو کوئی جنگ ہوئی نہ ایک قطرہ خون کا گرا لیکن انقلاب بڑا زبردست تھا - جان عالم لکھنو سے کیا گئے ساری رونق اپنے ساتھہ لے گئے - اول تو لکھنو کے قابل ذکر لوگوں کا ایک جم غفیر اودھ کے آخری تاجدار کے ہمراہ جلا وطن ہوگیا - اور جو رہ گئے وہ گردش آسمان کے ہاتھوں پریشان و تنگ حال تھے - پوتڑوں کے امیر دانے دانے کو محتاج ہو گئے تھے لکھنو واجد علی شاہ کے دم سے دلہن بنا ہوا تھا - واجد علی شاہ کی بربادی لکھنو کی تہذیب کی بربادی تھی - لکھنو والوں کے عیش و عشرت کی تباہی تھی - لکھنو کی سوسائٹی کی تاراجی تھی - بھرے پرے محلوں میں خاک اُڑنے لگی - شاہی محلات دربار اور کچہری کا پتا بھی نہ رہا - یہی حالت تھی جیسے

دیکھہ دیکھہ کر وابستگان دولت کے دلوں سے یہ صدا نکل جاتی تھی۔

ہے لکھنو کی جان تو کلکتہ میں 'امیر' خاک آے میری آنکھوں کو اب لکھنو پسند

اور اسی کیفیت کا نقشہ 'فرقت' نے یوں کھنیچا ہے:—

جدھر جاؤ بازار سنسان ہیں محل شہ کے دیکھو تو ویران ہیں
نظر آے یہ دل پہ کیوں کر نہ داغ ہوا لکھنؤ یک بیک بے چراغ
نہ وہ لوگ ہیں اور نہ وہ ازدحام نہ وہ صحبتیں ہیں نہ وہ دھوم دھام
مہ و مہر و انجم ہیں ثابت گواہ ہوا شہر اختر کا سارا تباہ
غرض کو بکو اُڑ رہی خاک ہے سحر کا گریباں تلک چاک ہے
عجب حال ہے شہ کی سرکار کا پتا ہے کچہری نہ دربار کا
گھٹا سب کا چندے میں جاہ و جلال جو تھا ماہ کامل ہوا وہ ہلال
قدم بھر نہ تھی جن کو چلنے کی تاب ہوئی ان ضعیفوں کی مٹی خراب
بناوٹ کے مشہور تھے جو امیر ہوے سال بھر میں وہ بالکل فقیر

کتنی صحیح تصویر ہے لیکن تھوڑی دور آگے بڑھیے تو وہی 'امانت' کی محبوب صنعت رعایت لفظی شاگرد کے یہاں بھی جلوہ ریز ہے:—

گئے باغ میں جب کئی وضع دار تو سیر چمن سے ہوا دل کو خار
روش پر جو دانا اکھٹے ہوے اناروں سے کیا دانت کھٹے ہوے
وہ کیلوں کی جھرمٹ جو دیکھی تباہ اکیلے دوکیلے نے مانگی پناہ
نظارہ بلا ہو گیا سیب کا بہی پر ہوا شبہہ آسیب کا
بنا شاخ انگور دل داغ سے شریفوں کو یہ پھل ملا باغ سے

یہاں تک تو ان حالات اور مناظر کی تصویریں تھیں جو شاعر کی نظر سے گزر چکے تھے۔ آگے اب ان کیفیتوں کا بیان آتا ہے جن کی بنیاد 'فرقت' کے تخیل اور تصور پر ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے جنابۂ

عالیہ کے سفر لندن کا ذکر ہے - چونکہ آنکھوں دیکھی بات نہیں اس لئے انداز بیاں بھی سادہ اور فطرتی نہیں - لفظی صناعیوں کی نقاب شاہد معنی کے رخ پر ڈال دی گئی ہے - راستے میں مختلف منازل کا بیان کرتے ہوے لکھتے ہیں کہ·

غرض مصر میں جاہ سے باتمیز رھے پہلے یوسف کے سارے عزیز
پئے آبرو سد کے رنج و محن وہ سب در شہوار پہنچے عدن

تعجب ھے کے 'فرقت' سے اتنی فاش غلطی کیوں ھوئی- ھندوستان سے انگلستان جانے کے لئے عدن ھوکر سواحل مصر سے گزرنا پڑتا ھے نہ کہ پہلے مصر جائیں پھر عدن پہنچیں - جہاز کی روانگی کا بیان بھی واقعیت سے دور اور غیر دلچسپ ھے :—

جہاز ان کا ھوتا نہ کیوں کر رواں کہ تھے چادر اشک کے بادباں
وہ موجوں سے کیوں کر نہ رکھتا گریز دھواں اس کو آھوں کا کرتا تھا تیز
کئی کوہ تمکیں تھے اس پر سوار وھی اس کے لنگر تھے وقت قرار

ھاں "بیان تلاطم دریاے شورکا" بہت خوب ھے اور ایجاز و اختصار کا اچھا نمونہ ھے :—

وہ گرمی کا موسم وہ آندھی کا ڈر وہ ھر جا تلاطم کا خوف وخطر
وہ موجوں کا ھلنا ھوا کا وہ زور وہ طوفاں کا اُٹھنا وہ دریا کا شور

لندن میں استقبال اور ولیعہد بہادر کی سواری کا بیان بھی چنداں قابل اعتنا نہیں- البتہ قیام گاہ شاھی کا ذکر سن لیجئے- یہ ملکہ وکٹوریہ کے ایک مکان کا نقشہ ھے جس میں جنابۂ عالیہ فروکش تھیں - فرماتے ھیں کہ :-

عجب ایک بنگلہ تھا وہ خوش نما کہ آتی تھی باغ جناں کی ھوا
سفید اس کے تھے جتنے دیوار ودر مصفا تھے مانند روے سحر

اگی تھیں وہ تصویریں اس میں تمام کہ بہزاد ومانی کا روشن تھا نام
ستوں سارے تختے تھے کشمیر کے نہال اس میں گلشن تھے تصویر کے
قرینے کا تھا فرش مسند سے تیز کسی جا پہ کُرسی کسی جا پہ میز
....

اور اک سامنے نہر با آب و تاب سبق بردہ بر چشمۂ آفتاب
چمن گرد تھے اس کے شاداب گُل ولایت کے میوے نزاکت کے گل

محل کی آرایش کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ شہزادے کے پاس چند فرنگی " کہ تھا اُن کا رتبہ سبھوں سے بلند " گئے اور عرض کیا کہ :

ملال اپنے اب دور سب کیجئے بدستور پھر سلطنت لیجئے
یہاں کیجئے آپ سیر چمن پھرے جب تلک ملکۂ سیمتن
یقیں ہے جو ملکہ تلک جائیں گے وہی ہوگا جو آپ فرمائیں گے

سیاست و دستور انگلستان سے با خبر اصحاب کے لئے یہ بیان مضحکہ خیز معلوم ہوگا- جہاں کوئی کام بغیر پارلیمنٹ کی منظوری کے نہیں ہو سکتا وہاں چند ایسے لوگوں کا " کہ تھا ان کا رتبہ سبھوں سے بلند " یا بالفاظ دیگر اراکین دولت کا خود آکر شہزادے سے یہ کہنا کہ ' بدستور پھر سلطنت لیجئے" کیا معنی رکھتا ہے- اور اس یقین کے لئے کیا وجوہات تھے- ملکہ تک رسائی کے بعد " وہی ہوگا جو آپ فرمائیں گے " ایسے معاملات پر خود ملکہ بھی صاحب اختیار نہ تھیں - لیکن فرقت اس قسم کے بیانات کے لئے معذور تھے - اس زمانے میں انگلستان کے متعلق اتنی معلومات ہی عوام کو نہ تھیں حتی کہ اخبارات کی خبروں میں بھی افسانوی رنگ ہوتا تھا - چنانچہ یہی واقعہ لکھنؤ کے هفتہ وار اخبار " سحر سامری " کی یکم دسمبر سنہ ۱۸۵۶ ع کی اشاعت میں بالفاظ ذیل شایع ہوا تھا :

خبر فرحت اثر

" جناب عالیہ و مرزا ولی عہد بہادر مرزا سکندر حشمت بہادر، مرزا باقر صاحب، مرزا ولی عہد کے مصاحب سفر ولایت میں ولی نعمت کے همراہ تھے- اقبال کی طرح مقبول بارگاہ تھے- وهاں پونہچ کر ولی نعمت نے نامہ بری کا منصب عنایت کیا- حضرت سلطان عالم کے پاس رخصت کیا - انگریزی ڈاک کے جہاز پر سوار هوے- ۱۶ ربیع الاول سنہ ۲۷۳ ھ کو دریا سے پار هوے- حضرت کے نام اپنے حضور کی تحریر لائے- گھڑی وغیرہ اور بہت تحائف دل پذیر لائے- ان کی زبانی سے دل چسپ کہانی ہے کہ ابھی تک ملکۂ فرنگ مصروف سیر و شکار هیں- مسافران لندن محو انتظار هیں مگر تیر مدعا نشانے سے قریب تر ہے- ملکۂ فرنگ کی شکار سے پلٹنے کی جلد خبر ہے- بڑے بڑے انگریزان جلیل الشان اونچی اونچی کچہری پارلیمنٹ کے ارکان هم زبان هیں کہ داد گستر کے آنے تک تیغ انصاف کے جوهر نہاں هیں- ادهر ملکہ شکار سے پھریں ادهر برگشتہ طالعوں کے دن پھر جائیں گے- جتنے ستارے گردش کے هیں اشک ندامت کی طرح چشم فلک سے گر جائیں گے- پھر وهی شاہ اودہ کا دور دورا هوگا، وهی حشمت کا انداز، وهی سلطنت کا طور هوگا- شکستہ خاطروں کو تسلی دیتے هیں، ارکین دولت تشفی دیتے هیں کہ گھبرانے کی بات نہیں ہے- دنیا کی کسی بات کو ثبات نہیں ہے- انہیں حکام پارلیمنٹ نے اپنے اپنے مکان خالی کردئے- ایک ایک کو آنکھوں میں جگہ، دل میں گھر دئے - ملکۂ فرنگ نے پیام بھیجا- جناب عالیہ کے نام بھیجا

کہ بادشاہی کوٹھی میں اتر لیجئے ہر طرح کا سامان آرام سرکار سے بے خطر لیجئے - جناب عالیہ نے جواب لکھا کہ ملکۂ عالم رونق افروز ہولیں پھر جہاں ارشاد ہوگا رہیں گے اور جب تک دامن دولت سے دور ہیں عیش کیسے آرام کہاں کا ہر طرح کے جور سہیں گے ملکۂ عالم نے پھر تحریر فرمایا تشفی کا مضمون سنایا کہ اضطراب کا مقام نہیں گھبرانے کا ہنگام نہیں ڈیڑہ مہینے میں ہم آتے ہیں تمہیں مراد کو پہنچاتے ہیں- مرزا صاحب اس تحریر کے آنے کے دس روز بعد گرم سفر ہوے بائیس دن راہ میں بسر ہوے - اس حساب سے اب ملکۂ عالم ولایت میں آگئی ہوں گی جناب عالیہ منہ مانگی مراد پا گئی ہوں گی" —

اور پھر فرقت نے تو سنی سنائی روایتیں نظم کردی تھیں "جو کچھ تو نے فرقت سنا سو کہا" - دروغ بر گردن راوی - اس زمانے میں بھی جب انگلستان کے ذمہ دار ارباب سیاست ہندوستان اور ہندوستانیوں کی بابت مضحکہ خیز باتیں کہہ یا کرتے ہیں اب سے پچہتر برس قبل انگلستان کے متعلق ایسے بیانات قابل تعجب نہیں -

سطور بالا میں مثنوی کے کافی اشعار نقل کئے گئے ہیں جن سے اس کی شاعرانہ حیثیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے - آخر میں فرقت کی تشبیہات اور تمثیلات کے متعلق اور عرض کرنا چاہتا ہوں- نظم کی کامیابی کے لئے شگفتہ، بر محل اور حسین تشبیہوں کا استعمال نہایت ضروری ہے - اسی وادی میں ایک شاعر اور غیر شاعر کا امتیاز ہوتا ہے - یوں تو روز مرہ گفتگو میں بھی تشبیہیں اور تمثیلیں استعمال کی جاتی ہیں- انسانی ذہن کا خاصہ ہے کہ وہ سیدھے سادھے بیان کے بجاے تشبیہ و تمثیل

سے بات کو جلد تر سمجھتا اور پسند کرتا ہے۔ شاعر کا کمال یہ ہے کہ جو تشبیہیں وہ استعمال کرے ان میں لطافت، جدت اور معنویت بدرجۂ اتم موجود ہو اور اس کے ساتھہ ہی دور از کار نہ ہوں۔ لکھنو کی شاعری میں تشبیہوں کا وافر استعمال کیا گیا ہے۔ حسین سے حسین اور بھونڈی سے بھونڈی تشبیہ شعراے لکھنؤ کے یہاں مل جائے گی۔ خصوصاً امانت کے یہاں تو اکثر تشبیہیں پھبتیوں کا کام دیتی ہیں۔ ذیل میں لطیفۂ فرقت کی بعض عمدہ تشبیہیں پیش کی جاتی ہیں ۔

واجد علی شاہ کی واپسی کی تمنا میں کہتے ہیں —

پھرے باغ میں وہ شہ نامدار چمن سے خزاں جاے آئے بہار

خزاں و بہار کہہ کر نوابی کے زمانے کی خوش حالی اور فارغ البالی اور الحاق اودہ کے بعد کی تباہی کا نقشہ کھینچ دیا ہے ۔

واجد علی شاہ کے لکھنؤ چھوڑنے کے بعد فضا کی غم آلودگی کا ذکر کرتے ہوے کہا ہے :-

نہیں ہے کرن گرد مہر منیر جگر پر یہ پیوست ہیں غم کے تیر

کرن کو مہر منیر کے جگر پر غم کا تیر کہنا لطیف و نادر تشبیہ ہے ۔

جنابۂ عالیہ بیٹے کی مفارقت میں کہتی ہیں ۔ پوتا پاس ہے ۔

قریں شاہزادے ہیں شہ دور ہے یہاں تو ہیں آنکھیں وہاں نور ہے

بیٹے اور پوتے کی محبت کا نازک فرق کتنی خوبصورتی سے دکھایا ہے ۔

جہاز سے اترنے کا سماں :

وہ نکلے جہاز اپنا یوں چھوڑ کر صدف سے نکل آے جیسے گہر

—— * ——

سودا کی حیات اور کلام کے متعلق غلط فہمیاں اور غلط بیانیاں

از

(جناب شیخ چاند صاحب ایم اے - ایل ایل بی -)

سودا کی حیات میں سب سے پہلی غلط فہمی اس کے خاندان کے متعلق ہے - آزاد اور اس کی تقلید میں بعد کے تمام تذکرہ نگاروں نے اس کے آباو اجداد کو سپاہی پیشہ لکھا ہے - قدیم تذکرہ نویسوں نے کہیں اس کی طرف اشارہ نہیں کیا - قایم سب سے پہلا تذکرہ نگار ہے جس نے سودا کے والد مرزا محمد شفیع کی نسبت لکھا ہے کہ بطریق تجارت ہندوستان آے اور عمل تجارت میں مشہور ہوے - اس بیان سے سودا کے آبای پیشے کا کہیں حال نہیں کھلتا ' صرف اس کے والد کا تاجر ہونا ثابت ہوتا ہے - سودا آبائی سلسلے سے مغل تھا اور اس کے اجداد مغلوں کے پیر تھے جیسا کہ اس کے شاگرد حکیم اصلح الدین نے اپنے اس عقیدہ میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے جو مصحفی کی ہجو میں تحریر ہوا ہے —

ہے ایک سبب یہ کہ وہ آپ مغل تھا
اور جتنے بزرگ اوس کے تھے مغلوں کے تھے وہ پیر

اس بیان سے بھی سودا کی آبای سپاہ گری کی تردید ہوتی ہے -

مادری سلسلہ بھی سپاھی پیشہ نہ تھا۔ شاہ کمال نے لکھا ھے کہ سودا کے نانا نعمت خاں عالی تھے جن کا آبائی پیشہ طبابت تھا۔ خود اس کا ابتدائی تخلص 'حکیم' بقول آزاد بلگرامی اس پیشے کی مناسبت کی قوی شہادت ھے۔ اس میں شبہ نہیں کہ نعمت خان نے بادشاھی نوکری اختیار کرلی تھی لیکن سپاھیوں کے زمرہ میں اس کا شمار نہیں ھوسکتا۔ ان شواھد کی موجودگی میں یہ کسی طرح صحیح نہیں ھوسکتا کہ سودا کا آبائی یا مادری پیشہ سپاہ گری تھا۔ گردیزی کا یہ بیان صحیح معلوم ھوتا ھے کہ خود سودا نے سپاہ گری اختیار کرلی تھی۔ اس کا ثبوت اس کے کلام سے بھی ملتا ھے۔ لیکن بہت جلد اس سے سبک دوش ھوکر مصاحب پیشگی پر اتر آیا تھا جیسا کہ قایم نے لکھا ھے۔

سودا کی عمر کا بھی ابھی تک صحیح تعین نہیں ھوا۔ آزاد نے پیدائش کا سنہ ۱۱۲۵ھ لکھا ھے' وفات ۱۱۹۵ میں ھوئی۔ اس لحاظ سے ستر (۷۰) سال کی عمر قیاس ھے یقینی نہیں۔ سنہ پیدائش کسی تذکرہ میں درج نہیں۔ قایم نے لکھا ھے کہ مرزا رفیع' بہادر شاہ کی فوج کے ساتھہ دکن گئے تھے۔ بہادر شاہ کا زمانہ ۱۱۱۹ تا ۱۱۲۴ ھجری ھے۔ سودا نے فوجی ملازمت کا ذکر کیا ھے لیکن زمانہ کا اظہار نہیں کیا۔ حضرت علی کی منقبت میں قصیدہ لکھا ھے جس کی تمہید میں مظالم گردوں کی شکایت کا آغاز اس طرح کیا ھے —

کہی جاتی نہیں وہ مجھہ سے' جو اُس ظالم نے
جس طرح کے میرے اوقات میں ڈالے ھیں خلل

لا بٹھا یا مجھے گھر بار چھڑا لشکر میں
پال بے چوب تلے اپنے بغیر از پر تل

اگر هم قایم کے بیان کو صحیح تسلیم کریں اور سودا کے اس بیان سے بهادر شاهی فوجی ملازمت مان لیں تو ظاهر هے که ۱۱۱۹ اور ۱۱۲۴ھ کے درمیان اس کی عمر فوجی ملازمت کے لئے کم سے کم اتھارہ سال کی هو گی - اس لحاظ سے اس کی ولادت کا سنه ۱۱۰۶ھ سے قبل هو سکتا هے اور اس طرح اس کي عمر کم و بیش نوے سال هوتی هے - میر حسن نے ۱۱۸۵ اور ۱۱۸۸ (مدت قیام دربار اودہ به عهد شجاع الدوله) کے ما بین لکھا هے که اس کی عمر ستر سال کی هو گی - اس اعتبار سے اس کا سال ولادت ۱۱۱۵ اور ۱۱۱۸ھ کے درمیان پڑتا هے اور عمر اسی سال کے لگ بھگ، لیکن یه قیاسی هے —

ان بیانات سے صاف ظاهر هے که سودا کی عمر کا صحیح تعین اب تک نهیں هوا اور ابھي ضرورت هے که اس باب میں مزید تحقیق سے کام لیا جاے۔

سودا کے تخلص کی وجه بھی متحقق نهیں هوی - آزاد نے "بعض" کا قول نقل کیا هے که باپ کی سوداگری وجه تخلص هوي - حواله نهیں دیا - اسپرنگر نے بھی قایم کے حوالے سے یهی لکھا هے، قایم کا تذکرہ چھپ چکا هے اس میں یه درج نهیں —

آزاد اور اس کے مقلدوں نے لکھا هے که خان آرزو نے سودا کو مشورہ دیا که "مرزا! فارسی اب تمهاری زبان مادری نهیں اس میں ایسے نهیں هو سکتے که تمهارا کلام اهل زبان کے مقابل میں قابل تعریف هو - طبع موزوں هے - شعر سے نهایت مناسبت رکھتی هے - تم اردو کها کرو تو یکتاے زمانه هو گے - مرزا بھی سمجھه گئے اور دیرینه سال استاد کی نصیحت پر عمل کیا "۔

تمام قدیم تذکرہ نگار اس بارے میں خاموش هیں - آزاد کے بیان

کا ماخذ معلوم نہیں - سودا نے خود ایک قطعہ لکھا ھے جس میں ایک فارسی داں کا قول نقل کیا ھے - خان آرزو کے مشورہ کا ذکر نہیں —

میں ایک فارسی‌داں سے کہا کہ اب مجکو	ھوئی ھے بندش اشعار فرس ذھن نشیں
جو آپ کیجے اصلاح شعر کی میرے	نہ پائیے غلطی تو محاورہ میں کہیں
ھے اور زیر فلک ذات میرزا فاخر	سلامت ان کو رکھے حق سدا بروے زمیں
سوکب‌انھوں کو ھے اصلاح کا کسو کي دماغ	قبول کب کرے ان کي متانت رنگیں
کہا یہ بعد تامل کہ دوں جواب تجھے	جو میری بات کا اے‌یار‌تجکو ھووے یقیں
جوچاھے یہ کہ کہے ھندکا زباں داں شعر	تو بہتر اس کے لئے ریختہ کا ھے آئیں
و گرنہ کہہ کے وہ کیوں شمرفارسی فاحق	ھمیشہ فارسی داں کا ھو مورد نفریں
کوئی زبان ھو لازم ھے خوبیء مضموں	زبان فرس پہ کچھہ منحصرسخن تو نہیں
اگر فہیم ھے تو چشم دل سے کر تو نظر	زبان کا مرتبہ سعدي سے لے کے تابہ حزیں
کہاں تک ان کی زبان تو درست بولیگا	زبان اپنی میں تو باندہ معنی رنگیں
دیار ھند میں دو چار ایسے ھو گزرے	جنھوں نے باز رکھا مضحکہ سے اپنے تئیں
چنانچہ خسرو، فیضی و آرزو و فقیر	سخن انھوں کا مغل کے ھے قابل تحسیں
سوائے ان کےکوئی اور بھی ھو پر شاعر	سواد ھند میں وہ ھی ھیں بامزہ نمکیں

اس سے ظاھر ھے کہ خان آرزو کا مشورہ نہیں تھا - اگر وہ مشورہ دیتے تو اس طرح فخر سے مسلم‌الثبوت اساتذہ میں اپنا شمار نہ کرتے - اردو میں طبع آزمائی کے مشورہ کی اس زمانے میں کوئي ضرورت نہ تھی - خود اردو کی مقبولیت اور لوگوں کے بڑھتے ھوے عام رجحان نے فارسي کا بت توڑ دیا تھا - نو وارد سے نو وارد ایرانی بھی اس سے نہ بچ سکے - سودا تو ھندوستان میں پیدا ھوا تھا اور پورا ھندوستاني تھا - ماحول کے عام مذاق کے اثر سے اس نے بھی فارسی کو کم التفاتی سے دیکھا -

سودا کی استادی اور شاہ عالم بادشاہ کی شاگردی کے بارے میں ایک نہایت پر لطف افسانہ بیان کیاجاتا ھے - آب حیات میں لکھا ھے :—

" جب کلام کا شہرہ عالمگیر ھوا تو شاہ عالم بادشاہ اپنا کلام اصلاح کے لئے دینے لگے اور فرمائشیں کرنے لگے - ایک دن کسی غزل کے لئے تقاضا کیا - انھوں نے عذر بیان کیا - حضور نے فرمایا - بھئی مرزا کے غزلیں روز کہہ لیتے ھو ؟ مرزا نے کہا پیر و مرشد جب طبیعت لگ جاتی ھے دو چار شعر کہہ لیتاھوں - حضور نے فرمایا بھئی ھم تو پائخانہ میں بیٹھے بیٹھے چار غزلیں کہہ لیتے ھیں - ھاتھہ باندہ کر عرض کی ویسی بو بھی آتی ھے - یہ کہہ کر چلے آئے - بادشاہ نے پھر کئی دفعہ بلا بھیجا اور کہا کہ ھماری غزلیں بناؤ ھم تمہیں ملک الشعرا کر دیں گے ' یہ نہ گئے اور کہا کہ حضور کی ملک الشعرای سے کیا ھوتا ھے ' کرے گا تو میرا کلام ملک الشعراء کرے گا - پھر ایک بڑا مخمس شہر آشوب لکھا - (ع) کہا میں آج یہ سودا سے کیوں ھے ڈانواں ڈول " —

یہ محض افسانہ ھے واقعات اس کی مطلق تائید نہیں کرتے - شاہ عالم بادشاہ سنہ ۱۱۷۳ ھ میں تخت نشین ھوے - اور سودا ۱۱۶۷ ھ میں دھلی کو خیر باد کہہ چکا تھا - وہ نواب عمادالملک غازی الدین خان کے ساتھہ فرخ آباد گیا تھا - یہ وہ موقع ھے جب نواب عمادالملک ' احمد شاہ درانی کے ایماسے دو آبے سے زرتا وان وصول کرنے گئے تھے ' سودا ساتھہ تھا - مہربان خاں رند دیوان احمد خاں بنگش والی فرخ آباد کے شدید اصرار سے وھاں ٹھیر گیا تھا - قائم نے سنہ ۱۱۶۸ ھ میں یہ واقعات لکھے ھیں - اس کے بعد سودا دھلی نہیں آیا بلکہ سنہ ۱۱۸۵ ھ کے قریب فیض آباد اور ۱۱۸۸ ھ میں لکھنو گیا اور

بالاخر لکھنو میں فوت ہو کر وہیں پیوند خاک ہوگیا - ایسی صورت میں شاہ عالم بادشاہ کی شاگردی محض افسانہ ہے - اس میں بھی صداقت کا شائبہ تک نہیں کہ شاہ عالم نے ملک الشعرای کے خطاب کی ترغیب و تحریص دلای تھی اس لئے کہ سودا شاہ عالم کی تخت نشینی سے کم سے کم آٹھہ سال قبل اس خطاب سے سرفراز ہوچکا تھا جیسا کہ میرتقی میر نے سنه ۱۱۶۵ ھ میں لکھا ہے کہ " ملک الشعرای ریختہ او را شاید " اور قایم نے سنه ۱۱۶۸ میں اس کی تائید اس طرح کی ہے —

" بالفعل بخطاب ملک الشعرای که همین پایۂ سخوران است اعزاز و امتیاز دارد "

خطاب ملک الشعرای کے متعلق ایک اور غلط بیانی کا ازاله اس سلسله میں بے محل نه ہوگا —

عام طور پر مشہور ہے کہ آصف الدوله نے سودا کو یه خطاب دیا تھا ' لیکن آج تک کسی نے کوئی معتبر سند اس کی نہیں پیش کی - نه تو قدیم تذکروں میں اس کا ذکر ہے اور نه خود سودا کے کلام میں اس کا کہیں حواله ہے - اس کے علاوہ میر اور قایم کے بیانات سے جن کو میں ابھی پیش کرچکا ہوں اس کی قوی شہادت ملتی ہے کہ آصف الدوله کی تخت نشینی سے کم سے کم ۲۳ سال قبل سودا اس خطاب سے سرفراز ہوچکا تھا - اس میں شبہه نہیں کہ میر اور قایم نے یه نہیں بتایا کہ اس کو یه خطاب کہاں سے ملا - اگر دربار دھلی سے ملا تو شاید احمد شاہ بادشاہ نے یه خطاب دیا ہو اس لئے کہ اسی زمانے میں سودا کی شاعری چمکی - لیکن ایک مشہور روایت سے (جس کو محمد انوار حسین تسلیم سہسوانی نے بھی کلیات سودا مطبوعه نولکشور ۱۲۸۹ ھ کے خاتمه پر نقل کیا ہے) یه معلوم ہوتا ہے کہ شیخ علی حزیں نے سودا کو یه خطاب دیا تھا - جب شیخ ۱۱۴۶ ھ میں ہندوستان آیا

تو کچھہ عرصہ تک دھلی میں بھی رہا - ایک روز سودا ملنے گئے - شعر پڑھنے کی اجازت حاصل کی - اپنا یہ شعر پڑھا —

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں
تڑپے ھے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

شیخ نے پوچھا تڑپے ھے کے کیا معنی؟ کہا "می تپد" شیخ نے پھر شعر پڑھوایا اور زانو پر ھاتھہ مار کر کہا "مرزا رفیع قیامت کر دی یک قبلہ نما باقی بود آں را ھم نگذاشتی" یہ کہہ کر اُٹھہ کھڑے ہوے فرط مسرت سے بغل گیر ھوے اور اس خطاب سے سرفراز کیا - اس روایت کی ھلکی سی تائید سودا کے اس شعر سے بھی ھوتی ھے : —

ممکن نہیں یہ روح مقدس سے حزیں کے
ایسی جو غزل ھووے تو سودا صلہ دے چھوڑ

اگر یہ روایت صحیح ھے تو ظاھر ھے کہ سودا کو یہ خطاب محمد شاہ کے اخیر زمانے میں ملا اس لئے کہ شیخ کا قیام اس زمانے میں دھلی میں تھا - ممکن ھے کہ میرو قایم نے اسی واقعہ کی بنا پر لکھا ھو - لیکن شیخ سے ایسی توقع رکھنی بیجا ھے کہ اس نے ایک ریختہ گو ھندوستانی شاعر کو محض اس ایک شعر کے سننے پر اتنی عزت بخشی ھو - اس کی کتاب احوال حزیں اپنے وقت کی "مدر انڈیا" ھے - مصحفی کا بیان ان سب سے مختلف ھے اس نے لکھا ھے - "بعضے او را دریں فن بہ ملک الشعراے پرستش می کنند" ان قدیم مستند بیانات کی موجودگی میں مصحفی کا مبہم بیان کچھہ قابل لحاظ نہیں - بہر حال میرو قایم کے بیانات اور یہ روایت ثابت کرتے ھیں کہ سودا کو دربار اودھ سے یہ خطاب نہیں ملا تھا —

سودا کے ممدوحین دہلی میں ایک نام مہربان خاں کا بھی لیا جاتا ہے اس نام کا کوئی امیر اس زمانے میں دہلی میں مشہور نہیں ہوا ہے - دہلی کے ممدوحین میں اب تک شاہ عالم گیر ثانی، نواب عماد الملک، نواب سیف الدولہ احمد علی خاں، بسنت خاں خواجہ سرا کا ذکر ملتا ہے- بسنت خاں محمد شاہی عہد کا خواجہ سرا ہے - محمد شاہی عہد کے آخر میں سودا کی شاعری نے فروغ پایا جیسا کہ سودا نے رسالۂ سبیل ہدایت اور عبرۃ الغافلین میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے - اس زمانے میں صرف یہی خواجہ سرا سر پرست تھا- اس کے بعد احمد شاہی دور میں سیف الدولہ نے اور عالم گیر ثانی کے عہد میں خود بادشاہ اور اس کے وزیر نواب عماد الملک نے سر پرستی کی - ان کے سوا کوئی امیر مہربان خاں نام کا نہیں تھا - یہ مہربان خاں فرخ آبادی احمد خاں بنگش کا دیوان تھا جس کی سرکار میں سودا نے تقریباً اٹھارہ سال گزارے - ۱۱۶۷ ھ سے ۱۱۸۵ ھ تک یہ سودا کا سر پرست رہا ہے - کلیات میں جہاں جہاں یہ نام آیا ہے اس سے مراد فرخ آبادی مہربان خاں ہے - اس کی تعریف میں جو قصیدے موجود ہیں ان سے بھی کوئی قرینہ اس بات کا نہیں پایا جاتا کہ یہ دہلوی امیر ہے - اس کے سوا سنہ ۱۱۷۴ ھ کے مکتوبہ کلیات میں یہ قصیدے موجود نہیں - یہ وہ کلیات ہے جس میں صرف قیام دہلی کے دوران کا کلام مدون ہوا ہے - یہ نسخہ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی کے کتب خانے میں محفوظ ہے —

یہ کہا جاتا ہے کہ دہلی کو چھوڑنا گوارا نہ تھا اس لئے شجاع الدولہ کی اشتیاق بھری طلبی پر لکھنو جانے سے انکار کردیا اور معذرت میں ایک رباعی لکھہ بھیجی —

سودا والیٔ ملک کی نااھلی و کم زوری اور اعیان حکومت کی سازشوں، خود غرضیوں اور ناعاقبت اندیشیوں سے بیزار تھا- اس لئے دھلی سے بھاگنا چاھتا تھا- اس کی شہادت میں وہ مخمس پیش کیا جا سکتا ھے جس میں سودا نے والیٔ ملک کی ناگفتہ بہ حالت اور مملکت کے زبوں حال کی تصویر کھینچی ھے- بادشاہ اور دربار داروں کی ھجو تو کہی ھے لیکن دلّی سے بیزاری کا رنگ بھی نمایاں ھے :—

امیراب جوھیں دانا انیوں کی ھےیہ چال ھوےھیں خانہ نشیں دیکھہ کر زمانے کا حال
بچھی ھے سوزنی خو جا کھڑےجھلےھے روماں حضور بیٹھےھیں ایک دو ندیم اھل کمال
دھرے ھے روبرو اک پیک دان و اک تنبول

جو کوئی ملنے کو اُن کے انہوں کے گھر آیا ملے یہ اُس سے گر اپنا دماغ خوش پایا
جو ذکر سلطنت اس میں وہ درمیاں لایا انہوں نےپھیر کے اُدھر سے منہ یہ فرمایا
خدا کے واسطے بھائی کچھہ اور باتیں بول

جو مصلحت کے لئے جمع ھوں صغیر و کبیر توملک ومال کا فکراس طرح کریں ھیں مشیر
وطن پہنچنےکی سوجھی ھے بخشی کوتدبیر کھڑا یہ اٹکلے دیوان خاص بیچ وزیر
کہ شامیانے کے بانسوں پہ نقرئی ھیں جھول

غرض میں کیا کہوں یا روکہ دیکھہ کریہ قہر کروڑ مرتبہ خاطر میں گذرے ھے یہ لہر
جوتک بھی امن دل اپنےکودیوےگردش دھر تو بیٹھہ کر کہیں یہ روئیےکہ مردم شہر
گھروں سے پانی کو باھر کریں جھکول جھکول

یہ بین ثبوت اس امر کا ھے کہ سودا دل سے دھلی کو ترک کرنا چاھتا تھا لیکن کچھہ دنوں جو دھلی میں ان دلشکن حوادث و انقلابات کے باوجود ٹھیر گیا محض دوست احباب کے اصرار سے- چنانچہ ایک رباعی میں خود اس کی طرف اشارہ کیا ھے- خواجہ میر درد کا نام

خصوصیت سے لیا ھے :—

نادیدنی از بسکہ ھے روے عالم ھے کفر ملاقات جو کیجے باھم
کرتا ھوں کہیں جانے کا جس وقت میں عزم 'درد' آن کے 'سودا' میرے پکڑے ھے قدم

ان حالات میں اگر اس کو کہیں سے عزت آمیز دعوت پہنچتی تو وہ خوشی سے قبول کر لیتا - چنانچہ ایسا ھی ھوا جب سودا کے سرپرست نواب غازی الدین خاں عمادالملک احمد شاہ ابدالی کے ایما سے دوآبے جانے لگے اور راستہ میں فرخ آباد میں قیام کیا تو احمد خاں بنگش رئیس فرخ آباد کے دیوان مہربان خاں نے اصرار کیا تو سودا اُسے غنیمت جان کر ٹھیر گیا - اس کے سوا شجاع الدولہ کا سودا کے قیام دھلی کے زمانے میں دعوت دینا کئی وجوہ سے غیر صحیح معلوم ھوتا ھے - شجاع الدولہ ۱۱۶۶ ھ میں مسند نشین ھوے - یہ وہ زمانہ ھے جس میں ان کو اھم ملکی معاملات و مہمات سے سر کھجانے کی فرصت نہ تھی - دوسرے سودا کے سرپرست عمادالملک سے ان کی مخالفانہ چشمک تھی - اور ان کی تخت نشینی کے بعد ھی عمادالملک نے احمد شاہ ابدالی سے وعدہ کیا کہ وہ شجاع الدولہ سے زر خطیر وصول کر کے پیش کریں گے چنانچہ اسی غرض سے انھوں نے بڑے لاو لشکر کے ساتھہ دوآبے کا سفر کیا - سودا بھی ساتھہ تھا - فرخ آباد سے آگے مہربان کے اصرار نے اس کو بڑھنے نہ دیا - جس رباعی کو اس دعوت کی معذرت کے طور پر بیان کیا جاتا ھے وہ رباعی سنہ ۱۱۷۴ ھ کے مکتوبہ کلیات میں موجود نہیں ھے - ان حالات میں شجاع الدولہ کا دعوت دینا قرین صحت نہیں معلوم ھوتا - یہ ممکن ھے کہ قیام فرخ آباد کے دوران میں یہ طلبی ھوی ھو - اس لئے کہ اس وقت تک شجاع الدولہ کے حصے میں بڑی حد تک فرصت و فراغت آ چکی تھی - اور سودا نے حسن

معذرت کے طور پر یہ رباعی لکھہ بھیجی ہو :

سودا پئے دنیا تو بھر سو کب تک آوارہ ازیں کوچہ بآں کو کب تک
حاصل یہی اس سے نہ کہ دنیا ہووے بالفرض ہوا یوں بھی‌تو پھر تو کب‌تک

اس رباعی کی کوئی تحریری سند نہیں صرف روایت ہے - اگر یہ صحیح مان لی جاے تو فرخ آباد سے لکھی ہوگی - اس لئے کہ سودا نے اس میں در بدر کی آوارگی کا اشارہ کیا ہے - فرخ آباد جانے سے پہلے اس کو تلاش معاش میں کسی دوسری جگہ جانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا - یہاں سے دوسری جگہ جانا آوارگی تھی - شجاع‌الدولہ کے علاوہ محمد یار خاں خلف نواب علی محمد خاں والی ملک روہیل کھنڈ وغیرہ نے اس کو اپنے ہاں آنے کی دعوت دی تھی - لیکن فرخ آباد میں اس قدر خوش تھا کہ اس دعوت کو بھی رد کردیا - اگر خوش نہ ہوتا تو ممکن تھا دونوں جگہ میں سے کہیں چلا جاتا - اس لئے کہ دونوں شعر و سخن کے قدر داں تھے - شجاع‌الدولہ کی سخاوت و قدردانی مشہور ہے - محمد یار خاں بھی صاحب ذوق امیر تھا - موسیقی کا بڑا ماہر تھا - خود شاعر تھا اور شاعروں کا زبردست پرستار - کئی مشہور شاعر اس کی سرکار میں تھے - یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ نواب احمد خاں بنگش کے انتقال پر سودا فرخ آباد سے فیض آباد چلا گیا - نواب احمد خاں اپنی وفات سے دو سال قبل بصارت سے محروم ہو گئے تھے - دو سال ان کے نہایت ابتری میں گزرے اور ان کو حکومت کے کاروبار کو پوری طرح دیکھنے بھالنے کا موقع نصیب نہ ہوا - سودا کا سرپرست امیر مہربان خان دیوان بھی نواب کے علاج معالجے میں اپنے سرکاری فرائض کی بہ نسبت زیادہ مصروف تھا - نواب کی بیماری اور ان کے اوہام پرستانہ معالجے نے فرخ آباد کے

پناہ گزیں شعرا کو نئی گردش کا پیغام سنا دیا تھا، یہی وجہ ہے کہ سودا نے احمد خاں کی وفات سے قبل نہ کہ بعد وفات فرخ آباد کو خیر باد کہا - اس کا ثبوت خود اس کے کلام میں موجود ہے - مہربان خان کے اشعار کی تعریف میں ایک مثنوی لکھی ہے اس میں اپنے رخصت ہونے کا ذکر کیا ہے اور دعا دی ہے کہ تو نواب کے سایہ میں پھولے پھلے اور سوز کی سفارش کی ہے کہ وہ ایک طائر خوش نوا ہے جو اتفاق سے تیری محبت کے جال میں گرفتار ہے اگر وہ یہاں سے چھوٹا تو پھر کبھی ہاتھہ نہیں آے گا :

شعر کے بحر میں ترا اوستاد   کشتیء ذهن کو هے باد مراد
اس کو هر طرح تو غنیمت جان   پهر ملے گا نه سوز سا انسان
کیسے هی رام هوں کسی کے ساتهه   پنچهی بهڑکے هوے نه آویں هاتهه

....

کر چکا میں دعا په ختم کلام   پهنچے رخصت کا میرے تجهکو سلام
حشر تک زیر سایۂ نواب   رهیو جوں آفتاب عالمتاب

ان اشعار سے صاف روشن ہے کہ نواب احمد خاں کی وفات سے قبل سودا نے فرخ آباد کو خیر باد کہا اور اس بنا پر سودا کا سنہ ۱۱۸۵ ھ میں فیض آباد پہنچنا صحیح نہیں- لیکن اس میں شبہ نہیں کہ وہ سنہ ۱۱۸۳ ھ تک تو ضرور فرخ آباد میں موجود تھا اس لئے کہ اس کے ایک خط کا ذکر شفیق اورنگ آبادی نے گُل رعنا میں کیا ہے جو غرۂ ربیع الآخر سنہ ۱۱۸۳ کو فرخ آباد سے 'ذکا' کے نام لکھا تھا - ایسی صورت میں فیض آباد پہنچنے کی تاریخ ۱۱۸۳ اور ۱۱۸۵ ھ کے درمیان پڑتی ہے -

آزاد نے لکھا کہ فرخ آباد سے لکھنؤ گئے - یہ صحیح نہیں - پہلے

فیض آباد گیا جو شجاع الدولہ کی راج دھانی تھی۔ یہاں شجاع الدولہ کی وفات (سنہ ۱۱۸۸ھ) تک رہا اس کے بعد جب آصف الدولہ نے لکھنؤ کو اپنا مرکز حکومت قرار دیا تو لکھنؤ گیا ــ

آزاد کا بیان ھے جب سودا نے شجاع الدولہ کی ملازمت حاصل کی تو نواب بہت اعزاز سے ملے لیکن "یا تو بے تکلفی سے یا طنز سے کہا مرزا وہ رباعی تمہاری اب تک میرے دل پر نقش ھے اور اس کو مکرر پڑھا۔ انہیں اپنے حال پر بڑا رنج ہوا اور بپاس وضع داری پھر دربار نہ گئے یہاں تک شجاع الدولہ مر گئے اور آصف الدولہ مسند نشین ہوے"۔

آزاد کو رباعی کے مضمون پر رنگ چڑھانے کے لئے یہ قصہ گھڑنا پڑا۔ یہ بھی ایک افسانہ ھے جو صداقت سے سراسر خالی ھے۔ سودا شجاع الدولہ کی وفات تک برابر ان کے دربار میں رہا۔ اس کے تین ثبوت ھیں۔ پہلا تو خود سودا کا کلام ھے جس میں کئی قصیدے قطعے وغیرہ نواب کی مدح میں موجود ھیں۔ بعض تاریخی قطعے بھی ھیں۔ دوسرا ثبوت میر حسن کا بیان ھے جس نے لکھا ھے "الحال در سرکار نواب شجاع الدولہ بوسیلۂ شاعری سرفرازست"۔ تیسرا ثبوت مصحفی کا بیان ھے جس نے لکھا ھے ــ

"فقیر در عہد نواب شجاع الدولہ روزے برائے دیدن ایں بزرگ بخدمتش رسیدہ بود ...... آگے چل کر لکھتا ھے "نواب مرحوم و مغفور نیز بودن او را در سرکار خود بسیار غنیمت می دانستند"

لکھنؤ کے قیام کے متعلق بالاتفاق کہا جاتا ھے کہ والی ملک اور اہل لکھنؤ کی قدر دانی سے سودا ہر طرح فارغ البال رہا اور امن و اطمینان سے بسر کرتا رہا۔ یہ بڑی غلط فہمی ھے۔ شجاع الدولہ کے زمانے میں سودا بے شک آسودہ حال اور مطمئن تھا۔ لیکن آصف الدولہ کے زمانے میں وہ معاش

کی طرف سے زیادہ مطمئن نہ تھا- اسپرنگر اور علی لطف نے لکھا ھے کہ آصف الدولہ نے چھ ھزار سالانہ مقرر کردیے تھے- لیکن اس کو اس نقد رقم کے حاصل کرنے میں درباری کارکنوں اور عاملوں کی بڑی منت سماجت کرنی پڑتی تھی اور خزانے سے رقم اس دشواری اور ذلت سے ملتی تھی کہ سودا نے اس کی بار بار شکایت کی ھے- ایک قصیدہ میں آصف الدولہ سے ان دقتوں کی شکایت کی ھے اور نقد رقم کے عوض جاگیر سے سرفراز کرنے کی درخواست کی ھے —

اس نظم سے غرض ھے مجھے عرض مدعا ‌‌ ‌ مقصد میرا قلیل ھے پہنچے بانصرام
اپنی تیری جناب میں اتنی ھی عرض ھے ‌ ‌ کس کس کا ملتجی ھوں کہا کر ترا غلام
انصاف ھے کہ ھو وہ عطا اِس جناب کی ‌ ‌ اور اُن کی میں سماجت ومنت کروں مدام
دیہات جو ھیں مصرف مطبخ کے اوس میں سے ‌ ‌ اس نقدی کے عوض ھو مجھے صحنک طعام

حسن رضا خاں سرفراز الدولہ نائب سلطنت تھے- سودا کے شاگرد اور ممدوح تھے ان سے بھی اس نے یہی شکایت کی ھے -

پھرا کروں میں لئے مشت استخواں اپنے ‌ ‌ میانے میں پئے عمال زیر کہنہ رواق
سواب تو اس سے بھی نوبت گزر گئی ھے مگر ‌ ‌ گلے میں کرتا بپا کفش ھاتھہ میں چھاق
سپرد تجکو ھے سررشتہ سب کی حرمت کا ‌ ‌ کیا ھے اتنی وہ مخلوق کا ھے جو خلاق
سو طالب اتنی میں حرمت کا اب نہیں جس سے ‌ ‌ کروں معاش بسر اپنا میں بہ تم و طراق
عوض میں دے مجھے اس نقدی کے تو ایسا گاؤں ‌ ‌ بسر ھو عمر میری جس سے زیر کہنہ رواق
نہ شکل نور علی خاں ھوں کہا کے میں فربہ ‌ ‌ نہ سوکھہ کر ھوں طرح میرزا رفیع کے قاق
بہ نان و دال میں سازش کر ایک گوشہ میں ‌ ‌ مدام مدح میں تیری لکھا کروں اوراق

یہ وہ صحیح اور داخلی بیانات ھیں جن سے سودا کی لکھنوی زندگی کا سچا سچا حال معلوم ھوتا ھے - اب تک ھم اس کی فارغ البالی اور آسودہ

خاطری کے حق میں عجب حسن ظن رکھتے تھے شاعر کی شکایتیں ہماری خوش عقیدگی کو بدل دیتی ہیں —

ممکن نہیں کہ سودا کا ذکر آئے اور اس میں اس کے غلام غنچہ کو جگہ نہ ملے - مشہور ہے کہ یہ اس کا خادم تھا جو قلمدان لئے ہمیشہ ساتھ رہتا تھا - کسی قدیم تذکرہ میں اس غنچہ کا نام دیکھنے میں نہیں آیا - آزاد اور اس کے مقلدین نے اس روایت کو نقل کیا ہے - سودا کے ساتھ اس کا ایک شاگرد ہمیشہ رہا کرتا تھا وہ شاعر بھی تھا اور اشرف علی خاں صاحب تذکرۂ فارسی کا بیٹا تھا - مرزا کے مسودات کی تبئیض وہی کرتا تھا - میر حسن اس کے متعلق لکھتا ہے " میر فخرالدین خلف اشرف علی خاں صاحب تذکرۂ فارسی اکثر ہمراہ مرزا می‌باشد وغزل ہاے ایشاں را ترقیم می نماید " —

مصحفی کا بیان ہے —

" فخرالدین ماہر ... مدتے بخدمت مرزا رفیع السودا اوقات عزیز خود را بہ کتابت دیوانش صرف ساختہ ... ازیں جہت اکثر اوقات ' خود را از مصاحباں و مشیران مرزا می شمارد و فخرید می گوید کہ مونس ہر وقت ایشاں بودہ ام و طرفہ تر ایں کہ باوصف آگاہی فن اگر کلامش نگاہ کنی خالی از سخافت نیست دریں جا ایں مثل بسیار بموقع بیاد آمدہ - دوران با خبر در حضورو نزدیکان بے بصر دور ' -

صرف ماہر کے متعلق تذکروں میں یہ ملتا ہے کہ وہ ہمیشہ ان کے ساتھ رہتا تھا ممکن ہے کہ اس وقت زندہ دلوں نے اس کی خدمت کے اعتبار سے یہ نام رکھدیا ہو - بہر حال اس کے سوا کسی تذکرہ یا تحریر میں غنچہ کا نام نہیں ملتا -

آزاد نے ایک بہت ھی پر لطف قصہ سودا اور میر جعفر زٹل کے بارے میں لکھا ھے کہ "جب مرزا رفیع لڑکے تھے اس وقت میر جعفر زٹل کا بڑھا پا تھا - اگلے وقتوں کے لوگ رنگیں جریبیں جن پر نقاشی کا کام ہوتا تھا اکثر ھاتھہ میں رکھا کرتے تھے - ایک دن شام کے قریب میر موصوف ایک سبز رنگ جریب ٹیکتے ٹہلنے کو باھر نکلے- مرزا بغل میں کتابوں کا جزدان لئے سامنے سے آتے تھے اس زمانے میں ادب کی بڑی پابندی تھی - بزرگوں کو سلام کرنا اور ان کی زبان سے دعا لینے کو بڑی نعمت سمجھتے تھے - مرزا نے جھک کر سلام کیا- انہوں نے خوش ہوکر دعا دی- چونکہ بچپن ھی میں مرزا کی موزونیٔ طبع کا چرچا تھا - میر صاحب کچھہ باتیں کرنے لگے- مرزا ساتھہ ھولئے- انہوں نے نو خیز طبیعت کو بڑھانے کے لئے کہا مرزا بھلا ایک مصرع پر مصرع تو لگاؤ —

ع - لالہ در باغ داغ چون دارد ؟ مرزا نے سوچ کر کہا - ع - عمر کوتا است غم فزون دارد- میر صاحب نے فرمایا واہ مرزا دن بھر کے بھو کے تھے (ہ) کہا گئے - مرزا نے پھر کہا - ع - از غم عشق سینہ خون دارد میر صاحب نے فرمایا واہ بھئي دل خون ھوتا ھے جگر ھوتا ھے بھلا سینہ کیا خون ھوگا - سینہ پر زخون ھوتا ھے- مرزا نے پھر ذرا فکر کیا اور کہا - ع - چہ کند سوزش دروں دارد - میر صاحب نے کہا ھاں ٹھیک ھے ذرا طبیعت پر زور دے کر کہو - مرزا دق ھوگئے جھٹ کہہ دیا ع - یک عصاء سبز زیر ...دارد - میر جعفر مرحوم ھنس پڑے اور جریب اٹھا کر کہا - کیوں ھم سے بھی - دیکھہ کہونگا - تیرے باپ سے - بازی بازی بریش بابا ھم بازی - مرزا تو لڑکے تھے ھی - بھاگ گئے " -

یہ لطیفہ کسی قدیم تذکرہ میں نہیں - میر حسن نے لکھا ھے- لیکن اس

اس کو سودا سے کوئی تعلق نہیں - اس میں میر جعفر زٹل اور سودا کے بجاے میرزا بیدل اور میر جعفر زٹل ہیں - میر حسن کے اصل الفاظ ہیں -

" نقل است کہ روزے (میر جعفر زٹلی) پیش مرزا بیدل رفت- مرزا در فکر مصرع مصروف بودند - ملتفت نہ شدند - پر سید صاحب وقبلہ کدام مصرع فرمودہ اند - گفت بلے و آن ایں مصرع بود : لالہ بر سینہ داغ چو دارد - میر مسطور گفت دریں تامل چیست - چو بکے سبز زیر ... . دارد - مرزا ازیں معنی بہم بر آمد زود چیزے دادہ رخصت نمود " -

میر حسن کے اس بیان سے ظاہر ہے کہ یہ سب آزاد کی فسانہ آرائی کے شاخسانے ہیں -

آزاد نے میر تقی کی ایک راے سودا کے متعلق درج کی ہے - لکھا ہے " لکھنؤ میں کسی نے پوچھا کیوں حضرت آج کل کون کون شاعر ہے؟ کہا ایک تو سودا دوسرا یہ خاکسار ہے اور کچھ تامل کرکے کہا آدھے خواجہ میر درد - کوئی شخص بولا کہ حضرت ! اور میر سوز صاحب ؟ چیں بجبیں ہو کر کہا کہ میر سوز صاحب بھی شاعر ہیں؟ انھوں نے کہا کہ آخر استاد نواب آصف الدولہ کے ہیں- کہا خیر یہ ہے تو پونے تین سہی "

میر صاحب کی یہ راے کسی تحریر میں نہیں ملتی - ممکن ہے کہ آزاد کی نظر سے کہیں گزری ہو یا روایتاً کہیں سنی ہو لیکن اس کی صحت پر یقین نہیں کیا جا سکتا - میر صاحب سودا کی زندگی میں لکھنؤ نہیں گئے - بلکہ دو سال بعد جیسا کہ ذکر میر، گلزار ابراہیم اور گلشن ہند سے ثابت ہے - ایسی صورت میں آج کل والا فقرہ کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا - جب میر صاحب کا قصہ چھڑ گیا ہے تو ایک غلط فہمی کا ذکر کردینا ضروری معلوم ہوتا ہے- بعض تذکرہ

نویسوں نے لکھا ھے اور اسے اکثر معتبر ادیبوں نے نقل کیا ھے کہ سودا نے میر تقی میر کے ایک مرثیے اور ایک سلام پر ناقدانہ اعتراضات کئے ھیں- اور ان کے فنی نقایص کی پردہ دری کی ھے - یہ منظوم اعتراضات دراصل ایک رسالہ ھے جس کا نام سبیل ھدایت ھے - حکیم اصلح الدین نے اس پر ایک نثری دیباچے فارسی میں لکھا ھے جس سے صاف معلوم ھوتا ھے کہ یہ میر تقی میر نہیں بلکہ یہ بزرگ میر محمد امتخلص بہ تقی ھیں- سودا نے تقی کے جن اشعار پر اعتراض کئے ھیں ان میں تقی کا تخلص اکثر قلمی دیوانوں میں موجود ھے مرتب نے تقی کو میر کردیا ھے میں سبیل ھدایت سے ایک بند نقل کرتا ھوں -

تقی اس حکایت کو کوئی کیا کہیگا یہ دو حرف ھیں اس کےدو میں ھوں بولا
کوئی مہرباں ھو کہے کر بلا جا کہ وھاں جاکے مرنے کی دل کو طلب ھے

تمام قلمی دواوین میں یہی تخلص استعمال ھوا ھے- فہرست مخطوطات انڈیا آفس نشان ۱۴۷ میں سودا کے اُس دیواں کا ذکر ھے جس کی کتابت یقین کے بیٹے مقبول نبی خاں نے ۱۲۱۴ ھ میں شاہ جہاں آباد میں کی ھے - اس نے صاف طور سے محمد تقی دھلوی عرف کُھاسی شاگرد فخرالدین لکھا ھے- یہ وھی شاعر ھے جس کا ذکر میرحسن نے اپنے تذکرہ کے صفحہ (۷۰) پر کیا ھے ان شواھد کی موجودگی میں تقی کو میر سمجھہ لینا کسی طرح صحیح اور قابل قبول نہیں —

سودا اور ضاحک کی ھجویات کے بارے میں آزاد نے لکھا ھے کہ سودا ضاحک کے انتقال کے بعد ان کے فرزند میرحسن سے عزا پرسی کرنے گئے "دیوان اپنا ساتھہ لیتے گئے بعد رسم عزا پرسی کے اپنی یا وہ گوئی پر جو کہ اس مرحوم کے حق میں کی تھی بہت سے عذر کئے اور کہا کہ سید مرحوم نے دنیا سے انتقال فرمایا تم فرزند ھو جو کچھہ اس روسیاہ سے

گستاخی ہوئی معاف کرو - بعد اس کے نوکر سے دیوان منگا کر جو ہجویں ان کی کہی تھیں سب چاک کر ڈالیں - میر حسن نے بمقتضاے علوء حوصلہ و سعادت مندی اس وقت دیوان باپ کا گور سے منگایا اور جو ہجویں ان کی تھیں وہ پھاڑ ڈالیں" - میر ضاحک کا انتقال سنہ ۱۱۹۶ھ میں ہوا جیسا کہ خود آزاد نے گلزار ابراہیم کے حوالے سے لکھا ہے اور سودا کا انتقال ۱۱۹۵ھ میں - ان حالات کے تحت آزاد کا یہ بیان بالکل بے بنیاد اور سراسر غلط ہو جاتا ہے —

آزاد نے ایک لطیفہ لکھا ہے —

" ایک ولایتی نے کہ زمرۂ اہل سیف سے تھا عجب تماشا کیا یعنی سودا نے اس کی ہجو کہی اور ایک محفل میں اس کے سامنے ہی پڑھنی شروع کردی - ولایتی بیٹھا سنا کیا - جب ہجو ختم ہوئی اٹھ کر سامنے آ بیٹھا اور ان کی کمر پکڑ کر مسلسل و متواتر گالیوں کا جھاڑ باندھ دیا - انہیں بھی ایسا اتفاق آج تک نہ ہوا تھا حیران ہو کر کہا کہ خیر باشد !خیرباشد جناب آغا اقسام ایں مقالات شایان شان شما نیست - ولایتی نے پیش قبض کھینچ کر ان کے پیٹ پر رکھ دی اور کہا نظم خودت گفتی- حالا ایں نثر را گوش کن - ہرچہ تو گفتی نظم بود - نظم از ما نمی آید ما بہ نثر ادا کردیم" —

یہ اور اس قسم کے چند لطیفے آزاد نے اپنی کتاب میں درج کئے ہیں- نہ تو کسی کتاب کا حوالہ دیا اور نہ کسی روایت کا ذکر کیا - ایسی حالت میں ان کی صداقت ہر طرح مشتبہ ہے - اوپر کی مثالوں سے واضح ہے کہ تاریخی حقایق کو تذکرہ سنجوں نے فسانہ آرائی سے

مسخ و مجروح کر دیا ہے اور واقعات و حالات کو بدل کر ان کی نوعیت کچھ کی کچھ کر دی ہے تو اس قسم کے خیالی قصے وضع کرنے میں کیا امر مانع ہے --

سودا کے حیات کے متعلق غلطیوں کو میں یہاں ختم کرتا ہے اور اب اس حصے کو لیتا ہوں جو اس کے کلام کے متعلق ہے، سودا کا کلام کلیات کی شکل میں مدون ہو کر شایع ہو چکا ہے، اس کا سب سے زیادہ رائج، متداول اور عام دسترس میں جو نسخہ ہے وہ نول کشور کا ہے - لیکن ایک تو یہ غلط ہے، دوسرے اس میں الحاقی کلام کثرت سے ہے جو دوسروں کا ہے - تیسرے اس میں بہت سا ایسا کلام موجود نہیں ہے جو سودا کا ہے اور قلمی نسخوں میں ملتا ہے - اس کا مرتب غلام احمد ہے جس نے کئی جگہ سے جمع کیا اور بے تحقیق و تفتیش سودا سے منسوب کر کے مرتب کر دیا - چنانچہ اس نے خود لکھا ہے -

" بندۂ غلام احمد کہ مولف کلیات ہذا است می گوید کہ دیوانہاے افضل المتاخرین مرزا رفیع‌المتخلص بسودا بشوق تمام و ذوق مالا کلام بکمال محنت و دماغ سوزی از چند جا بہم رسانیدہ بترتیب دلپزیر مرتب ساختہ یادگار روزگار گذاشت چون ایں کلیات جامع تر از دیگر دواوین مشہور است اکثر عزیزاں و صاحبان شوق بقیمت صد روپیہ طالب نسخۂ موصوفہ بودند لیکن دوری آں قبول طبع خاکسار نیفتاد خدا شاہد ایں مقال است "

غلام احمد کا مرتبہ نسخہ ہر طرح غیر معتبر ہے - یہ حال نہ صرف اس نسخہ کا ہے بلکہ اکثر قلمی نسخے اس عیب سے خالی نہیں - میرے پیش

نظر کلیات سودا کے کم و بیش چالیس قلمی نسخے هیں اور متعدد تذکرے اور حوالے کی کتابیں - یہ ذخیرہ انجمن ترقی اردو کے مہربان معتمد نے اپنی عنایت سے میرے لئے فراهم کیا هے - اس مواد کی مدد سے مجھے یہ تحقیق هوا هے کہ سودا کے کلیات میں کچھ کلام ایسا بھی هے جو دوسروں کا هے اور غلطی سے اس سے منسوب هو گیا هے اور اس کا کچھ کلام ایسا بھی هے جو ابھی تک معرض اشاعت میں نہیں آیا - میں پہلے الحاقی کلام سے بحث کروں گا —

الحاقی کلام کے سلسلے میں سب سے پہلے قایم کا ذکر ضروری هے - قایم سودا کا نامور شاگرد هے ، اس کا حسب تفصیل ذیل کلام سودا کے کلیات میں داخل هو گیا هے —

(۱) مثنوی در شدت سرما - یہ چھپن شعر کی مثنوی هے ، اس کا مطلع هے —

سردی اب کی برس هے اتنی شدید صبح نکلے هے کانپتا خورشید

یہ مثنوی قایم کی هے اس کے کئی ثبوت هیں - پہلا تو یہ کہ کلیات قایم کے ایک قدیم قلمی نسخے میں یہ مثنوی موجود هے - دوسرا ثبوت یہ هے کہ میر حسن اور قدرت اللہ شوق نے اس مثنوی کو قایم هی سے منسوب کیا هے اور اس کے انتخابی اشعار بھی دیے هیں - یہ دونوں تذکرے سودا کی زندگی هی میں لکھے گئے هیں - اس کے علاوہ سودا کے قلمی دواوین میں یہ مثنوی موجود نہیں هے - ان قلمی نسخوں میں سے بعض سودا کی زندگی میں لکھے گئے هیں اور اکثر اس کی وفات کے پس و پیش - سودا کے مروجہ کلیات میں یہ مثنوی هے لیکن قایم کے کلیات کی مندرجہ مثنوی سے مقابلہ کیجیے تو اکثر اشعار

میں جگہ جگہ الفاظ و تراکیب کا فرق ہے - سودا کے کلیات میں یہ اصلاح یافتہ شکل میں پائی جاتی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سودا کے پاس بغرض اصلاح یہ مثنوی آئي سودا نے اصلاح تو کردي لیکن واپس نہیں ہوی اور جب غلام احمد نے دیوان مرتب دیا تو اس میں اس کو بھی داخل کردیا - یہی حال قایم اور سودا کے دوسرے شاگردوں کے کلام کا ہے - جن کي تفصیں آگے آئے گی - خلط ملط اور الحاق و اتصال کا یہ سلسلہ سودا کے کلام کے متعلق اب تک جاری ہے - چنانچہ حکیم اصلح الدین کا وہ قصیدہ جو مصحفی کی ہجو میں تحریر ہے سید مطلب حسین عالي بی - اے لکھنوی نے سودا سے منسوب کردیا ہے اور اپنے انتخاب میں اس کو شامل کردیا ہے - حالانکہ قصیدے کے ہر شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا لکھنے والا سودا کا حمایتی اور شاگرد ہے —

(۲) قایم کی دوسری مثنوی "ہجو طفل پتنگ باز" سودا کے کلیات میں ملتی ہے - یہ ۵۲ اشعار پر مشتمل ہے —

ایک لونڈا ہے پتنگ کا کھلار

قایم کی مصنفہ مثنوی ہونے کے وہی ثبوت ہیں جو اس سے قبل بیان ہوچکے ہیں - کلیات سودا کے قلمی نسخوں میں یہ درج نہیں - شوق نے اپنے تذکرہ میں اسے قایم ہی سے منسوب کیا ہے اور اس کے ۲۴ انتخابی شعر بھی نقل کیے ہیں - اس میں بھی الفاظ و تراکیب کا اختلاف ہے اور یہ بھی اصلاح کی غرض سے سودا کے پاس آئي تھی اور اصلاح پاکر دھري رہی اور بالآخر سودا کے کلیات میں مرتب نے داخل کردی —

(۳) گیارہ شعر کی ایک حکایت بطرز مثنوی ہے جس کا مطلع ہے —

سنا ہے کہ ایک مرد اہل طریق نہایت ہی واقع ہوا تھا خلیق

یہ بھی قایم کے کلیات کے قلمی نسخے میں ہے اور کلیات سودا کے قلمی نسخوں میں درج نہیں —

(۴) ۲۳ شعر کی ایک اور حکایت ہے جس کا مطلع ہے —

سلف کے زمانے کا تاریخ داں یہ لکھتا ہے احوال وار فتگاں

(۵) ۱۹ شعر کی ایک تیسری حکایت ہے جس کا مطلع ہے —

سنا ہے کہ ایک مرد آزادہ طور جز اپنے نرکھتا تھا اسباب اور

(۶) ۱۲ شعر کی ایک چوتھی حکایت ہے اس کا مطلع یہ ہے —

سنا جاے ہے ایک مہوس کا حال کہ رکھتا تھا نت کیمیا کا خیال

یہ سب حکایتیں قایم کی ہیں، یہ سودا کے قلمی دواوین میں موجود نہیں اور قایم کے قلمی کلیات میں درج ہیں - ان کی تراکیب اور الفاظ وغیرہ میں اختلات موجود ہے -

(۷) ۳۵۹ شعر کی ایک طویل عشقیہ مثنوی "حکایت مرد درویش پنجاب" سودا کے مروجہ کلیات میں داخل ہے جس کا مطلع ہے -

الہی شعلہ زن کر آتش دل تب دل دے بقدر خواہش دل

یہ بھی قایم کے کلیات میں موجود ہے مگر کلیات سودا کے قلمی نسخوں میں درج نہیں - سپرنگر کے بیان کے مطابق ۱۱۹۷ ھجری کے ایک مکتوبہ کلیات قایم میں یہ مثنوی ۱۰۶ صفحوں پر موجود ہے - ھردو کلیات میں اکثر مقامات پر اختلات پایا جاتا ہے - سودا کے کلیات میں مثنوی کی اصلاح یافتہ شکل ہے اور قایم کے ہاں غیر اصلاح یافتہ - قایم کی ان کل العاقی نظموں کے اشعار کی تعداد (۵۳۳) ہے - یہ اشعار حقیقتاً سودا کے نہیں ہیں اس میں شبہہ نہیں کہ ان سب پر سودا کی اصلاح ہے لیکن اصلاح کرنے سے سودا کی تصنیف میں شمار ہونا لازم نہیں آتا - یہ مرتب کی غلطی سے داخل

ہوگئے ہیں - ان پر سودا کو مصنفانہ حق نہیں پہنچتا - البتہ یہ ضرور ہے کہ اس سے سودا کی استادانہ اصلاح اور شاعرانہ مہارت کا اندازہ ہوتا ہے —

اسی طرح سودا کے اور شاگردوں کا کلام بھی اس کے کلیات میں داخل ہو گیا ہے - ان میں ایک فتح علی شیدا ہے۔ شیدا کی ایک مثنوی " بوم و بقال " ہے جو فدوی لاہوری کی ہجو میں لکھی گئی ہے میر حسن اور قدرت اللہ شوق نے اس کو فتح علی شیدا کی مصنفہ بتایا ہے - شیدا میر سوز کا متبنی تھا اور سودا کا شاگرد جب فدوی نے احمد نگر عرف فرخ آباد میں سودا سے شاعرانہ مجادلہ کیا تو شیدا نے اس کی ہجو لکھی - میر حسن اور شوق کے بیانات کے سوا خود مثنوی کے اشعار اس خیال کی تائید کرتے ہیں —

وارد احمد نگر ایک ہیں مرد عزیز فہم میں سرتا قدم اور سراپا تمیز
شعر پر ہر ایک کے کرتے ہیں وہ اعتراض جامی کے دیوان سے خوب جانیں ہیں اپنی بیاض
حضرت سودا تلک جو میرے استاد ہیں شعر پہ ان کے بھی اب ان کے یہ ایراد ہیں

ان اشعار سے صاف ظاہر ہے کہ ان کا لکھنے والا سودا کا شاگرد ہے - مقطع میں بھی شیدا کا تخلص صاف طور سے موجود ہے - سودا کے اکثر قلمی نسخوں میں یہ مثنوی موجود نہیں اس کی بھی وہی شکل ہے جو دوسری الحاقی نظموں کی ہے - یعنی یہ اصلاح یافتہ صورت میں سودا کے کلیات میں داخل ہے - سودا کے ایک ترجیع بند کا اقتباس پیش کرتاہوں جس سے اس کی مزید تائید ہوتی ہے کہ مثنوی بوم و بقال شیدا کی مصنفہ ہے —

فدویا بولے ہے میں ہوں اوستاد میں کیا فن شاعری ایجاد
آکے شیدا جو ہو مرا شاگرد گوش دل سے سنے مرا ارشاد

مرتبہ اس کے شعر کا ہو یہ　سخن اس کا سخن کے ہو استاد
رفتہ رفتہ سنا ید شیدا نے　کہا اس نے کہ خانماں بر باد
معنی کے گھر کو تونے ویران کر　پھینک دی اس کی کھود کر بنیاد
کس طرح سے میں ہوں ترا شاگرد　بیت سعدی کی یہ مجھے ہے یاد

کس نیاید بزیر سایۂ بوم
ور ھما از جہاں شود معدوم

سودا کے ایک اور شاگرد فضل علی ممتاز کی ایک نظم " مثنوی در توصیف چھڑی " سودا کے کلیات میں داخل ہوگئی ہے - میر حسن نے اس کو ممتاز سے منسوب کیا ہے اور اس کے انتخابی اشعار بھی نقل کئے ہیں - میر حسن کا بیان ہے " ممتاز ...... یک مثنوی مسمی بدلاتھی نامہ خوب گفتہ کہ سلسلۂ اورابہ عصاے کلیم رسانیدہ و بسے ما نند شاخ گل برو گلہاے ذکر د وانیدہ چند ازان بیاد ست - من مثنوی :—

ہوتی ہے دنیا میں جو کچھ تحفہ چیز
سب سے ہے ممتاز کو لاٹھی عزیز

سودا کے کلیات میں مصرعہ ثانی اس طرح درج ہے -

سب سے ہے سودا کو یہ لاٹھی عزیز

یہ مثنوی بھی سودا کے کلیات میں اصلاح یافتہ شکل میں ہے - قلمی دواوین میں موجود نہیں —

بندرابن راقم سودا کا شاگرد تھا - اس کا ایک ھجویہ قصیدہ (۱۴) شعر کا سودا کے قدیم مطبوعہ کلیات میں داخل ہے حالانکہ راقم کا تخلص مقطع میں صاف طور سے موجود ہے -

راقم نے ھجو از بس غصے میں جو کہی ہے
اُڑ جاویگا یہ تیرے اب منہ کا نور بھڑوے

الحاقی کلام کے سلسلے میں سودا کے مرثیوں پر نظر ڈالنی بھی ضروری ہے - سودا کے مرثیوں کا دیوان ہی الگ ہے - جس میں ۹۱ مرثیے ہیں - لیکن ان میں ۱۸ ایسے ہیں جن میں مہربان کا تخلص موجود ہے - منشی کریم الدین کا بیان ہے کہ سودا مرثیوں میں مہربان تخلص کرتا تھا - یہ ممکن ہے کہ لفظ سودا کو منحوس خیال کر کے ازراہ ادب اس کا استعمال نہ کرتا ہو لیکن بقیہ (۷۳) مرثیوں میں اس کا تخلص سودا ہی درج ہے - اس لحاظ سے یہ توجیہ کسی طرح صحیح نہیں ہوسکتی - اس کے سوا نہ تو سودا نے کہیں اس کی طرف اشارہ کیا ہے کہ مرثیوں میں اس کا تخلص مہربان ہے اور نہ اس کے تذکرہ نویسوں نے - ایک مرثیہ میں مہربان خان آیا ہے ظاہر ہے کہ سودا اپنے آپ کو " خان " نہیں لکھہ سکتا تھا -

سنا احوال تم نے اے عزیزاں
کہے کیا تم سے آگے مہرباں خاں

ہمارا خیال ہے کہ یہ مرثیے بھی الحاقی ہیں اور یہ بھی اس کے ایک شاگرد اور ممدوح نواب مہربان خاں فرخ آبادی کی تصنیف سے ہیں - مہربان خاں کا تخلص رند تھا لیکن شوق کے تذکرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مہربان بھی تخلص کرتا تھا چنانچہ شوق نے اس کے جو انتخابی اشعار نقل کئے ہیں ان میں دو جگہ مہربان تخلص موجود ہے - رند کے متعلق یہ توجیہ ہوسکتی ہے کہ مرثیے کے غم انگیز مضامین نیز بے ادبی کے خیال سے " رند " جیسے تخلص کا استعمال کرنا مناسب نہ تھا - اس لئے مہربان اس کی جگہ رکھہ دیا - سودا کے کسی اور شاگرد یا شمالی ہند کے ہم عصر شاعر کا تخلص مہربان نہ تھا - صرف مہربان خاں سودا کا شاگرد ہے جس نے مہربان بھی اپنا تخلص استعمال کیا ہے - مصحفی نے لکھا ہے کہ مہرباں خاں مرثیے بھی

کہتا تھا - اس بنا پر یہ خلاف قیاس نہیں کہ یہ اسی مہربان خاں کے مرثیے ہیں جو سودا سے منسوب ہوگئے ہیں - سودا نے ایک قصیدہ میں جو مہربان خاں کی مدح میں ہے لکھا ہے کہ مہربان خاں نے اس قسم کی نظمیں شوق اور عقیدت سے لکھی ہیں -

ہوکے مصروف دل و جان سے کہے ہیں اون نے
بسکہ در منقبت حیدر صفدر اشعار

اس شعر سے ظاہر ہے کہ اس نے اس قسم کی نظمیں لکھی ہیں -

ان مرثیوں کے الحاقی ہونے کی بھی وہی صورت ہے جو اوپر بیان ہوی ہے - یہ الحاقی مرثیے سودا کے قلمی نسخوں میں موجود نہیں ہیں - یہ تعداد میں اٹھا رہ ہیں اور سودا کے مطبوعہ دیوان مراثی میں بقید تخلص "مہربان" موجود ہیں مہربان خاں کے سلسلے میں ایک ضروری بات کی طرف اشارہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے - مہربان خاں کے اُستاد میر سوز تھے - سودا سے بھی وہ مشورہ کرتا تھا - کئی غزلیں ایسی ہیں جو سوز اور سودا دونوں کے کلیات میں ملتی ہیں - جن کے متعلق شوق نے لکھا ہے کہ "اکثر اشعار در دیوان او (مہربان خاں) یافتہ شد کہ آں را میر سوز نسبت بطرف خود می کند و بعضے گویند کہ از مرزا رفیع است " - مصحفی نے بھی لکھا کہ مہربان خاں کے دیوان میں سودا کے اشعار داخل ہیں جو بہت قبیح امر ہے - سوز اور سودا کے کلیات کے متعدد نسخوں کا ہم نے مقابلہ کیا ہے - بیسیوں غزلیں مشترک ہیں - ان کی نسبت یہ فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ در اصل کس کی ہیں - آیا سوز کی یا سودا کی یا خود مہربان خاں کی - مہربان خاں کے دیوان میں بقول شوق پچاس ہزار اشعار ہیں - اس وقت وہ ہمارے پیش نظر نہیں ورنہ ممکن تھا کہ اس کے حل کی صورت نکل آتی - سودا اور سوز کے طرز و انداز

اور رنگ طبع سے بھی مصنف کا پتہ چل سکتا ہے لیکن یہ یقینی نہیں۔ ذوق نے مشتبہ کلام سے سترہ غزلوں کا انتخاب درج کرنے کے بعد لکھا ہے :—

" علی ہذالقیاس اکثر غزلیات مضبوط و مربوط کہ داخل دیوان او (مہربان خان) ست آن را بمرزا رفیع و میر سوز وغیرہ نسبت می کنند خدا داند کہ در واقع از کیست " —

اس عبارت میں لفظ " وغیرہ " سے معلوم ہوتا ہے کہ سودا اور سوز کے علاوہ دوسرے شاعروں کا کلام بھی اس کے دیوان میں شامل ہے۔ ایسی صورت میں یہ بحث اور بھی پیچیدہ ہو جاتی ہے انجمن ترقی اُردو کلیات سودا اور کلیات سوز کو خاص تحقیق سے مرتب کرا رہی ہے۔ ان کی اشاعت سے یہ بحث صاف ہو جائے گی —

سودا کا بہت سا کلام ایسا بھی ہے جو اب تک معرض طبع میں نہیں آیا اور عام دسترس سے باہر ہے۔ غیر مطبوعہ کلام میں سب سے پہلے قصائد پر نظر پڑتی ہے۔ مطبوعہ کلیات میں صرف ۴۴ قصیدے ہیں۔ ان کے علاوہ گیارہ قصیدے اور ہیں جو ہمیں قلمی نسخوں میں دستیاب ہوے ہیں۔ ان کی تفصیل یہ ہے —

(۱) ایک قصیدہ حضرت فاطمۃ الزہرا کی مدح میں ہے جو ۸۶ شعر کا ہے اس کا مطلع ہے :—

مکھڑے سے اپنے زلف کے پردے کو تو اوٹھا
ابر سیہ میں ماہ درخشاں کو مت چھپا

(۲) دوسرا قصیدہ حضرت علی کی منقبت میں ہے (۳۴) اشعار پر مشتمل ہے۔ اس کا مطلع ہے :—

لخت دل بکھرے ھیں یوں آہ سے ھنگام قلق
جنبش باد سے جوں گل کے پریشاں ھوں ورق

(۳) تیسرا قصیدہ "خلاصۃ الاوراد" ھے - یہ حضرت امام زین العابدین کی مدح میں ہے۔ اس کے ۶۳ شعر ھیں - مطلع یہ ھے :—

کہا میں ایک دن اُس سے کہ اے ستم ایجاد
جفا و جور کہاں تک کہاں تئیں بیداد

(۴) چوتھا قصیدہ حضرت امام حسن کی مدح میں ہے۔ (۲۰) شعر ھیں - مطلع یہ ھے :—

ھوا ہے دشت برنگ چمن طرب مانوس
نگہ غزال کی جوں شاخ سبز ہے محسوس

(۵) پانچواں قصیدہ حضرت امام باقر کی مدح میں ھے۔ اس کے ۱۳ شعر ھیں - مطلع یہ ہے :—

ھزار شکر گئے وہ خزاں کے رنج و الم
رسیدہ مژدہ کہ آمد بہار فیض قدم

(۶) چھٹا قصیدہ "صبح صادق" ھے۔ یہ امام جعفر صادق کی مدح میں ھے (۳۸) شعر ھیں مطلع یہ ھے :—

فلک بتا دے مجھے اپنے عیش و غم کی طرح
کرم کی کون طرح کون سی ستم کی طرح

(۷) ساتواں قصیدہ حضرت امام تقی کی مدح میں ھے - ۳۱ شعر ھیں مطلع یہ ھے :—

ھووے جو قطرہ ریز یہ چشم تر آب میں
پیدا ھو پھر بجاے گہر اخگر آب میں

(۸) آٹھویں قصیدہ کے ممدوح بھی امام تقی ھیں - ۲۲ شعر ھیں
مطلع یہ ھے :—

ہوا کے فیض سے ایسا ھے سبز باغ جہاں
شبیہ سنبل تر سے ھے موج ریگ رواں

(۹) نواں قصیدہ دربار اودھ کے انگریز رزیڈنٹ رچرڈ جانسن کی مدح
میں ھے اس کے ۲۳ شعر ھیں - مطلع یہ ھے :—

دیکھا نہ جائے اس سے رخ گلرخاں پہ رنگ
غنچہ کے بیچ دھن کی ہے چشم زمانہ تنگ

(۱۰) دسواں قصیدہ شیخ جی کی ہجو میں ھے ۲۰ شعر ھیں مطلع یہ ھے :—

شیخ جی کوں ھیں دستار بڑی اون کا ھے کول
چھپ رھا ریش مبارک کے تلے پیٹ کا جھول

(۱۱) گیارھواں قصیدہ "مضحکہ دھر" بریلی کے شیخ کی ھجو میں ۴۷
شعر کا ھے - مطلع ھے :—

لکھتا ھوں میں ایک شیخ بریلی کی حکایت
ھر چند زباں خامہ کی قاصر ھے نہایت

قصائد کے علاوہ دیگر اصناف سخن میں بھی مستقل نظمیں اور متفرق اشعار اور بند ایسے ھیں جو مطبوعہ کلیات میں موجود نہیں اور قلمی نسخوں میں ملتے ھیں - ان کی تفصیل یہاں طوالت کا باعث ھوگی - انجمن ترقی اردو کلیات سودا کو خاص تحقیق کے ساتھ شایع کرنے کا ارادہ رکھتی ھے - اس کی اشاعت سے بہت سا غیر مطبوعہ کلام روشنی میں آجائے گا —

ده مجلس کا اردو ترجمہ

از

(جناب کاشی پریاگی صاحب)

کوئی صاحب تھے "محمد رحمت اللہ نام قوم انصاری متخلص قیدی" جنہوں نے اپنی سکونت اور پتہ یوں لکھا ہے "ساکن شہر بیکسی مقیم محلۂ تنہائی" انہوں نے ده مجلس کا ترجمہ فارسی سے اُردو میں کیا ہے، ترجمہ آزاد ہے سلیس ہے بامحاورہ ہے اور پر اثر ہے۔ زبان ایسی صاف ہے کہ اب سے تیس چالیس سال ادھر کی معلوم ہوتی ہے —

"شہر بیکسی" اور "محلہ تنہائی" کی صرف یہی وجہ سمجھ میں آتی ہے کہ بے چارے بہت زیادہ منکسر اور خاکسار تھے ورنہ موضوع ایسا نہ تھا کہ کسی نقاب کی ضرورت ہوتی —

وجہ تالیف (بہ معنی ترجمہ) یہ کی گئی ہے کہ "اکثر مومنین محرم کی چاند رات سے تعزیہ داری کی مجلس میں کتاب سننے کو اس غریب بیکس کے یہاں آتے تھے لیکن سچ یوں ہے کہ اُن میں جو صرف اشخاص (؟) یا اہل علم تھے ان کو تو احوال کتاب غم کا ظاہر ہی تھا مگر

بعض عوام الناس که بے علم محض تھے ان کے تئیں فقط تردد خاطر هی تیا - اگرچه پڑھنے والا عبارت کی ساتھه مکرراً معنی بهي کهتا تها تسپر بھی بسبب فارسیت کے مضمون مدعا کا سمجھنے سے رهتا تها تو اسی واسطه اس هیچمدان نے ترجمه ده مجلس کا عبارت نثر میں بیچ ریختہ زبان کے لکھا " —

میرے پاس جو نسخه هے وه علی حافظ صاحب کا نقل کیا هوا هے - جس پر سنه ۱۲۲۸ ھ درج هے -

یه ترجمه سنه ۱۲۲۳ ھ میں کیا گیا تها اور اس کا تاریخی نام تها " ترجمه مجلس ماتم کا " -

پرانی قلمی کتابوں میں اکثر یہی روش نظر آتی هے که نه سند هوتا هے نه مصنف یا مولف کا نام هوتا هے - کہیں کہیں نقل کرنے والے البته اپنی معلومات اور تحقیق سے کچھه لکھه دیا کرتے هیں - قیدی صاحب نے بڑی همت کی - سند ترجمه بهی لکھه دیا اور اپنا نام بهی مگر سکونت نه لکھی اسی لئے نه تو ان کے متعلق اور کچھه حالات مل سکے نه یه معلوم هوسکا که یه کتاب علی حافظ کے پاس سنه ۱۲۲۸ ھ میں یعنی ختم ترجمه کے بعد پانچ هی برس کے اندر کیسے پہنچ گئی -

غور کرنے کے بعد میں صرف دو هی نتیجوں پر پہونچ سکا هوں -

۱ - یا تو یه کتاب اس قدر مقبول اور مشہور هوئی که پانچ هی برس میں کانوں کانوں پہونچ گئی -

۲ - یا یه که بالکل مشہور نہیں هوئی اور کانوں کی کانوں هی میں رہ گئی -

پہلا نظریه نگاهوں میں اس لئے نہیں جچتا که اگر اس کتاب کو

قبول عام کا حله مل گیا هوتا تو "مغشورات" میں اس کا ذکر هوتا، تذکروں میں آتا - مگر ایسا نہیں هوا -

عدم قبول کی وجه یه نہیں هے که ترجمے کی زبان اچھی نہیں یا کچھه داخلی سوانع هیں - میرے نزدیک عام طور پر مشہور هونے کے اسباب کچھه اس طور پر رهے هوں گے -

۱ - ایک تو قیدی صاحب ایسے "بیکس" تھے که بار بار اپنے کو "غریب بیکس" کہتے هیں -

۲ - اردو پریس کا ابتدائی زمانه تھا، نشر و اشاعت، طباعت و کتابت آسان چیزیں نه تھیں -

۳ - خود قیدی صاحب زیادہ نشر کے متمنی نه تھے - انہوں نے تالیف کی غرض اتنی هی بتائی هے که جو لوگ فارسی نہیں جانتے وہ بھی سلیس زبان میں مطالب سمجھه لیں اور خود مولف داخل حسنات هوجائے - چونکه رونے رلانے کی چیز تھی اور ایک خاص فرقے سے مخصوص تھی لہذا اس کی شہرت کچھه ایسی زیادہ نه هوسکی - مگر آج سنه ۱۳۵۰ ھ میں جب هم سنه ۱۲۲۳ ھ کی زبان دیکھتے هیں

تو تصویر هوجاتے هیں - خصوصاً اس زمانے کے اور نثر کے ادبی کارناموں کے سامنے جب هم اس کی عبارت کو رکھه دیتے هیں تو آنکھیں کھل جاتی هیں -

اس ترجمے میں نه تو آورد هے نه تصنع نه پر شکوہ الفاظ هیں، نه سجی هوئی تشبیهیں، نه خلاف فطرت عناصر کی چاشنی هے، نه رومانیت کا غلبه - سیدھی سادی بات هے مگر بلا کا اثر اور غضب کی سادگی هے -

دوسرے نظریے میں موافق اور خلاف دونوں عنصر هیں -

سید علی حافظ صاحب (کاتب) نے سنه ۱۲۳۶ ھ میں یه قلمی نسخه

میرے پر دادا میر باقر علی صاحب کے امام باڑے میں نذر کیا تھا - سر کتاب پر یہ عبارت هے -

" بتاریخ غرہ محرم الحرام سنه ۱۲۳۶ هجری قد سے ایں کتاب مصیبت انتساب را سر گشته وادی عصیاں احقر الناس علی حافظ براے داخل شدن ثواب جماعة مومنین در امام باڑہ سیدی سندی میر باقر علی صاحب نذر نمود "...

یه امام باڑہ موضع مگرسن تحصیل هنڈیه ضلع اله آباد میں تھا - پندرہ برس هوے که میر عابد علی صاحب ایڈوکیٹ مرحوم نے اسي جگهه خام امام باڑے کو منہدم کرا کے پخته بنوا دیا هے - رونے رلانے کی چیز تھی امام باڑے میں نذر هو کر اسی چار دیواری میں نظر بند هو گئی -

گانوں کے بڑے بوڑھوں سے اور مقامی حضرات کے خاندانی شجروں سے علی حافظ صاحب کا دھندلا سا پته تو چلتا هے مگر قیدی صاحب کا کچهه پته نهیں چلتا - کیا عجب هے که پردیسی رهے هوں اور چلتی پھرتی چھانوں کی طرح اس گانوں میں بھی آ نکلے هوں - بهر کیف یه کام صاحبان نظر کا هے ' اُمید هے که ادبیات میں بال کی کھال کھینچنے والے حضرات قیدی صاحب کا پته بھی لگا لیں گے اور اس ترجمے کو شایع کر کے اس زمانے کے نثری صف میں اس کی جگهه بھی نکال لیں گے -

قیدی صاحب نے اپنے ترجمے کے پڑھنے کے متعلق چند هدایتیں بھی لکھی هیں جو میں انهیں کے الفاظ میں آپ کے سامنے پیش کرنا چاهتا هوں - ممکن هے که مولف کی وسعت نگاہ ' علم تقریر اور فن کتابت کے متعلق بھی کچهه مدد مل سکے - ان هدایات کا التزام ساری کتاب میں بسم الله سے تمت تک هے - نشانات سب سرخ روشنائی سے هیں -

" جو کوئی اس کے تئیں بشرط آئین کے پڑھے تو البته احوال واضح

ہوے اور سب کی فہم میں آوے اور آئین اس کے بڈھنے کا یہ ہے کہ
آخر ہر فقرے کے حرف فا (ت) سرخی سے لکھا ہے وہ علامت فقرے کی ہے
اور جہاں کہیں نقاط (:.) ہے اشارہ نظم کے مصرعہ کا ہے اور جس جگہہ
کہ خط تب (س) کا کھینچا ہے تو وہ کنایہ ہے کہ وہاں سے مطالب عبارت
اور مضمون کا علحدہ ہے۔ پس فقرے کے تئیں ابتدا سرخی انتہا تلک
بدوں سکتہ بڈھے موجب یہ کہ عبارت جو نسر ہے اگر فقرہ مل جاوے تو
عبارت نہ رل جاوے اسی واسطے نشان مقرر رکھے اگرچہ کچھہ
صنعت تو نہیں"۔

خود اپنی عبارت کے متعلق لکھتے ہیں۔

"کہ عبارت سایس ہے اور صنایع و بدایع سے عاری محض اور رنگینی
و انشا پردازی سے خالی مطلق اگر اصلاح فرماوے (پڑھنے والا) تو سزا وار
ہے باقی مختار ہے والسلام علی اهل الکلام۔

ساری کتاب ایک سو ستر صفحات کی ہے۔ ہر صفحے میں ۱۳ سطریں
ہیں۔ پندرہ سولہ الفاظ في سطر کا اوسط ہے۔ ہر باب سے ایک نئی
شہادت شروع ہوتی ہے ۱۶۰ صفحہ تک دس شہادتیں یا مجلسیں ختم
ہوجاتی ہیں اس کے بعد "شمہ از حالات بعد شہادت حضرت سیدالشہدا
امام حسین علیہ السلام" ہے —

ساری سرخیاں سرخ روشنائی سے ہیں اور فارسی میں ہیں —

اب میں کہیں کہیں سے نثر و نظم کے نمونے دے کر اس مضمون کو
ختم کرتا ہوں۔ صفحہ ۲ پر حمد خدا میں لکھتے ہیں —

ہے وہ خداے پاک جہاں آفریدہ کار جس نے بناے سب یہ نہاں اور آشکار
سب یہ سیہ سپید ہے قدرت کے رنگ سے یعنی دو رنگ دیکھو جو ہو لیل اور نہار

ہے سب ظہور اس کا یہ کیا ارض کیا سما
صحرائے خار خار یہ دامان کو ہسار
صنعت سے اس کی خالی نہیں ہے کوئی جگہ
یا گُلزمیں ہے یا کہ کہیں ہے یہ شورہ زار
جبر و قدر کا سارا یہاں ہے معاملہ
تابع ہیں اس کے امر کے جبر او ر اختیار
قیدی ہے اس کے امر کا جو کچھ ہے جلوہ گر
خلاق ذو الجلال خدا وند کرد گار

سر دست میں قیدی صاحب کی کتاب کے نمونے دے دوں گا اور تنقید نہ کروں گا- اگر خدا کے فضل سے وہ دن بھی آیا کہ یہ مکمل تصنیف شایع ہوکر اہل نظر کے سامنے آگئی اس وقت موازنہ اور تبصرے کا لطف ہو گا- ابھی تو بے فصل کا راگ معلوم ہوتا ہے -

صفحہ ۳ نعت میں کہتے ہیں -

ہے ہم سے رو سیاہوں کو اس سے ہی کچھ پناہ
یعنی شفیع حشر ہے وہ مرسل اللہ
غمخواری عاصیوں کی رہی زیست بھر تمام
اُمت کے واسطے ہی تھی ساری یہ رسم و راہ

اصحاب رسول کی منقبت میں فرماتے ہیں -

مرتبہ اصحاب کا کس سے بیاں کچھ ہو سکے
ہے حدیث آیت سبھی بس حق میں ان کے سب نزول
اے معاذاللہ جو کوئی دشمن اصحاب ہو
دین احمد سے مخالف ہے سراسر وہ فضول

صفحات ۱۰ سے ۱۵ تک -

مجلس اول در ذکر وفات جناب رسول عالم شفیع اُمم حضرت احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ (صلعم) -

باد صبانے سرپہ اُڑا یا ہے کیوں غبار
ہے جیب چاک کس لئے یہ صبح ایکبار

ہے کس کے غم میں ہائے بھلا شام ماتمی دھونی سی کیوں لگائے ہیں بیٹھے یہ کوہسار
چادر ہے آہ ابر کی یوں تیرہ رنگ سی نعرہ زناں ہے رعد تو ہے برق بے قرار

ایک دن جناب رسول خدا بیماری کے عالم میں حجرۂ مبارک سے باہر نکلے اور بلال کیتئیں ارشاد کیا کہ جانا مسلمانوں کے تئیں کہہ آنا کہ آج سبب جمعہ کے مسجد جمع ہو کر آویں... ... ... بعد فراغت نماز کے منبر پر چڑہ کر خطبہ حمد الٰہی کا ادا کیا اسکے بعد فرمایا ... ... اب تم سے جدا ہوتا ہوں .... جس شخص کا تم میں سے کچھہ قرض میری طرف ہو تو اس کی نشان (؟) لے یا بخش دے اور جسکو کہ میں نے کسی تہب آزردہ کیا ہووہ اب آوے اور اس کا بدلہ مجھہ سے لے جاوے کیونکہ آسودہ اور سبکبار واصل خدا ہوں ... . ایک شخص کہ اس کا عکاسہ نام تھا اُتھہ کر یوں عرض کرنے لگا ... ... آپ نے تبوک کے سفر میں ناقہ کو غضب سے کوڑا اُٹھایا تھا - ضرب اس کوڑے کی سرے کاندھے پر ایسی لگی کہ بہت آزار دیا سو اب بدلہ اس کوڑے کا چاہتا ہوں تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ اے عکاسہ تو جانتا ہے کہ وہ کون سا کوڑا تھا اس نے عرض کیا .... وہ جو کوڑا گندھا ہے اور خفران کے چوب کے دستہ میں ٹنگا ہے- یہ سنتے ہی حضرت رسول خدا نے سلمان کیتئیں ارشاد کیا کہ جاوہ کوڑا فاطمہ کے یہاں سے لے آ .... سلمان نے جو کوڑا حضور پر نور میں لا کر رکھا تو دیکھتے ہی اس کے دفعتاً تمام صحابہ سے غل وادریغا کا اٹھا ہائے کیا کہئے کہ ایک شور قیامت کا سا پڑا اسوقت ہر ایک اصحاب نے افسوس کھایا اور اسکے پاس جا کر سمجھایا کہ اے عزیز تو جانتا ہے کہ پیغمبر خدا نہایت رنجور رہے اور کوڑا کھانے سے معذور ہے پس یہ خیال جانے دے اور ہم سب کو دس دس کوڑے لگا لے اوسنے

کہا یہ سب خلاف ہے مجھے نہیں قبول ... ... یہ سن کے حضرت رسول نے فرمایا کہ ہرگاہ میں نے کسی کے کوڑا بذات اپنی مارا ہو تو پھر قصاص اسکا تم سے کیونکر ہو سکتا ہے ... ... اس وقت آپ نے عکاسہ کیتئیں تاکید سے فرمایا کہ اب قصاص کیوں نہیں جلد لیتا ہے ... ... عکاسہ نے التماس کی کہ جس وقت کوڑا مرے لگا تھا تو بدن میرا ننگا تھا ... ... یہ سنتے ہی جناب رسول نے پیرہن بدن مبارک سے نکال لیا اور کاندھا اپنا ننگا کیا - جو ہیں نظر عکاسہ کی مہر نبوت پر پڑی ووہیں کوڑا ہاتھ سے ڈال کر مہر چوم لی اور چہرہ اپنا آپ کے شانوں سے مل کر عرض کی کہ یا رسول‌الله غرض غلام کی یہ نہ‌تھی کہ آپ سے قصاص لیجئیے بلکہ خصوص مراد اپنے دل کی یوں تھی کہ مہرنبوت کو چوم لیجئیے - کیوں کہ آپ نے فرمایا ہے کہ من مس جلدی فلاتمسه النار یعنی جو کوئی چھوئے مرے بدن کیتئیں پس نہ جلے گا وہ دوزخ کی آگ میں —

———*———

شیخ ملا نصرتی ملک الشعراے بیجاپور

(۲)

علی نامہ

ماہ ذیحجہ سنہ ۱۰۴۵ ھ (۱۶۳۶ ع) میں جب مغلوں اور سلطان بیجاپور میں مصالحت ہوگئی اور جنگ و پیکار کا خاتمہ ہوگیا تو سلطان محمد عادل شاہ کو اپنی حکومت کی توسیع اور فروغ کا موقع ملا - اس نے بیس سال کے عرصے میں اپنی حکومت کو انتہاے عروج تک پہنچا دیا اور اس کی قلمرو بحیرۂ عرب سے خلیج بنگال تک جا پہنچی - جب محمد عادل شاہ کا انتقال (سنہ ۱۰۶۷ ھ/۱۶۵۶ ع) ہوا تو اس کے ملک کا سالانہ محاصل ۷ کروڑ ۸۴ لاکھ تھا اور اس کے علاوہ باجگزار ریاستوں سے سوا پانچ کروڑ روپیہ سالانہ بطور خراج کے اور وصول ہوتا تھا - فوج میں اسی ہزار سوار اور اڑھائی لاکھ پیدل اور ۵۳۰ جنگی ہاتھی تھے - اگر باجگزار ریاستوں کو بھی ملا لیا جاے تو ایک طرف اس کے علاقے میں بمبئی کے اضلاع کنارا اور دھاروار تھے اور دوسری طرف مدراس کے اضلاع کرنول اور بلاری اور ریاست میسور کا بہت سا حصہ - اس سے عادل شاہ کی قلمرو کی عظمت و شان کا اندازہ ہو سکتا ہے —

باپ کی وفات پر علی عادل شاہ ثانی کی عمر ۱۸ سال کی تھیؔ -

امرا میں حسد و رقابت کی آگ بھڑک رہی تھی ' سرحدی صوبوں پر بغاوتیں نمودار ہو رہی تھیں ' اس پر اورنگ زیب کی چڑھائی اور بعض عادل شاہی امرا کی غداری نے طرح طرح کی پیچیدگیاں اور پریشانیاں پیدا کر دی تھیں ' تاہم بیجاپور برابر مقابلہ کرتا رہا - اتنے میں اورنگ زیب کو دکن کی مہم چھوڑ کر دہلی جانا پڑا - وہاں تخت و تاج اس کے انتظار میں تھے - اس سے بیجاپور کو دم لینے کا موقع مل گیا - علی عادل شاہ نے بڑی ہمت اور ہوشیاری سے کام لیا اور اپنی حکومت کو سنبھال لیا - وہ خود میدان جنگ میں آیا ' شیواجی کی بڑھتی ہوئی قوت کو روکا ' کرنول کے حبشی سرداروں کو نیچا دکھایا ' راجہ بدنور کی سرکوبی کی اور آخر میں مغلوں کے فوجی سیلاب کو جو جے سنگھہ کی سرکردگی میں بڑھتا ہوا چلا آ رہا تھا ' پیچھے ہٹا یا —

اِس مثنوی میں جو علی نامہ کے نام سے مشہور ہے اِنہیں مہمات کے کارنامے ہیں —

نصرتی کا بڑا کمال یہ ہے کہ اس نے تاریخی واقعات کو صحیح ترتیب ' بڑی احتیاط اور صحت کے ساتھہ بیان کیا ہے - حسن بیان اور زور کلام کے تمام اسلوب ہوتے ہوے کہیں تاریخی صحت سے تجاوز نہیں کیا - تاریخ سے واقعات کو ملا لیجئے کہیں فرق نہ پائیے گا بلکہ بعض باتیں شاید اس میں ایسی ملیں گی جن کے بیان سے تاریخ قاصر ہے - باوجود اس کے واقعات کی تفصیل ' مناظر قدرت کی کیفیت ' رزم و بزم کی داستان اور جنگ کا نقشہ کمال فصاحت و بلاغت اور صناعی سے کھینچا ہے - اردو زبان یوں ہیں رزمیہ نظموں سے خالی ہے اور اگر ایک آدہ رزمیہ نظم جو اس سے قبل لکھی گئی ہے وہ ہرگز اس کو نہیں پہنچتی - یہ رزمیہ مثنوی ہر لحاظ سے

ہماری زبان میں بے نظیر ہے —

اس نظم کے تفصیلی بیان سے قبل ایک بات اور لکھہ دینی چاھتا ہوں جس کا جاننا ضروری ہے - وہ یہ کہ مغلوں اور بیجاپوریوں کی اس جنگ میں شیواجی کو بہت بڑا دخل ھے - جب بیجاپوری حکومت نے اس کا قافیہ تنگ کیا تو مغلوں کی منت سماجت کرکے ان سے جا ملا اور بیجاپور کی فتح کا سبز باغ دکھایا اور جب کسی قدر آزادي ملی اور پھر لوٹ مار شروع کی اور مغلوں نے دبایا تو بیجاپوریوں سے ساز باز کر لیا - بعد میں حکومت بیجاپور اور مغلوں میں اتحاد تو ہو گیا مگر پھر بھی وہ ایک دوسرے سے بد گمان رھے - حکومت بیجاپور کو یہ بدگمانی تھی کہ مغل شیواجی سے در پردہ ساز رکھتے ھیں اور مغل یہ سمجھتے تھے کہ حکومت بیجاپور خلاف معاھدہ پوشیدہ طور سے شیواجی کی امداد کرتی ہے - ان دونوں کی بدگمانیاں کچھہ بیجا نہ تھیں اور اس کی وجہ سے انہوں نے بہت کچھہ نقصان اٹھایا - ان تاریخی الجھیڑوں کو چھوڑ کر اب ہم اصل کتاب کی طرف رجوع کرتے ھیں -

اس مثنوی میں بھی نصرتی نے وھی اھتمام کیا ھے جو گلشن عشق میں پایا جاتا ھے - یعنی ھر باب کا عنوان ایک شعر ھے جس میں اس باب کے اصل واقعے کا خلاصہ یا اشارہ اس شعر میں آجاتا ھے - عنوان کے یہ تمام شعر ایک بحر اور قافیے میں ھیں - ان تمام اشعار کو یک جا جمع کر لیا جاے تو لامیہ قصیدہ ھو جاے گا جس میں مثنوی کا سارا مضمون آجاے گا - کتاب کا عنوان یہ دو شعر ھیں —

حمد اول ھے خدا کا کہ جنے روز ازل

دیا ھے ھمت مرداں کو جو توفیق سوں بل

رکھا اس نامۂ نامی کا علی نامہ ناتوں
تا جنم جگ یو زمانے کے گلے ہوے ہیکل *

اس کے بعد اصل کتاب شروع هوتي هے - حسب معمول اول حمد هے - نصرتی کے حقیقی شاعر هونے میں کلام نہیں' اس نے یه التزام رکھا هے که جس رنگ کی مثنوي هے اسی رنگ کی حمد بھی هو یعنی عشقیه مثنوی کی حمد عاشقانه هے جیسا که گلشن عشق کے بیان میں ذکر هو چکا هے اور رزمیه مثنوی کی حمد شان رزم رکھتی هے - چند ابتدائی شعر ملاحظه هوں

سرانا سرے اس سکت دار کوں	تعریف اس قوی قادر کو زیبا هے
که آدھار هے جن نرا دھار کوں	که جو بے آسراؤں کا آسرا هے
سکندر کوں دارا پہ جن جس دیا	جس نے سکندر کو دارا پہ غلبه دیا
ادک کج تھے شرزے کے هت کس دیا	اور شیر کے پنجے کو هاتھی سے زیادہ قوت بخشی
دیا یوں توں رستم کے پنجے میں زور	تو نے رستم کے دست و بازو میں وہ زور دیا'
پڑیا تر تھے جس دل میں دیواں کے شور	که اس سے دیووں کے دلوں میں دهشت بیٹھ گئی
نہنا ساچ هیرا نپا کھن منے	ننھا سا هیرا کان میں پیدا کیا
بڑا بل دیا پیسنے گھن منے	اسے گھن میں پیسنے کو کتنی بڑی قوت دی
دکھت سر کش آتش میں باد غرور	سر کش آگ میں کس قدر باد غرور نظر آتی هے
چھنے هت تھے پانی کے تس مکھ تھے نور	آخر اس کے منه کا نور پانی کے هاتھوں چھینا گیا
کر نہار غالب کوں مغلوب وے	وهی غالب کو مغلوب کرنے والا هے
طلب کی هے طالب کا مطلوب وے	اور وهی طالب کی طلب کا مطلوب هے

* ایک دوسرے نسخے میں یه مصرع یوں هے
" جس کی هر رزمیه رستم کے گلے کا هو هیکل "

الہی قوی توں سرے تجھہ سکت	الہی توقوی ہے اورقوت تجھی کو سزاوار ہے
نہ دیتا توں بہاتا رتی کس کے ہت	تو اگر نہ دیتا تو کسی کے ہاتھہ کچھہ نہ آتا
ننھے اور بڑے میں تہیں حد بندیا	چھوٹے اور بڑے میں تونے حد باندھی
دونو میں توں شمشیر کا سد بندیا	اور دونوں میں تلوار کی دیوار کھڑی کردی
کہ کوی کس اوپر دات آنا سکے	تاکہ ایک دوسرے کو دبا نہ سکے
گر آوے اچھوتا وو جانا سکے	اور جو دباے تو اچھوتا نہ بچ نکلے
سکت پاے کوی دیس موذی اگر	اگر کچھہ دن کسی موذی کوزورحاصل ہوبھی گیا
وہاں اس پہ دے جیونکہ چمٹی کوں پر	تو چیونٹی کی طرح اسے پردے کروبال نازل کرتا ہے

اس کے بعد خدا کے عدل کی تعریف کرتا ہے کہ کس طرح موذیوں کو قابو میں رکہتا ہے اور موقع موقع سے غضب اور کرم کرتا ہے - چونکہ یہ رزمیہ نظم ہے اس میں تلوار کی تعریف کرتا ہے کہ خدا نے اس میں کیا کیا جوہر رکھے ہیں اور اسے وہ قوت دی ہے کہ ایک ایک کونے سے لاکھوں خزانے باہر نکال لاتی ہے - اور آخر میں کہتا ہے

کیا توں لوہا نامۂ صلح کل

یعنے تلوار ہی صلح کا نامہ ہے' اس کے بغیر امن نہیں ہوتا —

لوہے کوں کیا توں سفر کا رفیق	لوہا نیں تو زر دشمن ہر طریق
لوہے بن نکوی یار جانی ہے ہور	لوہے تہیچ ہے یار جانی کوں زور

پھر بڑی خوبی سے لکھتا ہے کہ ہر شے جسے خدا نے بڑائی دی ہے اسے اس کی حفاظت کے لیے ہتیار بھی دیے ہیں

توں سرجا ہے جے شے بزرگی کے کاج	تو نے جس کسی کو بڑای کے لیے پیدا کیا ہے
کیا نین بڑا اُس کو ہتیار باج	اُسے بغیر ہتیار کے نہیں رکھا
فلک کوں جو تاریاں کی جوشن دیا	آسماں کو تو نے تاروں کا جوشن دیا

ملمع سے چندنی کے روشن کیا	اور اُسے چاندنی کی جگمگاہٹ سے روشن کیا
دیا تس کھڑک سورسا تابدار	اور اُسے سورج سی چمکتی ہوی تلوار دی
سورج کوں دیا خنجر آبدار	اور سورج کو خنجر آبدار عطا کیا
سمندر میں موجاں ہتیاراں کی فوج	سمندر کی موجیں گویا ہتیاروں کی فوج ہے
جواہر کے ہتیار پانی کی موج	اور جواہر کے ہتیار پانی کی موج ہے (آب)
دیا آگ کے ہت توں خنجر ہزار	تونے آگ کو ہزاروں خنجر دیے ہیں
کرے باؤ پر دمبدم تیز دھار	جو ہر دم ہوا پر اپنی دھار تیز کرتی رہتی ہے
نہ کرنے برس ابر عالم کو غرق	مبادا بادل برس برس کر دنیا کو غرق کردے
دیا رعد کے ہات توں تیغ برق	تونے رعد کو برق کی تلوار دی
سورج کی تہیں روز کھڑ سان کاڑ	توہر روز سورج کی سان (فسان) کو باہر نکالتا ہے
دیوے نور کی مہ کے خنجر کو باڑ	تاکہ چاند کے خنجر کو نور کی باڑ دے
سپر کی تو صورت دیا پھول میں	پھول کو تونے سپر کی صورت دی
نشاں بھال کا غنچہ مقبول میں	اور غنچہ میں بھال کا نشان رکھا ہے
توں باگاں کوں خنجر سوں چڑنکہ دیا	تونے شیروں کو خنجر سے بڑھ کر ناخن دیے
دسن گج کوں کر گرز بیشک دیا	اور ہاتھی کوں دانت ساگرز دیا
کیا خنجر مار پر زہر توں	سانپ کو زہر بھرا خنجر دیا
بچھو ہت دیا نیزۂ قہر کوں	اور بچھو کو نیزۂ قہر عطا کیا
نظر میں توں خوباں کوں تیزی دیا	تونے معشوقوں کی نظر میں تیزی رکھی ہے
توں چھب کی کھڑک میں ستیزی دیا	اور چھب کی تلوار کو جنگ کی قوت دی
صباحت میں دے توں ملاحت کا آب	صباحت میں ملاحت کی رونق ملاکر
رکھیا حسن کی تیغ کا جگ پہ داب	تونے دنیا میں حسن کی تلوار کو شوکت بخشی
لینے ملک جاں خوبرویاں کی نین	اقلیم جاں کی تسخیر کے لئے تونے خوبرویوں

دیا ہے توں تیر و کماں ان کوں عین	کی آنکھوں کو تیر و کمان عنایت کیے
جنوں کا پلک مارنا بھوں چڑا	جن کا بھویں تان کر پلک مارنا
خد نگ ناز کا دل میں چھوڑیں گڑا	گویا ناز کے تیر کا دلوں میں گڑونا ہے

غرض شاعر نے ہر شے میں اس کی اپنی حفاظت یا دوسروں کے بچاؤ یا تسخیر کے لیے طرح طرح کے ہتیار پیدا کیے ہیں - حمد کے دو چار شعر اور لکھتا ہوں جس سے نصرتی کے شاعرانہ کمال کا اندازہ ہو گا —

سکت تجہ ہے دریا کوں ماٹی میں داب	یہ تیری ہی قدرت ہے کہ سمندر کو مٹی میں دباکر
پون پر نپانا گگن کا حباب	ہوا میں آسماں کا حباب بنایا
سبھوں کا سمجھہ تھک رہا ہے یہاں	سب کی عقل حیران ہے کہ ایک
کہ یک بڑ بڑے میں بسایا جہاں	بلبلے میں یہ سارا جہان کیونکر بسا دیا
لکھن ہار ہر نقش توں بے قلم	تو بغیر قلم کے نقش و نگار کرنے والا ہے
سفیدی سوں کے رنگ پنچاے جم	اور سفیدی سے بیسیوں رنگ پیدا کرتا ہے
ہمن عقل تجہ حکمتاں پاس یوں	ہماری عقل تیری حکمت کے سامنے ایسی ہے
سوا لاک پربت پہ چھنٹی ہے جوں	جیسے سوا لاکھ پہاڑوں پر ایک چیونٹی
ترے یک پنے پر دھریں اتفاق	تیری وحدت پر سب کو اتفاق ہے
موحد و ملحد میں نیں یہاں نفاق	اس میں ملحد و موحد کا اختلاف نہیں
دھنی تونچ ہے مسجد و دیر کا	مسجد و دیر کا مالک توہی ہے
تھیں سب سبب صلح ہور بیر کا	اور توہی صلح و عداوت کا سبب ہے

یہ آخری شعر کس قدر بلیغ ہے - یعنی مسجد و دیر سب ترے ہی ہیں اور یہ جو آپس میں صلح یا عناد ہے وہ تیری ہی وجہ سے تو ہے - یعنی تیری ہی ذات و صفات کی بحث اور جھگڑے کی وجہ سے اختلافات پیدا

ہوے اور ملتوں میں تفرقہ ہوا - غرض اتفاق ہو یا نفاق وہ تیری ہی تلاش میں ہے اور اس لئے تیرا ہی ان سب میں ظہور ہے - اس کے آگے کہتا ہے -

ترا انت پانے میں سب جگ ہے غرق	تیری انتہا پانے میں سارا زمانہ منہمک ہے
بڑا پن پچھانت میں فرقیاں میں فرق	البتہ تیری عظمت کے پہچاننے میں بہت کچھ فرق ہے
نہ پاے تری ذات کوی جز صفات	سواے صفات کے تیری ذات کو کوئی نہ پاسکا
ہر ایک گھٹ میں گھٹ ہو یوںیک دھات بات	اصل یہ ہے کہ تو ہر جگہ ساری ہے
نظر کر کہ میں دیکھتا ہوں جسے	جب میں غور سے دیکھتا ہوں
تو ہر گھٹ کے گھر میں دوا توں دسے	تو ہر جسم کے گھر میں تو ہی ایک چراغ نظر آتا ہے
اگر دین حق کے نہ قابل اہیں	جو دین حق کی صلاحیت نہیں رکھتے
ولے تیری وحدت کے قائل اہیں	وہ بھی تیری وحدت کے قائل ہیں -

اب مناجات میں سے چند شعر نقل کرتا ہوں، چونکہ یہ شعر آسان ہیں اس لئے ان کے معانی یا مطلب لکھنے کی ضرورت نہیں —

پلا مجہ محبت کا ایسا شراب کہ ہو مست بسروں دو جگ کا حساب
سرے مکھہ تے کاڑ * اس اثر کا کلام کہ ہر بول ہوے سے پرستاں کوں جام
دھرنہار اثر حال کا قال دے دلاں کوں جم اس قال تھے حال دے
بھر یا رکھہ سرے دم میں افسوں سدا کہ جگ ہوے مسخر یو سن کر ندا
مرے شعر سوں زندہ کر ہر شعور سہج مجہ بچن تھے توں کر جگ میں پور
مری بات انگیں + بحث کر سب کی رد سخن کر مرا عارفاں میں سند
سیاہی کوں کر میری ظلمات دھات ‡ قلم میں مرے خضر کی دے صفات
کہ ظلمات میں اس جو یو خضر جاے برسنے کوں امرت ابھال ؟ ہو کہ آے

---

* نکال - + آگے - ‡ طرح - ؟ بادل -

(یعنے جب یہ خضر (قلم) ظلمات (دوات کی روشنائی) میں جاے تو امرت، برسنے کے لیے ابر ہو کر آے —

مرے فن کے بن کوں عطا کر او آب کہ ہر پھول ہوے چشمۂ پر گلاب
ہر ایک پھول کوں دے توں اس دھات رنگ کہ ہوے ہر صبح دیکھ خورشید دنگ
خیالاں کوں مجنہہ باؤ کی اوج دے طبیعت کوں دریا کی نت موج دے

(یعنے میرے خیالات کو ہوا کی سی بلندی عطا کر اور میری طبیعت کو دریا کی سی موج دے)

مری جیب کوں سیف کر آبدار عنایت کی رکھہ دم سوں نت تیز دھار

(میری زبان کو شمشیر آبدار بنادے اور اپنی عنایت کے دم (سان) سے اس کی دھار ہمیشہ تیز رکھہ)

کہ تک جس طرف آبھے وو زباں گزر جاے کر موشگافی وہاں

(تاکہ جس طرف وہ (زبان) ذرا پھر جاے تو وہاں سے موشگافی کرتی ہوی نکل جاے)

ذکر معراج کی تمہید شب معراج کے وصف سے اس طرح شروع کی ہے

مرصع کی کسوت سوں یک نس سنوار	رات نے زرق برق مرصع لباس پہنا
رکھی آرسی چاند کي بر منجھار	اور چاند کا آئینہ بغل میں لیا
جگا جوت نا دیکھہ تس ابرھن	اُس زرق برق لباس کو دیکھہ کر سورج چکا چوند
اندھارے لیا موچ سورج نیں	میں آگیا اور اپنی آنکھیں میچ لیں

تیسرا شعر کیا اچھا لکھا ھے -

جو خوش مُکھہ پہ زلفاں پریشاں کرے
ھر یک سیام بادل کو گریاں کرے

یعنے اگر وہ رخ زیبا پر زلفیں پریشاں کردے تو کالے بادل اُسے دیکھہ کر پانی پانی ہو جائیں —

جب صاحب لولاک عرش کے مقام خاص پر پہنچتے ھیں تو لکھتا ھے۔

دسیا روپ پردے میں وو بے حجاب — که جس نور کے ذرہ کئی آفتاب
سمجھنے کی ھے بات کر دل کوں جمع — که فانوس میں کئیں بھی چھپتی ھے شمع

اسی بیان کے آخر میں اس نے چاروں اصحاب کا ذکر ضمناً اس طرح کر دیا ھے که جب آنحضرت معراج سے واپس آے تو اپنے چاروں اصحاب سے اس کا ذکر کیا اور ھر ایک صحابی کے ساتھ صرف ایک ایک لفظ تعریف کا لکھ دیا ھے - لیکن حضرت علی کی منقبت اس نے الگ لکھی ھے —

اس منقبت کے ضمن میں حضرت بندہ نواز کی مدح بھی لکھ گیا ھے - وہ شعر یه ھیں —

مجھ اپنے کرم ساتھ کر شاد کام — که ھوں تجھ کھینه خلف کا غلام
جسے ناؤں عالم میں بندہ نواز — محمد حسینی ھے گیسو دراز
محبت سوں اپنے تو فرزند کی — توں دلجوی کارن یو دلبند کی
بنچانے کو اِس تشنگی تھے جلا — محبت کا یک جام ایسا پلا
جو سب تن میں حق عشق کا چڑ اثر — قیامت کی رھوں ھول تھے بے خبر

اب سلطان علی عادل شاہ شافی کی مدح شروع کرتا ھے

بکھانوں اِتا مدح شاہ زماں	اب میں شاہ زماں کی مدح بیان کرتا ھوں
که ثانی سکندر ھے صاحب قراں	جو صاحب قران اور سکندر ثانی ھے
قلم آج جو مجھ جہانگیر ھے	یه بادشاہ کی صفت لکھنے کی تاثیر ھے
صفت شه کے لکھنے کی تاثیر ھے	که میرا قلم آج جہان پر چھایا ھوا ھے
زھے شاہ عادل سمی ولی	
علی ابن سلطان محمد بلی	

جو میں ورد تجہ اسم اعظم کیا	جب سے میں نے تیرے اسم اعظم کا ورد کیا ھے
بچن سوں مسخر یو عالم کیا	میرے کلام نے سارے عالم کو مسخر کر لیا ھے
دکھن نت ھے اس فخر تھے باغ باغ	دکھن اس فخر سے پھولا نہیں سماتا
کہ تس گھر ھے تجہ سا گہر شبچراغ	کہ اس کے گھر میں تجہ سا لعل شبچراغ ھے
ھر ایک دیپ تجہ دیپ آنا ضرور	ھر چراغ کا تیرے چراغ کے پاس آنا لازم ھے
کہ سب ملک اندھارا دکھن پر ھے نور	کیونکہ سارے ملک میں اندھیرا ھے اور صرف دکن روشن ھے
تیرا چتر خورشید کا سایہ باں	تیرا چتر آفتاب کا سایہ باں ھے
منگے تجہ علم کا پناہ آسماں	اور آسماں تک تیرے جھنڈے کی پناہ مانگتا ھے
تری ذات تھے ھے شجاعت کو ناؤں	شجاعت کا نام تیری ذات سے ھے
کہ پالیا ھے کر تیغ کی جس پہ چھاؤں	کیونکہ تو نے اسے تلوار کی چھاوں تلے پالا ھے
صفت تجہ کھڑگ صف میں کرتیں بیاں	اپنی صفوں میں تیری تلوار کی صفت کرتے کرتے
پڑے موں میں چھوٹی کے آڑی زباں	چیونٹیوں کی زبان لال ھے
ترے ھت تھے نت آبرو پاے تیغ	تیرے ھاتھہ سے تلوار ھمیشہ اس طرح آبرو پاتا ھے
کہ جوں فیض پاتا ھے دریا تھے میغ	جیسے بادل دریا سے فیض پاتا ھے
شرارے تری تیغ کے بے شمار	تیری تلوار کے بے شمار شرارے
کریں دل کے بادل میں بجلیاں ھزار	بادل کے دل میں ھزاروں بجلیاں پیدا کرتے ھیں
سورج کانپتا نت ترے بیم میں	سورج ھمیشہ تیرے خوف سے کانپتا ھے اور
فلک سر نگوں تیری تعظیم میں	فلک تیری تعظیم میں ھمیشہ سر نگوں ھے
ترے قہر کے بحر کا تیغ موج	تیرے قہر کے بحر کی موج تلوار ھے
ترے خنگ تل گرد دشمن کی فوج	تیرے گھوڑے کے نیچے دشمن کی فوج گرد ھے
پون تھے سبک سیر تیرا ترنگ	تیرا گھوڑا ھوا سے زیادہ تیز ھے
چندر جس کی جلدی انگیں کہنہ لنگ	اور اس کی تیزی کے آگے چاند لنگڑا ھے

دس آوے جدھر فتح کا تجه نشاں	تیرا فتح کا نشاں جہاں کہیں نظر آتا هے
کہے الاماں تب زمین آسماں	تو زمیں آسماں اس سے امان مانگتے هیں
دندی دیکھه تجه مکھه انکھیاں موچتا	دشمن تیرا چہرہ دیکھه آنکھیں میچ لیتا هے
که توں مار اول پچھیں پوچھتا	که تو پہلے مارتا اور بعد میں پوچھتا هے
کھڑگ جب توں جھلکاے صف میں نکال	جب تو صف فوج میں اپنی تلوار نکال کر چمکاتا هے
دس آوے هو ٹکڑے گگن جیوں ابھال	تو آسماں بادل کی طرح ٹکڑے ٹکڑے نظر آتا هے

اسی نہج سے بادشاہ کی شجاعت اور دلیری کی تعریف کرتا چلا جاتا هے- اس کے بعد اس کی سخن سنجی اور علم پروری کا ذکر کرتا هے - نمونے کے طور پر چند شعر نقل کیے جاتے هیں

تری بات تھے نیشکر رس بھرے	تیری باتوں سے نیشکر رس حاصل کرتا هے
تجه انکھیاں تھے سے مست هو سد هرے	اور تیری آنکھیں دیکھه شراب مست هوکر هوش و حواس کھو بیٹھتی هے
ترا ذهن نرمل تیرا طبع صاف	تیرا ذهن پاک اور تیری طبع صاف هے
سخن سنج باریک بیں موشگاف	تو سخن سنج، باریک بیں اور موشگاف هے
ترے دل کے دریا کا شعر ایک هے موج	شعر تیرے دل کے دریا کی ایک موج هے
فلک پست جاں تجه خیالاں کی فوج	جہاں تیرے خیالات کا لشکر پہنچتا هے وهاں فلک پست هے
ترا شعر هر مردہ دل کو جنم	تیرا شعر هر مردہ دل کو زندہ کرتا هے
کرے خضر بھر خوش مسیحا کا دم	اور خود خضر ایسے مسیحا کا دم بھر کر خوش هوتا هے
سکے شاعراں شعر تھے تجه شعور	شاعروں نے تیرے شعر سے شعور سیکھا هے
دھریا طبع موزوں تھے تجه نظم نور	اور نظم نے تیری طبع موزوں سے نور حاصل کیا هے

مدح شاہ کے بعد سبب نظم کتاب کی باری آتی هے- اسے بھی نصرتی نے کسی قدر تفصیل سے بیان کیا هے - چاندنی رات کا سماں هے ' بادشاہ کا دربار لگا هوا هے ' فضلا و شعرا جمع هیں جن میں خاصکر یه صاحب

کہاں قابل ذکر ہیں —

قاضی کریم اللہ ' جنھوں نے سب سے پہلے نصرتی سے اس مثنوی کے لکھنے کی فرمائش کی - چنانچہ وہ لکھتا ہے

زہے حاکم شرع والا نژاد — سو قاضی کریم اللہ فرخ نہاد
خلاصے سوں رکھہ سجہ رخن ان نظر — کیا ریز یوں خوش سخن کے گہر
کہ*نپچیا ہے جدتھے جہاں میں کھڑگ+ — مثل کی پتی فوج کوں آج لگ
علی نرپتی شاہ عادل کے بن — کھڑگ جل میں یوں نین ڈوبایا ہے کن
دسیا سو تہاشا نظر کی حضور — ہوا نصرتی پر تو لکھنا ضرور

دوسرے صاحب شاہ نوراللہ ہیں جنھوں نے فارسی نثر میں اس عہد کی تاریخ لکھی ہے - نصرتی نے ان کی بہت تعریف کی ہے ' چند شعر نقل کیے جاتے ہیں —

مدبر بڑا رائے زن دوربیں — قوی رکن ہے سلطنت کا یقیں
مقرب بڑا شہ کی درگاہ کا — بڑا معتبر معتمد شاہ کا
زہے شاہ نوراللہ فرخندہ نام — منور ہے جس فضل تھے جگ تمام
کہ جب شاہ عادل علی کا مکار — جو بے مثل کرنیاں ‡ کیا نا مدار
وہ سب لکھہ کے تاریخ میں خوب دھات — کیا نت حوالے زمانے کے ہات
کیا جیوں وہ تاریخ لکھنی شروع — ہوا فیض حق تس کی جانب رجوع
سفینہ جو تاریخ کا لکھہ کے پاس — دسے یوں جو دیکھیں تو اہل قیاس
مضامین کی ایک سطران کی موج — عبارت کے دریا نے پکڑیا ہے اوج
سلاست میں پانی کی صافی دھرے — فصاحت میں امرت کی شیری دھرے

---

* پیدا ہوا ہے   + تلوار   ‡ کام

نظر میں اگر سنبلستاں دسے حقیقت میں رنگیں گلستاں دسے

تیسرے صاحب شاہ ابوالمعالی ہیں —

نسب میں سیادت سوں عالی اہے تو تس ناؤں شا ابوالمعالی اہے

اس باب کی تمہید بہت خوب ہے وہ چند شعر یہاں نقل کرتا ہوں -

جویک نس ستاریاں کی مجلس ہو جمع	ایک رات ستاروں کی مجلس جمع تھی
اتھی بیچ روشن سپورن کی شمع	اور ان کے بیچ میں ماہ کامل کی شمع روشن تھی
اجالے سوں تس خانۂ آسماں	
رہیا تھا ہو پر نور خوش تابداں	
ہوا کی تھی سالو کی کدوت یقیں	ہوا نے سالو کا لباس پہن رکھا تھا
تکت اورہ بیٹھی تھی ساری زمیں	اور ساری زمین بادلے میں ملبوس تھی
دیا چاند گاراں کو ہیریاں کی تاب	چاند نے (گار) پتھروں میں ہیروں کی سی چمک پیدا کردی تھی
کیا سنگریزیاں کو بلورناب	اور سنگریزے خالص بلور معلوم ہوتے تھے
نظر میں جو لیانا لگے آب کوں	پانی کی یہ حالت تھی کہ اُسے دیکھ کر
بسرنا پڑے صاف سیماب کوں	آدمی سیماب کو بھول جاے
نظارے میں نظراں دھرے گلشنی	اس نظارے سے نظروں میں گلشن کا سا سماں تھا
صفای سوں پکڑے دلاں روشنی	اور اس کی صفای سے دلوں میں روشنی آتی تھی

اس تمہید کے بعد دربار کی خوبی اور اُن چند صاحبوں کی تعریف کی ہے جن کا اوپر ذکر ہوا ہے - رات کا جلسہ برخاست ہوتا ہے، مگر نصرتی کو رات بھر بے چینی رہتی ہے کہ کتاب لکھنے کی کیسی کرلگی اور یہ مشکل کیونکر حل ہوگی —

مرے پر تو اے فکر مشکل پڑی طبیعت چلانے کو ادکھل کھڑی

رہیا تھا اسی آکہ حیرت میں جیوں کرن مشکل آساں منگیا حق نے یوں

صبح ہوتے ہی بارگاہ شاہی میں پہنچتا ہے اور وہی رات کا تذکرہ پیش آتا ہے —

تلی رات بعد از ہوا صبح ویں اتہاتب تلک شہ کی درگاہ میں
دکھت مجھہ رخن شاہ عالم نواز کرن لیکے خدمت بڑے سرفراز
معمے سے ظاہر اشارت کیے ولے دل کوں دل سوں بشارت دیے
کہا میں کہ بندے میں یو کاں ہے حد کہوں تب جو اُستاد کا ہوے مدد

(یعنے مجھہ میں اتنی سکت کہاں ہے البتہ استاد (یعنے بادشاہ) کی مدد ہو تو یہ کام سر انجام ہوسکتا ہے ۔ —

اس کے بعد اپنے کلام کی تعریف اور کچھہ تعلی کرتا ہے اور فخریہ کہتا ہے کہ میں نے اس حقیر زبان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے - ان باتوں کا ذکر کسی دوسرے مقام پر آئے گا —

اب کتاب کا اصل مضمون شروع ہوتا ہے - پہلے بادشاہ کی تخت نشینی کے جشن، شہر کی آرائش اور رعایا کی خوشی کا ذکر کرتا ہے —

گھرے گھر نوی شاد مانی ہوی
زمانے کوں پھر نو جوانی ہوی

اور اس جشن کے بیان کو دعا پر ختم کرتا ہے —

جشن کے بعد نئے باب کا آغاز ہوتا ہے - اس میں اول وہ دکن کی بادشاہت پر نظر ڈالتا ہے اور لکھتا ہے کہ جب اس ملک میں کوی نیا بادشاہ تخت پر جلوہ گر ہوتا ہے تو سلطنت کی حالت بھی دگرگوں ہوجاتی ہے- دوست دشمن، مخالف موافق تاک میں رہتے ہیں اور بادشاہ کو اپنی سلطنت سنبھالنے کے لیے بڑی ہوشیاری، مصلحت اندیشی اور احتیاط سے کام کرنا پڑتا ہے - بادشاہت بھی شطرنج کی سی

بازی ہے - ہر شاطر کی چال جدا جدا ہے - جب کوئی کھیلتے کھیلتے بازی چھوڑ کے چل دیتا ہے تو دوسرے کو وہی بازی کھیلنی پڑتی ہے اور جب تک وہ اُسے پورے طور سے نہیں سمجھ لیتا اس کا کھیلنا سخت دشوار ہوتا ہے - (یعنی جب ایک بادشاہ کے بعد دوسرا بادشاہ آتا ہے تو جب تک وہ امور سلطنت کے اسرار سے کماحقہ واقفیت حاصل نہیں کرلیتا اُسے سخت مشکل پیش آتی ہے) - اس میں بڑی دور اندیشی اور احتیاط سے کام کرنا پڑتا ہے - جو کہیں سے مخالف کو ہٹانا ہو تو اپنا ایک آدھ مہرہ کھونا پڑتا ہے - ہر طرف نظر رکھنی پڑتی ہے کہ دشمن دھوکا نہ دے جائے - جو کوئی اس طرح کھیل پر قابو حاصل کرلے تو وہ " پیادہ مات " (پیدل مات) دے سکتا ہے - اس عام حالت کا نقشہ کھینچنے کے بعد وہ بتاتا ہے کہ محمد عادل شاہ کے مرنے اور علی عادل شاہ ثانی کی تخت نشینی پر ملک کی کیا حالت تھی - میں یہ کیفیت ابتدا ہی میں چند سطروں میں لکھ چکا ہوں - اب میں اِسی کو نصرتی کے الفاظ میں دکھانا چاہتا ہوں - نصرتی نے جو کچھ لکھا ہے تاریخوں سے اس کی حرف بحرف تصدیق ہوتی ہے -

کہ القصہ یو پادشاہی کے کام درست ہوئیں لگ او غنیماں تمام	غرض امور سلطنت کی اصلاح ہونے تک تمام
نہنے ہور بڑے تھے سو سب بدنہاد اُچاے وہ چارو طرف تھے فساد	بدنہاد مخالفوں نے (خواہ چھوٹے خواہ بڑے) چاروں طرف سے فساد برپا کردیا -
مخالف تو اکثر منافق ہوے موافق بی کے ناموافق ہوے	جو منافق تھے وہ تو خیر مخالف ہو ہی گئے لیکن بعض موافق بھی مخالف بن گئے
بڑی رج کی شہ اپنے کم سن منے نوی بادشاہی نوے اُدن منے	اس کم سنی پر بھی بادشاہ نے بڑی ہمت کی (حالانکہ) اس کی نئی نئی بادشاہی اور نیا زمانہ تھا

دُبل سخت بازیانچ پڑنے لگیاں	بیڈھب اور سخت بازیاں پڑنے لگیں
بڑیاں شدّتاں روز گھڑنے لگیاں	اور ہر روز شدید سانحے پیش آنے لگے
ولے شاہ ہمت سوں رکھہ دل قوی	لیکن بادشاہ نے ہمت کرکے دل قوی رکھا
نوے کام پر کر تردد نوی	اور ان نئی مشکلات کی فکر کرنے لگا
یک یک کام لگ بل سوں سادن لگیا	ایک ایک کام کو وہ اپنی قوت سے سدھارنے لگا
یک یک تہ تردد سوں باندن لگیا	اور ایک ایک پیچیدگی کو سلجھانا شروع کیا
... ...	
اگن پن وو نتنے کی چوندھیر سوں	لیکن فتنے کی وہ آگ جو تلوار کی آب
اٹھی تھی وو شمشیر کے نیر سوں	سے ہر طرف بھڑکی ہوئی تھی
اُسے یک طرف تھے بجاویں تلگ	ابھی ایک طرف سے بجھنے نہ پاتی تھی
اٹھے بھی وہ دُسرے رخن تھے سلگ	کہ دوسری طرف سے سلگ اٹھتی تھی
بزرگی جسے ات خدا داد ہے	لیکن خدا جسے بزرگی دیتا ہے
دل اُس کا نبرّ پن میں پولاد ہے	لڑکپن میں بھی اس کا دل فولاد ہوتا ہے-

جب شیواجی کی فتنہ انگیزی حد سے بڑھی تو علی عادل شاہ نے افضل خاں کو اس کی سرکوبی کے لیے متعین کیا - افضل خاں نے جب اپنے دلیرانہ حملوں سے اس کا قافیہ تنگ کیا تو عاجز ہوکر اس نے صلح و عفو کی خواهش کی - افضل خاں نے صاف دلی سے اسے منظور کرلیا اور پھر جس طرح شیواجی نے دغا سے افضل خاں کو قتل کیا ہے وہ ایک تاریخی واقعہ ہے جس کی تفصیل کی ضرورت نہیں - اس واقعہ سے علی عادل شاہ کو سخت رنج اور صدمہ ہوا اور اس نے اپنے ایک امیر سیدی جوہر کو صلابت خاں کے خطاب سے سرافراز کرکے اس مہم پر روانہ کیا —

ان واقعات کو نصرتی کی زبان سے سننا بہتر ہوگا - یہ واقعات نصرتی

کی آنکھوں کے سامنے پیش آے ہیں، وہ بیجاپوری ہے اور بادشاہ کا ملازم خاص، اس لیے وہ اپنے مخالفوں کی شان میں جو کچھہ کہتا ہے اُسے تحمل سے سننا چاہئے —

شیواجی کی فتنہ انگیزی اور اس کی عام سیرت کے متعلق اس کا بیان سنئے :—

جو کوئی کار بد کا جو پاپی ہے بد	جو پاپی برے کام کا بانی ہوتا ہے
ہوا ناؤں تس لعنتی تا ابد	اُس کے نام پر قیامت تک لعنت پڑتی رہتی ہے
خدا پاس نا اس کوں بہبود ہے	خلقت میں وہ مردود ہے اور خدا
خلائق کنے تو وہ مردود ہے	کے ہاں بھی اس کی بخشائش نہیں-
اتا بات کوں کاڑ موذی کا نام	اب اُس موذی کا نام لو
کہ قائم ہوا فتنہ جس تھے تمام	جس سے یہ تمام فتنہ برپا ہوا
سیویا کر جو ایک فتنہ انگیز تھا	سیوا نامی جو ایک فتنہ انگیز تھا
بڑا چور موذی و خونریز تھا	وہ بڑا چور موذی اور خونریز تھا
دکن کی زمیں بیچ تخم فساد	دکن کی سر زمین میں اول اول جس نے
جو پیریا سو اول یہی بدنہاد	فساد کا بیج بویا وہ یہی بدنہاد تھا
رعیت جتا خوار اوس شوم تھے	رعیت اس شقی سے پریشان و خوار تھی
ہوا ملک ویرانہ تس بوم تھے	اور مُلک اُس بوم سے ویرانہ ہو گیا تھا
جو بد اصل تھا سو بڑا ہور نہنا	جتنے چھوٹے بڑے کم اصل تھے
سکیا اِس تھے صاحب سے باغی پنا	اُن سب نے اپنے آقا سے بغاوت اِسی سے سیکھی-

ذیل کے پہلے شعر میں وہ اس کے مقام سکونت کو بتاتا ہے -

دکھن ہور مغلائی کے درمیان	دکھن اور سلطنت مغلیہ کے درمیانی
وطن دھر کُہستان میں تھا نہاں	کوھستان میں اس نے اپنا مسکن بنا رکھا تھا

بھریا تھاسب اُس ذات میں‌مکرو ریو	اس کی ذات مکر و دغا سے بھری هوی تھی
دسے آدمی روپ پر نسل دیو	دیکھنے میں انسانی شکل تھامگراصل میں نسل دیوتھا
دکھاوے جو تک اپنی تلبیس کوں	اگر ذرا اپنی شیطنت دکھاے
لگے ورد لاحول ابلیس کوں	تو ابلیس لاحول پڑھنے لگے
فرنگی تھے تھا کفر میں اتاشد	کفر میں فرنگی سے بھی اشد تھا
کرے دین سوں دشمنی سخت بد	اور دین سے سخت دشمنی رکھتا تھا
نه اس قتل حج تھی عبادت نهنی	قتل اس کے نزدیک حج سے بھی بڑی عبادت تھی
حرم میں بی سنپڑے تو تپا کشتنی	یه حرم میں بھی هاتھه لگے تو گردن زدنی هے-

آخری شعر کے دوسرے مصرع کی حیثیت تاریخی هو گئی هے - روایت یه هے که سکندر عادل شاہ کے عہد میں جب اورنگ زیب کی فوج نے اهل بیجاپور کو بالکل تنگ اور عاجز کردیا تو وهاں کے چند علما لشکر عالم گیری میں حاضر هوے اور عرض کی که جہاں پناہ عالم با عمل، زاهد و متقی، متشرع و متدین هیں اور پیشگاہ خلافت سے کوئی امر خلاف قانون و شرع صادر نہیں هوتا- پھر اس کی کیا وجه هے که باوجودیکه اس شہرو ملک کا حاکم اور یہاں والے کلمه گو مسلمان هیں، بادشاهی لشکر کا قہر ان پر نازل کیا گیا هے جس سے بے قصور رعایا سخت عذاب میں مبتلا هے- اورنگ زیب نے اس کے جواب میں یه کہلا بھیجا که تمہارا کہنا درست هے، لیکن همیں تم سے اور تمہارے شہر اور ملک سے سروکار نہیں اور نه تم سے هم جنگ و قتال کا قصد رکھتے هیں - مگر بات یه هے که ایک کافر فاجر حربی شقی که جس پر یه قول صادق آتا هے

حرم میں اچھے تو بھی هے کشتنی

تمھاری بغل میں پناہ لیے ہوے ہے اور فساد برپا کر رکھا ہے جس سے اسلامی بلاد اور اہل اسلام سخت ایذا میں ہیں - اس فساد کا استیصال ہم پر واجب ہے * —

اورنگ زیب کے جواب میں اس مصرع کا منقول ہونا اس امر کی دلیل ہے کہ نصرتی کا یہ مصرع عام و خاص میں بطور ضرب المثل کے مشہور ہو گیا تھا —

غرض شیواجی کی سرکوبی کے لیے علی عادل شاہ نے افضل خاں کو بھیجا ، مگر جب شیواجی نے اسے دغا سے قتل کر ڈالا تو بادشاہ بہت متفکر اور پریشان ہوا - اس اثنا میں سیدی جوہر نے جو کچھ عرصے سے سرکش ہو کر محمد نگر کرنول میں خود مختار بن بیٹھا تھا ، عذر خواہی اور معافی کی عرض داشت بھیجی - بادشاہ نے اس کا قصور معاف کیا اور صلابت خاں کے خطاب سے سرافراز کر کے شیواجی کے مقابلے کے لیے بھیجا - بیجاپوری فوج کی روانگی کو نصرتی اس شان سے بیان کرتا ہے —

چلیا دھم پہ دھم ات ترنگ ہور حشم
ہوے آسماں ہور زمیں بیش کم
لگا نیر دسنے گھنسے جا زمیں
ہوا کوں ہوا جسم پیدا یقیں

(لشکر خیل و حشم کے ساتھ اس دھوم دھام اور زور شور سے چلا کہ زمین کم اور آسمان زیادہ ہو گیا ، یعنے اس قدر گرد وغبار پڑا کہ زمین کا کچھ حصہ آسمان سے جا ملا - پانی زمین میں دھسا جاتا تھا اور گرد کی کثرت کی وجہ سے

* بساتین السلاطین صفحہ ۵۴۲ - ۵۴۳

ھوا جو پہلے بے جسم تھی اب مجسم نظر آتی تھی)

شیواجی صلابت خاں کے مقابلے کی تاب نہ لا سکا - صلابت خاں نے اسے اس قدر رگیدا اور پریشان کیا کہ اور جب کچھہ بن نہ پڑا تو تنگ آکر قلعۂ پنالا میں محصور ھو گیا - صلابت خاں نے اس موقع کو غنیمت سمجھہ کر قلعہ کا محاصرہ کر لیا - اب اس نے مجبور اور عاجز ھو کر خان موصوف سے خفیہ خط و کتابت شروع کی - یہ اس کی پرانی چال تھی - اور خوشامد اور چاپلوسی سے صلابت خاں کو اپنی وفاداری اور عقیدتمندی کا ایسا یقین دلایا کہ وہ بالکل اُس کا ھو گیا - چنانچہ آدھی رات کو ملاقات کے لیے آیا ' صلابت خاں بہت عزت و تکریم سے پیش آیا - دونوں میں اتحاد باھمی کا پختہ عہد ھو گیا - جب علی عادل شاہ کو اس کی اطلاع پہنچی تو وہ بہت برھم ھوا اور فوراً فوج لے کر موقع پر جا پہنچا - اس موقع پر نصرتی صلابت خاں کی اس بدعہدی کو صاف اڑا گیا ھے اور یہ لکھتا ھے کہ جب پنالہ کے محاصرے میں دیر لگی تو بادشاہ نے بہ نفس نفیس چڑھائی کی - شیواجی نے جب یہ دیکھا تو ایک روز رات کے وقت اپنے اھل و عیال اور کچھہ فوج سمیت چپکے سے نکل بھاگا اور قلعہ علی عادل شاہ کے ھاتھہ آگیا —

نصرتی نے اس فتح کی خوشی میں ایک قطعۂ تاریخ اور ایک زبردست اور پر زور قصیدہ لکھا ھے - تاریخ اس مصرع سے نکالی ھے

علی نے پل میں پنالہ لیا صلابت سوں

اس مصرعے سے سنہ ۱۰۷۰ ھ نکلتا ھے - قصیدے کا مطلع یہ ھے

جب تے فلک دیکھیا ادک سورج تری تروار کا
تب تھے لگیا تھر کاپنے ھو پر عرق یکبار کا

(یعنے جب سے فلک نے تیری تلوار کے چمکتے ہوے سورج کو دیکھا ہے تب سے وہ پسینے پسینے ہو رہا ہے اور تھر تھر کانپ رہا ہے)

مطلع ثانی ہے:

اے شاہ عادل توں علی صاحب ہے اب سینسار کا
کفار بھنجن جگ تھمن نیں سور کوی تجھ سار کا

(یعنے اے شاہ علی عادل اس وقت دنیا کا مالک تو ہی ہے اور تو ہی کفار شکن اور عالم پناہ ہے اور تجھ سا بہادر اب کوی نہیں ہے)

الفاظ کی شوکت اور قوت کو ملاحظہ فرمائیے —

قلعهٔ پناله کی تعریف میں لکھتا ہے:

تھا یکہ یک جو جگ منے او گڑ پنالے کا بلند
تھمنے دھرت لنگر ہے ہور انبر کو تھا۔ آدھار کا

(دنیا میں پنالے کا قلعه اپنی بلندی و رفعت میں ایک ہی ہے، وہ دھرتی کا لنگر ہے اور آسمان کو سہار نے کا تھم ہے)

پونچے پون پیری میں جاکر گر جوانی میں چڑے
انپڑے نه دوجی عمر لگ تس پر قیاس یک بار کا

(ہوا اگر جوانی میں اس پر چڑھے تو پیری میں جاکر پہنچے اور دوسری عمر تک بھی آخر تک نه پہنچ سکے۔ اس سے قلعه کی بلندی کا قیاس ہوسکتا ہے)

نیں بات کی لگ مُکھ منے کے تہار پر پھسلے زباں
گر ناؤں کوی لینے منگے تس راہ ناھموار کا

(اگر اس کی ناھموار راہ کا نام لینا چاھیں تو اس کا نام

لیے لیے تک زبان کئی بار پھسل جاے گی)

گڑ پر بھتے پانی تھے ات ڈھر ڈھر تو ماءالنہر ھے

کرتا ھے رد کشمیر کوں انگن ہی ھر گلذار کا

(قلعہ پر پانی کی یہ افراط ھے کہ گویا گھر گھر ماءالنہر ھے اور اس کے ھر گلذار کا آنگن روکش کشمیر ھے)

اس قلعے کی بلندی، ناھمواری اور دشواری کی تعریف میں بہت سے شعر ھیں - یہ تین چار شعر صرف نمونے کے طور پر لکھے گئے ھیں —

اس قصیدے میں اس نے بڑا کمال یہ کیا ھے کہ ابتدا سے جو جو واقعات پیش آئے ھیں سب کو بیان کر گیا ھے - مثلاً سیواجی کی سرکشی، اس کی دغا بازی، قلعۂ پنالہ کی رفعت و بلندی اور دشوار گزاری، اس کا قلعے میں سامان اور ذخیرے اور فوج کے ساتھہ مضبوط ھوکر بیٹھہ رھنا، صلابت خاں کا بادشاہ کی خدمت میں حاضر ھونا، خطاب سے سرافراز کرکے سر لشکر بنانا اور شیواجی کے مقابلے کے لئے بھیجنا، جنگ کا خونخوار نقشہ، شیواجی کا قلعہ چھوڑ کر بھاگنا، بہادروں کی بہادری، علی عادل شاہ کی ھمت و دلیری، نمایاں فتح، جنگ سے بادشاہ کا مرتضی آباد آنا، وھاں سے دارالخلافت کو پہنچنا، فتح کی خوشی میں رعایا کے جشن اور شہر کی آراستگی کا تفصیلی بیان، بادشاہ کی مدح و ثنا اور دعا —

یہ تمام واقعات اور حالات خاص شاعرانہ انداز میں بڑے شکوہ و وقار کے ساتھہ بیان کئے ھیں - چونکہ میں نصرتی کے قصائد پر آگے چل کر الگ تبصرہ کرنے والا ھوں اس لیے اس مثنوی کے ضمن میں اس کے قصائد کے حسن و قبح سے بحث نہیں کروں گا - اس قصیدے میں تیرہ سو سے

زائد شعر ہیں- آخر میں تعلی بھی کی ہے اور " شوقی " پر طنز کی ہے کہ اس رنگ میں دس پانچ شعر کہہ لینے سے کیا ہوتا ہے، اتنا بڑا قصیدہ لکھتا تو حقیقت معلوم ہوتی —

دس پانچ بیت اس دھات میں کے ہیں تو شوقی کیا ہوا
معلوم ہوتا شعر اگر کہتے تو اس بستار کا

اس جنگ میں صلابت خاں کے علاوہ ایک سردار مسعود خاں * کی بہادری کا بھی ذکر کیا ہے - لیکن شیواجی سے صلابت خان کے خفیہ عہد و پیمان کا کہیں اشارہ نہیں کیا- اس کا ذکر وہ آگے کرے گا —

دارالخلافت میں واپس آنے کے بعد علی عادل شاہ نے ملناڑ کے زمیندار کی تنبیہ کا ارادہ کیا، کیونکہ ایک مدت سے اس نے خراج ادا نہیں کیا تھا اور طرح طرح کے فساد اور شرارتیں کر رہا تھا - اس لشکر کشی کے لیے سامان تیار ہو رہا تھا کہ اتنے میں خبر آئی کہ صلابت خاں نے پھر غداری شروع کردی ہے - بادشاہ نے اُسے ایک نصیحت آمیز خط لکھا اور اپنے امرائے دولت ابراہیم خاں، شاہ ابوالحسن اور ملا احمد کے ہاتھہ اس کے پاس بھیجا - ان لوگوں نے اسے بہت کچھہ سمجھایا اور نشیب و فروز سجھا کر اطاعت کی ترغیب دی اور اس بات پر راضی کر لیا کہ بادشاہ دارالخلافت سے چھلگی میں جو دریاے کرشنا کے کنارے واقع ہے رونق افراز ہونے والے ہیں- تم اس وقت تک اپنی جگہ سے کہیں نہ جانا- بادشاہ کی یہ تکلیف فرمائی محض تمہاری تسکین خاطر کے لیے ہے - بادشاہ کو اس کی اطلاع دی گئی، اس نے اس تجویز کو پسند فرمایا اور اس طرف

---

* اس سے مراد سیدی مسعود ہے جو صلابت خاں کا داماد تھا—

روانہ ہوے - پہنچنے پر سیدی مسعود داماد صلابت خاں اور شرزہ خاں نے حضور میں حاضر ہوکر صلابت خاں کی معافی اور امان کی درخواست کی - علی عادل شاہ نے درخواست منظور کی اور ایک فرمان صلابت خاں کی معافی کا لکھہ دیا —

نصرتی نے خط کے لکھنے اور امرا کے بھیجنے کا ذکر نہیں کیا - صرف اتنا لکھا ہے کہ بادشاہ نے مالنارؔ کی طرف کوچ کیا اور جب کشنا پہ پہنچا تو صلابت خاں (جو سرکشی پر تلا ہوا تھا) یہ سن کر خوف زدہ ہوا اور حاضر ہوکر معافی کا طلب گار ہوا - بادشاہ نے اُسے معاف کر دیا —

فرمان معافی پانے کے بعد صلابت خاں چھالگی میں حاضر ہوا اور منصب اور علاقہ کی بحالی سے سرفرازی پائی - بادشاہ نے اُسے نواب عبدالرحیم بہلول خاں کے ہمراہ کرناٹک کی مہم پر جانے کا حکم دیا —

ادکہ کرہ ٹاپاں تے دھرتی ھدر	گھوڑوں کے ٹاپوں سے زمیں میں ایسا تہلکہ
تپکنے لگے ڈونگراں جیوں کنکر	مچا کہ چٹانیں کنکروں کی طرح تپکنے لگیں
دمامے کریں بادلاں کو ندا	دمامے بادلوں کو آوازیں دے رہے تھے
جواباں میں اترے فلک دھر صدا	جن کے جواب میں آسمان سے صدائیں آرہی تھیں
گگن دھمدھمیاں کن دسے بے شکوہ	آسماں دمدموں کے آگے بے شکوہ نظر آتا تھا
بچے ہودسیں اُن کے گوداں میں کوہ	پہاڑ ان کی گودوں میں بچے معلوم ہوتے تھے

اس جنگ کی فتح پر بھی قصیدہ لکھا ہے جس کا مطلع یہ ہے -

علی عادل شہ غازی یو شاہ بوالمظفر کوں
دیا ہے جس خدا ایسا کہ تھا جیسا سکندر کوں

آخر میں ایک مصرعے سے تاریخ بھی نکالی ہے -

منگیاں تاریخ کہنے میں یو جب نصرت کی' ہاتف وتیں
کھیا دل سوں "کھندل مارے علی یک پل میں جوہرکوں"

صلابت خاں شکست کہا کر جو بہاگا تو رائچور میں جاکر پناہ لی - وہاں سخت بیمار ہو کر کرنول جا پہنچا - علی عادل شاہ نے رائچور کی طرف کوچ کیا - قلعہ دار سیدی جوہر' صلابت خاں کے متوسلیں میں سے تہا' غداری کرنا چاہتا تہا لیکن جماعت احتشام کے سرداروں نے اُسے گرفتار کر کے قید کر دیا اور قلعہ کی کنجیاں بادشاہ کی خدمت میں بہیج دیں —

شاہی فوج حسب فرمان بادشاہ دریاے تنگ بہدرا سے عبور کر کے اس طرف پہنچ گئی - سید مسعود (داماد صلابت خاں) نے اس پر شبخون مارا - لیکن شاہی لشکر کو پہلے سے اطلاع ہو گئی تہی' خوب لڑائی ہوئی - سیدی مسعود کو میدان چہوڑ کر بہاگنا پڑا - صلابت خاں کو اس کا ایسا صدمہ ہوا کہ جانبر نہوسکا —

نصرتی نے اس کی موت پر ایک تاریخی قطعہ لکہا ہے - آخری شعر یہ ہے —

تس مرگ کے سبب کی جو تاریخ کوئی پوچھے
اے نصرتی توں بول کہ باغی ہوا موا

آخری مصرع سے سنہ وفات نکلتا ہے جو سنہ ۱۰۷۲ ھ ہے —

صلابت کے بیٹے (عبدالعزیز) اور داماد (سیدی مسعود) نے جب رنگ بدلا ہوا دیکہا تو معافی اور جان بخشی کے لیے حاضر ہوے - بادشاہ نے عبدالمحمد بہلول خاں کی سفارش پر ان دونوں کو معاف کرکے خلعت و منصب عطا فرمایا —

اب بادشاہ نے دارالخلافے کی طرف مراجعت کی - اس مراجعت

پر نصرتی نے ایک زبردست اور پر شکوہ قصیدہ (ذو مطلعین) لکھا ہے - جس کا پہلا مطلع یہ ہے —

اے شہ توں ہم نام علی شاھاں پہ تیری سروری
دلدل فلک کا رام تجھ کرتا زمانہ قنبری

اسی قصیدے کے ضمن میں موسم زمستان کے حال میں ایک پر زور قصیدہ لکھا ہے - بحر وہی ہے مگر ردیف و قافیہ دوسرا ہے - اس کے ختم ہوتے ہی وہ پہلا قصیدہ مطلع ثانی لکھ کر پھر شروع کرتا ہے اور فتح کی خوشی اور بادشاہ کی واپسی پر شہر میں جو چہل پہل اور جشن ہوے تھے ان کا ذکر کیا ہے - اس میں شہر کے ضابطہ حوالہ دار (کوتوال) منجھلے شاہ کے انتظام و بیدار مغزی کی بھی تعریف کی ہے —

بادشاہ نے کچھہ روز سیر و شکار کیا اور پھر دریا سے عبور کر کے قلعۂ تورگل کا رخ کیا - یہ سلطنت کے مستحکم قلعوں میں سے تھا - وہاں کے قلعدار کی کجروی اور سرکشی کی خبریں پہنچ چکی تھیں ' اس لیے اس کی تنبیہ ضروری تھی —

نصرتی اس قلعہ کی مضبوطی اور استحکام کے متعلق لکھتا ہے

کُہل تورگل تھا ندی کے کنار   اتھا شہ کے کوٹاں میں نامی حصار
اتھی کوٹ کے ڈونگراں پر زمیں   بلندی میں افلاک سوں ہم نشیں
قوی کوٹ و محل و بروج استوار   ندی یک طرف جس کے خندق منجھار
قدم در قدم یوں کراڑے کُہل   فلک نا دسے گر پڑے پگ پھسل
فرشتیاں کا ہو نا سکے جاں گزر   شیاطین کوں چھپ رہنے وھاں نظر -

اس قلعدار کا نام سیدی یاقوت تھا - اُسے جب بادشاہ کے آنے

کی خبر ہوی تو مقابلے کے لیے تیار ہو گیا - بادشاہ نے محاصرے کا حکم دیا - اس اثنا میں یہ اطلاع ملی کہ صلابت خاں نے قلعدار سے ساز باز رکھا ہے اور گولے بارود وغیرہ سے اُسے مدد پہنچا رہا ہے - یہ سنتے ہی محاصرے کے اٹھا لینے کا حکم دیا اور صلابت خاں کی سرکوبی کے لیے کوچ کیا - جب قلعۂ بہنود کے نزدیک پہنچے تو معلوم ہوا کہ صلابت مقابلے کے عزم سے قریب ہی میں آ پہنچا ہے - غرض لڑائی ہوی اور صلابت کو شکست ہوی - فوج کی بھگدڑ میں وہ گھوڑے پر سے گر پڑا اور ایک سپاہی کے گھوڑے پر سوار ہوکر فرار ہو گیا —

نصرتی نے اس لڑائی کا بیان یوں ہی لکھا ہے - تورگل کے محاصرے کے لیے جب فوج چلتی ہے تو لکھتا ہے

کوھستاں میں گھوڑوں کی ایسی ھل چل ھوی کہ باوں	ھوی یوں کہستاں میں گھوڑیاں کی چل
میں سے مکوڑے ابل پڑے	دیکھو ڑی ھتاں میں تے نکلے ابل

اس مہم سے فارغ ہونے کے بعد کچھ دن بادشاہ نے دارالخلافت میں عیش و آرام سے گزارے، اتنے میں محرم آ گیا - اس موقع پر شاعر نے "قصیدۂ ذوالمطلعین در وصف مجلس آرائی عاشور" لکھا ہے - پہلے حصے میں شہادت کا کچھ ذکر ہے اور دوسرے حصہ میں بیجاپور کے محرم کا حال ہے، جس میں شہر کی آراستگی، حسینی محل کی شان و شوکت، مجالس ماتم اور بادشاہ کی مدح بیان کی ہے- اس قصیدے کا پہلا مطلع یہ ہے —

کہتا ہوں اول حمد میں عالم کے سر جنہار کا
افلاک کا اونچا چھجا باندیا ہے کس بستار کا

یہ بڑی شان کا قصیدہ ہے اور (۱۴۰) اشعار پر مشتمل ہے —

اس کے بعد ملناڑ کی فتح کی داستاں یوں شروع ہوتی ہے

اماساں کا کر عرس شه پا کے جس رکھے ملک گیری کی دل میں ہوس
شجاعت گی جب داد اپس داد آی مہم ملک ملناڑ کی یاد آی
که ملناڑ کا راج دھر عقل کچ بھروسے سوں جھاڑی کے تھا مست گج

یعنے ملناڑ کا کج عقل راجا گھنے جنگل کے بھروسے پر مست ہاتھی بنا ہوا تہا - اس مست ہاتھی کے فتح کرنے کو شرزہ خاں بھیجے گئے جنھوں نے اس کی ساری مستی نکال دی - (پہلے بادشاہ نے ملا خرم کو بھیج کر راجہ کو بہت کچھ سمجھایا مگر وہ سرکشی سے باز نہ آیا تب یہ لشکر شرزہ خاں کی سرگردگی میں بھیجا گیا اور اس کے بعد بادشاہ خود بھی لشکر لے کر اس طرف پہنچے) —

اب نصرتی کے زبانی اس کا ذکر سنئے —

بسر جاو و شررے کے اودھاں کوں ضروری سوں چھوڑیا نہیں ماں کوں
تلک شرزہ انپڑ یا چہ سوکر کے لاگ لگا یا جلالت سوں جنگل کوں آگ
وھیں شہ کیتک دن پچھیں ساؤ چیت چلے گئے دھر اپنے بزرگاں کی ریت
گئے وھاں که نہ جا سکے جاں خیال کیے کام جو تھا سو امر محال
سکندر ھو صاحب قرانی کیے سکندر کی سیوت نشانی کیے
لیے تخت اگ ملک اس کا تمام پھیر املک دے بھی رکھے کر غلام

اس کے بعد اس لڑائی کے حال اور فتح کی مبارک باد میں ایک زبردست قصیدہ لکھا ہے جس کا مطلع یہ ہے

هوا ہے کون عالم کے شہاں میں شه ترے بل کا
سچا توں نائوں کاری ہے وصیئی شاہ مرسل کا

یه قصیدہ (۲۲۰) شعر کا ہے اور حقیقت یه ہے که اس شان اور کمال

کا قصیدہ ہماری زبان میں مشکل سے ملے گا - قصیدہ کیا ہے جنگنامہ ہے - اس میں بیشک بادشاہ کی مدح ہے لیکن مدح سے کہیں زیادہ اس جنگ کے تفصیلی حالات موجود ہیں - مثلاً راجۂ ملناڑ کی سرکشی، سرکشی کے اسباب، شرزے خاں کا فوج لیکر سرکوبی کے لیے روانہ ہونا، بادشاہ کا بھی خود لشکر لیکر کوچ کرنا، برسات آجانے سے کچھہ دن قیام کرکے انتظام کرنا، برسات کی بدولت جل تھل ہوجانا، جنگل کی بہار، درختوں کی رونق، آسمان و زمین کا نیا رنگ روپ، فوج کا دھاوا، لڑائی کا ڈھنگ، شرزے خاں اور عبدالمحمد کی شجاعت و دلیری، مظفر خاں، سید محمد علی، مولوی احمد کے کارنمایاں، رستے میں قلعۂ سوندہ کا فتح کرنا، پھر راجۂ ملناڑ کی راجدھانی بدنور کی تسخیر، راجا کا مغلوب اور عاجز ہوکر جان کی امان مانگنا اور شفاعت کے لیے حاجیوں کو بھیجنا اور بادشاہ کا فرط رحم و کرم سے معاف کرنا - نصرتی نے بدنور میں مسجد کی تعمیر کا بھی ذکر کیا ہے جس کا حوالہ تاریخ میں نہیں ملتا —

یہ ایسا بے مثل قصیدہ ہے کہ جی چاہتا ہے کہ پورا نقل کردوں - لیکن ڈرتا ہوں کہ پرانی زبان ہونے کی وجہ سے پڑھنے والوں کو لطف نہ آے گا اور وہ بیزار ہوجائیں گے - شرح کرتا ہوں تو وہ لطف بیان اور زور کلام کہاں سے آئے - حقیقت یہ ہے کہ ایسے معرکۃالارا قصیدے ہماری زبان میں سوا ے سودا کے کہیں نظر نہیں آتے —

جب علی عادل شاہ نے شیواجی کو مار بھگایا تھا اور قلعۂ پناله پر قبضه کرلیا تھا، اُسی زمانے میں شمال کی طرف اورنگ آباد کے صوبہ دار اور افواج مغلیه کے سپه سالار شایسته خاں نے اس کو شکست پر شکست دی اور پونا اور دوسرے قلعے اس سے چھین لیے - شیواجی

نے ایک شب کو محل میں گھس کر شایستہ خاں کو مجروح کیا - اورنگ زیب کو اس واقعہ سے سخت رنج ہوا اور اس نے اس مہم پر جسونت کو مقرر کیا - شیواجی نے اتنے میں سورت پر دھاوا کیا اور کئی روز تک اس متمول شہر کو دل کھول کے لوٹا - اورنگ زیب نے اس پر سخت پیچ و تاب کھایا اور جے سنگھ کو اس کام پر متعین کیا —

نصرتی نے شایستہ خاں کے مجروح ہونے اور سورت کے قتل و غارت کے واقعات کو تفصیل سے نظم کیا ہے - لکھتا ہے —

نظر باز ہنگامۂ راز کا لکھے کھیل یوں چرخ کجباز کا
کہ جس وقت عادل علی بادشاہ کیے تھے بنگا پور کوں تخت گاہ

... ...

سیویا دیکھہ میدان خالی بچار کُہستاں سے بیشک نکل آکے بہار
کھپیا یوں آپس دل میں ہونے شکیب نظامی ہے شیطاں ستے پر فریب

... ...

بڑا جس کوں شاہ مغل ماننا قوی بازوے سلطنت جاننا
بڑا راے زن دور اندیش اچھے بڑے کام پر تس قدم پیش اچھے
بلند شان کا جس کی دھلی پہ داب اتھا اُس کوں شایستہ خاں کر خطاب
نہوی جے مہم جنگ و شر شور سوں کرنہار اونے عقل کے زور سوں
سیویا کھیل اُس سات کرنے لگا سہیانے کوں فن سوں سنترنے لگا
ملایا مکھنڈ چور خونخوار کئی آپس سار کے رندو عیار کئی

اس کے بعد رات کا سماں اس واقعہ کی مناسبت سے کھینچتا ہے اور شایستہ پر حملے کا حال لکھتا ہے —

سورج وہ کہ جس سامنے ہو زبوں چھپاتے ہیں چوراں بچالی میں سوں

اوتر تخت وہ جب گیا گھر منجھار بیٹھا تب ہو حاکم چندر اُس کی ٹھار
گیا عیش میں کر سہیلیاں سوں میل ہوا راج میں اس کے چوراں کا کھیل

(یعنے وہ سورج کہ جس کے سامنے چور بچالی میں منہ چھپا لیتے ھیں جب وہ تخت سے اُتر کر اپنے گھر میں چلا گیا تو چاند اس کی جگہ حاکم بن کر بیٹھا اور اپنے ھمجولیوں کے ساتھہ رنگ رلیاں منانے لگا اس کے راج میں چور کُھل کھیلے) -

جب رات زیادہ ھوئی تو شیواجی کو دغا بازی کی سوجھی اور اپنی جماعت کو لے کر شایشتہ خاں کے محل کی طرف چلا

جو شایستہ خاں تب سہیلیاں میں تھا کر ٹھار سکھ خوش رنگیلیاں میں تھا
کہ تھے گھر کے چوندھر نگہباں کیتے ہر یک ٹھار انگے بلک و دریاں کیتے
نہ اُس ٹھار ابلیس کوں تھا مجال گیا وھاں تلک بیس لہو کا کھلال
سوتا تھا سو تس نیند جانی اُچت اوچایا کھڑک آب ات موں پہ ست
نہ اوس کوں مقابل پہ آنے دیا نہ ھتیار پر ھات بھانے دیا
کھپیا کوپ کیسے جلد واراں پہ وار کہ گھاواں پہ گھاواں لگے تن منجھار
سرنگ سیج ھوئی لہو سوں سب بےدرنگ رنگیلیاں کیا سب سہیلیاں کوں رنگ
انھیاں کئی سہیلیاں جو رجپوتنیاں اپس ست بنچانے کوں اودھوتنیاں
دھنی پر بھڑکتے دیکھت آگ یتی یک یک دھن لگی آگ پڑنے ستی
بنچانے کو جیو آپنے پیو کا سپر تن کریں آپ تس جیو کا
کٹتا لئی سو ھر سروقد گلعذار رواں جوئے خونی ھوی موج مار
بھوت گرچہ گھائل ھو بانچیا جیا جیسے لگ ولے جیو کوں زخمی کیا
کہ تس سامنے تس کے پیاریاں کو کاٹ چلیا اوت سب شرم پھر اپنی بات
گیا دے کے یوں داغ شرمندہ گی کہ جیتا ھے لگ موت ھوئی زندگی

گیا پل میں ایسے کا لے ننگ و نام کیا سب بچاریا جو تھا دل میں کام
وھیں شرق تے غرب لگ دم منیں یو ھوئی بات مشہور عالم منیں

(شایستہ خاں اُس وقت تک اپنی نازنینوں کے ساتھہ لطف عیش اُڑا رھا تھا - گھر کی چاروں طرف نگھباں اور دربان تھے - جہاں شیطان کو بھی رسائی کا یارا نہ تھا وھاں اس (شیوا) نے خون خرابا کیا - جو سو رھا تھا اُس نے جانا نیند اچاٹ ھو گئی اور آنکھہ کھلتے ھی تلوار کے گھاٹ اتار دیا گیا - نہ اُسے مقابلے پر آنے کا موقع دیا نہ ھتیار پر ھاتھہ ڈالنے کی مہلت دی - جلدی جلدي وار پہ وار کیے اور گھاؤ پہ گھاؤ لگاے - تمام سیج خون آلودہ ھو گئی اور نازنینوں کو خون سے رنگ دیا - اُن میں جو راجپوتنیاں تھیں انھوں نے جب آقا پر آگ بھڑکتی دیکھی تو آگ میں گر کر ستی ھونے پر آمادہ ھو گئیں اور بڑی بہادری سے اپنے آقا کو بچانے کے لیے سپر بن گئیں - وہ سروقد نازنینیں بھی اس قدر زخمي یا ھلاک ھوئیں کہ خون کی ندي بہنے لگی - اگرچہ (شایستہ خاں) بہت کچھہ گھائل ھو کر بچ نکلا مگر جب تک زندہ رھا اُس کا دل زخمی رھا - وہ اپنے پیاروں کو اپنے سامنے کٹتے دیکھہ کر مارے شرم کے وھاں سے چلا گیا - اُسے ایسا داغ شرمندگی نصیب ھوا کہ جیتے جی موت آگئی - وہ (شیوا) پل بھر میں ننگ و نام لوٹ لے گیا اور جو وہ سوچ کر آیا تھا وہ کر گیا - آناً فاناً شرق سے غرب تک یہ بات مشہور ھو گئی) -

جب یہ خبر دھلی پہنچی تو بادشاہ کا خون خشک ھو گیا اور کہا کہ "آل تیمور کی ایسی بدنامی کبھی نہیں ھوئی - جب تک اس کا انتقام نہ لوں گا بادشاھی مجھہ پر حرام ھے" -

اب جسونت سنگھہ اس مہم پر متعین ھوتا ھے -

که جسونت سنگهه کر کے رجپوت تھا
جتے رج کے پوتاں میں اودهوت تھا

سورت بندر کا ذکر اِن الفاظ میں کیا ھے —

که سورت ککر ملک گجرات میں بندر یک اتھا خوب سب بات میں
رهویں بحر و خشکی کے تجار وهاں ملے بست جے نہیں سو عالم میں وهاں
یک یک کونچه یک شہر معمور اچھے هر یک گھر میں کئی گنج بھر پور اچھے
لیوے هند نت فیض اس تھے نول که جوں ابر کوں آب دریا تے بل
او پچ جگ هوئی جب تے وو بوستاں نه دیکھی تھی چک تب تے باد خزاں

(سورت نامی جو گجرات میں ایک بندر ھے وہ هر بات میں خوب ھے - بحری اور بری هر قسم کے تاجر وهاں رهتے هیں اور جو چیز دنیا میں کہیں نه ملے وہ وهاں مل جاتی ھے - هندوستان همیشه اس سے نیا فیض حاصل کرتا ھے جیسے ابر کو آب دریا سے قوت پہنچتی رهتی ھے - جب سے یه بوستاں دنیا میں پھولا پھلا اس نے کبھی باد خزاں کا جھوکا نه دیکھا تھا) -

سورت کی غارت گری کے حال میں لکھتا ھے -

کیا لوت یوں پل میں بندر کوں پاک که جوں آگ لگتیں نرھے باج راک
پھیری خوب صورت کی صورت نے یوں جوانی تھے محبوب پیری میں جیوں

(یعنے لوت لات کر بندر کا پل بھر میں اس طرح صفا یا کر دیا جیسے آگ لگنے پر سوائے راکھه کے کچھه نہیں رهتا - خوبصورتوں کی صورت ایسی بدل گئی جیسے جوانی کے محبوب کی صورت بڑھاپے میں بدل جاتی ھے) —

اس واقعه کے بعد جے سنگهه دکهن کی مهم پر آتا ھے —

نصرتی آخر علی عادل شاہ کا ملازم اور درباری شاعر ہے - وہ یہ اپنا فرض سمجھتا ہے کہ اپنے بادشاہ کی شان بڑھاے اور اس کے مقابل میں دوسروں کو گھٹاے، اس لیے وہ کہیں کہیں واقعات کو نمک مرچ لگا کر بیان کرتا ہے - چنانچہ لکھتا ہے کہ جب سورت بندر کے لٹنے کی خبر اورنگ زیب کو پہنچی تو وہ سخت پریشان ہوا اور کہنے لگا کہ جب تک علی عادل شاہ کی مدد نہوگی یہ مہم سر نہیں ہوسکتی - اس کا بیان دیکھیے —

پکڑ اپنے دانتوں میں حیرت سوں بونٹ کھیا چابتا سخت غصے سوں ھونٹ
مگر کچھ ہے یہ آسمانی بلا کہ ھو لادوا یوں کرے مبتلا
دس آتا ہے نا ھوے ھون تے علاج علی کی طرف سے مدد پاے باج

(یعنے اورنگ زیب نے (واقعۂ سورت پر) حیرت سے انگلی دانتوں میں دبا لی اور غصے سے ھونٹ چابنے لگا اور کہنے لگا کہ یہ آسمانی بلا ہے جس کا کوئی علاج نہیں - معلوم ایسا ھوتا ہے کہ جب تک علی (علی عادل شاہ) کی مدد نہ ھوگی اس کا علاج نہوسکے گا) -

یہ سوچ کر اس نے اپنے وکیل بیجاپور بھیجے اور انھوں نے اورنگ زیب کی طرف سے باھمی صلاح اور امداد کا پیغام دیا - اس کا جواب جو علی عادل شاہ نے دیا ہے وہ نصرتی کی زبانی سنئے، کیا شان برستی ہے - گویا اورنگ زیب اس کے سامنے ایک معمولی بادشاہ تھا -

کہ ھوں میں سمیء نبی کا خلف دو جا تس پہ ھمنام شاہ نجف
لقب کفر بھنجن ہے مجھہ بے گمان صفت دست گیر فرو ماندگاں
میرے کام پر میں ھوں حاضر سدا تماری بی کرنی کرو ابتدا
مدد میں ھوں سوڈی پہ چل بیگ آؤ لڑو مت تماشا ولے دیکھہ جاؤ

کہ مجھ فوج دشمن سوں لڑتی ہے کیوں ستی جا کے آتش پہ پڑتی ہے کیوں
جو ساواں سوں کیوں دزدگم نام نے لڑے صف بہ صف آمنے سامنے
نبھانا اپس عہد پر آپ جم کہ مرداں ہیں وعدے پہ ثابت قدم
سنیا شاہ عادل تے جب یو جواب وہیں خوش ہو شاہ مغل بے حساب
کہیا مجھ ہوا اب تے ہادی فلک کدوو نرپتی نے قبولیا کو مک

اب جو عادل شاہ کی امداد کا اطمینان ہو گیا تو اورنگ زیب نے بڑا دربار کیا اور دکھن کی مہم کے لئے جے سنگھہ کا انتخاب کیا۔ نصرتی نے اس موقع پر جے سنگھ کی تعریف تو کی ہے مگر اس کی مکاری اور حیلہ بازی کو بہت بڑھا چڑھا کر بیان کیا ہے۔ یہ گویا آنے والے واقعات کی پیش بندی ہے —

ادھر علی عادل شاہ اپنا دربار کرتا ہے۔ اس دربار کی شان و شوکت ہی اور ہے۔ سب سے پہلے چاندنی رات کا سماں کھینچا ہے۔ یہ سماں بالکل فرضی ہے، شروع سے آخر تک تشبیہات و استعارات سے کام لیا ہے۔ یہ فارسی شاعری کی پوری نقالی ہے۔ یہ چودھویں شب ہے۔ ماہ کامل جلوہ گر ہوتا ہے شفق، ہوا، ثوابت، جوزا، میزان، سنبلہ سب اپنی اپنی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ قاضیء آسماں کا اجلاس عدالت ہے اور عطارد کارفرمائی کے لیے حاضر ہے۔ اس تمام شان و شوکت کے ساتھہ علی عادل شاہ کا دربار ہوتا ہے۔ زہرا گانا گاتی ہے جس سے فلکی اور خاکی دونوں وجد میں آجاتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ

چاندنی کی تعریف میں ایک شعر اچھا کہا ہے

صفای انگے مہ کی شرمندہ سور
دسے روئے خوباں تے تس نرم نور

(یعنے چاند کی صفای کے سامنے سورج بھی شرمندہ تھا اور
وہ صفای روئے خوباں سے بھی زیادہ نرم معلوم ہوتی تھی)

یہاں نرم کا لفظ کیا خوب استعمال کیا ہے —

اسی دربار میں بادشاہ اپنے امیر خواص خاں کو شیواجی کے
مقابلے اور مغلوں کی امداد کے لیے انتخاب کرتا ہے —

شہنشہ سوں همراز خاصاں میں خاص
جسے نام ناسی ہے خان خواص

نصرتی نے خواص خاں کی خوب تعریف کی ہے - اس کے بعد
سرافرازی کا حال سنئے

سرافراز خلعت سوں کر بے درنگ   عنایت کیسے هت تے اپنے فرنگ
مگر فتح کی وے بشارت دیے   سهم بیگ کرنے اشارت دیے

(خلعت سے سرافراز کرنے کے بعد اپنے ہاتھ سے اپنی تلوار عنایت
فرمای - گویا یه فتح کی بشارت اور جلد سهم کرنے کا اشارہ تھا)

بشارت یو پایا چه سو سهبلی   اوتھیا لے فرنگ کهه مدد یا علی

(اُس بہادر نے جو بشارت پائی تو تلوار اٹھاکر "یا علی مدد"
کی آواز لگائی)

اور کیا کہتا ہے

که میں کھا بدیا هوں علی کا نمک   مغل آئے لگ وهاں مجھے کیا اٹک
کرے آسرے پاے کے ترکی کار   ولے باگ اپنگ مارتا ہے شکار
یکیلاچ انپڑ یوں دهینکا نا کروں   پهلی پهوڑ ایسا بهنکا نا کروں

(میں نے علی (عادل شاہ) کا نمک کھایا ہے میں مغلوں کے
آئے تک کیوں رکا رهوں - چڑی مار آسرا پا کے شکار کرتے هیں لیکن شیر

علانیہ شکار مارتا ہے - میں اکیلا پہنچ کر حملہ کروں گا اور اس کی فوج کو توڑ پھوڑ کر تہس نہس کردوں گا ! —

اس کے بعد کیا اچھا شعر لکھا ہے جس میں رزم کے ساتھ بزم کا مزہ آجاتا ہے

کہ باغی کی مجلس و ساقی نہ رہے
مغل آئے لگ دور باقی نہ رہے

غرض یہ بہادر افواج مغل کا انتظار کیے بغیر چل پڑا اور کوچ پر کوچ کرتا ہوا اور گنجان اور خطرناک جنگلوں کو طے کرتا ہوا ایک گھاٹ پر پہنچا جو بہت دشوار گذار تھا اور شیواجی کے سرحد کے قرب ہی میں تھا - لیکن اس سے بےخبر تھا کہ شیواجی کہاں اور کس طرف ہے - رات کے وقت فوج نے اس جنگل میں جو پہاڑوں سے گھرا ہوا تھا ' پڑاؤ کیا - شیواجی نے اس موقع کو غنیمت سمجھکر کہ یہ فوج قلیل ہے اور مغلوں کے آنے میں ابھی دیر ہے ' رات کو شبخون مارا - بیجاپوریوں کے اوسان جاتے رہے لیکن خواص خان نے بڑی ہمت و دلیری سے کام لیا - فوج کی ہمت افزائی کی اور خود تلوار لے کر آگے بڑھا ' سپاہیوں نے یہ دیکھا تو ہمت کرکے ٹوٹ پڑے اور شیواجی کو مار بھگایا —

نصرتی نے اس لڑائی کا حال بڑی خوبی سے لکھا ہے اور ہیبت ناک کوہستان اور جنگل کی عظمت اندھیرے اور چاندنی کا سماں دکھانے میں بڑا کمال ظاہر کیا ہے - لکھتا ہے

کو بل تھا کہستان کے مکھہ پہ گھاٹ	کوہستان کے منہ پر نہایت دشوار گزار
معمے سے موہوم تھی جس پہ باٹ	گھاٹ تھا جس کا تنگ رستہ معمے سے بھی زیادہ موہوم تھا

که جس بات مشکل کا لینے میں نانوں	اس دشوار رستے کا نام لیتے ہوے زبان کا
زبان کا پھسلتا ہے جم مکھہ میں پانوں	پاؤں ہمیشه منه میں پھسل پھسل جاتا ہے
ہور اس گھاٹ کے تل جو ہے کوہ کن	اور اس گھاٹ کے نیچے جو کوکن کا علاقه ہے
رھوے روز روشن ہو وھاں جو رین	وھاں روز روشن رات کی طرح نظر آتا ہے
اندھارا ملیا یوں دسے نور سوں	اندھیرا نور سے یوں ملا جلا نظر آتا ہے
که دن جنت ہے شام دیجور سوں	گویا دن شام دیجور کا جفت ہے
اندھارے سوں تارے دسیں دن تمام	اندھیرا اس غضب کا تھا که دن کو تارے
کریں بیٹھہ نت وھاں رصد بند کام	نظر آتے ہیں اور رصد والے وھاں بیٹھہ کر کام کر سکتے تھے
وو روئے زمیں گرچه محبوب ہے	اگرچه وہ روئے زمیں محبوب ہے لیکن
نظر میں سورج کے بھی محجوب ہے	سورج کی نظروں سے بھی پوشیدہ ہے
زمیں استری ہے سو صاحب جمال	زمیں ایک صاحب جمال عورت ہے اور یه قطع
کہے ہے یو قطع اپس مکھہ کا خال	زمیں اس کے چہرے کا خال ہے
اندھارا تو عالم کا ہے وھانچہ جمع	اگرچه سارے عالم کا اندھیرا وھاں جمع ہے
ولے یک اندھارے میں کئی لکھہ ہیں شمع	لیکن ایک اندھیرے میں کئی لاکھہ شمعیں ہیں
ہزارا نچہ نکلے ہیں یک نس په سور	ایک رات میں ہزاروں سورج نکلے ہوے ہیں
که چربیا ہے یعنے گلستاں کا نور	اور گلستاں کا نور چھایا ہے
بچھاوے ہو فراش نت نو بہار	نوبہار فراش بنی ہوی ہے اور رنگ برنگ
رنگا رنگ پھولاں تے صدراں ہزار	پھولوں کی ہزاروں مسندیں بچھا رکھی ہیں
پنکھیرو ہر یک بھات کے دلفریب	طرح طرح کے حسین پرندے اپنے رقص
دکھاویں سدا رقص و نغماں سوں زیب	اور نغموں سے عجب بہار دکھا رہے ہیں

جوڑے جہاڑ سب مل کے چھپاے فلک	درخت آپس میں اس طرح جڑے ھوے ھیں کہ آسماں کو
ستاریاں کی پکڑی ہے جگ نے جھلک	چھپا لیا ھے اور زمیں پر ستاروں کی صرت جھلک نظر آتی ھے
یک یک بانس میں توڑ سٹنے کا خیال	ایک ایک بانس کا یہ حوصلہ ھے کہ وہ آسماں کی چھت
بلند سقف گردوں تے مکڑیاں کے جال	پر سے مکڑیوں کے جالے اتارنے کا خیال رکھتا ھے
فلک سوں دسیں بانس بھڑیوں اپار	بانس آسماں سے یوں بھڑے ھوے نظر آتے ھیں
کہ منصور یک ھور ھزاراں ھیں دار	کہ منصور تو ایک ھے اور داریں ھزاروں ھیں
گویاں بھوئیں چھپے خاص باکاں کے گھر	اس کی زمیں میں شیروں کے خاص گھر ھیں جن کے منہ
بندے بانس جالیاں سوں مون پر جبھر	پر بانسوں نے گھنی جالیاں بنا رکھی ھیں
دسیں جا بجا غار و خونریز خار	جا بجا غار اور خونریز کانٹے نظر آتے ھیں
قدم در قدم طشت و نشتر ھزار	اور ھرقدم پر ھزاروں طشت اور نشتر موجود ھیں

جنگ کا بیان بھی بڑی تفصیل اور بڑے جوش و خروش سے لکھا ھے مثلاً -

کہنا کھن تے کھڑ کاں کے یوں شور اُٹھیا	تلواروں کی کھنا کھن سے وہ شور اٹھا
جو تن میں پہاڑاں کے لرزا چھوٹیا	کہ پہاڑوں کے تن بدن میں لرزا پیدا ھو گیا
بلا نیند میں تھے سو ھوشیار ھوئی	گویا بلا نیند میں سے ھوشیار ھو گئی
اجل خواب غفلت تے بیدار ھوئی	اور اجل خواب غفلت سے بیدار ھو گئی
سلاحاں میں کھڑکاں جو دھسنے لگے	تلواریں جو اسلحہ میں گھسنے لگیں
اگن ھور رکت مل برسنے لگے	تو آگ اور خون مل کے برسنے لگے

هویاں لهوکیاں چھٹکاں هوا پر بخار	لہو کے چھینٹے هوا پر پہنچ کر بخار بن گئے
ستیں تیغ جیباں تے شعلے هزار	تلواروں کی زبانوں سے هزاروں شعلے نکلنے لگے
بهر یا نس کا کهڑکاں کی چنگیاں تے روپ	تلواروں کی چنگاریوں سے رات کا روپ هی کچهه اور هو گیا
هوا نرم چندنا سو سب گرم دهوپ	اور نرم نرم چاندنی گرم دهوپ هو گئی
هوا پر شراریاں کا ات کهیل تیا	هوا پر شراروں کا تماشا نظر آتا تها
اوڑے لهو سو تس آگ پر تیل تها	اور لهو جو اڑ رها تها وه گویا آگ پر تیل کا کام دے رها تها -
فرنگاں په لهو کے کهلالے دسیں	تلواروں پر لهو کے فوارے جاری تهے
انیاں پر تے دهاراں پنالے دسیں	اور انیوں پر سے خون کی دهاریں پرنالوں کی طرح به رهی تهیں
پون کوں سرنگ رنگ پیدا هوا	هوا کا رنگ سرخ هو گیا تها
شفق ابر پر سب هویدا هوا	اور ابر پر شفق نمودار تهی

یه چند شعر رزمیه بیان کی کیفیت دکهانے کے لیے کافی هیں - اس سے نصرتی کا کمال شاعری معلوم هوتا هے —

جنگل میں بهاگتوں کی حالت کو کیا خوب بیان کیا هے - صرف تین شعر نقل کئے جاتے هیں —

لیا نهاٹتیاں کا هوهر جهاڑ کال	بهاگتوں کا درختوں نے برا حال کیا
سونڈا ساچ کوی کوی سو جهونٹے کے بال	کسی درخت نے منڈا سا اتار لیا اور کسی نے سر کے بال
ستیا آنگ پر جس کے کانٹے نے هات	جس کسی کے بدن پر کانٹے نے هات مارا
لیا کاڑ کپڑیاں کوں چنبڑی سنگات	تو چمڑی سمیت کپڑے اتار لیے

اُس دم درخت رنگ برنگ کے	جتا جھاڑ پینا دسیا اُس گھڑی
چیتھڑوں کی گودڑیاں پہنے نظر آتے تھے	رنگا رنگ تکڑیاں کی یک گودڑی

ان اشعار میں درختوں سے الجھنے کی کیا اچھی اور صحیح تصویر کھینچی ہے - اس میں تھوڑا سا ظرافت کا پہلو بھی ہے -

اس لڑائی میں نصرتی نے شاہ حضرت ' سیدی سرور اور شیخ میراں کا خاص طور پر ذکر کیا ہے —

اتنے میں جے سنگھہ کی سر کردگی میں مغلیہ فوج بھی آ جاتی ہے اور قلعۂ پورندہ کو فتح کر لیتی ہے - نصرتی اس فتح کا ذکر بڑی حقارت سے کرتا ہے یعنے اصل جان جوکھوں کا کام تو بیجاپوری فوج نے کیا تھا اس میں مغل فوج کی کیا بہادری ہے - کہتا ہے -

تو فرصت مغل پا کیا گڑ کوں زیر
کہ اندلے نے جوں چانپ پکڑیا بٹیر

(یعنے مغلوں نے موقع دیکھہ کر قلعہ فتح کر لیا - گویا اندھے کے ھاتھہ بٹیر لگ گئی) —

جب شیواجی نے یہ رنگ دیکھا اور کوئی مفر نظر نہ آیا تو اس نے پھر دام تزویر بچھایا اور جے سنگھہ سے سازباز شروع کیا - شیواجی آدھی رات کو جے سنگھہ سے جا کر ملا اور بعض شرائط پر جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں باہم صلح ہو گئی - نصرتی نے اس غداری پر بہت غم و غصہ کا اظہار کیا ہے - اس شکست کے بعد شیواجی کے دل کی جو کیفیت ہوتی ہے اور مغلوں سے مل جانے کا جو منصوبہ سوچتا ہے اُسے بڑی خوبی سے بیان کیا ہے —

(شیواجی اپنے دل میں سوچتا ہے) کہ اب گھر سے ھاتھہ دھو کر (یعنے ملک دے کر)	تا گھر تے ھت دھو
	بلا ٹالنا

نه چپ گھر برابر اپس جالنا	اس بلا کو ٹالنا چاهئے - گھر کو جلتے دیکھه کر خود بھی جلنا مناسب نهیں -
* منڈا سا گنوانا بھلا سر کی تھار	سر کے بجاے منڈاسے کا کھو دینا بہتر هے
که بانچیا تو یک سر منڈا سے هزار	که اگر سر بچ رها تو منڈا سے هزاروں
مغل سوں تو میں سخت کیتا هوں کھوڑ	میں نے مغلوں سے سخت دغا کی هے وه بغیر
وو لے گھر مجھے چپ نه دیویں گے چھوڑ	گیر (ملک) لیے مجھے یونهیں نه چھوڑدیں گے
طمع جیو بنچانے کوں ایسا دیکھانوں	اپنی جان بچانے کو ایسا لالچ دوں گا که
پڑیں شرم ست پھر وو میرے پچھ پانوں	وه بے حیای سے الٹے میرے هی پاؤں پڑیں گے
نه نامرد کے دل په انکار آے	نامرد کو کچھه بھی غیرت نهیں آتی
گنوا لاکھه عزت کوں یک جیو بچاے	وه لاکھه عزت کھو کر اپنی جان بچا لیتا هے
نه چھے قدر کچھ مال کی چور پاس	چور کے نزدیک مال کی کیا قدر
پھوکت لے گنوا وے پھوکت اور پاس	مفت میں هاتھه آتا هے اور مفت میں دوسرے کو دے دیتا هے -

اس کے بعد لکھتا هے که شیواجی نے جےسنگھه کو کیا پٹی پڑھائی -

که تم آج اگر مجھه پکڑتے هیں هات	اگر تم میری دستگیری کرو تو میں ایک
تو کرتا هوں یک کام اس دهات سات	ایسا کام کرتا هوں که آج تک کسی سے نهوسکا
نکوی آج لگ کر سکیا هے وو کام	اور تمهارا نام دنیا میں ابدلآباد
تمهارے تے هو آبدی جگ میں نام	تک رهے گا

---

* محمد ابراهیم زبیری نے اپنی تاریخ بساتین السلاطین میں اس موقع پر بالکل اسی شعر کا ترجمه لکھه دیا هے - دراصل یه پرانی کهاوت هے - وه لکھتا هے " مثل مشهور است درمیان مردم که چوں سر سلامت باشد دستار کم نیست " (صفحه ۴۰۳)

کدھیں فوج دھلی کی اس شان سوں	دھلی کی فوج نے کبھی اس شان اور
چلی تھی نہ یو ساز و سامان سوں	ساز و سامان سے کوچ نہیں کیا تھا -
رکھیں پیٹ میری تو کیا کر کہ فن	اگر تم میری پشتی بانی کرو تو ایک چال
یدی لیکہ دیتا ھوں ملک دکن	چل کر ملک دکن تمہیں دلا دیتا ھوں

شیواجی نے جب یہ سبز باغ دکھایا تو جے سنگھ پر کیا اثر ھوا

سنیا جب سیو یاتے یو جیسنگ لات	جے سنگھ نے جب شیوا جی کی یہ لات سنی تو
اپس شہ کے وعدیاں کوں کیتا خلاف	بادشاہ سے جو وعدے کیے تھے ان سب کو بھول گیا
قوی رابطہ مرد صادق سوں توڑ	مرد صادق سے قوی رشتے کو توڑ کر مفسد کے
ملیا کئے میں مفسد کے اخلاص جوڑ	کہنے میں آگیا اور اُس سے رابطہ قائم کرلیا
کہ تھا اصل میں اس سے ھم جنس نیت	کہ وہ دونوں اصل میں ایک ھی جنس کے تھے
منگیا رکھنے کافر نے کافر کی پیٹ	کافر نے کافر کی حمایت کی -
طمع ات منافق پہ غالب ھوئی	طمع اس منافق پر اس قدر غالب ھوی کہ ننگ و نام
ڈوبانے کوں تس ذاتوں طالب ھوئی	ڈبونے پر آمادہ ھو گیا
سچے مرد سوں راست بازی کوں چھوڑ	مرد صادق سے راست بازی چھوڑ دی اور جھوٹے سے مل کر
منگیا کھیلنے ملکہ جھوٹے سوں ھوڑ	فن فریب کھیلنے لگا
طمع اھل عزت کوں کرتی ھے خوار	
کرے جگ میں بے قول و بے اعتبار	وغیرہ وغیرہ

اب نیا دور شروع ہوتا ہے - مغلوں اور شیواجی کی باہم صلح ہوجاتی ہے اور علی عادل شاہ کا مغلوں سے مقابلہ ہوتا ہے —

علی عادل شاہ کو جب اس غداری کی خبر ملی تو سخت پریشان ہوا - مُلا خرم اور مُلا احمد کو بھیجا کہ وہ جے سنگھ سے گفتگو کرکے اُسے راہ پر لائیں لیکن اس گفت و شنید کا کچھہ اثر نہ ہوا - مجبوراً جنگ کی تیاری ہوی - آس پاس کے زمینداروں اور باج گزار سرداروں کو فوج وحشم لےکر حاضر ہونے کا حکم ہوا —

سواس و سنیوار عالی مقام	عالی مرتبت سواس اور سنیوار
لے آے اتھے پاے دل جو تمام	اپنی پیدل فوجوں کو لےکر حاضر ہوے
سلامت رھنا کر بڑا شہ کا گھر	تا کہ بادشاہ کا گھر سلامت رہے وہ
او تھے تھے سو سب جیو پہ کرنے کہتر	جاں جوکھوں کے ایسے آمادہ تھے
خوش اس دھات فوجاں پہ فوجاں چلیاں	فوجوں پہ فوجیں اس ڈھنگ سے چلیں
کہے توں کہ دریا پہ موجاں چلیاں	گویا دریا پہ موجیں چل رہی ہیں

بادشاہ نے ایک دور اندیشی یہ کی کہ شہر کے گرد جس قدر باغ، نہریں، حوض، تالاب اور پورے تھے ان سب کو مسمار کردینے اور توڑ دینے کا حکم دیا - اور باولیوں اور کنوؤں میں زھر ملا دینے کا انتظام کیا گیا - تاکہ غنیم کو نہ کوئی جاے پناہ ملے اور نہ پینے کو پانی نصیب ہو —

حوضوں اور تالابوں کے توٹنے سے پانی جو ایک دم زور شور سے بہا ہے تو اُس کی کیفیت یوں لکھی ہے

دسے دور تے یوں وہ پانی جنجال
زمیں حوض ہوی ہور فلک تس کنجال

باغات کی بربادی کے متعلق لکھتا ھے —

تلف یوں یتے تازہ باغاں ھوے فلک پر گلاں جن کے داغاں ھوے
پرندیاں کوں کیں باغ و بن نہیں رھیا چراکاہ ھور کیں وطن نہیں رھیا
نہ تھی دھوپ جہاں وھاں کیڑا آفتاب لایا آب کی تہار بہنے سراب

(یعنے جہاں کبھی دھوپ کا گذر نہ تھا وھاں آفتاب کیڑا تھا اور پانی کی جگہ سراب بہ رھا تھا)

رھیا سب ھو برباد یوں بے قصور اوڑایا ھے گویا قیامت کا صور
کف دست بیوئیں یوں ھوئے سر بسر دیکھیں کوٹ پرتے نظر کر اگر
ڈھلے جس رخن گولہ بیضے کی تہار نہ تہارے لگے لگ فلک کے کنار

(یعنے قلعہ پر سے اگر نظر دوڑای جاے تو ساری زمین کف دست کی طرح صاف نظر آتی تھی - اگر قلعہ سے گولہ مارا جاے تو انڈے کی طرح اڑھکتا چلا جاے اور جب تک آسمان کے کنارے نہ لگ جاے اس وقت تک نہ تھیرے)

یہ سارا انتظام میرزا یوسف کے سپرد تھا - مرزا کی نصرتی نے بہت تعریف لکھی ھے —

اس باب کی ابتدا نصرتی نے قلعۂ بیجاپور کی تعریف سے کی ھے اور اس کی شان و شوکت ' اس کی سر سبزی و خوشحالی اور ثروت و عظمت کا بیان کرنے کے بعد بادشاہ کے حکم سے اس کے باغوں اور کھیتوں کے برباد کرنے' اُس کے پوروں اور آبادیوں کے مسمار کرنے اور اس کے نہروں اور حوضوں کے توڑ ڈالنے کا افسوس ناک ذکر کرتا ھے - اسے پڑھ کر افسوس ھونے لگتا ھے اور اھل بیجاپور اور اس کے سلطان سے ھمدردی ھو جاتی ھے - قلعہ کی تعریف کے صرف چند شعر نقل کرتا ھوں —

فلک یو جو دھرتا ہے دیدے ہزار ندیکھا ہے اتنا بڑا کیں حصار

زہے کوٹ عالی بجاپور کا کہ ہے برج بیت الشرف سور کا

کرے تت بلندی میں کیواں سوں بات کنگورے چھپنے بام ہفتم کوں ہات

(اس کی فصیل اتنی بلند ہے کہ زحل سے باتیں کرتی ہے اور اس کے کُنگرے فلک ہفتم کو ہاتھ سے چھولیتے ہیں)

فلک دھوپ لگ کر پریشان ہوے کنگورا ہر یک تس سوریا بان ہوے

(فلک اگر دھوپ سے پریشان ہوجاے تو اس کا کنگرہ چھتری کا کام دے گا)-

پون چڑ سکیا نہیں کدھیں تت بلند دھویں کا بی ست کنگرے پر کہند

(دھنویں کی کہند ڈال کر بھی ہوا آج تک اس کی بلندی تک نہیں پہنچ سکی)

اگر آسرے تت کے نکلے تو چاند صبا ہوے چڑآے لگ ویچہ کاند

(اگر چاند اس کی فصیل کے سہارے نکلے تو صبح ہوے تک اُسی ایک دیوار تک رہے)

بدل کاچ تکڑا کنگورا دسے کڑ کتی جو بجلی زنبورا دسے

(اس کی فصیل کا کنگرا بادل کا ٹکرا معلوم ہوتا ہے اورکڑکتی بجلی اس کنگرے پر کی بندوق ہے)

نہیں کوی کنگورا بی ڈونگرتے کم رنبورا ہر ایک افعیٔ تیز دم

(ہر کنگرا پہاڑ سے کم نہیں اور اس کی ہر ہر بندوق تیز دم افعی ہے)

زحل دیکھہ جس کے عرابے کا پھیر دسیا لنگ ہو سیر کرنے تے سیر

(زحل اس کی توپوں کا زنجیرہ دیکھہ کر سیر کرنے سے بیزار اور لنگڑا ہوگیا)

بزرگی میں جس پھیر کے آسماں دسے نقط جیوں دائرے کے میاں

(آسماں اس کے پھیر کی بڑای کے سامنے ایسا ھے جیسے دائرے کے بیچ میں نقطہ)

غرض یہ سب بیرونی انتظام کرنے کے بعد قلعہ کی شکست ریخت، حصار کی درستی، سامان رسد کی فراھمی وغیرہ کے تمام انتظام اندرون قلعہ کیے جاتے ھیں اور جنگ کے لیے تمام تیاریاں مکمل کرلی جاتی ھیں - اس کا بھی کسی قدر تفصیل سے ذکر ھے —

جب قلعہ کے اندر تمام انتظامات مکمل ھوگئے اور فوج کیل کانٹے سے لیس ھوگئی تو سلطان علی عادل شاہ نے اپنے خاص خاص امرا ووزرا اور فوجی سرداروں سے مشورہ کے لیے مجلس منعقد کی - جن میں (بقول نصرتی) عبدالمحمد، محمد اخلاص خاں، خان شرزا، عبدالکریم ابن عبدالرحیم، یکوجی فرزند شاہ جی شریک تھے - ان سب کی حسب لیاقت و درجہ تعریف کی ھے - ان سب سے مخاطب ھوکر سلطان نے فرمایا —

رھنا گھر دکن کا تہارے تے تیا نب کہ ھیں سلطنت کے تمہیں آج کہانب

(دکن کا گھر اب تمہارے ھی سنبھالے سنبھلے گا کیونکہ تمہیں اس سلطنت کے سہارا (کھم) ھو)

ھوا ھے مغل آج بد عہد کل اوچانے پہ ھے یہاں تلک آکہ غل
اگر پیش رو اھل تلبیس ھے اُسے رھنما نسل ابلیس ھے
دکھایا ھے دریا کوں کریک سراب رکھیا نام زھر ھلاھل گلاب
اگیتی کوں سمجیا دیا لالہ زار اناراں کے دانے دسے تس انگار

(مغل ھم سے بد عہد ھوگیا ھے - اُسے ابلیس نے ایسا بہکایا ھے کہ اُسے سراب دریا اور گلاب زھر ھلاھل نظر آتا ھے - گلخن لالہ زار اور انارے

آثار دانے دکھای دیتے هیں)

کیا سو سہم پا همن تے مدد هوا پھر همن سوں بد اندیش بد

(همیں سے مدد پا کے تو سہم سر کی اور اب همیں سے بدگمان هو گیا هے)

اگر متفق بد سوں بد جنس هے ولے مجه مدد خالق انس هے

اوسے گر چه بل بت پرستی اچھے همن قرب ربی کی مستی اچھے

(اگر بد اور بد جنس متفق هوگئے هیں (مغلوں اور شیواجی کے اتفاق کی طرف اشارہ هے) تو همیں اپنے خالق سے مدد کی امید هے - اگر اُسے بت پرستی کا بھروسه هے تو همیں قرب رب کی مستی کافی هے)

غرض اس قسم کی تقریر سے اصل حقیقت بیان کرکے اپنے امرا اور بہادروں کو جوش دلاتا هے - تقریر کا آخری شعر یه هے

رکھو آج مردی سوں هو مرد نام

تمن نام هوے هور همارا سو کام

(اے جواں مردو! آج مردی کی لاج رکھه لو، تمہارا نام هو اور همارا کام -)

یه لوگ اس کے جواب میں سلطان کی تعریف، مغلوں کی بیوفائی کی مذمت کرتے هیں اور اپنی وفاداری اور جاں نثاری کا اپنے آقا کو اطمینان دلاتے هیں - اور اپنی اور مغلوں کی لڑائی کے ڈھنگ کا مقابله کرکے اپنی شجاعت اور ان کی بزدلی کا خاکه کھینچتے هیں ۔ اس مقام کے چند شعر نقل کیے جاتے هیں —

زمانه میں شاہ یگانه تہیں حقیقت میں شاہ زمانه تہیں

غریباں نوازی هے تجه بندگی تری بندگی سایۂ زندگی

تری نعمتاں کھا سکے هم تمیز نمک او یهی وقت کرنا هے چیز

مغل اصل نامرد هور حیله گر شجاعت همهاری همیں سب په ور
مغل کا هے هتیار تیر و تفنگ همیں قبضه جمدهار و کردا فرنگ
لڑیں چھپ مغل لے عرابے کا اوت همیں بیس دَل میں کریں لوٹ پوٹ
کہاں رهے په اوسان او چهوڑ تے همیں کو نه هتیارسوں جهوڑ تے
مغل آکه اول جو لت کہاے هیں دکهن کی لڑائی سے کندرائے هیں
یکیک موت کے وقت فرزند کوں کہے یاد رکهه پوت اس پند کوں
دکهن کی مہم پر تجو روز کار که زنهار نیں او پهر آنے کی تہار
یه آتے سو اکثر هیں وو پوت عاق جو نپجے هیں ماواں لیے پر طلاق

آخر کے تین شعر قطعه بند هیں - جن کے معنے یه هیں که مغلوں کا هر سپاهی مرتے وقت اپنے بیٹے کو یه وصیت کرتا هے که یاد رکهو که جب کبهی دکهن کی مہم در پیش آے تو نوکری سے دست بردار هو جانا که وهاں جانے کے بعد واپس آنے کی هرگز کوئی توقع نہیں رهتی- (اس کے بعد کہتا هے) که یه جو نوجوان مغلوں کی فوج میں هیں یه وه هیں جنهیں ان کے باپوں نے عاق کر دیا هے اور مطلقه ماؤں کی اولاد هیں)

اگلے بیان میں اس نے تمام قوموں اور ملتوں اور خیلوں اور قبیلوں کے نام گنوائے هیں جن کے بہادر افراد فوج میں شریک هیں - اِن میں هندو اور مسلمان دونوں هیں - کوچ سے پہلے پهر تمام فوج سے خطاب کرتا هے اور اهل فوج اپنی جان نثاری کی تجدید کرتے هیں -

اُدهر سے جے سنگهه کی فوج نے عادل شاهی علاقے پر یورش کی اور قلعه منگل بیڑ پر قبضه کر کے سرافرازخاں کو پانچ هزار سوار کے ساتهه وهاں متعین کر دیا- جب اس کی خبر شرزه خاں کو پہنچی تو اس نے فوراً ادهر کا رخ کیا- بیجاپوری فوج کے پہنچنے پر سرافرازخاں نے (خلاف

احکام جے سنگھ) قلعہ سے باہر نکل کر مقابلہ کیا - تھوڑی دیر خوب لڑائی ہوئی اور سر افراز خاں عین کارزار میں مارا گیا - مغلوں کی باقی فوج قلعے میں جا کر محصور ہو گئی - اور جب بیجاپوری بندوقوں کی زد میں آ گئے تو گولیاں مار مار کر بھگا دیا - لیکن نصرتی اور عادل شاہی مورخ یہ لکھتے ہیں کہ شرزہ خاں نے قلعے پر تسلط کر لیا مگر اتنے میں عبدالمحمد اور محمد اخلاص خاں کا خط پہنچا کہ غنیم سے اِن کا دو تین دن میں بڑا معرکہ ہونے والا ہے فوراً چلے آؤ - شرزہ خاں نے اسی وقت سنگل بیڑہ سے یلغار کی اور عادل شاہی لشکر سے جا ملا —

اصل لڑائی اب شروع ہوتی ہے - جے سنگھ اپنا لشکر لے کر بیجاپور کے قرب و جوار میں آ پہنچتا ہے اور بیجاپوری قلعے میں محصور ہو کر مقابلے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں اور کچھ فوج میدان میں لڑنے مرنے کے لیے جاتی ہے ' اور جو علاقہ مغلوں کے تصرف میں تھا اس پر حملہ شروع کرتی ہے —

ان لڑائیوں میں کبھی پسپائی ہوئی اور کبھی کامیابی - لیکن نصرتی ہر بار اپنی ہی فتح بتاتا ہے - ان کی تفصیل یہاں غیر ضروری ہے مگر ہر موقع پر اس نے جو رزمیہ بیان لکھے ہیں وہ بلا شبہ قابل تعریف ہیں - مثلاً جنگ کی طیاری ' بہادروں کی نبرد آزمائی ' ہتھاروں کا چلنا ' گھوڑوں کی باد پیمائی ' ہاتھیوں کا جوش و خروش ' غرض پورا جنگ کا سماں دکھایا ہے - رزمیہ شاعری کا یہ کمال قدیم اردو زبان میں کہیں نہیں پایا جاتا اور ضمیر اور انیس سے قبل کسی کو اس کی ہوا بھی نہیں لگی - یہ سچ ہے کہ نصرتی میر انیس یا زمانۂ حال کے بعض رزمیہ نگار مرثیہ نویسوں کو نہیں پہنچتا لیکن یہ بھی دیکھنا چاہئے

که اس نے میر انیس وغیره سے سوا دو سو برس پہلے ان مضامین پر طبع آزمائی کی هے —

یہاں بعض مقامات سے کچھہ کچھہ شعر نقل کئے جاتے هیں - مثلاً وه اپنی فوج کے هتیاروں کا ذکر یوں کرتا هے -

جو هے تیر هر یک اجل کی چیڈتی	هر تبر اجل کا پروانه هے جو لگنے پر
لگے پر لیے جیو بن نہیں چھوٹی	بغیر جان لیے نہیں چھوٹتا
بھوکا اژدها رن پر بھالا دسے	بھالا رن میں بھوکے اژدهے کی طرح هے
دندی کا چ جیوتس نوالا دسے	دشمن کی جاں اس کا نوالا معلوم هوتی هے
جو برچی چھوٹی جا پرنہار هے	برچھی چلنے میں جان کی لیوا هے
وو هر ناگنی اڑ لڑنہار هے	وه ایک ناگن هے جو اڑ کے ڈستی هے -
کمند هار هو جا پڑے جس گلے	کمند جس گلے کا هار هو کر جا پڑے تو وه
انکھیاں میں نه جیو لیاے بن چپ تلے	بغیر آنکھوں میں دم لاے نہیں ٹلتی
ذرنگ هر اجل کی ندی کا هے پاٹ	تلوار اجل کی ندی کا پاٹ هے
ڈوباتا هے جیو جس کے پانی کا کاٹ	جس کی آب کا کاٹ جانوں کو ڈبو دیتا هے

یه دو شعر خاص طور پر قابل ملاحظه هیں

پٹا رن کے دریا کا دستا نہنگ	پٹا رن کے دریا کا نہنگ معلوم هوتا هے
کرے دم کی جھڑپوں دو دھڑ بے درنگ	جو اپنی دم کی جھڑیوں سے دھڑ دو ٹکڑے کر دیتا هے
دسے جیب اژدر کی سیف آبدار	سیف آبدار اژدهے کی زبان معلوم هوتی هے

اوڑیں وار کرنے میں چنگیاں ہزار	جس سے وار کرتے وقت ہزاروں چنگاریاں اڑتی ہیں

قسم قسم کے گھوڑوں کی کیفیت، ان کے رنگوں اور ان کی سرعت کا بھی ذکر آتا ہے —

اچنبک کیتی بھانت اچپل ترنگ	سیکڑوں قسم کے تیز طرار گھوڑے کہ جن
پون پیچ کھاوے اتھیں پرنسنگ	کے چلنے پر ہوا پیچ و تاب کھاتی ہے
دریای جو دریا پر سٹتے ہیں دھانوں	دریای (گھوڑے) جب وہ دریا پہ دھاوا
نہ دیتے ہیں لگنے کوں پانی پہ پانوں	کرتے ہیں تو پانو کو پانی نہیں لگنے دیتے
کنپی، روپ ونتی، چنچل، من ہرن	ایسے دل موہنے والے، چنچل، حسین، طرار
بھولے سد تھکاں اُن کی دیکھت پون	کہ جن کے ناز و انداز دیکھ کر ہوا کے بھی ہوش جاتے رہتے ہیں -
سبک سیر ترکی دسیں گردباد	سبک سیر ترکی بگولے معلوم ہوتے ہیں
گزر جائیں گلشن پہ بارے کے ناد	وہ گلشن پر سے ہوا کی طرح گزر جاتے ہیں

ہاتھی کے بیان میں بہت سے شعر لکھے ہیں، یہاں صرف چند لکھے جاتے ہیں —

چلیں پردسیں پاکھراں سوں سنور	جب پاکھروں سے سنورے سنوارے چلتے ہیں تو یہ
فرشتے چھا وڑتے ہیں جیوں کھول پر	معلوم ہوتا ہے کہ فرشتے پر کھولے اڑرہے ہیں

سہیں کوہ البرز سے مست گج یکیک آہنی برج قامت سوں سج	ایک ایک آہنی برج سے سجے ہوے مست ہاتھی کوہ البرز معلوم ہوتے ہیں
لٹکتے چلیں پر لگیں گرد باد دسیں ہال اتہنیں غلولے کی ناد	اگرچہ ناز سے چلتے ہیں تو بھی بگولا معلوم ہوتے ہیں دوڑتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے توپ کے گولے ہیں
مخالف کے دل پر تو دریا کا لوٹ اپس فوج انگے ہن وو چلتا سو کوٹ	مخالف کے لشکر پر دریا کا سا سیلاب ہیں اور اپنی فوج کے آگے چلتے ہوئے قلعے ہیں
دھریں ملک کی فتح یابی کا آڑ کلیداں سوں داتاں کی کھولیں کیواڑ	ملک کے فتح باب کا سہارا ہیں اپنے دانتوں کی کنجیوں سے کواڑ کھولتے ہیں
کریں پائیں سنھکہ تو یک دم میں دور دھریں سونڈ گویا قیامت کا صور	ان کی سونڈیں قیامت کا صور ہیں جو سامنے آیا اٹھا پھینکتے ہیں
نکوی باغ بن رکھہ دسے دل فریب نہ کچ باج کوی دل پکڑتا ہے زیب	جیسے کوئی باغ درختوں کے بغیر بھلا نہیں معلوم ہوتا اسی طرح کوئی لشکر ہاتھی بغیر اچھا نہیں لگتا

فوج کے کوچ کو کس خوبی سے بیان کیا ہے

ہوئی فوج جیوں مستعد جس گھڑی دمامیاں پہ چوندھرتے لکڑی پڑی	جس گھڑی فوج مستعد ہوی تو دماموں پر چاروں طرف سے ضربیں پڑنے لگیں

گگن پر ستارے ھوے حال میں	آسماں پر ستارے یوں ھلنے لگے
ھدرتا ھے سیماب جوں تھال میں	جیسے پارہ تھال میں ھلتا ھے
جتے بھیر و برغم جو بجنے لگے	جتنے قرنا اور نقارے تھے سب بجنے لگے
سوا لاکھ پربت گرجنے لگے	گویا سوا لاکھ پربت گرج رھے تھے
دسے فوج دریا نمن ھر طرف	فوج ھر طرف دریا کی طرح نظر آتی تھی
لگیں رست چھتریاں کی موجاں پہ کف	اور چھتریوں کی قطار ایسی معلوم ھوتی تھی جیسے موجوں پر کف

اسی طرح بیان کرتے کرتے کہتا ھے کہ زمیں فوج کی رگڑ سے اس قدر پیسی گئی اور پائمال ھوئی کہ اس کی گرد کا ایک کرہ آسمان کے طبق میں جا جما - یا یوں کہو زمیں کے بستر خاک کو اونچا کردیا ھے اور اس کا پردہ افلاک پر جا باندھا ھے - آخر میں کہتا ھے —

کہے کیا ابھال آکہ اوتریا ھے وھاں
بڈی ھے زمیں یا نویا آسماں

گویا وھاں ایک بادل اُتر آیا ھے : یا تو زمیں اونچی ھوگئی ھے یا آسمان نیچا ھوگیا ھے —

اس باب میں اُس نے دھلی کی فوج کا بیان بڑے لطف سے کیا ھے - لشکر کی بہتات ' اس کی عظمت ' ھندوستان و ایران و ترکستان کے مختلف اقوام اور قبائل کے لوگوں کی شرکت ' ھاتھیوں کے پرے ' اسلحہ کی کثرت وغیرہ تفصیل سے بیان کی ھے مگر ساتھ ساتھ چٹکیاں بھی لیتا جاتا ھے اور یہ سارا بیان اچھی خاصی ھجو ملیح ھوگیا ھے - یہاں میں اس کا اکثر حصہ نقل کیے دیتا ھوں —

کتا ھوں اتا فوج دھلی کی بات | اب میں دھلی کی فوج کا حال سناتا ھوں

چلے تھے دکن دل پہ کس دھات سات
کہ جس فوج کو دیکھنے میں سمج
دسے نا کسے انتہا ہور اوبج
ہتیاں کا عرابہ چلے میل میل
نہنا جس میں سردار
اصحاب فیل
سراسر اگر بہار سارا دسے
تو یک فوجدار اُس
میں دارا دسے
سبک منصبی ہور بہاری کتے
اتھے کئی صدی ہور ہزاری کتے
یک یک ملک کے نام آور جواں
دو اسپہ سہ اسپہ سپہ بے گماں

کہ وہ کس ڈھنگ سے دکن کے لشکر پر چڑھے تھے ایسی فوج کہ جس کی انتہا اور ابتدا سمجھہ میں نہیں آتی تھی ہاتھوں کا پرا آہستہ آہستہ چلتا تھا ان میں کا ہر ایک اصحاب فیل کے ہاتھیوں کا سردار تھا

اگر ساری فوج کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک دیکھا جاے تو ایک ایک فوجدار دارا کے رتبے کا معلوم ہوتا تھا

کچھہ ان میں چھوٹے منصبدار تھے اور کچھہ بڑے بڑے منصبدار : کچھہ صدی تھے کچھہ ہزاری ان میں ملک ملک کے نام آور جوان تھے اور اس میں دواسپہ سہ اسپہ سب قسم کے سپاہی تھے

اس کے بعد وہ ہر قوم اور قبیلے اور ہر ملک اور شہر کے لوگوں کو جو مغلوں کی فوج میں بہرتی ہوکر آے تھے، گنواتا ہے اور کہیں کہیں ان کے عادات و خصائل کو ہجو یہ رنگ میں بیان کرتا ہے —

مغولاں کیتے ملک و کے شہر کے کیتے ہندو کوئی ماورالنہر کے
چغتے قزل باش اذبک بلی قندھاری کتے بلخی و کابلی
مروت کے مفلس محبت کے شوم فراست کوں طوطی نحوست میں بوم
فریب ان کے فن میں بڑا برد ہے جنم جن کا ابلیس شاگرد ہے
نچھے جن میں اصلا مروت کی بوے کریں اُس سوں بد جس سے نیک اُن پہ ہوے
ٹھکا نیچہ دنیا کو مادر کہیں چھپا لوز ظاہر کوں خواہر کہیں

(ٹھگنے کے لیے دنیا کو مادر کہتے هیں اور نفسانی خواهشات کو چھپا کر ظاهر میں خواهر کہتے هیں یعنے بڑے ابن‌الوقت هیں) -

بدی باپ سوں اپنی میراث جان　　برادر کا خوں شیر مادر پچھان
دیکھیں کچھ هے جہاں فائدہ آپ کوں　　نچھوڑیں سگے بھائي اور باپ کوں
اتھے میرزا اُن میں کشمیر کے　　غرائب سپاهی بی چوندهیر* کے
خراسانی اور اصفہانی کیتے　　دماوندی و دامغانی کیتے
کیتک سبز واری بخاری کیتے　　هراتی و طوسی و لاری کیتے
هویزای و هروی و همگری　　سجستانیاں اصل نسل آذری
کتک ترک گرجی کتک رومیاں　　سمر قندی شیر ازی جهرومیاں
کمندا ز کوئي گرز بازی میں چست　　تیر انداز کوئی نیزہ بازاں درست
بھوکے هو که جھگڑے کوں پھرتے دلیر　　لوهے چابتیں دل نهوئیں ان کے سیر
خلال ان کے دانتاں کا بھالا دسے　　گراں گرز مکھد کا نوالا دسے
کیتک ذات کے تھے روهیلے اوت　　زبردست پنجابیاں دل کے گھٹ
بھوت راو رانے اتھے رج کے پوت†　　غروری میں شیطان جھگڑے پہ بھوت
سسودی و کچھوی و کابی جنوار　　سورج و نس و سرسات و گوهل پنوار
امت دیوڑی چندراوت چندیل　　سیندهل سوم بنسی و کھینچی پونچھیل
سوري جیٹھوی هور جھالے کیتے　　سو لنکی و پر مارو هالے کیتے
کدم کوڑ و کوڑی و کاڑی کیتے　　کتک چاوڑی هور هاڑی کیتے
بئیس اور کھیلوت کے دهاندلاں　　چوهاناں و سورها کیتے باچھلاں
کیتے بھرئی واجهی واکھیلے　　بھٹے ٹانک و بھائی کیتے واڑلے

---

* چو طرف -　　† راجپوت -

تھرانا و کسمونیاں بڑ گجر کہر وار و بوندیل وجادھو تنور
اھیران و کھاچر و آسیل تھے دھوری ھور راتھور و تومیل تھے
براڑی کیتے خاندیسی کیتے بنگالی کی کوتال بھیستی کتے

غرض اس طرح وہ فوج کی ھر ذات اور قبیلے اور ملک و دیار کے باشندوں کا شمار کرتا چلا جاتا ھے —

ان کے لباس کے متعلق لکھتا ھے —

کئی کسوتاں تنکی کوئی آھنی سلاداں بندی یعنے روئیں تنی
تیلونی کیبے جامہ کوئی کیسری کئے کسوتاں صات کوی زر زری
جرت * کے طرے سر پہ کلگیاں لگاے مہن مال + کوی گل ‡ مکت سال بھاے ††

لیکن آخر تان اس پر توڑتا ھے -

مغل ھر ھنر میں برا کارساز
لڑائی کے فن پر توات ‡‡ حیلہ ساز

اس کے بعد شاعر مغلیہ فوج کی حالت اور شان کا نقشہ کھینچتا ھے

چلے سات لے دل کا چلتاچ کوٹ	فوج کا چلتا ھوا کوٹ (قلعہ) ساتھہ لے کر
سرپ فوج دارو سوں آتش کی موت	چلے اور تمام فوج گولے بارود کی وجہ سے آگ کا خزانہ بنی ھوئی تھی
زنجیرے کا حلقے سوں باندے حصار	زنجیروں کے حلقے سے حصار باندھا ھرا تھا
رچیں جوڑ گج مست برجاں کی تھار	اور اس حصار کے برج مست ھاتھی تھے
فرنگ نال او تم چیں کے بوم کے	اعلیٰ درجے کی بندوقیں چین کے ملک کی
فرنگی فرنگ داز کوی روم کے	اور ان کے چلانے والے روم کے تھے

* جڑاؤ - + موھن مالا - ‡ گلا - †† ڈالے ھوے - ‡‡ بہت، نہایت -

کریں یک رنجکہ کر جو گولیاں کی ریز ہوا ہوے اگیتی انگاریاں کی تیز	جب یک بارگی گولیاں چلائیں تو ہوا جلتے ہوے انگاروں کی انگیٹھی بن جاتی ہے -
قطاراں قطاراں شتر نال اچھے سب اوس کوٹ کوں ہو کہ سہکال اچھے	شتر نالوں (یعنے وہ بندوقیں جو اونٹوں پر رکھہ کر چلائی جاتی ہیں) کی سینکڑوں قطاریں تھی اور وہ سب اس کوٹ (فوج) کی زینت تہیں
چھوٹے مست ہاتھی تو تونگرتے چڑ فرنگیاں زنبوریچ چوتال سو گڑ	مست ہاتھی جو پہاڑوں سے بھی بڑہ چڑہ کر تھے چھٹتے ہوے تھے اور چھوٹی بڑی توپوں سے قلعہ آراستہ تھا
یکیک بستہ دارو کا یک کوہ جان صندوقانچ گولیاں کی ششیاں کی کھان	گولے بارود کا ایک ایک ڈھیر ایک ایک پہاڑ تھا اور صندوقوں ، گولیوں اور شیشوں کی کان تھے
بڑا توپ خانہ یکیک جس کی توپ غلولے سوں دھرتی کا ہوے سینہ کوپ	بڑا توپ خانہ تھا جس کی ایک ایک توپ ایسی تھی کہ اس کے گولے سے زمین کا سینہ شق تھا
دیکھت گولہ بسرے کرہ بھویں کا ناز تھکے دیکھ بھانتے فلک حقہ باز	ان گولوں کو دیکھہ کر کرۂ ارض اپنا ناز بھول جاتا ہے اور فلک حقہ باز دیکھہ کر ششدر رہ جاتا ہے
ہر یک توپ بادل ہے بن برق بار برستی اگن جل میں گولیاں کے کار	ہر ایک توپ برق بار بادل تھی جس کے گولے جل میں برستی ہوی آگ تھے
جو یکہ توپ دھرتی پہ جب کڑکڑے	اگر ایک توپ بھی اس زمین پر کڑکڑاے

سمندر کا دهشت سوں پانی پڑے	تو دهشت سے سمندر کا پانی اڑ جاے
شتر باراناں هزاراں قطار	اونٹوں کی هزاروں قطاریں تیروں سے
دسے بانس پیکیا سو جیوں کوهسار	لدی هوی ایسی معلوم هوتی تهیں گویا کوهسار پر بانسوں کے کهیت اُگے هوے هیں
هتی لئی مکوڑیاں تے چهنٹیاں تے تار	هاتهی، مکوڑوں اور چیونٹیوں کی قطار سے
پیاداں کے بهاراں ملخ تے اپار	بهی زیاده تهے اور پیاده فوج ٹڈی دل سے بهی بڑه کر تهی

غنیم کی فوج کا یه ذکر بڑے زور شور سے کیا هے - اپنی اس فوج کو دیکهه کر جے سنگهه کیا کهتا هے

یو جب فوج جے سنگهه دیکهیا سنور	جے سنگهه نے جب یه آراسته فوج دیکهی تو
کیا لاٹ ایسی خدا کوں بسر	وه خدا کو بهول گیا اور ایسی لاٹ مارنے لگا
مسلماں تکرار کرتے ڈرے	که جسے مسلمان کهتے ڈرتا هے اور فرنگی
فرنگی سونے بی تو توبه کرے	سن پاے تو توبه توبه کرے -

دوسری طرف سے بیجاپوری فوج کوچ کرتی هے اور ایک دوسرے کا آمنا سامنا هوتا هے - ان دونوں میں شیواجی کی حالت کو پاسنگ سے بڑی اچهی تشبیه دی هے ، جو موقع پاکر کبهی اِدهر هو جاتا هے کبهی اُدهر —

دونو بهار هم تول تهے یوں اگر	دونوں فوجیں برابر کی هم پله تهیں
سیویا ان میں پاسنگ کا تها پتهر	اور شیواجی اُن میں پاسنگ کا پتهر تها

جو یک دل کھڑا رہے پہ یک تک چلے	اگر ایک لشکر کھڑا رہے یا ایک چلے
توے یک طرت یک طرت ڈلملے	تو یہ کبھی ایک طرت کو جھک جاتا ہے اور کبھی دوسری طرت کو-
تو سنجیدہ لوگ اس کوں پاسنگ جان	تو سنجیدہ لوگ اُسے پاسنگ سمجھہ کر
منگے ترت کرنے وو پلے کوں کان	فوراً اپنے پلے کو کان دیدیتے یعنے جھکا دیتے ہیں -

اب لڑائی کا سماں شروع ہوتا ہے اور خان شرزا بہادری کے جوش میں آگے بڑھتا ہے - کیا دیکھتا ہے کہ مغلیہ فوج توپوں کا حصار اپنے گرد کیے کھڑی ہے - یہ رنگ دیکھہ کر خان شرزا کہتا ہے —

کہ بیٹھا چ ہے لگ کنڈل مار سانپ　　سٹیکا چ بے فکر چھیڑے تو چھانپ
ھمیں ہو کہ ناچپکہ چھکارنا　　لنبا کرکے اس مار کو مارنا

یعنے یہ سانپ کنڈلی مارے بیٹھا ہے ' اگر ذرا بھی چھیڑا تو ڈس لے گا - تو ہم کیوں خواہ مخواہ اسے چھیڑیں' مناسب یہ ہے کہ اُسے لمبا کرکے ماریں - یعنے ایسی ترکیب کریں کہ وہ کنڈلی کھول کر آگے بڑھے اور اس وقت ہمارا داؤ چل جاے گا - توپوں کے زنجیرے سے محصور ہونے کو سانپ کی کنڈلی مارنے سے کیا اچھی تشبیہ دی ہے —

غرض بیجاپوری فوج اپنا داؤ کرتی ہے اور پیچھے ہٹتے ہٹتے غنیم کو دور کھینچ لاتی ہے اور پھر مقابلہ کرتی ہے —

اب جنگ کا میدان گرم ہوتا ہے

ہوا پل میں پیدا کری بے مثال اگن کا گگن ہور دھوئیں کا ابھال	ہوا نے ایک پل میں آگ کا آسماں اور دھوئیں کا عجیب و غریب بادل پیدا کر دیا
غنیماں کے بیبجیاں کوں کھانے شتاب خوش آنے لگیا سوں میں کھڑکاں کے آب	دشمنوں کے بھیجے کھانے کے لیے تلواروں کے منہ میں پانی بھر بھر آتا تھا۔
کماناں رکھیاں دل کشاکش منیں اوبلنے لگے تیر ترکش منیں	کمانوں نے دلوں کو کشمکش میں ڈال رکھا تھا اور تیر ترکش سے اُبلے پڑتے تھے۔
پھوکیا تیزیوں سخت بھالیاں کا انگ کہ پھکتا ہے جیوں باؤ لے کر بھوجنگ	سخت بھالوں کا جسم اس طرح پھنک رہا تھا جیسے اژدہا ہوا کھا کر پھنکارے مارتا ہے
بھڑکتے ترنگاں ہو آگاں دسے سواراں بھوکے رن کے باگاں دسے	بھڑکتے گھوڑے آگ بگولا نظر آتے تھے اور بھوکے سوار شیر معلوم ہوتے تھے
نشانی ہے جیوں میہنوں لانے کوں باؤ دیویں یوں مہراتے لڑائی کوں تاؤ	جس طرح ہوا بارش لانے کی نشانی ہوتی ہے سرھتے اسی طرح لڑائی کو گرما رہے تھے
نکلتے ہیں جیوں باگ نخچیر کوں نکل یوں مہراتے دونو ڈھیر سوں	جس طرح شیر شکار پر لپکتا ہے اس طرح دونوں طرف سے سرھتے لڑنے کو نکلتے تھے

اگے چل کر لکھتا ہے

هر یک مکهه تے آواز سن مار مار	هر ایک کے منه سے مار مار کی آواز سن کر
کیا جیو نے دشمن کے هونٹاں میں تهار	دشمنوں کے دل هونٹوں میں آکر ٹهیر گئے تهے
دیکهیا جب بدی آکه بازی یتی	جب مغلوں نے دیکها که بات یہاں تک بڑه گئی هے
مغل وئیں عرابے کو دیتا بتی	تو اس نے توپوں کے زنجیرے کو آگ دکهای
جو یک دم چهوٹی توپ هر فرد فرد	جب ایک دم توپیں چهٹیں تو هوا نے آگ
اوچا یا دهواں باؤ هوا اگ کی گرد	کی گرد بنکر دهنواں بلند کیا
دسے تس میں تروار جهلکے جتی	تلوار اس میں جهلکتی هوی ایسی معلوم هوتی تهی
مگر گرد میں اوڑ رهی هے پتی	جیسے گرد میں اُڑتی هوی پتی
هوا آسماں گرم جیوں اگ کے تاب	اس کی حرارت سے آسمان گرم هوگیا
سوکا اوت جا چشمۂ آفتاب	اور چشمۂ آفتاب خشک هوگیا
هوا پر فرنگیاں کے گولیاں کا تهات	بندوقوں کی گولیاں کا هوا پر یه هجوم تها
نظر کی گزر کا ستیا باند باٹ	که نظر کا رسته بند هوگیا تها (یعنی کچهه سجهائی ندیتا تها)
کہے دیکهه حیران هو اهل عرش	اهل عرش یه دیکهه کر حیران هوکے کهتے تهے
معلق هوا پر بندیا کون فرش	که هوا پر کس نے یه فرش معلق کردیا هے
دلیراں کریں نعرہ یوں هو کے آگ	دلیر آگ هوکر یوں نعرہ کرتے تهے
نیستاں میں جیوں گرجتے هیں باگ	جیسے نیستان میں شیر گرجتے هیں
جهلکنے لگی کهڑک بهالیاں میں یوں	تلوار بهالوں میں یوں جهلکتی تهی
لگے هے نیستان کوں آگ جوں	جیسے نیستان میں آگ لگی هو
پڑے کٹ که واراں تلیں هر رخن	هاتهی دانت گلے کی پوریوں کی
هتی دانت کانڈے کی پیریاں نمن	طرح کٹ کٹ کر گر رهے تهے

اس طرح لکھتے لکھتے ایک شعر لکھتا هے

رگت کت تے بھالیاں کے نکلیا اپار
لراں جیوں نکلتیاں ہیں جالیاں کے بھار

یعنی خون بھالوں کے کناروں سے اس طرح بہ نکلا تھا جیسے پانی کی لہریں جالیوں سبن سے ہوکر بہہ نکلتی ہیں —

یک یک کہم تے سینتیاں چھوٹیاں برن ہزار کہ برسیاں ہیں بجلیاں نیچ بونداں کی تہار	ایک ایک ہاتھی پر سے جو ہزاروں برچھیاں چلیں تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ بجائے بوندوں کے بجلیاں برس رہی ہیں
نکوی کس مدد کر سکے تس گھڑی ہر یک سر پہ اپنیچہ اپسیں پڑی	اُس گھڑی کوی کسی کی مدد نہیں کر سکتا تھا ہر ایک اپنی اپنی مصیبت میں مبتلا تھا
اوٹھیا جیوں کھنڈ کھن کا آواز زور فلک کان سونچیا نہ سن سک کہ شور	کھنا کھن کی آواز اس زور سے اٹھی کہ فلک اُس شور کی تاب نہ لا سکا اور اپنے کان بند کر لیے
کھڑگ کڑکڑاتی سورج تھانوں تیانوں سپر بن نہ تھی کچھ بی کس سر پہ چھانوں	چمکتی تلوار جگہ جگہ سورج بنی ہوئی تھی اور کسی کے سر پر سوائے سپر کے کوی چھانو نہ تھی
وو ڑا و وڑ میں آگ کھڑگاں تے جھڑ سپر پر موتی جیوں بھونے سو پھڑ	تلواروں سے مسلسل آگ برس رہی تھی اور ڈھالیں اس کی حرارت سے ایسی ہوگئی تھیں جیسے بھنے پاپڑ
جھیا کوی کھڑے راگ ہنکار کا رہیا سر کھنا کھن کے جھنکار کا	کوی کھڑا آہ و فریاد کا راگ الاپ رہا تھا اور ادھر کھنا کھن کی جھنکار کا سُر جاری تھا
زمیں ہور فلک ہوکہ یک حال میں لگے ناچنے تیغ کی تال میں	زمین اور فلک ایک حال میں ہو کر تیغ کی تال پر ناچنے لگے
ہوا رند جن تک کھڑا پانوں گاڑ دسے کھونٹ جیوں ڈال توڑے سو جھاڑ	جو ذرا قدم جما کے کھڑا ہوا وہ رند منڈ ہو گیا جیسے درخت کا ٹھنڈ

جنگ کا یہ بیان بہت طویل ہے - میں نے کہیں کہیں سے چند چند

شعر لکھہ دیے ھیں کہ شاعر کی قوت بیان کا اندازہ ھو سکے - چند شعر اسی بیان سے متعلق اور نقل کرتا ھوں —

سلح کوٹ کڑ سرد اوپرال ھے	اسلحہ، فصیل، قلعہ سرد کی حفاظت کے لیے ھیں
اجل آے پر و یچھ بینونچال ھے	لیکن جب اجل آتی ھے تو یہی پھونچال ھو جاتے ھیں
اجل کا جو جس مرد پر ذوق ھے	جس شخص پر اجل کی نظر ھوتی ھے
زرہ کی کڑی سو بھو طوق ھے	تو زرہ کی کڑیاں اس کے لیے طوق بن جاتی ھیں
ھوا بار سفرہ یتا مرگ کا	موت کا خوان اس قدر بھرپور تھا کہ
پھر یا موں نوالیاں تلیں کھڑگ کا	تلوار کا منہ کھاتے کھاتے پھر گیا -

اس کے ساتھہ وہ مغلوں کی شکستہ حالی اور درماندگی کا بھی ذکر کرتا ھے - اس میں مبالغہ کے ساتھہ تکلف اور تصنع پایا جاتا ھے - مثلاً وہ لکھتا ھے کہ مغل ھمارے گھر مہمان آے ھیں، ھم نے اُن کی خاطر مدارات کا سامان یہ کیا ھے - زمین ان کی مسند رنگین ھے (یعنے خون سے) اور اجل کی شراب ان کی تفریح کے لیے ھے - نقل کے لیے دانت بجاے مغز بادام اور لب بجاے انگور ھیں - سر کے کاسوں میں بھیجے ان کے کھانے کے لیے اور غم کے پینے کے لیے ھیں وغیرہ وغیرہ - اس کے بعد لکھتا ھے —

اجل کی کیتے خواب میں خُر خُرائیں	بہت سے خواب اجل میں غرق خراٹے لےرھے تھے
کیتے ھوئیں آسودہ کوئی تڑ پھڑائیں	بہت سے ٹھنڈے ھو گئے تھے اور بہت سے تڑپ رھے تھے

ہوے ہو سلم گرم سینے تنور	اسلحہ کی گرمی سے سینے تنور ہو رہے تھے اور پسلیوں
اگن دھک کے جلتی تھی پھنسلیا ہو چور	کے ایندھن سے آگ دھک دھک جل رہی تھی
تنوراں تے سینیاں کے اُڑ لہو کی دھار	سینوں کے تنوروں سے لہو کی دھاریں
ہوے رن میں طوفاں ادک تھار تھار	اُڑ رہی تھیں اور اُس سے میدان جنگ میں جگہ جگہ طوفان بپا تھا
زمیں پر رکت کا اکھنڈ حوض بھر	زمین پر خون کا مسلسل حوض بھرا ہوا تھا
یکا یک جو چڑیا چلیا پور بھر	اس سے جو یکا یک سیلاب چڑھتا چلا تو
سورج سخت طوفان کا دیکھ اوبال	سورج نے اس شدید طوفان کا اُبال دیکھ
منگیا چڑنے چندر کی کشتی نکال	کر سواری کے لیے چاند کی کشتی کو نکالنے کا حکم دیا۔
ہلاوے جو پر زور آنے لگے	اب جو پر زور ریلے آنے لگے تو
ہتی تول میں ڈلہلانے لگے	ہاتھی بے قابو ہو کر ڈگمگانے لگے
نقارے رکت پر جو اولٹے پڑے	نقارے جو خون کے اس سیلاب پر اُلٹے پڑے تھے
دسے بڑ بوڑے باو اوندے کھڑے	وہ ایسے نظر آتے تھے جیسے حباب
دسیں یوں زرہ پوش لہو میں جنجال	زرہ پوش لہو میں لتھڑے اس طرح نظر آتے تھے
مچھی جیوں توڑا لیکہ نہاتی ہے جال	جیسے مچھلی جال تڑا کر بھاگ جاتی ہے
رکت جل میں تکڑے زرہ کے ننجال	خون کے سیلاب میں زرہ کے ٹکڑے مثل کائی کے تھے
گونگے خود و دستانہ سینپیاں مثال	خود مثل گھونگے کی تھی اور دستانے مثل سیپیوں کے۔

کھاناں پڑیاں تٹ کہ چلّے انوپ	کمانوں کے چلے اس طرح ٹوٹتے پڑے تھے جیسے
کہ جیوں دھامنیاں بھار لیتیاں	دھامنیاں دھوپ کھانے کے لیے باہر
ہیں دھوپ	آپڑتی ہیں
ملے یوں وو چلّے رگت بیچ میں	خون میں وہ چلے اس طرح لتھڑے پڑے تھے
ہزاراں ہیں جیوں کیچوے کیچ میں	جیسے کیچڑ میں کیچوے۔

موت کا وہ بازار گرم ہوا کہ

ملایک کے ہت تے گیا	فرشتوں کی قدرت سے یہ کام باہر
کام بھار	ہو گیا اس لیے
کہ آتے تھے جیو یک کے	کہ ایک ایک کی تقسیم میں ہزار ہزار
بانٹے ہزار	جانیں آتی تویں
ہوا سب یہ ارواح سوں بھر رہی	تمام ہوا ارواح سے بھر گئی تھی اور ہوا میں
پوں پر ادک مارتے پر رہی	زور زور سے پر مار رہی تھیں
چھوٹا زور ارواح کا باوجب	ارواح کی آندھی جب زور سے چلی تو
فلک کی یو فانوس گرداں	اس ڈر سے کہ فلک کے فانوس گرداں
میں تب	میں سورج کی
یو شمع سورج نا کہ ہوے کر بڑی	شمع تاریک نہ ہو جائے فوراً
نیا پردۂ ابر اوتار اس گھڑی	ابر کا پردہ ڈال دیا گیا

مخالفین کی حالت ملاحظہ ہو

مخالف نے دیکھیا کہ یوں رن پڑیا	غنیم نے جب ان کی یہ کیفیت دیکھی تو
اپس کا تو لوک اس میں اوگن پڑیا	اس کی حالت بہت زبون اور بری ہو گئی
دسے نیمہ فوج آئی تھی جو عظیم	وہ فوج عظیم جو آئی تھی اب آدھی رہ گئی
رہی سوبی زخموں سے ہوے نیمہ نیم	اور اس آدھی میں سے بھی آدھے زخمی پڑے تھے

هوے تھے سو آدیاں تے سب جان اوڑیا	آدھے تو ایسے تھے جو جان کھو چکے تھے
جو سارے اتھے اُن تے اوسان اوڑیا	اور باقی جو سالم تھے اُن کے اوسان جاچکے تھے
کھڑے تھے جو ھمت سوں جہاں پانوں گاڑ	جو ھمت کرکے پانو گاڑے کھڑے تھے اُن میں
نا طاقت رھی پانوں لینے اُکھاڑ	اتنی سکت نہ رھی کہ وھاں سے پانو اٹھا لیں
سب اعضا نے قوت کوں ساری ستے	سب اعضا نے ھمت ھار دی اور ھتیاروں نے
ھتیاراں بی ھر ھت تے یاری ستے	بھی ھتیار بندوں کی دستگیری چھوڑ دی
نوایاں کماناں نے سرمان ھار	کمانوں نے ھار مان کر اپنے سر جھکا دیے
تھکے تیر سوفار کے موں پسار	تیروں کے سوفاروں نے تھک کر منہ پسار دیے
اوڑیاں بانکڈاراں جھڑے ھت تے سانگ	خنجر اور نیزے ھاتھوں سے گر گر پڑے
سلح ڈھل پڑے ڈرسوں پتلے ھو آنگ	سپاھی ڈر سے ایسے دبلے ھوگئے تھے کہ ھتیار خود بخود بدن پر سے گرے پڑتے تھے
ھوے ٹٹ علی بند آوارہ ڈھال	علی بند اور ڈھالیں ٹوٹ کر اس طرح
ٹوٹی بیل پرپات ھوئیں جوں نڈھال	رہ گئیں جیسے ٹوٹی بیل کے پتے نڈھال ھوجاتے ھیں
بسر رج کوں رجپوت دانتوں سنبھار	راجپوت بے غیرتی سے دانتوں میں تنکوں
دھرن آے برچھیاں کوں کاڑی کے تہار	کی بجاے برچھیاں رکھے ھوے تھے
گئے بھول قانون اپنا قدیم	اپنا پرانا قاعدہ سب بھول گئے اور
نہ کچھ کام آیا عرابہ عظیم	ان کے بڑے توپ خانے کچھ بھی کام نہ آے

مغل فوج کو شکست ھوی اور جب وہ میدان چھوڑ بھاگ نکلے تو شاعر نے ایک نیا سماں دکھایا ھے - میدان جنگ میں ایک بڑا جشن ھوتا ھے یعنے بہت بڑی ضیافت درندوں اور جانوروں کی ھوتي ھے - اس موقع پر شاعر نے بڑی جدت سے کام لیا ھے - میدان جنگ جو خون سے بھرا ھوا تھا درندوں کی مسند اور فرش تھا - شیر بڑے رعب داب

شان و شوکت سے درندوں کی فوج لے کر آتا ہے اور تخت شاہی
وہ افروز ہوتا ہے - اس کے بعد شاعر نے ہر درندے کی خصوصیت
اس کے لباس وغیرہ کی کیفیت بڑے مزے سے بیان کی ہے - مثلاً بادشاہ
) کے کرسی نشین ہوتے ہی ریچھ اپنی خاکی (دھنویں کے رنگ کی)
ے پہن کر چوبداروں کی طرح آکھڑے ہوے - پلنگ اور چیتے
اپنی خوشنما بیل بوٹوں کی پوشاک پہن کر آے - بھیڑیے صوف کے
د زیر بر کیے ہوے تھے - خارپشت ترکش لگاے آیا - لومڑی خوب
نور کر آی اور اپنی چوٹی کی دم کو پھندنے سے اراستہ کیے
تھی - سیہ گوش کلاہ پہنے اور صوف پوش نظر آتے تھے - خدا ترس
(چرخ) ہڈیاں ڈھونڈتے ہوے تشریف لاے - جب سب جمع ہو گئے
بیاباں شغال نے صلاے دعوت دی اور اب کوے، کتے، چیلیں، گدیں
ہ بھی حاضر ہو گئے - میدان جنگ جو مغل فوج کی لاشوں سے سفرۂ
نما ہوا تھا - اس پر وہ سب ٹوٹ پڑے - شاعر نے اس مقام پر اُن
یلوں اور خوش فعلیوں کی بھی تصویر کھینچی ہے اور یہ بھی
ا ہے کہ کون کیا کیا کھاتا اور کس کس طرح سے کھاتا ہے - جب
، اور ہڈیاں بھنبھوڑ بھنبھوڑ کر اور خون پی پی کر بدمست ہوے
نے بجانے اور رقص وسرود کی سوجھی - سروں کے کانسوں کے
ے بناے اور اُن پر رودوں کے تانت باندھے - اونٹ کی پسلیوں
انچے تیار کیے، غرض اس طرح بہت سے ساز بنا لیے - کووں نے
خوش آوازی سے اور گیدڑوں نے اپنی الاپ سے محفل کو خوب رجھایا -
لیے بھتنیاں آتی ہیں - اپنے کپڑے اتار کر نیا لباس اور زیور پہنا -
وں کی چنریاں بنائیں، جھنڈوں کے کپڑے کھول کر تد بند بناے - ہاتھی

دانت کے کڑے اور ناخنوں کی چوڑیاں بنائیں - کچھ موتی چن چن کر گلے میں پہنے - خون کا غازہ منہ پر ملا - پاکھروں سے آئینے نکال کر آرسیاں بنائیں بہادروں کے طرے سروں پر لگائے اور اُن کی مالائیں گلوں میں پہنیں - القصہ اسی طرح آراستہ ہوکر انہوں نے اپنے رقص کا کمال دکھایا ہے - کیا خوب شعر کہا ہے —

سراپا اگن ہو بھڑکتی چلی
ادک بیجلیاں تے کڑکتی چلی

یعنے وہ سر سے پانو تک آگ ہوکر بھڑک رہی تھی اور بجلیوں سے بھی زیادہ کڑکتی ہوی چلی —

اس رقص کو دیکھ کر تمام جانور اور درندے بیخود ہو گئے - ریچھ مستی سے آپے سے باہر ہوگیا اور حال میں آکر ہر تال پر قدم چومنے لگا - چیتے کے ہوش جاتے رہے - لومڑیوں کے ہنسی کے مارے پیٹ میں بل پڑ پڑ گئے - ببر نے ناچنے والوں پر (لاشوں کی) آنکھوں کے گوہر نثار کیے - کتوں نے انتڑیوں کے ہار ان کے گلے میں ڈالے - گیدڑوں نے چربیوں کی شالیں اُڑھائیں - شیر نے خوش ہوکر سرخ مخمل کی مسند انعام میں بخش دی - جب جشن قریب ختم ہوا تو سب نے بادشاہ (علی عادل شاہ) کے اقبال و دولت کے گیت گائے —

یہ بیان بہت پر لطف اور جدت آمیز ہے اور اس سے نصرتی کی ظرافت طبع اور بیان کی خوش اسلوبی ظاہر ہوتی ہے - رزم میں اس نے جا بجا بزم کا لطف دکھایا ہے مگر یہ بیان بہت ہی ظرافت آمیز ہے -

اس فتح کی خبر نھنے ملک کے ذریعے سے بادشاہ کے پاس بھیجی جاتی ہے - وہ وزرا کا نامہ لے کر جاتا ہے اور زبانی بھی حالات عرض

کرتا ھے - یہ نامہ دربار میں پنڈت دھرماجی پڑھ کر سناتا ھے - اس پر بہت خوشیاں منائی جاتی ھیں اور جشن کیا جاتا ھے - اور خاص خاص لوگوں یعنے شاہ ابراھیم خلف شاہ منجلے، علی رضا وغیرہ کو خلعت سے سرافراز کیا گیا —

اس کے بعد کے باب میں مغلیہ فوج کی بے سرو سامانی، تنگی، اور بد دلی اور جے سنگھہ کی پریشانی کا نقشہ کھینچا ھے - ھر طرف سے رستے بند ھیں اور رسد کے نہ پہنچنے سے سب بد دل اور پریشان ھیں —

لیا کونڈ چوندھر تے فوجاں مسند
ھوا بات تے باؤ آنے کوں بند

یعنے فوجوں نے چاروں طرف سے رستے اس سختی سے بند کر رکھے تھے کہ اس رستے سے ھوا تک نہیں آسکتی تھی —

اس بیان میں نصرتی نے سپاھیوں، بھیر و بنگاہ، گھوڑوں اور دوسرے جانوروں کی شکستہ حالی پر خوب خوب پھبتیاں کہی ھیں-

اس پریشان حالی میں جے سنگھہ کو یہ خوش خبری پہنچتی ھے کہ رسد کا بہت بڑا سامان آرھا ھے اور ھزاروں اونٹ، گدھے اور بیل لدے چلے آرھے ھیں - اس رسد کا پہنچانے والا صلابت خان (دھلوی) تھا -

سکندر ککر تھا اول ناؤں جس
خطاب آج خان صلابت ھے تس

یعنے پہلے اس کا نام سکندر تھا اور اب صلابت خان کے خطاب سے مشہور ھے —

شر زہ خان کے جاسوس ہر طرف لگے ہوے تھے

پھریا جا بجا جیوں ہے جگ میں پون
پھریں تس کے جاسوس یوں ہر رخن

یعنے جس طرح دنیا میں ہوا جا بجا پھرتی ہے اسی طرح اس کے جاسوس ہر گوشے میں پھرتے تھے —

جب شرزہ خاں نے یہ کیفیت سنی تو وہ فوج لے یلغار کرتا ہوا دشمن کے سر پر جا پہنچا - دشمن کے ہاتھ پانو پھول گئے

یدی آی کر فوج عادل سوای	سارے لشکر میں دھای مچ گئی کہ عادل
ہوی سارے لشکر میں چوندھر اوای	شاہ کی فوج آ پہنچی
پڑیا غلبلا ہو کہ یک بات میں	بات کی بات میں ایک غلغلہ پڑ گیا
سندا سا یکس سر کا یک ہات میں	ایک کی پگڑی دوسرے کے ہاتھ میں تھی
ترنگاں پہ الٹے کیتک	گھبراہٹ میں بہت سوں نے گھوڑوں پر
زین بھاے	الٹی زینیں
لگاماں بسر سوں میں	باندہ دیں اور لگاموں کی جگہ دمچیاں
دمچیاں لگاے	منہ میں لگا دیں
نہ فرصت کمر باندنے پاے کوں	نہ کسی کو کمر باندھنے کی فرصت ملی اور
نہ ہتیار لے ساندنے پاے کوں	نہ ہتیار باندھنے کا موقع ملا -

غرض بڑی گھمسان کی لڑای ہوی اور دونوں طرف کے بہادروں نے داد شجاعت دی - اس لڑای کا حال نصرتی نے بہت طویل لکھا ہے - دو ایک مقامات سے چند چند شعر نقل کیے جاتے ہیں

نپھل دھوپ میں ملکہ کھڑ کاں	روشن دھوپ سے تلواروں کی چمک نے
کی تاب	مل کر یہ

ہوا موج زن ہو کہ دریا سراب	کیفیت پیدا کی کہ گویا سراب کا دریا لہریں مار رہا ہے۔
ہوا کا پھریا عکس کھڑگاں تے روپ مگر کسوت ابرک لیے پین دھوپ	تلواروں کی چمک کا عکس جو ہوا پر پڑا تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ دھوپ نے ابرک کا لباس پہن رکھا ہے
ترنگاں کے تل تے دھولا راں اوٹھیا ہکاتاں کی ہردم تے بارا چھوٹیا گگن کی اگیٹی پہ جا پڑ کہ گرد کری داب انگارے کوں سورج کے سرد	گھوڑوں کے نیچے سے گرد و غبار اٹھا اور پیہم نعروں سے ایک آندھی اُٹھی آسماں کی انگیٹھی پر اتنی گرد جاکر پڑی کہ سورج کا انگارا دب کر ٹھنڈا پڑ گیا

لڑائی کا سماں دیکھئے

دونوں صف کے میانے بڑا دھم ہوا ادک دیکھ غوغا فلک کم ہوا	دونوں صفوں کے درمیان بڑا تہلکہ پڑا کثرت شور و غوغا سے فلک کے کان بہرے ہو گئے
غاولیاں کے جھینڈ و زنبوریاں کوں دات نپٹ دم نکلنا رہیا موں کی بات	گولوں اور توپوں کے ہجوم کی وجہ سے منہ کے رستے صرف دم نکلنا باقی تھا
دسے عکس جوشن تے ابلق ہوا فرنگاں کے پرتو تے ہوی شق ہوا	جوشن کے عکس سے ہوا ابلق نظر آتی تھی اور تلواروں کے پرتو سے ہوا شق ہوگئی۔
برسنے لگے ماکھ ات تیر و تیغ رگت کا چ برسات ہو برق و میغ	تیر و تیغ ، برق و بادل بن کر خون کی بارش برسانے لگے
ہر یک تیغ تے آگ جھڑ بے شمار سلاحاں ہوے لعل جلبل انگار	ہر ایک تلوار سے بے شمار آگ جھڑنے لگی اور ہتیار جل بل کے لال انگارے ہو گئے
لیے آگ چنگیاں تے بھالیاں کے بانس	بھالوں کے بانسوں میں چنگاریوں سے آگ لگ اٹھی

جلیں تیر دستے ہو پولیاں کی گھانس	اور تیر گھاس کے پولوں کی طرح جل رہے تھے
ہوا پر کھڑے ڈونگراں ہو کہ ڈھول	پہاڑ ہوا پر ڈھول بن کے کھڑے تھے '
شراریاں کے رُکھہ لہو کی چھٹکاں سوں پھول	شراروں کے روکھہ لہو کی چھینٹوں سے پھول بن گئے تھے
رگت بھوئیں پہ جم جا ہوا پر دھواں	خون زمین پر جم گیا اور دھنواں ہوا پر '
زمیناں ہویاں آتہ دس آسماں	اس سے زمینیں آتھہ ہوگئی تھیں اور آسمان دس -

چند اشعار کے بعد تیغ کی دو رنگی کو کیا خوب بیان کیا ہے -

جو ہے تیغ میں آب و آتش نہاں	تیغ میں آب و آتش کی جو دونوں خاصیتیں
دونوں کی بی صورت ہوئی تب عیاں	پوشیدہ ہیں وہ اب ظاہر ہوئیں
کریں وار تو تب جھڑے آگ دات	وار کرنے میں اس سے آگ جھڑتی ہے اور آب کی
ڈبے جیو پانی نے کرنے میں کات	کاٹ سے جانیں ڈوب جاتی ہیں

تلوار ہی کے متعلق پھر لکھتا ہے

فرنگ اژدہا ہو دم آتشیں	تلوار اژدہا ہو کر اپنے دم آتشیں سے
چھٹکنے لگیا اگ دندیاں پر یقیں	دشمنوں پر آگ برسانے لگی
برستے وجوداں پہ کھڑکاں کا آب	تلواروں کا پانی جب غنیم پر برسنے لگا تو
رگاں تے لراں بہ چلیا خون ناب	ان کی رگوں سے خون ناب کی لہریں چلنے لگیں
لگے دینے سنمکہ ہو شمشیر و تیر	تلوار اور تیر ایک دوسرے کے روبرو ہوکر
سوالاں جواباں یکس یک توں پھیر	ایک ایک کے سوال کا جواب دینے لگے -

اس خونخوار جنگ کا نتیجہ یہ ہوا کہ دہلی کی فوج کو شکست ہوی اور صلابت خاں میدان جنگ میں قتل ہوا - یہ سن کر جے سنگھہ کے دل پر جو بنی وہ نصرتی اِن الفاظ میں بیان کرتا ہے ـــ

سونیا سوچ یو بات بیٹھی کمر	یہ سنتے ھی اس کی کمر ٹوٹ گئی، افیوں
گئی سوں کہتا ہو کہ افیوں اتر	کا نشہ اُتر گیا اور سنہ سیٹھا ہو گیا
چھپیا روز روشن اندھارا پڑیا	روز روشن چھپ گیا اور اندھیرا چھا گیا
فلک ٹٹ کہ جیوں سر پہ سارا پڑیا	اور اس کے سر پر آسمان ٹوٹ پڑا
رین دل میں ہو چک تے تارے توٹتے	دن میں رات چھا گئی، آنکھوں سے تارے ٹوٹ کے
سلگ آگ انجو تھار انکارے توٹتے	گرے اور بجاے آنسووں کے انکارے گرنے لگے
ھوا حال جیوں رکھ کے تورے پہ بیخ	اس کا حال اُس درخت کا سا ھو گیا جسے جڑسے
طناباں ستے سب اوکھارے یہ میخ	اُکھاڑ ڈالیں یا اُن طنابوں کا سا جن کی میخیں اُکھڑ جائیں
نہ ڈیرا کھڑا رہ سکے پانو گاڑ	ایسی حالت میں ڈیرا کھڑا رہ سکتا ھے
نہ قائم رھوے توں اپس لے کہ جھاڑ	اور نہ درخت اپنے آپ کو قائم رکھ سکتا ھے

اس جنگ میں نصرتی نے شرزہ خاں کے نوجوان بیٹے مخدوم شاہ کا بھی ذکر کیا ھے جو میدان جنگ میں بڑی بہادری سے لڑا —

مغلوں اور بیجاپوریوں کی جنگ میں اب ایک نیا واقعہ پیش آتا ھے - سلطان عبداللہ قطب شاہ نے سلطان علی عادل شاہ ثانی کو خط لکھا کہ ھمیں معلوم ھوا ھے کہ راجہ (جے سنگھہ) آپ کی قلمرو میں گھس آیا ھے اور شرارت و فساد اور نا سزاوار حرکتیں کررھا ھے لہذا ھم چاھتے ھیں کہ آپ کی مدد کے لیے اپنی فوجیں بھیجیں- علی عادل شاہ نے اس مدد کو قبول کیا- چنانچہ جواب پہنچتے ھی گولکنڈہ سے نیکنام خاں کی سرکردگی میں قطب شاھی لشکر روانہ ھوا - جب بیجاپور کے قریب پہنچا تو وزیر سلطنت عبدالمحمد ممتاز سرداروں اور چیدہ سپاہ کے ساتھہ استقبال

کے لیے چلا - قطب شاہی اور عادل شاہی لشکر باہم ملتے ہیں اور ہر دو لشکر کے سردار ملاقات کرتے ہیں- عبدالمحمد نے بادشاہ کی طرف سے نیک نام خاں اور دوسرے سرداروں کو خلعت ہاے فاخرہ دیے- دونوں لشکر مل کر بلدۂ بیجاپور کی طرف چلے- سلطان نے علی برج سے ان کا نظارہ کیا اور سلامی لی- اس کے بعد بادشاہ نے عبدالمحمد کو حکم دیا کہ نیک نام خاں کو بارگاہ سلطانی میں حاضر کرے- چنانچہ نیک نام خاں اور اس کے ساتھہ کے سرداروں نے حضوری کی عزت حاصل کی اور شاہی نوازشوں اور خلعتوں سے سرافراز ہوے —

نصرتی نے اس واقعہ کو بڑے دھوم دھام سے بیان کیا ہے —

اب دونوں لشکر متحد ہوکر جے سنگھہ پر دو طرف سے حملہ کرتے ہیں اور اسے پائمال کرنے پر تلے ہوے ہیں - جے سنگھہ کی حالت بڑے خطرے میں —

نصرتی نے اس باب کی تمہید طلوع آفتاب اور صبح کے ظہور سے شروع کی ہے جو بہت دلکش شاعرانہ انداز میں ہے - (اسے میں کسی دوسرے موقع پر نقل کروں گا) - بادشاہ تخت پر جلوہ افروز ہوتا ہے، تمام وزیران مملکت و سرداران لشکر حاضر ہوتے ہیں - بادشاہ مخاطب ہوکر اُن کو لڑنے مرنے، شجاعت اور جان نثاری دکھانے اور غنیم کی فوج کو تباہ و برباد کرنے کی ترغیب دیتا ہے- وہ وفاداری اور جان نثاری کا ادعا کرتے ہیں اور دشمن کو شکست دینے اور ملک سے نکال دینے پر کمر ہمت باندھتے ہیں- اس کے بعد شاعر دونوں فوجوں کے کوچ کی شان دکھاتا ہے- مگر اس کے ساتھہ ہی وہ مغلوں کی فوج اور شجاع سپاہیوں کی شکل و صورت اور بہادری کا نقشہ

بھی کھینچتا ھے - مثلاً لکھتا ھے —

که هر مرد جیون کوہ البرز ھے تبر کس کے ھت کس کے جم گرز ھے
کتیاں کا تو تیر و کماں اصل ساز کمنداز کوی نیزہ کوی تیغ باز
دھرنہار هر مرد کو ته امید دل رستم و جسم دیو سفید
نہ آتش کدہ تے شکم اُن کے کم جو لکھه میں پڑیا سو گیا هو بھسم
شراب ان کوں یک مشک تھوڑا دسے سہج نقل دنبے کا جوڑا دسے
تراش اپنی داڑی مچھیاں دے که چھوڑ کریں سوں بچھو ڈانک ڈالی سوں توڑ
کہاں آپکڑ نے کے سکتا ھے فن اینو پاس تے ارجن ولچھمن
تو کا ھے جنن تیر کا تیر بخش جنن خنگ کن کرہ رستم کا رخش
کریں گر کشش رستمی لے کماں رگ و پے توتیں کڑکڑیں استخواں

یه درپردہ اپنی بہادری کی تعریف ھے جو ایسے بہادروں کو شکست دیتا ھے —

یه بہت سخت لڑائی تھی اور حقیقت میں جے سنگھه کو بڑی مشکل پڑ گئی تھی - نصرتی نے بھی اس کا بیان بڑی شان سے لکھا ھے - اگرچه نصرتی اور عادل شاھی مورخوں نے اپنی فتح لکھی ھے لیکن واقعه یه ھے که بڑی شدید جنگ ھوی دونوں طرف کے لشکروں نے داد مردانگی دی ' آخر میں جے سنگھه کی فوج نے دکھنی لشکر کو مار کر بھگا دیا - مگر اس میں جے سنگھه کی بھی کوئی نمایاں فتح نہیں پائی جاتی ھے یعنے دشمن کو ھٹا کر بھگا تو دیا مگر اس سے اُسے کچھه حاصل نه ھوا —

نصرتی مغلوں کی نامردی اور دکھنیوں کی بہادری کو اس طرح بیان کرتا ھے —

مغل کی ہے تلوار دکھنیاں پہ یوں	مغلوں کی تلوار دکھنیوں کے سامنے ایسی ہے
تبر سامنے جیونکہ انگلی کے نہنوں	جیسے تبر کے سامنے انگلی کا ناخن -
لگت دس ہتوڑیاں کہڑی کر سونار	سنار تان تان کر دس ہتوڑیاں
ادک دس تے ہوے یک جو مارے لوہار	مارتا ہے لیکن لوہار کی ایک اُس کی دس سے بڑھ جاتی ہے -

اگرچہ نصرتی نے فتح دکھنیوں ہی کی لکھی ہے لیکن اس جنگ کی شدت اور دکھنی فوج کی بہپتا کا اُس نے بھی اعتراف کیا ہے - چنانچہ لکھتا ہے کہ جب جے سنگھہ کی فوج نے زور سے حملہ کیا اور میدان جنگ میں قیامت برپا کردی تو دکھنیوں کے اوسان خطا ہوگئے

بہت آپڑی اہل اسلام پر کوڑی فکر ادک خاص ہور عام پر
کٹھن حال پا خان شرزا نوی کر اپنی کہڑک کو عصا موسوی

جے سنگھ کی فوج میں جادو راؤ اور کیسری سنگھ کا اور عادل شاہی فوج میں شرزہ خاں، خواص خاں، بہلول خاں اور عبدالمحمد کا خاص طور پر ذکر کیا ہے —

بہر حال نصرتی اور عادل شاہی مورخوں کے بیان کے موافق دکھنیوں کی فتح ہوی - آخر میں میدان جنگ میں درندوں کے آنے اور لاشوں کے کھانے کا تماشا دکھایا ہے —

اس کے بعد ایک اور لڑائی ہوتی ہے - بہلول خاں، شرزہ خاں، خواص خاں فوجیں لے کر جاتے ہیں - بہلول خاں ایک طرف لڑ رہے تھے اور شرزہ خاں اور خواص خاں دوسری طرف - ان دونوں کے مد نظر غنیم کے خاصے کی فوج تھی

ولے خان شرزا و خان خواص
نظر میں رکھے فوج خاصے کی خاص

دونوں طرف کے لشکر ایک دوسرے کے انتظار میں تھے - یہ چاھتے
کہ غنیم بڑھ کر میدان میں آے اور وہ اس کے منتظر تھے کہ دکھنی
، آکر حملہ کریں - غرض اس انتظار انتظار میں شام ہوگئی تو
زہ خاں اور خواص خاں ناچار اپنے ڈیروں کو واپس چلے - دونوں
تھہ ساتھہ جا رہے تھے - جہاں جہاں میدان ھموار آتا یہ دونوں
'بر برابر رھتے اور جہاں نشیب و فراز اور درخت آجاتے وھاں
ے دوسرے سے جدا ھو جاتے - ایک ایسے ھی موقع پر جب خواص خاں
لشکر کے ساتھہ ایک طرف چلا گیا اور شرزہ خاں دوسری سمت
اتفاق سے لشکر غنیم کی ایک جماعت اُدھر سے گزر رھی تھی -
زہ خاں کے بیٹے سید حبیب کی نظر اُن پر پڑی - اگرچہ خورد سال
لیکن بہادری اور شجاعت میں کسی سے کم نہ تھا ' بے کہے سنے
ے اُن پر جا پڑا اور شمشیر زنی کے جوھر دکھانے لگا - شرزہ خاں
جو نعرۂ جنگ کی آواز سنی تو گھوڑا جھپٹا کر پہنچا - دونوں نے
بھڑ کر اس جماعت کو بھگا دیا - دونوں خوشی خوشی پھر اپنے
.وں کی طرف روانہ ھوے - تھوڑی دور چلے تھے کہ یک بیک
زہ خاں اپنے گھوڑے سے گر کر زمین پر آ پڑا - دیکھا تو روح پرواز
چکی تھی —

عتؔ کے تب گھر میں ماتم ھوا	اس سے شجاعت کے گھر میں ماتم بپا ھوا - اس
میں بڑا جس پہ یے غم ھوا	پر کبھی ایسی آفت نہیں آی تھی
ل میاں کے بیٹھہ کونے منیں	تلوار میاں کے کونے میں بیٹھہ

گنوانے لگیا آب رونے منیں	رو روکر اپنی آب گنوانے لگی
زرہ کے پڑے دل پہ کئی دکھہ کے چھید	زرہ کے دل میں دکھہ سے چھید پڑ گئے
کیا روکہ جوشن نے دیدے سفید	اور جوشن کی آنکھیں روتےروتے سفید ہوگئیں
ترنگاں کو پیدا ہوا عذر لنگ	گھوڑوں کو عذر لنگ پیدا ہوا
پکڑنے منگے نعل سینیاں میں زنگ	اور نعلوں کے سینوں پر زنگ لگ گیا
رهیا سوں میں عالم کے ہو تلخ آب	اهل دنیا کے منہ میں پانی کڑوا معلوم ہونے لگا
لگے زہر چاکھے تو کوئی شہد ناب	اور خالص شہد زہر لگنے لگا -

اسی رنگ میں اور چند شعر خان مرحوم کے ماتم میں لکھے ہیں - لیکن ان سب میں تصنع اور آورد پای جاتی ہے - خصوصاً " ترنگان کو پیدا ہوا عذر لنگ " بہت ہی بے محل اور مبتذل ہے —

علی عادل شاہ کو جب اس حادثے کی خبر پہنچی تو بہت افسوس ہوا اور اُسی وقت خان مرحوم کے دونوں بیٹوں (سید مخدوم و سید حبیب) کو خطاب شرزہ خانی اور منصب و دولت سے سرافراز کیا -

اس کے بعد آخری جنگ کا بیان ہے جس میں بہلول خاں اور شرزہ خاں کے دونوں بیٹوں نے بڑی بہادری دکھاتی - اس جنگ کی کیفیت بھی ویسی ہی ہے جیسے اس سے پہلے کی لڑائیوں میں بیان ہو چکی ہے - فوج کے کوچ کے متعلق لکھتا ہے

چڑیا ہم سوں جھگڑے کے لینے میں باؤ	ترنگاں میں تیزی سواراں میں تاؤ
گرجتیں و بجتیں نقارے و بہیر	گرجنے لگے مست ہو نرہ شیر
فلک پر صدا تے ہوا کاج باج	زمیں پائی خوش نقش نعلاں کی تاج
رنگا رنگ ڈھالاں دیکھت اہل ہوش	کہے آج ہوی ہے ہوا دلق پوش

پھر لڑائی کا ذکر اسی زور شور سے ہے اور غنیم کی شکست پر

خاتمہ ہے - نصرتی اور عادل شاہی مورخوں کا بیان ہے کہ اس ہزیمت کے بعد جے سنگھ نے مقابلے کی ہمت نہ کی اور اپنے ملک کو واپس چلا گیا -

چلے کہا کے اوس دن تو ایسی شکست　　لگے ملک دھلی تلک یک وو رست
نہ آب اون کوں میداں میں پینے دیے　　سراب اون پہ جمنا کا پانی کیے

مغلوں سے یہ لڑائی علی عادل شاہ ثانی کے عہد کی آخری جنگ تھی- اس کے بعد ہی علی عادل شاہ کا انتقال ہوگیا - یہ لڑائی سنہ ۱۰۷۶ میں ہوی اور علی عادل شاہ کی وفات سنہ ۱۰۷۸ ع میں -

آخری باب میں جو کتاب کا خاتمہ ہے بادشاہ کی مدح اور علی نامہ کا ذکر خیر ہے - باب کے عنوان کا شعر یہ ہے

صفت شعر علی نامہ و خوش ختم کتاب
مدح عادل کا کہ ہے جس پہ عطا جس یو نول

اس کے بعد بادشاہ کی مدح میں دو شعر لکھنے کے بعد لکھتا ہے کہ

فلک پر نوا کام جیوں خواب ہے　　نر ہے یاد جو نقش بر آب ہے
ہنر مند ہوتا ہے تا بے نظیر　　کرے نقش کوں اُس پتھر پر کی کیر

(کیسا ہی نیا کام ہو وہ مثل خواب کے ہے - جو بات یا کام یاد نر ہے (محفوظ نر ہے) وہ نقش بر آب ہے - مگر جب کوئی باکمال ہنر مند آتا ہے تو اُسے پتھر کی لکیر بنادیتا ہے)—

روش ہے کہ گرچہ طبائع کا رکھہ　　کریں بار ور دیکھہ شاہا نیچ سکھہ
ولے تا ابد اس کے پھل کا سواد　　دیوے ان کے جینے کی خوبی کی داد

(اگرچہ یہ عام قاعدہ ہے کہ طبیعت کا شجر بادشاہوں سے آسائش پاکر بارآور ہوتا ہے لیکن اس کے پھل کا مزہ ابد تک رہتا ہے اور ہمیشہ ان کی زندگی کے کاموں کی داد ملتی رہتی ہے)

اُسی بختور کے هیں طالع دوگن که صاحب سخن کوں منگیا سب تے چن
سخن ورنه ملتا هے بختوں کے باج ملیا جس سو پایا ابد لگ رواج

(اُسی صاحب نصیب (بادشاہ) کے طالع بڑے هیں جس نے سب لوگوں میں سے صاحب سخن کو انتخاب کیا یعنے جس نے شاعر کو اپنا منظور نظر بنایا - ورنه سخن نصیبوں سے ملتا ہے اور جسے ملا اُس کا نام ابد تک قائم رہا)-

بزرگی تو هے جان هور جسم کی بڑائی پن استے ادک اسم کی
سخن ورتے رہ گئے زمانے میں یاد فریدوں کیا نہیں تو کیا کیقباد
صفت کر گیا کر سخن آفریں اجھوں لگ هے رستم پہ نت آفریں

(یوں تو بزرگی جسم و جان سے ہے لیکن اس سے بھی بڑہ کر بزرگی نام کی هے - فریدوں اور کیقباد کے کارنمایاں سخنور کی بدولت زمانے میں یادگار رہ گئے - یه سخنور کی هی تعریف کا طفیل هے که اب تک رستم پر همیشه آفریں کی جاتی ہے)-

اس کے بعد کہتا ہے کہ اس جنگ نامه میں میں نے هر ایک کے کام کی داد دی اور ان کی محنت و مشقت کو سراہا هے اور جن جن کا نام میں نے لکھ دیا ہے وہ دنیا میں ابد تک مقبول و معزز رهیں گے -

لیا ناﺅں جس بختور کا نواز رهیا تا ابد جگ میں وو سر فراز
معزز جو تھے لوگ شه کے پسند کرم هور عنایت سوں اقبال مند
اوسی نامداراں میں میں تھانوں تھانوں لیا هوں کیتک نیک بختاں کے ناﺅں
بهوت تھار تجویز سوں کر تمیز مشقت کیا کام کاراں کی چیز

پھر چند شعر اس تاریخ کی تحریر کے متعلق لکھتا ہے اور کہتا هے

کہ میں نے اکثر بڑے کام نہیں چھپائے اور جو جو ضروری باتیں تھیں وہ سب بیان کردیں - اس میں میں نے کسی کی رو رعایت نہیں کی بلکہ ھمیشہ حق کو پیش نظر رکھا اور کسی کے کام کو ضائع نہیں کیا ' خصوصاً شرزا خاں شہید کے نمایاں کام ' جس نے بہت بڑی جاں نثاری کی - اس بیان کو نصرتی کے اشعار میں ملاحظہ کیجئے —

بڑے کام اکثر رکھیا نہیں نہاں ضروری جو تھے سو کیا کر بیاں
نظر میں خدا کاچ نت حق رکھیا رعایت نے دور اپسے مطلق رکھیا
جکچھ تھیا سو اکثر کہیا بے ریا نہ ضائع کیا کام کس کا کیا
میرے شعر کے گھول امرت میں بات دلیراں کے ناؤاں کو بخشیا حیات
خصوصاً لکھیا جو یہ نامہ سعید کہ تو خان شرزا ھوا تھا شہید
فدا تھا وو گر شہ کے نت کام میں نبھا کر گیا کر نکو نام میں
رھنے تا ابد پاک تس روح شاد رکھیا تس کی کرتی کوں عالم میں یاد

اس کے بعد اِس مثنوی اور اپنے کلام کی تعریف میں چند شعر لکھتا ہے -

عجب فن کی بولیاں ھوں یہ مثنوی	یہ مثنوی میں نے عجیب و غریب لکھی ہے اور
کہ کئی بھانت ہے اس ھنر میں نوی	اس صنف میں یہ کئی لحاظ سے نئی ھے
سنواریاں ھوں کئی بزم کی انجمن	اس میں میں نے کئی طرح کی بز میں آراستہ کی ھیں
کھیلا یا ھوں خوش رزم کے پھولبن	اور رزم کے کئی چمن کھلائے ھیں
بھریا ھوں ھنر سوں سراسر کتاب	یہ کتاب سراسر کمالات سے بھری ھوی ھے
رکھیا ھوں نزاکت سوں سب بھر کتاب	اور نزاکت سے بھرپور ھے
قصائد لڑاایاں کے کئی معتبر	جنگ کے کئی بڑے بڑے قصیدے لکھے ھیں اور ان میں
یکیک وقت بولیا جو تھا سربسر	وھی لکھا جو حقیقت میں واقع ھوا تھا
نوی طرز کوں میں جو تزئیں دیا	میں نے جدید طرز کو زینت دی ھے

کیتک بر محل ووچ تضمین کیا	اور اسے بر محل استعمال کیا هے
پکڑ اصل تاریخ لکھتیاں کی چال	میں نے مورخیں کے اصول کی پیروی میں
لکھیا قصه در قصه میں حسب حال	واقعات کو حالات کے مطابق لکھا هے
لڑای کی هر بیت یو بے گماں	اس میں لڑائی کی هر بیت بلا شبه
سپاهی کو تعلیم خانه هے جان	سپاهی کے لیے گھر بیٹھے تعلیم کا کام دیتی هے
ملوکاں کی مجلس کا یو ساز هے	یه بادشاهوں کی مجلس کی زینت هے
وزیراں کوں سوندل کا انداز هے	اور وزیروں کے لیے جنگ کا انداز هے
نهیں کس لطافت میں یو بات کم	یه کسی خوبی میں کم نهیں ' خدا
الهی اچھوپن به مقبول جم	کرے یه همیشه مقبول هو -
کهیں سب بی معشوق کا حسن و ساز	کهیں میں نے معشوق کے حسن و آرائش کو
دکھایاهوں میں دهن کا صورت میں ناز	دکھایا هے اور اس کی صورت میں ناز کا نقشه کھینچا هے
طبیعت کا هر تھار دکھلا کے کس	هر مقام پر میں نے طبیعت کا زور دکھایا
ستیا ایکے کا نقدے کا رس سب بکس	هے اور گنے کا رس لے کر باقی پھوک پھینک دیا هے
نظر رکھه کے هر بات کے مغز میں	میں نے هر بات کی لطافت پر نظر رکھی هے
لیا بھید معنیاں کے	اور معنی کے مغز میں پهنچ کر اس کے اسرار
جا مغز میں	کو حاصل کیا هے
گلاں سیتی گفتار کی بے حساب	میں نے پھولوں کا بهت کچھه ذکر کیا هے
خلاصه لیا کاڑ یعنے گلاب	اور ان کا نچوڑ یعنے گلاب نکال لیا هے -
خیالاں میں ات موشگافی کیا	خیالات میں میں نے بڑی موشگافی کی هے
جو باریک تھا اُس میں صافی کیا	اور جو بهت دقیق تھے انهیں صاف کردیا هے
مضامین سوں جا بجا بات بول	میں نے جا بجا مضامین پیدا کیے هیں
دیکھایا سکت فیض کا حق کی کھول	اور فیض حق کی قدرت کو کھول کر دکھایا هے-

اسی ضمن میں نصرتی نے ایک بات خوب نکالی ہے کہ وہ کہتا ہے کہ محمود غزنوی نے بہت بڑی مثنوی لکھوائی لیکن خود محمود میں وہ کمالات اور جوہر نہ تھے جو دنیا کے نامور لوگوں میں ہوتے ہیں اس لیے دوسروں کی مدح لکھوانی پڑی۔ لیکن میرا بادشاہ ایسا ہے کہ اس نے اپنے کارنمایاں لکھوانے کے لیے فرمایا اور اب مجھہ پر لازم ہے کہ میں اپنا ہنر ایسا دکھاؤں کہ ہر بیت پر لاکھوں خزانے ملیں۔تب عجب نہیں کہ یہ دیکھہ کر فردوسی کی روح شاد ہو اور اپنا غم بھول جاے —

عجب کیا کہ فردوسیء پاک زاد
اپس غم بسراب کرے روح شاد

پھر بڑے فخر کے ساتھہ اس مثنوی کو (جسے وہ شاہنامہ کے نام سے موسوم کرتا ہے) دکن کی جان کہتا ہے

کتا ہوں سخن مختصر بے گمان
کہ یو شاہنامہ دکن کا ہے جان

جن صاحبوں نے اپنی تحقیق میں اسے "شاہنامۂ دکن' لکھا ہے وہ نصرتی کے اس شعر کو نہیں سمجھے —

آخر میں خود ہی کتاب کا سنہ تصنیف بتا دیا ہے

لکھیا شہ کا میں جس جو یو کر اوس
ہزار یک ہو ستر پہ تھے چھے برس

یعنی ۱۰۷۶ ہجری —

اگرچہ نصرتی نے کئی بار کتاب کے دوران میں اس مثنوی کو "فتح نامہ' سے موسوم کیا ہے لیکن درحقیقت اس کا نام "علی نامہ"

هی هے - سب سے ابتدای دو شعروں میں جو کتاب کا عنوان هیں نیز آخری باب کے عنوان میں وہ اسے "علی نامه" کهتا هے —

اس میں شبه نهیں که نصرتی کی یه مثنوی نه صرف قدیم دکهنی اردو میں بلکه تمام اردو ادب میں اپنی نظیر نهیں رکهتی - اس پر جو اس نے بار بار فخر کیا هے تو کچهه بیجا نهیں - خاتمے پر میں اس کے چند فخریه اشعار سنا دینا چاهتا هوں —

کیا میں بچن بیل کو یوں بڑی	میں نے سخن کی بیل کو یهاں تک بڑهایا
بڈی سو فلک کاچ منڈوا چڑی	که وہ فلک کے منڈوے پر جا چڑهی
چندر هور ستارے رهے دیکهه بهول	چاند اور ستارے میرے مضامین معانی
مضامین معنیاں کے مجهه پهل و پهول	کے پهل اور پهول دیکهه کر دنگ رہ گئے
یک یک قصه بولیا هوں جس تهار آ	جس جس مقام پر جو جو قصه میں نے
دکهایا هوں مجلس وو نظراں میں لا	کها هے اس کی تصویر نظروں کے سامنے کهینچ دی هے
سنواریا هوں کر فهم کی حاتمی	میں نے فهم و فراست سے هر رزم و بزم
هر یک رزمیه بزمیه رستمی	کو بڑی شان سے سنوارا هے
سنے پر یو خوش طرز مردانه قال	اس خوش طرز مردانه قال کے سننے پر
اُبل شوق هوے شیر مرداں کو حال	فرط شوق سے شیر مردوں پر حالت طاری هوگی
سخن میں نه هوے یو کرامت جالک	کلام میں جب تک یه کرامت نه هو اس وقت تک
کوانا نه هرگز سخنور تلک	اپنے کو سخنور کهلانا سزاوار نهیں -
میری بات میں لات نیں بے خلات	میری بات میں هرگز لات نهیں هے ' لات
که نادان کا هے هنر عین لات	مارنا نادان کا هنر هے -
که یو شعر میں آج اس دهات سات	که میں نے آج اس طرز کے شعر
کهیا سو بڑے دبدبے کے سنگات	بڑی شان کے ساتهه کهے هیں

کسی کا بی نا ھات انپڑ نا ککر	میں نے انھیں طاق گردوں پر لیجاکر رکھا ھے
رکھیا ھوں بی طاق گردوں اُپر	جہاں کسی کی رسائی نہیں ھو سکتی

دیکھئے ذیل کے اشعار میں وہ ھندی اور فارسی رزمیہ کا ذکر کس عنوان سے کرتا ھے —

کیا میں تو قطع نظر لات سوں	میں نے تو خیر لات سے قطع نظر کی ھے لیکن
ولے داد ھے اھل انصاف سوں	اب انصاف اھل انصاف کے ھاتھہ میں ھے
کہ کیوں میں پکڑ آج بھانت ایک نوی	کہ کیوں میں نے آج ایک نئی طرز اختیار کی
زبوں بات کوں کر دکھیا یا قوی	اور ادنی بات کو اعلی کر دکھایا
اگر کوئی معنی کوں کروا رسی	اگر کوئی مغز معنی کو پہنچے اور ھندی
پڑے رزمیہ ھندی و فارسی	اور فارسی رزمیہ مثنویوں کو پڑھے
اگر اوھے کامل سمج کا دھنی	اور اگر وہ فہم و ذوق میں کامل ھے تو
تو اس یک سوں ھوے دو ھنر کا غنی	اِسے پڑہ کر دونوں کی خوبیوں کا مزہ پاے گا
کہ دونوں کی خوبی مجھہ انکھیاں میں آن	دونوں کی خوبیاں میری نظر میں ھیں اور
خلاصہ نکالیا ھوں خوش مایہ چھان	میں نے دونوں کی خوبیوں کا عطر نکال لیا ھے
رتن دیکھہ لیتے ھیں صاحب نظر	صاحب نظر جواھر کو پرکھہ لیتے ھیں
کہ اندھلے کنے کیا رتن کیا پتھر	اندھے کے آگے پتھر اور جواھرات دونوں برابر ھیں

فصاحت کے ساتھہ مضمون یا خیال کے ھونے کو لازم قرار دیتا ھے کہ اس میں کلام کا حسن ھے اور پھر کہتا ھے کہ میں نے اِس مثنوی میں دونوں کا خیال رکھا ھے —

بزرگی ھے ھندی میں اکثر سکای	ھندی میں اکثر بزرگی سکھائی گئی ھے
وگر نیں تو مضمون کی	اگر یہ نہیں تو مضمون کی بڑائی کہاں رھی'
کا بڑای	یعنے مضمون ھی کی بلندی سے کلام ھندی کی بزرگی ھے

فصاحت ہے گر شعر کے بن کا روپ
ولے شعر کا جیو ہے مضمون انوپ
معزز ہے تن جیو دھرتا ہے جو
نہ بیجاں کی صورت کوں پینا ہے دھو
اچھے کات کا گرچہ پتلا سدنگ
نہ کام آدمی کے سکے کر اپنگ
کہ میں فتح نامہ لکھیا ہوں سو آج
نہ اکثر کیا بات مضموں باج
نظر میں مری جاں دسیا کچھ بھی کام
سخن کی کیا دیکھ جھڑتی تمام
گھڑیا ہوں سلامت سوں یک یک بچن
مضامین کی مد میں اوتیا رتن
نکالیا ہوں کے نگ طبیعت کے اوت
دیا خوب سورج کے مہرے کی جوت

اگرچہ فصاحت شعر کے چمن کا روپ ہے
لیکن مضمون کی ندرت اس کی جان ہے
جسم وہی معزز ہے جس میں جان بھی ہے ورنہ
بیجان صورت کوئی دھو کے پیے ؟
کات کا پتلا کیسا ہی خوبصورت ہو وہ
آدمی کے سے نادر کام نہیں کر سکتا
میں نے جو یہ فتح نامہ لکھا ہے ، اس میں
میں نے اکثر بغیر مضمون کے بات نہیں کی
جہاں کہیں میں نے کوئی کام کی بات دیکھی
تو سخن کا پورا جائزہ لے کر اُسے ادا کیا
ایک ایک بات میں نے بڑی سلامتی سے کہی ہے
اور مضامین کی مد میں جواہرات ڈھونڈ کے نکالے ہیں
طبیعت کے جواہر کھود کھود کے نکالے ہیں اور
انہیں سورج کے مہرے کی جوت دی ہے -

(باقی آیندہ)

کھڑی بولی

از

(جناب پنڈت منوھر لال زتشی صاحب ایم-اے)

رسالۂ اردو کے جنوری سنہ ۱۹۳۴ کے نمبر میں میرا ایک مضمون " بعض غلط فہمیاں " کے عنوان سے شایع ہوا ھے - اس میں میں نے کھڑی بولی کے متعلق لکھا تھا کہ یہ ھندی کی ایک شاخ ھے اور اس بیان کے ثبوت میں پریم ساگر کا ایک اقتباس پیش کیا تھا اور ھندی کی چار مستند تصانیف کا حوالہ دیا تھا - میرے مضمون کے آخر میں اڈیٹر صاحب کا ایک نوٹ شایع ھوا ھے جس میں وہ فرماتے ھیں —

" اردو کے تبصرہ نگار کی راے میں کھڑی بولی سے مراد وہ بولی ھے جو شستہ اور ادبی زبان نہیں - یعنی اس لفظ کا استعمال شستہ اور ادبی زبان کے مقابلہ میں ھوتا ھے- آج کل بھی یہ لفظ انہیں معنوں میں یعنی گنواری بولی کے لیے بولا جاتا ھے- یہ کوئی خاص زبان یا کسی زبان کی شاخ نہیں ھے - للوجی لال نے بھی غالباً انھی معنوں میں یہ لفظ استعمال کیا ھے یعنی وہ بولی جو شستہ نہ تھی اور شاعری

میں استعمال نہیں ہوتی تھی - یورپی محققوں کو اس سے
مغالطہ ہوا اور انہوں نے اسے ایک خاص زبان قرار دیا .
جن مصنفوں کا حوالہ فاضل مضمون نگار نے دیا ہے انہوں نے
بھی یورپی محققوں کی تقلید کی ہے "

مجھے یہ نوٹ پڑھ کر بڑی حیرت ہوئی اس واسطے کہ جو طالب علم اسکولوں میں هندی پڑھتے ہیں وہ بھی جانتے ہیں کہ برج بھاشا کی طرح کھڑی بولی هندی کی ایک مستقل شاخ ہے - اگر کوئی هندی کا طالب علم کلاس میں یہ کہے کہ "کھڑی بولی" کے معنی ہیں گنواری بولی تو غالباً وہ اپنے استاد کے ہاتھ سے سزا پائے - مجھے اس نوٹ کے بارہ میں چند باتیں عرض کرنی ہیں

۱ - اردو کے تبصرہ نگار کی "رائے" کو واقعات کے مقابلہ میں کس طرح مانا جائے - هندی کے جاننے والے کھڑی بولی سے هندی کی ایک خاص اور مستقل شاخ مراد لیتے ہیں - یہ طرز بیان برج بھاشا سے جدا اور مختلف ہے

۲ - "کھڑی بولی" کے معنی گنواری بولی نہ کبھی تھے اور اب ہیں

۳ - جو اقتباس میں نے پریم ساگر سے پیش کیا ہے اس کے یہ نہ معنی کسی طرح نہیں ہو سکتے کہ للوجی لال پریم ساگر گنواری بولی میں یا غیر شستہ زبان میں لکھ رہے ہیں- اس کا مطلب صاف ہے - اس میں لکھا ہے کہ پہلے چتر بھج سرنے بھاگوت کے دسویں اسکند کو دوھے چوپائی میں برج بھاشا کیا اور اب للوجی لال نے دلی آگرے کی کھڑی بولی میں کہہ نام پریم ساگر رکھا - اس سے صاف ظاہر ہے کہ "کھڑی بولی" دلی اور آگرے کی بولی ہے اور برج بھاشا

سے مختلف ہے تبصرہ نگار صاحب اگر پریم ساگر کے پڑھنے کی تکلیف اُٹھائیں تو اُن کو معلوم ہو کہ پریم ساگر کی زبان نہ گنواری ہے نہ غیر شستہ —

۴ - جن مصنفوں کا حوالہ میں نے دیا تھا اور جن کتابوں کے نام میں نے لکھے تھے ان کو پڑھنے کی تبصرہ نگار صاحب نے تکلیف نہیں اُٹھائی، بغیر پڑھے فرما دیا کہ انھوں نے یورپی محققوں کی تقلید کی ہے - ان کی زبردستی دیکھہ کر ہندی کے شاعر کا قول یاد آیا -

نیا و نہ کین کین تیکرائی
بن کیلے لکھہ دین برائی

بابو شام سندر داس نے ہندی زبان اور ہندی لٹریچر کی تحقیق میں عمر صرف کردی، برسوں نہیں جگوں بنارس کی ناگری پرچارنی سبھا کے سکرٹری رہے اور اب ہندو یونیورسٹی میں ہندی کے پروفیسر ہیں - بابو دھیرندر ورما الہ آباد یونیورسٹی میں ہندی کے شعبہ کے صدر ہیں "ہندی بھاشا کا اتہاس" ان کی مشہور کتاب ہے - کوئی اردو کے تبصرہ نگار کی راے کس طرح مان لے کہ یہ لوگ ہندی زبان کے معاملہ میں خود تفتیش اور تحقیق کرنے کے اہل نہیں ہیں محض فرنگیوں کے مقلد ہیں - ان صاحبوں کی زندگی اسی دشت کی سیاحی میں صرف ہوئی اور ہو رہی ہے - ان کے مضامین ہیں، ان کی کتابیں ہیں، ہندی کے جاننے والوں میں ہندی کے لکھنے والوں میں ان کا پایہ عالی ہے، بلا کسی ثبوت اور بلا کسی دلیل کے یہ کہہ دینا کہ انھوں نے "یورپی محققوں کی تقلید کی ہے" بہادری کی بات ہے —

آخر میں صرف اس قدر عرض کروں گا کہ برج بھاشا اور اودھی

کی طرح کھڑی بولی ہندی زبان کی ایک مستقل شاخ ہے اور اس بات کو صوبجات متحدہ کے مدارس کا ہر ہندی طالب علم جانتا ہے اور ہندی کے محققوں کا اس پر اتفاق ہے اردو اسی کھڑی بولی سے نکلی ہے - اگر اردو کے تبصرہ نگار اپنی ضد پر قائم ہیں اور کھڑی بولی کو گنواری بولی قرار دیتے ہیں تو اُن کی بہادری پر اور ان کی ہمت پر صد ہزار آفریں —

کھڑی بولی

از

(جناب پنڈت ونشی دھر صاحب ودیا النکار)

بولیوں کے اکثر نام جو پڑ جاتے ھیں وہ یا تو اُس جگہ کے نام پر ہوتے ھیں جہاں وہ بولی جاتی ھیں یا اُن قوموں کے نام پر ہوتے ھیں جو انھیں بولتی ھیں - برج والوں کی بولی کو ہم برج بھاشا کہتے ھیں - پورب والوں کی بولی کو پوربی اور بنگال کی بولی کو بنگالی کہتے ھیں - اسی طرح ہم انگریزوں کی بولی کو انگریزی اور فرانسیسیوں کی بولی کو فرانسیسی کہتے ھیں —

جب ہم کھڑی بولی کا لفظ کہتے ھیں تو اس سے صاف معلوم ہوتا ھے کہ یہ لفظ نہ تو کسی جگہ کے نام سے تعلق رکھتا ھے اور نہ کسی قوم کے نام سے - پھر اس لفظ کے کیا معنی ھیں ؟

بعض لوگ انگریز محققوں کی دیکھا دیکھی اس لفظ کو کھری کہتے ھیں اور اس طرح اِس کے معنی سچی اور حقیقی لیتے ھیں - اگر یہ بولی حقیقی اور سچی مانی جائے تو پھر پرانی ھندی کے اندر اس کا ادب بہت ھی کم کیوں ملتا ھے ؟ اور پھر اگر یہ کھڑی بولی برج بھاشا وغیرہ زبانوں کی طرح ادبی حلقے میں رائج تھی تو ھندی کے قدیم شعرا

نے اِس کا ذکر تک کیوں نہیں کیا؟ امیر خسرو نے هندوی زبان کا تو ذکر کیا ھے لیکن اُس نے اس کھڑی بولی کے نام کا ذکر نہیں کیا - اور نہ کسی قدیم هندی شاعر کے کلام میں کھڑی بولی کا لفظ پایا جاتا ھے - کھڑی بولی کے لفظ کا استعمال پہلے پہل هم للو لال جی کے "پریم ساگر" میں دیکھتے هیں - اگر کھڑی بولی کے معنی حقیقی اور سچی زبان مان لئے جائیں تو پھر قدیم شعرا کے کلام میں اِس کا کچھہ نہ کچھہ ذکر تو ضرور ملنا چاهئے تھا —

جناب بابو شیام سندر داس صاحب نے هندی شبد ساگر میں "کھڑی بولی" کے بارہ میں جو کچھہ بھی لکھا ھے اُس میں یہ کہیں دکھانے کی کوشش نہیں کی کہ لفظ "کھڑی" کے کیا معنی هیں - صاحب موصوف نے صرف کھڑی لفظ کے مخرج کو انگریزی محققوں کی طرح "کھڑی" لفظ کے محاذی سوالیہ علامت ڈال کر استعمال کیا ھے - اُنھوں نے اپنی طرف سے اِس بارہ میں کُچھہ بھی نہیں لکھا - اور نہ یہ بتانے کی کوشش کی ھے کہ اُس وقت کی "هندی" کا "کھڑی بولی" نام کیسے پڑ گیا - یہ سچ ھے کہ جناب بابو شیام سندر داس صاحب نے اپنی عمر هندی کی خدمت میں صرف کی ھے اور اُن کی خدمات کی همارے دل میں عزت ھے - لیکن اس کے هرگز یہ معنی نہیں هو سکتے کہ اُنھوں نے جو کُچھہ بھی لکھا ھے اس میں غلطی کا امکان نہیں - هماری زبانوں کے بارے میں جو کُچھہ بھی تحقیقات هو رهی ھے اُس میں بہت سی ایسی باتیں هیں جنھیں با وثوق ماخذوں سے ثابت کرنا ازحد مُشکل ھے - افسوس تو اس امر کا ھے کہ یہاں کے اکثر محققین بعض اوقات آنکھہ بند کر کے وهی لکھہ دیتے هیں جو کہ انگریزی محققوں نے لکھہ دیا ھے - اور اگر کوئی نئی بات ضبط تحریر میں لاتے بھی هیں

تو اُس کے لیے کوئی معتبر سند پیش نہیں کرتے - تحقیق میں جب تک کسی مستند ماخذ کا حوالہ نہ دیا جاے وہ آسانی سے تسلیم نہیں کی جا سکتی -

جناب بابو شیام سندر داس صاحب نے اپنے تحقیقی مضامین میں جن بیانات کو پیش کیا ہے ان میں سے اکثر حوالہ و سند کے محتاج ہیں - تحقیق کا شعبہ ہے بھی ایسا کہ جو بات کل مسلم تھی آج غلط ثابت ہوی - مثلاً صاحب ممدوح نے دیباچۂ ہندی شبد ساگر کے صفحہ ۲۱ پر تحریر کیا ہے کہ "اِسی طرح سمت ۱۶۸۰ میں جٹمل نے "گورا بادل کی کہانی" اِس زبان کی اُس وقت کی مروجہ نثر میں لکھی ہے "—

دسمبر سنہ ۱۹۳۳ع کے وشال بھارت میں جناب پورن چند صاحب ناہر ایم اے بی ایل کا "کونیں بھانگ" ایک مضمون شایع ہوا ہے جس میں اُنھوں نے حوالوں کے ساتھ تفصیل سے اِس امر کو ثابت کیا ہے کہ جٹمل نے "گورا بادل کی کہانی" کو نثر میں لکھا ہی نہیں - وہ لکھتے ہیں "شاید بابو صاحب (شیام سندرداس صاحب) نے اِس کتاب کا مطالعہ خود نہیں کیا ورنہ اتنی بڑی غلطی ہونی ممکن نہ تھی (وشال بھارت دسمبر سنہ ۳۳ ع صفحہ ۷۳۳) - ہم نے نمونے کے طور پر یہ صرف ایک مثال لکھی ہے جس سے معلوم ہوگا کہ جناب شیام سندرداس صاحب کی تحقیق بھی غلط ثابت ہو سکتی ہے -

جناب بابو شیام سندر داس صاحب نے ہندی شبد ساگر کے دیباچہ میں یہ کہیں بھی بتانے کی کوشش نہیں کی کہ آخر اس زبان کا نام "کھڑی" کیوں پڑا —

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے یہ تسلیم کر لیا ہے کہ اس وقت اس زبان کا نام "کھڑی بولی" تھا اور اِس بات کو ثابت کرنے کی

ضرورت ھی نہیں ھے اور یہ تسلیم کرکے وہ آگے چلے ھیں - اگر اُس وقت کی اِس بولی کا نام " کھڑی" بولی تھا تو کوی ثبوت تو اس کے لیے دینا چاھئے تھا - لیکن انھوں نے ایسا کوی ثبوت نہیں دیا ھے —

اس میں شبہ نہیں کہ آج کل کی مروجہ ھندی کو ' جو پڑھے لکھے لوگوں کی بولنے اور لکھنے کی عام زبان بن گئی ھے ' کھڑی بولی کہتے ھیں - لیکن اس بولی کو کھڑی بولی کہنے کے کیا معنی ھیں ؟ کھڑی کا لفظ سنسکرت کے لفظ کھر سے بنا ھے جس کے معنی سخت ' کٹھور اور کُھردرا ھیں ' جس میں کسی طرح کی نرمی اور نزاکت نہ ھو - اس کھر لفظ سے کھڑی بنا ھے - کھری کے معنی سچی یا حقیقی بھی اس لیے ھوتے ھیں کہ سچی بات اکثر سخت ھوتی ھے —

یہ مانا جا سکتا ھے کہ جو ھندی دلی میرٹھہ وغیرہ میں پرانے زمانے میں بولی جاتی تھی اس سے اردو پیدا ھوی - لیکن اس زمانے کے ھندی شاعروں اور مصنفوں کو وہ زبان برج بھاشا کے مقابلے میں شیریں' لطیف اور بامزہ نہیں معلوم ھوتی تھی - برج بھاشا کی بے مثل شیرینی کے سینکڑوں قصے اور کہانیاں آج بڑی مشہور ھیں - برج بھاشا کی مٹھاس کے سامنے یہ ھندی جس سے اردو پیدا ھوی اُس زمانے کے لوگوں کو " کھڑی " یعنی سخت معلوم ھوتی تھی اور اسی لیے برج کا چلن ھوتے ھوے بھی اس کا استعمال کثرت سے اردو داں طبقے ھی نے کیا - ھندی داں طبقے نے اس کا استعمال بہت ھی کم کیا - آج بھی ھندی زبان کے اندر ایک ایسا اسکول (مذھب) ھے جو یہ مانتا ھے کہ ھندی شاعری تو برج بھاشا ھی میں ھونی چاھئے - اور آج بھی برج بھاشا کی شاعری میں جو مٹھاس ھے وہ کھڑی بولی میں کہاں ؟ برج بھاشا کی مٹھاس '

اس کالوچ، اس کی نزاکت اور لطافت آج بھی ایسی ھے کہ زمانۂ حال کی مروجہ ھندی بھی اس کے سامنے سخت، اکھڑ اور کانوں کو گراں معلوم ھوتی ھے —

لیکن جب نثر کا چرچا زیادہ ھوا اس وقت بول چال کی کھڑی بولی کو اھمیت ملی اور تب یہ کھڑی بولی استعمال میں آنے لگی - پہلے پہل زیادہ تر یہ نثر ھی میں استعمال ھوی اور پھر رفتہ رفتہ بول چال کی بولی ھونے کی وجہ سے نظم میں اس کا چلن ھوا - شروع میں لوگ کھڑی بولی کی ھندی نظم کو سن کر ناک بھوں چڑھاتے تھے اور آج بھی ھندی کے بہت سے ایسے صاحب دل عالم موجود ھیں جنھیں برج بھاشا کی نظم کے آگے کھڑی بولی کی نظم پھیکی معلوم ھوتی ھے —

لیکن چونکہ اب مروجہ زبان کا چلن بڑھتا جاتا ھے اس لیے کھڑی بولی کی نظم کا چرچا بھی بڑھ رھا ھے اور برسوں کی کوشش کے بعد اس کی شاعری میں بھی اب کچھہ رسیلا پن آچلا ھے —

اسی طرح آج کی ھندی جو کھڑی بولی کہلاتی ھے پرانے زمانے میں حقارت کے طور پر کھڑی بولی کہلاتی تھی - بذات خود یہ کوی علحدہ زبان یا ھندی کی کوی مستقل شاخ نہیں تھی —

" کھڑی بولی " کا نام برج بھاشا کی متھاس کے مقابلہ ھی میں پڑا ھے - اس کے یہ معنی نہیں ھیں کہ وہ در اصل غیر مہذب اور ناشائستہ لوگوں کی زبان تھی - اس کا صرف یہی مطلب ھے کہ اس زبان کو اس زمانے کے ھندی داں برج بھاشا کے مقابلے میں نہ تو میٹھا سمجھتے تھے اور نہ اس میں وہ صلاحیت تھی جو برج بھاشا میں تھی - اس کا غیر شستہ پن اور کرختگی برج بھاشا کے مقابلے ھی میں تھی - للولال جی

جہاں کے رہنے والے تھے وہاں 'کھڑی'' کے لفظ سے یہی معنی لیے جاتے ہیں - دھلی آگرہ کے علاقوں میں آج بھی ''کھڑی'' کا لفظ غیر شائستہ اور کرخت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے - اس لیے اگر انھوں نے اس لفظ کو انھی معنوں میں استعمال کیا ہو تو کچھہ تعجب کی بات نہیں ــ

لیکن اس کے یہ معنی نہیں ھیں کہ اُن کا "پریم ساگر" گنوارو زبان میں لکھا گیا ہے - دنیا کی کوئی زبان' جسے زبان کا درجہ حاصل ہے اور جس میں کچھہ نہ کچھہ ادب موجود ہے ' گنوارو نہیں کہی جا سکتی - اس قسم کے الفاظ مقابلتاً ھی استعمال کیے جاتے ھیں - اگر کوئی کہے کہ فرانسیسی کے مقابلے میں انگریزی پھیکی اور گنواروسی معلوم ہوتی ہے تو اس کے یہ معنی نہیں ہوں گے کہ انگریزی ایک گنوارو زبان ہے اور اس میں کسی قسم کی خوبی نہیں ہے - آج یہ هندی جسے کسی زمانے میں کھڑی بولی کہا جاتا تھا ' نثر اور نظم میں ہر جگہ ایسی رائج ہو چکی ہے کہ اس میں معقول ادب پیدا ہو رہا ہے - اب هم اس بولی میں ایسے رچ پچ گئے ھیں کہ همیں اب یہ خیال بھی نہیں ہوتا کہ کسی وقت اسے اس معنی میں کھڑی بولی کہتے تھے ــ

هم تو سمجھتے ھیں کہ "کھڑی بولی" کے یہی ایک معنی ھیں جو سمجھہ میں آسکتے ھیں اور اس کے معنی سچی اور حقیقی لینا ایک قسم کی کھینچ تان معلوم ہوتی ہے کیونکہ اگر یہ حقیقی ہوتی تو پرانے هندی کے شاعر اس میں اتنا ھی ادب پیدا کرتے جتنا اردو زبان کے لکھنے والوں نے پیدا کیا ہے - اس زبان کا نام کھڑی اسی لیے پڑ گیا تھا کہ اسے اس وقت کے هندی مصنفین برج بھاشا کے مقابلہ میں غیر

شستہ اور کرخت سمجھتے تھے اور دراصل یہ وھی ھندی ھے جو اردو کی شکل میں نظر آتی ھے اور اردو والوں ھی نے اسے پروان چڑھایا - اُس وقت تک اِس زبان کو ھندوی یا ھندی کہتے تھے - کھڑی بولی تو اسے حقارت سے کہتے تھے ورنہ دراصل یہ ھندی کی کوئی الگ شاخ نہیں ھے - لیکن آج کل بہت سے لوگ اس کھڑی بولی کو ھندی کی شاخ لکھنے لگے ھیں جو قابل قبول نہیں معلوم ھوتا —

تبصرے

ادب

تاریخ و سیر

متفرقات

اردو کے جدید رسالے

تبصرے

ادب

ضروریات الادب اردو

(مولفۂ غلام الدین صاحب، بی - او - ایل - مدرس نارمل اسکول
آگرہ - چھوٹی تقطیع - صفات ۲۲۸ قیمت ایک روپیہ)

—

یہ کتاب طلبہ کے لیے تالیف کی گئی ہے اور اس میں شک نہیں کہ طالب علموں کے لیے بہت کار آمد ہے - اس میں منصلۂ ذیل مضامین پر بحث کی گئی ہے - (۱) مرکب الفاظ کی تشریح (۲) نظم و نثر کی اقسام مع امثلہ (۳) صنائع بدائع لفظی و معنوی (۴) الفاظ متضاد یا متقابل المعنی (۵) فارسی کلمات جو مرکبات میں کار آمد ہیں (۶) حروف کا باہمی بدل (۷) فقرات و اشعار کی نحوی ترکیب (۸) محاورات اردو زبان (۹) واحد عربی الفاظ کی جمع (۱۰) فصاحت و بلاغت، تشبیہ و استعارہ کا مختصر بیان —

تقویم العروض و القافیہ

(مولفۂ غلام محی الدین صاحب بی - او - ایل سابق مدرس
نارمل اسکول آگرہ - مفتی تولہ مرادآباد - قیمت آتھہ آنے)

عروض و قافیہ نیز علم بدیع پر مختصر کتاب ھے لیکن باوجود اختصار کے تمام ضروری مسائل تشریح اور مثالوں کے ساتھہ آگئے ھیں - طلبہ اور عام شائقین کے لیے بہت اچھی کتاب ھے --

---

افسانہاے عشق

(مترجمۂ حامد علی خاں صاحب بی - اے ' جائنٹ اڈیٹر
ھمایوں قیمت مجلد ایک روپیہ - دفتر ھمایوں لاھور)

حامد علی خاں صاحب اردو نثر اور نظم دونوں پر اچھی قدرت رکھتے ھیں - ان کے بیان میں دلکشی ھے - اس مجموعے میں سات فسانے ھیں اور ساتوں کے ساتوں ترجمہ ھیں - جن میں سے تین ٹیگور کے ' ایک سلتا چٹرجی اور ایک سیتا چٹرجی کا - باقی دوسرے فسانہ نویسوں کے —

ترجمہ بہت ستھرا اور پاک صاف ھے - کتاب چھوٹی تقطیع پر مجلد ھے اور بہت اچھی چھپی ھے —

شریک اخلاص (قیمت آتھہ آنے)

یہ نظم مولانا محمد علی مرحوم کا مرثیہ ھے جو مرزا احسان احمد

بی - اے ' ا ل ا ل - بی (علیگ) وکیل اعظم گڑہ نے لکھا ہے - اس میں مرحوم کی خوبیوں، اپنے درد دل اور قومی نقصان کو بڑے سوز وگداز سے بیان کیا ہے -

---

رموز العارفین

(نوشتۂ سید احمد اللہ صاحب قادری - حیدرآباد دکن قیمت دو روپے)

یہ میر حسن مصنف سحرالبیان کی ایک مثنوی ہے - اس میں ابراہیم ادھم بادشاہ بلخ کے ترک دنیا اور فقر اختیار کرنے کا بیان ہے - اس میں جا بجا مثنوی مولانا روم کے اشعار تضمین کے طور پر آگئے ہیں - اس مثنوی کو مثنوی سحرالبیان سے کچھہ نسبت نہیں - بہت معمولی نظم ہے - شروع میں مرتب صاحب نے ایک دیباچہ بھی لکھا ہے جس میں میر حسن کی زندگی کے حالات اور تصانیف وغیرہ کا مفصل ذکر ہے —

میری نا تمام محبت اور دوسرے رومان (۲) لاش اور دوسرے ہیبت ناک قصے —

(مصنفۂ حجاب اسمعیل صاحبہ قیمت ایک روپیہ آٹھہ آنے اور ایک روپیہ چار آنے دارالاشاعت پنجاب لاہور)

اس میں چار فسانے ہیں - " میری نا تمام محبت " کسی قدر طویل ہے باقی تین چھوٹے چھوٹے ہیں - قصے معمولی ہیں - تصنیف میں کچھہ ترجمے

کا رنگ پایا جاتا ہے - یہ قصے مشاہدے اور ذاتی تجربے کے اس قدر ممنون نہیں جتنے کتابوں اور مطالعہ کے ہیں - تاہم قابل نوجوان مصنفہ کو لکھنے کا ڈھنگ خوب آتا ہے اور انہیں لکھنے پڑھنے اور مطالعہ اور تصنف و تالیف کا شوق معلوم ہوتا ہے —

دوسری کتاب میں لاش اور اس کے ساتھ کے دوسرے قصے حقیقت میں ہیبت ناک ہیں -

---

"سخنوران ایران در عصر حاضر"

(مولفہ جناب پروفیسر محمد اسحاق صاحب ، کلکتہ یونیورسٹی)
(حجم ۱۸ ، ۴۵۵ ص - تعداد تصاویر ۴۳ - کاغذ چکنا و دبیز - ملنے کا پتہ : عبدالحلیم صاحب نمبر ۱۵۷ چاندنی چوک اسٹریٹ کلکتہ)

اگرچہ اردو زبان ہمیشہ سے فارسی کی خوشہ چین رہی ہے ، خصوصاً اس کا سرمایۂ شعر ، تمام تر ، فارسی مضامین ، الفاظ ، اور تشبیہات کا ممنون احسان رہا ہے ، بقول خواجہ حافظ —

شکر شکن شوند ہمہ طوطیان ہند
زین قند پارسی کہ بہ بنگالہ می رود

لیکن مقام حیرت ہے کہ اس قریبی تعلق کے باوجود ، ہندوستان کا فارسی دان طبقہ جدید ایرانی ادبیات کی روش اور رجحانات سے قطعاً ناآشنا ہے - آج ہمارے ملک میں فارسی زبان کے ایسے "فارغ التحصیل" اصحاب

موجود هیں ' جو جدید ادبیات سے نہ صرف ناواقف هیں' بلکہ اس کے سمجھنے سے بھی قاصر هیں - ان حضرات کی رائے میں ایرانی شاعری کا چراغ گویا جامی کی شمع حیات کے ساتھہ گل هوگیا' اور قاآنی اور یغما کی جگمگاهٹ اس شعلہ کی آخری بھوک تھی - بقول پروفیسر براؤن : -

" اغلب مستشرقین کہ زحمت تتبع ادبیات جدیدۂ ایران
را بخود نہ دادہ اند' چنین تصور می کنند کہ طوطی
شکر گفتار طبع شعرا و اُدباے اعصار گزشتۂ ایران از نطق
فرو ماندہ' و چندیں قرن است کہ درین چمن خزان دیدہ'
بلبلے بہ ترنم نیامدہ' و شاید هم هیچ نخواهد آمد" *

جن حضرات نے پروفیسر براؤن کی کتاب " Press and Poetry in modern Persia " (چاپ خانہ و شعر ایران کنونی) ملاحظہ فرمای هے' انهیں ایران کی جدید' خصوصاً دورۂ انقلاب کی شاعری کا کسی قدر اندازہ هوا هوگا' هندوستان کے فارسی دان طبقہ کو پروفیسر محمد اسحاق صاحب کا نہایت ممنون هونا چاهئے کہ صاحب موصوف نے محض اس مقصد کے لئے چهہ ماہ تک ایران میں قیام کیا اور خود وهاں کے شعرا سے ملے اور ان کا کلام اور حالات زندگی حاصل کئے اور اس طرح جدید ادبیات فارسی کے متعلق ایک ایسی مفید اور دیدہ زیب کتاب ملک کے سامنے پیش کی جس کی نظیر اردو طباعت میں مشکل سے ملے گی - فاضل مولف کے ساتھہ ساتھہ هم چاپخانہ جامعہ ملیہ' دهلی کو بھی مبارکباد دیتے هیں کہ اس نے کمال

---

* مقدمۂ فارسی از قلم پروفیسر براؤن بر کتاب Press & Poetry in modern Persia

۱۲ - راقم -

اهتمام کے ساتھہ اس کتاب کو طبع کیا - جس طرح یہ کتاب اپنی نوعیت کے لحاظ سے لاجواب ھے ' اسی طرح اپنی طباعت کے اعتبار سے بھی (کم از کم ھندوستان میں) بے نظیر ھے -

فاضل مولف نے اس موضوع پر تین جلدیں شائع کرنے کا مقصد ظاھر فرمایا ھے ' جن میں سے دو شعر جدید پر اور تیسری جلد نثر جدید پر ھوگی - زیر تبصرہ کتاب اس سلسلہ کی پہلی کڑی ھے ' جس میں ردیف وار' ۳۳ شعرا کے حالات زندگی ' ان کی تصاویر اور ان کا منتخب کلام پیش کیا گیا ھے - کتاب کے شروع میں ' آقاے جمال زادہ کا لکھا ھوا ۱۲ صفحات کا " تقریظ و تشکر " ھے - پھر خود فاضل مولف نے چھہ صفحات کا مقدمہ لکھا ھے ' جس میں سرسری طور پر آج کل کی ایرانی شاعری پر تبصرہ فرمایا ھے - کتاب کے آخر میں پانچ نہایت مفید فہرستیں : فہرست ھجای ' اسماء رجال ' اسماء اماکن ؛ اسماے ملل و قبائل و فرق ' اور اسماے کتب و جراید کی ھیں - حصۂ انگریزی میں سر زاھد سہروردی کی ایک مختصر تقریب ' اور فاضل مولف کا دیباچہ اور مقدمہ ھے - غرض کہ پروفیسر اسحاق صاحب اپنی سیاحت ایران سے ایک ایسا گلدستہ " رہ آورد سفر " کے طور پر لاے ھیں ' جو بجاے خود ایک گلستان ھمیشہ بہار ھے - یہ تینوں جلدیں جب شایع ھوجائیں گی ' تو پروفیسر براؤن کی تاریخ ادبیات ایران جلد چہارم کا بہترین اور مکمل ترین ضمیمہ ثابت ھوں گی —

اگرچہ فاضل مولف نے مجملاً اپنے مقدمہ میں آج کل کی فارسی شاعری کی بعض نمایاں خصوصیات کو واضح فرمایا ھے ' لیکن اس میں تاریخی مواد کافی نہیں ھے اور اس کو پڑھ کر ناظرین ان حالات کا اندازہ نہیں

لگا سکتے جنھوں نے جدید شاعری کو آب و رنگ دیا ہے - ہمیں امید ہے کہ آئندہ جلدوں میں اس کی تلافی ہو جائے گی - تجدد ادبی کی مثالوں کے ساتھ ساتھ اگر اس تجدد کے اسباب و علل سے بھی بحث کی جائے تو وہ زبانیں جن کی ادبیات ہنوز معرض تشکیل میں ہے ' بہت کچھ فائدہ اٹھا سکتی ہیں - اکثر اہل قلم جدید ایرانی ادبیات کو دورۂ انقلاب کی پیداوار قرار دیتے ہیں ' اور اس کا سیاسی حصہ بے شک براہ راست اُسی کا نتیجہ ہے ' لیکن دوسری حیثیتوں سے بھی یہ تجدد کچھ کم جالب توجہ نہیں ہے ' اور ہم بجا طور پر یہ کہہ سکتے ہیں جن سیاسی اور معاشری ہیجانات نے ترکی میں نامق کمال ' شناسی آفندی اور ضیاء پاشاہ کو پیدا کیا ' جو مصر میں عربی پاشا کی تحریک کی صورت میں ظاہر ہوے ' وہی در اصل ایرانی ادب کے تجدد کا سبب بھی بنے - مرزا محمد رضا کرمانی نے ناصرالدین شاہ قاچار کو قتل کیا ' مرزا آقاخاں کرمانی نے اپنے قلم سے تلوار کا کام لیا اور یہ پر جوش اشعار لکھے :-

بایران مباد آن چنان روز بد که کشور بہ بیگانگان اوفتد
نخواہم زمانے کہ این نو عروس بیفتد بزیر جوانان روس
بگیتی مباد آنکہ این حور ویس شود ہمسرے لردے از انگلیس

ذہنی تحریک دونوں صورتوں میں وہی ایک تھی ' صرف طریقۂ عمل میں فرق تھا - اس تحریک کو سمجھے بغیر ' جدید ایرانی ادبیات کی روح کو سمجھنا مشکل ہے —

سخنوران ایران در عصر حاضر کے مطالعہ سے ناظرین کو ایرانی افکار کا ایک نیا عالم نظر آے گا - شاہ پرستی کی جگہ جمہور پرستی ' خوشامدانہ

اغراق کی جگه تلخ حقیقت نگاری ' صنائع و بدائع پر زور طبع صرف کرنے کی بجاے وطنی اور ملی ترانے انهیں سنائی دیں گے ' اور انهیں حیرت هوگی که جس فارسی شاعری کی کورانه تقلید وہ آج تک اپنا شعار بنائے هوے هیں ' اس میں اب ایک نیا اُبال اور نیا جوش پیدا هوگیا هے - زندگی تبدیلیء پیهم کا نام هے ' اور ادبیات جو زندگی کا آئینه هوتی هے ' یا هونی چاهئے ' وہ بهی همیشه محل انقلاب و ارتقاء بنی رهتی هے - قدیم شاعری ' قدیم ایرانی معاشرت کی طرح حالت جمود میں تهی ' لیکن قوم کی نئی امنگوں کے ساتهه قومی ادبیات نے بهی هاتهه پاؤں نکالے هیں ' جس کی مثالیں ناظرین کو اس کتاب کے هر صفحے پر نظر آئیں گی —

سب سے پهلی تبدیلی ناظرین کو انتخاب موضوعات میں نظر آے گی - مدایح پادشاهان و بزرگان ' غزلیات و اخلاق و فلسفه و تصوف کی جگه اب معاشری اور سیاسی موضوعوں نے لے لی هے - اس میں شک نهیں که غزلیں اب بهی کهی جاتی هیں - اس لئے که ایرانی آب و هوا میں جو قدرتی رنگ تغزل هے ' وہ ظاهر هوے بغیر نهیں رہ سکتا ' لیکن اب ان کی حیثیت محض ادبی گل کاریوں کی سی هے - آج کل کی شاعری یا تو " وطنیاتی " هے ' یا معاشری - چنانچه اس جلد میں بهی ناظرین کو پردہ ' اصلاح طریقهٔ نکاح ' تعدد ازواج ' تساوی حقوق مرد وزن ' ستائش زارع ' راہ آهن اور ایسے هی نئے عنوانات پر متعدد نظمیں نظر آئیں گی ' جن سے ظاهر هوگا که آج کل ایرانی ادبیات کا معیار محض تفریح و تفنن طبع هی نهیں هے ' بلکه اس سے وطن خواهی کی تحریک ' اور اصلاح اور تبلیغ کا کام بهی لیا جاتا هے - جو طبیعتیں پهلے هلال نو سے ممدوح کا حلقه رکاب تراشا کرتی تهیں وهی اب شاهوں کے تاج کے گوهر تابناک کو ' اشک یتیم سے

تشبیہہ دیتی ہیں :-

روزے گزشت پادشہے از گزر گہے | فریاد شوق برسر ہر کوے و بام خاست
پرسید زان میانہ یکے کودک یتیم | کیں تابناک چیست کہ بر تاج بادشاہ است
نزدیک رفت پیرزنے ' کوز پشت وگفت | کیں اشک دیدۂ من و خون دل شماست

(پروین خانم اعتصامی)

جو ہمت پہلے شاہوں کی مدح میں صرف ہوتی تھی ' وہ اب پہلے سے زیادہ جوش اور خلوص کے ساتھہ وطن کے ترانے گانے میں صرف ہوتی ہے :-

تا بندہ چو خورشید ' و فروزان چو ستارہ
در صفحۂ پہنا ور ایں چرخ محدب
اے آئینہ شرق پدید از تو ہمارہ
فرزند بلند اختر و مردان مہذب
از خلد برین خوب تری اے چمن عشق
گہوارۂ علم و ہنری ' اے وطن عشق

(فرہنگ)

گردید وطن غرقۂ اندوہ و محن واے - ایواے وطن واے
خیزید و دوید از پے تابوت وکفن واے ' ایواے وطن واے
از خون جوانان کہ شدہ کشتہ درین راہ ' رنگین طبق ماہ
خونین شدہ صحرا وتل و دشت و دمن واے 'ایواے وطن واے

(اشرف)

مولانا حالی مرحوم نے اپنے کلیات پر جو مقدمہ لکھا تھا ' اس میں

انہوں نے یہ خیال ظاہر فرمایا تھا کہ خیالات کی تبدیلی کے ساتھہ ' اداے مطالب کے سانچے نہیں بدلتے۔ " محمل وہی ہیں لیکن محمل نشیں دوسرے پیالے وہی ہیں' لیکن شراب اور "۔ ایرانی ادبیات میں جو انقلاب ہوا ہے ' اس کا اندازہ ناظرین اسی سے لگا سکتے ہیں کہ موضوعات اور خیالات کی تبدیلی کے ساتھہ ساتھہ فارسی زبان کے سانچے بھی بدلتے جاتے ہیں - جس حد تک اصناف سخن کا تعلق ہے' حمد' نعت' منقبت مراثی' قدیم طرز کے قصاید ' یہ آج ایرانی ادبیات میں آثار قدیمہ کا حکم رکھتے ہیں - آج کل کی فضا میں تغزلانہ " حدیث دلبری " اور " آب و رنگ شاعری' کی گنجائش بہت کم ہے - مسدّس' اور مستزاد جسے قاآنی اور دادری نے زندہ کیا تھا آج کل زیادہ مقبول ہے' جس کی وجہ یہ ہے کہ سرود ملی کے لئے مسمط کی بحریں نہایت موزوں ہوتی ہیں - قطعات آج کل بہی لکھے جاتے ہیں' جن میں کوئی اخلاقی یا فلسفیانہ نکتہ بیان کیا جاتا ہے - چنانچہ اس کتاب میں بھی ناظرین کو ایرج مرزا کا قطعہ " قلب مادر "۔ اور " مادر "۔ حبیب یغمائی کا قطعہ " وطن " رشید یا سمی کا " آئینہ سیال " ملک الشعرا بہار کا " قلب شاعر " اور اے تاگر (ٹیگور سے خطاب نہایت عمدہ قطعات ملیں گے - ہم صرف ایرج مرزا کا قطعہ " مادر " یہاں نقل کرتے ہیں' جو صفائی اور شیرینی اور خلوص جذبات کے اعتبار سے آپ اپنی نظیر ہے :-

گویند مرا چو زاد مادر پستان بدهن گرفتن آموخت
شب ها بر گاهوارهٔ من بیدار نشست و خفتن آموخت
لب خند نهاد بر لب من بر غنچهٔ گل شگفتن آموخت
یک حرف دو حرف بر دهانم الفاظ نهاد و گفتن آموخت
دستم بگرفت و پا بپا برد تا شیوهٔ راه رفتن آموخت

پس هستی من زهستی اوست تا هستم و هست دارمش دوست

اصناف سخن میں آج کل " تصنیف " بہت مقبول ہے - یہ وهی چیز ہے جسے انگریزی میں (Ballad) کہتے هیں - اسے عموماً پیانو کے پردوں پر گایا جاتا ہے ' اور اس کی بحروں میں موسیقی کے بولوں کا خیال زیادہ رکھا جاتا ہے - تصنیف گویوں میں عارف قزوینی سب سے زیادہ مشہور هیں - یہ عموماً اپنی پر جوش تصانیف خود هی گا کر سناتے هیں - هم ذیل میں ان کی تصنیف کا ایک بند نقل کرتے هیں ' جس سے ناظرین کو اس صنف شعر کا اندازہ هو جائے گا -

گریہ کن کہ گر سیل خون گری ' ثمر ندارد
نالۂ کہ ناید زنائے دل ' اثر ندارد
هر کس کہ نیست اهل دل ز دل ' خبر ندارد
دل ز دست غم مفر ندارد دیدہ غیر اشک تر ندارد
این محرم و صفر ندارد
گر زنیم چاک جیب جان چہ باک مرد جز هلاک
هیچ چارۂ دگر ندارد زندگی دگر ثمر ندارد

جس حد تک الفاظ و اصطلاحات کا تعلق ہے ' آج کل ایک طبقہ ایسا پیدا هو گیا ہے جو اپنے اشعار میں بے تکلف فرانسیسی الفاظ استعمال کرتا ہے - یہ عیب (افسوس ہے کہ هم اسے عیب هی کہنے پر مجبور هیں) اکثر مشہور شعرا کے کلام میں بھی نظر آتا ہے - سمجھ میں نہیں آتا کہ ان مدعیان تجدد کو اس فرانسیسی پرستی سے کس اصلاح کی امید ہے -

عشقی مرحوم کی ایک نظم کا عنوان ہے "ایدہ آل عشقی" اسے پڑھ کر یہ سمجھ میں نہیں آسکتا کہ یہ ہے کیا چیز۔ خدا بھلا کرے فاضل مولف کا کہ انہوں نے حاشیہ میں اس کا مرادف " Ideal " لکھدیا ' اور ہمیں اس عنوان پر ہنسی بھی آئی اور افسوس بھی ہوا۔ تابلو (Tableaux) ' بمبارمان پارلمان ' یہ الفاظ مذاق پر بہت بار ہوتے ہیں - اکثر مشہور شعرا مثلاً ایرج مرزا ' بہار ' پورداؤد وغیرہ ان کانٹوں سے اپنا دامن بچاتے ہیں ' لیکن کہیں کہیں ایک یا دو فرانسیسی لفظ ان کے کلام میں بھی آہی جاتے ہیں۔

الفاظ کے بارے میں ایک خاص اور ذی اثر طبقہ پاکیزہ زبان کا بیڑا اٹھائے ہوئے ہے ' جس کا مطلب یہ ہے کہ عربی الفاظ کو نکال باہر کیا جائے ' خواہ فرانسیسی الفاظ ہی کیوں نہ استعمال کرنے پڑیں - اس " فارسی خالص" کی تحریک کے لوا بردار " پور داؤد " ہیں - انہیں حافظ کے اس شعر پر

اگر چہ عرض ہنر پیش یار بے ادبی است

زباں خموش ولیکن دہاں پر از عربی است

بڑا اعتراض یہ ہے کہ " عربی دانی " کو جزو ہنر کیوں سمجھا گیا - ملک الشعرا بہار اپنے " چہار خطابۂ پہلوی " میں کہتے ہیں

نصف زباں را عرب از بین برد

نصف دگر لہجہ بہ ترکاں سپرد

افسوس ہے کہ عربی کی یہ مخالفت صرف زبان ہی کی حد تک نہیں ہے - عصر حاضر کی ایرانی ادبیات میں عربی اثر اور عربی تمدن پر شدید حملے نظر آتے ہیں - ساسانی تہذیب کے احیاء کا جوش اس حد تک بڑھا ہوا ہے کہ عربوں اور ترکوں حتیٰ کہ قاچاریوں پر بھی شدید تبرا بازی کی جاتی ہے ' جو اکثر صورتوں میں دل آزاری کی حد تک پہنچ جاتی ہے - پورداؤد

اس طرح زہر اگلتے ہیں

از پیک نوید آمد ، ہاں گوش فرادار کا حمدشہ ایران شد از تخت نگونسار
اورنگ شہی پاک شد از دیو تبہ کار وز راہزن و ترمکن و دودۂ قاچار
زین مژدہ بدرگاہ خداوند سپاس آر
کز خجلت آن ننگ بجستیم دگر بار

یہ وہی راہزن (عرب) اور ترک ہیں جنھوں نے اپنی نوبت میں ایران کی خدمتیں کیں اور اسے سنوارا اور احمد شاہ کی تخت نشینی کے وقت تو بہت پر جوش قصاید بھی لکھے گئے تھے لیکن اس کی شکایت ہی کیا ' سیاسی حافظہ بہت کمزور ہوتا ہے اور پھر انقلاب اسی کا نام ہے - ساسانیت کی یہ تحریک اب اس حد تک ایرانی ذہن پر حاوی ہوگئی ہے کہ نوجوان شعرا ، "روان زرتشت" سے مدد طلب کرتے ہیں اور داریوش وکورس کو قومی ہیرو بناتے ہیں - مجتہدین کا طبقہ جس کا سیاسی اثر صفویہ کے زمانے میں اور خود دورۂ قاچاریہ میں نہایت زبردست تھا ' آج کل مردود خلائق ہے اور ان کی بجائے قوم کی آنکھیں و کلاے مشروطہ پر لگی ہوی ہیں - عشقی مرحوم کہتے ہیں :-

زردشت ایران خرابست - اے روان پاک زردشت - این کشتی در گرداب ست
حیف ازیں آب و خاک - زردشت
اے پیمبر آسمانی - زردشت تو برایران و ایرانی ' پیک نہانی - زردشت
الخ

چونکہ موجودہ ایرانی شاعری کا مخاطب طبقۂ خواص نہیں بلکہ 'طبقۂ عوام' ہوتا ہے ' اس لیے اب اس میں مغلق الفاظ و تراکیب کی

بجائے سادہ و سلیس زبان استعمال کی جاتی ہے، اور در حقیقت بغیر اس کے شاعری سے اصلاحی اور تبلیغی کام لیا بھی نہیں جا سکتا - بقول پروفیسر براؤن ایرانی طبیعت اس قدر "مجذوب شعر" ہے کہ جو کام اخبارات کے مضامین اور مقرروں کی دھواں دھار تقریریں نہیں کرسکتیں، وہ ایک ظریفانہ یا پر جوش نظم سے پورا ہوجاتا ہے - کسی زبان کی ادبیات پر سیاسیات کا اثر، خواہ اور حیثیتوں سے قابل اعتراض ہو، لیکن کم از کم صفائی اور سادگی زبان پیدا کرنے میں بہت کارآمد ہوتا ہے - ہندوستان میں تقریباً پچاس سال سے سیاسی تحریکات ملک میں جاری ہیں، لیکن ادب پر اس کا کوئی نمایاں اثر نظر نہیں آتا، لیکن ایران میں صرف دس سال کی سیاسی تحریکات نے ان کی ادبیات میں بڑا تغیر پیدا کردیا ہے جو ان کی قومی زندگی کا ثبوت ہے - آج کل کی شاعری صرف گوش شاہاں کے لئے اور حصول ستائش کے خیال سے نہیں ہوتی - اب اس میں ایک پوری ملت سے خطاب ہوتا ہے- اس لئے زبان بھی ایسی ہوتی ہے جسے عالم و عامی، مرد و زن، بچے اور بوڑھے سب سمجھ سکیں- جن محاوروں کو متقدمین سوقیانہ سمجھ کر کبھی استعمال بھی نہ کرتے، آج کل وہ ہر نظم میں نظر آتے ہیں- اکثر نظمیں تو مخصوص علاقوں کی مقامی بولیوں میں کہی جاتی ہیں- اس حیثیت سے اردو ادبیات جدید ایرانی شاعری سے بہت کچھ سیکھ سکتی ہے - اس کتاب میں بعض نہایت سادہ اور پر اثر وطنی نظمیں اطفال مدارس کے لئے بھی موجود ہیں - حبیب یغمائی کی نظم وطن کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :-

کشور ایران کہ زید جاودان ۔ ہست وطن برہمہ ایرانیان

اے پسر با ادب و ہوشیار ۔ از دل و جان خاک وطن دوست دار

ب وطن مہر و وفا آورد حب وطن صدق و صفا آورد
ترم این ملک چو مادر بدار هم وطن خویش برادر شمار
نم به همراهی بیگانه پوش خویش به آبادی این خانه کوش

علی هذا حسام زاده کی نظم "چند کلمه به بسران امروز" نہایت
پذیر اور مهیج نظم هے —

ے غنچهٔ ناشگفته در باغ اے نوگل زیب بوستانی
ے جلوهٔ باغ و رونق راغ واے همدم روح آسمانی
واے قلب تو پاک تر ز گوهر
وز عطر صفاے دل معطر

... ...

راهبری قوم گمراه داد سخن و مقال دادم
شعلهٔ نالهاے جان کاه بلگداخت و سوخت بس نهادم
فریاد من از سپهر برشد
عقل از سروجان زتن بدرشد

... ...

م همه خیره خیره بر تو است بر خیز کنون نه وقت خوابست
گوهر شاهوار در تو است دیگر که نه طاقت ونه تاب است
در پوست چهٔ چنین؟ برون آ
و آن گوهر و اصل خویش بنماے

مذکورهٔ بالا انتخابات اشعار کو پڑھ کر شاید ناظرین یه راے قایم کرلیں
آج کل کی شاعری میں فنی حیثیت کچھه بهی نہیں هے بلکه صرف

انادیت ہے - یہ خیال صحیح نہیں ہے - ایرانی مزاج وہی ہے جو ہمیشہ تھا، البتہ تعلیم مغربی کی صیقل اور سیاسی حالات کے تصادم سے اس آئینۂ طبیعت پر اب ایک جلا نئی پیدا ہوگئی ہے - پروفیسر براؤن نے کتنی سچی بات لکھی ہے :-

"آن طبع گہر بار ایرانی کہ اشعار آبدار قدیمہ را بوجود در آوردہ نمردہ است" —

"ہنوز گویندگان ہستند اندر عراق کہ قوت ناطقہ مدد از ایشان برد بلکہ از زیر آن ہمہ ابر ہاے تاریک کہ صفحات این مملکت را فرا گرفتہ، باز آن روح فنا ناپذیر مانند آفتابے کہ زیر ابر نہفتہ پس از چندے با یک پر تو عالم فروزی دیگر جلوہ گر گشتہ است" -

چنانچہ شعریت کی اس روح فنا ناپذیر کے جلوے ناظرین کو آج کل کی ادبیات میں بھی بکثرت نظر آئیں گے - دور از کار تشبیہات و استعارات کی جگہ نئی اور سچی تمثیلات انہیں ملیں گی - مناظر فطرت کو جس حسن و خوبی کے ساتھ آج کل کے شاعر بیان کرتے ہیں، اس کی مثال قدماء کے یہاں بھی مشکل سے ملے گی - شب مہتاب کے ایک منظر کی تصویر ملاحظہ ہو :-

اوائل گل سرخ است وانتہاے بہار نشستہ ام سرسنگے کنار یک دیوار
جوار دّرہ در بند دامن کہسار فضاے شمیران اندک زقرب مغرب تار
ہنوز بد اثر روز بر فراز اوین

چو آفتاب پس کوہسار پنہان شد ز شرق از پس اشجار مہ نمایان شد
ہنوز شب نہ شدہ آسمان چراغان شد جہان ز پر تو مہتاب نور باران شد
چو نو عروس سفید آب کردہ روے زمین

(عشقی)

رشید یاسمی نے چشمہ پر ایک نظم "آئینۂ سیال" کے عنوان سے لکھی ہے جو سر تا سر لطیف ترین تشبیہات سے مملو ہے ' ہم ذیل میں صرف چند بند ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں :-

چہ خوش باشد بروے آب دیدن　　براو رقصیدن مہتاب دیدن
بہ بیداری چنان خاطر فریبد　　کہ شام وصل یاران خواب دیدن

....

نسیم آید از و پر چین شود آب　　بلرزد قرص مہ چون لوح سیماب
دژم گردد چو روے مہ جبینے　　کہ ناگاهش بر انگیزند از خواب

....

بجنبد بید را در آب سایہ　　چو طفلے خفتہ در آغوش دایہ
بود این سایہ را آن لطف و آن حال　　کہ در گفتار شیرینان کنایہ

....

چو ناگہ بر جہد در آب ماهی　　ز حیرت بیخود از جا جست خواهی
گمانت عکس مہتاب از دم باد　　روان بگرفت و شد در آب راهی

اسی طرح سے ملک الشعرا بہار کا ایک قصیدہ "دماوندیہ" ہے جس میں کوہ دماوند سے خطاب ہے ' ملاحظہ فرمائیے کہ کس قدر لاجواب تشبیہات سے کام لیا گیا ہے :-

اے دیو سپید پاے در بند　　اے گنبد گیتی اے دماوند
از سیم بسر یکے کلہ خود　　ز آهن بمیان یکے کمر بند

....

چون گشت زمین ز جور گردوں　　سرد و خنہ و خموش و آوند

بلواخت ز خشم بر فلک مشت آں مشت توی تو اے دماوند
تو مشت درشت روزگاری از گردش قرنہا پس افگند

....

پہاڑ کی چوٹی پر سفید برف کی چادر کی اس سے لطیف تر تشبیہ اور کیا ہو سکتی ہے :-

تو قلب فسردۂ زمینی از درد ورم نمودہ یک چند
تا درد و ورم فرو نشیند کافور بر آن ضماد کردند

یا پھر گل نرگس کی یہ تشبیہ :-

بر دامن دشت نگر آن نرگس مست چشمے برہ و سبز عصاے در دست
گوئی مجنون در انتظار لیلے از گور برون آمد و بر سبزہ نشست

جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں ' قدیم طرز کی شاعری آج کل بھی ہوتی ہے لیکن بہت کم ' چنانچہ اس مجموعہ میں بھی ناظرین کو اکثر شعراء کی غزلیات نظر آئیں گی - شوریدہ شیرازی ' اور غمام ہمدانی کی بعض غزلیں اچھی بھی ہیں ' لیکن حق یہ ہے کہ اس صنف شاعری میں قدماء جو کچھ کر گئے ہیں ' اس پر اضافہ ممکن نہیں ہے - غزلوں پر تجدد کا کچھ اثر ہوا ہے تو الفاظ کی حد تک - آج کل کی زبان نسبتاً آسان اور عام فہم ہے ' لیکن اس میں وہ " رنگ تغزل " وہ شیرینی نہیں ہے - شوریدہ کی ایک غزل کے چند اشعار یہاں نقل کئے جاتے ہیں تا کہ ناظرین اس کا اندازہ لگا لیں —

ہرچہ کنی بکن مکن ترک من اے نگار من ہر چہ بری ببر ' مبر سنگدلی بہ کار من
ہرچہ کشی بکش مکش بادہ بہ بزم مدعی ہرچہ خوری بخور مخور خون دل فگار من

هرچه دهی بده ' مده ' زلف بباد اے صنم هرچه نهی ' بنه منه ' دام برهگزار من
هرچه بری ' ببر ' مبر ' رشتهٔ الفت مرا هرچه کنی ' بکن ' مکن ' خانهٔ اختیار من
هرچه هلی ' بهل ' مهل پردهٔ زروے چون پری هرچه دری بدر ' مدر ' پردهٔ اعتبار من
هرچه روی ' برو ' مرو ' راه خلاف دوستی هرچه زنی ' بزن ' مزن ' طعنه بروزگار من
هرچه کشی ' بکش ' مکش صید حرم که نیست خوش هرچه شوی ' بشو ' مشو تشنه بخون زار من

بہار کے یہ اشعار بھی تغزل کا اچھا نمونہ ہیں:-

رخے تو دخلے به مه نه دارد که مه دو زلف سیه نه دارد
به هیچ و جهت قمر نه خوانم که هیچ وجه شبه نه دارد
بها به ملک دل ار توانی که ملک دل پادشه نه دارد
تفاوتے نیست ' سیاستے نیست عسس نه دارد ' سپه نه دارد
رفیق کم ظرف ' زروے معنے بود سبوے که ته نه دارد
یکے به گوید به آں ستمگر
بہار مسکین گله نه دارد

اسی سلسلہ میں ہم ملک الشعرا بہار کی ایک " پولٹیکل غزل " بھی نقل کئے دیتے ہیں ' جس سے ہمارے ناظرین یقیناً محظوظ ہوں گے - اس غزل میں خوب خوب سیاسی کنایے ہیں ' اور نئی اصطلاحات کا استعمال کیا گیا ہے-

دل فریباں که به کا بینهٔ جان جا دارند مستبدانه چرا قصد دل ما دارند

معشوق کی بیسویں صدی کی سیاسی تشبیه ملاحظه ہو:-

دلبران خودسر و هرجائی و روسی صفتند ورنه در خانه غیرا ز چه سبب جا دارند
گاه لطف است و خوشی ' گاه عتابست و خطاب تاچه ازایں همه پلتیک تقاضا دارند

(Politics)

خوبرویان اروپا * زچه در مردن ما حیله سازند گر اعجاز مسیحا دارند
گرچه در قاعدۂ حسن سیاسات جمال مسلک آنست که خوبان اروپا دارند
عاشقان را سر آزادی و استقلال است کے ز پلتیک سر زلف تو پروا دارند
صف مژگان ترا دست سیاسی است دراز بانفوذیکه که بمعمورۂ دلها دارند

آج کل کے سیاسی قرضوں کی اس سے بہتر تشریح اور کیا ہوگی۔

دل مسکین من از قرض یکے بوسه گزشت باشروطے که لبان تو مہیا دارند
بچه قانون، سپه نازتوا ے ترک پسر در حدود دل یاران سر یغما دارند
ایں چه صلحے است که در داخلۂ کشور دل خیل قزاق اشارات تو ماوا دارند
بکمیسیون + عرائض چه کلم شکوہ ز تو که همه حال من بے دل شیدا دارند
مابتوضیح دو چشمان توقانع نه شویم زان که با خارجیان الفت و نجوا دارند
در پلاہ سر زلف تو بهار ستانے است که دراو هیئت دل مجلس شورا دارند
حکم فرمائے که در محکمۂ حسن و جمال هر چه آں حکم تو باشد همه مجرے دارند
رازداران تو در انجمن سرّی دل نطقے از رمز دهان تو تمنا دارند
دل غارت شدہ در محضر عدلیه ‡ عشق متظلم شد و چشمان تو حاشا دارند

سخن تازہ عجب نیست ز طبعے تو بهار
که همه مشرقیاں منطق گویا دارند -

منقولۂ بالا غزل سے ناظرین کو ایرانی ظرافت کا بھی اندازہ ہوگا - ایرانی مزاج بالطبع ظریف و ظرافت پسند واقع ہوا ہے ' یہی وجہ ہے کہ ظریفانہ نظمیں اور اشعار انقلاب ایران کے بڑی حد تک محرک ہوے ہیں -

---

* یورپ -

+ کمیشن -

‡ ہای کورٹ -

اس تالیف میں بھی اس کے نمونے جا بجا نظر آتے ہیں' اشرف الدین اشرف کے کلام کی جہاں ایک خصوصیت یہ ہے کہ سادہ ترین الفاظ میں عوام کے جذبات کو تحریک دیتے ہیں' وہیں ظرافت بھی ان کے اشعار کی ایک خصوصیت خاصہ ہے - اس مجموعہ میں ان کی ایک نظم "خطاب بفرنگیاں" ہے جو طنز اور ظرافت کا اچھا نمونہ ہے —

اے فرنگی ما مسلمانیم' جنت مال ماست
در قیامت حور و غلمان ناز و نعمت مال ماست

گر زنی بے سیم از دریا بہ ساحل تلگراف
گر کنی خلق غرامافون و سلماتوگراف
ور نمای بحر خود از اطلس و مخمل لحاف
سندس و استبرق اندر باغ جنت مال ماست

خواب راحت' عیش و عشرت' ناز و نعمت مال ماست

شیخی از ما' بابی از ما پطر و ناپلیون * زتو
دهری از ما' صوفی از ما' مکتب و قانون زتو
خرقہ و عمامہ از ما' کشتی و بالون + زتو
گم شو اے احمق' مجاز از تو حقیقت مال ماست

حور و غلمان باغ رضوان' عیش و عشرت مال ماست

مذکورۂ بالا سطور میں ہم نے جو اقتباسات دیے ہیں' ان سے ناظرین کو جدید ایرانی ادبیات کا بخوبی اندازہ ہو جائے گا' اور یہی اس طول کلامی کے لیے ہمارا عذر ہے - فاضل مولف سے ہمیں صرف یہ شکایت ہے کہ

---

* Peter نپولین - † بے لون -

انہوں نے اس قابل قدر تالیف میں ادبی تنقید سے قصداً دریغ کیا ہے، اور محض شعرا کے حالات و کلام کو پیش کردیا ہے تاکہ ناظرین خود اپنی ذاتی راے قائم کرلیں۔ اگر وہ آزادی کے ساتھہ آج کل کی شاعری پر نقد و تبصرہ فرماتے، تو ہمارا خیال ہے کہ اس کتاب کے ایرانی ناظرین کو اس کا اندازہ ہوتا کہ ان کی ادبیات دوسرے ممالک میں کس نظر سے دیکھی جاتی ہے۔ دوسری شکایت یہ ہے کہ شعرا کے انتخاب میں کوئی معیار قائم نہیں کیا گیا، ہم کئی ایسے شعرا کا نام بتا سکتے ہیں جنھیں اس مجموعہ میں جگہ پانے کا کوئی حق ہی نہیں ہے، اور جو بقول آقاے جمال زادہ :—

" یکسان معرکہ و نخود ہمہ آشے می باشند، نام و نشان آنہا عموماً با خود ایشان و گاہے نیز خوش بختانہ قبل از خود شان بگور می رود "

" سخنوران ایران در عصر حاضر " فارسی زبان میں ہے، اور حق یہ ہے کہ آج کل کی ایرانی انشا پردازی کی بہترین خصوصیات کی حامل ہے۔ اس کو پڑھ کر ہندوستان کے فارسی دان طبقہ کو معلوم ہوگا کہ آج کل کی فارسی نثر کا رتبہ کیا ہے، اور قدیم مرصع اور مقفی عبارت کی بجاے اب صفائی اور سلاست کس حد تک اس کا جزو ہے۔ ہمیں فخر ہے کہ ہمارے ملک کا ایک اهل قلم فارسی نگاری میں اس قدر بلند پایہ رکھتا ہے۔

ہمیں امید ہے کہ ہندوستان کے ہر کتب خانہ میں اس تالیف کا نسخہ ضرور خریدا جاے گا اور صاحب ذوق حضرات فاضل مولف کی ہمت افزائی فرمائیں گے۔ کتاب کی قیمت ۱۹ روپیہ ہے، جو اس کے مواد، فاضل مولف کی محنت اور اعلی درجہ کی طباعت کو دیکھتے ہوے کچھہ زیادہ نہیں ہے۔ (و-ہ-ا-ج)

مراۃ المثنوی

(مرتبۂ قاضی تلمذ حسین صاحب ایم اے - رکن دارالترجمہ ٔ حیدرآباد دکن)

مولوی رومی رحمۃ اللہ علیہ کی شہرۂ آفاق مثنوی دنیا کے ادبیات میں نہایت ممتاز مرتبہ رکھتی ہے اور اخلاق و معارف دینیہ کی لطیف و دلنشین تشریح کرنے میں اس کا کوی مثل و عدیل نہیں نظر آتا - صرف ڈینٹی کی نظم « ڈوائن کومیڈیا » کو بعض مستشرقین مثنوی کے مقابلے میں پیش کرتے ہیں لیکن ادبی محاسن سے قطع نظر کرلی جاے ' تو معنوی خوبی اور جامعیت کے اعتبار سے یہ کتاب مثنوی کے سامنے کچھہ وزن نہیں رکھتی - اور صرف اسی کتاب کا مثنوی کے مقابلے میں پیش کیا جانا مولوی رومی رح کے ثبوت افضلیت کو زیادہ آسان بنا دیتا ہے --

ہندوستان کے مسلمانوں میں فارسی سے روز افزوں بیگانگی کے باوجود' غالباً اس زبان کی کوی کتاب مثنوی کے برابر مقبول نہیں ہے لیکن حق یہ ہے کہ ابھی اس کے افادے کو عام اور مطالب کو سہل و دلپسند پیرایوں میں مروج کرنے کی بہت ضرورت باقی ہے - پچھلی دو تین صدی میں اس کی جو شرحیں لکھی گئیں ' اُن کی وجہ سے مثنوی اور بھی دشوار شے سمجھی جانے لگی - دوسرے اس کی ضخامت اور بیان کی پیچیدگی قبول عام پانے میں حائل رہی - یہی سبب ہے کہ ہمیں یہ دیکھہ کر نہایت خوشی ہوی کہ ہمارے فاضل دوست قاضی تلمذ حسین صاحب نے مذکورۂ بالا ضروریات کا بالکل صحیح اندازہ کیا اور مثنوی کی ترتیب کو بدل کر ایسی

عمدہ صورت میں پیش کیا کہ اس سے بہتر آج تک کسی نے اُسے مرتب نہ کیا ہوگا - مولوی رومی رح کا بڑا کمال بلکہ اعجاز' حکایات و تمثیلات ہیں لیکن اکثر حکایتوں کے درمیان کوی دوسری حکایت یا بحث چھڑ جاتی ہے اور اصل حکایت کا تسلسل قائم نہیں رہتا - جو لوگ مثنوی شریف کا عقیدت مندی اور باقاعدہ محنت کے ساتھہ مطالعہ کرنا چاہتے ہیں' ان کے لئے اس گسستہ بیانی سے کچھہ حرج نہیں مگر عام ناظرین کو ضرور پریشانی لاحق ہوتی ہے اور وہ کتاب سے پورا استفادہ نہیں کرسکتے - اس لئے پہلے بھی بعض بزرگوں نے مثنوی کے معارف و حکم اور حکایات کو علیحدہ علیحدہ جمع کرنے کی کوشش کی ہے مگر ہم خیال کرتے ہیں کہ اس معاملے میں قاضی تلمذ حسین صاحب کی سالہا سال کی محنت کا یہ نتیجہ سب سے زیادہ مفید و مکمل ہے - انہوں نے تمام حکایات کو مسلسل کردینے کے علاوہ' مولوی رومی رح کی اخلاقی تعلیمات کو تفصیلی عنوانات کے تحت میں علیحدہ جمع کیا ہے - پھر آیات قرانی اور احادیث نبوی (ص) کے مستقل ابواب مرتب کئے ہیں - سورۂ فاتحہ سے لے کر ترتیب قرآن کے مطابق کتاب اللہ کے جو اقتباسات مثنوی میں آے ہیں' انہیں سلسلہ وار نقل کیا ہے - اور " لآلی سلن " میں ہر حدیث کے پہلے لفظ کو لیکر بہ ترتیب حروف تہجی یہ احادیث اور متعلقہ اشعار درج کئے ہیں - آخر میں بسیط فہرستیں اور لغات مثنوی کی نہایت کارآمد فرہنگ لگائی ہے اور اس طرح عام کتابی تقطیع کے گیارہ سو صفحات پر اپنی اسم با مسمی کتاب مراۃ المثنوی کو پایۂ اتمام کو پہنچایا ہے - اسے بھی جناب قاضی صاحب کی کرامت یا مولوی رومی رح کا روحانی تصرف سمجھنا چاہئے کہ اتنی بڑی کتاب حیدرآباد کے ایک مطبع میں ایسی خوشخط اور دیدہ زیب چھپی ہے کہ اردو کی

بہترین مطبوعات میں شمار ہونے کے لائق ہے۔ اعلیٰ درجے کی چرمی جلد پر مطلا حروف میں کتاب کا نام چھپا ہوا ہے اور ان سب اوصاف کے باوجود اس کی قیمت صرف دس روپیہ کلدار رکھی گئی ہے جو کچھ بھی نامناسب نہیں معلوم ہوتی، اس سلسلے میں صاحب مثنوی رح کی سیرت اور شاعری پر دو اور مبسوط کتابیں زیر طبع ہیں اور چونکہ یہ سب کام فاضل مرتب کی پرشوق و خلوص عرق ریزی کے علاوہ مصارف کثیر چاہتے ہیں، اس لئے اور بھی ضروری ہے کہ اہل ذوق میں سراۃ المثنوی کو وہ اشاعت اور قبول عام حاصل ہو جس کی وہ ہر طرح مستحق ہے ـــ

(ش)

مصحفی کے تذکرے

(۱) تذکرۂ ہندی، صفحات علاوہ مقدمۂ مرتب ۲۸۳

قیمت غیر مجلد ایک روپیہ دس آنے مجلد دو روپے

(۲) ریاض الفصحا صفحات علاوہ مقدمۂ مرتب ۳۷۹

قیمت غیر مجلد دو روپے آٹھ آنے مجلد تین روپے

(۳) عقد ثریا صفحات علاوہ مقدمۂ مرتب ۹۴

قیمت غیر مجلد ۱۲ آنے مجلد ایک روپیہ دو آنے

ملنے کا پتہ :ـ انجمن ترقی اردو۔ اورنگ آباد دکن

مصحفی اردو زبان کا مشہور استاد اور پختہ گو شاعر ہے۔ اس کی تصانیف بکثرت ہیں جن میں شاعروں کے تین تذکرے خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ اب تک گوشۂ گمنامی میں پڑے ہوے تھے اور عام دسترس سے باہر تھے۔ انجمن ترقی اردو نے ان تینوں تذکروں کو خاص اہتمام سے طبع کرکے

شایع کیا ہے - ان میں پہلا تذکرہ تقریباً دوسو اردو گو شعرا کا ہے جو ابتدا سے لے کر شاہ عالم ثانی کے زمانے تک ہوے ہیں - ان میں سے اکثر شاعر مولف کے ہم عصر تھے اس لئے ان کی نسبت جو اطلاعات اس میں درج ہیں وہ بڑی حد تک مستند اور معتبر ہیں - یہ تذکرہ سنہ ۱۲۰۱ ھ سے قبل لکھا جانا شروع ہوگیا تھا اور ۱۲۰۹ ھ میں ختم ہوگیا تھا —

دوسرا تذکرہ ریاض الفصحا ان اردو گو شاعروں کے حالات اور کلام پر مشتمل ہے جن کا ذکر تذکرۂ ہندی میں نہیں ہے "اس کی وجہ تالیف جدید موزوں طبع شاعروں کی کثرت ہے - اس میں تقریباً سوا تین سو شاعروں کا ذکر ہے ' یہ تذکرہ ۱۲۲۱ اور ۱۲۳۶ کے مابین لکھا گیا ہے -

تیسرا تذکرہ عقد ثریا ہے - اس کا سنہ تالیف اول الذکر دونوں تذکروں سے قبل یعنی ۱۱۹۸ ھجری ہے - یہ تقریباً ڈیڑھ سو فارسی گو شاعروں کا تذکرہ ہے جس میں تین قسم کے شاعر ہیں - (۱) وہ ایرانی شعرا جو کبھی ہندوستان نہیں آے - (۲) وہ شعراے ایران جو ہندوستان آے (۳) ہندوستانی فارسی گو شعرا -

اس تذکرہ میں مصحفی نے ہر شاعر کے کلام کا انتخاب بھی درج کیا تھا لیکن غالباً فارسی کلام کو غیر ضروری سمجھ کر اور بخوف طوالت اس کو یہاں حذف کردیا ہے تاہم تمام شاعروں کے حالات بے کم و کاست درج کئے گئے ہیں —

مصحفی حاتم سے لے کر آتش تک ذاتی ملاقات رکھتا تھا گویا اردو شاعری کے تین ممتاز دوروں کے شاعروں کو اس نے دیکھا ہے - اس لئے اس کی معلومات خاص اہمیت رکھتی ہیں - ان تذکروں میں مصحفی نے جگہ جگہ شاعروں کے خانگی حالات اور اس زمانے کے معاشرتی و تاریخی

واقعات بھی لکھہ دئے ھیں - یہ صرف مصحفی ھی لکھہ سکتا تھا اس لئے کہ اس نے بڑی طویل عمر پائی اور مختلف دوروں کے شاعروں سے ذاتی واقفیت بھی رکھتا تھا - ان تذکروں میں جا بجا شاعروں کے کلام پر تنقیدیں بھی ھیں جو صاف صاف بیان کردی گئی ھیں - ان میں بعض ایسی ھوسکتی ھیں کہ جن سے آج اختلاف ھوسکتا ھے لیکن بعض اساتذہ کے متعلق اس نے جو غور و تامل کے بعد رائیں دی ھیں وہ نہایت سنجیدہ اور قابل قبول ھیں - قدیم یعنی عہد محمد شاہ سے قبل کے اردو گو شاعروں کو مصحفی نے تقریباً نظر انداز کردیا ھے - صرف چند شاعروں کا ذکر لکھا ھے لیکن عہد محمد شاہ سے لے کر شاہ عالم اور آصف الدولہ کے زمانے تک کے شاعروں کے حالات اس نے قلم بند کیے ھیں - کہیں کہیں حالات و واقعات کی صحت مشتبہ نظر آتی ھے - یہ صرف مصحفی کے ساتھہ مخصوص نہیں ھمارے اکثر تذکروں کا یہی حال ھے —

پہلے دو تذکرے اردو شاعروں کے حالات پر مشتمل ھیں جن سے بہت سے شاعروں کے حالات روشنی میں آتے ھیں اور بہت سی نئی اطلاعات ملتی ھیں اور جن شاعروں کے کلام محفوظ نہیں ھیں ان کا منتخب کلام ھمیں ان تذکروں میں آسانی سے مل جاتا ھے - عقد ثریا حالانکہ فارسی گو شاعروں کا تذکرہ ھے لیکن اس میں اکثر ایسے شاعروں کا ذکر ھے جو اردو میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے - اس لئے یہ تینوں تذکرے اردو ادب کی تاریخ میں بہت سی باتوں کا اضافہ کرتے ھیں - اردو ادب سے ذوق رکھنے والوں کے لئے ان کا مطالعہ ناگزیر ھے —

ان تینوں تذکروں کو مولوی عبدالحق صاحب مد ظلہ نے نہایت صحت و عمدگی سے مرتب کیا ھے اور ایک مقدمہ لکھا ھے جس میں مصحفی کے

سوانح حیات وغیرہ نہایت تحقیق کے ساتھہ قلم بند ہوے ہیں - مصحفی کے حالات اب تک اتنی صحت کے ساتھہ نہیں لکھے گئے تھے مقدمے میں تذکروں پر بھی تنقید کی ہے اس میں ضمناً بہت سی دلچسپ اور مفید باتیں آگئی ہیں - تذکروں کی طباعت و کتابت بھی نہایت خوشنما اور پاکیزہ ہے —

انجمن ترقی اردو نے تذکروں کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا ہے چنانچہ اب تک کئی تذکرے خاص تلاش سے فراہم کرکے شایع کیے جا چکے ہیں - اب انجمن کے پیش نظر قدرت اللہ شوق اور مفتون اورنگ آبادی کے تذکرے ہیں جن کو انجمن مرتب کرچکی ہے اور عنقریب شایع کرنے کا ارادہ رکھتی ہے - مصحفی کے تذکروں کے ساتھہ انجمن نے گلزار ابراہیم کو بھی شایع کیا ہے —

(ج)

گلزار ابراہیم

صفحات مع مقدمات وغیرہ ۲۷۰ لکھائی چھپائی اور کاغذ نہایت عمدہ

قیمت مجلد دو روپے آٹھہ آنے غیر مجلد دو روپے

ملنے کا پتہ :- انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن

یہ ۳۲۰ اردو گو شاعروں کا تذکرہ ہے جو ۱۱۹۸ ھ کے پس و پیش زمانے میں تحریر ہوا ہے - اس کے مولف نواب علی ابراہیم خاں خلیل ہیں جو وارن ہیسٹنگز کے زمانے میں بنارس کے چیف مجسٹریٹ تھے اور بعد کو

گورنر بھی ہوگئے تھے - انہوں نے اپنے ذاتی شوق اور عہدہ کے اثر سے بہت سے شاعروں کے حالات اور کلام کو یکجا جمع کیا اور حتی الامکان بقید سنین اپنے تذکرہ کو مرتب کیا ہے - اس تذکرہ کی بناء پر جان گلکرسٹ کی فرمایش پر علی لطف نے ۱۲۱۵ھ میں اپنا تذکرہ گلشن ہند لکھا جو ۲۸ سال قبل مولوی شبلی مرحوم کی تصحیح و تحشیہ اور مولوی عبدالحق صاحب مدظلہ کے مقدمہ کے ساتھ شایع ہوچکا ہے - گلشن ہند میں صرف ۶۸ شاعروں کا حال ہے جو گلزار ابراہیم سے انتخاب کرکے اردو میں منتقل کیا گیا ہے - ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نے گلزار ابراہیم کو مرتب کیا ہے - اس کی ترتیب میں یہ التزام رکھا ہے کہ گلشن ہند میں جن شاعروں کا حال تھا اس کو اردو میں علی لطف ہی کے الفاظ میں درج کیا ہے اور جہاں جہاں علی لطف نے حذف یا اضافہ اور ترمیم و تبدیل کی تھی اس کو بتا دیا ہے - بقیہ ۲۵۲ شاعروں کے حالات علی ابراہیم کی فارسی عبارت میں ہیں - صرف ۶۸ شاعروں کے حالات اردو میں علی لطف کے تحریر کردہ ہیں - اسی طریقے سے گلشن ہند اور گلزار ابراہیم دونوں ایک جلد میں آگئے ہیں اور اسی بناء پر مرتب نے مولوی عبدالحق صاحب مدظلہ کا مقدمۂ گلشن ہند اس میں شریک کردیا ہے اور خود گلزار ابراہیم پر ایک علحدہ مقدمہ لکھا ہے جس میں دونوں تذکروں کے بیانوں کے اختلاف وغیرہ کی نوعیت پر بہت جامعیت سے بحث کی ہے - فاضل مرتب نے کتاب کے آخر میں اشاریہ (انڈکس) لگا کر اسے اور زیادہ مفید بنا دیا ہے - ڈاکٹر صاحب اگر مولف کے مختصر حالات تحریر فرما دیتے تو اچھا تھا —

گلزار ابراہیم کے مولف نے بڑی تلاش و جستجو اور محنت و استقلال سے کام لیا ہے لیکن اس پر بھی وہ تمام فروگذاشتیں اس میں موجود

ہیں جو عام طور سے ہمارے تذکروں میں پائی جاتی ہیں - ڈاکٹر صاحب نے اس کی اہمیت کو طرح طرح سے جتایا ہے اور لکھا ہے کہ کئی اطلاعیں اس میں ایسی ملتی ہیں جو دوسرے تذکروں میں مفقود ہیں ان کا بیان ہے کہ مرثیہ گوئی کی ترقی کے " جس قدر ثبوت گلزار ابراہیم سے حاصل ہوتے ہیں اس زمانے کے شاید ہی کسی اور تذکرہ سے مل سکیں " مثلاً مرتب نے انسان، خلیفہ، شاہی، صبر وغیرہ مرثیہ گویوں کے نام پیش کیے ہیں جن کا اس تذکرہ میں ذکر ہے - لایق مرتب کو غالباً یہ علم نہیں کہ ان شاعروں کی مرثیہ گوئی کی نسبت میر حسن شوق وغیرہ علی ابراہیم سے قبل لکھہ چکے ہیں چنانچہ اس سے قبل کے تذکروں میں کئی مرثیہ گویوں کے نام ملتے ہیں - اسی طرح مثنویوں اور دیگر نظموں کے متعلق بھی مرتب نے یہی خیال ظاہر کیا ہے اور مختلف نو نظموں کے نام درج کیے ہیں - حالانکہ ان میں کوئی نظم بھی ایسی نہیں جن کا ذکر اس سے قبل کے تذکروں میں درج نہ ہو —

ہر تذکرے میں کچھہ نہ کچھہ خامیاں ضرور نظر آتی ہیں لیکن علی ابراہیم کی بعض فروگذاشتیں تعجب خیز ہیں مثلاً وہ بے کل دولت آبادی کو عزلت کا شاگرد بتاتے ہیں حالانکہ وہ آزاد بلگرامی کا شاگرد تھا اس نے خود اپنے تذکرہ تالیف بے نظیر میں اس کا ذکر بھی کیا ہے - اس تذکرہ میں عزلت کے بھی حالات درج ہیں لیکن صرف ایک ملاقات کا حوالہ ہے جو اتفاقاً مولف سے دولت آباد میں ہوئی تھی - اس طرح اپنے ایک ملاقاتی فقیہہ دردمند کا نام فقیر لکھا ہے اور اس کو عظیم آبادی لکھا ہے حالانکہ دردمند اودگیر (دکن) کا باشندہ تھا اور مظہر کا خاص شاگرد - مرزا عارف الدین خاں عاجز اورنگ آبادی کو عارف علی خاں اکبر آبادی لکھا ہے - حالانکہ عارف اکبر آبادی ایک دوسرا شاعر ہے جس کا ذکر میر وغیرہ نے کیا ہے -

مولف نے کئی گمنام اور کم حیثیت شاعروں کو اپنے تذکرے میں جگہ دی ہے لیکن بعض مشہور شاعروں کو چھوڑ دیا ہے - اسی طرح اور کئی فرو گذاشتیں ہیں - اگر مرتب ان کا مقابلہ دوسرے تذکروں سے کر لیتے تو بہت آسانی سے یہ چیزیں معلوم ہو جاتیں —

گلزار ابراھیم کے مفید ہونے میں شبہہ نہیں - اس میں معاصرین کے حالات بہت عمدگی سے مدون ہوے ہیں اور ان کے متعلق بہت سی کار آمد باتیں ملتی ہیں - غلطیوں سے تو شاید ہی کوئی تذکرہ بچا ہو - انجمن کے پیش نظر چند اور تذکرے بھی ہیں ان کی اشاعت کے بعد کیا اچھا ہو اگر ان سب کا ایک انڈکس تیار ہوجاے اور ان کی غلطیوں اور اختلاف کو ایک علحدہ جلد میں شائع کیا جاے - یہ بہت کام کی چیز ہوگی اور انجمن کو ضرور اس کی طرف توجہ کرنی چاہئے —

(چ)

تاریخ وسیر

تاریخ اسلام (جلد سوم)

(مصنفۂ اکبرشاہ خاں صاحب نجیب آبادی - مطبوعۂ منیجر صاحب رسالۂ صوفی)

اس تاریخ کے پہلے دو ابواب (۱۱ و ۱۲) میں اسلامی اُندلس کی تاریخ ہے - ایک ایک باب میں ممالک افریقیہ ' چنگیزی مغول اور پھر دولت عثمانیہ کے حالات (سلطان سلیم فاتح کی وفات تک) تحریر کئے

ہیں - خاتمہ کے عنوان سے اقوام اسلامی کے اسباب انحطاط پر اجمالی بحث اور پھر ایک پر جوش مناجات (نثر میں) لکھ کر اس جلد کو ختم کر دیا ہے - فاضل مصنف کا بیان نافی سلیس و شگفتہ اور پر مغز ہے اور ہمیں امید ہے کہ مسلمان طلبہ جنہیں اسلامی تاریخ سے دلچسپی ہے اس کتاب سے بخوبی استفادہ کر سکیں گے - اگر چہ اس کا طرز عہد جدید کی تاریخ نویسی سے مطابقت نہیں رکھتا - لائق مصنف نے اپنے کسی ماخذ کا حوالہ نہیں دیا - نہ کہیں یہ اعتراف کیا کہ کن کتابوں سے عبارتیں کی عبارتیں نقل یا تلخیص کی گئی ہیں - وہ واقعات کو غور و تجسس سے سمجھ کر لکھنے یا دل نشین کرنے کی بجائے اختصار و تسلسل تاریخی کے ساتھ لکھتے چلے گئے ہیں - البتہ کہیں کہیں فرنگی مورخوں کی تردید کی ہے اور اپنے ہم قوموں کو عبرت و غیرت دلانے کا موقع ہاتھ سے نہیں دیا ہے - خدا کرے ان کی سعی مشکور ہو - کتاب چار سو صفحات پر چھپی ہے - قلم باریک اور کاغذ ادنیٰ درجے کا ہے - تین روپیہ قیمت پر دارالاشاعت صوفی - پنڈی بہاءالدین (پنجاب) سے طلب کی جا سکتی ہے -

(ش)

حیات نادر

(تالیف جناب محمد حسین خاں صاحب سابق رئیس
تدریسات عمومی افغانستان - مطبوعۂ ہانڈہ پریس جالندھر)

محمد حسین خاں صاحب بی - اے (علیگ) مشہور مصنف اور ماہر تعلیمات ہیں - افغانستان میں اکیس سال تک سر رشتۂ تعلیمات کے اعلیٰ افسر رہے -

جو واقفیت ان کو اس مملکت اور وہاں کے مختلف حالات سے ہے وہ شاید ہی ہندوستان کے کسی باشندے کو ہو۔ افغانستان کے متعلق وہ اس سے قبل بہت کچھ لکھ چکے ہیں - اور ان کا لکھا ہوا بلا شبہ مستند اور قابل اعتماد ہے۔ اس کتاب میں فاضل مصنف نے نادرشاہ مرحوم کی زندگی کے حالات' ان کے خصائل و عادات اور ملک میں ان کی وجہ سے جو امن اور ترقیاں ہوئیں ان سب کو بڑی خوبی سے بیان کیا ہے - اور ضمناً شاہ مرحوم کے بھائیوں اور ان کے فرزند و جانشین محمد ظاہر شاہ کے حالات بھی آگئے ہیں - کتاب پڑھنے کے قابل ہے -

---

تاریخ سلطنت خداداد

(مولفۂ جناب محمود خاں محمود بنگلوری صفحات ۴۲۱ - قیمت چار روپے - ملنے کا پتا : محمد سراج الدین نمبر ۹۳ بلا کپلی روڈ ' بنگلور)

ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کے انحطاط پر ایک عام پریشانی اور افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔ ہر صوبہ اور علاقہ انانیت کا دم بھر رہا تھا اور خود مختاری کے خواب دیکھ رہا تھا۔ سارے ملک میں کش مکش' جد و جہد اور جنگ وجدل کا بازار گرم تھا۔ اس ہما ہمی کے عالم میں جنوبی ہند میں دو ایسے جوانمرد' شیردل بہادر نمودار ہوے جن کے نام اور کام تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیں گے۔ اور جوں جوں تاریخ کے چہرے سے تعصب و ناانصافی کے پردے اٹھتے جائیں گے' اِن کی بے مثل شجاعت و دلیری' ان کی حب وطن' ان کا انصاف و بے تعصبی' ان کے انتظام کی خوبیاں

اور دو راندیشیاں روز بروز اجا گر ہوتی جائیں گی —

محمود خاں صاحب محمود نے تعصب اور بے انصافی کے اس تاریک پردے کے اٹھانے کی کوشش کی ہے - فاضل مولف نے نہایت تحقیق اور کاوش سے نیز مختلف زبانوں کی تاریخوں کے مطالعہ کے بعد اس کتاب میں نواب حیدر علی خاں اور ٹیپو سلطان کے حالات و انتظامات اور جنگ آزمائیاں تنصیل سے بیان کی ہیں اور اُن غلط اور بے بنیاد اتہامات کے محققانہ جواب دیے ہیں جو مخالفوں نے اِن بہادر اور جری باپ بیٹوں کے نسبت کتابوں میں لّہہ لکھہ کر مشہور کر رکھے ہیں اور بسا اوقات انہیں کے ہم قوم مورخوں اور مدبروں کے بیانات پیش کرکے ان کے الزامات کی تغلیط کی ہے - مجھے خوب یاد ہے مولوی بشیرالدین احمد (بانیء اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ) ایک مدت سے بیتاب تھے کہ کیوں کوئی حیدر علی اور ٹیپو سلطان کے حالات تحقیق و صحت کے ساتھہ نہیں لکھتا - آج ان کے صدہا ہم خیال بزرگوں کی دیرینہ آرزو پوری ہوگئی - حقیقت یہ ہے کہ محمود صاحب نے ایسا اچھا اور بڑا کام کیا ہے کہ اُس کی جتنی تعریف کی جاے کم ہے - نواب حیدر علی اور سلطان شہید کے حالات و انتظامات کا کوئی شعبہ اور ادنیٰ سا ادنیٰ اور جزوی سا جزوی صیغہ بھی ایسا نہیں جو مصنف کی نظر سے بچا ہو- نبرد آزمائی اور جنگ جوی کے ساتھہ اُن کے مالی ' فوجی ' بحری انتظامات ' ان کی رواداری اور بے تعصبی ' ان کی عمارات اور سکے ' ان کی قدردانیاں ' ان کی دوراندیشیاں اور پیش بینیاں ' ان کا تدبر اور مصلحت اندیشی ' اُن کے حریف ان کے وزرا و امرا غیرہ سب کا ذکر آگیا ہے —

ان کی شجاعت و دلیری ' انتظامی قابلیت ' انصاف پسندی اور

تدبر و دور اندیشی کو دیکھہ کر حیرت ہوتی ہے کہ ان کی حکومت کو کیوں زوال ہوگیا - جنھیں کسی لڑائی میں شکست نہوئی ہو ' جنھوں نے ایک ہی وقت میں تین تین دشمنوں کی فوجوں کو پسپا اور پامال کیا ہو ' جن کی رعایا ان کی جاں نثار ہو ' جن کے انتظام سے ہندو مسلمان سب (بقول انگریزی مورخوں کے) اس قدر خوش حال اور فارغ البال ہوں کہ انگریزی رعایا کے خواب میں بھی کبھی ایسی خوش حالی نہ آئی ہو وہ کیوں مٹ گئے ؟

یہ صحیح نہیں ہے کہ قومی زوال کے زمانے میں شجاع اور فدائے قوم و ملت یا صاحب دماغ لوگ نہیں ہوتے ؛ ضرور ہوتے ہیں اور اکثر بے مثل اور بے نظیر ہوتے ہیں - لیکن قومی اخلاق میں اس قدر پستی اور انحطاط پیدا ہوجاتا ہے کہ لوگ اُن کا ساتھہ نہیں دیتے یا نہیں دے سکتے- یہی نہیں بلکہ ان میں خود غرضی اور حسد کا ایسا قوی مادہ پیدا ہوجاتا ہے کہ وہ ان مخلصوں کے ہر کام کو مٹانے اور ان کے وجود کو فنا کرنے میں مصروف ہوجاتے ہیں —

سلطنت خداداد کا زوال غداری کی صورت میں نازل ہوا - دنیا میں جب تک تاریخ کا وجود ہے میر صادق، میر غلام علی' میر قمرالدین' بدرالزماں نائطہ اور پورنیا پر لعنت برستی رہےگی - جو اصل حقیقت سے واقف ہونا چاہتے ہیں وہ اس کتاب کا مطالعہ فرمائیں —

کتاب بہت اچھے کاغذ پر چھپی ہے اور ۱۳ تصویریں اس میں شامل ہیں جن میں بعض بہت عبرتناک ہیں —

———

ایکناتھ

(مولفۂ شیخ چاند صاحب ایم-اے' ایل ایل - بی' ری سرچ
سکالر عثمانیہ یونیورسٹی - صفحات ۱۳۰ قیمت ۱۲ آنے
انجمن ترقی اردو سے مل سکتی ھے)

پٹن دریاے گوداوری کے کنارے ممالک محروسہ سرکار عالی کا نہایت قدیم شہر ھے' کسی زمانے میں یہ پنڈتوں کا استھان' علوم سنسکرت کا گھر اور ھندؤں کا بڑا تیرتھ تھا - اب ایک معمولی قصبہ ھے - اس وقت بھی تاریخ کے دلدادہ اس اجڑے گانو کی زیارت کو جا پہنچتے ھیں -

ایکناتھ کا جنم بھوم یہی پٹن تھا - شیخ چاند صاحب نے اپنے اس ھم وطن سادھو شاعر کے حالات اور کلام پر یہ کتاب لکھ کر اپنی حب وطن ھی کا ثبوت نہیں دیا بلکہ اردو ادب میں بھی اضافہ کیا ھے —

ایکناتھ بڑے پایہ کا سادھو اور مصلح ھوا ھے اور اس کے ساتھ ھی مرھٹی کا بہت بڑا شاعر بھی ھے - یوں تو اس کی کئی کتابیں ھیں لیکن اس کی سب سے بڑی تصنیف بھاگوت ھے - ایکناتھ نے دنانیشور کے بعد مرھٹی زبان کے زندہ کرنے اور رواج دینے میں بڑا کام کیا ھے - اس کا اثر مرھٹی شاعری اور مرھٹی سادھوؤں اور مہاراشٹر کی اخلاقی اور مذھبی زندگی پر اب تک ھے —

مسلمانوں میں بہت کم ایسے لوگ ھوتے ھیں جو اپنی مادری زبان کے

علاوہ ہندوستان کی دوسری زبانوں میں بھی مہارت حاصل کرتے ہوں اور وہاں کے معلومات سے اپنی زبان کو فیض پہنچاتے ہوں - اس لحاظ سے شیخ چاند صاحب قابل مبارک باد ہیں کہ انہوں نے مرھٹی زبان کے ایک اعلیٰ شاعر اور مہاراشٹر کے بہت بڑے سادھو ' معلم اور مصلح کے حالات و تعلیمات کو ایسی پاک صاف اور اچھی اردو میں بیان کیا ہے —

سیر الصحابہ

(جلد ششم و ہفتم - تالیف مولوی شاہ معین الدین احمد رفیق درالمصنفین)

صحابۂ رسول (صلی اللہ علیہ و سلم) کے حالات کو اردو میں چھاپنے کا جو مفید سلسلہ دارالمصنفین اعظم گڑھ نے شروع کیا تھا ' اس کی یہ آخری دو جلدیں ہیں - جلد ششم میں حسنین ' امیر معاویہ ' اور عبداللہ ابن زبیر (رضی اللہ عنہم) کے حالات لکھے ہیں اور ہفتم میں ڈیڑھ سو ایسے صحابہ کے تراجم ہیں جو فتح مکہ کے بعد مسلمان ہوے یا عہد رسالت میں صغیرالسن تھے - مگر ان حضرات کے اوصاف و اخلاق پڑھکر شاید اور بھی بہتر اندازہ ہوسکتا ہے کہ اُس چشمۂ نور و ہدایت کا اثر کتنا انقلاب انگیز تھا کہ جنھیں صرف چند جرعے میسر آے ' انھیں بھی عمر بھر کیف و سرشاری رہی -

چہ مستی ست ندانم کہ روبما آورد
کہ بود ساقی و ایں بادہ از کجا آورد

لیکن حصۂ ہفتم کی نسبت ' جلد ششم کو لکھنا رس اعتبار سے دشوار تر تھا کہ اس جلد میں بہت سے ایسے تاریخی اور "اعتقادی" واقعات سے

بحث کرنی پڑی جن کی بدولت ملت اسلامی میں نسل ہانسل تک خانہ جنگی رہی اور خون کی ندیاں بہا ی گئیں- حتیٰ کہ آج تک نہ صرف اختلاف بلکہ بعض اسلامی فرقوں میں دوسروں سے کینہ و عناد موجود ہے - نظر برایں فاضل مولف ہمارے نزدیک مبارک باد کے مستحق ہیں کہ ہر جگہ ایک راسخ العقیدہ سنی مسلمان رہنے کے باوصف انہوں نے انصاف و معقولیت کا دامن ہاتھہ سے جانے نہیں دیا اور کہیں بھی ایسی شدت اختیار نہیں کی جو اختلاف راے کے باوجود کسی فریق کی دل آزاری کا موجب ہو - باقی ' ان کی خوش اعتقادی کی مثال میں یہی لکھنا کافی ہوگا کہ واقعۂ کربلا کی انہوں نے جملہ تفصیلات اور انفرادی مقابلوں تک کے حالات ڈھونڈ ڈھونڈ کر جمع کر دیے ہیں بحالیکہ مدینۂ مبارکہ کے سقوط اور غارتگری کو صرف چند سطروں میں ختم کر دیا ہے ۔ اگرچہ ہمارے خیال میں سیاسی اور تاریخی اہمیت کے علاوہ' اعتقادی نظر سے بھی یہ واقعہ کچھہ الم ناک نہ تھا اور غالباً یزید کی ذاتی شقاوت کا کربلا سے بھی بڑھ کر یقینی ثبوت بہم پہنچا سکتا ہے - لیکن کسی ایسے فروعی اختلاف راے سے ان کتابوں کی مجموعی قدر و قیمت میں کچھہ کمی نہیں آتی اور حق یہ ہے کہ یہ پورا سلسلہ اردو خواں مسلمانوں کی ضیافت کا بہترین سامان ہے جسے دارالمصنفین نے اسلامی تاریخ و تراجم سے ذوق رکھنے والوں کے لئے بہت قرینے سے مہیا کردیا ہے -

کتابوں کی زبان صاف و شگفتہ ' لکھائی چھپائی مطبع معارف کے معیار کے مطابق اور ہر حصے کی قیمت تین تین روپے ہے -

(ش)

متفرقات

خزینۂ معلومات

(ایجو کیشنل بک ہاؤس، سیول لائنز، علی گڈھ قیمت دو روپے)

(ملنے کا پتا: انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن)

یہ کتاب فی الحقیقت اسم با مسمیٰ ہے - اس میں ہر قسم کی ضروری اور کارآمد معلومات جمع کردی گئی ہیں - مثلاً ڈاک خانہ، تار برقی، ریڈیو، ہوائی جہاز کا سفر، ریلوے، تجارت، بحری سفر، قوانین کسٹم، پروانۂ راہداری، طبعی معلومات، پبلک، دائمی جنتری، عدالت، مال، فوجداری وغیرہ کے متعلق تفصیلی اطلاعات درج ہیں - کتاب ضخیم ہے اور ۵۲۸ صفحے پر ہے —

---

(۱) اعادۂ شباب و درازیٔ عمر (۲) تجدید شباب کے چند مغربی طریقے (۳) اعادۂ شباب کا ایک سہل طریقہ (۴) درون افرازیات (۵) بڑھاپے سے مقابلہ (۶) عمر گھٹنے

کے اسباب (۷) نفسیاتی علاج (۸) قوائے جسمانی پر غذا کا اثر (۹) وٹامائنس

(تالیفات لفٹننٹ کرنل ڈاکٹر محمد اشرف الحق صاحب قلعہ گولکنڈہ، حیدرآباد دکن)

یہ چھوٹی چھوٹی مگر مفید اور قابل مطالعہ کتابیں جن کی قیمت چار چار آنے اور بعض کی دو آنے اور چھ آنے ہے لفٹننٹ کرنل ڈاکٹر محمد اشرف الحق صاحب کے متواتر مطالعہ، عمل اور محنت کا نتیجہ ہیں۔ پہلی چار کتابوں میں انہوں نے ان اعمال کی تشریح کی ہے جن کے رو سے شباب پھر عود کر آتا ہے اور بڈھوں میں جوانی کا دم خم پیدا ہوجاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا علم محض کتابی نہیں بلکہ وہ خود اس کے عامل ہیں اور بیسیوں مریضوں پر کامیابی کے ساتھ عمل کر چکے ہیں۔ جو لوگ اپنے قویٰ کو تازہ کرنا اور اپنی کھوئی ہوئی قوت کو دوبارہ حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ ان کتابوں کا ضرور مطالعہ کریں اور ڈاکٹر صاحب سے مشورہ کریں انہوں نے حتی الامکان صاف اور سلیس زبان میں اعادۂ شباب وغیرہ علاجوں کی کیفیت ان کتابوں میں بیان کردی ہے —

دو کتابیں غذا اور اس کے اثر کے متعلق ہیں۔ انہیں ہر شخص پڑھ کر فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اس زمانے میں جب کہ ادویہ کا استعمال خبط کی حد تک پہنچ گیا ہے اور لوگوں کے قویٰ میں انحطاط پیدا ہورہا ہے، ان کتابوں کا مطالعہ بیحد مفید ہوگا۔ غذا کی اصلاح اور اس کا صحیح استعمال اکثر و بیشتر حالات میں صحت و درازیٔ عمر کا ضامن ہوتا ہے

اور بہت سی بیماریوں سے محفوظ رکھتا ہے - ان چھوٹی چھوٹی کتابوں میں فاضل ڈاکٹر نے جامع طور سے نہایت کارآمد اور ضروری معلومات جمع کردی ہیں - جن کا پڑھنا ہر ایسے شخص پر فرض ہے جو صحت اور مسرت اور کامیابی سے اپنی زندگی بسر کرنا چاہتا ہے —

———

اُردُو کے جدید رسالے

یہ خوشی کی بات ہے کہ ہر سال بلکہ ہر مہینے اردو زبان میں نئے نئے رسالے شایع ہوتے رہتے ہیں، لیکن جب کچھ دنوں کے بعد بند ہو جاتے ہیں تو اسی قدر افسوس بھی ہوتا ہے - ایسے مقامات سے رسالے شایع کرنا جہاں پہلے سے کوئی رسالہ نہیں نہایت ضروری ہے، وہاں اردو زبان اور ادب کا شوق پیدا کرنے کے لیے اس سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں ہو سکتا - لیکن ایک ہی مقام سے بہت سے رسالے شایع کرنا خصوصاً جب کہ کوئی خاص مقصد پیش نظر نہیں ہے، غیر ضروری ہی نہیں نقصان رساں بھی ہے - ابھی نہ اچھے لکھنے والوں کی تعداد کثیر ہے اور نہ پڑھنے والوں کی، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سب کو نقصان پہنچتا ہے - ایسی صورت میں یہ زیادہ مناسب ہوگا کہ جو رسالے پہلے سے موجود ہیں اور اردو زبان کی معقول اور خاطر خواہ خدمت کر رہے ہیں انہیں کو مدد دی جائے اور ان کو زیادہ بہتر اور مفید بنایا جائے - بہر حال ان صاحبوں کی اولوالعزمی قابل تعریف ہے جو

باوجود گونا گوں رکاوٹوں کے اپنا روپیہ، محنت اور وقت صرف کرکے اردو زبان کی خدمت کا شوق رکھتے ہیں - ان ایام میں جو جدید رسالے شایع ہوئے ہیں ان کا ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے —

جاوید

ماہانہ رسالہ ہے جسے عبدالوحید صدیقی صاحب اور محمد ادریس صاحب میرٹھی مرتب کرتے ہیں - دہلی سے شایع ہوتا ہے —

شباب

اسی سال لکھنؤ سے نکلا ہے- شوکت تھانوی صاحب اس کے اڈیٹر ہیں، جن کے بیان کی شوخی اور دلکشی محتاج بیان نہیں -

---

انتخاب

یہ بھی لکھنؤ سے سہنی ندوی صاحب کی ایڈیٹری میں شایع ہوا ہے -

شہاب

یہ جوناگڑہ سے شایع ہوتا ہے - اس کے مرتب مولوی سید ابوظفر ندوی صاحب اور قاضی احمد میاں اختر صاحب ہیں - دونوں صاحب علم اور صاحب ذوق ہیں - جوناگڑہ میں بلاشبہ ایک ایسے ادبی رسالے کی ضرورت تھی اور امید ہے کہ یہ ضرور مفید خدمت انجام دے گا -

---

بانو

یہ بھوپال سے نکلا ہے - نام سے ظاھر ہے کہ عورتوں کے لئے ہے - اس کی اڈیٹر خاتون ارشد صاحبہ (ظہور فاطمہ بیگم) ھیں -

پھول باغ

پٹیالہ سے شایع ھوتا ہے - صاحبزادہ کوشاں سنگت پوری اڈیٹر ھیں -

فلم لائٹ

یہ رسالہ علی گڑہ کا ہے - اڈیٹر محمد مزمل اللہ خاں صاحب تلقین اور محمد شریف اللہ خاں صاحب عابر ھیں' اس میں فلم کی بعض عورتوں کی تصویریں ھیں اور کچھہ معمولی مضامین -

شفق

ظفر تاباں صاحب اور رشید طلعت صاحب کی ادارات میں دھلی سے شایع ھوتا ہے -

نرگس

یہ رسالہ لاھور کا ہے - فضل حسین صاحب اس کے مرتب ھیں - سر ورق سادہ اور دلکش ہے - ادبی اور تاریخی مضامین ھیں اور سلیقے سے لکھے گئے ھیں - اگرچہ لاھور میں رسالوں کی کچھہ کمی نہیں مگر اس کا رنگ ڈھنگ کچھہ الگ معلوم ھوتا ہے - اور یقین ہے کہ یہ ذوق صحیح کی اشاعت میں اچھا کام کرے گا —

ھم نے ان رسالوں پر تفصیلی تبصرہ نہیں کیا اس لئے کہ سب کا

مقصد واحد ھے یعلے اُردو زبان اور ادب کی خدمت ' اور سب کے سب تقریباً ایک سے ھیں - انیس بیس کا فرق ضرور ھے - ان میں نرگس ' شفق اور شہاب ھونہار معلوم ھوتے ھیں - ان کی ترتیب اور چھپای وغیرہ میں بھی صفائي اور سلیقہ نظر آتا ھے —

رھنمائے تعلیم کا فسانہ نمبر

رھنمائے تعلیم نے اپنے خاص نمبروں سے خاصی شہرت حاصل کرلی ھے - یہ نمبر بھی بہت ضخیم ھے اور ۴۵۶ صفحہ کا ھے - اس میں ھر قسم کے فسانے موجود ھیں اور کچھہ نظمیں بھی ھیں - دلچسپی کا بہت اچھا مجموعہ ھے - رسالہ کے اڈیٹر نیز ماسٹر جگت سنگھ صاحب مینجنگ پروپرائٹر کی محنت قابل تحسین ھے —

"خیابان" لکھنؤ

ھندوستان کا واحد اُردو مصور ریسرچ رسالہ - زیر ادارت مسٹر شہنشاہ حسین رضوی - ایم اے ایل ایل - بی (علیگ)

ایم - آر - اے - ایس (لندن) ایڈووکیٹ

—— §*§ ——

جس کا نصب العین حسب ذیل ھے —

اردو زبان و ادب کی تحقیق و تدقیق - اردو میں علوم مغربیہ و مشرقیہ کی ترویج - سلف الصالحین کے علمی کارناموں کا احیاء - باقیات الصالحات کے علمی تحقیقات کی اشاعت - دوسری زبانوں کے علمی تراجم و اقتباسات - مطبوعات جدیدہ پر تنقید و تبصرہ —

—— o)*(o ——

چندہ سالانہ پانچ روپیہ نمونہ آٹھ آنے

دارالاشاعت - وکٹوریہ اسٹریٹ - لکھنؤ

« ادبی دنیا »

مشرق و مغرب کے بہترین افسانہ نویسوں کے افسانے اور اُردو کے بہترین شاعروں کا کلام دیکھنا ہو تو ادبی دنیا کو زیر مطالعہ رکھئیے - فی پرچہ ۲ آنے سالانہ چندہ چار روپے ۱۳ آنے

منیجر « ادبی دنیا » لاہور

« ادبی دنیا »

ہندوستان بھر کے اُردو رسائل میں سب سے ضخیم سب سے مفید اور سب سے سستا رسالہ ہے - اپریل سے سائز دگنا کر دیا گیا ہے - اپنے اخبار فروش یا منیجر ادبی دنیا لاہور سے طلب کریں -

« ادبی دنیا »

اپنے ناظرین کو گیارہ سو صفحات کے بہترین مضامین نظم و نثر اور تین درجن کے قریب رنگین و یک رنگ تصاویر دے رہا ہے - قیمت فی پرچہ ۲ آنے سالانہ ۴ روپے ۱۳ آنے

منیجر « ادبی دنیا » لاہور

« ادبی دنیا »

میں صرف اعلیٰ پایہ کی نظمیں اور افسانے چھپتے ہیں اس لیے اعلیٰ پایہ کے لوگ صرف ادبی دنیا خریدتے ہیں - فی پرچہ ۲ آنے سالانہ چندہ چار روپے ۱۳ آنے -

مینیجر « ادبی دنیا » لاہور

« ادبی دنیا »

« ادبی دنیا » کے دور جدید میں مضامین کا معیار پہلے سے بھی بلند ہے - « ادبی دنیا » کی جاذبیت اور دلکشی میں بے حد اضافہ ہو گیا ہے - « زمیندار »

« ادبی دنیا » کا مطالعہ بصیرت کو روشن کرتا ہے -

« مدینہ »

فی پرچہ ۲ آنے - سالانہ چار روپے ۱۳ آنے -

منیجر « ادبی دنیا » لاہور

اردو

جلد ۱۴	جولائی سنہ ۱۹۳۴ ع	حصہ ۵۵

انجمن ترقی اردو کا سہ ماہی رسالہ

اورنگ آباد (دکن)

اردو

جلد ۱۴	جولائی سنہ ۱۹۳۴ ع	حصہ ۵۵

انجمن ترقی اردو کا سہ ماہی رسالہ

اورنگ آباد (دکن)

فہرستِ مضامین

روسی ناول

پہلا دور

میخائل یف گرافووچ سالتی کوف

از

[جناب محمد مجیب صاحب بی اے (آکسن)]

میخائل یف گرافووچ سالتی کوف (۱۸۲۶ - ۱۸۸۹) جو شچدرن کے نام سے بھی مشہور ہے تور کے ایک امیر گھرانے میں پیدا ہوا - اس کا پہلا استاد پاول نامی ایک غلام کسان تھا جسے فن مصوری میں خاصا ملکہ تھا - اٹھارہ سال کی عمر میں سالتی کوف تسار کو لے سیلو کے کالج میں داخل ہوا اور وہاں سے فارغ ہوتے ہی اس نے اپنا پہلا ناول " ایک جھمیلا " لکھا - سیاسی حاکموں کو اس ناول میں بہت سی باتیں قابل اعتراض معلوم ہوئیں ' اور اس کا نوجوان مصنف جلا وطن کرکے شہر وریاتکا کو بھیج دیا گیا - یہاں وہ سات سال تک رہا مگر واپسی پر اسے سرکاری ملازمت مل گئی - ملازمت میں اس نے خاصی ترقی کی اور ایک صوبے کا گورنر بھی مقرر ہوا ' لیکن اس کی طبیعت ملازمت کے لیے بالکل ناموزوں تھی ' اور ۱۸۶۸ میں وہ اس سے پیچھا چھڑا کر انشا پردازی میں مصروف ہوگیا - پہلے وہ اخبار " ہم عصر " کا مددگار ایڈیٹر ہوا ' اور جب وہ بند کرا دیا گیا تو شاعر نکراسوف کے ساتھ اخبار ' سرگذشت وطن " کی ادارت میں

شریک ہوگیا - عمر کے آخری سالوں میں اسے ایک سخت بیماری ہوگئی جس نے اس کی زندگی تلخ کردی ' مگر اس زمانے میں بھی اس نے اپنی تصانیف کا سلسلہ جاری رکھا - وریاتکا سے واپس ہوتے ہی اُس نے افسانوں کا ایک مجموعہ شایع کیا جس کا عنوان " مفصلات کے مرقعے " تھا - ۱۸۷۶ میں اس کا ناول " حضرات گولوف لیف " چھپا جو اُس کی بہترین تصنیف مانا جاتا ھے - " تاشکنت والے " " ایک شہر کی تاریخ " " مفصلات سے خطوط " " ہمارے زمانے کی شکل " وغیرہ اور افسانے ھیں جو اسی دور میں لکھے گئے - ۱۸۸۱ کے بعد کی تصانیف کہانیاں بڑے دن کی کہانیاں اور پوشے خونسک کی تاریخ ھیں - یہ تاریخ اس کی آخری ادبی خدمت تھی —

سالتی کوف کے پہلے ناول جھمیلے کو محض مشق سمجھنا چاھئے - اس وقت اسے زندگی کا مشاہدہ کرنے کا موقع نہیں ملا تھا ' اور اس کے ذھنی قویٰ بھی پوری نشو و نما نہیں پا سکے تھے - جلا وطنی میں اسے روسی زندگی کے مشاھدے کا بہت موقعہ ملا ' اس کی سیرت بھی اس عرصے میں پختہ ہوگئی ' اور جب اس نے پیٹر برگ واپس جاکر پھر قلم اٹھایا تو وہ اپنا کمال دکھا سکا - روسی ناول نویسوں اور انشا پردازوں میں جس کسی کا بھی سرکاری ملازموں سے سابقہ رھا اس نے اپنے آپ کو اُن کی سیرت اور ذھنیت کا خاکہ اتار نے پر مجبور پایا ' اور سالتی کوف کے پہلے افسانوں کا موضوع انہیں لوگوں کی زندگی تھی - اس کی طبیعت طنز کی طرف مائل تھی لیکن وہ یہ نہیں چاھتا تھا کہ لوگ اس کے افسانے پڑھ کر ھنسیں اور پھر انہیں بھول جائیں - اس کے طنز اور تضحیک میں ایک زہر تھا ' وہ چاھتا تھا کہ یہ زہر ان لوگوں اور اس ذھنیت کے لئے مہلک ثابت ہو جن کا اس کے افسانوں میں ذکر ھے ' اور سب کے دلوں میں

نفرت کا وهی جذبہ پیدا ہوجائے جو اس کے اپنے دل میں تھا - مفصلات کے مرقعے جب شائع ہوئے تو اصلاحی تحریک بہت زور پر تھی، ان افسانوں نے اور بھی اُدھم مچادیا اور اصلاح کے حامیوں کا ایک زبردست هتھیار بن گئے - ۱۸۶۴ میں وہ انتظامی اصلاحیں جن کے لئے کوشش کی جارهی تھی ایک حد تک ریاست کی طرف سے منظور هوگئیں، ۱۸۶۱ میں کسان آزاد کردئے گئے تھے اور ان دونوں اصلاحوں نے روسی زندگی کا رنگ بدل دیا - سالتی کوف کے افسانوں کا وہ سلسلہ جو ۱۸۶۱ سے شروع ہوا پرانی زندگی کے باقی ماندہ آثار اور ان حالات کا نقشہ کھینچتا ھے جو نظام کے تغیرات نے پیدا کئے تھے - مفصلات کے مرقعوں کی طرح ان میں بھی وہ ملاصف بن کر بیٹھتا ھے، طرح طرح کے لوگوں کو اپنے سامنے بلا کر ناظرین کو ان کے اعمال نامے سناتا ھے، اور ان کو طنز اور تضحیک کے کوڑے لگاتا ھے - مختلف افسانوں میں مختلف جرموں کا پردہ چاک کیا جاتا ھے - ایک شہر کی تاریخ میں روس کی اصلاحی کوششوں اور ان کے انجام کا مضحک پہلو دکھاتا گیا ھے - پیٹربرگ کے دوران قیام میں مفصلات کے رهنے والے کا روزنامچہ وہ کیفیت ظاهر کرتا ھے جو روس کی نئی معاشرت ایک قدامت پسند زمیندار کے دل میں پیدا کرتی ھے - یہ بزرگ ایک بار تھیٹر جاتے هیں اور وهاں ایک خوبصورت ایکٹرس کو دیکھتے هیں تو انہیں اپنی بیکسی پر افسوس آتا ھے - ایک زمانہ تھا جب وہ قرب وجوار کی هر عورت کی نسبت کہہ سکتے تھے کہ وہ میری ملکیت ھے، میں اس کے ساتھہ جو چاهوں کرسکتا هوں، کل یا ابھی فوراً، میں چاهوں تو اس کے بال کٹوا ڈالوں، چاهوں تو اپنے چرواھے آن تپ سے اس کا نکاح کرادوں - لیکن اب زمانہ بدل گیا ھے، حکومت کے دن ختم هوگئے - وہ

ٹھنڈی سانس بھر کر کہتے ہیں "افسوس ! اب ہم کسی کا کچھہ نہیں بگاڑ سکتے ' چاہے وہ مرغی ہی کیوں نہ ہو "! ان آثار قدیمہ کے ساتھہ ہی سالتی کوف نے ان لوگوں کے بھی مثالی نمونے لئے ہیں جو عہد تغیر کے خاص مظاہر تھے اور معاشرتی تبدیلیوں سے بہت جا اور بے جا فائدہ اٹھا رہے تھے - اس قسم کے لوگ زیادہ تر تاجر ٹھیکے دار' کارخانہ دار وغیرہ تھے ' اور سالتی کوف نے ان کی بے ایمانیاں ' ان کا کمینہ پن ' ان کے ذلیل چال چلن اور ان کی بد اعمالیاں سب صاف صاف دکھائی ہیں اور اس طرح کہ اُن کی حمایت یا صفائی میں کچھہ بھی کہنے کی گنجائش نہیں رہتی - ان لوگوں سے بھی زیادہ سالتی کوف کو اُن تھوڑی بہت تعلیم ' تھوڑی بہت سمجھہ والے آدمیوں سے عداوت ہے جو لطیف اور اعلیٰ حوصلوں کو اپنے حیوانی سکون اور ادنیٰ نفسانی لذتوں پر قربان کرتے ہیں ' جو بے انتہا بزدل ہوتے ہیں - مگر ان تمام شخصیتوں اور تحریکوں کی مخالفت پر فوراً کھڑے ہو جاتے ہیں جن سے ان کے سکون اور لطف اندوزی میں ذرا بھی خلل پڑنے کا اندیشہ ہوتا ہے ' اور جو اپنی مخالفت میں کسی کمینی حرکت یا جرم سے پرہیز نہیں کرتے - ایسے لوگوں کے لئے روس کی فضا بہت موزوں تھی اور روس کا کوئی خطہ اس آخور سے پاک نہیں تھا - سالتی کوف نے ان لوگوں کا خاکہ اتارنے میں بڑا کمال دکھایا ہے ' اور اس کے طنز اور تضحیک کا زہر اور کسی کے لئے بھی ایسا قاتل نہیں معلوم ہوتا جتنا اس قسم کے لوگوں کے لئے -

۱۸۶۷ کے بعد سالتی کوف نے جو افسانے لکھے ان کا موضوع اس کے اپنے طبقے کے لوگ اور ان میں بھی خاص طور سے وہ حضرات تھے جو جدتوں کے بہت زیادہ دلدادہ تھے اور جنھوں نے ۱۸۶۱ اور ۱۸۶۴ کی اصلاحوں کی

لما پر ایک بالکل ھی نئی دنیا بنا کر کھڑی کردینے کے منصوبے باندھے تھے -
ن تصانیف میں سالتی کوف کا مقصد طنز اور تضحیک نہیں بلکہ یہ ظاہر
رنا ھے کہ وہ لوگ اور وہ سوسائٹی جس کی تصویر اتاری جارھی ھے دنیا
یں صرف چند روز کی مہمان ھے اور وہ ان بیماریوں میں مبتلا ہو چکی
ے جو موت کا پیش خیمہ ہوا کرتی ھیں - اسی سلسلے کا ایک ناول " حضرات
ولوف لیف " سالتی کوف کی بہترین تصنیف ھے ' اور اس کا زیادہ تفصیل
ے ساتھ ذکر کرنا ضروری ھے -

" حضرات گولوف لیف " ۱۸۶۱ سے پہلے کے زمینداروں کے ایک خاندان
کا قصہ ھے - جس وقت داستان شروع ہوتی ھے ' اس خاندان کے بزرگ
لا جمیر میخائلووچ گولوف لیف بوڑھے اور مضمحل ہو چکے ھیں ' دن رات
لنگ پر پڑے رہتے ھیں اور صرف کبھی کبھی جب جوش آتا ھے تو دل کی
ضرورت نکالنے کے لئے اپنی بیوی کے کمرے تک لڑکھڑاتے ہوئے جاتے ھیں - اس
ے دروازے سے ذرا سر نکال کر زور سے " چڑیل " یا " بھتنی " کہہ کر پکارتے ھیں'
ور پھر بھاگ کر اپنے اڈے پر پہنچ جاتے ھیں - ان کی بیوی اریننا پتروفنا
ن دیوانی حرکتوں کی عادی ھے - شادی کے کچھ دن بعد ھی اسے اپنے
وھر کی سیرت کا پتہ چل گیا تھا ' اور تبھی سے وہ اپنے شوھر کو جائداد
ور گھر گرستی کے معاملات سے بے دخل کر کے خود حاکم اور قادر کل بن
یٹھی تھی - ولا جمیر میخائلووچ کو جو اپاھج اور کمزور طبیعت کے آدمی تھے'
تعلق کوئی شکایت نہ ھوتی اگر اریننا پتروفنا نے صرف حکومت پر قناعت
ی ہوتی - مگر اریننا پتروفنا نے ان کی شراب اور تمباکو بھی بند کردی -
ور کفایت شعاری کو اس حد تک پہنچا دیا کہ گھر میں کسی کو کبھی پیٹ
ھر کھانے کو نہیں ملتا تھا اور جو کچھ ملتا تھا وہ بھی ایسا کہ کوئی بھلامانس

اسے رغبت سے نہ کہاسکے - اس نے اپنا مقصد تو حاصل کر لیا - خاندانی جائداد جو پہلے بہت حقیر تھی ' رفتہ رفتہ بڑھتی گئی ' اور وہ چند ہزار کسانوں کی مالک بن گئی ' مگر یہ دولت بہت گراں ملی - اسے حاصل کرنے کے لئے ارینا پتروفنا نے محبت اور سلوک کرنا ایسا چھوڑا کہ اس کا نام تک بھول گئی - ولادیمیر میخائلووچ تو اسے چڑیل اور بھتنی کہتے ہی تھے ' اس کے بچوں کو بھی اس سے کوئی محبت نہیں ہوئی - دنیا میں کوئی شخص نہیں تھا جس پر اُس نے کوئی احسان کیا ہو ' چھوٹے بڑے لوگوں میں کسی سے اس کے مراسم نہیں تھے اور اس کے ہمسائے سب جانتے تھے کہ وہ اسی کی منتظر بیٹھی رہتی ہے کہ ان میں سے کوئی مالی دشواریوں یا اور کسی مصیبت میں مبتلا ہو تو وہ اس کی جائداد اونے پونے خرید لے - اگر ارینا پتروفنا کے دل کو انسانی ہمدردی یا محبت چھو بھی گئی ہوتی تو وہ محسوس کرتی کہ اس نے اپنے اصولوں پر چل کر کیا کھویا اور کیا پایا ہے ' لیکن اس کا کوئی امکان نہ تھا - اس کا بڑا لڑکا ستپان بچپن بھر اُسے گالیاں دیتا رہا ' اور اگرچہ گھر میں سب جانتے تھے کہ وہ بہت نیک اور با مروت ہے ' ارینا پتروفنا نے طے کر لیا کہ وہ باپ کی طرح دیوانہ اور احسان فراموش ہے اور خود بھی اس کے نام دھرنے لگی - جب وہ تعلیم ختم کرکے نوکری کی تلاش میں ماسکو اور پیٹربرگ گیا اور چار سال تک کوشش کرنے کے باوجود ناکامیاب رہا تو ارینا پتروفنا نے سمجھ لیا کہ یہ محض اس کی نالائقی ہے اور یہ نہ سوچا کہ اس کی ناکامیابی کا اصل سبب یہ ہے کہ اس کا کوئی سرپرست اور پرسان حال نہیں ' کیونکہ گولوف لیف خاندان کو یا تو کوئی جانتا نہیں تھا اور جو جانتا تھا وہ اس سے نفرت کرتا تھا - ارینا پتروفنا کو بیٹے سے زیادہ اپنے روپے اور جائداد کی فکر تھی ' اور جائداد محفوظ

رکھنے کے لیے اس نے حق اور محبت کے تقاضوں کا کوئی لحاظ نہیں کیا۔ جب ستپان نوکری کی تلاش میں نکلا تو اس نے اس کے لیے ماہوار جیب خرچ مقرر کر دیا، مگر اتنا کم کہ اس پر گذر کرنا محال تھا - اس کی ناکامیابی کی خبر سن کر اریناپتروفنا نے اسے ایک مکان جو اس نے ماسکو میں خریدا تھا دے دیا اور حکم دیا کہ اس کے کرائے پر گذر کرو - لیکن ستپان گھر پر اس طرح قید رہا تھا کہ آزاد ہو کر وہ اپنی طبیعت کو قابو میں نہ رکھ سکا، اور آخرکار اسے اپنا قرضہ ادا کرنے کے لیے مکان بیچ دینا پڑا۔ اس کے بعد گھر واپس جانے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا - جب وہ گھر واپس آیا تو اریناپتروفنا نے اسے رہنے کو ایک کمرہ تو دے دیا مگر اس میں رات کو روشنی کرانا یا سردی کم کرنے کو آگ جلوانا ضروری نہیں سمجھا اور میز پر سے جو کچھ بچ رہتا وہی کھانے کو بھجوا دیتی - اس تواضع کا انجام یہ ہوا کہ ستپان، جسے پہلے سے دق کی بیماری تھی، چند مہینے کے اندر مر گیا - اس کی موت بھی ارنیاپترو فنا کو ایک خلاف عقل حرکت معلوم ہوئی، گو اُس نے اکثر اسے کھانستے سنا تھا اور یہ بھی جانتی تھی کہ اس کے پاس پہننے اوڑھنے کا سامان کافی نہیں - اریناپتروفنا کی لڑکی آننا نے بھی اسے ستپان کی طرح "مایوس" کیا - جب وہ تعلیم سے فارغ ہوئی تو اس نے اس کو انتظامی معاملات میں اپنا مددگار بنانا چاہا - لیکن اس سے نہ خاندانی رواج کے مطابق بھوکا رہا گیا نہ گھر کی بے لطف اور بے رونق زندگی برداشت ہو سکی، اور وہ ایک ادنیٰ فوجی افسر کے ساتھ بھاگ گئی - اریناپتروفنا نے اسے "ماں کی دعائے خیر" سے محروم رکھا، مگر اپنی نیکی اور حق پرستی جتانے کے لیے اسے ایک ٹوٹا پھوٹا مکان اور تھوڑی سی زمین دے دی - تین چار سال بعد وہ دو لڑکیاں،

لیوبا اور آننا ' چھوڑ کر مرگئی - اریناپتروفنا نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا - " خدا کے کرم کی کوئی انتہا نہیں ...... ایک لڑکی چھین لی اور دو دے دیں "- اور وہ شکایت کیوں نہ کرتی - بچوں کی پرورش سے انکار کرنے کی اجازت اُسے نہ اُس کے اصول دیتے تھے نہ نیک نامی کا خیال —

ستپان اور آننا کے علاوہ اریناپتروفنا کے دو لڑکے اور تھے ' پورفیری اور پاول - پاول کی طبیعت پر جمود اس قدر حاوی تھا کہ اس کے لیے بات کرنا بھی ایک دقت طلب کام تھا ' اور اس کی عمر کھانے پینے اور خاموش بیٹھے رہنے میں گذرتی تھی - مگر پورفیری ہر اعتبار سے اپنی ماں کا بیٹا تھا - کفایت شعاری اور اصولوں کی پابندی میں وہ اریناپتروفنا سے کچھ کم نہ تھا ' اور بچپن سے عجزوانکسار کا مجسمہ بن کر ماں کی خوشامد کرنا ' دل کی بات چھپانا اور ہر وقت ماں کا حکم بجا لانے پر مستعد رہنا اس کا قاعدہ تھا - اریناپتروفنا کے دل میں ہمیشہ یہ کھٹکا رہا کہ پورفیری کی اطاعت گذاری ' خوشامد اور محبت محض دکھاوا ہے ' مگر پورفیری نے اسے کبھی کسی معاملے میں شکایت کا موقع نہیں دیا - اس کے بر خلاف پاول نے کبھی اسے کسی بات سے خوش نہیں کیا بلکہ ہر وقت یہ ظاہر کرتا رہا کہ اسے ماں سے گہری دلی نفرت ہے - اس برتاو کے باوجود اریناپتروفنا کو پاول سے زیادہ لگاو تھا ' لیکن جب کبھی لڑکوں کو کچھ دینے کا موقع آتا تو وہ پورفیری کو اوروں سے زیادہ دینے پر مجبور ہوجاتی - چنانچہ آخر میں جب جائداد کا بٹوارا ہوا تب بھی پورفیری کو اپنے بھائی سے بہت بہتر حصہ ملا —

پورفیری کو اس کے بھائی بہن بچپن سے " سود خوار " اور " جونک " کہتے چلے آئے تھے اور اریناپتروفنا کو بڑھاپے میں جائداد تقسیم کرنے کے

بعد معلوم ہوگیا کہ کفایت شعاری اور اصولوں کی پابندی میں وہ اس سے بھی بڑھ کر ہے' اسے باتیں کرنے کا شوق ہے' اور اس سے بھی زیادہ باتیں بنانے کا اور گو وہ ہر وقت شاندار اصطلاحیں استعمال کرتا ہے' وہ اپنے فائدے کو کبھی نظر انداز نہیں کرتا اور اس کی ہوس اتنی شدید ہے کہ وہ کسی کی خاطر اپنا حق چھوڑنے پر راضی نہیں ہوسکتا - اسی وجہ سے جب جائداد کے بٹوارے کے کئی سال بعد پاول بیمار پڑا تو اریناپتروفنا اس کے یہاں گئی اور باوجودیکہ وہ اس کے منہ پر اسے اور پورفیری کو گالیاں دیتا تھا' وہ اس کی تیمارداری کرتی رہی اور اس کی جان کے لیے دعائیں مانگتی رہی - لیکن پاول مرگیا اور جس پھرتی سے پورفیری بھائی کے قریب مرگ ہونے کی خبر سن کر اس کے مکان پر' پہنچا جس انداز سے اس نے بھائی کی موت پر ہر چیز کا جائزہ لیا' اور اس گاڑی کی نسبت جس پر اریناپتروفنا وہاں آئی تھی اور جو اس کی ذاتی ملکیت تھی کئی بار اس سے اور دوسروں سے دریافت کیا کہ وہ درحقیقت کس کی ہے' اس اندیشے میں کہ وہ کہیں پاول کی نہ ہو اور اریناپتروفنا اس پر ناجائز قبضہ نہ کرلے - ان سب باتوں سے اریناپتروفنا کے دل کو بہت صدمہ پہنچا - جب وہ پاول کی تجہیز و تکفین کے بعد اپنے گھر واپس ہوئی تو اس نے تہیہ کرلیا تھا کہ پورفیری کی صورت پھر کبھی نہ دیکھوں گی —

پورفیری دراصل "حضرات گولوف لیف" کا ہیرو ہے اور ناول کا مقصد زیادہ تر اسی کی سیرت کا ہر پہلو دکھانا ہے - پاول کی موت تک اس کی سیرت کا صرف ایک پہلو ظاہر ہوا تھا اور وہ اس کی زمانہ سازی' خوشامد' میٹھے اور پر تکلف الفاظ میں اپنا مطلب چھپانے اور اپنی غرض

پوری کرنے کے لیے ہر قسم کی بے عزتی برداشت کرنے کی صلاحیت تھی - جب پاول کے مرنے پر وہ اپنی بھانجیوں کی تھوڑی سی زمین اور بوسیدہ مکان کے علاوہ اریلا پتروفنا کی کل جائداد کا مالک ہوگیا تو اس کی سیرت اپنے اصل رنگ میں نظر آئی - اس میں یہ صفت ضرور تھی، جسے وہ کسی موقع پر بیان کرنے سے چوکتا نہیں تھا، کہ وہ دوسروں کا حق مارنا ناجائز سمجھتا تھا، اور اس کی ملکیت میں کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو اخلاقاً یا قانوناً کسی دوسرے کا حق ثابت کی جاسکے - لیکن اس کے ساتھ ہی وہ نہایت ہی سنگ دل اور خودغرض تھا، اور اس نے اپنے لئے جو اصول مقرر کئے تھے وہ قانوناً نہیں تو اخلاقاً جرم اور بے رحمی کا ایک فلسفہ تھے - اس کے بڑے لڑکے ولاجمیر نے پیٹربرگ میں ایک لڑکی سے نکاح کرلیا اور پورفیری نے جھٹ اس کا گذارا بند کردیا، کیونکہ ولاجمیر نے صرف یہ لکھا تھا کہ میں فلاں لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہوں، شادی کرنے کی اجازت نہیں مانگی تھی - گذارا بند ہو جانے پر ولاجمیر بالکل محتاج ہوگیا، اور مایوسی میں اس نے خودکشی کرلی - پورفیری کے چھوٹے لڑکے پیوتر نے سرکاری روپیہ جوے میں اُڑادیا، اور جب اس کی خیانت پکڑی گئی تو وہ بھاگا ہوا باپ کے پاس مدد کے لیے آیا - اس کی مدد نہ کرنے کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ وہ یا تو خودکشی کرلیتا یا اگر اس کی ہمت نہ کرسکتا تو قید کردیا جاتا اور اس کی زندگی برباد ہو جاتی - لیکن پورفیری نے اس کی مدد کرنے سے قطعی انکار کردیا۔ اسے قید کی سزا ہوگئی اور وہ چند مہینے بعد قیدیوں کے ایک ہسپتال میں مرگیا - پورفیری کی بھانجیاں لیوبا اور آننا جب بڑی ہوئیں اور انہوں نے بڑے حوصلے لیکر زندگی کے میدان میں قدم رکھا تو انہیں مالی امداد کی سخت ضرورت پڑی، کیونکہ

ان کی اپنی جائداد بہت تھوڑی تھی - مگر پورفیری نے کبھی انہیں ایک کوڑی نہیں دی - انہیں ناٹک کے فن سے شوق تھا ۔ اگر ان کی سرپرستی کی جاتی تو ممکن تھا وہ ماسکو یا پتربرگ کے کسی تھیٹر میں لے لی جاتیں ' اپنی استعداد کے مطابق ترقی کرتیں اور ان کے اخلاق پر کوئی برا اثر نہ پڑتا - لیکن مفلسی کی وجہ سے انہیں مفصلات کے تھیٹروں میں ایکٹ کرنا پڑا ' جہاں وہ بہت بری صحبت میں پڑگئیں - ناکامیابی ' مایوسی اور صحبت کے اثر نے ان کے اخلاق کو بگاڑ دیا - انہوں نے شراب خواری اور عیاشی شروع کردی اور آخر میں دونوں بہت ذلیل قسم کی رنڈیاں ہوگئیں - بڑی بہن لیوبا نے جب دیکھا کہ ذلت کے باوجود بھی پیٹ بھر کھانے کو نہیں ملتا تو اس نے زہر پی لیا ' چھوٹی بہن آننا کا بھی یہی ارادہ تھا ' مگر آخر وقت میں وہ ہمت ہار گئی اور اس نے چارو ناچار ماموں کے یہاں آکر پناہ لی -

دو جوان بیٹوں اور ایک بھانجی کی موت اور مسلسل تنہائی کی زندگی پورفیری نے کیسے برداشت کی ؟ اگر دوسرے انسانوں کی طرح وہ بھی دل رکھتا تھا تو اس نے ایسی کنجوسی اور خود غرضی کو کیسے گوارا کیا جس سے سارا خاندان تباہ ہوا اور کوئی بھی ایسا نہ رہ گیا جو دو پشتوں کی کفایت شعاری کا شکریہ ادا کرتا ؟ یہ معما پورفیری کی مذہبیت حل کرتی ہے - اریناپتروفنا کو دولت کی ہوس نے کنجوس اور سنگدل بنا دیا تھا اور اسی وجہ سے آخر میں اُسے پشیمانی ہوئی اور اس کے دل کو صدمے پہنچے - پورفیری نے اپنے اصولوں کی بنیاد مذہب پر رکھی تھی اور یہ بنیاد بہت مستحکم ہوا کرتی ہے - اس کی مذہبیت دوسروں کو محض مکاری اور ریاکاری معلوم ہوتی تھی ' اس کی پارسائی اور عبادت گذاری صرف ایک نفرت انگیز نمائش - دوسرے اس کی حاضر جوابی کو چالاکی اور عیاری سمجھتے تھے اور ان

مسلمہ اخلاقی اصولوں کو جو پورفیری کی زبان پر ہر وقت رہتے تھے اخراجات اور ذمہ داریوں سے بچنے کی ایک ترکیب اور بد اعمالیوں کو چھپانے کا ایک ذریعہ خیال کرتے تھے - لیکن پورفیری کی کٹر مذہبیت اور وہ اصول جنھیں بیان کرنے میں وہ اس قدر مشاق تھا' اس کے ضمیر کو راضی اور اس کے دل کو پرسکون رکھتے تھے اور وہ صدمے جو کسی دوسرے کی کمر توڑ دیتے اسے دراصل محسوس ہی نہیں ہوئے - عمر کے ساتھہ پورفیری کی دنیا تنگ ہوتی گئی' اس میں تجربہ حاصل کرنے کی مطلق صلاحیت نہیں رہی اور وہ ذہنی قویٰ جنھیں اس کی مسلسل تنہائی نے اظہار اور استعمال سے محروم رکھا تھا فضول بکواس کرنے کے بیہودہ مرض کی صورت میں اپنا زور دکھانے لگے - سوا ان چند گھنٹوں کے جو پورفیری گھر اور جائداد کا حساب کتاب دیکھنے میں صرف کرتا تھا اس کا سارا دن اور رات کا ایک خاصا حصہ کھاتے اور بکواس کرتے گذرتا تھا' اور یہ بکواس بھی ایسی لغو اور فضول ہوتی تھی کہ اسے سننے پر مجبور کرنا سخت سے سخت سزا تھی جو وہ کسی عزیز یا معتوب شخص یا دشمن کو دے سکتا تھا - لیکن وہی مذہبیت جس نے اس کے دل کو درد اور ہمدردی سے بیگانہ کردیا تھا اس کی خود پسندی کو بھی اپنی گود میں پالتی رہی' اور جس طرح پورفیری کو یقین تھا کہ اس نے دوسروں کے ساتھہ جو سلوک کیا وہ صحیح تھا ویسے ہی وہ اپنی زندگی اور طرز معاشرت سے بالکل مطمئن رہا اور اسے بے چین کرنے کو نہ کوئی حسرت پاس پھٹکی نہ امنگ -

آخر میں جب پورفیری کی بھانجی آننا ذلیل اور بیمار ہوکر اس کے یہاں رہنے کو آئی اور ایک مرتبہ رات کے تیسرے پہر پورفیری نے اسے اپنی منتظمہ یف پراکسیا کے ساتھہ بیٹھے شراب پیتے اور گندے گیت

گاتے پکڑا تو پورفیری کے معمول میں ایک تبدیلی ہوئی اور وہ یہ کہ رات کو وہ آننا کے ساتھہ بیٹھہ کر شراب پینے لگا - شراب اور نشے کی خواہش اس بنیاد کے کمزور بڑنے کی پہلی نشانی تھی جس پر پورفیری نے اپنے فلسفۂ حیات کو تعمیر کیا تھا، اس قلعے کی دیوار کی پہلی دراز جس میں وہ اب تک محفوظ رہا تھا - آننا شراب پی کر بالکل مست ہوجاتی، نشے میں پورفیری کو خوب جی کھول کر گالیاں دیتی اور اپنی، اپنی بہن اور اپنے ماموں زاد بھائیوں کی تباہی اور بربادی کا سارا الزام اسی کے سر لگاتی - پورفیری پہلے تو جواب دیتا اور اپنی صفائی کرتا رہا لیکن نشے میں بحث کرنا اور دوسرے کو قائل کرنا دشوار ہوتا ہے، رفتہ رفتہ پورفیری کے دل میں کچھہ شک سا پیدا ہوگیا اور آخر کار آننا کی شکایتوں اور گالیوں نے اس پر اتنا اثر کیا کہ اسے اپنا پچھلا طرز عمل غلط معلوم ہونے لگا - یہ احساس گویا اس کے لئے موت کا پیغام تھا اور کچھہ دنوں بعد وہ واقعی موت کی آرزو کرنے لگا - لیکن موت نہیں آئی اور دنیا سے نجات حاصل کرنے کے لئے پورفیری کو اپنے ہاتھوں اپنی جان لینی پڑی —

سالتی کوف نے حضرات گولوف لیف میں صرف حقیقت نگاری کا کمال اور نفس انسانی کا ہر پہلو جانچنے اور پہچاننے میں مہارت نہیں دکھائی بلکہ مذہبی جذبے کا ایک روگ بھی ظاہر کر دیا جو سچی مذہبیت کا سب سے بڑا دشمن ہے، جو صرف عقیدت کی جڑ نہیں کاٹ دیتا بلکہ ان لوگوں کے روحانی تنزل کا باعث ہوا ہے جو مذہبی ہونے کا حوصلہ رکھتے ہیں اور دعوے کرتے ہیں - اگر پورفیری محض مکار یا ریاکار ہوتا، اگر اس کی دینداری محض نمائشی ہوتی اور وہ کہتا کچھہ اور کرتا کچھہ تو

وہ عیاروں اور دغابازوں میں شمار ہوتا اور اس کی سیرت ہمارے لئے اتنی سبق آموز اور عبرت انگیز نہ ہوتی - لیکن پورفیری کے خلوص سے انکار نہیں کیا جا سکتا - اس کی خود پسندی اور خود پرستی صرف تکبر یا مزاج کا ایک عیب نہیں بلکہ اس کی عقیدت اور گہری مذہبیت کا دوسرا رخ ہے - اس کی سنگدلی میں اُس بھیانک ذہنی بیماری کی ایک جھلک بھی نہیں نظر آتی جو دوسروں کے درد اور تکلیف کو لطف اندوزی کا ذریعہ بنا دیتی ہے بلکہ یہ بھی اُس کے اصولوں اور عقیدوں کا ایک لازمی نتیجہ ہے اور اس کی سیرت دیکھتے ہوے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اگر وہ سنگدل نہ ہوتا تو اپنے عقیدے پر قائم نہ رہ سکتا - یہی خصوصیت ہے جس کی وجہ سے اس کی سیرت اور سرگذشت ہمارے لئے خاص طور سے سبق آموز ہوجاتی ہے - انسان کو صرف جھوٹی مذہبیت سے نہیں بچنا چاھئے بلکہ اس خلوص سے بھی جو درد اور محبت کے سامنے سر نہ جھکاے -

سالتی کوف کی تصانیف کے تیسرے دور میں نہ اس کے پہلے افسانوں کا طنز اور تضحیک ہے، نہ ” حضرات گولوف لیف “ کی طرح سوسائٹی اور انسانی ذہنیت پر تنقید - ” کہانیوں “ کے مجموعے میں زیادہ تر ۱۸۶۱ سے پہلے کی کسانوں کی زندگی دکھائی گئی ہے اور مصنف کا مقصد نکتہ چینی نہیں بلکہ ہمدردی کا جذبہ بیدار کرنا اور نظر میں وسعت پیدا کرنا معلوم ہوتا ہے - ” بڑے دن کی کہانیاں “ مذہبیت سے لبریز ہیں اور یہ وہ مذہبیت ہے جو ضمیر کو روشن، دل کو محبت کے نشے سے چور کردیتی ہے اور ایثار کی تیز آگ میں اس تمام آخور کو جلا کر خاک کردیتی ہے جو انسان کی طبیعت میں اسی طرح خود بخود جمع ہوتا رہتا ہے جیسے اس کے جسم پر میل - سالتی کوف کے دل پر اس وقت وہی کیفیت گذر رہی تھی

جس نے گوگول کو انشا پردازی سے توبہ کرائی تھی اور وہ بھی اپنے آپ کو عمر بھر کی طنزیہ تنقید اور تضحیک کا اس صورت سے کفارہ ادا کر رہا تھا۔ یہ ارادہ سب سے زیادہ اس کے آخری ناول "پوشیے خونسک کی تاریخ" میں نمایاں ہے۔ یہ "تاریخ" اس نے دل سے تمام شکایتیں نکال کر اور نظر کو عیب جوئی کی عادت سے پاک کرکے لکھی تھی۔ اس میں پرانے طرز کی زندگی اور پرانا فلسفۂ حیات اسی طرح کے شاعرانہ رنگ روپ میں دکھائی دیتا ہے جیسے اک کوف کی "خاندانی داستان" میں۔ سالتی کوف گویا دنیا سے رخصت ہوتے ہوئے کہا سنا معاف کرانا چاہتا تھا اور اپنے قلم اور تخیل سے اپنے خلوص کی شہادت دلوا رہا تھا۔ اس کا شمار روس کے سب سے زیادہ تلخ زبان اور سخت گیر نقادوں میں ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ہمیں اس کی محبت اور ہمدردی کا رشتہ دوبارہ قائم کرنے کی اس کوشش کو بھی یاد رکھنا چاہئے —

روسی ناول

از

جناب محمد مجیب صاحب بی اے (آکسن)

پہلا دور

لسکوف

نکولائی سیمیونووچ لسکوف صوبہ اورل کا رہنے والا تھا۔ اس کا باپ معمولی حیثیت کا سرکاری ملازم تھا، مگر ماں رئیس خاندان سے تھی اور لسکوف کا بچپن عام زمینداروں کے بچوں کی طرح گذرا - وہ سولہ سال کا تھا کہ اس کے ماں باپ دونوں کا انتقال ہوگیا اور وہ اسکول چھوڑ کر ملازمت کرنے پر مجبور ہوا - کچھ سال بعد وہ ایک انگریز مسٹر اسکاٹ کے کاروبار میں شریک ہوگیا، روس اور بیرونی ملکوں میں بہت سفر کرتا رہا، اور اس طرح اسے روسی فطرت اور معاشرت کے مطالعے کا نہایت اچھا موقع ملا - ۱۸۶۰ میں اس نے مضمون نگاری شروع کردی اور دو سال مشق کرکے اخبار نویسی کے ارادے سے پیٹربرگ گیا - اخباروں اور رسالوں نے انشاپرداز کی حیثیت سے اس کی خاصی قدر کی مگر لسکوف سیاسی فرقہ بندیوں سے بالکل الگ رہنا چاہتا تھا اس لئے اخبار نویسی کے میدان میں اس کے قدم کبھی جم نہیں سکتے تھے - انتہا پسند فرقے کے اخباروں نے اسے ایک مضمون کی بنا پر بائیکاٹ کردیا اور اس بائیکاٹ

کا نتیجہ صرف یہ نہیں ہوا کہ اس کے مضامین کا ان اخباروں میں چھپنا بند ہوگیا بلکہ اس کی ادبی تصانیف بھی عام طور پر نقادوں کی توجہ سے محروم رہیں - لسکوف نے اخبار نویسی رفتہ رفتہ چھوڑ دی مگر اس کے ناولوں اور افسانوں کا سلسلہ جاری رہا - ۱۸۶۳ میں اس کا پہلا افسانہ شایع ہوا ، اس کے دوسرے سال "پس و بیش" اور ۱۸۷۱ میں "چھری کٹاری" - یہ دونوں ناول سیاسی تھے اور ان کی وجہ سے لسکوف انتہا پسند حلقوں میں بالکل مردود ہوگیا - "چھری کٹاری" کے بعد لسکوف دامن جھاڑ کر سیاسی مباحثوں سے علحیدہ ہوگیا - "گرجا والے" جو شائع ہوا بہت مقبول ہوا اور اس کے علاوہ لسکوف نے روسی کلیسا اور پادریوں کے رہن سہن پر جو افسانے لکھے وہ بھی بہت پسند کئے گئے - کلیسائی مذہب کی طرفداری کرنے سے اس نے دربار کے بہت سے سربر آوردہ لوگوں کو خوش کردیا ، اور خود ملکہ کے اثر سے اسے سرکاری مذہب کی حمایت کرنے کے معاوضے میں ایک عہدہ مل گیا جس میں تنخواہ وصول کرنے کے سوا کوئی کام نہ تھا - مگر ملکہ کی یہ سرپرستی ایک غلط فہمی پر مبنی تھی اور جب لسکوف نے کلسیا والوں کا مذاق اڑانا شروع کیا اور اس کی آزاد خیالی میں کوئی شک نہیں رہا تو وہ عہدے سے برطرف کردیا گیا - آخر عمر میں لسکوف پر تالستائی کی شخصیت کا بہت اثر ہوگیا - گرو چیلے کے خیالات اور ذہنیت میں بہت فرق تھا مگر لسکوف اپنے خاص طرز پر تالستائی کی اخلاقی تعلیم کا پرچار کرتا رہا —

مصنفوں کو مشہور اور بدنام کرانے میں نقادوں کی رائے کو بہت دخل ہوتا ہے اور روس میں عام رائے بالکل نقادوں کے اشارے پر چلتی تھی - لیکن نقادوں کی عداوت کے باوجود لسکوف کی تصانیف مقبول اور

ہر دلعزیز رہیں اور سیاسی حادثوں اور خیالات کے تغیر سے اس ہردلعزیزی میں کوئی فرق نہیں آیا - یہ کامیابی لسکوف کے ناولوں کی بہترین تعریف ہے اور اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ روسی قوم کیسی خوش مذاق اور قدردان ہے جو اپنے ذہنی رہنماؤں کی ممانعت پر بھی لسکوف کی قدر کرتی رہی - اور اس معاملے میں عام ناظرین کی رائے نقادوں سے زیادہ صحیح تھی - روسی نقاد لسکوف کو قدامت پرست اور روشن خیالی اور ذہنی آزادی کا دشمن سمجھتے تھے، مگر وہ غلطی پر تھے - لسکوف میں صرف ایک ضد تھی جو اسے اچھی چیز کا برا پہلو بھی دکھانے پر مجبور کرتی تھی، اور اگر اس نے انقلابیوں کا اکثر مذاق اڑایا تو قدامت پسندوں کو بھی نہیں چھوڑا - لیکن روسی نقادوں کو ایسی حقیقت نگاری جس میں انسان اور انسانی زندگی کے اعلیٰ حوصلے اور گہرے روحانی مسائل نظر انداز کئے گئے ہوں یا جس سے کوئی اخلاقی یا سیاسی عقیدے اخذ نہ کئے جاسکیں ہمیشہ ناگوار معلوم ہوتی تھی، اس لئے کہ ناول اور افسانے ہی ایک ذریعہ تھے جس سے قوم میں اخلاقی اور سیاسی عقیدے وغیرہ پھیلائے جاسکتے تھے، اور جو مصنف ناول محض قصہ سنانے کے لئے لکھتا اور تعلیم یا اصلاح اس کی غرض نہ ہوتی وہ انہیں اوچھا اور پست ہمت، اپنی قوم کے مستقبل سے بے پروا، اور اس کی کامیابی کے رستے میں ایک رکاوٹ معلوم ہوتا تھا - ایک حد تک تو ان کا ناول نویسوں سے رہبری اور اصلاح کی توقع کرنا بجا تھا - روسی حقیقت نگاری اگر عام انگریزی یا فرانسیسی طرز کے مقابلے میں بہت زیادہ بلند اور قابل قدر ہے تو اسی وجہ سے کہ اس کے مقاصد بہت اعلیٰ ہیں اور وہ محض سطحی زندگی کی عکاسی نہیں ہے - لسکوف

پر روسی ناول کے معیار میں فرق ڈالنے کا الزام ضرور آتا ہے، لیکن اس میں خوبیاں بھی اتنی ہیں کہ ہم یہ خطا معاف کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں —

لسکوف کی سب سے نمایاں خصوصیت اس کی زبان ہے۔ اس نے وہ پاکیزگی اور فصاحت جو تورگینف کی تصانیف میں عروج پر پہنچی اور جس کا دستہ ئیف سکی کے سوا ہر روسی انشاپرداز نے حوصلہ کیا بالکل ترک کردی اور اس کے ناولوں میں انوکھے اور شاذ محاورے، عجیب عجیب اصطلاحیں، ایہام اور مستعمل مگر غلط الفاظ کثرت سے ملتے ہیں۔ یہ خاص انداز بیان اس کی عبارت کو کسی قدر مشکل ضرور کردیتا ہے لیکن اس کی وجہ سے اس کی زبان بہت رنگین اور دلچسپ ہو جاتی ہے، اور اس کے قصے پڑھنے میں ایک خاص مزہ آتا ہے، کیونکہ قصے اور انداز بیان میں ایک لطیف مناسبت ہوتی ہے۔ لسکوف کی دوسری صفت اس کی داستان کی شوخی اور رنگارنگی ہے۔ اس کی تصانیف کی فضا اس مایوسی اور حزن سے پاک ہے جو روسی انشا پردازوں میں عام طور سے پائی جاتی ہے، وہ ناول اور افسانے قصہ سنانے کی غرض سے لکھتا ہے اور اس کے قصے ایک اہمیت اور دلچسپی رکھتے ہیں جس کا فلسفے یا اخلاقی اور سماجی مقاصد سے کوئی واسطہ نہیں۔ یوں اس کی نظر ہمیشہ قصے پر جمی رہتی ہے، اس نے اپنے ناولوں کی آرائش سیاسی اور اخلاقی نظریوں سے نہیں کی ہے بلکہ ان حادثوں اور واقعات سے جن سے اس کا ہر ناول لبالب بھرا ہوتا ہے۔ یہ واقعات اور حادثے اکثر مضحک ہوتے ہیں اور لسکوف اپنے کیرکٹروں کا مذاق اڑانے سے کبھی نہیں چوکتا، خواہ وہ دل میں ان کی کتنی ہی قدر کرتا ہو اور اپنے ناظرین سے

ان کا ادب کرانا چاهتا هو - نقادوں نے یہ انداز دیکھہ کر همیشہ کے لئے طے کر لیا کہ وہ محض ایک مسخرہ هے، لیکن دل لگی بازی اور سچے احترام کی آمیزش لسکوف کے فلسفۂ حیات کی خصوصیت تھی اور اس آمیزش کا طریقہ ایسا هے کہ دونوں کیفیتوں کا ایک دوسرے پر کوئی اثر نہیں پڑتا، اور اس کی دل لگیوں کے با وجود اس کے هیرو، اس کی اور اس کے ناظرین کی نظروں میں هیرو هی رهتے هیں - اگر لسکوف کے فلسفۂ حیات پر ذرا غور کیا جائے تو همیں اس پر بھی تعجب نہ هوگا کہ اس نے ان متضاد چیزوں کو یکجا کرنے کی کوشش کیوں کی - وہ مذهب اور اخلاق میں کسی قسم کی تنگی اور حد بندی کا قایل نہیں تھا، کیے اس کے نزدیک آزاد فضا میں نشو و نما پانا انسان کی سب سے اهم روحانی ضرورت تھی اور نیکی اس کے خیال میں وهی تھی جو نیک عمل اور انسانی همدردی میں ظاهر هو - جیسے وہ سچے اور اچھے عقیدوں کو رسمی مذهب کا نام دے کر ان کی تاثیر گھٹانے کے خلاف تھا ویسے هی اسے یہ ناگوار تھا کہ ایسی هستیاں جو ادب اور احترام کی مستحق هوں مورتیں بنا کر کھڑی کر دی جائیں اور انسان کی نظر کو اس کی اجازت نہ دی جائے کہ انہیں هر پہلو سے دیکھے —

شروع کے سیاسی ناولوں میں لسکوف اپنے اصل رنگ میں نظر نہیں آتا، اور اس دور کے افسانوں میں بھی ظاهر هوتا هے کہ اس کا فلسفۂ حیات مکمل اور پختہ نہیں هوا تھا - اس زندہ دلی، وسعت نظر اور رواداری کا بھی، جو اس کی خاص صفتیں تھیں، اس کی پہلی تصانیف میں پتا نہیں چلتا، اور اس کے کیرکٹر زیادہ تر انسانی سیرت کے برے نمونے هیں - لسکوف کی طبیعت کے جوهر پہلی مرتبہ اس کے ناول " گرجا والوں "

میں چمکے، اور اسی ناول نے اس کی شہرت کی بنیاد ڈالی - اس ناول میں لسکوف نے ایک فرضی شہر ستارگورود کے گرجا کے تین پادریوں کی داستان سنائی ہے، اور ان تینوں میں سے ہر ایک کی سیرت اور صورت کا نقشہ کھینچنے میں کمال دکھایا ہے - سویلی توبے روزوف، گرجا کے صدر پادری، نہایت نیک اور پارسا آدمی ہیں اور ان کا شمار ان سیرتوں میں ہونا چاہئے جو شائستہ زندگی کا مایۂ ناز ہیں - توبے روزوف میں مذہبیت کا وہ سچا جذبہ ہے جو انسان کو ہر وقت اپنے اعمال اور نفس کی اصلاح میں مصروف رکھتا ہے اور جو ضمیر کو اتنا زودحس کردیتا ہے کہ دوسروں کی نکتہ چینی کے لئے نہ موقع ملتا ہے نہ خواہش رہتی ہے - زخاریا بے نے فاکتوف، گرجا کے دوسرے پادری، اس مسکینیت کی ایک مثال ہیں جو غربت اور دینی خدمات میں محو رہنے سے اکثر مذہبی لوگوں میں پیدا ہوجاتی ہے - انہوں نے نفس کشی اس لئے کی ہے کہ مجبور تھے، دنیاوی حوصلے ترک کئے اس سبب سے کہ انہیں پورا کرنے کی کوئی صورت نہیں تھی - ان کا عجز و انکسار ان کے عقیدوں کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ افلاس اور طبیعت کی کمزوری کا - آخلاً جس نیمت سن، گرجا کا ڈیکن، صورت، سیرت اور عادتوں کے اعتبار سے اپنے دونوں افسروں سے بالکل جدا ہے - اس کا جسم ایک دیو کا ہے، طبیعت بچوں کی سی، اور شوق وہی جو تندرست نوجوانوں کو ہوا کرتے ہیں - گو اُس وقت جب داستان شروع ہوتی ہے اس کی عمر چالیس سال سے کچھ زیادہ ہی ہے، مذہبیت اس کو چھو بھی نہیں گئی ہے، اور اپنی کلیسائی خدمات انجام دینے کے بعد وہ سارا دن کھیل کود، ورزش اور گپ شپ میں صرف کرتا ہے - لیکن لطف یہ ہے کہ ان سب صفتوں کے باوجود بےدینی اور

آزاد خیالی کی مخالفت بھی اسی کے ذمے پڑتی ھے اور جن جن طریقوں سے وہ یہ فرض ادا کرتا ھے ان کا بیان ناول کا سب سے زیادہ دلچسپ حصہ ھے - مثلاً وہ ایک مدرس کے یہاں سے جو علم تشریح کی معلومات کا ذخیرہ بڑھانے پر تلا ھے' مردوں کی ھڈیاں چرا لاتا ھے' اور چپکے سے دفن کرکے پھر تمام شہر میں اپنے کارنامے کی خبر سناتا پھرتا ھے - شہر کی میونسپلٹی والوں کے لئے یہ ایک مستقل تماشا سا ھوگیا ھے کہ وہ ایک طرف تو علم کو فروغ دینے کی غرض سے مدرس کو لاوارث مردوں کی لاشیں دیتے ھیں اور دوسری طرف دین کی حفاظت کے لئے ڈیکن آفلا کو انھیں چرا کر دفن کردینے کا انعام دیتے ھیں - افلا کو یہ نہیں معلوم ھے کہ مردوں کی ھڈیاں چراکر دفن کردینے سے دین عیسوی کو کیا فائدہ پہنچتا ھے' اور وہ اس مسئلے پر کبھی غور بھی نہیں کرتا - اسے فقط اپنا فرض ادا کرنے سے مطلب ھے - پھر ایک بار دریا میں نہاتے وقت وہ کسی جان پہچان کے ڈاکٹر کو ایک ھڈی دکھاتا ھے اور ڈاکٹر اسے بتاتا ھے کہ یہ انسان کے ڈھانچے کی ایک ھڈی ھے جسے (astragelus) کہتے ھیں - افلا کو یقین تھا کہ یہ ھڈی "چھوٹی سی دم" ھے - (astragelus) کا لفظ بھی کچھہ ایسا تھا جسے اس کے خیال میں کسی شریف اور دیندار عیسائی کو ھرگز اپنی زبان پر نہ لانا چاھئے - اس لئے افلا نے ڈاکٹر کو شرک اور توھین مذھب کی سزا دینا ضروری سمجھا' اور اس کی گردن دبا کر اسے دریا میں کئی ڈبکیاں دیں - ڈاکٹر بیچارے نے لاکھہ ثابت کرنا چاھا کہ astragelus کے لفظ سے دین عیسوی یا کلیسا کے عہدہ داروں کی کوئی توھین مقصود نہیں' لیکن افلا اسے ڈبکیاں دیتا رھا' اور کسی طرح سے اسے معاف کرنے پر راضی نہ ھوا - افلا کے بعد "گرجا والوں" کا سب سے

دلچسپ کیرکٹر وهی مدرس هے جس کے یہاں سے افلا هڈیاں چرایا کرتا هے - مدرس « مذکر » هے ' اور سائنس کا شیدائی ' اور چونکه اس کے ارد گرد جتلے لوگ هیں وہ سب بہت مذهبی هیں اور سائنس اور سائنس دانوں کا احترام نہیں کرتے ' اسے اپنے ماحول سے سخت شکایت هے ۰ اس کی ماں هر بات میں اس کی مخالفت کرتی هے ' جن مردوں کی لاشیں وہ لاتا هے ان کی مغفرت کے لئے وہ گرجا میں دعائیں مانگتی هے اور جب مدرس کوئی بات کرتا هے جس کو وہ نہیں سمجھتی تو اپنی جہالت پر شرمندہ هونے کی بجائے مدرس کی ناک کے سامنے تالی بجاتی هے * - ماں کے بعد مدرس کو سب سے زیادہ شکایت افلا سے هے ' جسے وہ علم اور روشن خیالی کا دشمن بلکه اس سے بھی زیادہ یقین کے ساتھ پولیس کا جاسوس سمجھتا هے ' اور گرفتار هونے اور سزا پانے کا خوف اس پر ایسا طاری هے که افلا کے علاوہ بھی وہ هر شخص کو جو اس کے علمی ذوق کا قائل نہیں جاسوس فرض کرلیتا هے - شہر میں مدرس کو تسلی دینے والی صرف ایک خاتون هیں جو اس وقت سے آزاد خیالی کی فدائی بن گئی جب اس کے باپ نے زنا کی سزا میں اس کو درے لگائے تھے اور پولیس والوں نے بجائے باپ کو جیل خانے میں بند کرنے کے صاف صاف کہدیا که تم ایسی هی سزا کی مستحق هو —

افلا دین کی حمایت اور مدرس جاسوسوں سے بچنے کے لئے جو ترکیبیں کرتا هے وہ بہت دلچسپ هیں ' لیکن « گرجا والوں » کی داستان میں پھر بھی واقعات اور حادثوں کی وہ افراط نہیں جو لسکوف کی تصانیف میں عام طور سے پائی جاتی هے - " مسحور سیاح " ۱۸۷۴ کا قصہ ' ایک

* نحوست دور کرنے کا عمل جو روسی عوام میں رائج تھا —

شخص کی سرگذشت ہے جو اپنے بھتیجوں کی انگریز اُستانی کے ناگوار التفات سے جان بچانے کے لئے روس چھوڑ کر بھاگ جاتا ہے' اور پولیس والے اسے "ماہر" اور انقلابی سمجھہ کر اس کا پیچھا کرتے ہیں اور بیرونی ممالک کی پولیس کو بھی اس کی طرف سے بدظن کردیتے ہیں - اسی سال کی دوسری تصنیف "مقتل فرشتہ" جس میں ایک مقدس مورت کی چوریوں کا قصہ ہے' لسکوف کے خاص طرز کا ایک بہت اچھا نمونہ ہے۔ "دنیا کے سرے پر" ۱۸۷۶ کا ایک افسانہ ہے جس میں لسکوف نے' جو اس وقت تک سرکاری مذہب کا پیرو مانا جاتا تھا مذہب عیسوی کے ایک مبلغ کی سرگذشت سنا کر اپنی آزاد خیالی پہلی بار ظاہر کی - اسی زمانے میں لسکوف پر ٹالسٹائی کی تعلیم کا اثر پڑنے لگا' مگر اس پر بھی اس نے اپنا نرالا رنگ نہیں بدلا اور "کبھا لوہار" ۱۸۸۲' "بڑے دن کی کہانیاں" ۱۸۸۶ "ڈکیتی" ۱۸۸۷ اور "برمحل قصے" ۱۸۸۷ ظرافت اور حیرت انگیز اور دلچسپ سانحوں سے لبریز ہیں - ان افسانوں میں "کبھا لوہار" خاص طور سے مقبول ہوا - اس میں زار روس کے سفر یورپ کا ایک قصہ ہے - زار جس ملک میں جاتا ہے وہاں کے لوگ اسے اپنی صنعت و حرفت کے کرشمے دکھاتے ہیں - لیکن زار سب سے زیادہ انگریزی صنعت اور کاریگری سے مرعوب ہوتا ہے جس کا ایک اعلیٰ نمونہ وہ خرید کر ساتھہ بھی لے جاتا ہے - یہ ایک فولاد کی مکھی ہے' اس قدر چھوٹی کہ خورد بین کے بغیر نظر نہیں آتی - مگر تعجب کی بات یہ ہے کہ ایسی چھوٹی مکھی کے پیٹ میں ایک کل ہے اور جب اس میں کوک بھری جاتی ہے تو وہ ناچنے لگتی ہے - زار کے ہمراہ اتناق سے پلاتوف' ایک سن رسیدہ' تجربہ کار اور قوم پرست دریاے ڈون کے کنارے پر رہنے والا کوسک بھی

ہے' جس کا ھتیلا پن روس کی آبرو بچا لیتا ہے اور زار کو اپنی رعایا سے مایوس اور یورپ کی قوموں کا گرویدہ نہیں ہونے دیتا - زار جب مکھی دیکھتا ہے اور انگریزوں کی کاریگری کی تعریف میں الفاظ کا دریا بہاتا ہے تو پلاتوف اس سے وعدہ کرتا ہے کہ میں روسی کاریگروں سے اس کے جواب میں کوئی اعجوبہ تیار کراؤں گا - روس واپس آنے کے کئی سال بعد آخر کار جب زار کا انتقال ہوتا ہے اور اس کا بیٹا تخت پر بیٹھتا ہے تو پلاتوف کو اپنا وعدہ پورا کرنے کا موقعہ ملتا ہے - وہ فولاد کی مکھی کو شہر تولا کے مشہور لوہاروں کے پاس لے جاتا ہے' اور لوہار اپنے کام کی نزاکت اور باریکی جتانے کے لئے مکھی کے ہر پیر میں جوتی پہنا دیتے ہیں اور جوتوں کے تلوں پر اپنے نام کھود دیتے ہیں - زار ان کے کام سے بہت مرعوب ہوتا ہے' اور ان میں سے ایک کو جو کھبا ہے روسی صنعت کے اس کارنامے کو دکھانے کے لئے انگلستان بھیجتا ہے - انگریز اس کی بہت قدر کرتے ہیں' اور ہر طرح سے کوشش کرتے ہیں کہ اسے اپنے پاس رکھیں - لیکن وہ نہیں مانتا' اور کچھ دن مہمان رہنے کے بعد روس واپس ہوتا ہے - راستے میں جہاز پر وہ ایک ملاح سے شراب پینے کی شرط لگاتا ہے اور جب جہاز بندرگاہ پر پہنچتا ہے تو لوگ اسے مست پاتے ہیں اور کسی کو معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کون ہے اور کہاں جانا چاہتا ہے - دربار میں بھی سب اس کا قصہ بھول گئے ہیں اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ " کھبا لوہار " جو شراب خواری کی کثرت اور سردی لگ جانے کی وجہ سے بیمار پڑ گیا تھا محتاجوں کے ہسپتال میں مرجاتا ہے اور کسی کو اس کی خبر نہیں ہوتی - روسی اور عام یوروپی ذہنیت کے مقابلے سے جو نتیجے نکلتے ہیں ان کے علاوہ داستان میں بہت سی خوبیاں ہیں - اس کے مکالمے بہت پر لطف ہیں اور

زبان انوکھی مگر بہت دلچسپ ھے —

لسکوف نے اپنے آخری ناولوں اور افسانوں سے تالستائی کی طرح اخلاقی تعلیم دینی چاھی اور یہ دکھایا کہ اصل چیز مذھبی رسوم کی پابندی نہیں بلکہ ایسا عمل ھے جس سے خلوص اور دل کی نیکی ظاھر ھو۔ "پہاڑ" "ایس کلون کا رھزن" اور "حسین آزا" جو اس دور کے بہترین افسانے ھیں کسی قدر شہوت انگیز ضرور ھیں لیکن یہ عیب ان کی اخلاقی اھمیت میں فرق نہیں ڈالتا، بلکہ حقیقت کو اور زیادہ واضح اور روشن کردیتا ھے۔ ان افسانوں کے بعد بھی لسکوف نے ایک ناول "خرگوشوں کی پرورش گاہ" لکھا جو ابھی کچھ سال ھوئے پہلی بار شائع ھوا۔ یہ ناول اس کے شروع کے طرز پر ھے اور اس کا ھیرو پے رے گود ایک کمزور دماغ کا شخص ھے جسے ایک باا ثر رشتہ دار کی مہربانی سے پولیس میں ایک بڑی ذمہ داری کا عہدہ مل گیا ھے۔ پے رے گود اپنی مشکل خدمات خاصی کامیابی کے ساتھ انجام دیتا رھتا ھے جب تک کہ اسے باغی ملاؤں گرفتار کرنے کا خبط نہیں ھوجاتا۔ اس منصوبے کو پورا کرنے کی کوشش میں وہ ایک ایسی زک پاتا ھے کہ اس کا دماغ بالکل خراب ھوجاتا ھے اور اس کی عمر کا بقیہ حصہ پاگل خانے میں گذرتا ھے۔ لسکوف کے انداز بیان نے اس داستان کو جو بظاھر محض مزاحیہ ھے قوم اور قومی ذھنیت کی تنقید اور اس کی گمراھی عیاں کرنے کا ایک ذریعہ بنا دیا ھے۔ بصیرت افروز ظرافت لسکوف کا حصہ تھی —

تیگور کے ادبی مضامین

از

پنڈت ونشی دھر ودیا النکار

ادبیات عالم

ہمارے دماغ میں جتنی قوتیں ہیں وہ دنیا کی تمام چیزوں کے ساتھہ تعلق قائم کرنے کے لئے ہیں - اسی تعلق کے ذریعے ہم اپنی ہستی کو حقیقی بنا لیتے ہیں اور اسی میل کے ذریعے ہم حقیقت کو حاصل کرتے ہیں - اگر یہ تعلق نہ ہو تو ہماری ہستی اور دوسری چیزوں کی ہستی کا کچھہ مطلب ہی نہیں رہتا —

دنیا میں حقیقت کے ساتھہ ہمارا تعلق تین قسم کا ہوتا ہے - عقل کا تعلق ' غرض کا تعلق ' اور مسرت کا تعلق - ان میں سے عقل کا تعلق حقیقت کے ساتھہ ایک طرح کی حریفانہ حیثیت رکھتا ہے گویا وہ ایک شکاری کے ساتھہ شکار کا تعلق ہے - گویا عقل حقیقت کو فریق ثانی کی حیثیت سے خود کے بنائے ہوے کٹہرے میں کھڑا کرکے اور اس پر جرح کرکے اس کے دل کی بات کو رتی رتی باہر نکال لاتی ہے - اسی وجہ سے حقیقت کے بارے میں عقل کو ایک قسم کا گھمنڈ ہو جاتا ہے - وہ جس مقدار میں حقیقت کو جانتی ہے اُسی مقدار میں اپنی قوت کو محسوس کرتی ہے - اس کے بعد

حقیقت کے ساتھ غرض کا تعلق ہے - اس غرض یعنے مطلب کے تعلق میں ہماری قوت اور حقیقت کا ایک طرح کا اتحاد پیدا ہوتا ہے -اسی غرض کے سبب حقیقت ہم سے نزدیک تر ہو جاتی ہے - پھر بھی اُس کے ساتھ جو ہماری علیحدگی ہے وہ فنا نہیں ہو جاتی - انگریز سوداگروں نے جس طرح ایک دن نواب کے آگے سر جھکا کر اور نذرانے دے کر اپنا مطلب نکال لیا تھا اور کامیاب ہوکر آخر کار خود تخت کے مالک بن بیٹھے تھے اسی طرح حقیقت سے کام لے کر اور اس سے اپنا مطلب پورا کرکے آخر میں ہم سمجھتے ہیں کہ گویا ہمیں نے دنیا کی حکومت حاصل کرلی ہے - تب ہم کہتے ہیں کہ قدرت ہماری خادمہ ہے؛ پانی، ہوا اور آگ ہمارے بندۂ بے دام ہیں ——

اس کے بعد حقیقت کے ساتھ مسرت کا تعلق ہے - اسی حسن یا مسرت کے تعلق میں حقیقت سے ہماری علیحدگی فنا ہو جاتی ہے - وہاں گھمنڈ نہیں رہتا، وہاں خود کو بالکل حقیر اور کمزور ہستی کے حوالے کر دینے میں ہمیں ذرا بھی تامل نہیں ہوتا - وہاں متھرا کے راجا کو بندرابن کی گوپیوں کے پاس اپنی شاہی عظمت کے چھپانے کا طریقہ نہیں سوجھتا- حقیقت کے ساتھ جہاں ہماری مسرت کا تعلق ہوتا ہے وہاں ہم اپنی عقلی قوت کو بھی محسوس نہیں کرتے، اور کام کی قوت کو بھی محسوس نہیں کرتے وہاں ہم صرف خود ہی کو محسوس کرتے ہیں - بیچ میں کوئی رکاوٹ یا دوری نہیں رہتی ——

اگر اختصار کے طور پر کہا جائے تو حقیقت کے ساتھ عقل کا تعلق ہمارا مدرسہ ہے، غرض کا تعلق ہماری کچہری ہے اور مسرت کا تعلق ہمارا گھر ہے- مدرسے میں بھی ہم پوری طرح نہیں رہتے، اور دفتر میں بھی ہم پورے طور سے اس کے نہیں ہو جاتے؛ صرف گھر ہی میں ہم بغیر کسی رکاوٹ کے حقیقی

طور پر رہتے ہیں - مدارس میں آراستگی نہیں ہوتی ' دفتروں کو سجایا نہیں جاتا لیکن گھر کی آرائش مختلف سامانوں سے کی جاتی ہے —

یہ مسرت کا تعلق کیا شے ہے ؟ دوسروں کو اپنا اور اپنے کو دوسروں کا سمجھنا - جب ہم ایسا سمجھہ لیتے ہیں تب تفریق کا کوئی سوال نہیں رہتا - یہ بات ہم کبھی نہیں پوچھتے کہ ہم خود کو کیوں پیار کرتے ہیں - ہمیں اپنے احساس ہی میں مسرت معلوم ہوتی ہے - یہی احساس جب ہم دوسروں میں پاتے ہیں تب اس بات کے پوچھنے کا کوئی مطلب ہی نہیں رہتا کہ ان کو ہم کیوں پیار کرتے ہیں —

" یا جنّی دلک رشی " نے " گارگی " سے کہا تھا :—

نوارے پترسّی کاماے پترہ پریو بھوتی
آتمنستو کاماے پترہ پریو بھوتی
نوارے ونسّی کاماے وتم پریم بھوتی
آتمنستو کاماے وتم پریم بھوتی "

ہمیں بیٹا اس لیے پیارا نہیں معلوم ہوتا کہ ہم اسے چاہتے ہیں بلکہ ہم خود کو چاہتے ہیں اس لیے ہمیں بیٹا پیارا معلوم ہوتا ہے - دولت ہمیں اس لیے پیاری نہیں معلوم ہوتی کہ ہم اسے چاہتے ہیں لیکن چونکہ ہم خود کو چاہتے ہیں اس لیے دولت ہمیں پیاری معلوم ہوتی ہے —

اس قول کا یہ مطلب ہے کہ جس چیز کے اندر ہم خود کو کامل طور سے دیکھہ سکتے ہیں ہم اسی کو چاہتے ہیں - بیٹا ہماری کسی کو دور کردیتا ہے؛ اس کا یہ مطلب ہے کہ ہم بیٹے کے اندر خود کو اور بھی زیادہ حاصل کرتے ہیں گویا اس کے اندر ہم 'اور بھی زیادہ ہم' ہوجاتے ہیں - اسی لیے وہ ہمارا اپنا ہے؛ وہ ہم سے الگ ہوکر بھی ہمیں اپنے اندر حقیقی شکل میں

بنا لیتا ہے - اپنے اندر جس حقیقت کو ہم یقین کامل سے دیکھہ کر پیار کرتے ہیں بیٹے کے اندر بھی اسی حقیقت کو اسی طرح گہرائی سے دیکھنے میں ہماری محبت بڑہ جاتی ہے - اسی سبب سے یہ جاننے کے لیے کہ ایک انسان کیسا ہے ہمیں اس بات کو جاننا چاہئے کہ وہ کس چیز کو پیار کرتا ہے - اس سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اس تمام دنیا کے اندر کس چیز میں اپنے آپ کو پایا ہے، کتنی دور تک اس نے اپنے آپ کو پہیلا دیا ہے - جہاں ہمیں کسی طرح کی محبت نہیں ہوتی وہاں ہماری روح اپنے حدود کے دائرے کے اندر ہی رہتی ہے —

بچہ باہر روشنی کو دیکھہ کر یا کسی کو چلتا پہرتا دیکھہ کر خوشی سے ہنس پڑتا ہے اور شور کرنے لگ جاتا ہے - وہ اس روشنی اور چاپلے پن میں اپنی ہی روح کو بڑی شکل میں دیکھتا ہے، اسی لیے وہ خوش ہوتا ہے —

لیکن صاحب شعور ہونے کے بعد جب آہستہ آہستہ بچے کی روح دل و دماغ کی بہت سی تہوں میں پہیل جاتی ہے تب صرف انہیں چیزوں میں اسے مسرت حاصل نہیں ہوتی - یہ نہیں کہ بالکل حاصل نہیں ہوتی بلکہ تہوڑی حاصل ہوتی ہے —

اس طرح انسان کی جس قدر نشو و نما ہوتی جاتی ہے وہ اتنی ہی بڑی شکل میں اپنی حقیقت کو محسوس کرنا چاہتا ہے —

اگر انسان اپنی روح کو باہر دیکھنا چاہتا ہے تو سب سے پہلے وہ اسے دوسرے انسانوں ہی کے اندر دیکھہ سکتا ہے - آنکھوں کے ذریعے دیکھنے میں، کانوں کے ذریعے سننے میں، دل کے خیالات میں، تخیل کی جولانیوں میں، دل کی عجیب کششوں میں وہ دوسرے انسانوں ہی کے اندر قدرتاً

اپنے آپ کو کامل طور سے دیکھہ پاتا ھے - اسی لئے انسان کو جان کر ' انسان کو کھینچ کر ' انسان کا کام کرکے وہ بہت خوش ہو جاتا اور ملک اور زمانے میں جو انسان جتنے زیادہ انسانوں کے اندر اپنے آپ کو ملاکر دیکھہ سکتا ھے اور اپنے آپ کو چمکا سکتا ھے وہ اتنا ھی بڑا آدمی ھے ' وھی دراصل مہاتما ھے - تمام انسانوں کے اندر ھی ھماری زندگی کی کامیابی ھے - اس بات کو جو شخص کسی نہ کسی اچھے موقع پر کچھہ نہ کچھہ سمجھہ سکتا ھے اس کی قسمت میں اپنی شخصیت کا حصہ کم ھوگیا ھے ' وہ روح کو اپنے اندر دیکھنے ھی سے اپنی بے حقیقتی کو سمجھتا ھے —

سب کے اندر خود کو دیکھنا یہ ھماری انسانی روح کی فطرت ھے - خود غرضی اور غرور اس میں رکاوٹ ڈالتے ھیں - اسی قسم کی رکاوٹوں سے ھماری روح کی قدرتی ترقی رک جاتی ھے - انسانیت کے کامل حسن کو ھم بغیر کسی رکاوٹ کے نہیں دیکھہ سکتے —

لیکن ھم یہ سمجھتے ھیں کہ بعض لوگ یہ سوال کریں گے کہ اگر انسانی روح کی یہ فطرت ھے تو اس کی پیروی سے دنیا میں اس کی اتنی بری گت کیوں بنتی ھے ؟ اس خود غرضی اور غرور ھی کو کیوں نہ فطرت کہا جائے جن کو تم رکاوٹ کہہ کر اُڑا دیتے ھو ؟

دراصل بہت سے لوگ ایسا کہا کرتے ھیں کیونکہ فطرت کی نسبت اُس کی رکاوٹیں زیادہ نظر آتی ھیں - پہلے پہل جب کوئی آدمی بائسیکل پر بیٹھنے کی مشق کرتا ھے تو وہ چلنے کی نسبت زیادہ گرتا ھے - اگر اس وقت کوئی کہے کہ وہ آدمی بیٹھنے کی مشق نہیں کرتا گرنے کی مشق کرتا ھے تو اس بارے میں بحث کرنی فضول ھوگی - دنیا میں خود غرضی اور غرور کا تصادم ھمیں قدم قدم پر نظر آتا ھے لیکن اگر

اُن کے ہوتے ہوئے بھی انسان اپنی فطرت کو بچانے کی کوشش یعنی سب کے ساتھہ ملنے کی کوشش کو نہ دیکھہ پائے ' اگر گرنے ہی کو فطرت کہہ کر تکرار کرے تو یہ بحث بالکل فضول ہوگی —

حقیقت میں جو فطرت ہمارے لئے قدرتی ہے اُسے قدرتی شکل میں سمجھنے کے لئے ہی ' اُسے پوری قوت سے کام میں لگا دینے کے لئے ہی رکاوٹیں پیدا ہوتی ہیں - انہیں رکاوٹوں کے ذریعے سے وہ جاگ اٹھتی ہے اور اس کی یہ بیداری جس قدر زیادہ ہوتی ہے اس کی مسرت بھی اتنی ہی زیادہ ہوتی ہے ' ہر معاملے میں ایسا ہی ہوتا ہے —

عقل کی مثال لیجئے - علت و معلول کے تعلق کا پتا لگانا عقل کا ایک خاصہ ہے - آسانی سے مشاہدے میں آنے والی چیزوں میں جب تک وہ اس کام کو بہ سہولت انجام دیتی ہے تب تک وہ خود کو کامل طور پر نہیں دیکھہ پاتی - لیکن تمام دنیا میں علت و معلول کے تعلق اس قدر گہرائی میں پوشیدہ ہیں کہ ان کا پتا لگانے میں عقل کو جان توڑ کوشش کرنی پڑتی ہے - انہیں رکاوٹوں کے دور کرنے کی محنت میں عقل سائنس اور فلسفے میں خود کو اچھی طرح دیکھہ پاتی ہے - اسی سے اس کی شان اور عظمت بڑھتی ہے - در اصل اچھی طرح غور کرکے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سائنس اور فلسفہ عقل کے حصول کے سوا اور کچھہ نہیں - جہاں عقل اپنے قانون پر غور کرتی ہے وہاں اُس چیز کو اور خود کو اکٹھا کرکے دیکھتی ہے - اسی کو " اِدراک " کہتے ہیں - اِسی ادراک میں عقل کو مسرت حاصل ہوتی ہے ورنہ سیب جس وجہ سے زمین پر گرتا ہے سورج اسی وجہ سے زمین کو اپنی طرف کھینچتا ہے ' اس بات کے معلوم کرلینے میں انسان کے لئے اس قدر مسرت کا کوئی

سبب نہیں تھا ؛ کھینچتا ہے تو کھینچا کرے ہمیں اس سے کیا مطلب ؟ ہمارا اس سے یہی مطلب ہے کہ دنیا کے اس ہمہ گیر قانون کو ہم نے اپنی عقل کے ذریعے سمجھہ لیا - ہر جگہ اپنی عقل کو محسوس کرلیا - ہماری عقل کے ساتھہ زمین سے لیکر سورج ' چاند اور تاروں تک سبھی مل گئے - اس طرح دنیا کا غیر محدود راز انسانی عقل کو باہر کھینچ کر پھر اُس کے سامنے خود کو بڑی شکل میں نمایاں کرتا ہے - خود کو تمام دنیا کے ساتھہ ملاکر پھر اپنے آپ کو انسان کے حوالے کردیتا ہے - تمام چیزوں کے ساتھہ عقل کے اسی میل کا نام علم ہے - اسی میل کے ذریعے قوائے عقلیہ کو مسرت حاصل ہوتی ہے —

اسی طرح تمام انسانوں میں کامل طور سے اپنی انسانیت کے تعلق کو پانا انسانی روح کا قدرتی خاصہ ہے اور اُسی میں اسے سچی مسرت حاصل ہوتی ہے - ہمیں روح کے اس خاصے کو ذی شعور یا جیتی جاگتی شکل میں پانے کے لئے اندر باہر بڑی بڑی بندشوں اور رکاوٹوں میں سے گزرنا پڑتا ہے - اسی سبب سے خود غرضی میں اتنی طاقت ہے ' غرور اس قدر اٹل ہے اور دنیا کا راستہ اتنا دشوار گزار ہے - ان تمام رکاوٹوں میں سے گذرکر جہاں انسان کی فطرت اُجلی ہوکر کامل حسین شکل میں خود کو بزور نمایاں کرتی ہے وہاں بڑی مسرت حاصل ہوتی ہے - وہاں ہم خود کو بڑی شکل میں دیکھتے ہیں —

اسی سبب سے ہم بڑے لوگوں کی سوانح عمری پڑھنا چاہتے ہیں - ان کی سوانح عمری میں ہم اپنی رکاوٹوں سے گھری ہوئی طبیعت کو آزاد اور شگفتہ پاتے ہیں - تاریخ میں ہم اپنی ہی فطرت کو طرح طرح کے لوگوں میں ' مختلف ممالک میں ' مختلف واقعات میں ' مختلف معیاروں میں اور مختلف

سلسلوں میں دیکھہ کر خوش ہوتے ہیں ' گو ہم صاف طور پر سمجھیں یا نہ سمجھیں مگر اپنے دل میں اس بات کو ضرور محسوس کرتے ہیں کہ تمام انسان اور ہم ایک ہیں - اِس اتحاد کو جس حد تک ہم اچھی طرح محسوس کرتے ہیں اسی حد تک ہمیں مسرت حاصل ہوتی ہے —

لیکن سوانح عمری اور تاریخ میں ہم ابتدا سے انتہا تک سب کچھہ صاف طور پر نہیں دیکھہ سکتے - وہ بھی بہت سی رکاوٹوں اور بہت سے شبہات سے ڈھکی ہوئی نظر آتی ہیں ' تاہم اس کے ذریعے سے ہمیں انسان کے متعلق جو کچھہ علم حاصل ہوتا ہے وہ بلا شبہہ بہت بڑا ہے - لیکن ہم پھر اُسی علم کو اپنے دل کے موافق بناکر اور اپنی مرضی کے مطابق سجا کر ہمیشہ کے لئے زبان میں محفوظ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں - اگر ہم ایسا کر سکیں تو وہ علم خاص طور پر ہمارا ہوجاتا ہے - خوبصورت زبان میں عالی دماغی کے ذریعے جب ہم اس علم کے اندر اپنی محبت کو نمایاں کرتے ہیں تو وہ انسان کے دل کی شے بن جاتا ہے - پھر وہ اس دنیا کی آمد و رفت کی رو میں نہیں بہہ جاتا —

اس طرح باہر کی یہ جو ناممکن البیان خوبصورت روشنی ہے خواہ وہ طلوع آفتاب کا حسن ہو ' یا کسی بڑے آدمی کی زندگی کی چمک یا اپنے اندرونی جذبات کا طوفان ہو - غرض جو کچھہ بھی ہو ' ہر لحظہ ہمارے دل کو بیدار کرتا رہتا ہے - دل اُسے اپنی تخلیق کے ساتھہ ملا کر اسے اپنا سمجھہ کر محفوظ کرلیتا ہے - اس طرح ان تمام چیزوں کے ذریعے سے وہ در اصل خود ہی کو ' خاص طور سے نمایاں کرتا ہے —

میدان عمل میں انسان اپنے جسم ' دل اور دماغ کی تمام قوتوں اور تجربے سے گھر ' سماج ' راج اور مذہب و ملت کی تعمیر کرتا ہے - اسی تعمیر

میں انسان نے جو کچھہ حاصل کیا ہے ' جو کچھہ جان لیا ہے ' جو کچھہ اس کی خواہش ہے سب کچھہ نمایاں ہوتا ہے - اس طرح انسانی فطرت دنیا کے ساتھہ مل کر اور مختلف شکلیں اختیار کر کے سب کے بیچ میں خود کو قائم کرتی ہے - اس طرح جو چیزیں جذبات کے اندر صاف نہیں تھیں وہ بہت سی چیزوں کے بیچ میں مختلف اعضا کے ذریعے ایک جسم حاصل کر لیتی ہیں - غرض ہر آزاد انسان گھر ' سماج ' راج اور مذہبی فرقوں کے بغیر جن کی تعمیر بے شمار انسانوں نے زمانۂ دراز میں کی ہے خود کو اچھی طرح اور کامل طور پر نمایاں نہیں کر سکتا - یہ سب چیزیں انسان کے لیے انسان ہی کی شکل کی ہو گئی ہیں - اگر ایسا نہ ہو تو ہم ان چیزوں کو تہذیب یعنی کامل انسانیت کے نام سے نہیں پکار سکتے - راج یا سماج کے جس کسی کام میں بھی ہم انفرادی طور پر بالکل آزاد ہیں یعنی جہاں کہیں ایک کے ساتھہ سب کا میل نہیں ہوتا ' وہیں ہم غیر مہذب ہیں - اسی سبب سے مہذب سماج میں راج کو نقصان پہنچنے پر اس حکومت کے ہر ایک شخص کے بڑے جسم کو صدمہ پہنچتا ہے - اگر سماج بعض شعبوں میں تنگ نظر ہو تو اس سماج کے ہر شخص کی ذاتی نشوونما رک جاتی ہے - انسان کے دنیاوی میدان کی مذکورۂ بالا تمام بنائی ہوی چیزیں جس مقدار میں وسیع ہوتی ہیں اسی مقدار میں وہ اپنی انسانیت کو بغیر کسی رکاوٹ کے نمایاں کر سکتی ہیں اور جس قدر وہ تنگ نظر ہوتی ہیں اسی قدر انسان خود کو نمایاں نہ کر سکنے کے سبب پستی میں گر جاتا ہے - کیونکہ یہ دنیا اپنے عمل کی بدولت انسان کو نمایاں کرنے کے لیے ہے اور نمائش ہی مسرت ہے —

میدان عمل میں بھی انسان خود کو نمایاں کرتا ہے لیکن اس میں خود کو نمایاں کرنا اس کا اصلی مقصد نہیں ہوتا وہ تو اس کا ایک بالواسطہ نتیجہ ہوتا

ہے - ایک گھر والی گھر کے کاموں میں خود کو نمایاں تو کرتی ہے لیکن خود کو دکھلانا ہی اِس کا اصلی مقصد نہیں ہوتا - گھر کے کاموں کے ذریعے سے وہ اپنے بہت سے مقاصد پورے کر لیتی ہے اور یہ مقاصد اس کے کاموں کے ذریعے اس کی فطرت کو ہمارے پیش نظر کر دیتے ہیں —

لیکن ایک وقت آتا ہے جب انسان خاص طور پر خود کو نمایاں کرنا چاہتا ہے • غور کر کے دیکھو کہ گھر میں جس دن شادی ہوتی ہے اس دن ایک طرف شادی کی تیاریاں ہوتی رہتی ہیں اور دوسری طرف صرف شادی کے لوازمات اور رسوم کی تکمیل کے لیے ہی نہیں بلکہ اپنے دل کو کھول کر بتانے کی بھی ضرورت ہوتی ہے - اس دن گھر کے آدمی اپنے گھر کی مسرت کا سب کے سامنے اعلان کیے بغیر نہیں رہ سکتے - اور یہ اعلان کس طرح کیا جاتا ہے ؟ شہنائی بجتی ہے ' دئیے جلتے ہیں ' پھول اور پتوں سے گھر سجایا جاتا ہے - راگ رنگ ' خوشبو اور دل خوش کن نظاروں اور مسرت کے ذریعے دل خود کو سودھاری فوارے کے مانند چھوڑ دیتا ہے - اس طرح مختلف قسم کے اشاروں میں اپنی مسرت کو دوسروں کے دلوں میں جگا کر حقیقی بنانا چاہتا ہے —

ماں اپنے بچے کی خدمت کیے بغیر ہرگز نہیں رہ سکتی - یہی نہیں - صرف خدمت کے ذریعے نہیں ' ماں کی محبت خود بخود بغیر کسی سبب کے خود کو نمایاں کرنا چاہتی ہے ' وہ محبت کتنے کھیلوں ' کتنے پیاروں اور کتنی زبانوں میں سے پھوٹ پڑتی ہے - ماں بچے کو مختلف رنگوں کی آرائش سے سجا کر ' طرح طرح کے گہنے پہنا کر بغیر کسی غرض اور مطلب کے اپنی مامتا کو ان چیزوں کی کثرت کے ذریعے ' اور دل کی امنگوں کو حسن کے ذریعے نمایاں کئے بغیر نہیں رہ سکتی —

اس سے یہ پتا لگتا ھے کہ ھمارے دل کی فطرت یہی ھے - وہ اپنے جوش کو بیرونی دنیا کے ساتھہ ملا دینا چاھتا ھے - وہ بذات خود کامل نہیں ھوتا وہ اندرونی حقیقت کو بیرونی حقیقت کی شکل میں قائم کرکے ھی زندہ رھتا ھے - انسان جس گھر میں رھتا ھے وہ گھر اس کے لئے اینٹ اور لکڑی کی شکل میں ھی نہیں ھوتا اُس گھر کو وہ اپنی رھائش کی جگہ بنا کر اُس پر اپنے دل کے جذبات کا رنگ چڑھا دیتا ھے - جس ملک میں اُس کا دل رھتا ھے وہ ملک اُس کے نزدیک صرف مٹی ' پانی اور آسمان نہیں ھوتا ؛ وہ ملک جب اُس کے نزدیک خدا کی زندگی بخش شکل کو ماں کی شکل میں نمایاں کرتا ھے تب اُسے مسرت حاصل ھوتی ھے - ورنہ دل اپنے آپ کو باھر نہیں دیکھہ سکتا - اگر ایسا نہ ھو تو دل بے حس ھوجاتا ھے اور دل کے لئے بے حسی موت ھے —

اس طرح دل حقیقت کے ساتھہ اپنے جذبات کا تعلق قائم کرتا ھے - جہاں جذبات کا تعلق ھوتا ھے وھاں لین دین ھوتا ھے - ھمارے دل کی مالکہ جس گھر سے جیسی سوغات پاتی ھے اگر اُس گھر میں ویسی سوغات نہیں بھیج سکتی تو گویا اس کے وقار کو صدمہ پہنچتا ھے - اس طرح کی سوغات کی تھالی میں اُسے اپنے جذبات اور تعلقات کو نمایاں کرنے کے لئے مختلف مال مسالوں کے ذریعے ' زبان ' موسیقی ' برش اور پتھروں کے ذریعے ' تخلیق کرنی پڑتی ھے - اس کے ساتھہ ساتھہ اگر کوئی اس کا اپنا مطلب بھی پورا ھوجاتا ھے تو ٹھیک ھے ورنہ اکثر وہ اپنے مطلب کو قربان کرکے صرف خود کو نمایاں کرنے کے لئے بے چین رھتی ھے - وہ دیوالیہ ھوکر بھی اپنے کو مشہور کرنے میں دریغ نہیں کرتی انسان کی فطرت میں یہ جو نمائش کا جذبہ ھے یہی اس کی فضول

خرچی کا شعبہ ہے - اسی میں عقل کو ' جو خزانہ دار ہے ' بار بار اپنا سر پیٹنا پڑتا ہے —

دل کہتا ہے کہ میں اندر جتنا سچا ہوں باہر بھی اتنا سچا کس طرح ہوسکوں گا - ایسے اسباب اور اس طرح کا اچھا موقعہ کس طرح حاصل ہو سکے گا - وہ روتا ہے کہ میں خود کو سب کے سامنے نمایاں کرنے کی قابلیت نہیں رکھتا - ایک دولت مند آدمی جب اپنے دل میں یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ دولت مند ہے تو خود کو دولت مند دکھانے کے لئے " کُبیر " (یعنے دولت کا دیوتا) کی دولت کو بھی اُڑا دینے میں تامل نہیں کرتا - ایک عاشق جب اپنے دل میں سچی محبت محسوس کرتا ہے تو اُس محبت کو دکھانے کے لئے یعنی باہر حقیقی شکل میں لانے کے لئے وہ مال ' جان اور عزت وغیرہ سب چیزوں سے ایک پل میں دست بردار ہوجاتا ہے اس طرح باہر کی چیز کو اندر کی اور اندر کی چیز کو باہر کی چیز بنا دینے کی بے چینی کسی طرح کم نہیں ہوتی - شاعر " بلرام داس " (بنگالی شاعر) نے کہا ہے :-

" تو مار ھیار بھتر ھیتے کے کیل باھر "

(تمہارے دل کے اندر سے کس نے باہر نکال دیا)

یعنی پیاری چیز دل کے اندر کی چیز ہے اُسے گویا کسی نے باہر نکال لیا ہے - اسی سبب سے اُسے پھر اندر لوٹا دینے کے لئے اتنی زبردست خواہش ہوتی ہے اور اس کا برعکس بھی دیکھا جاتا ہے - دل اپنی اندرونی خواہش اور جوش کو جب کسی طرح بھی باہر نہیں دیکھہ پاتا تب آخر کار وہ مختلف ذرائع سے خود بخود اس کی شکل کا عکس اتارنے کے لئے جان توڑ کوشش کرتا ہے - اس طرح دنیا کو اپنی اور

خود کو دنیا کا بنانے کے لئے دل کی بے چینی ہمیشہ کام کرتی رہتی ہے - خود کو باہر نمایاں کرنا بھی اسی کام کا ایک شعبہ ہے ۔ اسی وجہ سے دل اسے نمایاں کرنے کی خاطر انسان کو سب کچھہ تج دینے کے لئے آمادہ کرلیتا ہے -

وحشی فوج جب لڑنا چاہتی ہے تو وہ صرف دشمن کو ہرا دینے پر ہی بس نہیں کرتی وہ دشمن کو شکست دینے کے بعد اپنے جسم پر رنگ مل کر ' شور و غل مچا کر اور باجے بجا کر ناچا کرتی ہے - یہ ہے اندرونی قتل کی خواہش کو باہر مشکّل کرکے کھڑا کرنا - ایسا نہ کرنے سے گویا قتل کی خواہش مکمل نہیں ہوتی - قتل کی خواہش اپنے مقصد کو پورا کرنے کے لئے جنگ کرتی ہے اور اپنی شکل کو دکھانے کی مسرت کے لئے یہ تمام فضول حرکات کیا کرتی ہے —

موجودہ زمانے کی مغربی جنگوں میں بھی جیتنے کی خواہش کو دکھانے کے لئے باجے وغیرہ کا سامان کچھہ کم نہیں ہوتا - پھر بھی موجودہ زمانے کی لڑائیوں میں عقلی چالوں کی اہمیت ہوگئی ہے - آہستہ آہستہ انسانی دل کی فطرت اس سے پرے ہٹتی جاتی ہے - مصر میں جب درویشوں کی جماعت نے انگریزی فوج پر دھاوا کیا تھا تو وہ صرف لڑائی جیتنے کے لئے ہی نہیں جان دیتے تھے ' بلکہ اپنے اندرونی جوش وخروش کو دکھانے کے لئے وہ آخری شخص تک مرمٹے تھے - لڑائی میں جو صرف فتح چاہتے ہیں وہ ایسی فضول حرکت نہیں کرتے - خودکشی کے ذریعے بھی انسان اپنے دل کو نمایاں کرنا چاہتا ہے - بھلا اتنے بڑے فضول خرچ کا کون قیاس کرسکتا ہے ؟ —

پوجا کرنے میں عقلمندوں کا طریقہ کچھہ اور ہے اور خالص عبادت

کرنے والوں کا کچھہ اور- عقلمند سوچتا ھے کہ پوجا کے ذریعے خدا سے فلاح حاصل کرلوں گا اور خالص عبادت کرلے والا سوچتا ھے کہ پوجا کے بغیر عبادت پوری نہیں ھوتی- اس کا چاھے اور کوئی نتیجہ نہ ھو دل کی عبادت کو باھر نمایاں کرنے سے اس کا پھیلاؤ ھوجاتا ھے- اس طرح عبادت پوجا کے اندر خود کو نمایاں کرکے کامیاب بناتی ھے- عقلمند کی پوجا سود پر روپیہ لگانا ھے اور خالص عبادت کرنے والے کی پوجا صرف فضول خرچی ھے- دل خود کو نمایاں کرنے میں نقصان کی قطعی پروا نہیں کرتا-

تمام دنیا کے اندر جہاں کہیں ھم اپنے دل کی اس فطرت کو دیکھتے ھیں وھیں ھمارا دل خود بخود اپنے آپ کو اس فطرت کے حوالے کردیتا ھے اور کسی بات کے جاننے کی خواھش نہیں کرتا- دنیا میں اسی بے حساب فضول خرچی کا ایک پہلو حسن ھے- جب ھم دیکھتے ھیں کہ پھول صرف بیج بننے کے لئے جلدی نہیں کرتا بلکہ اپنے مقصد کو طے کرکے خوبصورت شکل میں کھلتا ھے؛ بادل صرف پانی برسا کر اپنے کام کو پورا کرکے جلد فارغ نہیں ھوجاتا بلکہ بغیر مطلب کے ٹھہر کر اپنے دلکش رنگوں کی نمائش سے نظروں کو اپنی طرف کھینچ لیتا ھے؛ درخت صرف لکڑی بن کر برسات اور روشنی کے لئے ایک دبلے اور کمزور بھکاری کی طرح ھاتھہ نہیں پھیلائے رھتے بلکہ وہ ھرے بھرے حسن کی الوھیت میں اپنے چاروں طرف حسن کی بوچھاڑ کر دیتے ھیں- جب ھم دیکھتے ھیں کہ سمندر بادلوں کے ذریعے زمین پر صرف پانی برسانے کے لئے ھی ایک بڑا دفتر کھولے نہیں بیٹھا ھے بلکہ وہ اپنے چنچل نیلے پن کی اتھاہ گہرائی سے ڈراونا بھی ھے؛ پہاڑ صرف ندیوں کو پانی تقسیم کرکے ھی اکتفا نہیں کرتا بلکہ وہ جوگ میں بیٹھے ھوئے مہادیوجی کے مانند اپنی ڈراونی شکل کو فضائے آسمانی میں خاموشی کے ساتھہ قائم کئے ھوئے ھے، تو

اس وقت ہمیں دنیا میں دل کی فطرت کا پتہ چلتا ہے - اور اس وقت ہمیشہ بیدار رہنے والی عقل سر ہلا کر پوچھتی ہے کہ دنیا بھر میں اتنی غیر ضروری اداؤں کی فضول خرچی کس لئے ہے ؟ ہمیشہ جوان رہنے والا دل کہتا ہے کہ مجھہ کو مبہوت کرنے کے لئے اس کے سوا دوسرا کوئی سبب سمجھہ میں نہیں آتا - دل ہی جانتا ہے کہ دنیا کے اندر ایک اور دل بھی ہمیشہ خود کو نمایاں کر رہا ہے ورنہ دنیا کے اندر اتنا روپ ' اتنی موسیقی ' اتنی ادائیں ' اتنے اشارے اور کنائے اور اتنی زیب و زینت کس لئے ہے ؟ دل بیوپاری کی کنجوسی سے مبہوت نہیں ہوتا اسی سبب سے اُسے کھینچنے کے لئے جل تھل اور آسمان میں قدم قدم پر اصل مطلب کو چھپا کر اتنا غیر ضروری اہتمام کیا گیا ہے - دنیا اگر حسن کے رس میں ڈوبی ہوی نہ ہوتی تو ہم بالکل حقیر اور بے آبرو ہوکر رہتے - ہمارا دل کہتا کہ اس دنیا کی محفل میں مجھہ کو مدعو نہیں کیا گیا لیکن تمام دنیا اپنے ان گنت کاموں میں بھی مسرت پیدا کر کے یہی کہہ رہی ہے کہ میں تم کو چاہتی ہوں ' میں تم کو مختلف طرح سے چاہتی ہوں ' ہنسی میں رونے میں ' ڈر میں بھروسے میں ' غصے میں اور سکون میں —

اس طرح دنیا میں ہم دو طرح کے کام دیکھتے ہیں - ایک کام کا اظہار اور دوسرے جذبات کا اظہار - لیکن کام کے ذریعے جو کچھہ نمایاں ہوتا ہے اسے کامل طور سے دیکھنا اور سمجھنا ہمارا کام نہیں ہے - ہم دنیا کے اسرار کا پوری طرح اپنی علمی قوت سے حل نہیں سمجھہ سکتے کیونکہ وہ کامل طور پر ہمارے سامنے نمایاں نہیں ہوسکتے - لیکن جذبات کا اظہار بالکل کھلا اظہار ہے - جو خوب صورت ہے وہ خوب صورت ہے اور جو عظیم ہے وہ عظیم ہے 'جو خوفناک ہے وہ خوفناک ہے دنیا کی مسرت ایک دم

ہمارے دل میں داخل ہوتی ہے اور ہمارے دل کی مسرت کو باہر کھینچ لاتی ہے - اس ملاپ میں کتنی ہی تاک جھانک کیوں نہ ہو' کتنی ہی رکاوٹیں کیوں نہ پیش آئیں تو بھی تلاش کرنے سے جذبات کے اظہار اور ہمارے دل کے میل کے سوا اس میں کچھہ نہیں ملتا —

تب ہی تو ہم دیکھتے ہیں کہ اس دنیا اور انسانی دنیا کے مابین ایک طرح کی مشابہت ہے - خدا کی صداقت کی شکل دنیاے علم و عرفان کے گونا گوں واقعات میں نمایاں ہوتی ہے اور اس کی مسرت کی شکل دنیا کے مختلف رسوں میں بے نقاب ہوتی ہے - واقعات میں خدا کے علم کی شکل کو سمجھنا مشکل ہے لیکن رس میں اس کی مسرت کی شکل کو محسوس کرنے میں دشواری نہیں ہوتی کیونکہ رس میں تو وہ خود اپنے آپ کو نمایاں کرتا ہے —

انسانی دنیا میں بھی ہماری علمی قوت کام کر رہی ہے اور ہماری قوت نشاط رس کو پیدا کرتی ہے - کاموں کے ذریعے ہماری حفاظتی قوت اور رس کے ذریعے ہماری خود نمائی کی قوت ظاہر ہوتی ہے - ہمارے لئے حفاظت ذاتی کی ضرورت ہے اور خود کو نمایاں کرنا ہماری ضرورت سے زیادہ ہے —

ہم لڑائی کی مثال میں یہ دکھا چکے ہیں کہ ضرورت نمائش کے اور نمائش ضرورت کے راستے میں رکاوٹیں ڈالتی ہے - خود غرضی فضول خرچی نہیں چاہتی اور فضول خرچی ہی میں مسرت اپنا پتہ دیتی ہے - اسی سبب سے خود غرضی کے میدان میں ہماری نمود و نمائش جتنی کم ہوتی ہے اتنا ہی وہ کام معزز ہوجاتا ہے اور خوشی کے جلسے میں خود غرضی کو جتنا بھلا دیتے ہیں جلسہ اتنا ہی خوش نما ہوتا ہے —

اس لیے ادبیات میں انسان کے لیے خود کو نمایاں کرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی - خود غرضی اس نمائش سے دور ہے - وہاں دکھہ دل میں آنسوؤں کی دھاریں پیدا کرتا ہے لیکن ہمارے دنیا کے کاموں میں دست اندازی نہیں کرتا - ڈر ہمارے دل کو دہلا دیتا ہے لیکن ہمارے جسم کو صدمہ نہیں پہنچاتا - سکھہ ہمارے دل کو شگفتہ کر دیتا ہے لیکن ہمارے لالچ کو نہیں جگاتا - اس طرح انسان اپنی ضرورت کی دنیا کے پہلو بہ پہلو ضرورت کے علاوہ دنیائے ادبیات کی تخلیق کر رہا ہے - اس کے ذریعے وہ خود کو کوئی نقصان نہ پہنچا کر مختلف رسوں کے ذریعے اپنی فطرت کو مختلف شکلوں میں محسوس کرنے کی مسرت حاصل کرتا ہے - اپنی نمود و نمائش کو بغیر کسی رکاوٹ کے دیکھتا ہے وہاں کوئی ذمہ داری نہیں ہوتی وہاں مسرت ہی مسرت ہوتی ہے - وہاں سپاہی پہرہ دار نہیں ہوتے وہاں خود مہاراجہ ہوتے ہیں —

اس لیے ادبیات میں ہم کس چیز کی واقفیت حاصل کرتے ہیں ؟ اس چیز کی جو انسان میں ضرورت سے بالا ہے' جو الوہیت ہے' جو اس کی تمام ضرورتوں کو عبور کر گئی ہے - جو اس کی دنیا کے اندر ختم نہیں ہوسکتی -

اسی وجہ سے ہم نے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ کھانے کا مزا اگرچہ دنیا میں چھوٹے بچے سے لے کر بوڑھے تک ہر کوئی جانتا ہے اس پر بھی ادبیات میں سوائے مزاحیہ (A farce) کے اسے کہیں اور جگہ نہیں ملی کیونکہ وہ مزا بھوک کی سیری سے آگے نہیں بڑھتا - پیٹ بھرنے کے بعد ہم بادل کی طرح ایک گھرے " آہا " یعنی کلمۂ انبساط کے اظہار سے اسے (کھانے کے مزے کو) جلد رخصت کر دیتے ہیں - ادبیات کے شاہی دربار میں دکشنا دینے کے لیے ہم اسے مدعو نہیں کرتے لیکن جو ہمارے بھنڈار کے برتنوں میں کسی طرح بھی

نہیں سماتا وہی تمام رسوں کی طوفان خیز روانی ادبیات کے اندر لہریں اُٹھاکر ترنم کرتی ہوئی بہہ جاتی ہے - انسان اُسے اپنی ضرورتوں ہی میں ختم نہیں کرسکتا اسی لیے بھرے دل کی روانی سے ادبیات میں نمایاں کرکے سکون حاصل کرتا ہے —

اس طرح کی زیادتی میں انسان دراصل نمایاں ہوتا ہے انسان کھانے کو پسند کرتا ہے یہ بالکل سچ ہے؛ لیکن انسان بہادر ہے یہ اس سے بھی زیادہ سچ ہے - وہ گنگا کی طرح پتھروں کو پیس کر ایراوت (اندر کا ہاتھی) کو ہیرا کر گانو' شہر اور دھان کے کھیتوں کی پیاس بجھا کر ایک دم سمندر میں جاگرتا ہے - انسان کی بہادری انسانی دنیا کے تمام کاموں کو پورا کرکے دنیا کو عبور کرجاتی ہے —

اس طرح قدرتاً انسان کی جو چیز عظیم الشان اور ہمیشہ رہنے والی ہے اور جسے وہ اپنے کاموں میں ختم نہیں کرسکتا وہ انسان کی ادبیات میں محفوظ ہوکر خود بخود انسان کی بہت بڑی شکل بنا دیتی ہے —

اور بھی ایک سبب ہے - دنیا میں ہم جسے دیکھتے ہیں منتشر شکل میں دیکھتے ہیں - اسے کچھہ آگے سے کچھہ پیچھے سے کچھہ ادھر سے اور کچھہ ادھر سے دیکھتے ہیں اور دس کے ساتھہ مقابلہ کرکے دیکھتے ہیں - لیکن ادبیات میں اس طرح نہیں دیکھا جاتا - ادبیات میں جس چیز کو نمایاں کیا جاتا ہے اُسی پر پوری روشنی ڈالی جاتی ہے - اس وقت کسی اور دوسری چیز کو نہیں دیکھنے دیا جاتا - اس کے لیے مختلف قسم کی صنعتوں سے ایک خاص جگہ بنا دینی پڑتی ہے جہاں سے صرف وہی چیز چمکتی رہتی ہے —

ایسی حالت میں اس قسم کی کامل آزادی میں اور اس طرح کی تیز روشنی میں جو چیز اچھی نہیں معلوم ہوتی اسے ہم قدرتاً ایسی جگہ

نہیں کھڑا کرتے کیوں کہ ایسی جگہ پر اگر ناموزوں چیز کھڑی کر دی جائے تو وہ اس کی بے توقیری ہے - دنیا کے مختلف پردوں میں پیٹو آدمی پر نظر نہیں پڑتی لیکن جب ہم اسے ادبیات کے پلیٹ فارم پر مخصوص روشنی میں پیش کرتے ہیں تو وہ مضحکہ انگیز بن جاتا ہے - اس لیے انسان جس شکل کو روشنی میں لاتا ہے اور وہ ناقص نہیں ہے ' انسان کا دل جس شکل کو رحم یا بہادری میں ' خوف یا سکون میں اپنا ٹھیک نمائندہ تسلیم کر لینے میں پس و پیش نہیں کرتا اور جو شکل حسن صنعت کے حدود میں کھڑی ہوکر تکٹکی باندھنے والی نظر کو برداشت کر سکتی ہے ' اسی شکل کو انسان قدرتاً ادبیات میں جگہ دیتا ہے - ورنہ اس کی غیر موزونیت ہمارے لیے باعث تکلیف ہو جاتی ہے - راجا کے سوا اگر ہم کسی اور کو تخت پر بیٹھا ہوا دیکھیں تو ہمارے دل میں بغاوت پیدا ہو جاتی ہے —

لیکن تمام انسانوں میں قوت مدرکہ بڑھی ہوی نہیں ہوتی - سب سماج بھی وسیع نہیں ہوتے اور کوئی وقت ایسا آتا ہے جب کہ ایک عارضی اور ناقص چیز کا فریب انسان کو چھوٹا بنا دیتا ہے - ایسے بگڑے وقت کے آئینے میں چھوٹی چیز بڑی نظر آتی ہے اور اس وقت کے ادبیات میں انسان اپنی چھوٹی چیز کو بھی بڑی بنا کر دکھاتا ہے اور اپنے بد نامی کے داغ پر فخر کے ساتھ روشنی ڈالتا ہے - اس وقت صنعت کی بجائے اپنی چالاکی ' عظمت کی بجائے غرور اور " ٹینیسن " کی بجائے " کپلنگ " کو لا کھڑا کرتا ہے —

لیکن بڑا وقت بیٹھا ہوا ہے - وہ سب کو چھانتا اور بیلتا ہے - اس کی چھلنی میں سے جو چھوٹا اور ناقص ہوتا ہے وہ نکل آتا ہے اور مٹی میں مل کر مٹی بن جاتا ہے - مختلف زمانوں اور مختلف لوگوں میں

وهی چیزیں نکلتی هیں جن میں تمام انسان خود کو دیکھ سکتے هیں - اس طرح چھان کر چلنے سے جو چیزیں رہ جاتی هیں وہ تمام ملکوں اور تمام زمانوں کے انسانوں کی ملکیت هوتی هیں —

اس طرح توڑ پھوڑ کر اور گھڑ کر ادبیات میں انسانی فطرت کا ' انسان کے اظہار کا همیشہ رهنے والا نمونہ خود بخود جمع هوتا جاتا ہے - یہی نمونہ نئے زمانے کی ادبیات کی پتوار کو بھی پکڑے رهتا ہے - اس نمونے کے مطابق اگر هم ادبیات پر غور کریں تو تمام انسانوں کی قوت مدرکہ کی مدد لینی پڑتی ہے —

اب اصل بات کے کہنے کا وقت آگیا ہے - وہ یہ ہے کہ اگر هم ادبیات کو ملک ' زمانہ اور کردار میں محدود کرکے دیکھیں تو هم ادبیات کو حقیقی طور سے نہیں دیکھ سکتے - اگر هم اس بات کو سمجھ لیں کہ ادبیات میں تمام دنیا کا نمائندہ انسان خود کو نمایاں کررها ہے تو هم ادبیات میں قابل دید چیز کو دیکھ سکیں گے - جہاں ادبی تصنیف میں مصنف خود صرف اظہار کا ذریعہ نہیں بن گیا ہے وهاں اس کی تصنیف برباد هوگئی ہے اور جہاں مصنف نے اپنے احساسات میں تمام انسانوں کے جذبات کو محسوس کیا ہے اور اپنی تصنیف میں تمام انسانوں کے درد کو نمایاں کیا ہے وهاں اس کی تصنیف نے ادبیات میں جگہ حاصل کرلی ہے - همیں ادبیات کو اس طرح سمجھنا پڑے گا کہ تمام دنیا کا نمائندہ انسان شاهی معمار بن کر اس ادبیات کے مندر کی تعمیر کر رها ہے مصنف مختلف ملکوں اور مختلف زمانوں سے آکر اُس کے مزدور بن کر کام کر رہے هیں - تمام

عمارت کا خاکہ کیا ھے ؟ یہ کسی کو معلوم نہیں - لیکن بنانے میں جہاں غلطی ھوجاتی ھے وھاں وہ بار بار ٹوٹ جاتی ھے ۔ ھر ایک مزدور کو اپنی قدرتی کامل قابلیت کے ذریعے اپنی تخلیق کو سب کے ساتھہ موزوں بناکر اُس نظر نہ آنے والے خاکے کے ساتھہ ملانا پڑتا ھے - اس میں اس کی قابلیت ظاھر ھوتی ھے اور اسی سبب سے اُسے معمولی مزدوروں کی طرح معمولی تنخواہ نہیں دی جاتی - اس کی ایک اُستاد کی طرح عزت کی جاتی ھے —

ھم پر جس مضمون کے غور و خوض کی ذمہ داری عائد کی گئی ھے اُسے ادبیات عالم (Comparative Literature) کہتے ھیں —

انسان اپنے افعال کے ذریعے کونسی بات کہتا ھے ؟ اُس کا مقصد کیا ھے ؟ اس کی کوشش کس قسم کی ھے ؟ اگر ھم ان باتوں کو جاننا چاھیں تو تمام تاریخوں میں انسان کے مقصد کی پیروی کرنی پڑے گی ۔ اکبر کی حکومت ' یا گجرات کی تاریخ ' یاالزبتھہ کا کردار اس طرح الگ الگ کرکے دیکھنے سے صرف معلومات حاصل کرنے کی خواھش پوری ھوتی ھے - جو جانتا ھے کہ اکبر یاالزبتھہ صرف ذریعہ ھیں ' جو جانتا ھے کہ انسان تمام تاریخوں کے ذریعے اپنے بہت گہرے مقصد کو مختلف جد و جہد ' بھول اور اصلاحوں کے ذریعے حاصل کرنے کی کوشش کررھا ھے ' جو جانتا ھے کہ انسان تمام کاموں میں سب کے ساتھہ بڑی حد تک مل کر نجات حاصل کرنے کی کوشش کررھا ھے ' جو جانتا ھے کہ آزاد حکومت خود کو ایک بادشاہ کی حکومت میں اور ایک بادشاہ کی حکومت خود کو جمہوریت میں کامیاب بنانے کے لئے کوشش کررھی ھے ' اور انسان تمام دنیا کے نمائندہ انسان میں خود کو نمایاں کرنے کے لئے '

انفرادیت اکثریت میں خود کو حاصل کرنے کے لئے جوڑ توڑ کر رہے ہیں، وہ شخص انسان کی تاریخ میں کسی خاص شخص کا نہیں بلکہ ہمیشہ رہنے والے انسان کے ہمیشہ رہنے والے زندہ مقصد کو دیکھنے کی کوشش کرتا ہے - وہ صرف تیرتھ کے مسافروں ہی کو دیکھ کر واپس نہیں ہوجاتا بلکہ تمام مسافر جس دیوتا کے درشن کے لئے مختلف مقامات سے آتے ہیں اُسے دیکھ کر گھر لوٹتا ہے —

اسی طرح ادبیات میں انسان اپنی مسرت کو کس طرح نمایاں کرتا ہے اور اس نمائش کی حیرت انگیز تصویر میں انسان کی روح اپنی کونسی جاودانی شکل کو دکھلانا چاہتی ہے، ادبیات میں یہی چیز در اصل قابل دید ہے - وہ خود کو روگی، بھوگی، یا جوگی کی کس شکل میں تعارف کرانے میں خوش ہوتا ہے؟ دنیا میں انسان کا اپنا پن کتنی دور تک حقیقی بن گیا ہے یعنی سچ کہاں تک اُس کا اپنا بن گیا ہے؟ اسی بات کے جاننے کے لئے ادبیات کی دنیا میں داخل ہونا پڑے گا - اسے بناوٹی سمجھ لینا درست نہیں ہے - یہ ایک دنیا ہے اس کے عناصر کسی خاص شخص کے تابع نہیں ہیں - دنیا کی اور چیزوں کی طرح اس کی تخلیق ہو رہی ہے اور اسی بے انتہا تخلیق کی سب سے اندرونی تہ میں ایک انتہا کا نمونہ مستقل طور سے موجود ہے —

آفتاب کے اندر کی چیزیں خود کو مائع اور ٹھوس شکل میں مختلف طرح سے بنا رہی ہیں - ہم انہیں دیکھ نہیں سکتے لیکن اُن کے چاروں طرف جو روشنی کا دائرہ ہے وہ آفتاب کو دنیا کے سامنے نمایاں کرتا ہے یعنے سب کے ساتھ خود کو ملا دیتا ہے - اگر ہم انسان کو اسی طرح کامل طور پر دیکھنے کی چیز بنا سکتے تو ہم اُسے بھی آفتاب

ھی کی طرح دیکھتے - اُس وقت ہم دیکھتے کہ اُس کی چیزیں اندر ھی اندر آھستہ آھستہ مختلف تہوں کے ذریعے بن رھی ھیں اور اس کے چاروں طرف ایک روشنی کا چمکدار دائرہ ھمیشہ اپنے آپ کو چاروں طرف پھیلا کر خوش ھو رھا ھے - ایک بار ادبیات کو اُس روشنی کے دائرے کی شکل میں دیکھو جو انسان کے چاروں طرف پھیلی ھوئی ھے تو معلوم ھوگا کہ یہاں روشنی کا طوفان بپا ھے ' روشنی کا سونا پھوٹ رھا ھے اور روشنی کے بخارات کا اجتماع ھو رھا ھے —

شہر کے راستے پر چلتے چلتے ہم دیکھتے ھیں کہ انسان کو فرصت نہیں ھے - پنساری دوکان پر بیٹھا ھوا ھے ' لوھار لوھا پیٹ رھا ھے ' مزدور بوجھ اُٹھائے جا رھا ھے ' بنیا اپنے کھاتے کا حساب ملا رھا ھے ' اُس وقت ھم اس کے ساتھ ایک دوسری چیز کو نہیں دیکھ پاتے - لیکن ایک مرتبہ چپ چاپ دیکھو راستے کے دونوں طرف ھر ایک گھر میں ' ھر ایک دوکان میں ' بازار میں ' گلی کوچے میں ' کس قدر شاخ در شاخ مسرت کی موج کتنے راستوں سے ھوکر ' کتنے میل ' تنگی اور غریبی پر پھیلتی چلی جا رھی ھے - راماین ' مہابھارت ' کتھا کہانی ' کیرتن پانچالی (کتاب کا نام) دنیا کے نمائندہ انسان کے دل کا آب حیات دن رات ھر ایک انسان کو بانٹ رھی ھیں - بالکل حقیر لوگوں کے چھوٹے چھوٹے کاموں کی آڑ میں رام لچھمن آکر کھڑے رھتے ھیں ' تاریک مکان میں "پنچوٹی" (ایک مقام کا نام) کی رحم سے بھری ھوئی ھوا چلتی ھے - انسان کے دل کی تخلیق اور اس کے دل کی نمائش دونوں ' انسان کے میدان عمل کی سختی اور اس کی غریبی کو ' اپنے حسن اور ملگل کے کنگن پہنے ھوے ھاتھوں سے ڈھانک رھے ھیں - تمام ادبیات کو تمام انسان کے

چاروں طرف ایک مرتبہ اس طرح دیکھنا پڑے گا - دیکھنا ہوگا کہ انسان اپنی حقیقی ہستی کو جذبات کے ذریعے اپنے چاروں طرف اور بھی بہت دور تک بڑھا کر لے گیا ہے - اس کی بارش کے چاروں طرف کتنے گانوں کی برسات، نظموں کی برسات، کتنے " میگھہ دوتھہ " (کالی داس کی ایک نظم) کتنے " ودیا پتی " (ہندی اور بنگالی زبان کا مشہور شاعر) پھیل رہے ہیں - اپنے چھوٹے سے گھر کے سکھہ دکھہ کو اُس نے کتنے چندر بنسی اور سورج بنسی خاندان کے راجاؤں کی سکھہ دکھہ کی کہانی میں بڑا بنا لیا ہے - اس کی لڑکی کے چاروں طرف پاربتی کی دلدوزی ہمیشہ گھومتی رہتی ہے - وہ کیلاس (مہادیوجی کے رہنے کی جگہ) کی عظمت میں اپنی غربت کے دکھہ کو ملا دیتا ہے - اس طرح لگا تار انسان اپنے چاروں طرف جس وسعت کو پیدا کرتا ہے اس کے ذریعے گویا خود کو پھیلا کر اپنے آپ کو وسیع کرتا جا رہا ہے - جو انسان اپنے حالات سے مجبور ہے وہی انسان اپنے جذبات کی تخلیق کے ذریعے جو اپنی اس وسعت کی تخلیق کر رہا ہے، دنیا کے چاروں طرف ایک دوسری دنیا بنا رہا ہے - یہی ادبیات ہے —

اس بات کا آپ خیال تک بھی نہ کریں کہ اس ادبیات عالم میں میں آپ کا رہنما بن سکوں گا اپنی اپنی قوت کے مطابق ہم سب کو یہ راستہ طے کرنا پڑے گا - جس طرح میں تو اتنا ہی کہنا چاہتا تھا کہ زمین میرا کھیت، تمہارا کھیت اور اُس کا کھیت نہیں ہے، زمین کو اس طرح سے جاننا بالکل اناڑیوں کی طرح جاننا ہے - اُسی طرح ادبیات میری تخلیق، تمہاری تخلیق، اور اُس کی تخلیق نہیں ہے - عام طور پر ہم ادبیات کو اسی طرح اناڑی پن سے دیکھا کرتے ہیں -

اس اناڑی پن کی تنگ نظری سے خود کو ہٹا کر ادبیات عالم کے اندر انسان عالم کو دیکھنا ہم اپنا مقصد بنائیں گے ؛ ہر ایک مصنف کی تخلیق کے اندر ایک تکمیل کو دیکھیں گے اور اس تکمیل کے اندر تمام انسانوں کی نمائش کی کوشش کا تعلق معلوم کریں گے - اس طرح کے عزم کرنے کا وقت آگیا ہے —

ساقی نامۂ درد مند

از

شیخ چاند ایم' اے - ایل ایل' بی

محمد فقیہ المتخلص بہ درد مند اودگیر ضلع بیدر (دکن) کے نجباء سے تھے ان کی پیدائش وہیں ہوی - کم سنی میں اپنے والد کے ساتھ سنہ ۱۱۳۶ ھ میں شاہ جہاں آباد دھلی گئے تھے - آزاد بلگرامی کے بیان کے مطابق شاہ ولی اللہ اشتیاق سرہندی نبیرۂ شاہ گل وحدت نے اپنے سایۂ عاطفت میں لیا اور تہذیب اخلاق اور تحصیل حیثیات میں مشغول ہوے - درد مند کے والد نے جب کچھ دنوں کے بعد رحلت کی تو میرزا جان جاں مظہر نے اپنے آغوش شفقت میں لیا —

قایم نے آزاد بلگرامی کی اس اطلاع کو دو سال بعد (۱۱۶۸ ھ) اس رنگ میں پیش کیا: - "درد مند عنفوان شباب میں دلفریب حسن رکھتا تھا - شاہ ولی اللہ اشتیاق ... اس کے جمال کے مشاھدے سے حیات تازہ حاصل کرتے تھے ' لیکن چونکہ حسین پھول میں وفا کے رنگ و بو کا کوئی اثر نہیں ہوتا ہے اس لیے معمولی تغیر سے میرزا جان جاں سے جا ملا " —

قایم کے بیان میں درد مند کے تلون مزاج بلکہ بے وفایانہ افتاد طبع

کا اشارہ ملتا ہے - جس ادنیٰ تغیر کا قایم نے ذکر کیا ہے اس کا کچھہ حال نہیں کھلتا - لیکن اس میں مطلق شبہ نہیں کہ درد مند اپنے والد کی وفات کے بعد مرزا مظہر کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوگئے تھے - یہ واقعہ ۱۱۹۱ سے قبل کا ہے اس لیے کہ شاہ اشتیاق نے بقول قایم اسی سال رحلت کی - اس سےکافی قبل مظہر نے درد مند کو اپنے ظل عاطفت میں لیا تھا - اس کے بعد درد مند مظہر ہی کے تربیت کردہ ' شاگرد اور مرید کہلائے اور شاہ اشتیاق کی سرپرستی و استادی کا ذکر مذکور بہت کم ہوگیا ۔ اسی زمانے میں لوگ اس کو بھول گئے چنانچہ ہم عصر تذکرہ نگاروں نے درد مند کے سلسلے میں اشتیاق کی بجاے مرزا مظہر کا ذکر کیا ہے -

میر نے ۱۱۶۵ میں لکھا ہے : - " اس قدر جانتا ہوں کہ مرزا مظہر کے نظر یافتہ ہیں " آزاد نے سرو آزاد (مولفہ ۱۱۶۶ ھ) میں لکھا ہے :- " ان کی (مرزا مظہر کی) عنایت و تربیت سے مجموعۂ کمالات ہوگئے اور فن سخن میں رتبۂ شایستہ پیدا کیا " - گردیزی کا بیان ہے :- " درد مند کی شمع ادراک مرزا مظہر کے تجلی کدے سے روشن ہوی ہے " - قایم ۱۱۶۸ میں لکھتا ہے :- " مدت تک ان کی (مظہر کی) خدمت میں استفاضۂ آگاہی کیا اور سخن سنجی شروع کی ' - ان کے علاوہ قدرت اللہ شوق ' میر حسن ' شفیق عبدالوہاب افتخار' علی لطف ' قاسم اور دیگر تذکرہ نویسوں نے یہی لکھا ہے -

اگرچہ تذکرہ سازوں نے درد مند کے حق میں شاہ اشتیاق کی ابتدائی تعلیم' تربیت اور فیض و اثر کا ذکر نہیں کیا ہے لیکن قرین قیاس یہ ہے کہ ان کی صحبت و تعلیم نے دیگر فیوض و برکات کے ساتھہ درد مند کے دل میں شعر و سخن کا شوق بھی جاگزیں کردیا تھا ۔ شاہ صاحب ایک صاحب ذوق شاعر تھے - قایم نے ان کی نسبت لکھا ہے - " باوجود مذاق علمی چاشنیٔ فقر داشت

در کوٹلۂ فیروز شاہ سکونت داشت انزوا گزیدہ اوقات عزیز بیاد الہی بسر می برد هر گاہ کہ از تدوین و ترتیب نسخۂ عقبی فراغتش روے نمود چیزے از قبیل فارسی بر سبیل فکر می کرد - بندہ روزے بخدمتش حاضر شدم حرفہاے با مزہ می گفت " ـــ

اس صحبت کا اثر ہونا لازمی تھا اور ہمارا خیال ہے کہ فارسی کا شوق ابتداءً یہیں پیدا ہوا اور یہی وجہ ہے کہ ۱۱۶۶ ھ سے قبل اپنا فارسی دیوان مرتب کر لیا تھا جیسا کہ گردیزی کے بیان سے ثابت ہوتا ہے - اور اسی کا اثر تھا کہ آخر تک فارسی ہی میں طبع آزمائی کرتے رہے اور ریختہ کی نسبت لکھا ہے کہ مرزا مظہر جان جاں کی محبت سے مجبور ہو کر اس میں طبع آزمائی کی ہے —

محبت نے مجکوں کیا لا جواب
وگرنہ میں اور ریختہ کیا حساب

شاہ اشتیاق کی صحبت میں دردمند نے سخن گوی شروع کی ہو یا نہ کی ہو لیکن یہ تسلیم کرنے میں تامل نہیں ہوسکتا کہ شاعری کا ذوق انہیں شاہ صاحب ہی کی صحبت میں ہوا - یہ ضرور ہے کہ مرزا مظہر کی استادی نے ان کے جوہر خوب چمکاے - مرزا ہی سے فقیری کا فیض پایا اور ریختہ میں طبع آزمائی بھی انہیں کی ایما سے کی - چنانچہ خود لکھا ہے :

خدیو سخن میرزا جان جاں کہ حکم اس کا ہے ناطقے پر رواں
اسے سب میں یارب امامت رہے قیامت تلک وہ سلامت رہے
کہاں تھا مجھے ریختہ کا خیال ہوا واجب ایک امر کا امتثال
محبت نے مجکوں کیا لا جواب وگرنہ میں اور ریختہ کیا حساب

درد مند کا قیام دہلی میں تقریباً تیس سال رہا اس طویل عرصے میں وہ کسب حیثیات کرتے رہے اور رفتہ رفتہ وہ کمال پیدا کیا کہ اچھے اچھے اہل علم و فضل ان کے معترف ہوگئے - خود مرزا جان جاں ان کے اوصاف شاعرانہ پرناز کرتے تھے اور اپنی استادی اور ان کی شاگردی پر فخر و مباہات کرتے تھے - اپنے ایک شعر میں بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے —

مظہر مباش غافل از احوال درد مند
لعلے ست ایں کہ درگرۂ روزگار نیست

قاسم نے لکھا ہے کہ :

" مرزائے مرحوم ان سے بدرجۂ اعلی خوش تھے " —

درد مند نے اپنے فضل و کمال اور شہرت و ناموری کی بنا پر بعض مقتدر امیروں کی سر پرستی حاصل کرلی تھی - ان میں سب سے زیادہ مشہور محمد شاہی مصاحب و وزیر نواب امیر خاں انجام عمدۃ الملک ہیں جن کا اس زمانے میں طوطی بول رہا تھا۔ قاسم نے درد مند کے ایک شعر کے بارے میں لکھا ہے کہ " جب محمد شاہ بادشاہ محل سرا میں داخل ہوئے اور وہاں سے نواب انجام کو رخصت کیا تو اس موقع پر یہ شعر کہا :—

سدھارے سرا پردۂ خاص کو
مرخص کیا بردۂ خاص کو

یہ شعر ساقی نامے کے کسی نسخے میں نہیں ملا شاید کسی دوسری نظم کا ہو - اس شعر سے نواب عمدۃالملک کی سر پرستی کی ہلکی سی شہادت ملتی ہے - محمد علی خاں کوئی امیر تھے جو درد مند کے ممدوح تھے

ان کی شان میں لکھا ہے :-

رهی نہیں مجھے نیک و بد کی تمیز — کہ ہے ایک خاطر قیامت عزیز
کروں آب گوہر سے اول وضو — تب اس نام سے میں کروں گفتگو
سعادت ہے اس نام کا ذکر خیر — عبادات ہیں ناتمام اس بغیر
نبی اور علی اس سے آتے ہیں یاد — دو دولت ہیں یک نام سے مستفاد
محمد علی خاں سیادت کا جان — کہ کرتے ہیں اس سے فخر دونو جہان
امامت کا نخل برو مند ہے — کہ شاہ ولایت کا فرزند ہے

کئی شعروں میں ان کی تعریف ہے - یہ نہ معلوم ہوسکا کہ یہ کون امیر تھے - خود میر نے اسی زمانے میں لکھا ہے کہ ' کوئی محمد علی خاں تھے " -

یہ واقعات عہد محمد شاہی کے ہیں - اس کے اخیر میں نادری قہر نازل ہوا جس نے دہلی کو بے جان اور نڈھال کردیا - اس کے بعد ہی ابدالی کے ہنگاموں اور یورشوں کا آغاز ہوگیا اور خانہ جنگی ' طوایف الملو کی اور خود غرضیوں اور سازشوں کا وہ بازار گرم ہوا کہ دہلی میں کسی کا ٹھکانا نہ رہا - خود امراء و روسا دہلی کو چھوڑنے لگے - قدرشناس بے ٹھور ٹھکانا ہوگئے اور جگہ جگہ پناہ گیر ہونے لگے - اس فتنہ خیز اور افرا تفری کے زمانہ میں درد مند نے دہلی کو خیر باد کہی -

آزاد بلگرامی اور گردیزی کے بیان کے مطابق درد مند ۱۱۶۶ ھ کے لگ بھگ شاہ جہاں آباد سے بنگال گئے - وہاں کے حاکم نے بڑی قدر کی - وہاں یہ بجمعیت خاطر گزراں کرتے تھے - علی لطف کا بیان ہے کہ " چند مدت عظیم آباد میں بود باش کی ہے اور رفاقت میں نواب غلام حسین خاں اور نواب اعظم خاں کے بیٹے کی گزران معاش کی ہے - بعد اس کے پھر دلی گئے اور چند مدت وہاں رہے - پھر نوازش محمد خان شہامت جنگ

بھتیجے نواب وردی خان مہابت جنگ کے بلائے ہوئے شاہ جہاں آباد سے مرشد آباد میں آے اور طور بود و باش کا وہیں تہیرا ے - رفاقت میں نواب مذکور کی البتہ ایک رفاہ حال ہوا - آخر ۱۱۷۲ ھ میں بلدۂ مرشد آباد کے اندر انتقال ہوا " —

تاریخ وفات کے بارے میں اختلاف ہے - یوسف علی خاں نے (جو درد مند کو اپنا دوست بتاتا ہے) اپنے تذکرے (مولفہ ۱۱۸۰ - ۱۱۱۳ ھ) میں سنہ وفات ۱۱۷۹ ھ لکھا ہے (ملاحظہ ہو فہرست کتب خانۂ شاہان اودہ) - درد مند بہت خوش اختلاط شخص تھے - لوگوں سے مراسم اچھے تھے - آزاد بلگرامی سے ملاقات نہ تھی لیکن ان سے خلوص تھا - آزاد کا بیان ہے " فی مابین فقیر (آزاد) و مشار الیہ (د د مند) غائبانہ اخلاص وافی است و ہمیشہ طریق مراسلات مسلوک '-علی لطف نے لکھا ہے " طریقۂ مصاحبت و اختلاط کے ماہر حد سے زیادہ تھے ' —

درد مند کی شہرت و عظمت کا راز ان کی شاعری میں ہے - وہ فارسی اور ریختہ دونوں زبانوں میں طبع آزمائی کرتے تھے لیکن فارسی کی طرف میلان طبع زیادہ تھا - اکثر مشہور اور مستند تذکروں میں ان کا ذکر اور ان کے کلام کے نمونے موجود ہیں - ان کا فارسی دیوان بقول گردیزی سنہ ۱۱۶۲ ھ سے قبل مشہور ہوچکا تھا - کتب خانۂ شاہان اودہ میں اس کا ایک نسخہ موجود تھا - فارسی دیوان ہمارے پیش نظر نہیں البتہ مختلف تذکروں * میں ان کے جو اشعار بطور نمونہ درج ہیں وہ یہاں نقل کئے جاتے ہیں --

---

* سرو آزاد ' تذکرۂ بے نظیر ' گل رعنا مولفہ شفیق ' عبرۃ الغافلین سودا —

در کوے مے فروش نماند آبرو مرا لب تشنگی فروخت بدست سبو مرا
جاں بے کسانہ دادم و شادم کہ عمرہا بود است بر مراد تو مرگ آرزو مرا

ایں الم در قفس آورد بفریاد مرا کہ بہار آمد وکس گل نفرستاد مرا

آں قدر با قفس افتاد سر و کار مرا کہ فراموش شدہ آخر رہ گلزار مرا
گرہمہ شربت وصل است کہ لذت ندہد آنقدر داشت فلک تشنۂ دیدار مرا

نامہ ام تا باز ننماید کسے خوب مرا کشتہ قاصد را بگردن بستہ مکتوب مرا

صیدے ز قفس جست کماں می برم امروز ایں گونہ کہ رنگ از رخ حیا بریدہ است

(رباعی)

از فیض تو اے شافع روز محشر ہر روز بود عہد غدیر دیگر
چوں جام بود چشم امیدم در حشر بر دست تو اے ساقیٔ حوض کوثر

(رباعی)

آنم کہ نشاط را از شیون طلبم سرمایۂ زیستن ز مردن طلبم
چوں تیغ جفا کشی من از بہ دعا از سر تا پا چو شمع کردن طلبم

تا دید جذبۂ دل حیرت شعار من آئینہ صاف نیست بمشت غبار من

چو خوبی بلدہ خوبے شود گردم اسیر او مردم جوانی را هم عمر است پیر او

(رباعی)

یک چند عتاب و ناز ظاهر کردی وین عمر دو روزه بار خاطر کردی
بعد از مردن رهت بخاکم افتاد اول با پست آنچه آخر کردی

یه اشعار شاهد هیں که درمند فارسی کے پخته گو شاعر هیں - ان کے کلام میں وہ تمام خصوصیات پائی جاتی هیں جو ایک مشاق اور صاحب ذوق شاعر کے لئے لازم هیں - اس زمانے کے اساتذۂ تنقید نے ان کے فارسی کلام پر بہت عمدہ رائیں دی هیں جن سے ثابت هوتا هے که ان کا فارسی کلام مقبول اور مشہور تها - هم چند رائیں درج کرتے هیں - آزاد بلگرامی " از شعراے خوش تقریر ' فارسی و ریخته هر دو خوب می گوید " - شفیق " در سخن رتبۂ بلند و پایۂ ارجمند می دارد - اشعار فارسیش بین الجمہور مشہور است " " شعر فارسیش با گفتگوے مرزا (مظہر) مانا است " - علی لطف " فارسی دیوان ان کا صاحب نظروں کا منظور هے " —

گردیزی " دیوانے به زبان فارسی جمع کردہ دراں تلاش معنی رنگین و الفاظ درد آگیں نمودہ داد سخن گستری دادہ "

فارسی سے قطع نظر کر لی جاے تو دردمند کا پایه اردو شاعری میں بهی کافی بلند هے اردو دیوان کا اب تک پته نہیں چلا - تذکروں * میں چند اشعار ملتے هیں جو یہاں بطور نمونه درج کئے جاتے هیں ان سے دردمند

* گردیزی ' قائم ' مہر حسن ' علی لطف —

کی ریختہ گوئی کا ایک حد تک اندازہ ہوگا —

ہے غم سے رقیبوں کے مرا دل ناشاد
اس دھر کے سے جاتے ہیں سبھی عیش بباد
پرویز کے شیشہ خانۂ عشرت پر
سنگ آیا و لیکن سخت آیا فرہاد

کہسار میں جا گرا ناحق لے نئیں پرویز سے جا بھڑا ناحق کے نئیں
کوئی ٹکر پہاڑ سے لیتا ہے فرہاد کا سر پھرا ہے ناحق کے نئیں

قفس تک بھی نہ پہنچے اور پڑے دور آشیانے سے
عجب ساعت میں بچھڑے ہم چمن کے آشیانے سے

الٰہی مت کسی کو پیش رنج و انتظار آوے
ہمارا دیکھئے کیا حال ہو جب تک بہار آوے

دردمند کو اردو زبان کی تاریخ میں جو جگہ ملتی ہے وہ محض ان کی مثنوی ساقی نامے کی وجہ سے - یہ ایک مثنوی ہے جس کا تعلق خمریات سے ہے - یہ کوئی عشقیہ مثنوی نہیں اس لئے اس میں کسی فسانے کی مسلسل و مربوط روئداد نہیں - اس کے نام (ساقی نامہ) سے ظاہر ہے کہ رندی و مستی اور خمر و نشہ کے مضامین کی حامل ہے - اس کی اہمیت اس وجہ سے ہے کہ اردو زبان میں ان مضامین کو اس شکل میں مستقل طور سے پہلی دفعہ اس نادر کلامی کے ساتھہ قلم بند کیا گیا ہے - دو سو سال قبل کی زبان ہے - عہد محمد شاہی میں لکھی گئی ہے لیکن جو

نمکینی اور صفائی اس کی زبان میں ھے اور جو سلاست و پختگی اس کے طرز ادا میں پای جاتی ھے اس سے آج بھی ھم لطف اندوز ھوتے ھیں - یہ بات اس دور کی شاعرانہ پیداوار میں بڑی حد تک مفقود ھے - فارسی میں ساقی نامے شاعروں نے کثرت سے لکھے ھیں لیکن اردو میں ان کا وجود نہ تھا درد مند سب سے پہلا شاعر ھے جس نے اس اھتمام اور کامیابی کے ساتھہ یہ نظم لکھی ھے کہ اس کے بعد کسی شاعر کو لکھنے کی ھمت نہیں ھوی اور یہی وجہ ھے کہ تمام اساتذہ نے اس کی تعریف متفق اللسان ھوکر کی ھے - چند رائیں ملاحظہ ھوں —

آزاد بلگرامی : " ساقی نامۂ ریختہ او مشہور است کہ مقبول طبایع گردیدہ " -

قدرت الہ شوق : " ساقی نامۂ او بر السنۂ خواص و عام مذکور است " —

افتخار دولت آبادی : " ساقی نامۂ او شہرت دارد " -

شفیق : " ساقی نامۂ ریختہ او مشہور آفاق است " " طرفہ صفاے و نمکے دارد " —

مہر حسن : " ساقی نامہ ... بسیار با نمک گفتہ و گوھر معانی سفتہ " —

قاسم : " ایں ساقی نامہ خیلے مشہور و بر زبان خلق جاری است " -

ان تذکرہ نگاروں کے علاوہ اردو زبان کے " نقاش اول " مرزا جان جاں بھی اس کی بڑی تعریف کرتے تھے اور بقول قاسم اس کو بار بار سنتے تھے -

ساقی نامہ کی مقبولیت و شہرت کا حال قدیم تذکرہ سنجوں کے بیانوں سے بخوبی ھوتا ھے اس کے سوا ایک اور ثبوت اس کی غیر معمولی شہرت کا یہ ھے کہ سید عبد الولی عزلت نے اس کے جواب میں ایک مثنوی ۳۳۱ شعر کی بیان ظہور کے تاریخی نام سے ۱۱۷۴ ھ میں لکھی - یہ خیال ھوسکتا ھے کہ درباری رشک و حسد سے مغلوب ھوکر جواب میں یہ مثنوی

لکھی ہو اس لئے کہ دونوں ایک ساتھہ کچھہ عرصے کے لئے مرشد آباد میں تقریباً ایک ہی سرکار کے متوسل تھے - دردمند کا سر پرست نواب علی وردی خاں کا بھتیجا تھا اور عزلت کا سرپرست خود نواب تھا - لیکن یہ قیاس کسی طرح صحیح نہیں ہوسکتا عزلت ایک ضابط و متین متوکل اور با وضع قلندر تھا - درباری رقابت سے اس کی ذات بہت ارفع تھی دوسرے اگر وہ اس کا جواب دیتا بھی تو مرشدآباد میں دے سکتا تھا جہاں دردمند بھی موجود تھا اور شاعرانہ مجادلے کے لئے موزوں میدان بھی تھا - اس کے برخلاف عزلت نے یہ جواب مرشد آباد کو خیرباد کہنے کے کافی عرصے کے بعد دکن میں دیا ہے اور وہ بھی ایک عجیب اتفاق کی بنا پر - خود عزلت نے اپنی مثنوی بیان ظہور کی تقریب میں لکھا ہے " چند پر خلوص احباب چاندنی کا لطف اٹھا رہے تھے ' صحبت شعر بھی گرم ہوگئی کسی نے دردمند کے ان اشعار کا ذکر چھیڑ دیا جو اس نے چاندنی کے حق میں کہے ہیں " (ملاحظہ ہوں آخری آٹھہ شعر) - جن کا خلاصہ یہ ہے کہ شاعر نے ساقی کو سیر باغ کی ترغیب دی پھر جام و مینا کا اشتیاق ظاہر کیا ' راگ کی خواہش کی اور آخر میں چاندنی کے سیر کی تکلیف دی - جوش مستی اور سرور مے و نغمہ میں چاندنی نے قیامت کردی - اس عالم میں دل پر تاثرات و جذبات کا جو ہجوم ہوا تو تاب نہ لاسکا - نور مہتاب کو دیکھہ کر جی اس طرح ڈوب گیا جس طرح پانی کو دیکھہ کر مصروع کا دل بیٹھہ جاتا ہے - شاعر کہتا ہے کہ مہتاب سے دشمنی کی توقع نہ تھی لیکن ذرا غور کیا تو خود اپنا قصور نظر آیا - مے و نغمہ اور رندی و مستی گناہ ہے جس کی پاداش میں خدا نے طوفان نازل کیا - لیکن چونکہ ہم گنہگار ' حضرت محمد علیہ السلام

کے امتی ہیں اس لئے ہمارے لایق طوفان نور نازل کیا - دردمند نے شاعرانہ حسن تعلیل سے جوش مہتاب کے اثرات کو دکھایا ہے ' لیکن عزلت نے یہ اعتراض کیا ہے کہ " حضرت محمد علیہ السلام کے امتی دنیا میں مورد عتاب نہیں - اس کے سوا چاندنی اس وقت سے ہر ماہ چٹکتی ہے جب سے کہ دنیا بنی ہے یہ کوئی نئی چیز نہیں کہ اسے طوفان کہا جاے - بڑے تعجب کا مقام ہے کہ امت نوح پر تو صرف ایک بار طوفان آے اور حضرت محمد کی امت پر ہر ماہ طوفان نازل ہو - یہ طوفان مخصوص بہ امت محمدی نہیں - سابق کی امم بھی بلا تخصیص اس کی مورد تھیں - مقام حیرت ہے کہ اہل معنی (دردمند) اس ذرا سی بات کے سمجھنے میں کوتاہی کریں - دردمند ایک پختہ گو شاعر ہے لیکن غلطی کے طوفان میں گھر گیا ہے " اس کے بعد چاندنی کے متعلق اپنے خیالات ظاہر کئے ہیں کہ اس میں دو رمز ہیں —

کیا حق نے عزلت پر اپنا کرم　　دو معنی کئے اوس کے دل پر رقم
یہ ہے رمز اول جسے ماہ سے　　جو پوچھا میں الہام اللہ سے
کہ دل پر جلھوں کے بہ فضل خدا　　ذرا مہر ایماں کا پر تو پڑا
وہ پوچھیں کہ محرم ہیں جو مومناں　　نہویں رحمت حق سے مایوس یاں
کہ جوں شب سے ڈل کر کے مہتاب آے　　ہٹے ظلمت اوس کی ہو جاے ضیاے
سیہ نامۂ مومنوں سے بہ جبر　　نکل نور رحمت ہو جاوے گا نشتر
جو سچ پوچھو تو نور ایماں وہی　　بن آوے گا خود نور رحمت سبھی
ورق ان کے جرموں کا اُلٹے گا رب　　سیہ نامے اُجلے ہو جاویں گے سب
دویم رمز یہ ماہ سے ہے عیاں　　کہ عصیاں ہے حق نمک بھولنا
نمک نور خورشید کا کھا ہلال　　شب و روز بڑھتا رہا بال بال

ھوا بدر تب مہر سے کر کے عار رکھا دل میں اپنے کلف کا غبار
حق پرورش سب بھلا مہر کا حریف مقابل ھوا مہر کا
کیا مہ نے حق نمک دل سے حک نہیں چاندنی بھوت نکلا نمک

درد مند اور عزلت کے بیانوں کو پیش نظر رکھہ کر فتوت اورنگ آبادی نے اپنی مثنوی در معلوی (مولفہ ۱۱۷۳ - ۱،۷۵) میں چند شعر لکھے ھیں جن میں دونوں کے بیانات سے انحراف کر کے اپنا قول پیش کیا ھے —

کیا دونو نے خوب مہ کا ثبوت کہ تھا اصل میں اس کا جو تار و پوت
نشہ میں مجھ سے کے آیا خیال کہ ضرب المثل میرا یہ ھے مثال
کہ مستوں کا احوال سن بے خبر ترحم کا حق نے کیا ھے نطر
ھے عصیاں بہ ید مغفرت کا نشاں کہ سر مستوں کا ھے یہ حق بے گماں
خدا کی بھی قدرت تو معمور ھے نہیں چاندنی پردۂ نور ھے

ان شاعرانہ موشگافیوں سے بھی ثابت ھے کہ ساقی نامہ کی شہرت عالمگیر تھی اس کو غیر معمولی مقبولیت حاصل تھی ۔ اس زمانے میں کسی شاعر یا صاحب تنقید نے اس کی زبان و بیان پر خردہ گیری نہیں کی بلکہ تمام ارباب نظر نے اس کی بڑے شد و مد سے تعریف کی ھے - شفیق اورنگ آبادی نے ذیل کے شعر پر اعتراض کرتے ھوے لکھا ھے " اجزاے مصرعۂ ایں بیت خلاف روز مرۂ ھندوستان است و از جدا خواندن ایں بیت دریں ولا خود ثابت می شود " -

شفیق نے وہ شعر اس طرح نقل کیا ھے :—

ارے زاھدو ملکروں کے امام ارے آب انگور تجھہ پر حرام

لیکن ساقی نامے کے تمام نسخوں میں یہ شعر اس طرح درج ھے —

ارے زاھد، اے منکروں کے امام
ارے آب انگور تجھہ پر حرام

اس سے ظاھر ھے کہ شفیق کے پیش نظر کوئی غلط نسخہ تھا - مصرعہ اولیٰ کے اجزا پر اس کا جو اعتراض ھے اس صورت میں وہ خود بخود رد ھو جاتا ھے —

ساقی نامے کی شہرت و مقبولیت (جو عرصے تک اس کو اھل شعر و سخن اور صاحبان فن میں رھی ھے) پر نظر کرتے ھوے ایک زمانے سے اس کی تلاش تھی - اتفاق سے اس کے تین نسخے مخدومی مولوی عبدالحق صاحب مدظلہ کے کتاب خانے میں ھاتھہ آے جن سے ایک نسخہ مرتب کرایا گیا ھے جو ھدیۂ ناظرین کیا جاتا ھے - ھماری قدیم مثنویوں میں جو چلد شعر خمر و نشہ کے مضامین پر لکھے جاتے تھے ھمارا خیال ھے کہ ان کے رواج اور ترقی میں درد مند کے ساقی نامے کی شہرت و مقبولیت بھی کار فرما ھے - اس نظر سے بھی اس کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ھوگا - قدیم اساتذہ کا کلام ھر وقت ھمارے پیش نظر رھنا چاھئے اس لئے کہ جب نیا ادب، قدیم کی جگہ لیتا ھے تو اپنے اندر پچھلے اثرات ضرور پنہاں رکھتا ھے جس سے یہ معلوم ھوسکتا ھے کہ ھم میں کس حد تک اپج اور جدت ھے اور کس حد تک ھمارے ادب پر قدیم خیالات کا قبضہ ھے اس تقابلی مطالعے سے ھم اپنی جدتوں اور ادبی فتوحات کو جانچ سکتے ھیں اور ان کے برقرار و زندہ رکھنے کی فکر کر سکتے ھیں ورنہ اکثر اس لاعلمی اور بے خبری میں بہترین اور مایۂ ناز خصوصیات اور امتیازات پائمال غفلت ھو جاتے ھیں —

ساقی نامہ

حمد

الٰہی تیرا حمد مقدور نیں   اگرچہ سخن کا یہ دستور نیں
بجا ہے جو تیرا ثنا گر نہیں   یہ مونہہ ان شرابوں کا ساغر نہیں

نعت

میرا نعت میں بھی یہی حال ہے   وہی عجز اس عجز پر دال ہے
کہ جیوں شمع ہوں سخت عاجز بیاں   جلانے کے قابل ہے میری زباں

مناجات

مناجات میری یہی ہے تمام   کہ ساقی کوثر دیوے مجکو جام

مدح مرزا مظہر

زہے پیر و مرشد زہے پیشوا   کوئی کیا کرے اوس کی مدح و ثنا
نبت مدح کا قافیہ تنگ ہے   کہ اس مدح سے اسکتیں تنگ ہے
خدیو سخن میرزا جان جاں   کہ حکم اوس کا ہے ناطقے پررواں
ہے اوس کا لقب ذوالجلال سخن   کہ بندے ہیں اوس کے سب ارباب فن
سب اہل کمال اوس سے ہیں مستفید   کہ ہیں علم و عقل اوس کے دونو مرید
کرے کیوں نہ مشکل دو عالم کی حل   کہ جس کا ید اللہ ہے بانہہ بل
کوئی آج اوس کے برابر نہیں   وہ سب کچھہ ہے اِلا پیمبر نہیں
میں پھرتا ہوں گرد اس کے ہر صبح و شام   کہ ہے عشق کا اوس کے دل پر مقام

نملا ہے یہ اس کف خاک کوں — کہ چھوڑے نہ اُس دامن پاک کوں
اُسے سب میں یارب امامت رہے — قیامت تلک وہ سلامت رہے
کہاں تھا مجھے ریختے کا خیال — ہوا جب سے اس امر کا امتثال
محبت نے مجکوں کیا لا جواب — وگر نہ میں اور ریختہ کیا حساب

مدح محمد علی خاں

رہی نیں مجھے نیک و بد کی تمیز — کہ ہے ایک خاطر قیامت عزیز
کروں آب کوثر سے اول وضو — تب اُس نام سے میں کروں گفتگو
سعادت ہے اُس نام کا ذکر خیر — عبادات ہیں نا تمام اُس بغیر
نبی اور علی اُس سے آتے ہیں یاد — دو دولت ہیں یکنام سے مستزاد
محمد علی خاں سیادت کا جان — کہ کرتے ہیں فخر اُس سے دونو جہان
امامت * کا نخل برو مند ہے — کہ شاہ ولایت کا فرزند ہے
کہوں اُس کی دولت کا کیا اقتدار — کہ کرتے ہیں یہاں بخت بھی افتخار
کہوں کیا سواری کا اُس کی بیاں — کہ چلتا ہے سورج لے اُس کا نشاں
یہی اُس کی رفعت پہ بس ہے گواہ — کہ ہے نقش پا اُس کے ہاتھی کا ماہ
عطا میں ہے ہاتھ اُس کا سب سے بلند — جیسے دل کے دیلے میں یہ درد مند
کہوں اُن کی جرأت کا کیا کاروبار — جنھوں کی ہے میراث میں ذوالفقار
کروں سجدۂ شکر قدرت کے تئیں — نہ پوچھوں معانی و صورت کے تئیں
پڑی اُس کی خوبی کی ازبسکہ دھوم — لیا ہاتھ قدرت کا صانع نے چوم
کروں اُس کے اخلاق کا کیا بیاں — مجھے شکر سے اُس کے فرصت کہاں
غرض میں کروں پر یہی ہے یقین ۱ — کہ جد اُس کا ہے سید المرسلین
کیا چاہئے سب کچھہ اوس پر قیاس — کہ حیرت سے میرے رہے نیں حواس

---

* (نسخہ) امارت
۱ (نسخہ) غرض ملکراں پر نہیں ہے یقیں

مناسب نہیں اب بغیر از سکوت کہ ہے وہ تصور میرے دل کا قوت
الٰہی بحق دل درد مند اوسے دونو عالم میں رکھہ سر بلند

خطاب بہ ساقی

ارے ساقی اے جان وصل بہار یہی تھا ہمارا تمہارا قرار
ہمارے بسر لے کی یہ فصل ہے ؟ فراموش کرنے کی یہ فصل ہے ؟
ستم سے گذر کچھہ تو انصاف کر خدا سیتی ڈر کچھہ تو انصاف کر
تامل سے تک دیکھہ دل کا شکوہ کہ لبریز ہے باغ تا دشت و کوہ
اس آتش سے میرا نہ کر دل کباب نہ کر میری طاقت کے زہرہ کو آب
کہ میں جاں بلب ہوں پیالے کی طرح لگی ہے مجھے آگ لالے کی طرح
ارے مجھہ سے کیا جرم واقع ہوا کہ دل تیرا مجھہ سے جو یوں پھر گیا
نہ تو مجکو دیتا ہے جام شراب نہ فریاد کا میری دیتا جواب
میرے عیش کا دفتر ابتر نہ کر قیامت کو مجھہ پر مکرر نہ کر
تیرے اس تغافل سے ظاہر ہوا کہ پایا ہے تونے ستم میں مزا

قسمیہ

تجھے جام صہبا کے سر کی قسم تجھے اپنے مینا کے سر کی قسم
تجھے جان گل کے لہو کی قسم تجھے باغ کے رنگ و بو کی قسم
تجھے جام کے چشم تر کی قسم تجھے اپنی پنہاں نظر کی قسم
تجھے ناز و مستی کی اپنی قسم تجھے خود پرستی کی اپنی قسم
ادا سے لہکنے کی تجکو قسم نشہ سے بہکنے کی تجکو قسم
قسم ہے تجھے بے سبب جنگ کی قسم ہے میرے نام کے ننگ کی †
ارے بے وفا بے مروت صنم میں دیتا ہوں تجکو قسم پر قسم

† (نسخہ) قسم ہے تجھے نام اور ننگ کی

تجھے دختر رز کی حرمت کی سوں / تجھے مغبچوں کی شرارت کی سوں
تجھے جان مستوں کی لغزش کی سوں / صراحی سے مے کی تراوش کی سوں
تجھے وعدہ کر بھول جانے کی سوں / تجھے اپنی سوگند کھانے کی سوں
تجھے سانس کی اپنے لینے کی سوں / مجھے سانس میں جان دینے کی سوں
تجھے ناتوانوں کی طاقت کی سوں / تجھے بے قراروں کی فرصت کی سوں
شب عید کے تجکو چاؤں کی سوں / تجھے اپنے مہندی کے پاؤں کی سوں
جو تونے کیا مے کو مجھہ پر حرام / تو انصاف کر اے ظالموں کے امام
کہ اس سر کشی سے نہ کر پائمال / مرے خوں کو کر اپنے اوپر حلال
ارے ساقی اے سر پلاہ دماغ / ارے بزم مستوں کے شمع و چراغ
اتھا خاک سے پر خماروں کے تئیں / جلا اُن تغافل کے ماروں کے تئیں
کسی کا ستانا تجھے خوب نئیں / خصوصاً جلانا مجھے خوب نئیں
مجھے اس طرح مت بسر رحم کر / نہ مجھہ پر تو اپنے اوپر رحم کر
مجھے مرنے جینے کی نہیں کچھہ تمیز / مرے واسطے زندگی ہے عزیز
تجھے رحم کچھہ مجھہ پر آتا نہیں / مگر جیونا میرا بھاتا نہیں
تو اتنا سخن دل ستی مان رکھہ / کہ میں سخت مخلص ہوں پہچان رکھہ
برا مت ہو گر کچھہ بھلا میں کہوں / کہ آخر ترے خیر خواہوں میں ہوں

فخریہ

تیری جان کی سوں غنیمت ہوں میں / سلیقوں میں ظالم قیامت ہوں میں
میرے وضع و اطوار پر کر نظر / میرے طرز و گفتار پر کر نظر
اگر عشق میں دوں تحمل کو عرض / لہوے کوہ کن مجھہ سے ہمت کو قرض
میرا عقل میں کون انباز ہے ؟ / ارسطو میرا ایک دوا ساز ہے
فلک چرخ مارے گا گر صد ہزار / نہ لاوے گا مجھہ سا کوئی روبکار

نہ نور آئینہ اپنے دیدار کا زیاں خوب نیں اپنی سرکار کا
یہ سب میکدے میں جو آتے ہیں یار مجھے دیکھ ہوتے ہیں تیرے شکار
اگرچہ تجھے مجھ سے رغبت نہیں ولے کوئی ایسی خسارت نہیں
کہ مجھ سا جدا ہووے تجھ سات سے یہ شہباز جاتا رہے ہات سے
کوئی تجھ سا خوباں میں فائق نہیں تری شان کے ظلم لایق نہیں
مت اس طرح پیارے کسو کو بسر مبادا کوی ناتواں جاے مر
نہ اپنی سفارش یہ کرتا ہوں میں تری خیر خواہی میں مرتا ہوں میں
جو منظور تیری بھلای نہ ہوے نظر میں تیری آشنای نہ ہوے
تو مرنے کی کچھ مجکو پروا نہیں کچھ اس جیونے کی تمنا نہیں
جو کچھ تھا سو ہمت میری سہہ گئی ولے جی میں یہ آرزو رہ گئی
مری بات تونے نہ مانی کبھو مری قدر تونے نہ جانی کبھو
اسی غم کو جاؤں گا لے گور میں کہوں گا یہی حشر کے شور میں
محبت نے مجکو کیا بے ادب محبت ہے ان شوخیوں کا سبب
وگر نہ کہاں مجکو یہ تاب ہے کب اس حرف کا یہ دہن باب ہے
یقیں جانیو گر نہ ہو ایک آن تری مہربانی کا ہم کو گمان
تو صورت نہ پکڑے ہماری حیات نکل جاے جی ناامیدی کے سات
محبت کا ہم خوب پایا ہے بھید سبب زندگی کا نہیں جز امید
جو کھینچا کبھو مہر سے تونے ہات ستمگر کو محشر میں نیں ہے نجات
سو یہ زندگانی گوارا نہیں اجل جو نہ آوے تو چارا نہیں
ولیکن شکایت کا نہیں احتمال کہاں ہے اسیروں کو یہاں تک مجال
یہ ممکن نہیں بندۂ خاص سے کہ پر دور ہے شان اخلاص سے

حکایت بر سبیل تمثیل

لگن میں بڑا ایک پروانہ رات　　یہ کہتا تھا ارباب مجلس کے سات
کہ اس بے پرو بال کی عرض ہے　　کہ ابلاغ اوس کا تمہیں فرض ہے
مرا شمع سے یہ سادیسا کہو　　اوسے خوب سمجھا کے اتنا (*) کہو
یہی تھا لکھا میری قسمت میں جان　　قیامت نلک هجر ' وصل ایک آن
جو تجکو میرا یہ خوش آتا ہے حال　　تو مجکو شکایت کی کب ہے مجال
سرا پا مزہ (ن) گرچہ آتش میں ہے　　سعادت مری تیری خواهش میں ہے
جو میری برائی سے ترا هو بھلا　　تو مجکو نہیں چارہ غیراز رضا
وهی کر تو جس میں ترا کام هو　　و لیکن نہ اتنا کہ بدنام هو
یہ کہہ کر کیا کام اپنا تمام　　هوا زندگانی کا روز اوس بہ شام
جو کوی عشق میں اس ادب سے مرے　　خدا تا ابد اوس پر رحمت کرے

خطاب بہ زاهد

ارے زاهد اے ملکروں کے امام　　ارے آب نگور تجهہ بر حرام
نہیں جانتا تو جو اسرار مے　　نہ کر بے وقوفی سے انکار مے
یہ وہ آب ہے جس آتش ڈرے　　هزار الاماں جس سے دوزخ کرے
موافق کے ہے واسطے سلسبیل　　مخالف کو یوں ہے کہ جیوں آب نیل
جو کوی شخص بانی سوں بیزار ہے　　یقیں ہے کہ آب اوس کوں در کار ہے
تری تر زبانی خوش آتی نہیں　　تیری خشک مغزی یہ بھاتی نہیں
زباں مت نکال اپنی خامے کی طرح　　نہ چڑہ سر پر اتنا عمامے کی طرح
تو آزار دیتا ہے مستوں کے تئیں　　ستاتا ہے ساغر پرستوں کے تئیں
یہ محشر کے دن تیرے شانے سے ریش　　بلاے سیہ هو کے آوے گی پیش

(*) (نسخہ) ایسا - (ن) میرا —

جلا ویں گے روز قیامت کے تئیں — یہ مسواک سے تیرے قامت کے تئیں
جو اندھے کو دیکھے کوی چاہ پر — تو واجب ہے لاوے اوسے راہ پر
میں کہتا ہوں یہ وضع کچھہ خوب نہیں — سلامت روی کا یہ اسلوب نہیں
نہیں ہاتھہ مستوں کے رہتی عناں — مبادا پہونچ جاے تجکو زیاں
ستانا ترا اون سے کیا دور ہے — کہ سب طرح سے مست معذور ہے
جو بہرنا ہے آپ اپنے خوں سے ایاغ — تو بکنے کا مجکو ہے کب اب دماغ

در تعریف اہل چمن

مبارک ہو اے میکشاں فصل گل — دکھانے لگی اپنی شاں فصل گل
دیکھو تک شہ گل کا جاہ و جلال — کہ جس کا ہے فوارہ سا مور چال *
نظر تم کرو تک چمن کی طرف — شگوفے کو مستی سے آیا ہے کف
چمن میں بہرا ہے نشہ یہاں تلک — کہ جاتی ہے نرگس کی گردن ڈھلک †
تماشے سے جاتے ہیں سب غم بسر — کہ بھولا ہے گلزار دل کھول کر
زبس گرم ہے جوش گل سے ہوا — نہالوں کو پنکھا کرے ہے صبا
ہوا کے نشہ نے کیا بسکہ زور — بڑا آب کرتا ہے مستی میں شور
زبس گرم جوشی کا یہاں ہے رواج — کھلا ہے دل اس طرح پھولوں کا آج
کہ بو دھو سکے داغ لالہ کے تئیں — جیسے دُرد قہوے کی پیالہ کے تئیں
کھلی ہے ایسی اختلاطوں کی راہ — کہ سنبل سے اٹکی ہے گل کی نگاہ
عزیز و تغافل کا ہنگام نہیں — مگر تم کو گل ساتھہ کچھہ کام نہیں
یہ دن کو غنیمت نہیں جانتے — میری عرض یارب ‡ نہیں مانتے

در اشتیاق گوید

---

* (نسخہ) کہ جس کا ہے فوارہ شاخوں پہ لال
† (نسخہ) کہ جاتی ہیں نرگس کی انکھیاں جھپک
‡ (نسخہ) یارو

ارے ظالموں منت هے یه بہار / کہاں یه نشه پھر کہاں یه خمار
که جیوں نقش بر آب هے یه جہاں / تک یک موج میں تم کہاں هم کہاں
اولٹ جائے گا ایک دم میں ورق / کروگے سبھی جیوں قلم سینه شق
نه یه مے نه یه باغ رہ جائے گا / نه ملنے کا یه داغ رہ جائے گا
کوی درد اس دکھه سے بدتر نہیں / که * سب ٹھاٹ هے ' تم میسر نہیں
لہو دل کا پیتا هے گلشن کا سیر / یه آب خضر زہر هے تم بغیر
جو هو جائے گا باغ بے آب و تاب / کوی پی کے تب کیا کرے گا شراب
میں کچھه پوچھتا نہیں تغافل کا بہید / نه تھی ہائے تم سے مجھے یه امید
که اس طرح جاؤگے تم اوس ا کو چوک / کروگے تم اس فصل میں یه سلوک
یه سختی هے حق میں تمہارے زبوں / که گلشن کے زہرے کو کرتی هے خوں
نه روتا هوں اس چشم خونبار پر / مجھے رحم آتا هے گلزار پر
که تم بن عجب حال هے اب کے سال / چمن پر برستا هے گرد ملال
نه بلبل کو هے بولنے کا دماغ / نه غنچے کو دل کھولنے کا دماغ
مجھے یه خوشی تھی که آئی بہار / نکل جائیں گے دل کے سب خار خار
کہو کب تھا طالع سے یه احتمال / که شادی سے لوں اپنے ماتم کی فال
نه تھا جانتا ہائے یه سینه ریش / که سب دوست دشمن هو آئیں گے پیش
تغافل نے یاروں کے مارا مجھے / که بے وقت انھوں نے بسارا مجھے
میرے تئیں پڑا اتفاق ایک بار / چمن کی طرف فصل گل میں گذار
کھڑا دیکھتا تھا بہار طیور / که ناگه سنا میں نے بلبل کا شور
یه کہتی تھی تنہا نپٹ درد سے / دل گرم سے اور دم سرد سے
که ایام اسیری کے کیا خوب تھے / خصوصاً مجھے سخت مرغوب تھے

---

* (نسخه) که سب هیں مگر الخ
ا (نسخه) تم مجکو چوک

پھلسے تھے سبھی هم نفس ایک بار — همیں دام لگتا تھا باغ و بہار
عجب تھا مزہ درد و اندوہ کا — عجب تھا جشن مرگ انبوہ کا
توجه تھی هم ساتھه صیاد کو — پہونچتا تھا هر وقت فریاد کو
موافق تھی دام قفس کی هوا — سب آپس میں کرتے تھے جی کو فدا
نه تھے آشنا داد و بیداد کے — که تھے سب اسیر ایک صیاد کے
پڑا اب کے سال اس طرح اتفاق — که جاتے رهے سب وہ اهل وفاق
چمن کی هوا مجھه پہ اب تنگ * هے — میری زندگی موت کا رنگ † هے
نه لگتا هے جی صحبت غیر میں — نه کہلتا هے دل باغ کی سیر میں
نه کچھه ذوق هے آب و دانه ستی — بھڑکتا هے جی آشیانه ستی
مجھے گل کی صورت ‡ لگے هے زبوں — چمن هے نظر میں میری حوض خوں
اکیلے کو کب خوب لگتا هے باغ — بلا هے رفیقوں کی دوری کا داغ
سخن میں توقف جو واقع هوا — بجز رنج ¶ اس کا سبب کچھه نه تھا
نه تھا کچھه مجھے طاقت و زور سے $ — که میں دم لیا تھا تک یک شور سے
پھر آیا سخن کا نشه جوش میں — پھر آئی هے دیوانگی هوش میں

در ذوق راگ

جلوں کا سر اب کیوں نهوے بلند — که هے دل مرا ایک مطرب سے بند
جو کچھه کام هے مجکو اوس ساتھه هے — میرے دل کا دل اوس کے اب هاتھه هے
وہ مطرب هے فن اپنے میں مقتدا — جو دعوی کرے وہ سو هے کا بجا
ستارا عجب اوس مغنی کا هے — که زهرہ کے مله پر بجاتا رهے §

* (نسخه) ساگ † (نسخه) ڈھنگ ‡ (نسخه) کا سایه (نسخه دوم) واشد
¶ (نسخه) بجز غصه (نسخهٔ دوم) بجز غفلت $ (نسخه) نه تھا کچھه تھکا
طبع کے زور سے § (نسخه) بجاتا هے نے

ارے مطرب اے دردمندوں کی جان　　کبھی تو کہا اپنے والوں کا مان
تغافل کے ہاتھوں سے طنبور وار　　گریباں کو میرے نہ کر تار تار
صدا گوش کر اپنے مشتاق کی　　خبر لے تک آہنگ عشاق کی
مجھے اب تلک ذوق صہبا سے تھا　　جو کچھ کام تھا جام و مینا سے تھا
ہوا سیر دل اب مے ناب سے　　گیا ہوں گزر عالم آب سے
لگی ہے مجھے پیاس اب آگ کی　　گلو گیر ہے تشنگی راگ کی
نچھوڑ اس طرح پیاس کے حال میں　　ڈبو دے مجھے راگ کے نال میں
نکر سر بلند اپنی بیداد کا　　نکر حق تلف میری فریاد کا
یہ تاکید کرتا ہوں اس واسطے　　ترے کان بھرتا ہوں اس واسطے
کہ تک یک صبر کا بانو چل جائے گا ۱　　تو یہ جی خدا ہو نکل جائے گا
ملاقات کا سب طرح ذوق تھا　　خصوصاً مجھے یہ بڑا شوق تھا
کروں چاندنی کی ترے ساتھ سیر　　ولیکن تیرے جی کی سوں تجھ بغیر
پڑا آج کی رات یوں اتفاق　　کہ سب ہوگئے جمع اہل وفاق
کہ شبخون کر لشکر خواب پر　　سبھی جاکے بیٹھے لب آب پر
مرا جی گیا ڈوب مہتاب دیکھ　　جیسے مرگی والے کا جی آب دیکھ
عداوت کی کب چاند سے تھی امید　　ولیکن ہوا مجکو معلوم یہ بھید
کہ واقع ہوے ہم سے از بس گناہ　　گئے نامے کی طرح چہرے سیاہ
ہوے سب طرح مستحق عتاب　　تو لازم ہوا اب نزول عذاب
ولیکن خدا بھیجتا تھا سدا　　مناسب ہر یک قوم کے یک بلا
نبی کی ہوی بسکہ حرمت ضرور　　اس امت پہ آیا ہے طوفان نور

---

۱ (ن) کہ تک صبر کرتا ہوں جل جاؤں گا —

پهنسے تهے سبهی هم نفس ایک بار — همیں دام لگتا تها باغ و بهار
عجب تها مزه درد و اندوه کا — عجب تها جشن مرگ انبوه کا
توجه تهی هم ساتهه صیاد کو — پهونچتا تها هر وقت فریاد کو
موافق تهی دام قفس کی هوا — سب آپس میں کرتے تهے جی کو فدا
نه تهے آشنا داد و بیداد کے — که تهے سب اسیر ایک صیاد کے
پڑا اب کے سال اس طرح اتفاق — که جاتے رهے سب وه اهل وفاق
چمن کی هوا مجهه په اب تنگ * هے — میری زندگی موت کا رنگ † هے
نه لگتا هے جی صحبت غیر میں — نه کهلتا هے دل باغ کی سیر میں
نه کچهه ذوق هے آب و دانه ستی — پهڑکتا هے جی آشیانه ستی
مجهے گل کی صورت ‡ لگے هے زبوں — چمن هے نظر میں میری حوض خوں
اکیلے کو کب خوب لگتا هے باغ — بلا هے رفیقوں کی دوری کا داغ
سخن میں توقف جو واقع هوا — بجز رنج ¶ اس کا سبب کچهه نه تها
نه تها کچهه مجهے طاقت و زور سے $ — که میں دم لیا تها تک یک شور سے
پهر آیا سخن کا نشه جوش میں — پهر آئی هے دیوانگی هوش میں

در ذوق راگ

جلوں کا سر اب کیوں نهوے بلند — که هے دل مرا ایک مطرب سے بند
جو کچهه کام هے مجکو اوس ساتهه هے — میرے دل کا دل اوس کے اب هاتهه هے
وه مطرب هے فن اپنے میں مقتدا — جو دعویٰ کرے وه سو هے کا بجا
ستارا عجب اوس مغنی کا هے — که زهره کے منه پر بجاتا رهے §

---

* (نسخه) سانگ † (نسخه) ڈهنگ ‡ (نسخه) کا سایه (نسخه دوم) واشد
¶ (نسخه) بجز غصه (نسخهٔ دوم) بجز غفلت $ (نسخه) نه تها کچهه تهکا طبع کے زور سے
§ (نسخه) بجاتا هے نے

ارے مطرب اے دردمندوں کی جان کبھی تو کہا اپنے والوں کا مان
تغافل کے هاتھوں سے طنبور وار گریباں کو میرے نہ کر تار تار
صدا گوش کر اپنے مشتاق کی خبر لے تک آهنگ عشاق کی
مجھے اب تلک ذوق صہبا سے تھا جو کچھہ کام تھا جام و مینا سے تھا
هوا سیر دل اب مے ناب سے گیا هوں گزر عالم آب سے
لگی هے مجھے پیاس اب آگ کی گلو گیر هے تشنگی راگ کی
نچھوڑ اس طرح پیاس کے حال میں ڈبو دے مجھے راگ کے تال میں
نکر سر بلند اپنی بیداد کا نکر حق تلف میری فریاد کا
یہ تاکید کرتا هوں اس واسطے نرے کان بھرتا هوں اس واسطے
کہ تک یک صبر کا پانو چل جائے گا † تو یہ جی خفا هو نکل جائے گا
ملاقات کا سب طرح ذوق تھا خصوصاً مجھے یہ بڑا شوق تھا
کروں چاندنی کی ترے ساتھہ سیر ولیکن تیرے جی کی سوں تجھہ بغیر
بڑا آج کی رات یوں اتفاق کہ سب هوگئے جمع اهل وفاق
کہ شبخون کر لشکر خواب پر سبھی جاکے بیٹھے لب آب پر
مرا جی گیا ڈوب مہتاب دیکھہ جیسے مرگی والے کا جی آب دیکھہ
عداوت کی کب چاند سے تھی امید ولیکن هوا مجکو معلوم یہ بھید
کہ واقع هوے هم سے از بس گناہ گئے نامے کی طرح چہرے سیاہ
هوے سب طرح مستحق عتاب تو لازم هوا اب نزول عذاب
ولیکن خدا بھیجتا تھا سدا مناسب هر یک قوم کے یک بلا
نبی کی هوی بسکہ حرمت ضرور اس امت پہ آیا هے طوفانِ نور

---

† (ن) کہ تک صبر کرتا هوں جل جاؤں گا —

شیخ ملا نصرتی ملک الشعرا ے بیجاپور

(۳)

از اڈیٹر

تاریخ اسکندری

علی عادل شاہ ثانی کا انتقال سنہ ۱۰۸۳ ھ (۱۶۷۲ ع) میں ہوا - اور اس کے ساتھہ ہی بیجاپور کی شان و شوکت بھی رخصت ہوگئی - اس کا بیٹا سکندر اس وقت چار سال کا تھا - تخت نشینی کی رسم ادا ہوی لیکن حکومت ناتجربہ کار اور خود غرض وزرا کے ہاتھہ میں رہی - آخر آپس کی ناچاقیوں اور خود غرضیوں نے سلطنت کا خاتمہ کردیا —

علی عادل شاہ اپنی عیاشی اور بے اعتدالیوں کی بدولت ایسا بیمار پڑا کہ صحت نے جواب دیدیا اور حکیموں کی حکمت کارگر نہ ہوئی - جب وہ اپنی زندگی سے مایوس ہوگیا تو ایک روز عبدالمحمد کو بلا کر کہا کہ مجھے اب زندگی کی امید باقی نہیں رہی ' سلطنت کی حالت اندیشہ ناک ہے ' ایک طرف مغل سر پر کھڑے ہیں دوسری طرف سیوا گھات میں لگا ہوا ہے - نہ معلوم میری آنکھہ بند ہوتے ہی کیا صورت پیش آے ' اس لیے میری مصلحت یہ ہے کہ تم شہزادے کو تخت پر بٹھاکر کاروبار سلطنت کو اپنے ہاتھہ میں لے لو - اس کے بعد کسی کو

مخالفت کی مجال نہ ہوگی ' بادشاہت محفوظ ہوجائے گی اور میں اطمینان سے اس دنیا سے کوچ کرجاؤں گا —

عبدالمحمد بارہ سال سے حکومت کا سارا کاروبار چلا رہا تھا 'اس کی کاردانی اور وفاداری مانی ہوئی تھی - علی عادل شاہ ثانی کے عہد میں سلطنت کے استحکام اور حفاظت میں عبدالمحمد کے تجربہ ' شجاعت اور لیاقت کو بہت بڑا دخل تھا - یہی وجہ تھی کہ بادشاہ کو جو اعتماد اس پر تھا وہ کسی پر نہ تھا - لیکن عبدالمحمد کی نظر دور اندیش نے دیکھہ لیا تھا کہ اب دربار کا رنگ کچھہ اور ہے اور بادشاہ کے مرنے کے بعد یہ رنگ اور شوخ ہوجائے گا - اس لیے اُس نے اس بار امانت کے قبول کرنے سے عذر کیا - ہر چند دیانت راو اور سلطنت کے دوسرے بہی خواہوں نے سمجھایا کہ بادشاہ کا یہ عین منشا ہے کہ شاہزادے کو تمہارے سپرد کرکے اپنے جیتے جی استقلال سلطنت کو دیکھہ لیں ' تم کسی وسوسے کو دل میں نہ لاؤ ورنہ سارا کام درہم برہم ہوجائے گا - عبدالمحمد راضی نہ ہوا اور خود ہی یہ تجویز کی کہ خواص خاں شاہزادے کو تخت پر بٹھاکر دارالخلافہ اور اس کے آس پاس کے علاقے کا انتظام کرے - مجھے شمال مشرقی علاقہ (قلعہ شاہ درک و گلبرگہ وغیرہ) سپرد کردیا جائے تاکہ مغلوں کی روک تھام کرتا رہوں - عبدالکریم بہلول خاں کو مغرب (یعنی مرج اور قلعہ پنالہ وغیرہ) کی طرف بھیج دیا جائے تاکہ وہ شیواجی کے مقابلے کے لیے تیار رہے - مظفر خاں کو سمت جلوب (بدنور وغیرہ) کا صوبہ دار بنادیا جائے تاکہ جلوب کے ملدو راجاؤں پر نظر رکھے اور ہم سب خواص خاں کے احکام کی تعمیل کریں - عبدالمحمد کی یہ قرارداد بیجاپور کی تباہی کا پیش خیمہ تھی -

خواص خاں نے اسے لطیفۂ غیبی سمجھہ کر فوراً قبول کرلیا - دونوں جانب سے قسما قسمی اور قول و قرار ھوئے کہ بادشاہ کہ وفات کے دوسرے ھی روز اس پر عملدر آمد ھوگا - بادشاہ کا مرض بڑھتا گیا اور اسی کے ساتھہ اندر ھی اندر سازشوں کا جال پھیلتا گیا - صرف عبدالمحمد ایک شخص تھا جو اپنے قول پر ثابت قدم رھا - آخر کئی مہینے مرض الموت کی صعوبت جھیلنے کے بعد ۱۳ شعبان ۱۰۸۳ ھ کو بادشاہ نے انتقال کیا - خواص خاں نے شاھزادۂ سکندر کو تخت پر بٹھایا اور زمام حکومت اپنے ھاتھہ میں لے لی - دوسرے روز عبدالمحمد نے پیغام بھیجا کہ باھم جو قول و قرار ھوا تھا اب اس پر عمل ھونا چاھئے - خواص خاں نے کہلا بھیجا کہ بادشاہ بچہ ھے یہ کیونکر ھوسکتا ھے کہ شاھی قلعے تم لوگوں کے حوالہ کردوں - عبدالمحمد اس بد عہدی کو دیکھہ کر بہت دل شکستہ ھوا اور آخر بالکل قطع تعلق کرلیا - یہ سلطنت بیجاپور کی بد نصیبی تھی —

" غرض بادشاہ کی خورد سالی اور کم حوصلہ لوگوں کی صاحب اختیاری نے ارکان سلطنت میں تزلزل پیدا کردیا اور شیرازۂ انتظام درھم برھم ھوگیا - اطراف و جوانب کے قابو جو جو تاک میں بیٹھے تھے ' اُٹھہ کھڑے ھوے اور ھر طرف شور و فتنہ بپا ھوگیا - سب سے اول بغلی دشمن شیواجی بھونسلہ نے جو علی عادل شاہ ثانی کے آخر زمانے میں بعض شاھی قلعوں اور علاقوں ' اور بعض مغلیہ اضلاع پر قابض ھوگیا تھا ' سر اٹھایا " -

اب جو اسے معلوم ھوا کہ اُن ارکان سلطنت میں سے جن پر قیام مملکت کا دارومدار تھا ' کوئی نہیں رھا تو اس نے دست درازی شروع کی - پہلے قلعہ پنالہ پر تصرف کیا اور بعد ازاں عادل شاھی مملکت کی تسخیر کے لیے ھر طرف لشکر روانہ کیے —

خواص خاں نے جب یہ دیکھا تو عبدالکریم بہلول خاں کو اس کے مقابلے پر بھیجا - جب وہ امرانی کے قریب پہنچا تو شیواجی کے لشکر نے اس پر حملہ کیا اور قتل و خونریزی کا ھنگامہ بپا کردیا - بہلول خاں بڑی ثابت قدمی اور پامردی سے مقابلہ کرتا رھا اور باوجودیکہ اس کی فوج کم تھی اور غنیم کا لشکر بہت زیادہ تھا ' صبح سے شام تک بڑی بہادری سے مصروف پیکار رھا - دونوں طرف بہت سے مقتول و مجروح ھوے - آخر شیواجی کا لشکر منتشر ھوگیا - بہلول خاں نے اسے غنیمت سمجھہ کر تیکوتہ کی طرف کوچ کیا - جب بیجاپور سے تازہ مدد پہنچی تو وھاں سے کوچ کرکے دشمن پر حملہ کیا اور شیواجی کے لشکر کو شکست دی - شیواجی کو جب اس کی اطلاع ھوئی تو اس کے غم و غصہ کی کوئی انتہا نہ رھی اور اپنے سرداروں کو سخت ملامت اور سرزنش کی - اسی جنگ کا حال نصرتی نے اپنی اس مثنوی میں لکھا ھے —

جہاں تک تحقیق کیا گیا ھے دنیا میں اس مثنوی کا صرف ایک ھی نسخہ ھے جو میرے کتب خانے میں ھے - نام اس کا تاریخ اسکندری ھے جو خود نصرتی نے اپنے ایک شعر میں بتادیا ھے —

کہنہار یو تاریخ اسکندری

لگے جس کی گفتاریوں سرسری

سنہ تالیف ۱۰۸۳ ھ ھے جو نصرتی کے اس مصرع سے ظاھر ھے —

سہس ہور اسی پر جو تھے تین سال

نصرتی کی یہ مثنوی گلشن عشق اور علی نامہ کے مقابلے میں بہت ھی مختصر ھے - یعنی اس میں صرف ۵۵۴ شعر ھیں - کلام میں وہ زور اور شگفتگی بھی نہیں جو اُس کی دوسری مثنویوں میں پائی جاتی ھے -

یہ نصرتی کا آخری کلام ہے اور اُس کے اور بیجاپور کے انحطاط کا زمانہ ہے - نہ اگلی سی شان و شوکت تھی نہ پہلے بادشاہوں کا سا جاہ و جلال تھا اور نہ اُن کے سے پرعظمت کارنامے تھے ' اس لیے شاعر کی طبعیت کو ابھارنے والی کوئی بات نہ تھی - بہلول خاں کی فتح ' نصرتی نے جس کے گن گاے ہیں ' براے نام فتح تھی - اس کے بعد ہی نفاق و مخالفت کی گرم بازاری شروع ہوگئی اور سلطنت بیجاپور کے اقبال کا ستارہ گھٹنے لگا —

اس کتاب کا ذکر کسی تذکرہ نویس نے نہیں کیا ' البتہ میرزا ابراہم زبیری صاحب بساتین 'السلاطین نے اس کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے - " ملک الشعرا میاں نصرتی در تاریخ اسکندری کہ بزبان ہندی منظومہ پرداختہ است کہ بجلگ امران مشہور گشتہ است داد تہور و شجاعت عبدالکریم بہلول خاں و سخنوری فصاحت و بلاغت خویش آنچناں دادہ است کہ سخندانان انصاف کیش و ہنر شناسان معانی اندیش گوہرہائے تحسین و لآلیء آفریں برآں نثار می کنند " —

اب ہم اصل مثنوی کی طرف رجوع کرتے ہیں —

ابتدا حمد سے کی ہے اور اس کے دو ہی شعر لکھے ہیں لیکن جیسا کہ نصرتی کا دستور ہے کہ وہ حمد بھی مضمون مثنوی کی مناسبت سے لکھتا ہے ' یہاں بھی ان دو ہی شعروں میں اُس نے اُس زمانے کی خفیف سی جھلک دکھادی ہے —

سرانا جتا سو خدا کوں مرے کہ وہ عین حکمت ہے جوں اُن کرے
جو اچھتا سرج دن کوں نت برقرار تو کیوں نس کوں آتا چندر پر مدار

(یعنی خدا کی جتنی حمد و ثنا کی جاے اس کو سزاوار ہے ' وہ جو کچھہ کرتا ہے عین حکمت ہے - اگر سورج ہمیشہ آسمان پر قائم

رهتا تو چاند شب کو کیسے آنا) —

پهلا شعر اگرچه خالص حمد کا هے لیکن جس نہج سے یه حمد کی گئی هے اس سے صاف افسردگی اور پژمردگی ٹپکتی هے - دوسرے شعر میں ایک بادشاہ کے جانے اور دوسرے کے آنے کی طرف اشارہ هے جسے اُس نے تیسرے شعر میں کھول کر بیان کردیا هے —

بڑے بادشہ گر نه هوتے سلف نه پاتے شهی شاهزادے خلف

اس کے بعد کے تین شعر یه هیں —

بھلار هے جس زمین پر جو خوں بہے کیوں نا هووے سبب کچھه زبوں
نپاتا زبوں وقت گر کس تے کس رهتا کیوں قیامت لگ اُس نر کا جس
جلم هے اُسی مرد کا زندہ نام پڑی جس تے هے نیک نامی تمام

(یعنے جس سر زمین پر خونریزی هونے والی هے اُس کا کوئی نه کوئی زبوں سبب هوتا هے - اگر زبوں وقت کو کسی سے اعانت نه ملتی تو قیامت تک اُس بهادر کی شهرت کیوں قائم رهتی - همیشه اُسی مرد کا نام زندہ رهے گا جس نے بڑی نیک نامی حاصل کی هے) —

اس کے بعد ایک شعر میں کتاب کا نام اور دوسرے میں سنه تالیف بتایا هے - اور اس کے بعد صرف ایک شعر میں نئے بادشاہ کی تخت نشینی کا ذکر هے —

جو ملک دکن میں هوا شاہ نو لباس آپ دنیا کری تازہ نو

ان اشعار میں نه جوش هے نه مسرت جو اس موقع کا تقاضا تها ' جس سے صاف ظاهر هے که شاعر اپنے ماحول سے متاثر هے اور دل امنگ سے خالی هے —

ارکان سلطنت کی هوس کا نقشه یوں کھینچا هے —

هوس تن جو هر تن کوں گهر گهر جدا که هونا شهی کے اپیں کن خدا

یعنے هر ایک کو یه هوس، تهی که بادشاهی همارے هاتهه آ جاے —

سلگ نیں سکی کس کے فتوے کی اگ تهلدا هو که بیتها سب یک پل میں جگ

کسی کے فتنے کی آگ نه سلگ سکی اور ان سب کے جوش تهلدے پڑ گئے -

آخر زمام حکومت خواص خاں کے هاتهه آئی

لیے هاتهه سو کام خان خواص کیے شکر اکثر سو تر لوک خاص

اس شعر میں "اکثر" کا لفظ پر معنی هے —

یهی بول هر مکهه تے آتا هوا که بدنیتاں کا نه بهاتا هوا

(هر ایک کی زبان پر یهی بات تهی که اچها هوا بدنیت لوگوں کا چاها نه هوا) —

کریں اگ خردمند بیعت درست هوے لوک بد عهد پیماں کے ست

(یعنے عقلمندوں کے بیعت کرتے کرتے بد عهد لوگ اپنے عهد و پیمان سے پهر گئے) —

اور مفسدوں نے فساد برپا کرنا شروع کیا

شریراں شرارت هو یدا کیے اثر جیو میں مستی کا پیدا کیے

دبی تهی سو آتش اوتهی پهر سلگ پڑیا دغدغے کی حرارت میں جگ

اور سب سے بڑه کر مفسد اعظم (یعنے شیواجی) نے سر اتهایا

خصوصاً سیوا کا فریب نظام جو فرعون کا هے سو سایه تمام

جلگ * جگ میں مهلت هے ابلیس کوں تلک † چال هے تس کی تلبیس کوں

اس کے بعد اُس کے لشکر کی کثرت اور اس کی دست درازیوں کا حال بیان کرتا هے - چند شعر ملاحظه هوں

---

* جب تک † تب تک —

نچھے پیس جانلگ پون کوں مجال — اچھے واں تلک تس کے گھوڑیاں کی چال
جو جانلگ ہے چالے کو چمٹی * کی جھول† — جنم تس پہ اوس کے حشم کا ہے کھیل
بچے آسماں کے جو گڑ تھے بلند — لیا چڑ ستیا واں سوفن کا کمند

(وہ قلعے جو بلندی میں آسمان کے بچے سمجھے جاتے تھے، اُن پر مکر و حیلہ سے چڑھ کر قبضہ کر لیا)

کریا چڑ جہازاں جو دریا پہ دوڑ — کیا لوٹ بندر فرنگیاں کے چوڑ

(جہازوں میں چڑھ کر سمندر پر حملہ کیا اور فرنگیوں کے بندر لوٹ کر تباہ کر دیے) —

سدا بس تے دریا و‡ طوفان دسے — زمیں نحس تس پگ تے ویران دسے

(اس کی وجہ سے ہمیشہ دریا میں طوفان رہتا ہے اور اس کے منحوس قدموں سے زمیں ویران نظر آتی ہے)

سٹے بات سارو جو اوس بھویں پہ پانوں — ملے نا یک یک ہفتہ بستی کا نانوں

(اگر مسافر اُس سرزمیں میں قدم رکھے تو اُسے ہفتے ہفتے بھر کسی بستی کا نشان نہ ملے گا)

جو اوس سیں جتے فوجداراں لڑے — لوٹے کے وتے یا سلپڑ بند پڑے

(جتنے فوجدار اُس سے لڑے وہ یا تو لوٹے گئے یا اُس کے ہاتھوں قید ہوے) —

پن اُس دل میں تھا خاں کا سخت دھاک — کیے تھے جو یک بار اُسے بھی ہلاک

(باجود اس کے دل میں بھی خواص خاں کی دھاک بیٹھی ہوی تھی کیونکہ وہ اُسے ایک بار چرکا دے چکے تھے)

نہ آسیں ککر آج گھر کس پہ چھوڑ — نہ لڑ سیں اپنگ مجھہ سیتی فوج جوڑ

---

* چیونٹی † قطار ‡ یہ کاتب کی غلطی معلوم ہوتی ہے "و" کی جگہ "میں" ہونا چاہئے —

(یه سمجهه کر که وه کاروبار سلطنت کو چهوڑ کر نهیں آے گا اور مجهه سے لڑنے کے لیے فوج جمع نهیں کر سکے گا)

بهروسے په کر یه مقرر خیال وطن تے نیکل لیکے فوجاں دنبال
جو یک عمر لگ تها سو قابو طلب پڑیا دیکهه قابو موافق سبب
قدم در قدم ملک میں فن سوں پیٹهه پکڑ یک کو بل تهار آمد میں بیٹهه
وهیں ملک سب مار کرلے تلف بٹهایا هزاراں سوں دل هر طرف

یعنی اس یقین پر که خواص خاں امور سلطنت کو کسی دوسرے پر چهوڑ کر مقابلے کے لیے نهیں آسکتا وه لشکر لے کر نکلا - وه ایک مدت سے ایسے موقع کی تاک میں تها اور اب اس موقع کو غنیمت سمجهه کر ملک میں گهسنا شروع کیا اور خود ایک دشوار گزار مقام پر آکر بیٹهه گیا اور وهاں سے ملک کو تباه و تاراج کرنا شروع کیا —

یه رنگ دیکهه کر خواص بے چین هو جاتا هے —

سبب دیکهه خان مملکت کے مدار غضب میں هوے پن کهے یوں بچار
که نیں آج ممکن جو میں اُتهه کے دوڑ جو بهی کر سٹوں مار فوج اس کی چوڑ

چونکه خود مقابلے کے لیے جانا ممکن نه تها اس لیے ایک دوسری تدبیر کی —

دوسرا باب بادشاه کے دربار کے متعلق هے جس میں بهلول خاں کو خلعت عطا فرما کر شیواجی کے مقابلے کے لیے بهیجا جاتا هے —

اس باب کے تمهیدی اشعار یه هیں

دل افروز یک روز فیروز تها فرح بخش جوں عید نو روز تها
ادک تازگی پا زمین و زمن هوا تها رنگا رنگ گلشن نمن
ظفر بخش اُس دن کی پا خوب قدر شهنشاه فرما شهانی صدر

اس کے بعد بادشاہ، محل اور نخت وغیرہ کی تعریف کرتا ہے - خواص خاں اپنے رفقا کے ساتھ آتا ہے ۔ لوگ اس کے سلام کے لیے حاضر ہیں - سب سے مقدم شیواجی کا معاملہ ہے جس کی خان کو بڑی فکر ہے —

سیوا نے جو پکڑیا هنر نا پسند سیکھانے اوسے ات ادک خوب پند
کن ایسا ہے کر مرد اپس من میں لیائے تو کر یاد نواب کوں ویں بلائے

یعنے شیواجی نے جو یہ ناشایستہ حرکت شروع کی تو خواص خاں سوچنے لگا کہ اس کی گو شمالی کے لیے ایک معقول شخص کی ضرورت ہے اس وقت اُسے نواب (عبدالکریم بہلول خاں) کا خیال آیا اور فوراً اُسے بلا بھیجا۔ یہاں شاعر بہلول خاں کی شجاعت اور علم و هنر وغیرہ کی تعریف کرتا ہے —

اتنے میں جب بہلول خاں آتا ہوا نظر آیا تو

وهیں خان اپس مجلس خاص سوں بہوت دے کے تعظیم اخلاص سوں
جو بیٹھے سو ہو مل کے خاطر فراغ ہوے دیکھ یکس یک کوں خوش باغ باغ

معمولی مزاج پرسی وغیرہ کے بعد اصل معاملے پر گفتگو ہوتی ہے —

بہاں کر کے یک دلبری کے نکات نوکالے وهیں راج کارن کی بات
کہے خان کافر خر بے لگام سیکھیا ہے جنم چر کہ کھانے حرام
جیکوی لا نہارے ہیں شیراں کو ڈر تو کاں ان کی نظراں میں اچھتا ہے خر
ولے وو جو ہے سو خر پر * تمیز کہ جس وقت پاتا ہے فرصت عزیز
نرکھہ کچھہ دھنی کے زیاں پر نظر کرے خوار سب باغ شاھی کو چر
غرض یو کہ اصل غرض نابکار لگے خرتے کم دیکھنے میں بچار
کہ جس گھرتے جیکوی بڑیا ہو انگے پچھیں تورنے پھر وهی گھر ملگے
زیاں کار کوں کچھہ نہ اس سود ہے پڑیا گھر تو آپیں بھی نابود ہے

* کاتب غلطی سے " بے " کی جگہ " پر " لکھہ گیا ہے —

بد اندیش بد کیش یعنے سیوا هوا شاد عمل دیکھہ شہی کا نوا

... ...

یتی ملک میں آگ سلگی ہے سانچ کہ سب شہر بیکل ہے لگتے هی آنچ

هوا فرض اپنا یوں کہ یہ آگ آج سلگنے ندینے کی کرنا علاج

کہ ہے دل تمارا جو نیراں کا میغ بجانا جھڑپ اُس برف برق تیغ

(خواص خاں بہلول خاں سے کہتا هے کہ اس خر بے لگام (یعنے شیواجی) نے چر کر حرام کھانا سیکھا ہے - لیکن جن کی دھاک شہروں کے دل میں ہے وہ کب اس گدھے کو خیال میں لاتے هیں - یہ خر نامشخص اپنے آقا کے نقصان کا خیال نہیں کرتا اور جب موقع پاتا ہے شاهی باغ کو خراب کر ڈالتا ہے - عرض یہ نابکار صاحب غرض گدھے سے بھی کمتر ہے ، کیونکہ جس گھر کی بدولت اس نے عروج پایا اُسی کے توڑنے کی فکر میں ہے - لیکن زیاں کار کو اس سے کچھہ فائدہ نہیں کیونکہ جب گھر هی برباد هوگیا تو یہ خود بھی نیست و نابود هوجاے گا - یہ بد اندیش بد کیش نئی بادشاهت کے عمل کو دیکھہ کر خوش ہے (کہ اُسے هاتھہ رنگنے کا خوب موقع ملے گا) ... ... اس فساد کی آگ ملک میں ایسی بھڑکی ہے کہ اس سے تمام شہر بیکل ہے - اب یہ همارا فرض ہے کہ اس آگ کو سلگنے نہ دیں اور ابھی سے اس کی تدبیر کریں - تمہارا لشکر جو تیروں کا بادل ہے وہ فوراً اُس پر برف باری کر کے بجھا دے) ..

بہلول خاں یہ تقریر سن کر جواب دیتا ہے

کہے جب سخن مملکت کے مدار سنیا سوچ بولیا وو یوں کامگار

"سیوا گرچہ اس بوم کا بوم ہے کیتی تس بزرگی سو معلوم ہے

تمارا جو شاید ہے خاطر شریف تو کیا ہے وهی جو ملیا کوی حریف

کہ ہے ان گنت فوج اُس پاس اگر ولے چور کاں آئے ساواں کے سر
(یعنے گو اس کے پاس بے شمار فوج ہے لیکن چور ساھوؤں یعنے کھرے لوگوں کے سامنے کہاں آسکتا ہے)

ھمیں جاں کھڑے رھیں تو کر اختیار رکھیں نانظر میں دندی * کا شمار
مرا ھر سپاھی سو سردار ہے بھری ترکش اُس کی سویک بھار ہے
... ...
لگیا ہے مری تیغ کا جس کو دھاک دیکھت موج پانی کا ھووے ھلاک
بیجاپور کی نیں صفت یہ نوی کہ ہے شہر و شرزیاں کی کھلی † گوئی ‡
سیوا آج موڑھی جو فوجاں کو نیٹ چلایا ہے آگیں اپیں رکھ جو پیٹ
(وھی سیوا آج فوجیں سامنے لا رہا ہے جو پہلے پیٹھ دکھا کر بھاگا تھا)
سر اُس کا کوچل یوں کروں اُس کو گم کہ جیوں سانپ کا سیر کوچلے پہ دم
(اُس کی فوج کا سر کچل کر اُسے ایسا بیکار کردوں گا جیسے سانپ کا سر کچلنے پر اُس کی دم بیکار ھو جاتی ہے)
نچل سی ھمارے پہ کافر کا حد کہ ہے دیلداراں کوں حق کا مدد

یہ جواب سن کر خواص خاں کو بڑا اطمینان ھوا اور وہ اسے بادشاہ کے حضور میں لے جاتا ہے - بادشاہ اُسے خلعت و ملصب سے سرافراز کرتے ھیں اور فوج کی سالاری پر مقرر کرکے مہم پر روانہ کرتے ھیں —

بہلول خاں لشکر کی تیاری میں مصروف تھا کہ جاسوس خبر لاے کہ شیواجی کا بے شمار لشکر چلا آرہا ہے - وہ اپنی فوج کے جمع ھونے کا حکم دیتا ہے اور اس کے سامنے تقریر کرتا ہے کہ یہ جان نثاری اور

---

* دشمن † پرانی ‡ شہروں کے رھنے کی جگہ

وفاداری کا وقت ہے - غنیم چڑھا چلا آرہا ہے ' اپنے ملک اور وطن کی حفاظت ہمارا فرض ہے - اس کے ساتھ اہل لشکر کی مذہبی حمیت کو بھی جوش میں لاتا ہے - سپاہی اپنے سردار کی شجاعت کی تعریف کرتے ہیں اور اس کے ساتھ لڑنے مرنے اور جان دینے کا عہد کرتے ہیں —

اس کے بعد بہلول خاں کے سوار ہونے اور لشکر کی روانگی کو بڑی خوبی سے بیان کیا ہے —

لکھتا ہے -

جو نواب چوڈول کا گج چڑچلیا کہے توں کہ بھویں کے اوپر گڑ چلیا
کہے سب نے دیکھ اُس تجلی سوں دھور کہ نیکلیا گگن پر جو مطلع تے سور

(یعنے جب نواب ہاتھی پر عماری میں سوار ہوکر چلا تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا زمیں پر قلعہ چلا جارہا ہے - سب نے اس بہادر کی یہ شان دیکھ کر کہا کہ مطلع آسمان سے آفتاب نکلا ہے) —

پھر باجوں کی گرج ' نقاروں کے شور ' دماموں کے بجنے ' جلاجل اور دوسرے باجوں کی کیفیت بیان کی ہے - اس کے بعد لشکر اور اہل لشکر کا کچھ ذکر کیا ہے - مثلاً

لگے ہر ہتی یوں وہ پاکھر کے نال کہ اوتریا ہے ڈونگر پہ آجیوں ابھال
دسیں ہر جھلکتی سلیں اوس میں برق نہ تھا گاجنے ہور گرجنے میں فرق
ہتیاں پر رنگا رنگ ڈھالا دسیں کہستاں پہ جیوں نونہالاں دسیں
چلے تو ہتی ڈلنے سب دھرن عرابے (کی) گاڑیاں تے ھدریا گگن

(ہر ایک ہاتھی جس پر پاکھر پڑی ہوئی تھی ایسا معلوم ہوتا تھا گویا پہاڑ پر بادل اُتر آیا ہے - ہر ایک چمکتی ہوئی برچھی میں بجلی نظر آتی تھی ' اب باجوں کے بجنے اور گرجنے میں کوئی فرق نہ رہا

تھا - ہاتھیوں پر رنگ برنگ کی ڈھالیں پڑی تھیں جو ایسی معلوم ہوتی تھیں جیسے کوہستان پر نونہال - جب ہاتھی چلتے تھے تو زمین زلزلے میں آجاتی تھی اور جب (سامان جنگ) کی گاڑیاں چلتی تھیں تو آسمان ہلنے لگتا تھا) -

اب اصل جنگ کی کیفیت بیان کرتا ہے - یہ جنگ بہت مختصر اور صرف دو روز کی ہے - ہر روز کی لڑائی الگ الگ بیان کی ہے - اس لڑائی کو وہ چور اور ساہو کی لڑائی سے تشبیہ دیتا ہے —

کھڑے چور ہور ساؤ لڑنے کوں سانڈ

اول اس نے غنیم کی فوج کی کثرت ' اسلحہ کی بہتات ' گھوڑوں اور ہاتھیوں کے ہجوم کا بیان شاعرانہ انداز میں کیا ہے - کہتا ہے کسی جنگل کے درختوں میں اتنی ڈالیاں نہیں جتنے اس فوج کے رنگ برنگ کے جھنڈے ہیں -

نہ کیں بن کے ڈالیاں پہ اتنے ہیں پات
نشاناں تو اوس تے ادک دھات دھات

اور نہ کسی کوہستان میں اتنے سنگریزے ہیں جتنے اس کے ہاں مست ہاتھی پڑے جھوم رہے ہیں -

نہویں کس کہستان میں سنگ یتے
کھڑے تھے یتے مست جھولتے متے

نہ کسی سر زمین سے اتنی چیونٹیاں ابلتی ہوں گی جتنا اس کے ساتھ لاو لشکر تھا -

نہ کس بھویں پہ چنٹیاں ابلتیاں ہیں جم
چلے باند رستا یتا کچھ حشم

نہ کسی عفونت میں اتنے مچھر ہوں گے جتنے اس کے ساتھ سپاہی تھے —

اسی طرح ایک ایک دو دو شعر ہتیاروں اور گھوڑوں وغیرہ کی نسبت لکھتا ہے - گھوڑیوں کے وصف میں دو شعر یہاں نقل کئے جاتے ہیں —

اتھیاں مادوانچہ ناگن بھریاں	وہ گھوڑیاں ناگن بوری تویں
پریاں تیوں نتھیاں بن دسیں جوں بریاں	پریاں تونہ تویں لیکن بریاں سر معلوم ہوتی تویں
چھلے گرم ہوویں تو آتش سے تاؤ	گرمی میں آگ سے بڑہ کر
سبکپن میں کرنیاں بون پر براؤ	اور سبکی میں ہوا سے زیادہ ہیں

اب لڑائی شروع ہوتی ہے - جب غنیم نے عادل شاہی فوج کو دیکھا تو وہ اپنا لشکر لے کر چلا اور یہ ارادہ کیا کہ بیجاپوری اشکر کو چاروں طرف سے محصور کر لے -

کھیا یوں کہ چوندھرتے فوجاں چلاوں
جزیرہ کر اول بچھیں سب ڈو باوں

نواب غنیم کی چال کو سمجھہ گیا اور فوراً حکم دیا کہ -

جو ہے سب عرابا یو آتش کا موت
بلدو فوج کے گرد سب اوس کی کوت

یعنے تمام گاڑیوں کا جن پر توپیں رکھی ہوئی ہیں فوج کے گرد ایک حصار باندہ دو - فوج کو اس حصار کے پیچھے رکھہ کر تیر باری کا حکم دیا - خود نواب ہاتھی پر تھا - جب دونوں طرف سے لڑائی کا بازار گرم ہوا اور سوار گھوڑے دوڑا کر ایک دوسرے پر حملہ آور ہوے تو اس سے گرد و غبار کا جو طوفان برپا ہوا ، اسے شاعر نے اس طرح بیان کیا ہے —

اوتھے جب ترنگ مار چوندھیر یل
اوڑی گرد تب یوں مدور نکل
اوچایا ہے شیطان جوں گرد باد
کہ جانا فلک اوڑ کہ خیمے کی ناد
حرکت زمانے کی رھی کوئی گھڑی
کہ یوں جگ میں گردوں تے ماتی اڑی
نکل جائے سورج کے دیدے تے جوت
ھلال یوں دسیا جیوں ہوجای سو پوت

جب بہادر گھوڑے اٹھا کر چاروں طرف سے حملہ آور ہوے تو گرد مدور شکل میں اُٹھی ؛ گویا شیطان نے ایک بگولہ اٹھایا ہے جو خیمے کی صورت میں فلک تک پہنچ گیا ہے - دنیا میں آسمان سے اتنی دھول اڑی کہ زمانے کی حرکت رک گئی سورج کی آنکھوں سے روشنی جاتی رھی اور ھلال بے رونق پوت کی طرح دکھائی دیتا تھا

گھوڑوں کے ٹاپوں سے جو گرد اُڑی اور گولوں کے چھٹنے سے جو دھواں پھیلا ، اس کی کیفیت یوں بیان کرتا ھے

گھڑی یک میں سب آسمان ہور زمیں
دھنویں اور اگن میں بھری تب یقیں
بھری بھویں ھو گلشن کے جائیاں پہ نار
سمندر لیے چھین پھلوریاں کی تھار
ھوا پر جمے یوں دھنویں کے تھوے
جو بیٹھے بگولے ھو نکلے کوے
اوتھیاں لے جو باناں روش ناگ کے
بندیاں پل ھوا کے اوپر آگ کے
غلولے چلے تھے جدھر دے کے سیس
سٹے پاڑ فوجاں پہ فوجاں کوں پیس
کیاں شور باناں جدھر کے اوتھیاں

گھڑی بھر میں تمام آسمان اور زمیں دھنویں اور آگ سے بھر گئے زمیں پر گلشن کی جگہ آگ بھر گئی اور باغ میں پھلوروں کی جگہ سمندر نے لے لی ھوا پر دھنویں کے ایسے طبق جم گئے تھے کہ بگلے جو بیٹھے تھے وہ کوے ھو کر نکلے بان جو ناگ کی طرح اُٹھ کر بلند ھوے تو انھوں نے ھوا پر آگ کے پل باندھ دیے گولوں نے جدھر کا رخ کیا اُدھر فوجوں کی فوجیں پیس کر رکھ دیں بانوں کے شور سے ھاتھی ڈر کر

هتی ڈر سوں جنگل پھرے لے پراں	اپنی جان بچانے کے لیے جنگل میں بھاگ گئے-
دھنویں کا جلک سدا تہا درمیاں	جب تک دھویں کی دیوار بیچ میں حائل تھی
دونوں دل تو قائم اتھے جاں کے واں	دونوں لشکر جہاں کے تہاں کھڑے رہ گئے

اتنے میں زور کی ہوا آتی ہے اور اس دیوار کو اڑا لے جاتی ہے اور پھر دونوں طرف کے بہادر ہتیار درست کرکے حملہ شروع کرتے ہیں '

نڈھ لیا جو میانے تے بارا حجاب

ھلے نہارنے جھانک راوت شتاب

اس موقع پر نصرتی بہلول خاں کی تیر اندازی کا نقشہ کھینچتا ہے جو بلا شبہ قابل تعریف ہے اور اس سے اس کی شاعرانہ قوت بیان کا اندازہ ہوتا ہے —

وہیں دیکھ خاصہ پکڑھت کماں	نواب نے یہ دیکھ فوراً اپنی کماں اٹھائی
کہیا ہاں اے ترکس بنداں ہونہاں	اور کہا کہ اے تر کش بندو ! ہاں !
جو دھرتے ہے تیراں چلانے کی لاف	وہ جو تیر اندازی کی لاف مارتے تھے
کرو آو یک تیر کی صف تے صاف	وہ اب آئیں اور صفوں کو صاف کریں
پکڑ نے کشاکش کے گوشے میں تھانوں	اُس نے کماں کے گوشے میں ہاتھ ڈال کر
اپیں سعد و قاص کا لے کے نانوں	سعد وقاص کا نام لیا
خدنگ جوڑ چلے میں کھینچیا کماں	اور پھر جو چلے میں تیر جوڑ کر کھینچتا ہے تو
دیا بوسہ تس ھات اوپر آسماں	آسماں نے (بے اختیار) اس کے ھات کو بوسہ دیا
نہ قوس قزح تب رکھی کس سوں تاب	اُس وقت قوس قزح بھی اس کی تاب نہ
نہ چلنے کے اتنے ہیں تیر شہاب	لاسکی اور نہ اتنے تیر شہاب تھے جو چلتے -
کماں اپنے قبضے میں پکڑیا جو دھس	اُس بہادر نے جب کمان کو اپنے قبضے میں پکڑا
رگ و پے میں اوس کے بھریا آپ کس	تو خود بخود اُس کے رگ و پے میں قوت سرایت کرگئی

نظر کی صفائی کوں رکھہ شست میں	شست میں نظر کی صفائی کو رکھہ کر
دیکھا تیر کی راستی دست میں	تیر کی راستی کو ہاتھہ میں دیکھا
چلایا یتے دور انداز تیر	اور پھر اُس دور انداز نے اتنے تیر چلائے
کہ چھو ٹتا سو نین اوس کیا جس اسیر	کہ جس پر پڑا وہ بچ نہ سکا
کہ ہوتا جو لگتا تو گنبد پہ مار	اگر وہاں گنبد بھی ہوتا تو اس پر لگ کر
کبوتر کے انڈرے تے سک اس کے پار	کبوتر کے انڈے میں سے پار ہو جاتا

جب سپاہ نے نواب کی یہ سرگرمی دیکھی تو انہوں نے بھی تیر چلانے شروع کیے

چلے تیر خاصے کے جیوں پیش امام
خدنگ مقتدی ہو سدہ کے تمام

اس کے بعد وہ ان کی تیر اندازی شمشیر زنی اور گولہ باری کے کمال اور دشمن کے پامال ہونے کا ذکر کرتا ہے - آخر میں نواب کی قابلیت اور بہادری کی تعریف کرتا ہے —

تردد پہ خاصے کے لاکھہ آفریں	نواب کی جد و جہد پر لاکھہ آفریں ہے کہ
رکھیا تھا نظر میں جو وو سب زمیں	وہ میدان جنگ پر ہر طرف نظر رکھتا تھا
دیکھے تو اپیں سن میں تھا نوجوان	دیکھنے میں تو نوجوان ہے لیکن
پن استاد تھا پیر مرداں کو واں	بڈھوں بڈھوں کا اُستاد تھا
یو ہے حق میں دھوراں کے خوب یک مثل	بہادروں کے حق میں یہ کیا اچھی مثل ہے
کہ لڑنے تے آپیں لڑانا کو بل	کہ لڑنے سے لڑانا بہت مشکل ہے
کرے گا لڑائی یو یک دو پہ وار	جنگ میں ایک شخص زیادہ سے زیادہ دو پر وار
لڑاوے لڑاوے تو لوتاں ہزار	کرے گا لیکن لڑانے والا ہزاروں کو سلادے گا
مگر تھا اوسی تے وہ چوڈھل اوپر	شاید اسی خیال سے وہ عماری پر سوار

که رکھنا اپیں هر طرف پر نظر
جدهرتے جو کام آکه مشکل پڑے
کرے توڑنا اوس میں هرگز اڑے

تها که هر طرف نظر رکهه سکے جدهر کوئی مشکل آ پڑتی تو فوراً وه اس کا توڑ کرنا اور کبهی قاصر نه رهتا -

نواب کی بهادری دیکهه کر سپاهی بهی جان توڑ کر لڑے اور هر شخص اپنے سردار پر جان فدا کرنے کے لیے تیار تها - اب دونوں طرف سے خوب جم کے لڑائی هوی —

جمی آ دو دهرتے لڑائی عظیم
لهئے دم کهڑا جهوں هو ماندا غنیم

عرابے په یک فوج کا بند حصار
دهریا آگ کا آ که چوند هرتے مار
غلولهاں کا هر دم چهوٹتے یوں تهوا
انگاریاں تے اوس هوئی اگهٹی هوا
پڑے صف په یوں تیر پکڑے په اوج
که جهوں کهیت چرنے کوں تولاں کی فوج
جهجر یوں نشاناں هوے دهات دهات
که جهوں تلول بیٹھے په جهاڑاں کے پات
مگر دل میں کچهه وهم خاصه نه لیاے
نه وو میهوں هے جان فرغل منگاے
زباں میں نه تهی مار بن کچهه بی بات
نه تیر و کماں تے نیکا لها وو هات

دونوں طرف سے جم کر بهت بڑی لڑائی هوئی اور غنیم بهکا ماندا سا سستانے کو ٹهیر گیا فوج کے گرد عرابوں کا حصار باندھ لیا اور چاروں طرف سے آتشبازی شروع هوگئی گولوں کی مسلسل اس قدر بهرمار هوی که ان کے انگاروں سے هوا انگیٹهی بن گئی تیر چڑه چڑه کر صفوں پر اس طرح گرتے تهے جس طرح ٹڈی دل کهیت پر گرتا هے جهنڈے اس طرح جهر جهرے هوگئے تهے جس طرح ٹڈیوں کے بیٹهنے سے درختوں کے پتے لیکن نواب نے اس کی مطلق پروا نه کی اور اس کی اتنی حقیقت بهی تو نه سمجها جتنی مینه کی که فرغل منگا کر پهن لیتا - اُس کی زبان پر سواے "مار" کے کوئی بات نه تهی اور نه اُس کے هاتهه سے تیر و کمان ایک دم کے لیے چهٹتا -

نظر میں اتھا ہو نشانہ غلیم | اس کی آرزو یہ تھی کہ غلیم نشانہ بنے اور
رکھے دل پہ بھویں مار پڑتا سو بیم | ایسا ڈر بیٹھے کہ اُس کا لشکر زمین پر تڑپتا ہو -

آخر میں نواب کی خوش خلقی اور مقبولیت کے متعلق لکھتا ہے

جو خوش خلق نواب جگ میت کا اتھا سب سوں اخلاص کی ریت کا
نہ خویشاں چہ اتھے اس پہ آجیو سوں بیش کہ تھے پاس لوگ اس کے بیگانے خویش

(نواب جو خوش خلق اور مقبول زمانہ تھا اُس کی رسم و راہ سب سے پر اخلاص تھی ' صرف خویش و اقارب ہی اُسے عزیز نہ تھے بلکہ بیگانے بھی اُس کے نزدیک خویش و اقارب کے برابر تھے) -

اور اسی پہ نصرتی نے پہلے روز کی جنگ ختم کردی ہے - اس نے کہیں یہ نہیں لکھا کہ شیواجی کی فوج کو شکست ہوی یا اُس کی فوج منتشر ہوگئی جیسا کہ صاحب بساتین السلاطین یا دوسرے بیجاپوری مورخوں نے لکھا ہے -

دوسرے روز کی جنگ غلیم کی تیر باری سے شروع ہوتی ہے - خاص کر اس بارش کا نشانہ نواب کی چوڈول ہے —

ہوی تھی ادک ریز چوڈھل پہ یوں
برستا ہے برسانت ڈونگر پہ جیوں

(یعنی چوڈول پر تیروں کی بارش اس طرح ہو رہی تھی جیسے پہاڑ پر مینھہ برستا ہے) -

اہل لشکر میں جو خیر اندیش تھے انھوں نے پکار کر نواب سے یوں خطاب کیا -

کی بیٹھا سو مار هر کا هو نشان
توں پکڑیا هے کیا گهر ڈوبانے کی شان
یتا مار چو ڈهل هوئی جو تلک
رهے گا تو وهانچه کر کو تلک
توں بانچ اب همن مار اپے حضور
که نیں کد لڑای رهے باج دهور
نه ڈرسیں بلا میں جو کھالے گا توں
موئے پر قبیلے کوں پالے گا توں
اوتر هست هور بیگ تازی سوار
که کر حمله دشمن کوں لیتے هیں مار

تو هر مار کا نشانه بنا کیوں بیٹھا هے
کیا گھر ڈبونے کی ٹھیرائی هے -
جو ڈول پر اتنی تیروں کی بارش هوئی هے
اب تو وهاں کب تک رهے گا -
تو اپنے آپ کو بچا اور همیں مرنے دے کیونکه
بغیر سپه سالار کے لڑائی نہیں قائم رہ سکتی -
اگر تو همیں جنگ میں جھونکے گا تو هم نہیں ڈریں گے
کیونکه (هم جانتے هیں که) مرے پیچھے تو همارے
قبیلے کی پرورش کرے گا - اب هاتھی سے اُتر آ
اور جلد گھوڑے پر سوار هو اور هم ابھی
حمله کر کے دشمن کو مارے لیتے هیں -

نواب نے جب یه سنا تو یوں جواب دیا -

سنے سوچه نواب یو بات کے
که تملا کوں یاراں نه معلوم هے
که دارا کوں آ شاه اورنگ سوں
پڑی تهی لڑای سو سوندال کے جیوں
اتها شاه دارا جو هاتی سوار
پڑیا جیوں غلولیاں کا چوندهرتے مار
نایا تاب اوتر کیج ترنگ جیوں چڑیا
لگیا فوج کوں تب که خاصه پڑیا
هوی پل میں اس دهات لشکر کی موڑ
که نیں لڑ سکے پھر که بھی فوج جوڑ

نواب نے یه بات سن کے کہا که
یارو شاید تمهیں یه معلوم نہیں هے
که دارا کو شاه اورنگ سے
اسی طرح کی لڑائی کا سابقه پڑا تها
شاه دارا جو هاتھی پر سوار تها
اُس پر جب چاروں طرف سے گولیوں کی
مار پڑی تو تاب نه لا کر هاتھی سے اتر
گھوڑے پر سوار هوا، تو فوج سمجھی
که بادشاه مارا گیا - پھر کیا
تها پل بھر میں سارا لشکر تتر بتر هوگیا

وهی کام سلبھال دانا کرے
جو نادان کرنے تے عزت دھرے
تمیں جانتے ہیں کہ نیں یو مثل
چھپے تو بی نا ھوے اجل کوں وجل
بزرگاں کے رکھہ قول پر خوش مدار
یہی سب برتتا ھوں میں بار بار
اگر تیغ عالم بجنبد ز جاے
نبرّد رگے تا نخواہد خداے
سمجھتا ھوں کر حق تے یاری ھے آج
میرے بال کوں کچھہ نہ بھاری ھے آج
اگر ھو تو بی کچھہ خدا کی رضا
رضا وند ھوں جیوں وہ انبڑے قضا
ولے میں رکھیا ھوں سو بڑنا قدم
جدھر تے بھی دھسنا انگے نا کہ کم
جو ھوے بیدھڑک ھول تے سر بسر
اوسے کیا ھے غوغاے محشر تے ڈر
ھتی پر جو ھوں میں تو بیریاں پہ داب
کہ یک نیزہ جیوں سر پہ ھے آفتاب
فلک پر تو نہ اُڑ سکیں لٹی ھے فرق
ملگے بھویں جو پڑ کے تو ھوویں کے غرق

اور پھر اسے جمع کر کے نہ لوا سکا -

کام ایک ھی ھے' دانا سوچ سمجھہ کر کرتا ھے مگر نادان اس طرح کرتا ھے کہ اپنی عزت کھو بیٹھتا ھے - کیا تم نے یہ مثل نہیں سنی کہ ہزار چھپو اجل نہیں ٹلتی - بزرگوں کے اس قول پر میرا اعتقاد ھے اور ھمیشہ اس پر عمل کرتا ھوں

اگر تیغ عالم بجنبد ز جاے
نبرد رگے تا نخواہد خداے

میں سمجھتا ھوں کہ آج خدا کی طرف سے میری مدد ھے اور میرا بال بیکا نہوگا اگر کچھہ ھوا بھی تو خدا کی رضا' اور میں اس کی رضا پر راضی ھوں - لیکن میں نے بڑھتا ھوا قدم رکھا ھے' جدھر سے بھی گھسوں گا آگے بڑھوں گا نہ کہ پیچھے -

جو خوف سے نڈر ھے اُسے غوغائے محشر سے بھی ڈر نہیں -

میں جو ھاتھی پر ھوں تو اس سے دشمنوں پر رعب ھے - میں ان کے سروں پر اس طرح ھوں جس طرح آفتاب کا ایک نیزے پر آجانا - آسمان پر تو اُڑ کے جانہیں سکتے کہ وہ بہت دور ھے' اور اگر زمین پر رھے تو غارت ھو جائیں گے

جو هلتے هیں باگے تے بھی چھوڑ تهانوں
که جیوں مر نسک جھاڑتے هاتھ پانوں
پتنگاں کے پڑتے نه ہو جسی هلال
مریں جل جو پکڑیں ہو جانے کا خیال
نجانو که بھالے کر اُن کے هیں بهار
هرن هیں کرو بیگدی سگ شکار
رکھو مار یو فوج کافر پلید
رکھو کھیت یا سب هو مسلم شهید

اور اگر جگه چھوڑ کر ذرا بھی
تو هاتھ پانو هلاے بغیر نهیں مر سک
پتنگوں کے گرنے سے هلال کی شمع بجھ ن
سکتی اور اگر وہ بجھانے کا خیال کریں
خود جل مریں گے۔یه خیال نه کرنا که
بھالے دار بڑے قوی هیں' وہ هرن هیں کتو
شکار کرو۔اس فوج کافر کو مارکر تهس ن
کر ڈالو۔ یا تو ان کا یهیں خ
کر دو ورنه سب شهید هو

یه تقریر سن کر اهل لشکر میں جوش پیدا هوا اور وہ پهلے زیادہ آمادۂ پیکار هوگئے اور اس بے جگری سے لڑے که مخالف بھی کا لوها مان گئے اور پریشان هوکر کهنے لگے که ان سے لڑنا مشکل ه

لڑے جب یو دهلی کے فوجاں سے چھوٹ
لیے هیں گے امراو یک دم میں لوٹ
اگر مرد میدان بهلول هے
همن دسویں حصے کا کاں تول هے
دکھن کا ملو یک دهور نیں هے پچاس
نه لشکر سب اوس کا بی هے اوس کے پاس
کھڑا یو سو ویں آگ کا هو ابهال
سٹها برق بونداں سوں عالم کوں جال
همن آج نهاتیں تو ناسوس یوں
صبا مکھ دیکھانا دهلی پاس کیوں

یه لوگ جب دهلی کی فوج سے لڑ
انهوں نے آناً فاناً میں سب امرا کو لو
اگر مرد میدان بهلول هے تو هم اس
دسویں حصے کے برابر بھی نهی
دکھن کا یه بهادر ایک نهیں بلکه پچاس کے
هے حالانکه ابھی اس کا پورا لشکر اس کے پاس نه
جهاں یه کھڑا هوا آگ کا بادل چھا جا
اور بجلی کی بوندوں سے ایک عالم کو جلادیتا
اگر هم آج اسے برداشت نه کر کے بھ
تو کل اپنے آقا کو کیا منه دکھائیں

ایتا کام سیوت پہ ہے یہ روا
کہ لیتا عرابا یو یک کر ڈھوا

اب آخر میں اتنا کام کرنا لازم ہے کہ ایک ہاد کر کے عرابوں پر قبضہ کر لیں۔

یہ کہہ کر انہوں نے زور شور سے حملہ کیا اور پھر ایک بار قتل و غارت کا بازار گرم ہوگیا -

لھویاں پر دھسے کر دلیری یتی
پڑے جیوں کہ جلتی اگن میں ستی
کھوک ھل رھے جب یو بھالے پڑے
دھڑک آگ اٹھی جب دنتا لے پڑے
رکھے تھوپ گنجدال کوں بھالیاں کی مار
سیئے کے یکس یک میں دو دو سوار
ہزاراں سوں بھالے جدھر آ ستے
اُدھر یک بیک فوج الٹھا ستے
اتھا رین راوت جو گھوڑے کی پیٹ
کیا دو کوں یک نیزہ بیٹھا سو نیٹ
زرہ نا رکھی تن کوں بھالے تے جھانپ
کہ انکوے نہ مکڑی کے جالے تے سانپ
بھالیا آکہ جھلکیا سو جس تن کے آر
بوڑی رکھہ اودھر جا رھیا تن کے پار
موی گو سنلد آگ کوں نہیں ڈری
عرابے کی خندق رگت سوں بھری

تلواریں لے کر بڑی دلیری سے گھس پڑے جیسے جلتی آگ میں ستی جا پڑتی ہے جب تلواریں رہ گئیں تو بھالے اٹھائے اور اس سے آگ اور بھڑک اٹھی بھالوں کی مار سے ہاتھیوں کے دل کو کونچ ڈالا اور ایک ایک بھالے میں دو دو سوار پرو دیے جدھر ہزاروں بھالے لے کر آپڑے ادھر ساری فوج ایک دم میں درہم برہم کردی جو بہادر سوار گھوڑے کی پیٹھ پر تھا اس پر نیزہ اِس صفائی سے پڑا کہ ایک کے دو ہوگئے - زِرہ بھالے سے جسم کو نہ بچا سکی کہ سانپ مکڑی کے جالے سے نہیں رک سکتا - جس پر نیزہ آکر لگا، بوڑی تو ادھر رہ گئی اور باقی نیزہ جسم کے اُس پار نکل گیا - مردہ گو سفلد آگ سے نہیں ڈری، اور عرابے کی خندق خون سے بھر گئی -

ہوتے ہوتے یہ لڑائی وہاں تک پہنچ گئی جہاں نواب بہلول خاں کھڑے تھے اور اب معرکہ بہت شدید ہوگیا -

ہتی پر وئیں خاصہ برچی سنبال
کہیا مار لو دیکھتے کیا ایتال
سکل کوٹ پارو اسی ٹھور میں
کہ آئے ہیں اپے نگوں گور میں
سنے سوچ شمشیر بنداں یو بات
ہوے پاوں اوتارا فرنگاں لے ہات
ستے جس پہ شمشیر کا وار آ
ترنگ ہور اوسے بھویں پہ بیسلا لیا
سنبا لیا سو بھالے لے ثابت کتار
کیا پھوڑ بکتر کوں چھاتی کے بار
چلاویں اگر دھنک ہاتی پہ زور
پڑے وو ہتی دیکھ اپس جیو چھوڑ
دیکھا ویں تو سنداں پہ توڑاں کے بہانت
اوڑیں ہو کہ چنگیاں متے گج کے دانت
کمر پر ستیں ہیں نو نیں لگ خبر
نیکل جاے یک دل کو دو پھانک کر

... ...

زرہ کا تو ہے وار بھنے میں حال
کہ بھر لوٹ انگے لرکے کاں رہے کلنجال

نواب نے وہیں ہاتھی پر برچھی سنبھالی اور للکار کر کہا کہ دیکھتے کیا ہو، مارو! سب کو مار کر یہیں تمام کردو کہ وہ اپنے پاوں چل کر اپنی قبر میں آئے ہیں جب شمشیر زنوں نے یہ بات سنی تو پیدل اُتر کر تلواریں ہاتھوں میں سنبھالیں جس پر تلوار کا وار کیا تو وہ گھوڑے سمیت زمین پر آرہا - بھالے لے کر کٹار سنبھالی جو بکتر کو توڑ کر چھاتی کے پار نکل گئی - ہاتھی پر جب وہ وار کرتے تھے تو وہ فوراً بیدم ہوکر گر پڑتا تھا اُن کے وار ایسے تھے جیسے کھن پر ہتوڑے کی ضربیں کہ اس مار سے مست ہاتھیوں کے دانت چنگاریوں کی طرح اُڑتے تھے - کمر پر جب ہاتھ پڑتا تھا تو اس وقت تک خبر نہیں ہوتی تھی جب تک تلوار دو ٹکڑے کرکے نہیں نکل جاتی تھی

... ...

زرہ کا حال پتلا تھا ؛ پر زور سیلاب کے آگے کائی کہاں ٹھیر سکتی ہے -

سٹیے کاٹ یوں کافراں کو کٹھن	ان شدید کافروں کو کاٹ کر اس طرح ڈال دیا
کہ قربانی بکریاں کوں جیوں حج کے دن	جیسے عید قربان میں بکرے قربانی کرتے ہیں

لیکن اُدھر کے بہادر بھی کچھہ کم نہ تھے ' انھوں نے پھر قدم جماکر لڑنا شروع کیا —

دسے عین اجل پن دیکھت نیں ڈرے	موت نظر آرھی تھی مگر اس پر بھی وہ نہیں ڈرے
کہ ناموس کون بیش انگے جیو کرے	کہ ناموس کے آگے جان کوی چیز نہیں -
روش ہے عرابے سوں لڑنا سو دھور	قاعدہ ہے کہ جو بہادر عرابوں کی حصار باندہ کر
کھید پڑے پہ دشمن کوں نا جاے دور	لڑتا ہے وہ دشمن کو بسپا کرنے پر بھی دور نہیں جاسکتا
کہ جوڑے پہ نابوسوں گاڑیاں کو ڈات	اس لیے کہ گاڑیوں کو اس طرح جوڑ کر مضبوط کھڑا
ھلیں نب بکھرنا ھے یک دم وو پھات	کیا جاتا ہے کہ اُس سلسلے کو توڑیں تو انتشار پیدا ہوجاتا ہے -

اگرچہ غنیم بیجاپوریوں کے حملوں سے پریشان ہوگیا تھا اور اس میں مقابلے کی تاب نہ رہی تھی لیکن ایک مشکل یہ آپڑی تھی کہ ندی پر اُس کا قبضہ تھا اور خوب سمجھتا تھا کہ بیجاپوری کیسے ہی بہادر کیوں نہ ہوں پیاسے لڑنا آسان نہیں ہے - ادھر دھوپ کڑاکے کی پڑنے لگی جس سے اہل لشکر کی بے تابی اور بڑہ گئی —

کہ جانے نہی چلتا تو نیں کچھہ علاج	وہ جانتے تھے کہ یہ معاملہ لا علاج ہے
ولے ھوینگے عاجز تو پانی کے باج	پانی بغیر وہ خود بخود عاجز ہوجائیں گے
دیکھے دھونڈ تو بر جاے تھا وہ قیاس	غور سے دیکھو تو اُن کا یہ قیاس بجا تھا
جیوے گا بھوکا ناجیوے مار پیاس	آدمی بھوکوں جی سکتا ہے لیکن پیاس کا مارا نہیں جی سکتا
کہ اُصبح تے واں بھری یک جو دھوپ	صبح ہوتے ہی دھوپ کا عمل شروع ہوگیا لشکری
کھڑے تھے ھمی ھم سوں لڑنے جو چوپ	محض ہمت کے بل پر کھڑے لڑ رہے تھے

پچھوری تھی دھوپ یک تو آسر پہ اک
سلگتی تھی دوسری درونے میں دھک
سیوا کا وو لشکر تو صورت حرام
مگر نسل شیطان کا تھا تمام
کہ یک پیش آتے کوں کرنے کو پس
دسیں پھر اوسی یک کی جاگے پہ دس
دل اسلام کا تھا سو معدود تھا
کومک غیر حق ان پہ نابود تھا
لڑای تو پل پل کوں ایسی کھٹن
پڑی یوں کہ دیکھیا نہ ہوے عمر کن

ایک تو سر پر دھوپ پڑ رہی تھی
دوسرے دلوں میں آگ بھڑک رہی تھی
سیوا کا صورت حرام لشکر شاید
نسل شیطان سے تھا
کہ ایک کو سامنے سے ہٹاتے تھے تو
اس کی جگہ اور دس آجاتے تھے
اسلام کا لشکر گنا چنا تھا اور سوائے
خدا کے کسی کی مدد کا آسرا نہ تھا
لڑائی ہر لحظہ ایسی کٹھن ہوتی جاتی تھی
کہ کسی نے اپنی عمر میں کبھی نہ دیکھی ہوگی

حال یہ تھا کہ ہوا تیروں سے بھر گئی تھی، سنگلاخ زمین گولوں سے پٹ گئی تھی، ہاتھوں میں چھالے پڑگئے تھے اور زخموں سے خون بہہ رہا تھا - اگرچہ لڑنے کی تاب و طاقت نہیں رہی تھی مگر صرف ہمت کے بل بھروسے پر لڑ رہے تھے - یہاں شاعر نے گرمی کی تپش اور پیاس کی شدت کو شاعرانہ رنگ میں بڑی خوبی سے بیان کیا ہے —

وجوداں میں روحاں دھری چٹپٹی
تندور آسماں تھا زمیں تھی بھٹی
لگے جوش کھا سر میں پکنے داغ
زرہ جل کے دینے لگی تن پہ دماغ
گیا سوک سب امرت کا چشمہ دھن
پڑی جیب بے آب ماہی نمن
ہوا خشک لہولیا نہ مہلت سوں تاب

روحوں نے جسموں میں کھلبلی مچا رکھی تھی
آسمان تنور بن رہا تھا اور زمین بھٹی -
سر میں بھیجے جوش کھا کر پکنے لگے
اور زرہ تپ کر جسم پر داغ دینے لگی -
دھن کے امرت کا چشمہ سوکھ گیا
اور زبان ماہیء بے آب کی طرح تڑپنے لگی -
سختی کی تاب نہ لا کر لہو خشک ہوگیا

کھڑک بن نه تھا کس بی جاگے په آب
کھڑے تھے تو دھریک تے یک دل میں جوگ
ولے آب بن تلملیا سب ھی لوگ

اور سوائے تلوار کے کسی جگه پانی نظر نه آتا تھا اگرچه ایک سے ایک لولگائے کھڑا تھا مگر بغیر پانی کے سب ھی بیقرار تھے

نواب نے خیال کیا که اگرچه فتح خدا کی عنایت سے ھماری ھے لیکن اس کا کیا علاج که ظالموں نے ھم پر پانی بند کردیا ھے ' لهذا اب ایک آخری حمله کرنا لازم ھے یا تو یہیں شہید ھوے یا پھر اس مصیبت سے نجات پای - اس بیان کو نصرتی کے الفاظ میں سنیے —

سمج ھوی یو نواب کے دل میں راز
خدا تو دیا فتح کر سر فراز
پن اوس دینداراں په ظالم بلا
بسائے ھیں لیا محنت کربلا
که پکڑے ھیں لگ لڑوو کافر پلید
ھوے آه سب پانچ مارے شہید
ھوا مج ایتا حمله کرنا ضرور
که تب لگ بلا یو نهوے سرتے دور

تب نواب کے دل میں یه بات آئی که خدا نے ھمیں فتح سے تو سرافراز کیا لیکن ظالموں نے دینداروں پر کربلا کی سی صعوبت نازل کر رکھی ھے پلید کافروں نے نہر پر قبضه کرلیا ھے' افسوس ھم سب یہیں شہید ھو جائیں گے اب مجھه پر حمله کرنا لازم ھوگیا تاکه یه بلا سر سے ٹلے -

وھیں دھور بولیا که اے یکه تاز
سپاھی تیر انداز شمشیر باز
لڑائی تو مارے ھمیں پن ھے دھاک
مبادا که بے آب ھم ھوئیں ھلاک
اگر اُن کی چاھت لگے لڑ کا آب
دسے نا امیدی سوں تمنا سراب
نه پانی که جس ھوے تو امرت کی چاه

پھرفوراً اس بہادر نےللکارکوکہاکه اےیکه تاز' تیرانداز شمشیر باز سپاھیو ' ھم نے اگرچه لڑائی مارلی ھے لیکن اندیشه یه ھے که کہیں ھم بے آب ھلاک نه ھو جائیں ' اگر ان کی بجائے صرف نہر کا پانی تمھارے ھاتھه لگا تو وه ناامیدی کی وجه سے تمھیں سراب نظر آے گا نه که وه پانی جو امرت کی خاصیت رکھتا ھے -

چلو میں لو لاتا ہوں خضر راہ
کروں میں جو حملہ تو باغی یہ سانڈ
دیکھوں کیوں رہتے لڑ کے پانی کو باند
کہیا سوچ سلمک تے گاڑے نیکال
شتر نال ہست نال لے مکھ پہ گھال

آؤ اب میں خضرراہ بن کر اُسے لاتا ہوں - اب میں باغیوں پر حملہ آور ہوتا ہوں' دیکھوں اب وہ کیسے پانی روکتے ہیں - یہ کہتے ہی سامنے سے توپے نکالے اور شتر نال اور ہست نال اُن کے منہ پر چلانے شروع کیے -

اس کے بعد آخری باب " فتح یافتن نواب بہلول خاں بر لشکر سیواجی و اورا ہزیمت دادن " کے عنوان سے ہے - اور اسی پر مثنوی کا خاتمہ ہے . اس حملے اور فتح یابی کی کیفیت خود نصرتی کے الفاظ میں بیان کرنی مناسب معلوم ہوتی ہے —

وہیں خاصہ نواب جب چل دیا
دونو دہیر کی فوج کوں ہو کیا
چھوٹے شیر یک دم جو زنجیر تے
ہوئے آ جو غرش میں جو بھیرتے
ترنگاں کے تل تے یتی گرد اوڑی
کہے یوں زمیں جا فلک سوں جوڑی
ستاریاں کی روئی جو ہو بیخلاف
فلک اور زمیں مل ہوا یک لحاف
کوڑا ہو جو جاں سانڈتا تھا غنیم
لڑائی پھر آنانڈتا تھا غنیم
دسے فوج اون کے گرد جو رواں
ہوئے تیرہ تب تس کے لیکے جہاں

جب نواب اس طرح سے نکلا تو دونوں طرف (یمین ویسار) کی فوج کو بڑھایا جب یکبار گی زنجیر سے شیر چھوٹے تو ہر طرف غرانے لگے - گھوڑوں کے نیچے سے اس قدر گرد اُڑی گویا زمیں آسماں سے جا لگی - ستارے روئی ہو گئے اور زمیں اور آسماں مل کر لحاف بن گئے غنیم جہاں کھڑے تھے وہیں جمع ہوگئے اور اور پھر انہوں نے لڑائی شروع کی - اُن کی فوج گرد رواں کی طرح نظر آتی ہے اور اُن کے حسابوں زمانہ تاریک ہو گیا تھا-

پھوتے کرہ نایاں نے دشمن کے گوش
کیا مغز بھیجا ہو دبا گے تے ہوش
نقاریاں تے میدان ہدر نے لگیا
کھڑا تھا سو جل رقص کرنے لگیا

قرناؤں کی آواز سے دشمن کے کان بہرے ہوگئے تھے اور ہوش و حواس بجا نہیں رہے تھے - نقاروں کی گونج سے میدان ہلنے لگا اور پانی جو کھڑا تھا رقص کرنے لگا -

بہادر کے دشمن پہ طالع پڑے
دھڑاں میں دلاں دھاک سوں دھڑ دھڑے
ہوی دل میں ہشیار نخوت کی اُٹ
گھٹ اوسان کی ہوئی دلاں میں شکست
بڑی دھور کی جب صلابت کی چھاؤں
لگے اوڑنے بارے پہ دشمن کے پاؤں

دشمن پر بہادر نواب کے طالع غالب آئے اور دل اُن کے جسموں میں خوف سے دھڑدھڑ کر رہے تھے اب ان کے دلوں میں نخوت پیدا ہونی شروع ہوی لیکن اوسانوں کو دلوں میں پہلے ہی شکست ہو چکی تھی - جب نواب کی بہادری کا ظہور ہوا تو دشمن کے پاؤں ہوا میں اڑنے لگے -

جو نواب کر رخ مخالف کے دھیر
برسنے لگیا صف سوں یک مٹھہ ہو تیر
دیے چھوڑ سو مرغ تیراں شتاب
بیے بیٹھہ ان سر کے کانسیاں میں آب
جمی فوج یک پل میں ہوی پھوت پہات
یکھک نہاسنے کوں دسے لاکھہ بات

نواب نے جب مخالف کی طرف رخ کیا تو صف لشکر سے تیروں کے مٹھے برسنے لگے - اور سینکڑوں تیروں کے مرغ چھٹے جو ان کے سروں کے پیالوں میں گھس کے پانی پینے لگے جمی جمائی فوج ایک پل میں تتر بتر ہوگئی اور بھاگنے کے لیے ایک ایک کو لاکھوں رستے نظر آنے لگے -

کہے تو کہ گدڑے پہ ہاتی چھوٹا
بھریا تھا ہنگامہ سو یکدم پھوٹا
بھوتے جمع تھے سو ہوے نا امید
دسی پل میں کالی زمیں سب سفید
پڑے سو کھیدیڑے پہ کھند لات میں
دسے وو برابر ہو چا بات میں

گویا گدھے پر ہاتھی چھوٹ گیا ہے اور وہ بھرپور ہنگامہ ایک دم میں منتشر ہوگیا - یہ منتشر مجمع نا امید ہوگیا اور وہ زمین جو کالی تھی سب سفید نظر آنے لگی - بھاگڑ میں جو گر پڑے وہ کھند لے گئے اور رستے میں زمین کے برابر ہو گئے

جتن کر وو بہر چھوڑ یوں لر چلے	جب سب جتن کرنے کے بعد وہ نہر چھوڑ کر بھاگے
نتہا نیر واں لہو ابس بہر چلے	تو نہر میں پانی کی بجاے اپنا لہو بہر ا ھوا چھوڑ گئے
ھوی لال بھویں یوں وہ کالی سکت	وہ کالی کلوتی زمیں اس طرح لال نظر آتی
بیجاپور کن جیونکہ جوگی کا مت	تھی جیسے بیجاپور کا جوگی کا مت -
نظر رن کے مردیاں کو دیکہت تھکی	نظر میدان جنگ میں مردوں کو دیکھتے دیکھتے تھک گئی
کہے توں کہ بردا ھے یک نائکی	گویا وہ نائک کا پردہ تھا -
ھوا کیچ یوں لہر کہ لہو نہانوں تہانوں	جگہ جگہ لہو کے بہنے سے اس قدر کیچڑ ھوگئی تھی
بھسلنے لگے بھویں پہ تیراں کے پانوں	کہ زمیں پر تیروں کے پانو بھسلنے لگے -
دیکہت تب کہ نواب دشمن سگل	جب نواب نے دیکھا کہ تمام دشمن جان
چلیا لیکہ جیو سامنے تے نیکل	سلامت لے کر بھاگ گئے ھیں تو
کیے حکم سب پر کہ اب بس کرو	حکم دیا کہ اب بس کرو اور بزدلوں
چکائیاں پہ ظاھر نکو کس کرو	پر زور نہ دکھاؤ
بھلے مرد کا مرد پر وار ھے	بھلے مرد کی لڑائی مرد سے ھونی چاھئے
نگوزیاں کوں جپ دیکھنا عار ھے	ان کم بختوں کا تو دیکھنا بھی موجب عار ھے
کہ نہاتے ھیں یو لاجو کوتے کے پاؤں	یہ کتوں کی طرح سے بھاگے ھیں اور
نہ پھر سیں بچکتے ھیں دیکھہ اپنی چھاؤں	اپنے سایہ کو بھی دیکھہ کر بدکتے ھیں
کدھیں پھر کہ مردی پکڑ آئیں گے	اگر پھر کبھی مرد بن کر آئیں گے
کریں گے سو اپنا سزا پائیں گے	تو اپنے کیے کی سزا پائیں گے -

یہ کہہ کر نواب خدا کا شکر ادا کرتا ھے اور میدان جنگ میں خوشی کے شادیانے بجنے لگتے ھیں - اس وقت وھیں سارے لشکر کے ساتھہ پڑاو ڈال دیتا ھے اور تیز رفتار ھرکارے بھیج کر فتح کی خوش خبری ھر طرف بھیجتا ھے - جب خواص خاں کو یہ خبر پہنچی تو بادشاہ کے

حکم سے بیجاپور میں جشن منایا گیا اور جگہ جگہ فتح کا خطبہ پڑھا گیا - قلعے پر سے بندوقیں اور توپیں چھوڑی گئیں- چونکہ بادشاہ کی یہ پہلی فتح تھی اس لیے گھر گھر مٹھائی تقسیم ہوی - بادشاہ نے نواب بہلول خاں کو خلعت سے سرفراز فرمایا - اور ملک ملک میں اس فتح کی شہرت ہوی —

یہ سب نصرتی کا بیان ہے جو اس نے اپنے آخری اشعار میں لکھا ہے - وہ اشعار یہ ہیں - ترجمے کی ضرورت نہیں کیونکہ اوپر کا بیان انہیں اشعار کا خلاصہ ہے ' علاوہ اس کے یہ اشعار ہیں بھی آسان —

یہی بات کر شکر حق لیا بجا کہڑا رن پہ رہ شادیانے بجا
دیلایا اوسی تھار ڈیرے تمام کیا وا ں سر بدل سوں اپنا مقام
خبر لے کہ اس فتح کا چار دھیر چلے نیر پر شاطراں جیوں کہ تیر
خصوصاً سلے جب حکومت پناہ خوشی بانٹنے جگ پہ کر حکم شاہ
بیجاپور میں عید کر آشکار پڑا خطبہ اس فتح کا تھار تھار
جو تھے کوٹ پر بان بھانڈے تمام دغا نے کوں فرمائے کر حکم عام
شہنشہ کی ہے فتح پہلی ککر بنٹائے بہوت گھر پہ گاڑیاں شکر
بٹھا خلعتاں پادشاہی نواز کیے سرتے نواب کو سرفراز
دیے شہرت فتح یوں شہر میں کہ ہوے قصہ پر ملک پر دھر میں

اس کے بعد نصرتی نے دو شعر اپنے اور اپنی کتاب کے متعلق لکھے ہیں —

منگے جیوں رہنا نام ہر کامگار زمانے پہ یک نقش ہو یادگار
وہیں " نصرتی " دھر کہ سرتے امس لکھیا فتح * نواب نامے کا جس

(ہر کامگار یہ چاہتا ہے کہ اس کا نام دنیا میں یادگار رہے -اس

---

* کاتب نے غلطی سے فتح کی جگہ فن لکھہ دیا ہے —

خیال سے نصرتی نے ہمت کرکے نواب کی فتح منانے کے لیے یہ نامہ لکھا ہے) —

آخری شعر دعائیہ ہے اور اسی پر کتاب کا خاتمہ ہے —

الہی زمانے میں جم بھانوں تھانوں
اچھو مجھ بچن تے یو مرداں کا نانوں

(الہی ! دنیا میں ہمیشہ جگہ جگہ میرے کلام کی بدولت اِن مردوں کا نام زندہ رہے) -

اس پر بے اختیار آمین کہنے کو جی چاھتا ہے -

اس میں شبہ نہیں کہ یہ مثنوی علی نامے کی ٹکر کی نہیں - وہاں مغلوں اور شیواجی سے بڑے بڑے معرکے ہوئے ہیں اور اُن لڑائیوں کی حیثیت عظیم الشان جنگوں کی ہے - اُن کے مقابلے میں یہ ایک چھوٹی سی لڑائی ہے اور فوج بھی کم ہے اور سلطنت کا وہ جاہ و جلال بھی نہیں جو علی عادل شاہ ثانی کے وقت میں تھا - تاہم بڈھے نصرتی نے اس میں بھی اپنا کمال دکھایا ہے اور بعض موقعوں پر وہی رزمیہ شان اور قوت کلام پائی جاتی ہے جو علی نامے میں ہے —

(باقی آیندہ)

عمر خیام

ایک لی ریکل ڈراما

از

(عزیز احمد صاحب متعلم کلیہ جامعہ عثمانیہ)

[عزیز احمد سلمہ' نے یہ ڈرامہ موسیقیانہ انداز میں لکھا ہے اور بعض حیثیتوں سے اردو زبان میں اپنی نوعیت کا خاص ڈرامہ ہے - اس میں علاوہ شاعرانہ خوبی کے سیرت نگاری کا حسن بھی پایا جاتا ہے - عزیز موصوف کا ادبی ذوق قابل تحسین ہے اور امید ہے کہ اگر اس رستے پر ثابت قدم رہے تو آیندہ اردو ادب میں نام پیدا کریں گے - اڈیٹر]

پہلا منظر

— مدرسہ —

وقتست کہ از جام جہاں آرایند
وز چشم سحاب چشمہا بکشایند
موسیٰ دستاں ز شاخ کف بنمایند
عیسیٰ نفساں ز خاک بیروں آیند

— * —

[مدرسے کے سامنے سبز قطعۂ زمین - حسن بن صباح ' عمر خیام اور

وہ طالب علم جس کو نظام الملک کا خطاب ملنے والا ھے]

["آواز فطرت" کی آمد]

آواز فطرت

(بیک گراونڈ سے)

وہ چیز جس کو طلسم حیات کہتے ھیں ۔ جسے حجاب رخ کائنات کہتے ھیں
وہ شب کہ جسکو زمانے نے روز گردانا ۔ وہ دن کہ جسکو زمانے میں رات کہتےھیں
کسی پہ کھل نہ سکا اس کا راز دنیا میں ۔ وہ شے جسے صنت بے صفات کہتے ھیں
شکست کھا کے ھوی عقل سر نگوں آخر
طلسم ساز کا چل ھی گیا فسوں آخر

آواز فطرت

(نظام الملک سے مخاطب ھو کر)

بتا تو ھی تجھے اک دن نظام الملک ھونا ھے
تجھے کشت جہاں میں تخم انصاف آکے بونا ھے
بتا تو ھی کہ اس ھستی کا آخر مدعا کیا ھے
سنا' اس زندگانیء جہاں کا ماجرا کیا ھے

نظام الملک

زندگانی اک فضائے لامکاں کا نام ھے ۔ عکس روئے صانع کون و مکاں کا نام ھے
زندگی وہ خواب ھے تعبیر ھو جسکی فنا ۔ ھستیء انساں' طلسم بے نشاں کا نام ھے
پھر بھی یہ ھستی حیات جاوداں کا عکس ھے ۔ زندگی انسانیت کے امتحاں کا نام ھے
زندگی کی شمع روشن ھے ازل کے نور سے ۔ خاک انساں سجدہ گاہ قدسیاں کا نام ھے

آواز فطرت

(حسن بن صباح سے)

حسن ابن صباح اب تو بتا
کہ انجام اس زندگی کا ہے کیا ؟
عزازیل سے تو نے سیکھا ہے کیا ؟
کہ اس زندگی کا ہے کیا مدعا

حسن بن صباح

زندگی ایک شورش آتش فشاں کا نام ہے ذرہ ہائے مضطرب کے اک جہاں کا نام ہے
زندگی اک برق ہے خرمن جلانے کے لیے زندگی کی موج خار آشیاں کا نام ہے
دھر میں شورش نہو تو زندگی بے لطف ہے زندگانی تیشہ و سانگ گراں کا نام ہے
ہے ازل سے عالم فانی پہ ابلیسی اثر خاک انساں ، مشت خاک رائگاں کا نام ہے
بزدلی کا نام اس دنیا نے نیکی رکھہ دیا راز عصیاں' زندگی کی داستاں کا نام ہے

آواز فطرت

(عمر خیام سے)

اے عمر خیام ہے تیری جبیں کیوں پر شکن
کس لیے خاموش ہے تو؟ کس لیے رنج و محن
زندگی کے راز پنہاں کی بھی کچھہ تفسیر کر
تجھکو ہونا ہے جہاں میں شاہ اقلیم سخن

عمر خیام

زندگی خواب پریشان جہاں کا نام ہے حاصل ہستی وبال جانستاں کا نامؑ ہے
ہر قدم پر جسکو اک طوفاں کا اندیشہ رہے زندگی اُس کشتیء بے بادباں کا نام ہے
جو خزاں کے خوف سے ہر لحظہ پژ مردہ رہے زندگی اُس سرو سبز بوستاں کا نام ہے

زندگی اُس کاروان خستہ جاں کا نام ہے جسکے آنے کا پتہ ہے اور نہ منزل کا نشاں

زندگانی اُس طلسم جاوداں کا نام ہے جسکی تہ تک عقل و ہوش و دل نہ پہنچیں گے کبھی

آواز فطرت

تعبیر خواب زیست تو یوں کر چکے مگر

تہا تین طاقتوں کا جدا جا بجا اثر

(نظام الملک سے) تم کو ملی حیات، تو آغوش زہد میں

(حسن بن صباح سے) ابلیسیت میں آئی تمہیں زندگی نظر

(عمر خیام سے) تمکو ملی حیات شکست حیات میں

ٹوٹا جو جام، مستیٔ مے نے کیا اثر

لیکن یہ دیکھنا ہے کہ یہ تین قوتیں

بلتی ہیں دور زیست میں کس طرح راہ پر

ہوگا جہاں نظامت طوسی سے مستفید

صباح کے اصول سے پھیلے گا شور و شر

خیام پی کے بادہ کرے گا جہاں کو مست

اور درد دل سے چشم جہاں ہوگی خوں سے تر

ان تین طاقتوں میں رہے گی وہ کش مکش

جس سے رخ زمانہ پہ ہوویگا اک اثر

[آواز فطرت کے جانے بعد]

حسن بن صباح

جہاں تسکین پاتا ہے فریب نور ایماں سے

مگر میں درس ہستی لے رہا ہوں شور عصیاں سے

گلستان جہاں پیکار خار و گل کا میداں ہے
کروں گا دامن گل چاک میں خار گلستاں سے

سکون عیش سمجھا دہر نے ہیجان ہستی کو
جہاں میں دوں گا طوفاں بن کے اس خواب پریشاں سے

جسے ابلیسیت کہتی ہے دنیا اک کرشمہ ہے
لیا ظلمت میں درس زیست جس نے نور یزداں سے

نظام الملک

ہے عمر دو روزہ میں دعا بس یہ خدا سے متصد ہو مرا خدمت دیں فقر و غنا سے
متصد ہو مری زیست کا ہمدردی انساں ہو منجھکو غرض گر تو ہو خالق کی رضا سے

عمر خیام

نکل کر اس جہان رنگ و بو سے جاوداں ہوجا
اُبھر کر خاک کی پستی سے متحو لا مکاں ہوجا

یہاں ہنگامہ پرور خاک و باد و آب و آتش ہیں
تو ان سب سے گذر کر نور یزداں میں نہاں ہو جا

فریب عکس میں اُلجھا ہوا ہے عالم فانی
جمال راز ہستی کا جہاں میں ترجماں ہوجا

[پردہ]

دوسرا منظر

— دربار —

آں بہ کہ دریں زمانہ کم گیری دوست
با اہل زمانہ صحبت از دور نکوست

آں کس کہ بجملگی ترا تکیہ براوست
چوں چشم خرد باز کنی دشمنت اوست

[الپ ارسلاں کا دربار]

[رقص و سرود]

ایک درباری

(الپ ارسلاں کی تعریف میں)

دنیا جو آج خرم و فرخندہ کام ہے ہر سو جہاں میں شادی و بہجت کا نام ہے
باقی رہے جہاں میں الپ ارسلاں کا دور جس میں نظام ملک کا یاں انتظام ہے
الطاف اور فضل سے عالم ہے مستفید تحصیل علم و فن کا غضب اہتمام ہے
ہے دشمنوں کے سر کے لئے تیغ بے پناہ اور دوستوں کو فضل و عنایت سے کام ہے
سیلاب کامیابی و نصرت کے سامنے اعدائے بدنہاد کا قصہ تمام ہے
ہیں دل سے محو قیصر و کسریٰ کی عظمتیں سلجوقیوں کے دور کا وہ اہتمام ہے

الپ ارسلاں

(نظام الملک سے)

نظام الملک تیرے فیض پر دنیا یہ کہتی ہے
کرے خورشید کو جو ماند اختر ہو تو ایسا ہو
بہے خوں ہو کے جو ہر درد دل کی داستاں سنکر
جہاں میں آہ کوئی دیدۂ تر ہو تو ایسا ہو

[حسن بن صباح آتا ہے]

حسن بن صباح

دور ہستی میں شہید جلوۂ باطل ہوں میں
زندگی کا اک نشان سعی بے حاصل ہوں میں

شعلۂ باطل بھی اس دنیا کی ظلمت میں بجھا
دھر میں دور چراغ کُشتۂ محفل ھوں میں

قوت شر بھی مصاف زیست میں ناکام ھے
ھوکے خوں جو بہہ چکا ھو آہ اب وہ دل ھوں میں

نظام الملک

(سفارشاً)

بزم ھستی سے پشیمانیٔ عصیاں لیکر
ایک دل خستہ چہ دیدۂ حیراں لیکر
ھے تیرے فضل و کرم سے مجھے امید کہ اب
یاں سے جائیگا نہ وہ قلب پریشاں لیکر
کوئی آفت زدہ آیا در دولت پہ تیرے
جب گیا یاں سے گیا بخت درخشاں لیکر

الپ ارسلاں

بس نظام الملک کی خاطر ھمیں منظور ھے
سلطنت کی شمع روشن اُس کے دل کا نور ھے
آج سے رکن حکومت ھم بناتے ھیں تجھے
سرپرستی ھم کو تیری ھر گھڑی منظور ھے

[نظام الملک جاتا ھے]

[موسیقی]

حسن بن صباح

یوں تو آساں زندگی ھے اک دل محزوں کے ساتھ
لطف تب ھے جب بسر ھو شاھد گلگوں کے ساتھ

یوں نظام الملک کے زہد ریا آمیز نے
ساز عشرت کردیا برباد اک افسوں کے ساتھہ

جس طرح آئے خزاں صحن چمن کو لوٹنے
اور رخصت ہو جوانان چمن کے خوں کے ساتھہ

الپ ارسلاں
(ملامت اور غصے سے)

کیا مروت کا یہی انجام ہے ؟
دوستی کیا بس اسی کا نام ہے ؟
تیری ہر جنبش میں پنہاں اک فریب
رہزن ایماں تیرا ہر نام ہے

[نظام الملک آتا ہے]

حسن بن صباح
(دربار سے جاتے ہوے)

تمہارے ساز عشرت کو پریشاں کرکے چھوڑوں گا
تمہارے خوں سے زخم دل کا درماں کرکے چھوڑوں گا

اجازت باغباں گلچینیوں کی گر نہیں دیتا
تو اس سے گلشن کو ہمرنگ بیاباں کرکے چھوڑوں گا

یہی ٹھہری جو شرط زندگی سیلاب ہستی میں
تو ہر قطرے میں پیدا زور طوفاں کرکے چھوڑوں گا

گلہ کی بجلیوں کی ضوفشانی سے مدد لوں گا
تیرا خرمن نثار برق تاباں کرکے چھوڑوں گا

[جاتا ہے]
[عمر خیام آتا ہے]

نظام الملک

حضور شاہ میں ایک کامل فن آج آیا ھے
چمن سے رازدار سر گلشن آج آیا ھے
عمر خیام جس کے فیض سے دنیا منور ھے
چمن زار جہاں سے گل بدامن آج آیا ھے

الپ ارسلاں

اے عمر خیام اے ملک سخن کے شہریار
خوش نصیبی سے ھوا اس شہر میں تیرا گذار
ھاں بتادے گر تجھے جاہ و حشم درکار ھو
تیرے قدموں پر زمانے بھر کی دولت ھو نثار

عمر خیام

گو شاھد گردوں کی ادا اور ھی کچھہ ھے
پر قلب مصفا کی ضیا اور ھی کچھہ ھے

ھے علم کی خدمت سے غرض مجھکو جہاں میں
مانا کہ زمانے کی ھوا اور ھی کچھہ ھے

آھنگ طرب سے ھمیں دنیا میں غرض کیا
زخم دل محزوں کی دوا اور ھی کچھہ ھے

سرشار ھے دنیا مئے گلگوں کی ضیا سے
پر تشنگیٔ آب بقا اور ھی کچھہ ھے

[پردہ]

منظر در منظر ۔

حسن بن صباح کے فدائیوں کے ھاتھہ نظام الملک کا قتل

تیسرا منظر

— شاہراہ —

ہر جاکہ گلے و لالہ زارے بودست
از سرخی خون شہر یارے بودست
ہر شاخ بنفشہ کز زمیں می روید
خالے ست کہ بر رخ نگارے بودست

[شاہراہ]

[نظام الملک کے ماتم میں راہ گیروں کا ماتمی لباس]

[عمر خیام آتا ہے]

عمر خیام

ہنگامہ کیوں بپا ہے کہ ماتم کناں ہیں سب ؟
کیا ہو رہا ہے شہر میں کیوں نوحہ خواں ہیں سب ؟

راہ گیر

نظام الملک طوسی کی شہادت کا یہ ماتم ہے
اُسی کی موت کے غم میں سیہ پوش ایک عالم ہے
کیا دنیا کو مالا مال جس کے فیض نے برسوں
اُسی فیاض و عادل کے گذر جانے کا یہ غم ہے
حسن صباح جس کے کارہائے شر کی شورش سے
بدی کی طاقت اِس دنیائے فانی میں مسلم ہے
شہید اُس نے کیا اُس پاک ہستی کو مکائد سے
کہ جس کے رنج وغم میں خونفشاں اب چشم عالم ہے

عمر خیام

ماتم کے ساتھہ آمد فصل خزاں ہے آج
ہر برگ گل سے خون شہیداں عیاں ہے آج
ہر موج بحر زیست کی ہے قاصد فنا
طوفاں سے غرق کشتیٔ عمر رواں ہے آج
پیک اجل نے راز فنا کیوں بتا دیا
ہر سر رہین منت سنگ گراں ہے آج
تعمیر زندگی ہے اجل ہی کے واسطے
تار نفس میں سوزش برق تپاں ہے آج

[وقفہ]

عمر خیام

کیا خون تمنا سے زمانے نے وضو برسوں
رہی برق تپاں کو خرمنوں کی جستجو برسوں
ہوی جب خار و گل میں کشمکش صحن گلستاں میں
ہوا لٹ کر پریشاں کاروان رنگ و بو برسوں
شہید ناوک بیداد ہر صید حرم ہے یاں
مٹایا دور گردوں نے طلسم آرزو برسوں
کبھی دنیا سکوں سے آشنا ہونے نہیں پائی
رہا شرمندۂ چاک گریباں ہر رفو برسوں
بس اب اے شاہد گردوں حسد کی انتہا بھی ہے
کہ ہر رخسار سے مٹتا رہا یاں رنگ و بو برسوں

دوسرا راہ گیر

حسن صباح بھی دنیا سے رخصت ہوگیا آخر
ہزاروں قتل کرکے جان اپنی کھوگیا آخر

عمر خیام

اجل گلشن میں پہلے آئی جور باغباں ہوکر
گری پھر خرمن صیاد پر برق تپاں ہوکر
کوئی ظالم، کوئی مظلوم دنیا سے ہوا رخصت
فنا کا راز باقی ہے صدائے الاماں ہوکر
فنا کے واسطے پیدا کیا دنیا میں انساں کو
ڈبویا نام ہستی زندگی نے رائگاں ہوکر

[پردہ]

چوتھا منظر

— میکدہ —

آمد سحرے ندا ز میخانۂ ما
کے رند خراباتی و دیوانۂ ما
بر خیز کہ پر کنیم پیمانہ ز مے
زان پیش کہ پر کنند پیمانۂ ما

[میخانہ]

عمر خیام

مغبچوں کی سنگت

[کوزوں کے انبار]

منبچوں کی سنگت

بے رنج و تعب

اے لیلی شب

ھنگام طرب

آتا ھے اب

روشن کوکب بھی فروزاں ھے اب مثل شعاعِ رحمت رب

اِس رنج کا اس حرماں کا سبب ؟ یہ شور و فغاں بیکار ھیں سب

عمر خیام

یہاں تک ھستی انسان کو غم نے تاک رکھا ھے

کہ ھر موج نفس میں خنجر سفاک رکھا ھے

خمیر جام بنتا ھے گل خاک حسیناں سے

مئے گلگوں ھے یا خون دل صد چاک رکھا ھے

مگر اب بادۂ صافی کو پی لے کچھہ تو تسکیں ھو

یہ سامان شکست شیشۂ ادراک رکھا ھے

سنگت

پھر آج چمن میں جلوہ فگن ھے شاھد گل کا رخ روشن

پھر لالۂ و ایمان و سوسن سے رشک ختن ھے آج چمن

عشرت کے ترانے گانے کو

اور لذت غم کے مٹانے کو

پھر آج چمن میں جلوہ فگن ھے شاھد گل کا رخ روشن

عمر خیام

بر خیزو دوائے ایں دل تنگ بیار

آں بادۂ مشکبوے گلرنگ بیار

اجزاے مفرح غم ار می خواهی
یاقوت مے و بریشم چنگ بیار

سنگت

لو جام شراب که پهر گلشن اب باد بهار کا هے مسکن
اے مطرب پهر وہ طرز کهن سب بهولیں جس سے رنج و محن
هو جائیں جو ساقی کے درشن تو آو لٹا دو تن من دهن
عشرت کے ترانے گانے کو
اور لذت غم کے مٹانے کو
پهر آج چمن میں جلوہ فگن هے شاهد گل کا رخ روشن

[جام و چانگ کے ساتهہ ساقی کی آمد]

عمر خیام

خیام اگر زبادہ مستی خوش باش
با لاله رخے اگر نشستی خوش باش
چوں آخر کار نیست خواهی بودن
آں گاہ که نیستی چو هستی خوش باش

مغبچے

وہ ضیائے طلعت مه جبیں که مه دو هفته هو شرمگیں
وہ هوائے کاکل عنبریں که خجل هو جس سے غزال چیں
وہ طلسم نرگس سرمه گیں که جهاں هے جس سے ته نگیں
وہ جمال عارض آتشیں که چمن میں رشک سے گل حزیں
(سنگت) - تری هر جهلک بت نازنیں هے شکیب عشق په نکته چیں
وہ فسون عشوۂ جانستاں که هر ایک قلب هے خونچکاں
وہ تبسم لب ارغواں که فروغ محفل گلرخاں .

مژۂ دراز ہے دل ستاں کہ ہر ایک لب پہ ہے الاماں
وہ نگہ میں وسعت لامکاں کہ نگوں ہے گنبد آسماں

(سلگت) - تیری ہر جھلک بت نازنیں ہے شکیب عشق پہ نکتہ چیں

ساقی کا گیت

خزاں ہونے کو ہے فصل شباب آہستہ آہستہ
بس اب جاری رہے دو یہ شراب آہستہ آہستہ
مئے رنگیں اگر ہے کامیاب آہستہ آہستہ
سکوں پائے دل پر اضطراب آہستہ آہستہ
ادھر ہو دختر رز بے حجاب آہستہ آہستہ
اُدھر مست طرب چنگ و رباب آہستہ آہستہ
رخ رنگین مے ہو بے نقاب آہستہ آہستہ
کہ ہو جیسے طلوع آفتاب آہستہ آہستہ

عمر خیام

بروئے گل از ابر نقاب است ہنوز
در طبع و دلم میل شراب است ہنوز
در خواب مرو چہ جائے خواب است ہنوز
جانا مے دہ کہ آفتاب است ہنوز

[پردہ]

پانچواں منظر

— لب آبجو —

من هیچ ندانم کہ مرا آں کہ سرشت
از اهل بهشت گفت یا دوزخ زشت

قوتے و بتے و بادۂ بر لب کشت
ایں ہر سہ مرا نقد و ترا نسیہ بہشت
[لب آبجو]

[عمر خیام ' ساقی ' اور مغبچوں کی سنگت]

عمر خیام

سبزہ ہو چمن ہو اور مئے گلگوں ہو چھایا ہر سو بہار کا افسوں ہو
موجود اگر ساقیء گلفام رہے دنیا کی مصیبتوں سے دل کیوں خوں ہو

دو دن کی اگر ہے زندگانی ساقی رخصت ہونے کو ہے جوانی ساقی
تو ہو ' مے ہو ' بہار ہو ' پھر کیا ہے اک لمحہ ہے عمر جاودانی ساقی

[" شاہد بہار " کی مجسم صورت میں آمد]

شاہد بہار کا گیت

(کورس) چمن پہ اک نکھار ہے کہ آمد بہار ہے

بہار ہے جو دل ستاں
تو ہے ہر ایک شادماں
طیور بھی ہیں نغمہ خواں
زمیں بنی وہ بوستاں

کہ آسماں نثار ہے

(کورس) چمن پہ اک نکھار ہے کہ آمد بہار ہے

نکھار پر جو ہے چمن
گلگوں پہ آج ہے پھبن
کلی ہر ایک خندہ زن
مہک رہی ہے یا سمن

ترنم ہزار ہے

(کورس)　چمن پہ ایک نکھار ہے　کہ آمد بہار ہے

کہیں بتان آزری
ہیں مست ناز و دلبری
غضب ہے جلنگ زرگری
وہ عشوۂ و فسوں گری
ہر اک بے قرار ہے

(کورس)　چمن پہ اک نکھار ہے　کہ آمد بہار ہے

جہاں میں ایک جوش ہے
کہ شور ناؤ نوش ہے
یہ چشم مے فروش ہے
کہ گم شکیب و ہوش ہے
زمانہ مے گسار ہے

چمن پہ اک نکھار ہے　کہ آمد بہار ہے

[" لیلی شب " کی آمد]

لیلی شب

زمانہ مست ہے لیلائے شب کی چشم میگوں سے
نسیم جاں فزا آتی ہے کوہ دشت وھاموں سے

دلوں میں اک مسرت کی لہر سی دور جاتی ہے
مہک اُٹھتے ہیں غنچے بھی صبا کے رمز مکنوں سے

قمر نکلا لباس نور میں گلگشت کی خاطر
ستارے جھانکتے ہیں فصل گل کو بام گردوں سے

شب مہتاب میں محبوب ہو ، ساغر ہو ، مینا ہو
خجل ہو گلشن فردوس تک اس کیف افسوں سے

[" خت رز " کی آمد]

دختِ رز

دختِ رز آئی ہے چشم دلستاں کھولے ہوے
راز مستی کی نہفتہ داستاں کھولے ہوے

ظلمت گردوں میں حسن و عشق ہوجائے فنا
جام کی گردش ہے چشم دلبراں کھولے ہوے

آتش سیال میں عکس جمال یار ہے
ہے سبہ مستی رموز جاوداں کھولے ہوے

شور مینا نے چمن والوں کو حیراں کردیا
رہ گئے گل لب بہ انداز فغاں کھولے ہوے

مست ناز حسن تجھہ کو چشم میگوں کی قسم
اب تو آجا بسوے علبر نشاں کھولے ہوے

[تینوں شکلیں غائب ہوجاتی ہیں]

[عمر خیام کا ساغر ٹوٹ جاتا ہے]

عمر خیام

ابریق مئے مرا شکستی ربی برمن درعیش رابہ بستی ربی
برخاک بریختی مئے ناب مرا من مست نیم مگر تو مستی ربی

(وقفہ)

اک ادائے ناز سے ساغر کے ٹکڑے کردیے
پھر ستمگر نے دل مضطر کے ٹکڑے کردیے

بیخودی کا راستہ جس نے بتایا دھر کو
رھزن گردوں نے اُس رھبر کے ٹکڑے کردیے

شعلۂ دل کو بجھا کر صبر آجاتا تجھے
کیا ستم ہے مشت خاکستر کے ٹکڑے کردیے

ہے سکوں اِس عرصۂ ھنگامہ پرور میں محال
ظلمت شب نے مہ و اختر کے ٹکڑے کردیے

(وقفہ)

دل مضطر فنا کا رازداں معلوم ہوتا ہے
کہ راز ہستی اب جاوداں معلوم ہوتا ہے

حباب بیخودی کو اس جہاں میں عیش کہتے ہیں
اسیروں کو قفس ہی آشیاں معلوم ہوتا ہے

فریب دید سے دنیا میں ہر دام سیہ بختی
خیال گیسوے عنبر فشاں معلوم ہوتا ہے

مگر پھر نیستی اس خواب ہستی سے جگاتی ہے
تبسم بھی اک انداز فغاں معلوم ہوتا ہے

فنا کے جام میں آب بقا لیکن ہے پوشیدہ
فنا کا راز ہستی کا نشاں معلوم ہوتا ہے

نگاہ غور سے تعمیر ہستی کو اگر دیکھیں
زمیں کا ذرہ ذرہ آسماں معلوم ہوتا ہے

(طویل وقفہ)

ناکردہ گناہ در جہاں کیست بگو آں کس کہ گنہ نہ کرد چوں زیست بگو
من بد کنم و تو بد مکافات دہی پس فرق میان من و تو چیست بگو

[حسن ابن صباح کی روح داخل ہوتی ہے]

عمر خیام

حسن ابن صباح کی روح کیوں
یہاں آئی ہے اس طرح سرنگوں

حسن بن صباح کی روح

مرا تو نام بھی دنیا بھلا چکی لیکن
زمین شعر کا وہ شہر یار باقی ہے

نشان زهر نہ باقی رہا زمانے میں
مگر شراب سخن کا خمار باقی ہے

[حسن بن صباح کی روح غائب ہو جاتی ہے]

[نظام الملک طوسی کی روح داخل ہوتی ہے]

نظام الملک کی روح

جسے زمانے نے رند جانا طلسم هستی کا رازداں ہے
اُسی کی عظمت کا آج چرچا زمیں سے تا حد آسماں ہے
سمجھ سکا گر نہ اُس کو زاہد قصور تھا تنگیٔ نظر کا
ملی حقیقت وہ بے خودی میں نثار خود گاشن جناں ہے

[غائب ہو جاتی ہے]

[رقص و سرود]

عمر خیام

من ظاهر نیستی و هستی دانم
من باطن هر فراز و پستی دانم
با این همه از دانش خود شرمم باد
گر مرتبهٔ ورائے مستی دانم

[پردہ]

تبصرے

ادب

تاریخ و سیر

مذہب

طب و حفظان صحت

متفرقات

اردو کے جدید رسالے

زنانے رسالے

تبصرے

ادب

جواهر سخن

(مرتبهٔ مولوی محمد مبین کیفی چریا کوتی ' صفحات ۴۱۵ طباعت
کاغذ وغیرہ عمدہ ' شایع کردۂ هندوستانی اکیڈیمی الهآباد '
قیمت مجلد پانچ روپے ' غیر مجلد ساڑھے چار روپے - انجمن
ترقی اردو اورنگ‌آباد سے مل سکتی ہے)

اردو نظموں کے معیاری اور جامع انتخابات کی طرف اب تک بہت کم توجہ کی گئی ہے ' اس سے قبل متعدد انتخابات شایع ہوے ہیں لیکن ان سے حقیقی انتخابات کی شرایط پوری نہیں ہوتی ہیں - مقام مسرت ہے کہ هندوستانی اکیڈیمی الهآباد نے اس کی طرف عملی قدم بڑھایا ہے- چنانچہ حال میں اس نے اپنے انتخابات کی پہلی جلد چھہ سال کی کوشش اور اهتمام کے بعد شایع کی ہے جو همارے پیش نظر ہے —

انتخابات میں جن اصولوں کو مد نظر رکھا گیا ہے اس کی صراحت اکیڈیمی کے سکرتری ڈاکٹر تاراچند اور مرتب حضرت کیفی نے کردی ہے

ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ "اکیڈیمی کی مجلس انتظامیہ نے سنہ ۱۹۲۷ ع میں یہ فیصلہ کیا تھا کہ اردو کے سر برآوردہ سخن وروں کے کلام کا انتخاب شایع کیا جاے - ضرورت یہ تھی کہ ایک ایسا جامع انتخاب مرتب ہو جس میں نہ صرف غزلوں کا انتخاب ہو بلکہ وہ ہر صنف سخن پر حاوی ہو، اس میں تاریخی اصول بھی مدنظر رہے تاکہ شعر اور اس کے زمانے کا تعلق عیاں ہوجاے اور زبان کی تدریجی ترقی کی منزلیں نگاہ کے سامنے آجائیں - اس انتخاب میں اس امر کا بھی لحاظ رکھا جاے کہ نہ تو اتنا مختصر ہو کہ شاعر کی خصوصیات اور اس کے شاہکاروں کی پوری طرح نمایندگی نہ ہوسکے، نہ اتنا بسیط ہو کہ اس میں کل رطب و یابس شامل ہو جائیں - چنانچہ یہ انتخاب انہیں اصولوں کے تحت میں تیار ہوا ہے- اس کے علاوہ اس میں شعراء کے انتخاب کے معاملہ میں بھی احتیاط برتی گئی ہے - جہاں تک ممکن ہوا ہے ہر ایسا شاعر جس کو صاحب طرز کہہ سکتے ہیں اس میں شامل کیا گیا ہے" - مرتب نے اپنے تمہیدی بیانات میں انہیں اصولوں کا اعلان کیا ہے - یہ تمام اصول نہایت خوش آیند بھی ہیں اور علمی بھی - اس کے سوا اکیڈیمی نے ایک نہایت معقول اور ضروری اہتمام کیا - انتخاب کا کام کیفی صاحب اردو ریسرچ سکالر کے تفویض کیا جنہوں نے کثیر دواوین، انتخابات، تذکرے اور سوانح وغیرہ سامنے رکھہ کر یہ انتخاب چھہ جلدوں میں (جو چھہ دوروں پر مشتمل ہیں) تیار کیا، لیکن چونکہ انتخاب اکثر ذاتی رجحانات اور ذوق کی بناء پر ہوتا ہے اور اکیڈیمی ایسا ہر دلعزیز انتخاب تیار کرنا چاہتی ہے جس سے مختلف الطبایع ناظرین لطف اندوز اور محظوظ ہوسکیں اس لئے چھہ مشہور علما کی ایک مجلس مقرر کی جس کے ارکان نے فرداً فرداً ایک

ایک جلد کی نظر ثانی کی ہے - نظر ثانی کے لیے بھی اکیڈیمی نے ایک علحدہ دستورالعمل بنایا ہے جس کے تحت نظر ثانی ہوئی ہے - اس دستور العمل کی تفصیل درج نہیں کی - جلد زیر تبصرہ کی نظر ثانی مولوی سید سلیمان ندوی نے فرمائی ہے - بہر حال اکیڈیمی نے اپنی کوشش اور اہتمام کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا اور تمام ابتدائی مراحل کو خوش اسلوبی سے طے کیا لیکن اِن تمام انتظامات کے باوجود افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ اکیڈیمی کو اپنے مقاصد میں قطعاً ناکامی ہوئی (ہماری یہ راے موجودہ جلد کے متعلق ہے)—

سب سے پہلے ہماری نظر کتاب کی بنیادی ترتیب و تبویب پر پڑتی ہے جو غیر اصولی اور غیر علمی ہیں - اس کا بڑا سبب ادب کی تاریخ اور اس کے ارتقائی رجحانات سے ناواقفیت ہے - مرتب نے اس جلد میں پہلا دور لیا ہے اور اس کو دو حصوں پر تقسیم کیا ہے " پہلے حصے میں شعراے دکن کے کلام کا نمونہ اور اُن کے مختصر حالات ہیں اور دوسرے حصے میں شعراے دہلی کے کلام کا نمونہ اور اُن کے مختصر حالات اور خصوصیات درج ہیں "- یہ ترتیب بہت آسان معلوم ہوتی ہے لیکن جیسا کہ ہم بیان کرچکے ہیں زبان کی تاریخ اور اس کے ارتقائی رجحانات سے ناواقفیت کی بنا پر مرتب عجیب و غریب پیچیدہ غلطیوں کے شکار ہوگئے ہیں اور قدم قدم پر لغزش کی ہے —

پہلے دور کا پہلا حصہ دکنی شعرا پر مشتمل ہے - مرتب نے ان کی ترتیب میں کوئی زمانی و مکانی التزام رکھا اور نہ دکن کے مختلف صوبوں کے لسانی فروق کو پیش نظر رکھا ہے - ان کی نظر میں گجرات' بیجاپور' گولکنڈہ اور اورنگ آباد سب برابر ہیں - انھوں نے سواے گجرات کے بقیہ

تمام مرکزوں کو بقید عنوان درج تو کردیا ھے لیکن زمان و مکان کے تعین کرنے میں بڑی فاش غلطیاں کی ھیں - اگر گولکنڈہ اور بیجاپور وغیرہ کے الگ الگ مرکز قایم کردیے گئے تھے تو یہ بتانا چاھئے تھا کہ ان کے علحدہ تعین کا کیا سبب ھے - ان دونوں مقاموں کے لسانی فروق اور ادبی و شعری رجحانات کیا ھیں - مرتب نے یہ نہیں کیا اور اس سے قبل جو بعض حضرات نے بے سوچے سمجھے یا بخیال سہولت یہ التزام رکھا تو انہیں کی اندھی تقلید میں خود بھی یہ مراکز قایم کردیے —

اگر مرتب یہ نہیں بتاسکتے تھے تو صاف سیدھی بات یہ تھی کہ کتاب کی ترتیب کی بنیاد زمانی اعتبار یا سنہ وار رکھتے - موجودہ ترتیب تو قطعاً اصولی نہیں - پھر مرتب نے بڑا ستم یہ کیا کہ ایک مرکز کے شعرا کو دوسرے مرکز کے تحت درج کردیا مثلاً شعراے احاطۂ مدارس و بیجاپور میں صبای ' گجراتی اور محمود گجراتی کو شامل کردیا - حالانکہ مدراس اور گجرات میں ھر لحاظ سے بعد المشرقین ھے - مرتب نے ان دونو شاعروں کو باشندگان گجرات بتاتے ھوے بھی یہ غلطی کی ھے - اسی طرح جعفر زٹل کو دکنی اور عزلت کو اورنگ آبادی شاعر تسلیم کرلیا ھے —

دکن میں اردو شاعری کے تین مشہور اور اھم مرکز ھیں - بیجاپور ' گولکنڈہ اور اورنگ آباد - پہلے دو مرکزوں کے لسانی و شعری امتیازات و فروق کا تعین اب تک نہیں ھوا ' اور ان کا تعین کرنا ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ھے - یہ دونوں ٹھیٹ دکنی کے مرکز ھیں - اورنگ آباد کا مرکز بعد کو قایم ھوا اور یہ پہلے دو مرکزوں سے ھر لحاظ سے مختلف و ممیز ھے - اورنگ آبادی زبان دکھنی نہیں (جیسا کہ رسالہ اردو بابت اکتوبر ۳۲ ع میں مضمون دکھنی مخطوطات پر تنقیدی نظر میں مفصل و مدلل

طور پر ثابت کیا گیا ہے)- اسی طرح گجرات کا ایک علحدہ مرکز ہے اور اس کی ادبی و شعری پیداوار کسی طرح دکن سے کم نہیں - یہ میدان محققین کی نظروں سے ابھی تک پوشیدہ ہے —

دھلی میں اردو شاعری کا باضابطہ آغاز عہد محمد شاھی میں ہوا - یہ دور ایہام گویوں کا تھا - اس میں کم سے کم سولہ ایسے مشہور شاعر ھیں جو اپنے وقت کے صاحب طرز استاد مانے جاتے تھے، جن میں آبرو، حاتم، ناجی، مضمون وغیرہ بطور خاص مشہور ھیں - ایہام گوی کے خلاف مظہر، سودا، میر وغیرہ نے اپنی کوششوں کا آغاز کیا اور اردو شاعری کو ایہام گوی کے تباہ کن قید و بند سے آزاد کیا - مظہر بقول مصحفی زبان اردو کے "نقاش اول" ھیں - سودا نے بھی طرز ایہام گوی کی مذمت جا بجا اپنے اشعار اور نظموں میں کی ہے اور ایک نئے طرز کا آغاز کیا - ایہام گوی اور اس نئے طرز کے متعلق میر نے اپنے تذکرے کے خاتمے پر وضاحت کردی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ "شاعران سلف میں ایہام کا رواج تھا لیکن اب طبایع اس صنعت کی طرف بہت کم مایل ھیں ... ہم نے جو انداز اختیار کیا ہے وہ تمام صنعتوں پر حاوی ہے" —

اس بیان سے ظاہر ہے کہ دھلی میں پہلے ایہام گویوں کا دور تھا - اس کے خلاف مظہر، سودا، میر وغیرہ نے ایک نئی تحریک کا آغاز کیا - مرتب اگر اردو شاعری کا غور سے مطالعہ کرتے اور ان تمام رجحانات کو پیش نظر رکھتے تو ان کو اپنی کتاب کی ترتیب میں ضرور بنیادی تبدیلیاں کرنی پڑتیں اور شعراے دکن اور شعراے دھلی دونوں کے خاص خاص ادوار بلحاظ خصوصیات مقرر کرنے پڑتے - لیکن انھوں نے اس کا کوئی لحاظ نہیں کیا حالانکہ انھوں نے اس کا دعویٰ بھی کیا ہے "ہم نے ترتیب

دور میں زیادہ تر تدریجی ترقی کا خیال رکھا ہے - اگرچہ ترتیب سال و سن سے بھی اعراض نہیں کیا گیا ہے لیکن جہاں کہیں ان دونوں میں تصادم ہوا ہے ہم نے پہلی شکل کو ترجیح دی ہے" —

مرتب نے اس دور میں بعض مشہور صاحب طرز اساتذہ کو ترک کردیا ہے، دکن کے کئی نامور شعرا بے التفاتی کا شکار ہوگئے ہیں - دہلی کے شعرا میں سودا، میر، سوز وغیرہ بھی نہیں لیے گئے، حالانکہ ان کے بعد کے شاعر اس میں آگئے ہیں - یہ سب صاحبان طرز ہیں اور اپنے اپنے رنگ کے استاد، میر اور سودا کی نسبت غالباً مرتب اپنے اس عذر کو کارگر اور کافی خیال کرتے ہیں کہ "پہلی جلد کے انتخاب میں کوشش کی گئی ہے کہ اشعار کی تعداد کے لحاظ سے منتشر نمونے یکجا ہوجائیں - اس لئے اس دور کے شاعروں میں سے کمتر ایسے ہیں جن کے دیوان شایع ہوے ہیں" - اگر اس بیان سے یہ مراد ہے کہ ان شعرا کو ترک کردیا گیا ہے جن کے دیوان شایع ہو چکے ہیں تو سوز کا بڑا ضخیم دیوان ہے جو اب تک معرض طبع میں نہیں آیا - اسی طرح اور بھی چند شاعر ہیں جن کے حق میں حقیقتاً ناانصافی ہوی ہے —

مشہور شعرا کے ترک کے ساتھہ مرتب نے یہ بھی کیا کہ جن شاعروں کو لیا ہے ان کا بلند پایہ کلام پیش نہیں کیا یا کم سے کم ایسا کلام انتخاب نہیں کیا جو مخصوص انداز رکھتا ہے - سراج کی مثنوی بوستان خیال (جس کا ذکر مرتب نے کیا ہے اور سہیل علی گڑہ میں اور علحدہ بھی چھپ چکی ہے) کا کوی نمونہ اس انتخاب میں نہیں - بوستان خیال شاہ سراج کے خاص انداز بیان کا نمونہ ہے - نصرتی کے قصاید میں جو زور، بلند آہنگی اور شکوہ ہے وہ فارسی کے مسلم الثبوت قصیدہ گو شاعروں

کے کلام سے کم نہیں - اس کے قصاید کے نمونے چھپ چکے ہیں - ان کے نہ ہونے سے نصرتی بلکہ اس دور کی قصیدہ گوئی کا کوئی صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا - اس طرح آبرو اور دوسرے ایہام گو شعرا کا ایسا انتخاب کیا ہے جو موجودہ زمانے کی زبان سے بہت قریب ہے - اس سے یہ ہوا کہ ایہام گوئی کا عمدہ اور صحیح نمونہ پیش نہ ہوسکا - آبرو کی بعض مثنویاں اور فغاں کی ہجویات اور دیگر نظمیں خاص وزن رکھتی ہیں - ان کے انتخاب کا نہ ہونا بڑی کمی ہے - ان حالات میں تسلیم نہیں کیا جاسکتا کہ موجودہ انتخاب میں نمایندہ یا معیاری کلام درج ہے —

کتاب کی غیر اصولی ترتیب و تبویب اور انتخاب کے بعد ہماری نظر فاضل مرتب کی ان آزاد اور بے لگام آرا اور تنقیدوں پر پڑتی ہے جو بعض بنیادی مسایل کے حق میں صادر ہوئی ہیں - دکھنی شاعری کے متعلق وہ لکھتے ہیں " دکنی شاعری کی لفظی خصوصیات میں یہ امر نمایاں ہے کہ اس نے اپنے فاتحوں کا اثر قبول نہیں کیا - اس سے جہاں تک ہو سکا اپنی زبان کا آئینہ بنی رہی - اگرچہ اس تعصب اور سخت گیری نے اس کو محدود دائرے سے آگے بڑھنے نہیں دیا " —

فاضل مرتب کو یہ نہیں معلوم کہ جو زبانیں فتح اسلام کے وقت دکن میں بولی جاتی تھیں وہ مرہٹی ، کنڑی اور تلنگی تھیں - دکھنی اردو میں ان تینوں زبانوں میں سے کسی کا کوئی بنیادی عنصر شریک نہیں حتیٰ کہ ان زبانوں کے معمولی اور چلتے (سوائے ایک آدہ کے) الفاظ بھی استعمال نہیں ہوے ہیں - دکن میں جو قدیم اردو رائج ہوئی وہ وہی زبان تھی جو مسلمان فاتح شمالی ہند سے بولتے آے تھے - مرور زمانہ سے اس میں فرق پیدا ہوتا گیا اور دکن کی فضا میں وہ

آزاد نشو و نما پاتی رہی اور رفتہ رفتہ شمالی ہند کی زبان سے مختلف ہوتی گئی - لیکن اس میں کبھی بھی دکن کی کسی اصلی اور قدیم زبان کا کوئی جزو شامل نہ ہو سکا - بعض الفاظ ایسے ملتے ہیں جو کسی قدر متغیر شکل میں مرہٹی میں پاے جاتے ہیں لیکن اس سے یہ تسلیم نہیں کیا جا سکتا کہ وہ مرہٹی کے ہیں - اس لیے کہ ایسے الفاظ مرہٹی اور دکھنی اردو میں پراکرت سے آے ہیں اور ان دونوں زبانوں میں علحدہ علحدہ پھلنے پھولنے سے ان میں تغیرات پیدا ہو گئے ہیں ' براہ راست مرہٹی سے ایسے الفاظ دکنی اردو میں داخل نہیں ہوے ہیں - ایسی حالت میں فاضل مرتب کی راے کیا وزن رکھتی ہے —

مرتب نے ولی کو خاتم الشعراء دکن لکھا ہے ' دکن کی شاعری ولی پر ختم نہیں ہوئی بلکہ اس کے بعد در اصل اورنگ آباد میں اردو شاعری کا مرکز قایم ہوا ہے جس میں بڑے باکمال شاعر ہوے ہیں - ان میں سراج ' عاجز ' داؤد ' سامی وغیرہ خاص طور سے مشہور ہیں (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مضمون اورنگ آباد اور اردو شاعری مندرج مجلہ عثمانیہ جلد ایک) —

مرتب نے شعرا کے حالات وغیرہ اور ان کے اسماء وسنین تک میں غلطیاں کی ہیں حالانکہ بہت سے تذکرے چھپ چکے ہیں اور جن شاعروں کا ذکر اس کتاب میں ہے ان پر متعدد مضامین لکھے جا چکے ہیں - اس پر بھی مرتب " ہنوز روز اول ' کا شکار ہیں - اس قسم کی بے شمار غلطیاں ہیں - اس مختصر تبصرے میں گنجائش نہیں کہ ان سب کو گنایا جائے - چند پیش کی جاتی ہیں - ذیل کی غلطیوں کے اسباب ہمارے خیال میں تین قسم کے ہیں - (۱) غیر معتبر ماخذات (۲) حوالوں کی

اصل کتابوں کی کمی (۳) عجلت اور چھان بین اور تحقیق وتدقیق
بیگانگی - ہمارے خیال کی تائید ذیل کی مثالوں سے ہوتی ہے —

عارف الدین خاں عاجز کی تصانیف میں مرتب نے فیروز شاہ اور
ۂ مصر کو شامل کردیا ہے اور اس کو دکنی شاعر اور اورنگ زیب کا
صر فرض کرلیا ہے - حالانکہ عاجز اورنگ آبادی شاعر ہے اور بقول میر
ا سے بارہ سال قبل اکبر آباد سے دکن آیا - اس کی مشہور تصنیف علاوہ
ان کے مثنوی لعل و گوہر ہے - قصہ ملکۂ مصر کا مصنف محمود ہے - بعض
ںجوں نے اس کو محمد علی اور بعض نے سید محمد لکھا ہے اور تخلص
ز بتایا ہے حالانکہ اس شاعر کا تخلص محمود ہے - اول الذکر دونوں
غلط ہیں - خود قصہ ملکۂ مصر کے خاتمے پر شاعر نے اپنا تخلص اس
ح ظاہر کیا ہے : -

اے محمود اب پیر کا ناوں لے
ختم کر درازی سوا ب چھوڑ دے

مرتب نے سیف الملوک بدیع الجمال کا سنہ تصنیف ۱۰۴۵ بتایا ہے حالانکہ
، شاعر نے خاتمے پر اس کا سنہ تصنیف ۱۰۳۵ بتایا ہے —

برس یک ہزار ہور پیں تیس میں
کیا ختم یو نظم دن تیس میں

تحفۃ النصائح کا سنہ ۱۰۴۱ بتایا ہے خود شاعر نے ۱۰۴۵ لکھا ہے —

ہجرت تے دس سو سال ہور چالیس پر بھی پانچہ اتھے
تب یو مرتب سب ہوا تحفہ سو دکھنی نامور

مرتب نے اس خیال کو اپنی کتاب میں درج کیا ہے کہ ہاشمی بیجاپوری
ختی کا موجد ہے - اس کا سنہ وفات ۱۱۰۹ ھ بتایا ہے - ہاشمی بے شبہہ ریختی

میں طبع آزمائی کرتا تھا لیکن اس کو موجد ریختی کہنا درست نہیں ' خود وجہی کی غزلیں ۱۰۱۸ ھ میں ریختی میں ملتی ہیں - مثلاً ہم دو شعر ایک غزل کے نقل کرتے ہیں —

چلونا جائیں اے سہلیاں ھمارا لال جاں اچھتا
ولے کوی جانتا نیں ہے کہ بھوند و وو کاں اچھتا
نشاں نیں ہے نشاں ہے وہ نشاں اس کا نہ کے منجکوں
سکی اڑ جائیں پنکھی ھو اگر اس کیں نشاں اچھتا

مرتب ضروری تاریخ سے بھی واقف نہیں اور نہ وہ اس سے واقف ہونے کی زحمت اٹھانی گوارا کرتے ہیں - انہوں نے مرزا کے متعلق لکھا ہے " عالمگیر نے جب اورنگ آباد فتح کیا اس وقت وہ موجود تھے " - اورنگ آباد شاہ جہاں کے عہد میں فتح ہوا - اس وقت اس کا نام کھڑکی تھا جس کو خود اورنگ زیب نے اپنی شہزادگی کے زمانے میں ترقی دی اور نام اورنگ آباد خجستہ بنیاد رکھا - یہ ۱۰۶۸ ھ کا واقعہ ہے - عالم گیر نے گولکنڈہ فتح کیا - مرزا در اصل تانا شاہ والی گولکنڈہ کا مقرب تھا اور میر حسن نے (جس کا حوالہ مرتب نے دیا ہے) یہی لکھا ہے - تانا شاہ کی مملکت کی حدود سے اورنگ آباد باہر تھا اور قلمروے مغلیہ میں شاہ جہاں کے زمانے سے داخل تھا —

لایق مرتب نے محمد قلی قطب شاہ کا سنہ ولادت ۹۷۷ لکھا ہے - یہ نہ تو اس کی ولادت کا اور نہ تخت نشینی کا سنہ ہے - وہ جمعہ چار رمضان ۹۵۷ کو پیدا ہوا اور ۹۸۸ ھ میں تخت نشین ہوا - محمد قلی قطب شاہ کے تخلص کے بارے میں مرتب نے لکھا ہے کہ وہ فارسی میں قطب شاہ اور اردو میں معانی تخلص کرتا تھا - یہ غلط ہے - مرتب نے جو اردو کلام اس کا درج کیا ہے اس میں خود قطب شہ تخلص موجود ہے اور اگر فارسی میں اس کا تخلص

معانی ہے تو پھر اس نے اردو میں کیوں معانی تخلص استعمال کیا - خود مرتب نے اپنی کتاب کے صفحہ ۲۸ پر ایک اردو شعر درج کیا ہے جس میں معانی تخلص موجود ہے - یہ غلطی دراصل محبوب الذمن کے بیانات پر اعتبار کرنے سے ہوی - اگر رسالہ اردو جلد ۲ کو غور سے دیکھہ لیا جاتا تو یہ غلطی نہ ہوتی —

مرتب نے ایک اور مضحکہ خیز غلطی کی ہے - شفیق کے حالات لکھے ہیں اور مخزن نکات ' چمنستان شعرا ' نکات الشعرا اور تذکرۂ میر حسن کے حوالے دیے ہیں - حالانکہ چمنستان شعرا مولفہ شفیق کے سوا بقیہ تذکروں میں سے کسی میں اس کا حال درج نہیں - مرتب کو یہ تو سوچنا چاہئے تھا کہ شفیق کا سنہ ولادت ۱۱۵۸ ہے (جیسا کہ خود مرتب نے بھی لکھا ہے) اور نکات الشعرا کا سنہ تالیف ۱۱۶۵ ہے - کیا میر صاحب اپنے تذکرہ میں طفل ہفت سالہ کا ذکر بحیثیت شاعر کے کرسکتے تھے —

اس جلد کے آغاز میں اکیڈیمی کے لایق سکرتری نے اس اہتمام کا ذکر کیا ہے جو دکنی شاعروں کے کلام کی غلط نقلوں کے ازالہ کے بارے میں اکیڈیمی نے کیا ہے - اس اہتمام کے باوجود بھی صحیح کلام نقل نہ ہوسکا اور بے شمار غلطیاں رہ گئی ہیں - جن سے شعر مہمل ' بے معنی اور فہم سے باہر ہوگئے ہیں - ہم چند مثالیں درج کرتے ہیں —

صفحہ ۳۲ " لکہ جوت ہے پرتھارولے تیک رتن ہے " - اس میں تیک کی بجاے ٹیک (بمعنی ایک) چاہئے - یہ غلطی دراصل رسالہ اردو کی کتابت کی غلطی کی وجہ سے چلی آرہی ہے - رسالۂ اردو میں کاتب نے تیک بجاے ٹیک کے لکھہ دیا حالانکہ ٹیک کے نیچے مضمون نگار نے معنی کے طور پر " ایک " لکھہ دیا تھا جس سے کتابت کی غلطی

میں شبہ نہیں ہوسکتا لیکن سب اس کو غلط نقل کرتے چلے آتے
اور کوئی معنی و مفہوم پر غور نہیں کرتا - اس پوری غزل
یہ لفظ غلط نقل ہوگیا ہے - جس کی وجہ سے تمام اشعار
ہوکر رہ گئے ہیں -

صفحہ ۴۸ "بتیاں ستر چھہ سات سو" - اس میں بیتاں (بمعنی ابیات) چا

صفحہ ۹۴ "ابتا ہاشمی نو مناجات کر"- اس میں مناجات تو خیر طباعت
غلطی ہے لیکن ابتا کی جگہ اِتا (بمعنی اتنا) چاهئے —

صفحہ ۹۴ "پسند کر کر روراکیں جو سب هوشمند" - یہ مصرع در اصل اس ہ
"پسند کرکے راکهیں جو سب هوشمند" -

صفحہ ۵۴ "نوری ایس کے دل کی کسی نہ کہہ بتھا" - اس میں ایس کی
اپس (بمعنی اپنے) چاهئے —

صفحہ ۹۰ "کم سمجھہ سکتے تھے اس کو خاص و عام"- خاص و عام کی
خلق عام چاہئے ورنہ شاعر کا مدعا یہ نہیں کہ منطق الطیر
کی سمجھہ سے بھی باہر ہے —

صفحہ ۹۰ "لیکن اس کو دیکھہ کر دلچسپ بول" - یہاں کوکی بجائے کے چ

صفحہ ۹۱ "شوق سوں ایسا رو چاپایک چهچا" - یہاں شاعر طوطی سے
کررہا ہے کہ تو شوق مستی میں ایک نغمہ بلند کر - اصل نسخہ
روچاپا کی جگہ اوچا (بمعنی بلند یا اونچا کر) ہے اور چھ
جگہ چهچها ہے —

صفحہ ۱۷۲ "خبر تیر عشق میں نہ جنوں رہا نہ پری رہی"- تیر کی بجائے تحیر ؟

اس قسم کی بکثرت غلطیاں موجود ہیں - اس غلط نقل سے
ظاہر ہے کہ مرتب قدیم اردو کے ناقابل فہم اور غلط اشعار کو ہ

سمجھتے ہیں اور اُن پر اپنی آزاد رائیں صادر کرتے چلے جاتے ہیں - پہلے تو وہ اشعار کو سمجھتے نہیں ہیں دوسرے ان کے پیش نظر شاعروں کا کلام وافر مقدار میں موجود نہیں ہے - ان دو صورتوں میں ان کی راے ظاہر ہے کہ قیاسی اور ناقص ہوگی چنانچہ اکثر شاعروں کے کلام پر انہوں نے جو رائیں دی ہیں وہ قابل قبول نہیں - مرتب اگر تفصیلی کلام کا مطالعہ کریں تو اُن کو اپنی تنقیدوں پر ضرور افسوس ہوگا -

ہم نے یہ تبصرہ بہت ہی رواروی میں لکھا ہے - اگر اِس انتخاب کا زیادہ غور سے مطالعہ کیا جاتا تو یقین ہے کہ غلطیوں کا ایک دفتر ہو جاتا - اکیڈیمی کو ہمارا مشورہ ہے کہ وہ اپنے انتخابات کے سلسلے میں اپنی کوشش اور اہتمام کو زیادہ وسعت اور عمدگی سے عمل میں لاے - یہ جلد بہت اہم تھی اور اتفاق سے اس میں گوناگوں خرابیاں پیدا ہوگئیں - اس جلد سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی تیاری کے لئے نہ تو ادبیات اردو کی تاریخ کا غور سے مطالعہ کیا گیا اور نہ زیادہ محنت اس کے مرتب کرنے میں کی گئی ہے -

(چ)

——)*(——

بچوں کی نظمیں

(مکتبۂ جامعۂ ملیہ اسلامیہ دہلی - صفحات ۵۵ قیمت پانچ آنے)

اس کتاب میں بچوں کے لئے سلیس اور سادی نظمیں جمع کی گئی ہیں جو پر لطف بھی ہیں اور مفید بھی - ہماری زبان میں بچوں کے لئے ایسی کتابیں بہت کم ہیں اور اس لیے یہ مجموعہ بہت قابل قدر ہے -

——)*(——

اصغر کے سو شعر

(مکتبۂ جامعۂ ملیہ دھلی - قیمت چار آنے)

اس چھوٹی سی خوبصورت کتاب میں اردو کے مشہور شاعر اصغر گونڈوی کے سو اشعار کا انتخاب کیا گیا ھے - شروع میں اصغر صاحب کے حالات اور کلام پر آٹھ صفحے کا دیباچہ ھے - جو صاحب اصغر کے حکیمانہ کلام کے دلدادہ ھیں وہ اس انتخاب کو پڑھ کر ضرور خوش ھوں گے —

——)*(——

گنج پنہاں

(جعفری بک ڈپو ' سیتاپور قیمت چار آنے)

یہ میرانیس کا ایک غیر مطبوعہ مرثیہ ھے جسے جناب آہ سیتاپوری نے شایع کیا ھے - یہ جناب زینب کی شہادت پر ھے -

——)*(——

گلزار معانی

(کلام جناب پنڈت دینا ناتھ مدن بی - اے ' معجز دھلوی ' لال حویلی ' محلۂ چوڑی گراں دھلی - قیمت چار آنے)

یہ جناب معجز کی غزلیات کا مجموعہ ھے - جن صاحبوں نے اُن کی تالیفات مخزن اسرار اور پیام سالک دیکھی ھیں وہ جانتے ھیں کہ معجز صاحب کو تصوف سے خاص لگاؤ ھے - یہ کلام بھی عارفانہ اور صوفیانہ ھے —

——)*(——

چراغ ایمن

(کلام کنور احمد صیانت الزماں صاحب فکری سلطان پوری -
صفحات ۹۶ - قیمت ایک روپیہ آتھہ آنے - ملنے کا پتہ
کنور احمد اعتبار حسین خاں - ہاریمئو ' ڈاک خانہ
جگدیش پور ضلع سلطان پور)

یہ جناب فکری کا مجموعۂ کلام ہے - کلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسم بامسمیٰ ہیں - خیالات کے اظہار میں جرأت ہے اور ان کی شاعری صرف غزل تک محدود نہیں - عام نظموں اور غزلوں دونوں میں اپنے جذبات کو خوبی سے ادا کیا ہے - تصنع اور ابتذال نہیں پایا جاتا - فکری کا ذوق صحیح اور طبیعت پرجوش ہے —

چند ڈرامے

از نور الہی محمد عمر		ناشر اُردو بک استال -

یہ کتاب ایک ایک باب کے سات چھوٹے چھوٹے مذاقیہ ڈراموں کا مجموعہ ہے - جن میں سے اکثر مغربی مزاحیہ ڈراموں سے ماخوذ معلوم ہوتے ہیں - ادبی حیثیت سے اِن میں کوئی خاص خوبی نہیں ہے - عبارت کو تھیٹری انداز میں مقفیٰ اور مسجع بنانے کی کوشش کی گئی ہے - ظرافت میں شستگی نہیں -

پہلا ڈراما "اُدماتی" - گلبرٹ کے دلکش لطیف آپیرا 'Trial by jury' کا آزاد ترجمہ ہے ' لیکن اصل کی لطافت و خوبی اور خوش اسلوب ظرافت

پیدا نہیں ہوسکی جملے کہیں کہیں بھونڈے ہوگئے ہیں - گفتگو میں تسلسل نہیں رہا اور بعض جگہ وہ حصے جو اصل آپیرا کی جان تھے بالکل حذف کردیے گئے ہیں - اصل آپیرا لطیف مزاحیہ نظم میں تھا، نثر میں اس کی وہ خوبی باقی نہیں رہی —

دوسرا ڈراما "جنون ادب" ایک تھیٹریکل فارس (Farce) ہے - مذاق عامیانہ ہے - اور ادبی یا ڈرامائی تناسب کا لحاظ نہیں رکھا گیا - مکالمے کی طرح ظرافت میں بھی تکلف پایا جاتا ہے - ظرافت میں شگفتگی نہیں، اور ہر جملے سے معمولی تصنع ظاہر ہوتا ہے - تیسرے ڈرامے کا ماخذ وہ دلچسپ قصہ ہے کہ ایک جج کی گونگی بیوی علاج کے بعد اس شدت سے باتونی ہوجاتی ہے کہ تنگ آکر خود جج کو بہرا ہوجانے کی دوا استعمال کرنی پڑتی ہے - اِس میں شروع کا مکالمہ جو جج اور وکیل کے درمیان ہے بہت پھس پھسا اور بے لطف ہے - پھر جج اپنی بیوی کی خاموشی کی شکایت کے بعد اُس کے باتونی پن کی شکایت اس قدر جلد، اور بے ربط طور پر کرنے لگتا ہے کہ واقعے کا سارا لطف کرکرا ہوجاتا ہے - البتہ اِس ڈرامے میں قابل تحسین چیز جج کی رپورٹ ہے —

"پہلی پیشی" - "لاگ ڈانٹ" اور "ہمہ خانہ آفتاب" اسی قسم کے مزاحیہ ڈرامے ہیں - کہیں کردار عیسائی ہیں تو اُن کی زبان مستورات دهلی کی شستہ زبان ہے - اور کہیں کردار مسلمان ہیں تو اُن کی زندگی مغرب کی مہذب زندگی کی نقل ہے —

(ع - ا)

راز

از کے - ایم - یوسف الدین مطبوعۂ آرتھر اسٹاک ویل لمیٹڈ - لندن
قیمت ۲ شلنگ چھہ پنس

شروع میں تمہیداً چند سطروں میں مصنف نے بیان کیا ھے کہ اِن میں سے بعض ترجمے اُردو نظموں کے مشہور ترجمے ھیں اور بعض انگریزی ھی میں لکھے گئے ھیں ' گو خیالات اور تصورات اُردو کے ھیں - لیکن کہیں اُس کی صراحت نہیں ھے کہ ان میں سے کون سی منشور نظمیں ترجمے ھیں' اور کون طبع زاد ھیں - اس کا بھی پتا نہیں چلتا کہ کن اردو نظموں کا ترجمہ کیا گیا ھے -

اِس کتاب کی اشاعت کا کوئی مقصد سمجھہ میں نہیں آتا - اگر اِس کا باعث یہ ھوا ھے کہ انگریزوں کو اردو شاعری کے طرز تخیل اور طرز ادا سے واقف کرایا جاے ' تو اس کے لئے ضرورت تھی کہ ملتخب شعراء کے منتخب کلام کا صحیح اور فصیح ترجمہ کیا جاتا -

اِن ٹکڑوں میں جو صاف سادہ انگریزی نثر میں لکھے گئے ھیں کوئی خاص بات نظر نہیں آتی -

ترجمے معمولی قسم کی نظموں کے کئے گئے ھیں - اور پہلی نظر میں معلوم ھوجاتا ھے کہ ٹیگور کی نظموں کے انگریزی ترجموں کو پیش نظر رکھہ کے اپنے طور پر مترجم صاحب نے یہ نظمیں انگریزی میں ترجمہ کی ھیں - یہ معلوم نہیں اِن میں سے کون سی نظمیں طبعزاد ھیں - معیار سب تقریباً یکساں ھے - ھمیں امید نہیں کہ اس قسم کی کوششوں سے غیر اردو داں طبقوں اور خصوصاً یورپ میں اردو شاعری کے متعلق کوئی اچھا خیال پیدا ھوگا -

(ع - ا)

شعرالحکم جلد دوم

از ضامن حسین صاحب گویا جہاں آبادی - کتاب مجلد ہے -

طباعت و کتابت دیدہ زیب - حجم تقریباً (۸۰) صفحات

یہ "گویا، جہاں آبادی کی غزلوں اور نظموں کا مجموعہ ہے - مولانا عبدالماجد بی-اے نے شاعر کا تعارف کرایا ہے - مجموعۂ نظم تین حصوں پر مشتمل ہے - پہلے حصے میں غزلیں اور رباعیاں ہیں، دوسرا حصہ نعتوں اور منقبتوں کا مجموعہ ہے - تیسرے حصے میں مختلف نظمیں ہیں - خیالات میں جدت نہیں لیکن پاکیزگی اور متانت ضرور ہے - زبان بہت صاف ہے اور ادائے بیان میں خاص لطف اور نزاکت ہے - اور عام رنگ ظاہر کرتا ہے کہ پرمشق شاعر ہیں - بعض بعض شعر بہت اچھے نکل گئے ہیں - دوسرا اور تیسرا حصہ پہلے حصے کے مقابلے میں کسی قدر پھیکا اور بے رنگ ہے —

(ع - ا)

فانوس خیال

از امین الدین احمد صاحب - ملنے کا پتہ لائبریرین لوہارو

اسٹیٹ لائبریری - قیمت ایک روپیہ - طباعت و کتابت اچھی -

یہ تیسرے درجہ کا ناول شاید ہی کسی طبقے میں مقبول ہو سکے قصہ ناہموار سا ہے - واقعات کی ترتیب ناممکن طریقے پر کی گئی ہے -

انگریزاور اینگلو اینڈین سوسائٹی کا بہت غلط تصور پیش کیا گیا ہے ' اور اس سوسائٹی میں مسلمان ہیرو جس طرح ملتا ہے اور جو واقعات پیش آتے ہیں وہ سب تقریباً ناممکن ہیں - طرز خیال ریناالڈس کے ناولوں سے ملتا جاتا ہے - کسی اعتبار سے اس ناول میں کوئی خاص بات نظر نہیں آتی —

(ع - ا)

بیاض سحر

مصنفۂ د-ب-سدید (اہلیہ شیخ تراب علی صاحب) قیمت مجلد تین روپیہ آٹھ آنے - قومی کتب خانہ لاہور

یہ ناول ایک پنجابی خاتون کی تصنیف ہے - مقدمہ سر عبدالقادر نے لکھا ہے - کتابت اور طباعت دونوں قابل تعریف ہیں —

مگر اس سے زیادہ اس کتاب کی تعریف میں کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ " اخلاقی ناول "لکھنے کا شوق اُردو خواتین کو شاید زنانہ رسالوں کی فضا سے شروع ہوا - اس قسم کے ناول جن کا مقصد زنانہ پند و موعظت ہوتا ہے ' جن کے قصے عجیب و غریب پیچ در پیچ ' اور مختلف ومتضاد عناصر سے مرکب ہوتے ہیں اور جو مسلم خواتین کی نیم تعلیم یافتہ ذہنیت کا آئینہ ہیں ' اُردو میں بکثرت لکھے گئے ہیں اور لکھے جا رہے ہیں —

اُردو زبان میں ایسے ناولوں کی بہت سخت ضرورت ہے جو خواتین " نسوانی نقطۂ نظر " سے لکھیں - وہ خالص نسوانی نقطۂ نظر جس سے وہ

روز مرہ کی زندگی کو دیکھتی اور سمجھتی ہیں اُن کا خالص نسوانی طرز خیال، نسوانی طرز ادا، زندگی کے ساتھ اُن کی نسوانی همدردی ان سب چیزوں کی اُردو زبان کو ضرورت ہے - اخلاقی ناولوں کا خاطر خواہ اثر اُسی صورت میں ہو سکتا ہے جب واقعات بالکل مطابق فطرت اور معاشرت کا آئینہ ہوں - واقعہ نگاری میں خلوص کی جھلک خود بخود پیدا ہو جاتی ہے - اور یہ خلوص ناول کے اخلاقی مقصد کو بہت زیادہ پر اثر بنا سکتا ہے —

سر عبدالقادر اپنی تمہید میں تحریر فرماتے ہیں " ہندوستانی شرفا کا پرانا تمدن اس زمانے کے نئے نئے اثرات سے بہ سرعت بدل رہا ہے، اور اس کی جگہ نیا تمدن ابھی پوری طرح قائم نہیں ہوا - بیگم تراب علی نے اس دور تغیر کے حالات اس کتاب میں خوبصورت پیرایہ میں بیان کیے ہیں" - افسوس کہ ہمیں اس سے کسی قدر اختلاف ہے پلاٹ اس قدر عجیب و غریب ہے کہ ہندوستان کی معاشرت کی مختلف فضاؤں میں سے کسی فضا پر صادق نہیں آ سکتا - افراد قصہ میں زندگی نہیں حقیقت نہیں - قصے کے واقعات اس قدر عجیب ہیں کہ اُن کا اس ترتیب سے پیش آنا تقریباً نا ممکن معلوم ہوتا ہے - "دور تغیر" کی نفسیاتی کیفیت تو درکنار ظاہری معاشری کیفیت کا بھی صحیح مطالعہ نہیں کیا گیا ہے - مکالمے بھی بے ربطی اور تصنع سے خالی نہیں - تاہم کہیں کہیں مکالمے میں زندگی کے آثار پیدا ہوگئے ہیں، اور وہی حصہ اس کتاب کا قابل مطالعہ اور لایق داد ہے —

ناولوں سے اخلاقی اثرات پوری طرح ڈالے جا سکتے ہیں - مگر اخلاقی مباحث سے نہیں، واقعات کے فطری تسلسل سے اخلاقی مباحث بھی

اسی صورت میں مفید ہو سکتے ہیں جب وہ فطری طور پر افراد قصہ کی گفتگو میں خود بخود آ جائیں - ورنہ اکثر یہ ہوتا ہے کہ ناظرین (خصوصاً وہ ناظرات جن کے لیے یہ کتاب لکھی گئی ہے) اس قسم کے مباحث کو چھوڑ چھوڑ کر صرف قصہ پڑھ لیتی ہیں —

لیکن اس خیال سے کہ یہ کتاب ایک خاتون نے لکھی ہے بہت کچھ قابل قدر ہے اور جس طبقے کے لیے یہ کتاب لکھی گئی ہے اُس میں بہت پسند کی جائے گی اور مسلم خواتین اور لڑکیاں جنھوں نے معمولی تعلیم پائی ہے اس کتاب کو بہت پسند کریں گی - مگر ضرورت یہ ہے کہ خواتین کا ادبی مذاق بھی اب کچھ ترقی کرے اور خواتین کی تصانیف کا معیار بھی بلند ہو —

(ع - ا)

تاریخ وسیر

کارنامۂ اسلام

(تصنیف سید عنایت علی صاحب مسرور صفحات ۲۲۸ قیمت دو روپے - قرول باغ - دہلی)

یہ سید عنایت علی صاحب المتخلص بہ مسرور (انہونوی) کا دلچسپ اور قابل قدر کارنامہ ہے - یعنی مسدس کی صورت میں رسول کریم علیہ التحیواۃ والتسلیم کی پوری سیرت شریف (۲۸۳ صفحات میں) نظم کردی ہے - اس میں

ولادت باسعادت سے لے کر وفات تک کے تمام حالات کافی تفصیل سے موجود ہیں بلکہ بعض واقعات کی مختلف روایات تک قلم بند کی ہیں - پوری نظم شاعر کے حسن اعتقاد اور قدرت کلام کی شہادت ہے اور ہمیں امید ہے کہ مسلمانوں میں خاطر خواہ قبولیت حاصل کرے گی - خصوصاً لڑکے اور لڑکیوں کو سیرت مبارک پڑھانے میں اس سے بخوبی کام لیا جاسکے گا - نمونے کے لیے کتاب کے پہلے دو بند پیش کئے جاتے ہیں :-

جب ظلمت گناہ سے عالم سیاہ تھا ہر فرد اس جہان کا گم کردہ راہ تھا
ہادی تھا کوئی اور نہ کوئی دیں پناہ تھا مردم ہر ایک صورت مردم گیاہ تھا
باطل پرستیوں کا زمانے میں تھا چلن
برپا تھے چار سمت فسادات ما و من

جلتی تھی بات بات پہ تلوار ہر طرف خونریزیوں پہ لوگ تھے تیار ہر طرف
ناحق تھے نقد جاں کے خریدار ہر طرف دختر کُشی کا گرم تھا بازار ہر طرف
انساں تھے صورتاً پہ بہائم صفات تھے
بے رحمیوں سے قاطع تار حیات تھے

عجب نہیں کہ یہ نظم لکھنے کی تحریک پنجاب سے شاہنامۂ اسلام کی اشاعت یا شہرت سن کر ہوی ہو - بہر حال ' یہ بہت خوشی کی بات ہے کہ لکھنؤ جیسے مقام میں رہ کر فاضل مصنف نے شاعری سے ایسا مفید کام لیا اور اتنی بڑی مربوط و مسلسل نظم تیار کردی —

فاضل مصنف سے دو روپے میں ' مسجد بکر ملدی بشیرت گنج ' لکھنؤ ' کے پتے سے مل سکتی ہے —

(ش)

تحفۂ سامی

(مرتبہ مولوی اقبال حسین صاحب ایم - اے ' بی - ال -)

ایران کے خاندان صفوی کا شاہزادہ سام میرزا جو بحالت قید اکسٹھہ برس کی عمر میں شاہ اسمٰعیل ثانی کی سنا کی کا شکار ہوا ' (سنہ ۹۸۴ ھ) نہایت علم دوست اور صاحب ذوق ادیب تھا - اس کا تذکرہ تحفۂ سامی اگرچہ نادرالوجود ہے لیکن علمی طبقے میں کافی شہرت واعتبار رکھتا ہے اور اس میں نویں صدی کے اواخر سے دسویں صدی ہجری کے وسط تک کے مشاہیر کے حالات لکھے ہیں' جن میں بعض نامور اشخاص خصوصاً شعرا سے مصنف خود ملا اور مستفید ہوا تھا - پوری کتاب سات ابواب یا "صحائف" میں ہے اور ان میں سے پانچویں صحیفہ کا موضوع "شاعران مقرر و فصحاے بلاغت گستر" قرار دیا ہے اور سب سے پہلے یہی ٹکڑا مولوی اقبال حسین صاحب ایم اے بی ایل کی تصحیح و تحشیہ سے ' زیر سر پرستی پٹنہ یونیورسٹی چھپ کر شائع ہوا ہے - لائق مدون یقین دلاتے ہیں کہ باقی صحائف بھی عنقریب طبع کرادیے جائیں گے -

کتاب نہایت عمدہ کاغذ پر ٹائپ میں تقریباً ۲۰۰ صفحات پر چھاپی گئی ہے - تین سو سے زیادہ شعرا کا تذکرہ ہے - اس لیے جامی ' ہاتفی ' بنائی ' امیدی اور اہلی کے سوا بہت کم کوی شاعر ہے جس کا ذکر ڈیڑہ دو صفحے یا زیادہ پر آیا ہو - حالانکہ حالات کے ساتھہ کلام کا نمونہ بھی شامل تذکرہ ہے - کتاب کی عبارت عموماً شگفتہ اور سلیس ہے اور جا بہ جا لطائف و محاضرات سے اس کی دلچسپی میں اضافہ ہوگیا ہے - یوں بھی خود

لکھنے والے کا ادیب و ہمعصر ہونا اس کی وقعت بڑھانے کے لیے کافی ہے -

فاضل مدون نے انگریزی مقدمے کے ساتھہ فارسی میں بھی مختصر سا مقدمہ تحریر فرمایا ہے لیکن ذیلی حواشی ہر جگہ انگریزی میں لکھے ہیں اور ان میں بھی کچھہ زیادہ تفصیل و تحقیق کی ضرورت نہیں سمجھی - برایں ہم ان کا اہل ادب پر یہ احسان کچھہ کم نہیں ہے کہ ایک ایسے عمدہ اور کمیاب تذکرے کو صحت کے ساتھہ چھاپ کر شائع کردیا - کتاب پر ملنے کا پتہ یا قیمت درج نہیں ہے - غالباً رجسٹرار پٹنہ یونیورسٹی سے طلب کی جاسکتی ہے —

(ش)

مختصر تاریخ عالم

(مولانا سید حکیم احمد نتوی صاحب - گوالیار صفحات ۱۲۰ قیمت ایک روپیہ)

قابل مولف نے اس کتاب میں مختصر طور پر خشکی پر حیات کے پیدا ہونے اور پھیلنے' انسان کے مماثل حیوانات اور اصل نوع انسان کے ظہور' اقوام انسانی' ترقی کے ابتدائے مراحل اور تاریخی زمانے کے آغاز کی کیفیت صاف زبان میں بیان کی ہے - یہ اس مختصر تاریخ عالم کی پہلی جلد ہے - جس قدر اس میں درج اُن کے ماخذ معتبر اور جدید ہیں - اردوداں کے طبقے اور خصوصاً طلبہ کے لیے مفید کتاب ہے —

تعلیمات قرآن

(مرتبۂ جناب اسلم جیراجپوری صاحب - قیمت دو روپے- قرول باغ- دھلی)

یہ قابل قدر کتاب مولانا اسلم جیراجپوری (معلم جامعہ ملیہ، دھلی نے اس غرض سے تالیف کی ھے کہ اسلام کے ضروری اصول و عقائد کو صرف قرآن مجید کی آیتوں سے بیان کیا جاے - قرآن مجید ھی کو سمجھنے سمجھانے کے لئے، احادیث کو جمع اور تفسیر وفقہ کو مرتب کیا گیا تھا، لیکن تقلید جاھلانہ کی بدولت مسلمانوں میں ان علوم کا اتنا زور بڑھا کر اصل سر چشمۂ ھدایت و تعلیم یعنی قرآن سے لوگوں کا "رشتہ توٹ گیا" اور اس کو حافظ اسلم صاحب قوم کی بدبختی اور تنزل کا سب سے بڑا سبب سمجھتے ھیں -

کتاب کے چھہ حصے ھیں، جن میں خالق، مخلوق، دین، رسالت، کتاب اور معاد کے متعلق، ذیلی عنوانات دے کر، آیات قرآن کو اردو ترجمے کے ساتھہ نقل کردیا ھے - صرف ذیلی حواشی یا کہیں کہیں متن میں کوئی فقرہ کسی مسئلے کی تشریح و تعبیر کے لئے تحریر ھے ورنہ فاضل مولف کی کوشش یہی ھے کہ فقط قرآن سے قرآن کی تعلیم پیش کی جاے - ھر عنوان کے تحت میں انھوں نے اس مضمون کی چیدہ چیدہ آیات نقل کردی ھیں لیکن غالباً یہ بہتر ھوتا کہ ذیلی عنوانات کو کم کر کے زیادہ ضروری مسائل کی تمام آیات کو یکجا لکھدیا جاتا کیونکہ جیسا کہ خود انھوں نے تحریر فرمایا اور مسلم ھے یہ مسائل مختلف سورتوں اور آیتوں میں پھیلے ھوے ھیں اور جو شخص صرف قرآن سے انہیں سمجھنا چاھتا ھے اس کے لئے لازم ھے کہ جملہ آیات متعلقہ کو اپنے سامنے رکھے -

فاضل مولف نے صاف طور پر لکھدیا ھے کہ " قرآن کے اندر میں نہ خود

اپنا کوئی خیال لے کر گھسا ھوں نہ کسی کے خیال کی پروا کی ھے بلکہ دیانت اور تقویٰ کے ساتھہ قرآن کو خود قرآن ھی سے اپنی بصیرت کے مطابق سمجھنے کی کوشش کی ھے - جہاں جہاں مجھسے غلطیاں ھوی ھوں ' اگر طالبین قرآن ان سے مجھہ کو مطلع فرمائیں گے تو میں ممنون ھون گا - اور انشاءالله اپنے خیال اور کتاب دونوں کی اصلاح کروں گا " -

یہ بالکل صاف اور ناقابل اعتراض مسلک ھے لیکن ظاھر ھے کہ جس قوم نے رفتہ رفتہ ' کرامات اولیا ' کو ماننا جزو ایمان قرار دے لیا ھو ' اس میں عام عقائد سے ذرا بھی مختلف بات کہنا ' مقبول نہیں ھو سکتا - مولانا اسلم صاحب کو دو مسئلوں میں معتقدات متداولہ سے اختلاف ھے - ایک تو یہ کہ وہ پیغمبر اسلام (علیہ الصلواۃ والسلام) کو کوئی حسی معجزہ دیے جانے سے انکاری ھیں - دوسرے قیامت سے پہلے حیات بعد الموت کے قائل نہیں ھیں - موسیٰ وغیرہ دوسرے انبیا کے حسی معجزات کا ' جو قرآن میں مذکور ھیں ان کو اقرار ھے لیکن حضور سرور کائنات مفخر موجودات کی نسبت عقیدہ رکھتے ھیں کہ قرآن میں آپ کا سب سے بڑا معجزہ خود قرآن کو بتایا گیا ھے - اس کے سوا آپ کا اور کوئی معجزہ بروے قرآن ثابت نہیں ھوتا - حافظ صاحب کے اِسی خیال پر بعض حضرات نے گرفت کی ھے اور حسب معمول اس علمی بحث میں بے جا شدت سے بھی کام لیا گیا ھے - ممکن ھے اسی تیزی میں کچھہ غلط فہمی بھی پیدا ھوگئی ھو - غیب دانی یا پیشگوئی کی ایسی مثالوں سے ' جیسے رومیوں کی فتح ایران پر ' فتح مکہ یا منافقین کے خفیہ مشوروں کا بذریعہ وحی الٰہی انکشاف ' ومثلہم ' فاضل مولف کو انکار نہیں ھوسکتا کیونکہ یہ قرآن میں صراحتاً مذکور اور تاریخ سے ثابت ھیں ' اور بلا شبہہ ان کو خوارق یا معجزات ھی میں شمار کرنا پڑے گا اگر چہ

مولانا اسلم نے اس کا کوئی ذکر نہیں فرمایا ہے - مسئلۂ ثانی میں بھی کافی بحث و گفتگو کی گنجائش ہے اور فاضل مولف نے جو کچھہ تحریر کیا ہے اس میں بظاہر بعض پہلو تشنہ رہ گئے ہیں لیکن مجموعی طور پر یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اگر ان کی طرح اس مسئلے کو کوئی صرف خود قرآن حکیم سے سمجھنا چاہے تو غالباً انہی کا ہم خیال ہوجاے گا - باقی یہ دوسری بحث ہے کہ خود رسول اللہ صلعم کے جو اقوال اور تصریحات صحت و تواتر کے ساتھہ ہم تک پہنچے ہیں ' ان سے قرآن کے سمجھنے میں کوئی واسطہ نہ رکھنا ' کس حد تک مفید یا جائز ہوگا —

بہرحال' کتاب نہایت محنت اور قابلیت سے لکھی گئی ہے اور غور و خوض سے پڑھنے کے لائق ہے - برقی پریس دھلی میں بہت صاف ستھری چھپی ہے —

(ش)

سبل السلام

(مولفۂ مولوی عبدالحی صاحب صفحات ۸۶ -
قیمت بارہ آنے - مکتبہ جامعۂ ملیہ - دھلی)

مولوی عبدالحی صاحب معلم دینیات جامعۂ ملیہ دھلی ایک خاص رنگ میں قرآن شریف کی تفسیر لکھہ رہے ہیں' اور بہت خوب لکھہ رہے ہیں- لیکن یہ مسلسل نہیں ہے بلکہ مختلف حصے الگ الگ شائع ہورہے ہیں - ان میں تفسیر سورہ بقرہ (الخلافت الکبریٰ) اور آل عمران (بیان) ملک میں کافی شہرت پاچکی ہیں - مندرجۂ عنوان حصہ پارۂ قد سمع اللہ کی نو سورتوں کی تفسیر ہے - فاضل مفسر ذی علم و پرجوش مسلمان ہیں اور عہد حاضر

کے سیاسی اور تمدنی مسائل کو خاص طور پر پیش نظر رکھ کر یہ ت
لکھے رہے ہیں - امید ہے کہ مسلمان ان کی مساعی حسنہ کی خاطر خواہ
اور اس کتاب سے پورا استفادہ کریں گے —

(ش)

طب و حفظان صحت

جوانی کا تحفظ اور بڑھاپے کی روک تھام

از لفٹننٹ کرنل ڈاکٹر محمد اشرف الحق - قلعہ گولکنڈہ
حیدرآباد دکن - صفحات ۳۵۲ - قیمت دو روپے

جوانی دیوانی سہی، مگر کون ہے جو سدا جواں رہنا نہیں چاہ
اور کون ہے جو جوانی جانے کے بعد اپنے بڑھاپے کو آن کے ساتھ قائم
رکھنا چاہتا؛ جوانی ہو یا بڑھاپا، انسان کی مسرت اور کامیابی کا
صحت میں ہے - اور اس کتاب میں اسی راز کو آشکارا کیا ہے —

ڈاکٹر اشرف الحق صاحب نے اعادۂ شباب، درازیٔ عمر اور مضا
متعلقہ پر متعدد رسالے لکھے ہیں لیکن یہ کتاب بہت جامع ہے - صحت
متعلق جتنے ابواب اور شعبے ہیں ان سب پر بڑی صفائی اور تفصیل
بحث کی ہے اور جسم و دماغ کی صحت قائم رکھنے کے لیے ذاتی نیز نا
طبیبوں اور ڈاکٹروں کے تجربوں کی بنا پر نہایت مفید اور کارگر تدبی
بتائی ہیں - ہر شخص جو دنیا میں خوشحالی کی زندگی بسر کرنا چ
ہے اُسے اس کتاب کا مطالعہ کرنا لازم ہے - اس کتاب نے بیسیوں کتابوں

مطالعہ اور ڈاکٹروں کے مشوروں سے مستغنی کر دیا ہے - ڈاکٹر اشرف الحق کی یہ تالیف ہر لحاظ سے ہمارے شکریے اور تعریف کی مستحق ہے —

ڈاکٹر صاحب نے کتاب کے آخر میں انگریزی اردو اصطلاحات کی ایک فرہنگ بھی درج کردی ہے جو بہت کار آمد چیز ہے —

جنسی امراض اور ان کا علاج

مصنفہ کرنل بھولاناتھ - قیمت تین روپے - ملنے کا پتہ
کتب خانہ لطف زندگی اعوان منزل موچی دروازہ لاہور

اُردو زبان میں صنفی موضوعات پر ایسی کتابوں کی بہت ضرورت ہے جن سے صحیح علمی معلومات ہو سکیں - صنفیات پر کچھ کتابیں جو اب تک شایع ہوی ہیں' ضرورت سے زیادہ "شاعری" سے مملو ہیں - زیر نظر کتاب کی اہمیت اس وجہ سے اور زیادہ ہو جاتی ہے کہ اس کی حیثیت بالکل فنی ہے - کتاب کو مقبول بنانے کے لیے شاعری نہیں کی گئی ہے - علمی زبان میں اختصار کے ساتھ لیکن جامع طور پر صرف موضوع سے بحث کی گئی ہے —

کرنل بھولاناتھ نے یہ کتاب لکھ کر اُردو زبان کے اس ذخیرے میں قابل قدر اضافہ کیا ہے - اس فن پر دوسری زبانوں میں صدھا کتابیں لکھی گئی ہیں - مگر اُردو زبان میں اس قسم کی خالص فنی کتابوں کا تقریباً فقدان تھا - یہ کتاب جو خالص طبی نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے ایک ممتاز حیثیت رکھتی ہے —

کتاب کا پہلا حصہ ضروری صنفی معلومات سے متعلق ہے' اور وضاحت کے ساتھ قابل مصنف نے اس موضوع کے تمام ضروری پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے - نقطۂ نظر اس حصۂ کتاب میں بھی طبی ہے - مگر عام لوگ بھی اس سے پوری طرح مستفید ہو سکتے ہیں —

دوسرے حصے میں جلسی امراض اور صنفی کمزوریوں کے ویدک، طبی اور ڈاکٹری علاج هیں - تیسرا حصہ برتھہ کنٹرول سے متعلق هے - ضروری نقشے اور ضرورت کے اعتبار سے تشریحاً قلمی تصویریں بھی موجود هیں —

(ع - ا)

متفرقات

پیام سالک

(مولفۂ جناب پنڈت دینا ناتهہ مدن معجز صاحب دهلوی ' بی - اے لال حویلی ' محلہ چوڑی گراں ' دهلی - قیمت ایک روپیہ)

جناب معجز دهلوی اس سے قبل شریمد بھگوت گیتا کا منظوم ترجمہ "مخزن اسرار" کے نام سے کر چکے هیں - "پیام سالک" مُنی اشٹاوکر کی گیتا کا منظوم ترجمہ هے - اصل کتاب بھی نظم میں هے اور ترجمہ بھی اردو نظم میں کیا گیا هے - اس میں بیس باب هیں - هر باب میں اشعار کی تعداد مختلف هے - کم سے کم چار اور زیادہ سے زیادہ سو - یہ در اصل اشٹاوکر مُنی کی وہ تعلیم هے جو انهوں نے طالب هدایت راجہ جنک (سیتا جی کے والد) کو وحدت و معرفت کے بارے میں دی هے —

یہ اسرار معرفت اور وحدت الوجود کا صحیفہ هے - فاضل مولف نے

اِسے نظم میں بڑی خوبی سے ترجمہ کیا ہے - پہلے اصل سنسکرت شعر لکھا ہے اس کے نیچے اردو ترجمہ منظوم اور اس کے بعد شرح - معجز صاحب اردو کے قابل ادیب اور شاعر ہیں - اور چونکہ وہ ویدانت اور تصوف دونوں سے باخبر ہیں اس لیے ان کے ترجمے میں لفظی اور معنوی دونوں خوبیاں موجود ہیں - ایسی بلیغ کتابوں کے ترجمے کے لیے محض ادیب اور شاعر ہونا کافی نہیں - اس کے لیے اسرار معرفت سے بھی واقف ہونا ضروری ہے - اور یہی وجہ ہے کہ معجز صاحب کا ترجمہ اصل کے قریب پہنچ گیا ہے - تصوف کی اصطلاحات اور تصوف کی زبان کو جس خوبی کے ساتھ انھوں نے برتا ہے وہ بہت قابل تعریف ہے - آخر میں اُن تمام مسائل کی فہرست درج کردی ہے جو اس کتاب میں معرض بحث میں آئے ہیں اور جن جن اشعار میں یہ بحث آئی ہے ان کا نمبر بھی دیدیا ہے —

جو حضرت مسائل معرفت سے شوق رکھتے ہیں وہ اس کتاب کا ضرور مطالعہ فرمائیں —

موتی

(مرتبۂ جناب سید یوسف صاحب بخاری دہلوی - گلی امام جامع مسجد دہلی - صفحات ۱۴۲ ' قیمت بارہ آنے)

یہ حکیمانہ اور شاعرانہ اقوال کا مجموعہ ہے جو قابل مولف نے بڑی جستجو اور کاوش سے عربی ' فارسی ' انگریزی ' اردو اور ہندی کے ادبی ذخیروں سے چن چن کر نکالے ہیں اور مختلف علوان کے تحت جمع کیے ہیں - کل عنوانات ۱۱۸ ہیں اور ان میں سب کچھ آگیا ہے -

اکثر اقوال ترجمہ ہیں اور ترجمے میں زبان اور موزونیت کا حتی الامکان خیال رکھا گیا ہے - جو نہایت ضروری ہے ورنہ ان کا مقبول ہونا ممکن نہیں - شروع میں ایک مقدمہ ہے جس میں اقوال کے فلسفہ و ماہیت پر بحث کی گئی ہے - کتاب کی ابتدا میں جناب اختر انصاری کا تعارف اور جناب راشد الخیری اور خواجہ حسن نظامی کے تبصرے ہیں -

---

خیالات مہاتما گاندھی

(حصۂ اول و حصۂ دوم، صفحات ۲۴۸ و ۵۱۲، قیمت فی جلد
سوا روپیہ - ملنے کا پتا، رفعت یار خاں صاحب، چال نمبر
۴۲، ورلی، بمبئی (۱۸))

یہ مسٹر سی - ایف اینڈریوز کی انگریزی کتاب کا اردو ترجمہ ہے - مسٹر اینڈریوز سے بڑھ کر کوئی شخص مہاتما گاندھی کے خیالات کا ترجمان نہیں ہوسکتا - انہوں نے گاندھی جی کی تحریروں اور تقریروں کے ایک بہت بڑے انبار کو چھان پھٹک کر مختلف عنوانات کے تحت میں اُن کے خیالات، جذبات و معتقدات اور ان کے کارناموں کو ایسی خوبی اور صفائی سے بیان کیا کہ گاندھی جی کی زندگی اور اُن کے مقصد کے سمجھنے کے لیے ان کا مطالعہ لازم ہے - مسٹر اینڈریوز کی گاندھی جی سے عقیدت، اُن تمام معاملات اور کارناموں سے ذاتی واقفیت جن کا تعلق گاندھی جی کی زندگی سے ہے، ہندوستان کے حالات پر کامل عبور — یہ سب باتیں ایسی ہیں جن کی وجہ سے اس کتاب کی خوبی اور وقعت دوبالا ہوگئی ہے - اور حقیقت یہ ہے کہ مسٹر اینڈریوز سے بہتر کوئی دوسرا شخص اس کام

کو انجام نہیں دے سکتا تھا - ترجمہ بھی (جس کسی نے کیا ہے) بہت اچھا کیا ہے —

پیراک

(مولفۂ جناب سید اکبر علی صاحب ایم - اے ' ایل ٹی - پاتانالہ '
لکھنؤ - قیمت چار آنے)

یہ رسالہ فن شناوری پر ہے - کسی زمانے میں یہ فن شریف تھا اور شرفا تیر اندازی ' شہسواری کی طرح اسے بھی سیکھتے تھے - سید اکبر علی صاحب نے درحقیقت بڑا احسان کیا ہے کہ انھوں نے اس مختصر رسالے میں پیرا کے کی وہ گُر جو اساتذۂ فن کسی غیر کو نہیں بتاتے تھے ' تشریح اور تصویروں کے ساتھ الم نشرح کردیے ہیں - اس رسالے کے پڑھنے سے یہ معلوم ہوا کہ پیرا کی اور تیراکی میں فرق ہے - پیرنے میں ہاتھ اور پیر استعمال کرنے پڑتے ہیں لیکن تیرنے میں نہیں - غرض سید صاحب نے اس رسالے میں ہر قسم کی پیرائیاں اور تیرائیاں ' ان کی اصطلاحات اور ان کا عمل بہ تفصیل بیان کردیا ہے - اس فن کے سیکھنے کے لیے یہ رسالہ بہت کچھ رہنمائی کر سکتا ہے —

سمندر کا عجائب خانہ

(مولفۂ جناب سید محمد عسکری جعفری صاحب)

اس میں سمندر کی عجیب و غریب مخلوق کا حال نو ابواب میں

بیان کیا گیا ہے - یہ کتاب بچوں کے لئے لکھی گئی ہے - سطح زمین پر کی چیزیں تو آسانی سے نظر آجاتی ہیں لیکن سمندر کی تہ میں جو آبادی ہے وہ نظر سے اوجھل ہے - کتاب میں کہیں کہیں تصویریں بھی ہیں - کتاب دلچسپ ہے اور خاص کر لڑکے لڑکیوں کے لیے بہت موزوں ہے —

نفسیات مذہب

از مولوی سید وہاج الدین صاحب بی - اے ' بی ٹی - چھوٹی تقطیع
صفحات ۷۸ ' لکھائی چھپائی اچھی - قیمت آٹھ آنے -
شایع کردہ جامعۂ ملیہ دھلی -

مولوی سید وہاج الدین صاحب عثمانیہ کالج اورنگ آباد میں معاشیات کے استاد ہیں لیکن اپنے مفوضہ مضمون کے سوا ان کو نفسیات سے خاص شغف ہے - اس سے قبل اس مضمون پر ان کی مشہور کتاب نفسیات ترغیب اور چند مقالے شایع ہو چکے ہیں - مقالہ زیر تنقید بھی اسی موضوع پر ہے - یہ مقالہ اردو اکادمی جامعہ ملیہ کے ایک جلسہ میں فاضل مصنف نے پڑھا تھا —

مقالہ کے نام سے ظاہر ہے کہ اس کا موضوع کس قدر اہم اور نازک ہے - اس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ انسانی فطرت میں حاسۂ مذہبی کن کن شکلوں میں نمودار ہوتا ہے اور اس جذبے کا دوسرے جذبات سے کیا تعلق ہے - تاثرات ' جذبات اور وجدانات کا تعلق چونکہ انسانی نفس سے ہے جہاں یہ سب پرورش پاتے ہیں اس لئے مذہبی جذبے کو نفسیات کی روشنی میں دیکھنے سے اس کی اصل حقیقت معلوم ہو سکتی ہے - اس مقالے

میں مذہبی جذبے کو اسی روشنی میں دکھایا گیا ہے - ماحصل بحث کا یہ ہے کہ انسانی فطرت میں احساس مذہب اس قوت اور مضبوطی کے ساتھہ بسا ہوا ہے کہ وہ باوجود کوشش کے بھی فنا نہیں ہو سکتا - اسی لئے انسان کو اس کے تقاضے سے مفر نہیں - وہ ضرور ظاہر ہوتا ہے لیکن اپنے اظہار کی وہ جو شکل اختیار کرتا ہے اس کا انحصار طبیعی اور معاشرتی ماحول اور حالات پر ہے -

ان دقیق مسایل کو فاضل مقالہ نگار نے نہایت شگفتہ اور پاکیزہ زبان اور دلچسپ پیرایہ میں بیان کیا ہے - ان کے اسلوب بیان میں ایک دلکشی اور رعنائی ہے -

(چ)

راگ سکھشا

مصنفۂ خادم محی الدین صاحب - شایع کردۂ قوی کتب خانہ لاہور - قیمت مجلد ایک روپیہ آتھہ آنے طباعت و کتابت بہت اچھی اور دیدہ زیب - حجم تقریباً (۱۲۰) صفحات -

یہ کتاب قابل مصنف نے موسیقی کے ابتدائی طالب علموں کے لئے لکھی ہے - مصنف نے اِس کو پچاس اسباق میں تقسیم کیا ہے - ترتیب سے سلیقے کا اظہار ہوتا ہے - اسباق میں غیر ضروری تفصیل سے کام نہیں لیا ہے - لیکن جو کچھہ سمجھایا ہے' واضح کر کے تشریحوں کے ساتھہ سمجھایا ہے- جا بجا تصویروں اور اشکال سے تشریح کی گئی ہے - یہ کتاب صرف موسیقی کے طالب علموں ہی کے لئے نہیں بلکہ عوام کے لیے بھی جو موسیقی سے ذوق رکھتے ہوں بہت مفید ثابت ہوگی —

(ع - ا)

اُردو کے جدید رسالے

معلومات

(ماهانه ' اڈیٹر جناب عبدالوالی صاحب بی - اے '
لکھنؤ - سالانه چنده پانچ روپے)

همیں جس قدر " معلومات " کے بند هونے پر افسوس هوا تھا اس سے زیاده اس کے دوباره اجرا پر خوشی هوئی - اٹھاره برس کی مدت کچھ کم نهیں هوتی ' اس عرصے میں دنیا کچھ کی کچھ هوگئی هے - سیاسیات ' معاشیات ' طرز خیال ' علم و فن میں انقلاب عظیم پیدا هوگیا هے - ایسے انقلابی زمانے میں جب که همارے اخبار اور رسائل اپنی پرانی ڈفلی پر وهی پرانا راگ الاپ رهے هیں معلومات جیسے رسالے کی شدید ضرورت تھی- وه ملک میں حرکت اور دلوں میں سچا جوش پیدا کرنا چاهتا هے - وه رسم و رواج ' بے معنی تقلید ' فرسوده خیالات اور از کار رفته نظریوں کے جھاڑ جھنکاڑ کو صاف کر کے نئی راه عمل ' روشن خیالات اور زنده تحریکات پیش کرنے کا خواهاں هے - وه پرانے کھنڈروں کو مسمار کر کے جدید خوشنما عمارتیں تعمیر کرنا چاهتا هے - وه مرده اور مرده دلوں کا دشمن اور زندوں اور زنده دلوں کا ساتھی هے - معلومات اسم بامسمیٰ رساله هے - اس کا فاضل اڈیٹر اپنے ملک کے حالات اور دنیا کی تحریکات سے باخبر هے اور اپنے اهل وطن کو ان سے باخبر کرنے اور رکھنے کا آرزو مند هے -

وہ ناصح بے عمل نہیں ' اس نے اس اتھارہ برس کی مدت میں بہت کچھہ کھکھیڑ اتھای ھے ' آنکھیں بند کرکے غول کے ساتھہ نہیں رھا بلکہ جو کچھہ گزرا اُسے اس نے آنکھیں کھول کے دیکھا ' غور کرکے سمجھا اور بہت کچھہ حاصل کیا - اس مشاهدے اور تجربے اور مطالعہ کے نتائج وہ ھمارے سامنے پیش کررھا ھے - کون ھے جو ان کے قبول کرنے سے ابا کرے گا ؟ وہ اپنے خیال کے اظہار میں نہایت جری اور بے باک ھے - اس کے بیان میں جوش ' قوت اور سادگی ھے - اُس کے خیالات میں تازگی اور زندگی ھے - اس کے دل میں آگ ھے جو دوسروں کو گرمائے بغیر نہیں رہ سکتی - اس کی رایوں سے اختلاف ھو مگر اس کی صداقت اور خلوص میں شک نہیں ھوسکتا —

یہ بہت قابل قدر رسالہ ھے اور اردو زبان میں اپنی نوعیت کا ایک ھی ھے - ھماری خواھش ھے کہ یہ رسالہ ھر اردو پڑھے لکھے شخص کے ھاتھہ میں ھو - اس وقت کی ضرورت اسی کی مقتضی ھے - ھمیں امید ھے کہ ھماری یہ استدعا رائگاں نہیں جائے گی —

الناظر

(اڈیٹر مولوی ظفرالملک علوی صاحب - لکھنؤ - سالانہ چندہ دو روپے آتھہ آنے - ارزاں اڈیشن ایک روپیہ سالانہ)

رسالۂ الناظر کسی تعارف کا محتاج نہیں - چار سال بند رھا ' اب پھر اس کے سرگرم اور مستعد اڈیٹر نے دوبارہ جاری کیا ھے - اُسے دیکھہ کر یہ مطلق خیال نہیں ھوتا کہ کبھی بند بھی ھوا تھا - وھی صورت وھی تقطیع وھی لکھای اور چھپای ھے اور بالکل ویسے مضامین ھیں جیسے پہلے

چھپتے تھے - الناظر کے دوبارہ اجرا پر اس کے پرانے خریدار اور اس کے قدردان ضرور خوش ہوں گے اور اس کی ترقی اشاعت نیز اُسے کار آمد اور بہتر بنانے میں پوری پوری مدد دیں گے - الناظر اپنے پہلے دور میں زبان اور ادب کی قابل قدر خدمت کرچکا ہے اور توقع ہے کہ اب وہ زیادہ قوت اور استقلال کے ساتھ اس خدمت کوانجام دے گا جو چار سال کی خاموشی کی سب سے بہتر تلافی ہوگی -

---

ماہ تمام

(اڈیٹر محمد اسحاق صاحب - کلای سول اسٹریت کلکتہ
سالانہ قیمت چار روپے)

یہ ماہانہ رسالہ کلکتہ سے اسی سال شایع ہونا شروع ہوا ہے - مضامین اور نظمیں دلچسپ ہیں - مختصر فسانے بھی ہوتے ہیں - ایک آدہ تاریخی اور علمی مضمون بھی ہوتا ہے - کلکتہ سے ایسے رسالے کا جاری ہونا بہت غنیمت اور قابل قدر ہے - لکھای' چھپای کاغذ بہت اچھا ہے - جو رسالہ ہمارے پیش نظر ہے اس میں ایک رنگین تصویر بھی ہے - غالباً اس کا التزام کیا گیا ہے —

ایوان

(مدیر مجنوں گور کھپوری - ایوان اشاعت - گور کھپور - سالانہ چندہ چار روپے)

اس کا شمار اچھے رسالوں میں تھا لیکن کچھہ تو ناقدردانی کی وجہ سے اور کچھہ اڈیٹر کی صحت کی خرابی کے باعث اسے بند کرنا

پڑا - اب دو سال کے بعد قابل اڈیٹر نے همت کرکے پھر جاری کیا ھے اور اُسی آب و تاب سے شایع ہوا ھے - امید ھے کہ اس کے خریدار اور قدردان اس ناگوار تجربہ کے بعد اُسے بند نہ ہونے دیں گے —

کونین

(اڈیٹر عزیزالرحمن اصلاحی و محمد یحییٰ اعظمی - گورکھپور
سالانہ چندہ ڈیڑہ روپیہ)

یہ رسالہ بھی گورکھپور سے شایع ہوا ھے - مذہبی ادبی تعلیمی اور معاشیاتی مضامین ہوتے ہیں - تقطیع بڑی ھے اور ہر صفحے میں دو کالم ہیں - معاملات حاضرہ پر بھی بحث ہوتی ھے - اس قیمت میں بہت اچھا رسالہ ھے اور اشاعت و امداد کا مستحق —

قائد

(مالک و مدیر سید حبیب احمد صاحب افق کاظمی - خانقاہ
شیخیہ امروہہ - سالانہ چندہ عام خریداروں سے ایک روپیہ)

خوشی کی بات ھے کہ امروہہ سے بھی ایک رسالے کا اجرا ہوا ھے - یہ زیادہ تر مذہبی اور اخلاقی ھے - ایک روپیہ سال میں ہر مہینے ۳۲ صفحے کا رسالہ برا سودا نہیں - مذہبی و اخلاقی نیز اصلاحی مضامین کے شوقین ضرور اس کی قدر کریں گے —

البرق

(مدیر، محمد علی - پنجاب انجینیرنگ انسٹی ٹیوٹ
جالندھر شہر سالانہ چندہ تین روپے)

رسالے کا مقصد نام سے ظاہر ہے - یہ ایک انجینیرنگ انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے شایع ہوتا ہے جہاں بجلی کے کام کی تعلیم دی جاتی ہے - رسالے میں زیادہ تر مضامین زراعت اور حرفت و صنعت پر ہوتے ہیں - ایسے رسالوں کی ملک کو زیادہ ضرورت ہے - رسالہ سلیقے سے مرتب کیا جاتا ہے - دلچسپی کے لیے ایک آدہ ایسا مضمون بھی نظر آیا جو غیر متعلق ہونے کے علاوہ بے کیف بھی ہے - سائنس اور صنعت و حرفت کا میدان خود اس قدر وسیع ہے کہ اس میں طرح طرح کی دلچسپیاں پیدا ہو سکتی ہیں، بشرطیکہ لکھنے والا اپنے مضمون پر قادر ہو اور لکھنا بھی جانتا ہو -

---

شہاب

(اڈیٹر ارشد عظیم آبادی - مچھوا بازار اسٹریٹ - کلکتہ -
سالانہ چندہ ایک روپیہ چار آنے)

اس نام کا ایک رسالہ کئی مہینے ہوئے جوناگڑہ سے شایع ہو رہا ہے، دوسرا حیدرآباد دکن سے نکلتا ہے اب یہ تیسرا کلکتہ سے نکلا ہے - ایک ہی زبان میں ایک نام کے تین رسالے! یہ کچھہ اچھا معلوم نہیں ہوتا - شاعروں کو شکایت تھی کہ ڈھونڈے سے بھی تخلص نہیں ملتا لیکن اب معلوم ہوا کہ اڈیٹروں کو رسالے کا نام تلاش کرنے میں بھی مشکل آپڑی

ہے - کلکتہ سے حال میں ایک رسالہ "ماہ تمام" کے نام سے شایع ہوا ہے اور اس کے بعد ہی شہاب کا ظہور ہوا ہے - رسالہ دلچسپ ہے - شروع ہی میں شایق احمد صاحب عثمانی نے ایک مضمون "اردو پر رحم کرو" لکھا ہے - اس میں اردو ٹائپ پر بھی بحث کی ہے اور سچی بات لکھی ہے کہ نستعلیق ٹائپ کا خیال چھوڑ دو، نسخ کافی ہے، اس کو اختیار کرلو - کلکتہ سے اردو رسالوں کا جاری ہونا نیک فال ہے —

میزان الافکار

(مدیر فایق کرتپوری صاحب - رام سوامی کوارٹرز
کراچی سالانہ چندہ بارہ آنے)

یہ چھوٹی سی تقطیع کا رسالہ کراچی سے شایع ہوا ہے - اس کے نگران اصول افسر صدیقی امر وہی ہیں - چند غزلیں ہیں اور چند چھوٹے چھوٹے مضامین - افسوس ہے کہ سندھ کو جہاں مسلمانوں کی کثیر آبادی ہے ایک معقول رسالے کی بھی توفیق نہ ہوئی —

الموسی

(مدیر، مرزا سرفراز علی متعلم سال دوم : انٹرمیڈیٹ
سٹی کالج، حیدرآباد دکن - سالانہ چندہ عام خریداروں سے
چار روپے، طلباے حال سے دو روپیہ اور طلبۂ قدیم سے تین روپے)

سب سے پہلے اورنگ آباد کالج سے ایک رسالہ نورس نکلا جو کئی

سال سے برابر جاری ہے اس کے بعد کلیۂ جامعۂ عثمانیہ نے اس کی تقلید میں مجلہ عثمانیہ جاری کیا - جب ورنگل میں انٹرمیڈیٹ کالج قائم ہوا تو اس نے بھی اورنگ آباد کی تقلید کی - سب سے آخر انٹرمیڈیٹ سٹی کالج نے یہ سہ ماہی رسالہ جاری کیا ہے - اس کا نام موسی ندی کے نام پر رکھا گیا ہے جس کے قریب اس کالج کی عمارت واقع ہے - شروع میں سخلہائے گفتنی ہیں جنھیں بلا وجہ بہت طول دیا ہے - کچھ غزلیں اور نظمیں ہیں - ایک مزاحیہ مضمون ہے جو بہت گرا ہوا ہے - ٹالسٹائی کے ایک ڈرامے کا اردو ترجمہ ایک طالب علم نے کیا ہے اور اچھا کیا ہے - مجموعی حیثیت سے رسالہ بہت اچھا ہے اور سب سے اچھی بات یہ ہے کہ زیادہ تر مضمون نگار طلبہ ہیں - سرورق میں جدت کی گئی ہے اور سادگی میں حسن پیدا کیا گیا ہے ' جس سے ذوق صحیح کا پتا لگتا ہے - چھپا بھی اچھا ہے -

---

گہوارۂ ادب

(مدیر ابرار احمد ' انور شاہ خاں - الگزنڈرا ہای اسکول ' بھوپال - عام قیمت سالانہ ایک روپیہ چار آنے)

یہ رسالہ بھوپال کے ہائی اسکول کی طرف سے سال میں تین بار شائع ہوتا ہے - مضامین بہت مناسب اور معقول ہیں اور خاص کر طلبہ کے لیے موزوں - نظمیں اور فسانے بھی ہیں - آخر میں مدرسہ کی خبریں وغیرہ ہیں - خوشی کی بات ہے کہ بھوپال کے ایک ہای اسکول نے ایک ایسا اچھا رسالہ نکالا ہے - رسالہ باقاعدہ دو سال سے جاری ہے - لکھنے

والے زیادہ تر طلبہ اور مدرس ھیں - قیمت بھی بہت کم ھے حالانکہ ضخامت ۶۴ صفحے سے زائد ھوتی ھے - رسالہ مصور ھے —

زنانے رسالے

زیب النسا

اڈیٹر صغرا ھمایوں مرزا (حیدرآباد دکن) لاھور سے
شایع ھوتا ھے - سالانہ چندہ تین روپے)

یہ رسالہ بیگم شاہنواز کی سرپرستی اور صغرا ھمایوں مرزا صاحبہ حیدرآباد کی مشہور انشا پرداز کی اڈیٹری میں لاھور سے شائع ھوتا ھے - پہلا ورق تصویروں کا ھے - مضمون ھر قسم کے ھیں لیکن زیادہ تر عورتوں سے متعلق ھیں - پہلا مضمون بیگم شاہنواز صاحبہ کا " قرطاس ابیض اور خواتین ھند " پر ھے - باقی مضامین ھلکے پھلکے ھیں - چند نظمیں بھی ھیں جو بری نہیں - آخری حصے میں کشیدہ کاری کے چند نمونے ھیں اور سب سے مرغوب ورق وہ ھے جس میں اچھے اچھے کھانے پکانے کی ترکیبیں ھیں - سب سے آخری صفحے میں دنیا کی مختلف خبریں ھیں —

مستورات

(مدیرہ حبیب بلقیس بیگم - سول لائن کانپور - سالانہ
چندہ عام خریداروں سے تین روپیہ ، غیر مستطیع طلبہ و
طالبات سے ڈیرہ روپیہ)

یہ پندرہ روزہ رسالہ نواب فخر یار جنگ بہادر معتمد فنانس

حیدرآباد دکن کی سرپرستی میں شایع ہوتا ہے - یہ سرپرستی ایسی ہی بے جوڑ ہے جیسے حیدرآباد کی ایک خاتون کا لاہور کے ایک رسالہ کا اڈیٹر ہونا - لیکن اس رسالے کی یہ خصوصیت قابل قدر ہے کہ مضامین کارآمد ، دلچسپ اور رسالے کے مقصد کے موزوں ہیں اور بہت صاف ستھری زبان میں لکھے ہوتے ہیں - آخری صفحے پر کشیدہ کاری کے لیے بھی کوی نہ کوی نمونہ ہوتا ہے - ایک نمبر میں گھریلو دوائیں اور بچوں کے علاج کے ضروری نسخے بھی دئے ہیں - جو بہت ضروری اور مفید ہیں - کبھی کبھی کسی کھانے یا میٹھے کے پکانے کی ترکیب بھی درج ہوتی ہے —

رہبر نسواں

(اڈیٹر فاروقی بیگم - دہلی - سالانہ چندہ تین روپے)

یہ ماہانہ رسالہ بیگم آصف علی (بیرسٹر دہلی) کی سرپرستی میں شائع ہوتا ہے - پڑھی لکھی عورتوں کے لیے سب سے بہتر پرچہ ہے - مضمون بہت معقول اور مناسب اور پڑھنے کے قابل ہوتے ہیں - پہلا رسالہ جو ہمارے سامنے ہے اس میں ہر مضمون کسی نہ کسی قابل شخص کا لکھا ہوا ہے اور تمام مضامین ضروری اور مفید مباحث پر ہیں - پہلے دو صفحے تصویروں کے لیے وقف ہیں اور یہ سب مشہور عورتوں کی ہیں - رسالے کے اندر بھی بعض عورتوں کے فوٹو ہیں - خوان نعمت کا حصہ بہت ہی خوب ہے - نسوانی دنیا کی خبریں بھی ہیں اور آخری دو صفحوں پر کشیدہ کاری کے لیے نمونے دیے ہیں - عورتوں کے لیے یہ رسالہ بہت دلچسپ ، مفید اور قابل مطالعہ ہے —

تازۂ ترین اشاعت ! !　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　تازۂ ترین اشاعت !

کتاب الطبیعیات

جلد سوم

کتاب النور

برائے

انٹر میڈیٹ

(جامعہ عثمانیہ)

از

مولوی محمد نصیر احمد صاحب عثمانی ، ایم ، اے ، بی ایس - سی (علیگ)

معلم طبیعیات کلیہ جامعہ عثمانیہ

حیدر آباد دکن

عالیجناب مولوی محمد عبد الرحمن خان صاحب بی ایس - سی (لندن) اے آر ، سی ، ایس ، صدر کلیہ جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن ، اس کتاب کی نسبت فرماتے ہیں —

کتاب النور زبان اردو میں اپنے طرز کی ایک نئی کتاب ہے —

مولوی محمد نصیر احمد صاحب معلم طبیعیات کلیہ جامعہ عثمانیہ نے اس کتاب کی تیاری میں ہند کی جامعات کے امتحانات انٹر میڈیٹ سائنس کے نصابوں کا پورا لحاظ رکھا ہے اور بڑی محنت سے طلبہ کی دقتوں کو رفع کرنے کی کوشش کی ہے - مجھے اُمید قوی ہے کہ اس کتاب کو پڑھ کر مبتدی نہ صرف نور کے مسائل بخوبی سمجھ سکیں گے ، بلکہ ان کو اس مضمون سے متعلق مزید معلومات حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوگا - ۲۰۸ شکلیں ۳۳۷ صفحہ -

قیمت (تین روپے)

ملنے کا پتہ : — محمد سلیمان خان نمبر ۹۱۷ کلب روڈ ، چادر گھاٹ حیدر آباد دکن

دیگر تالیفات از مولوی محمد نصیر احمد صاحب عثمانی

(۱) کتاب الطبیعات - برائے انٹر میڈیٹ

جلد اول - کتاب الخصواص والحرکت ...... (زیر تیاری)

جلد دوم - کتاب الحرارت والصوت ...... (زیر تیاری)

جلد سوم - کتاب النور ...... قیمت تین روپے

جلد چہارم - کتاب المقناطیس والبرق ...... (زیر طبع)

عنقریب شایع هو جاے گی -

(۲) حرکت - برائے - بی - اے شائع کردہ دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن

(۳) افکار عصریہ - ترجمہ از انگریزی - اس کتاب میں مادہ ' برق ' روشنی ' مقناطیس ' اثیر وغیرہ کی ماهیت نہایت آسان پیرایہ اور سلیس زبان میں بیان کی گئی ہے دارالمصنفین اعظم گڈہ کی طرف سے شایع هورهی هے عنقریب شایع هوجاےگی

(زیر طبع)

(۴) حلقہ مسموم - سر آرتھر کانن ڈائل ' مشہور انگریزی افسانہ نویس کے ایک دلآویز علمی قصہ کا ترجمہ ' قابل دید - بار دوم ۱۲ آنے

(۵) وادی خوف - سرآرتھر کے ایک دوسرے ناول کا ترجمہ ' اس میں شرلاک هومز ' مشہور سراغ رساں کے کارنامے هیں ' قابل دید باردوم ایک روپیہ ۴ آنے

منظورہ تعلیمات سرکارعالی برائے مدارس وکتب خانہ جات

(۶) خاندانی آسیب - سرآرتھر کے ایک تیسرے ناول کا ترجمہ اس میں بھی شرلاک هومز کے کارنامے هیں - قابل دید ایک روپیہ ۴ آنے

(۷) دی پرابلم آف رورل آپلفٹ (انگریزی)

از محمد بشیر احمد ' آئی ' سی ' ایس - دیہاتی ترقی سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے بے نظیر کتاب ہے ...... دو روپیہ ۸ آنے

ملنے کا پتہ :- محمد سلیمان خان نمبر ۹۱۷ کلب روڈ ' چادر گھاٹ حیدرآباد دکن

اردو

جلد ۱۴	اکتوبر سنہ ۱۹۳۴ ع	حصہ ۵۶

انجمن ترقی اردو کا سہ ماہی رسالہ

اورنگ آباد (دکن)

اردو

فہرستِ مضامین

اردو اکتوبر سنہ ۱۹۲۴ع

خطبات گارساں دتاسی

(اٹھارھواں خطبہ)

مترجمہ

جناب ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب ڈی لٹ (پیرس)

ہندوستانی زبان، جس کے ذریعہ سے مسیحی خیالات اور مغربی تہذیب اہل ہند میں پھیل رہی ہے، برابر ترقی پر ہے - اس کی ادبیات میں روز بروز تنوع بڑھتا جارہا ہے- میں اس دعوے کی تائید میں ایم ایس ہاول کا خط یہاں نقل کرتا ہوں جو ممالک مغربی و شمالی کے ناظم تعلیمات ہیں —

" آپ نے اپنے خطبات میں جو خیال پیش کیا ہے کہ اردو کو ہندی پر فوقیت حاصل ہے، بحیثیت دفتری زبان ہونے کے اور بحیثیت معاشری ضروریات کے میں اس باب میں آپ سے بالکل متفق ہوں - بہ حیثیت ناظم تعلیمات اپنے فرائض کی بجا آوری کے سلسلے میں میں نے ہر ممکن موقع پر اردو کی توسیع و ترقی کے لیے حمایت کی ہے اس لیے کہ میں سمجھتا ہوں کہ اردو ہندوستان کی دوسری زبانوں کے مقابلے میں قومی زبان کہلانے کی مستحق ہے - اس سے میری مراد وہ زبان ہے جو ہر خاص و عام کی سمجھ میں آتی ہے - اس بات میں مسٹر کمسن، جو ممالک

مغربی و شمالی کے سررشتہ تعلیم کے سب سے اعلیٰ عہدہ دار ہیں
بڑی حد تک میرے ہم خیال ہیں - لیکن بد قسمتی سے ابتدائی
مدارس میں یہ طریقہ رائج ہوگیا ہے کہ اردو یا ہندی میں
سے کسی ایک کے ذریعہ سے تعلیم دی جاتی ہے - چونکہ اکثریت
ہندو طلبہ کی ہے اس لیے ہندی کا استعمال بڑھ رہا ہے - مسلمان
اور بعض ہندو جن کی مادری زبان اردو ہے' اردو کو ترجیح
دیتے ہیں* - میرے خیال میں اردو اور ہندی کی تفریق قومی
نقطۂ نظر سے سخت نقصان رساں ہے - یہ زیادہ بہتر ہوتا اگر
ہندو بچوں کو اردو سکھائی جاتی - بجائے اس کے کہ انہیں ایسی
"بولی' میں اظہار خیال کی مشق کرائی جائے جو بالآخر
ایک دن اردو کے آگے سر تسلیم خم کرے گی †" —

اردو اور ہندی کی اہمیت کے متعلق میں نے گزشتہ سال کے خطبے میں جو ذکر کیا تھا اسی پر مسٹر ہنری کارتر نے جو کئی سال تک میرے شاگرد رہ چکے ہیں' اور مسٹر برڈوڈ کے یورپ واپس آجانے کے بعد بمبئی کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی کی شاخ کے سکریٹری ہوگئے ہیں' مجھے

---

* ہندی اور اردو کے فرق کو واضح کرنے کے لیے میں "باغ و بہار" کے اس حصے کو پیش کرتا ہوں جس میں ایک مسلمان ایک ہندو کے ساتھ گفتگو کرتا دکھایا گیا ہے - مصنف نے اس گفتگو میں اس کا خیال رکھا ہے کہ مسلمان اردو بولے اور ہندو ہندی - اگرچہ ہندی اور اردو ایک زبان سے عبارت ہیں لیکن ان دونوں کا فرق نہایت بین طور پر نظر آتا ہے - اردو اور ہندی کا فرق ہمیں ان مکالموں میں بھی صاف نظر آتا ہے جو آزاد بخت کی سرگزشت میں بیان کیے گئے ہیں —

† اگرچہ میں خود اردو کا بہت بڑا حامی ہوں لیکن میرے خیال میں ہندی کو "بولی" کہنا مناسب نہیں معلوم ہوتا —

ایک خط لکھا ھے اور اس مسئلہ کو چھیڑا ھے - خط کے الفاظ یہ ھیں -

" اردو بہ نسبت ھندی کے زیادہ بولی جاتی ھے - اس میں ترقی اور نشوونما کی صلاحیت بھی زیادہ ھے - اس میں شک کی گنجائش نہیں کہ ایک دن آنے والا ھے جبکہ اردو سارے ھندوستان کی مشترک زبان بن جائے گی "

یہ سچ ھے کہ ھندوستانی کا ماضی ایسا زیادہ درخشاں نہیں لیکن اس کا مستقبل یقیناً شاندار ھے - نہر سوئز کی تعمیر سے وہ بحر روم کے کناروں تک پہنچ جائے گی - ھندوستانی ایشیا کے بعض ایسے حصوں میں بولی جاتی ھے جہاں کی وہ اصل زبان نہیں ھے - مثلاً برھما میں مونگ شالو (Mong shaw loo) جو مولمین کے رھنے والے ھیں اور نیویارک میں بہت عرصے تک رہ چکے ھیں اور وھاں سے طب کی اعلیٰ سند حاصل کی ھے ' ان سے پیرس میں میری ملاقات ھوئی تھی ' انھوں نے بھی یہ کہا کہ برھما میں ھندوستانی بولی جاتی ھے —

اس سال شہر روما میں پروپگنڈا کالج کے ایک طالب علم نے ھندوستانی نظم پڑھی - یہ طالب علم آگرہ کا رھنے والا ھے - ھر سال اکادمی السنہ کی طرف سے اسی قسم کا جلسہ بعثت مسیح کی تقریب میں ھوا کرتا ھے اور مختلف ممالک سے طلبہ موقع کی مناسبت سے اپنی اپنی زبانوں میں نظمیں پڑھا کرتے ھیں - حاضرین کو موسیقی سے بھی لطف اندوز کیا جاتا ھے * —

فاضل بیمز کلکتہ کے ایشیاٹک جرنل میں اسی موضوع پر برابر لکھہ

* Accademia poliglotta che gli alumni del collegio de Prop. Fide offrone a' Santi Re magi, Roma, 1868 p. 10

رہے ہیں کہ ہندوستانی زبان میں عربی اور فارسی عناصر کو بر قرار رکھا جاے - جو خیال موصوف نے "کوارٹرلی ریویو" میں پیش کیا تھا (نمبر ۲۳۴) اسی کو ان مضامین میں پھیلا کر پیش کیا جا رہا ہے - "کوارٹرلی ریویو" میں موصوف نے لکھا تھا کہ "اگر سرکاری طور پر ہندوستانی کو سارے ہندوستان کی زبان تسلیم کیا جاے تو یہ صرف اس وقت ممکن ہوگا کہ ہندوستانی کو فارسی سے بالکل جدا نہ کیا جاے - مسلمانوں میں جو لوگ تھوڑے بہت بھی تعلیم یافتہ ہیں وہ فارسی ضرور جانتے ہیں - اسی زبان کے توسط سے مجرد تصورات کی ان تک رسائی ہوتی ہے - نیز سیاست و حکمت و شاعری میں فارسی سے استفادہ کیا جاتا ہے - در اصل اردو زبان سواے اس کے کچھہ نہیں کہ وہ فارسی اور ہندی کا امتزاج ہے - مسٹر بیمز کا خیال ہے کہ اگر اردو لکھتے وقت سنسکرت یا ہندی یا عربی و فارسی کے ہم معنی لفظوں میں سے ایک چننا ہو تو آخرالذکر کو سب پر ترجیح دینی چاہئے - میرے خیال میں اس قسم کا انتخاب اہل ہند بہت عرصہ ہوا کر چکے اور وہ عربی فارسی الفاظ کو سنسکرت اور ہندی کے الفاظ پر ترجیح دے چکے ہیں - ہم اس مسئلہ پر یہاں بحث کرنا غیر ضروری سمجھتے ہیں - (ہندوستانی) اردو کو راے اور بلیے سب ہی استعمال کرتے ہیں - یہ خاص کر شہروں میں بولی جاتی ہے - ہمیں اس سے انکار نہیں کہ دیہات میں اور خاص کر وہاں کے ہندوؤں میں ہندی بولی جاتی ہے - پنڈتوں نے ہندی کی ادبی خدمت بھی کی ہے جس طرح پرانے زمانے میں بھاٹ لوگوں نے اس کی خدمت کی تھی - بابو ہری چندر اور دوسرے پر جوش ہندوؤں کی ہندی تصانیف نہایت اہمیت رکھتی ہیں - ہندوستان کے اہل علم و فضل اور یورپ کے مستشرقین

کو ان تصانیف کی اہمیت تسلیم کرنے میں مطلق پس و پیش نہ کرنا چاهئے - میں ذاتی طور پر ان تصانیف کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں لیکن میرے نزدیک ان تصانیف کے مقابلے میں ان مطبوعات کو زیادہ اہمیت حاصل ہے جن کے ذریعے اردو کی نشر و اشاعت کا کام ہو رہا ہے —

میں اس موقع پر پھر اس کا اعادہ کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ہندوستانی زبان میں کمال پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ فارسی اور عربی میں استعداد بہم پہنچائی جائے - اسی طرح فارسی جاننے کے لیے ہندوستانی جاننا بھی ضروری ہے * - یہ واقعہ ہے کہ فارسی زبان کے ادیبوں کی اچھی خاصی تعداد نے ہندوستان کی سر زمین میں اپنی تصانیف لکھیں - ان کی تحریروں پر ہندوستانی اثر ہونا لازمی تھا - ہندوستان کے مسلمانوں نے فارسی زبان کی تحصیل میں جو سر گرمی ظاہر کی ہے اس کا اظہار کہیں اور نہیں ہوتا - در اصل فارسی زبان مسلمانان ہند کی کلاسکی زبان ہے - انہوں نے اس زبان کی بہترین لغتیں تیار کیں جیسا کہ خود اہل ایران تسلیم کرتے ہیں - ڈاکٹر بلوخ مان نے بھی اپنی کتاب (Contributions to Persian Lexicography) میں اسی بات کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے - موصوف نے بتلایا ہے کہ ہندوستان کی مروجہ فارسی اور ایران کی خالص فارسی کے درمیان کیا فرق ہے - اس ضمن میں تلفظ، لب و لہجہ اور محاورات کے فرق کو نہایت خوبی کے ساتھ ظاہر کیا

---

* اس ضمن میں ڈاکٹر بلوخ مان جیسے فاضل کی راے ظاہر کرنا ضروری ہے - مجھے مسرت ہے کہ موصوف بھی میرے ہم خیال ہیں - آپ نے (Contributions to Persian Lexicography) میں لکھا ہے کہ " موسیو گارسان دتاسی کا یہ خیال بالکل درست ہے کہ فارسی زبان کے علماء کو ہندوستانی جاننا ضروری ہے " —

گیا ہے - فارسی کے "استعمال ہند" کے متعلق مفید معلومات جمع کردی گئی ہیں - موصوف کی راے ہے کہ " ہندوستان میں فارسی زبان جس طرح استعمال کی جاتی ہے اس سے واقفیت رکھنا نہ صرف ان لوگوں کے لیے ضروری ہے جو فارسی کی ان کتب کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں جو ہندوستان میں تصنیف ہوئیں یا طبع ہوئیں بلکہ ہندوستانی زبان سے دلچسپی رکھنے والوں کو بھی اس میں درک رکھنا چاہئے - ...... فارسی نے ہندوستان میں جو خصوصیات حاصل کی ہیں وہ قابل قبول ہیں اور ان خصوصیات نے ہندوستان میں جہاں تک راہ پائی ہے وہ بالکل صحیح تصور ہوں گی - عربی مثل کے مطابق " غلط عام ، صحیح اور فصیح " ہو جاتا ہے - اہل ہند نے فارسی کی جس قدر تصانیف لکھی ہیں ان سبھوں میں " استعمال ہند " صاف طور پر نظر آتا ہے - خود ابوالفضل کے ہاں آپ کو اس کی مثالیں ملیں گی - " استعمال ہند " میں ہمیں بعض ایسی لسانی خصوصیات بھی ملتی ہیں جو ایران میں اگلے وقتوں میں موجود ہوں گی اور جنہیں آج کل کے ایرانیوں نے متروک قرار دیدیا ہے - ان کی زبان نے جوں جوں ترقی کی ویسے ویسے انہوں نے بعض الفاظ و محاورات کو متروک قرار دیا * —

گزشتہ ماہ جولائی کی ۲۸ تاریخ کو " انجمن بنارس " کے جلسے میں

---

* یہ خصوصیات مختلف الفاظ کے استعمال میں نظر آتی ہیں - مثلاً واؤ اور " یاے مجہول " کو خفیف اور معروف طریقے سے ادا کرنا - بجاے " او اور اے ' کے " اُ " اور " اِی " - جلی حروف علت (Long vowels) کے بعد اسم کو ناک کے (nasal) لہجہ سے ادا کیا جاتا ہے حالانکہ اہل ایران کے ہاں یہ بات نہیں ملتی - تشدید اور فتح ثانی کا حذف حالانکہ اہل ایران کے ہاں ایسا نہیں ہوتا —

کوئنز کالج (Queens College) کے ایک پروفیسر نے اس موضوع پر تقریر کی کہ شمالی ہند میں جو ہندوستانی رائج ہے اس کو کس طرح ترقی دی جائے - انڈین میل کے نامہ نگار نے لکھا ہے کہ یہ موضوع بحث ہندوستان میں بہت مقبول ہے - (۲ ستمبر سنہ ۱۸۶۸ ع) - مقرر موصوف نے دوران تقریر میں یہ خیال ظاہر کیا کہ ہندی اور اردو کے ادب کو فروغ دینے کی صرف یہ صورت ہے کہ انگریزی سے ان میں تراجم کئے جائیں اور اسی طرح انگریزی زبان کے اعلیٰ خیالات و جذبات کو ہندی اور اردو میں منتقل کیا جاے - موصوف نے یہ بھی خیال ظاہر کیا کہ ہندی اور اردو دونوں اخلاقی جذبات سے محروم ہیں - ہمارے خیال میں یقیناً ان یورپین کتب کا ضرور ترجمہ ہونا چاہئے جو ترجمہ کے قابل ہیں- لیکن یہ کوشش بے سود ہے کہ مشرقی ادبیات کی روح کو تبدیل کردیا جائے اور اسے یورپین رنگ میں رنگ دیا جاے - یہ خیال میرے نزدیک نہ قابل عمل ہے اور نہ قابل قبول - میں پہلے بھی اس کی مخالفت میں اپنی راے پیش کرچکا ہوں —

بمبئی کی انجمن جغرافیہ کے سال کے آخری جلسہ میں مسٹر برجس نے اس امر کی اپیل کی کہ ہندو اور اسلامی ناموں کو لاطینی رسم خط میں ایک متعین قاعدے کے تحت لکھنا چاہئے - بابو شیو پرشاد نے بھی ، جن کی مسئلہ ہندی اردو کی راے سے میں اختلاف کرتا ہوں ، اسی قسم کا خیال ظاہر کیا - ہم بھی اس خیال کی پرزور تائید کرتے ہیں - یہ بہت اچھا ہو اگر اشخاص و مقامات کو بجاے مختلف طریقوں سے لکھنے کے ایک ہی طور پر لکھا جاے - بعض اوقات ہجے کا اس قدر فرق ہوتا ہے کہ ایک ہی شہر اور ایک ہی مقام کو دوسرا شہر اور دوسرا مقام سمجھا جاتا ہے —

ہندوستانی زبان کے امتحانات کی بدستور پابندی کی جارہی ہے - یہاں تک کہ مبلغین مسیحیت کو بھی امتحان دینا پڑتا ہے - سرکاری گزٹ میں ان کے نام برابر شائع ہوتے رہتے ہیں جنھوں نے ان امتحانات میں کامیابی حاصل کی - سر ایس نارتھ کوٹ نے یہ تحریک کی ہے کہ ان امتحانات میں اور زیادہ سختی برتی جاے - آپ کو معلوم ہے کہ ہندوستان میں جو انگریز حکومت سے تعلق رکھتے ہیں وہ ہندوستانی میں بلا تکلف گفتگو کرسکتے ہیں اور بعض اوقات تقاریب کے موقعوں پر تقریر بھی کرتے ہیں - چونکہ اہل ہند سے انھیں کی زبان میں گفتگو کرنا مفید ہے اس لئے اس کا التزام رکھا جاتا ہے - میں نے اپنے پچھلے خطبے میں ذکر کیا تھا کہ وائسراے بہادر نے آگرے میں تقریر کی تھی - اس سال بھی موصوف نے لکھنو کے دربار میں نہایت فصیح اردو میں حاضرین کو خطاب کیا - یہ دربار ماہ نومبر میں منعقد ہوا تھا - ہندوستانی اخبارات اس تقریر کے طرز اور اس کی سادگی کی تعریف میں متفق ہیں - وائسراے بہادر سر جان لارنس نے یہ تقریر تعلقہ داروں کے ایڈریس کے جواب میں کی تھی - یہ تقریر پوری کی پوری ہندوستانی اخبارات میں شائع ہوچکی ہے - موصوف نے اپنی تقریر کے دوران میں ان تعلقہ داروں کو خطاب کرتے ہوے جنھوں نے جدید سیاسی انتظامات کے تحت اپنی سندیں حاصل کی ہیں ' کہا کہ وہ اپنے ان بھائیوں کے ساتھ مہر و محبت کا برتاو کریں جن کی سندیں ضبط کرلی گئیں —

اجمیر میں دیسیوں کے ایک کالج کی افتتاحی رسم کے موقع پر کرنل کیٹنگ نے جو گورنر جنرل کے ایجنٹ ہیں ' ہندوستانی زبان میں تقریر کی جس کو حاضرین نے بہت پسند کیا - موصوف نے چے پور کے

صنعتی اسکول کے افتتاح کے وقت بھی هندوستانی میں تقریر کی اور ایک ادبی وعلمی انجمن قایم کی- اس انجمن طرف سے جے پور میں ایک مطبع قایم کیا جاے گا جس میں هندی اور انگریزی کی چھپائی هوا کرےگی اور وهاں سے ایک اخبار بھی جاری کیا جاے گا۔

سر ولیم میور نے اردو اور هندی کی ادبیات کو فروغ دینے کے متعلق چند اصول و قواعد مرتب کئے هیں - چنانچہ موصوف کی جانب سے اعلان هوا هے کہ هر سال بہترین مصنف ' مولف یا مترجم کو ایک ایک هزار روپے کے پانچ انعام دیے جایا کریں - طرز تحریر اور مضمون کی اخلاقی حیثیت کا بھی لحاظ رکھا جاے گا - موضوع کی کوئی قید نہیں ' چاهے ادبی هو یا سائنٹفک - مصنف یا مولف کے جملہ حقوق محفوظ رهیں گے اور حکومت اشاعت کی خاطر ان کتب کی اچھی خاصی تعداد خریدےگی (*) -

نواب رامپور نے هندوستانی کی اهمیت کو ملحوظ رکھتے هوے متعدد اسکول اپنی ریاست میں قایم کئے هیں جہاں هندوستانی کی تحصیل پر خاص زور دیا جاتا هے - اگرچہ اس حصۂ ملک میں تعلیم نسواں کے خلاف تعصبات موجود هیں لیکن باوجود اس کے نواب صاحب نیز امراے ریاست نے لڑکیوں کی تعلیم کے لئے متعدد مدارس قایم کیے هیں (‡) -

میں سید عبدالله کے اس خط کے مضمون کے ساتھ بالکل متفق هوں جو موصوف نے سر استفورڈ نارتھ کوٹ (Sir Stafford Northcote) کے نام لکھا تھا اور جس میں اس امر پر زور دیا تھا کہ آئندہ سے حکومت

(*) هوم ورڈ میل - ۵ اکتوبر سنہ ۱۸۶۸ ع —

(‡) اودھ اخبار - ۲۶ جولائی سنہ ۱۸۶۸ ع —

ہند سول سروس کے مقابلے کے امتحان میں ہندوستان کی بعض مروجہ اور زندہ زبانوں کو لازمی قرار دے - در اصل ان السنہ کو سنسکرت اور عربی کے مقابلے میں کہیں زیادہ اہمیت حاصل ہے اس واسطے کہ سنسکرت اور عربی کے ساتھہ اہل ہند کو ادبی اور علمی تعلق ہے لیکن اکثر امیدواران سول سروس کے لیے اس سے کوئی تعلق نہیں ہے - سید عبداللہ نے اپنے اس خط میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ سول سروس کے ہر امیدوار کے لیے یہ لازمی قرار دینا چاہئے کہ وہ ملکی زبان میں پوری دسترس حاصل کرے، شکستہ تحریر بآسانی پڑھ سکے اور اس زبان سے انگریزی میں اور انگریزی سے اس زبان میں بخوبی ترجمہ کرسکے - در اصل یہ تمام باتیں نہایت ضروری ہیں - چنانچہ نظماے ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہیلی بری کالج (Haileybury) کے طلبہ کے لیے انہیں لازمی قرار دیا تھا - سید عبداللہ کے شاگرد ایچ پامر نے بھی اپنے استاد کے خیالات سے اتفاق کیا ہے * - ثانی الذکر نے دیسی زبان کے حصول میں جو مہارت بہم پہنچائی ہے وہ اس بات کی ایک مثال ہے کہ ایک یورپین اگر چاہے تو السنۂ مشرقیہ میں کس درجہ تک کمال حاصل کر سکتا ہے -

حکومت کو اس جانب توجہ دلاتے رہنا مفید ہے - لیکن ہمارے خیال میں حکومت کو خود بخود پہلے سے اس بات کا خیال ہے کہ نوجوان سول سروس والوں کو ہندوستانی زبان کی تحصیل کے لیے آمادہ کرے اس واسطے کہ ہندوستانی ہی ملک کی مشترک زبان ہے اور جیسا کہ

---

* انڈین میل مورخہ ۲۳ جنوری سنہ ۱۸۶۸ ع میں پامر صاحب کا مضمون شائع ہوا ہے جس کا عنوان " السنۂ شرقیہ کا مطالعہ " ہے - سید عبداللہ کے خط کے بعد —

میں بارہا پہلے بتا چکا ہوں اہل ہند کا ایک بڑا اور اہم طبقہ اس کے ذریعے اظہار خیال کرتا ہے اور ملک کے طول و عرض میں اس کے بولنے اور سمجھنے والے ملتے ہیں - ان تمام امور کو مدنظر رکھتے ہوئے ان لوگوں کو جو حکومت کی خدمت انجام دے رہے ہیں اس زبان کا سیکھنا از بس ضروری ہے - مثلاً اگر کسی نوجوان عہدہ دار کا ایسے ضلع میں تقرر ہو جائے جہاں کی مقامی بولی سے وہ نا واقف ہے تو وہ هندوستانی کے ذریعے کام نکال سکتا ہے - اسی طرح سیاسی امور کے لیے هندوستانی اور فارسی کا جاننا لازمی ہے - (هوم ورڈ میل' مورخہ ۲۳ مئی سنہ ۱۸۹۸ ع) -

فوجی عہدہ داروں کے امتحانات کے لیے خاص نصابی کتب هندوستانی میں تیار کی گئی ہیں - یہ امتحان دو قسم کے ہیں - ایک اعلیٰ اور دوسرا تحتانی - ان امتحانات میں هندی اور اردو کو ایک دوسرے سے علحدہ تصور کیا جاتا ہے - میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ هندوستانی کا لفظ ان دونوں پر حاوی ہے - اگرچہ مدراس کی طرف هندوستانی سے مراد اردو لی جاتی ہے —

میرے گذشتہ سال کے خطبے کے بعد سے اب تک هندوستانی میں جو کتابیں شائع ہوئی ہیں ان سبھوں کے نام اس جگہ میں نہیں بیان کروں گا بلکہ صرف چند کے متعلق ذکر کروں گا —

ان میں ایک اہم کتاب "حیات افغانی" ہے - یہ افغان لوگوں کی تاریخ ہے - مصنف کا نام محمد حیات خاں ہے - چنانچہ مصنف اور کتاب کے نام میں مناسبت موجود ہے - یہ کتاب بڑی تقطیع پر شائع ہوئی ہے اور ۷۰۰ صفحات پر مشتمل ہے - اس میں نقشے بھی دیے گئے ہیں - یہ لاہور میں سنہ ۱۸۶۷ ع میں شائع ہوئی ہے - مسٹر ٹی ایچ تھارنٹن (Thornton)

نے ازراہ کرم مجھے اس کا ایک نسخہ بھیجا ہے - موصوف پنجاب گورنمنٹ کے سکرٹری ہیں - یہ تاریخ تین حصص پر مشتمل ہے - پہلے حصے میں افغانستان کی جغرافی خصوصیات بیان کی گئی ہیں - یہ ملک افغانوں کا وطن ہے جنھیں پٹھان اور پشتو بھی کہتے ہیں* - اس ملک کی قدیم اور جدید حدود اور آبادی کا حال بیان کیا گیا ہے - اس کے علاوہ کانوں، نہروں، درختوں اور جانوروں کا حال ہے - پھر مشہور شہروں کا بیان ہے جو اٹک سے لے کر ایران کی سرحد تک پھیلے ہوے ہیں - صنعت و حرفت، تجارت، تاجروں کے مختلف طبقوں، پیداوار ملکی، در آمد بر آمد اور آمد و رفت اور خبر رسانی کے راستوں کے متعلق بھی ذکر کیا گیا ہے - اس ضمن میں مصنف نے اس طرف توجہ دلائی ہے کہ افغانستان کی تجارت کو فروغ دینے کے لیے کیا تدابیر اختیار کرنی چاہئیں - دوسرے حصے میں افغانستان کی عام تاریخ ۲۵۰۰ سال قبل سے بیان کی گئی ہے مختلف زمانوں میں اس ملک کے جو جو نام رہے ان کا ذکر ہے - ہندو یونانی اور اسلامی خاندانوں کی حکومت اور ان کے عروج و زوال کی تفصیل بیان کی گئی ہے - اسلامی خاندانوں میں مصنف نے بنی امیہ، بنو عباس، سامانی، غزنوی، غوری، مغل، نادر شاہ اور امیران افغانستان کا حال بیان کیا ہے - پھر سکھوں اور انگریزوں کی مشرقی علاقوں کی فتوحات کا ذکر ہے - اس کے بعد مصنف نے ان سرحدی سرکش قبائل کا ذکر کیا ہے جو پنجاب کے مغربی علاقے میں آباد ہیں اور یہ بتایا ہے کہ ان کو قابو میں رکھنے کی بہترین تدابیر کیا ہیں - دوسرے حصے میں افغانستان کے مختلف قبائل کی تاریخ بیان کی گئی ہے - ان قبائل

---

* پشتو زبان کو کہتے ہیں نہ کہ افغانستان کے لوگوں کو - (مترجم)

زبان اور ان کے گروهوں کا هندوستان، ترکستان، مازندران اور دوسرے ممالک میں جاکر آباد هونے کے متعلق بھی مسالا فراهم کیا گیا هے - کتاب کے تیسرے حصے میں مصنف نے ضلع بلو کے متعلق تاریخی معلومات جمع کی هیں —

حال کے زمانے کی مشہور هندی تصانیف میں " بال رام کتھہ امرت " کا شمار هوتا هے - یہ گروهرداس کی نظم هے - گوپال چندر نے (جو بابو هری چندر کے والد هیں) اس نظم کو مکمل کرنے کے لئے خود بھی تصرفات کیے هیں - گوپال چندر کو اس زمانے کے هندی مصنفین کی صف اول میں جگہ دینی چاهئے - موصوف نے ستائیس سال کی عمر میں انتقال کیا اور اس کم عمری میں ۳۲ کتابیں تصنیف کیں - یہ سچ هے کہ موصوف نے تصنیف و تالیف کی ابتدا بارہ سال کی عمر سے کردی تھی - ان تصانیف و تالیفات میں چوبیس هندی میں هیں اور آٹھہ سنسکرت میں - موصوف نے والمکی کی پوری رامائن کا هندی کبت میں ترجمہ بھی کیا هے - آپ کے فرزند ارجمند بابو هری چندر ان تمام تصانیف کو شائع کرنے کا قصد رکھتے هیں - چنانچہ " بال رام کتھہ امرت " سے اس سلسلہ کی ابتدا کی گئی هے —

گذشتہ سال دهلی میں هندی موسیقی پر ایک کتاب شائع هوئی هے جس کا نام " رکمنی منگل " هے * - اس موضوع پر لاهور سے بھی

---

* ۸۰ صفحات پر مشتمل هے - بڑی تقطیع -

ایک کتاب شائع ہوئی ہے جس کا نام " سرگوئت " ہے † - بنارس سے شیو پرشاد نے " منتخبات ہندی " شائع کی ہے ‡ —

کلکتہ کی ایشیاٹک سوسائٹی کے ایک رکن مسٹر ایف ایس گروز (Growse) نے ایسٹ انڈیا کمپنی سے یہ درخواست کی تھی کہ ہندی کی جلیل القدر نظم " پرتھوی راج راسو " کو جو چند بارد‌ے کی لکھی ہوئی ہے ' سوسائٹی کی طرف سے شائع کرنے کا انتظام کیا جاے - اس شاعر کو راجپوتوں کا ہومر تصور کرنا چاہئے - اس تجویز کی پادری جیمز لانگ (James Long) نے تائید کی تھی - چنانچہ اب ایشیاٹک سوسائٹی نے اس کی اشاعت کے متعلق فیصلہ کر لیا ہے - اس نظم میں دہلی کے آخری ہندو راجہ پرتھوی راج کے حالات زندگی بیان کئے گئے ہیں - یہ نظم نہ صرف تاریخی بلکہ لسانیاتی حیثیت سے بہت اہمیت رکھتی ہے - اس کی زبان ہندی کی ایک خاص بولی ہے - مسٹر بیمز نے اس کی اشاعت کا کام اپنے ذمہ لیا ہے - موصوف آج کل انگلستان میں اس نظم کے دو قدیم نسخوں کا مقابلہ کر رہے ہیں جو لندن کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے کتب خانہ میں ہیں - میں نے بھی اپنے لندن کے دوران قیام میں ان نسخوں کو دیکھا تھا - بابو رجندر پرشاد متر نے بھی " پرتھوی راج

† سر گوئت سے مراد ہے " بھگوت گیتا کا عطر " - مسٹر بیمز کی بدولت بھگوت گیتا کا ایک باتصویر نسخہ مجھے دستیاب ہوگیا ہے - در اصل یہ نسخہ دسویں باب کے اردو ترجمہ پر مشتمل ہے - منشی جگناتھ نے اردو میں ترجمہ کیا ہے - (مطبوعہ لاہور ' ۱۲۴ صفحات - ہر صفحہ پر ۲۶ سطریں ہیں - سنہ طباعت ۱۴ - سنہ ۱۸۶۳ ع) -

(‡) اس کتاب کی (Trubner) کے اخبار " Literary Record " نے بہت تعریف کی ہے - نمبر ۳۹ - مسٹر آرپر کلز نے بھی اس قسم کی کتاب " منتخبات اردو " کے نام سے شائع کی ہے جو ۳۱۴ صفحات پر مشتمل ہے —

راسو " کے دو قلمی نسخے حاصل کئے ہیں جن کا مقابلہ کرکے موصوف بھی اس کی اشاعت کا سامان کر رہے ہیں - * - بہر حال اب امید بندھتی ہے کہ عنقریب اس کتاب کی اشاعت ہوگی اور اس کے ساتھ اس کا ترجمہ بھی شائع کیا جائے گا جس میں مشکل حصوں کی تشریح قابل اطمینان طریقے پر کی جائے گی —

اردو کتابیں جو مجھے وصول ہوئی ہیں یا جن کے متعلق میں نے اردو اخبارات میں پڑھا ہے' ان میں "مجموعۂ دلپسند" قابل ذکر ہے - یہ عشقیہ غزلیات کا مجموعہ ہے اور دہلی سے شائع ہوا ہے - اس کے علاوہ ایک اور غزلیات کا مجموعہ میری نظر سے گذرا جو ان ماہانہ مشاعروں میں پڑھی گئی تھیں جو بابو ہری چندر کے ہاں منعقد ہوا کرتے ہیں - یہ مشاعرے ان کی نقل ہیں جو دہلی آگرہ اور لکھنؤ کی اسلامی سلطنتوں کے زیر اہتمام ایک زمانے میں ہوا کرتے تھے - " مثنوی زہر عشق " اور " چراغ ہدایت " بھی قابل ذکر ہیں - اول الذکر با تصویر شائع ہوئی ہے - ثانی الذکر اخلاقی مضامین کا مجموعہ ہے جنہیں منشی محمد علی نے ترتیب دیا ہے - " جذب القلوب " فارسی کی ایک مشہور کتاب کا اردو

* بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کی " کارروائی ' نمبر ۷ ' (جولائی ' ۱۸۹۸) (Proceedings) میں تین نسخوں کا ذکر ہے - (۱) آگرہ کے کتب خانے کا نسخہ جو مہاراجہ جے پور کا عطیہ ہے - مسٹر بیمز نے بھی اسے استعمال کیا ہے - (۲) مہاراجہ بنارس کا نسخہ جو موصوف نے ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کو مستعار دیا ہے - (۳) راؤ بیدلہ کا نسخہ - ان کے علاوہ دو قلمی نسخے بابو رجندر لال متر کی ملک ہیں - ان دونوں نسخوں میں مذکورۂ بالا تینوں نسخوں سے اختلافات موجود ہیں —

ترجمہ ہے * "حسن و دل" بھی فارسی کا ترجمہ ہے جس میں تشبیہ و استعارہ کثرت سے استعمال کیا گیا ہے - "تواریخ جہان" میں آفرینش عالم کا حال ہے † ایک مسلمان ڈاکٹر نے "مخزن ادویہ" (Materia medica) لاہور سے شائع کی ہے - ‡ "تاریخ اضلاع" میں ممالک مغربی و شمالی کے اعداد و شمار ہیں - یہ کتاب لفٹنٹ گورنر بہادر کے حکم سے شائع ہوئی ہے —

مسٹر پیرسن (Pearson) نے جو حلقۂ راولپنڈی کے انسپکٹر تعلیمات ہیں اردو میں ایک تاریخ ہند لکھنا شروع کی ہے - موصوف ایک مسلمان فاضل سے بھی اس ضمن میں مدد لے رہے ہیں جو اپنے طرز تحریر اور انشا پردازی میں شہرت رکھتا ہے - اسی ضمن میں میں یہ بھی یہاں بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ بابو شیو پرشاد کی تاریخ ہند جو ہندی میں لکھی گئی تھی اور جس کا نام "اتہاس تمر ناسک" ہے اس کا اردو ایڈیشن بھی شائع ہوگیا ہے - اس کے علاوہ پیارے لال نے جو دہلی کے نارمل اسکول کے پرنسپل ہیں سرکاری طور پر اردو میں انگلستان کی تاریخ لکھنا شروع کی ہے - یہ تاریخ Students'theme کی وضع اور طرز پر ہوگی جسے کلکتہ یونیورسٹی کے نصاب میں شامل کرلیا گیا ہے —

---

* مسٹر بیمز کی بدولت اس کا ایک نسخہ مجھے مل گیا - جو لکھنؤ میں طبع ہوا ہے - بڑی تقطیع پر ۲۸۸ صفحات پر مشتمل ہے - ہر صفحہ پر ۳۲ سطریں ہیں - کتاب کا پورا نام "جذب القلوب الی دیار المحبوب" (یعنی مدینہ) ہے - اصل کتاب کے مصنف کا نام عبدالحق ہے - یہ کتاب سنہ ۱۵۹۲ ع میں لکھی گئی تھی - اس میں رسول خدا (صلی اللہ علیہ و سلم) کے مرقد مبارک اور مدینہ کے دوسرے مزارات اور عمارتوں کا تذکرہ ہے —

† مطبوعۂ دہلی - ۱۲۸ صفحات پر مشتمل ہے —

‡ ۵۱۸ صفحات پر مشتمل ہے —

یہ بات خلاف توقع ہے کہ مرهٹی زبان میں ملکۂ انگلستان کی کتاب " Leaves from a Journal of our life in the Highlands " کا ترجمہ بمبئی سے شائع ہوگیا پیشتر اس کے کہ هندوستانی میں اس کا ترجمہ ہو * - اس کتاب کی یورپ میں بھی خوب قدر افزائی ہوئی - اس کتاب کے مرهٹہ مترجم کو نہ صرف ترجمہ شائع کرنے کی اجازت مل گئی ہے بلکہ اصلی کتاب کی تصاویر کے بلاک بھی مل گئے ہیں - جن کی مدد سے ترجمہ میں بھی یہ تصاویر شائع ہوسکیں گی —

کپتان ڈبلوآر - ایم هالرائڈ (Holroyd) نے " رسوم هند " کا پہلا جزو ازراہ کرم مجھے بھیجا ہے - موصوف پنجاب کے نئے ناظم تعلیمات ہیں اور اپنے پیشروکی نسبت اردو کی نشر و اشاعت میں زیادہ جوش و سرگرمی کا اظہار کررهے ہیں - اس کتاب میں اهل هند کے مذاهب اور ان کے مختلف فرقوں کا اختصار سے حال بیان کیا گیا ہے - هندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے عقاید پر تبصرہ ہے اور بالخصوص شمالی هند کے باشندوں کی خانگی زندگی اور ان کے عادات و اخلاق پر روشنی ڈالی گئی ہے - " رسوم هند " کی تالیف و ترتیب کا کام لاہور میں سنہ ۱۸۶۴ ع میں شروع ہوا جب کہ سرکاری طور پر ایک کمیشن اس غرض کے لیے مقرر کیا گیا تھا کہ هندوستانی زبان میں اعلیٰ درجہ کی تصانیف تیار کرائی جائیں - اس کمیشن کے صدر سر ڈی مکلیوڈ (Mac Leod) تھے جو آج کل صوبۂ پنجاب کے لفٹنٹ گورنر ہیں † - " رسوم هند " کی زبان اور

---

* انڈین میل - ۴ نومبر سنہ ۱۸۶۸ ع —

† حکومت پنجاب نے فیصلہ کیا ہے کہ یہ کمیشن جن کتب کی تالیف کی سفارش کرے گا ان میں سے بیشتر لاہور میں طبع کی جائیں گی —

اس کا طرز تحریر سادہ ہے جتنا سادہ کسی مشرقی زبان میں ممکن ہے - اس کتاب کے مکالموں کی زبان اسی قسم کی ہے جو آج کل کے ناٹکوں میں استعمال کی جاتی ہے - اس کتاب کی تالیف میں کپتان ہالرائڈ کے ساتھ ایک ہندو شریک تھے جو نارمل اسکول کے اول درجہ کے مہتمم ہیں اور دوسرے دھلی کالج کے عربی کے ایک مسلمان پروفیسر نے بھی اس کام میں مدد دی - ان کے علاوہ اور دوسرے اہل علم دیسی لوگ بھی شریک تھے -

کپتان ہالرائڈ نے اعلان کیا ہے کہ ۳۱مارچ سنہ ۱۸۶۹ ع میں اردو تصانیف کا مقابلہ عمل میں آے گا - یہ کتب مقابلہ چار موضوعوں پر ہونی چاهئیں - (۱) عام اصول صرف ونحو (۲) فارسی صرف و نحو (۳) تاریخ ہند سے ماخوذ کہانیاں جن میں اہم واقعات اور اشخاص کے تفصیلی حالات بیان کئے جائیں جنھوں نے بڑے بڑے کام کئے ہیں - (۴) اقلیدس کے ایک حصے کا ترجمہ - ان کتب میں سے بہترین کو اول اور دوم انعام دئے جائیں گے - اعلان میں اس کی وضاحت کردی گئی ہے کہ نہایت سادہ زبان استعمال کی جاے اور حتی‌المقدور فارسی محاورات سے احتراز کیا جاے - ناظم تعلیمات کو یہ حق حاصل ہوگا کہ ان میں سے جو کتب پسند کی جائیں انھیں تغیر و تبدل کے ساتھہ طبع کراسکے * -

ابتدائی مدارس کے لئے مسٹر فیلن (Fallon) کی نصابی کتب قابل ذکر ہیں جن کا نام (Urdu School Readers) ہے - یہ کتب صوبۂ بہار کے لیے ہیں جہاں موصوف انسپکٹر تعلیمات ہیں - ان ریڈروں کی تیاری میں منشی سورج مل نے بہت محنت کی ہے - موصوف نے پٹنہ اور الہ آباد کے

* اس کی تفصیل «اخبار عالم» مورخہ ۱۳ اگست سنہ ۱۸۶۸ ع میں شائع ہوئی ہے - میں اپنی ضرورت کے موافق اختصار سے اس کا یہاں ذکر کرتا ہوں -

تعلیمات کے انسپکٹروں کی تحریک پر ایک کتاب "اردو آموز" بھی تیار کی ھے - ان ریڈروں کی طبع اول کے نمونے میرے پیش نظر ھیں - ان کی تیاری میں مشرقی طریقے کو مد نظر رکھا گیا ھے - چونکہ مشرقی طلبہ کو نری نثر پڑھنا ناگوار ھوتا ھے اس لئے ساتھہ ساتھہ نظمیں بھی ھیں جو طلبہ زبانی یاد کرتے ھیں - اگر کوئی نظریہ نثر میں بیان کیا گیا ھے تو اس کو ساتھہ ھی نظم کردیا گیا ھے تاکہ یاد کرنے میں آسانی ھو ــــ

مہاراجہ بنارس کا ارادہ ھے کہ انگریزی انسائیکلوپیڈیا کا اردو میں ترجمہ کرائیں - اس انسائیکلوپیڈیا کو انگلستان میں بڑی شہرت حاصل ھے - مہاراجہ بہادر اس کام کے لئے دس ہزار روپیہ تک صرف کرنے کو آمادہ ھیں بشرطیکہ انگریزی حکومت بھی اس قدر رقم دینے کے لئے تیار ھو - موصوف کا خیال ھے کہ اس کام کی تکمیل میں بیس ہزار روپے کی ضرورت ھوگی - مجھے اس کا علم نہیں کہ اس تجویز کا کیا حشر ھوا اور آیا اس کا کوئی عملی صورت میں اظہار ھوا یا نہیں ــــ

حکومت ھند کے سکریٹری کی جانب سے ایک با تصویر کتاب شایع کی جا رھی ھے جس میں ھندوستان کی مختلف نسلوں کے افراد کی تصاویر ھوں گی - اس کتاب کے متعلق اصل تجویز لارڈ کیننگ کے زمانے میں منظور ھوئی تھی - یہ کتاب آٹھہ جلدوں میں تقسیم اور ھر جلد بڑی تقطیع پر طبع ھوگی - ھر جلد ۶۰ء۴ تصاویر پر مشتمل ھوگی اور ھر تصویر کے ساتھہ اس کی تشریح ھوگی - اس کی پہلی اور دوسری جلد شائع ھو چکی ھے -

وائسرائے گورنر جنرل نے بنگال کے لیے یہ قانون نافذ کیا ھے کہ اس صوبے میں جتنے اخبارات اور کتابیں شائع ھوں ان کی رجسٹری ھونی چاھئے - چنانچہ پچھلے جولائی کے مہینے سے اس پر عمل شروع ھوگیا ھے -

ہماری خواہش ہے کہ یہ قانون ہندوستان کے دوسرے حصوں میں بھی نافذ کیا جائے - اس کی رو سے حکومت ہر مطبوعہ اخبار یا کتاب کے تین نسخے خریدے گی - (اودھ اخبار مورخہ ۲۸ مارچ سنہ ۱۸۹۸ ع) - ان میں سے ایک نسخہ لندن کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی کو بھیجا جائے گا - اس سوسائٹی کے کتب خانہ میں یہ جملہ مطبوعات دیکھنے کو مل جائیں گی اور امید ہے کہ سوسائٹی کے رسالے میں ان مطبوعات کے نام کم از کم شائع ہوتے رہیں گے -

اس سال امرتسر، لاهور، مرزا پور، بریلی اور لکھنؤ سے مسیحی مذهب کے متعلق اردو میں متعدد کتب شائع ہوئی ہیں - ان میں سے زیادہ تر وہ ہیں جو ویزلین (Weslian) اور میتھوڈسٹ (Methodist کلیساؤں کے نمائندوں کی جانب سے لکھوائی گئی ہیں بلا امتیاز اس کے کہ وہ پریزبائٹیرین (Presbyterian) ہیں یا Episcopal - ان کتابوں میں سے میں اس جگہ صرف تین کی نسبت ذکر کروں گا (۱) تفسیر انجیل مقدس - (۲) انجیل اور قرآن کے درمیان مقابلہ (۳) جنگ مقدس - آخر الذکر تصلیف جے بلینُن (Bunyon) کی " Holy War " کا اردو ترجمہ ہے جو مسز ولش نے کیا ہے - موصوفہ الہ آباد کے ریورنڈ جے ولش کی بیوی ہیں - یہ بلین (Bunyan) وہی ہے جس کی مشہور آفاق کتاب (Pilgrim's Prgress) کا رابنس کرو سو کی سر گذشت کی طرح دنیا کی سب زبانوں میں ترجمہ ہوچکا ہے -

اردو کی اور بعض دوسری تصانیف ہیں جنھیں ہم خالص مسیحی نہیں کہہ سکتے لیکن نیم مسیحی ضرور کہہ سکتے ہیں - ان میں وہ سب کتب شامل ہیں جو مسلمان علما نے انجیل کی تفسیر پر لکھی ہیں - یہ کتابیں اپنے رنگ میں اجتہادی رنگ رکھتی ہیں - چنانچہ سید احمد خاں

کی تفسیر انجیل اسی قسم کی کتاب ہے - اس کتاب کا دوسرا حصہ بھی مجھے مسٹر ایم ایس ہاول (Hcwell) کی عنایت سے پہنچ گیا ہے - میں موصوف کا نہایت شکر گذار ہوں - پڑھنے سے معلوم ہوا کہ پہلے حصے کی طرح یہ حصہ بھی نہایت دلچسپ معلومات پر محتوی ہے - اس حصے کے سرورق پر قرآن کی یہ آیت مندرج ہے : إنا انزلنا التوراة فیها هدی و نور یحکم بها النبیون الذین اسلموا للذین هادوا والربانیون والاحبار بما استحفظوا من کتاب الله و کانوا علیه شهداء فلا تخشوا الناس واخشون ولا تشتروا بآیتی ثمناً قلیلا(ط) ومن لم یحکم بما انزل الله فاولئک هم الکافرون - (سورۂ مائدہ آیت ۴۸) - اس حصے میں مصنف نے عہد نامۂ عتیق پر عام تمہیدی تبصرہ کیا ہے - اور ان کتب کا تجزیہ پیش کیا ہے جن پر وہ مشتمل ہے - اس تمہید میں تورات پر جو اعتراضات کیے جاتے ہیں ان کے جواب بھی دیے گئے ہیں - پھر باب " پیدائش " کے ابتدائی گیارہ ابواب کا اصل متن اور اردو ترجمہ ہے - اصل متن عبرانی زبان میں ہے - عبرانی کے نیچے بین السطور اردو ترجمہ ہے - عبرانی کے ہر لفظ کے نیچے اس کا ہم معنی اردو لفظ ہے - صفحے کے ایک کالم میں یہ متن اور ترجمہ ہے اور دوسرے میں ایسی قرآنی آیات واحادیث ہیں جن سے مطالب کی توضیح ہوتی ہے - مصنف نے اپنی تفسیر میں اپنے امتزاجی خیالات کو راہ دی ہے - سید احمد خاں نے عبرانی الفاظ اور محاوروں کی نہایت بہتر تفسیر لکھی ہے اور اپنے دعووں کی تائید میں بہت سے اقوال جمع کیے ہیں - موصوف نے انجیل کے لاطینی ترجمے، انگریزی ترجمے اور دوسرے ماخذوں سے استفادہ کیا ہے - پھر یہود ونصاریٰ کی مختلف تاویلوں پر بحث کی ہے - نصاریٰ میں بھی پروٹسٹنٹ اور کیتھولک توجیہات کے فرق کو واضح کیا ہے - اس کے ساتھ قرآنی نقطۂ

نظر کو ، مفسرین اور فقہا کے خیالات کے ساتھہ جو عامۃ المسلمین میں مقبول ہیں ، پیش کیا ھے - ان مباحث کے ضمن میں مصنف نے معقولیوں (Ratioralists) کے اعتراضات کے جواب دیے ہیں اور ساتھہ ہی اس کا بھی اہتمام کیا ھے کہ جہاں کہیں قرآنی آیات کے مطابق عقلی توجیہہ ہوسکے اس کو مرجح قرار دیا جاے —

یہ تصلیف اس اعتبار سے حد درجہ دلچسپ ھے کہ اس میں مشرقی اور مغربی علم و فضل کا امتزاج ھے - جگہ جگہ اشعار بھی درج کئے گئے ہیں جو نہایت موزوں اور با موقع معلوم ہوتے ہیں - مجھے افسوس ھے کہ چونکہ میرا موضوع اس وقت محدود ھے اس واسطے میں اس کتاب کے چند صفحات نمونتاً نہیں پیش کرسکتا - خصوصاً وہ عبارت جہاں طوفان نوح کے عالمگیر ہونے کے متعلق بحث کی ھے نہایت بصیرت افروز ھے - اس ضمن میں موصوف کے خیالات ، ڈاکٹر کولنسو (Colenso) کی تحقیق سے بالکل مختلف ہیں جن کا خیال ھے کی طوفان نوح عالمگیر تھا - سید احمد خاں کا خیال ھے کہ یہ طوفان صرف ایک خطۂ زمین تک محدود تھا - اس بحث میں موافقت اور مخالفت کے دلائل پیش کرنے کے بعد موصوف نے اپنے نتائج تحقیق کوسیامٹ پیٹر کے قول پر مبنی ٹھیرایا ھے جو اس کے پہلے خط سے نقل کیا گیا ھے - اس خط کے الفاظ یہ ہیں " ان لوگوں نے شبہہ کیا نوح کی نبوت پر پھر آخری مرتبہ انہیں مہلت دی گئی جب کہ کشتی بنائی گئی - اس کشتی میں صرف آتھہ آدمی *

---

* ان میں نوکر چاکر اور غلام شامل نہیں ہیں جو پالتو جانوروں کی دیکھہ بھال کے لئے مقرر ہوے تھے —

طوفان سے بچے " † -

لائق مصنف نے ان جملوں سے ثابت کیا ہے کہ طوفان سے صرف وہ لوگ تباہ ہوے جنھوں نے سرکشی کی تھی نہ کہ ساری دنیا - پھر مصنف نے قرانی آیات سے مزید استدلال پیش کیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ حضرت نوح اپنی قوم کی تلقین کے لئے نبی مقرر کئے گئے تھے - چونکہ قوم نے سرکشی اختیار کی اور ان کی نبوت کو جھٹلایا اس لئے اللہ جل شانہ نے ان پر طوفان کے ذریعہ عذاب نازل کیا - پھر اس کے علاوہ لائق مصنف نے بتایا ہے کہ حضرت نوح پورے عالم میں تلقین نہیں کرسکتے تھے - یہ بات سمجھہ میں آتی ہے کہ وہ ایک مخصوص قوم کی تعلیم و تلقین کے لئے مبعوث کئے گئے ہوں —

طوفان نوح کے متعلق اس کتاب میں ۴۹ صفحات وقف کئے گئے ہیں - ان کو پڑھنے سے آدمی نہیں اُکتاتا اور میری راے میں یہ صفحات اس کے مستحق ہیں کہ علم دوست اور مذہب سے دلچسپی رکھنے والے طبقے کی توجہ ان کی جانب مبذول کی جاے —

اس سال بعض نئے ہندوستانی اخبارات نے جنم لیا ہے -

(۱) " رتن پرکاش " مہینے میں دو مرتبہ شائع ہوتا ہے اور رتلام (بندھیلکھنڈ) سے گذشتہ مئی سے نکلنا شروع ہوا ہے - یہ اخبار اردو میں شائع ہوتا ہے اور ساتھہ ہی ہندی میں ترجمہ بھی ہوتا ہے - اس اخبار سے بعض اوقات " اودھ اخبار " اور " اخبار عالم " میں مضامین نقل کئے جاتے ہیں - " اخبار عالم " نے خاص کر اس کی ترتیب و ادارت کی بہت تعریف لکھی ہے —

---

† باب ۳- آیت ۱۹ ' ۲۰ —

(۲) " گیان پر دائنی پترکا " یہ ماہوار ہندی رسالہ ہے - گذشتہ مارچ سے نکلنا شروع ہوا ہے - مضامین دلچسپ ہوتے ہیں - ویدوں اور دوسری سنسکرت کتب کے تراجم اس میں درج ہوتے ہیں - فلسفیانہ ، علمی اور ادبی مضامین اور اہم خبریں شائع ہوتی ہیں - یہ رسالہ لاہور سے نکلتا ہے - بابو نبن چندر رائے اس کے مدیر ہیں - موصوف نے ہندی میں سنسکرت کی ایک صرف و نحو کی کتاب بھی لکھی ہے —

(۳) " اخبار سائنٹفک سوسائٹی ، علیگڈھ " - اس سال کے شروع سے یہ مہینے میں دو مرتبہ شائع ہوتا ہے - ہر صفحہ پر دو کالم ہوتے ہیں - سرورق پر یہ الفاظ لکھے ہوے ہیں - " جائز رکھنا چھاپے کی آزادی کا ہے کام ایک دانا سیاست کا اور برقرار رکھنا اس آزادی کا ہے کام ایک آزاد رعیت کا " —

بعض اوقات مضامین کے اردو متن کے ساتھ انگریزی ترجمہ بھی ہوتا ہے - ۱۲ مئی کی اشاعت میں اس سائنٹفک سوسائٹی کی سالانہ کار گزاری کی رپورٹ بھی درج ہے جو ۹ مئی کو منعقد ہوئی تھی - جن جن لوگوں نے اس موقعہ پر تقریریں کیں ان کی روداد بھی موجود ہے - مسٹر ہاول نے از راہ کرم یہ نمبر مجھے بھیجدیا ہے —

(۴ ، ۵) سنہ ۱۸۶۷ ع سے دو رسالے برابر شائع ہو رہے ہیں جن میں حکومت کے جملہ قوانین و احکام کا اردو ترجمہ شائع ہوتا ہے اور عدالت ہائے عالیہ کے فیصلوں کی نقل درج کی جاتی ہے - یہ دونوں لاہور سے شائع ہوتے ہیں اور دونوں کی ادارت ایک ہی شخص کے ہاتھ میں ہے - ایک کا نام " گنج شائگان " اور دوسرے کا نام " انوارالشمس " ہے —

" اودھ اخبار " اور " اخبار عالم " کے پڑھنے سے اردو کے بعض

جدید اخبارات کے متعلق مجھے علم ہوا جن کی نسبت پہلے میں بالکل نا واقف تھا - اُن کے نام یہ ہیں —

(۶) " طلسم حیرت " مدراس سے شائع ہوتا ہے -

(۷) امیر الاخبار - یہ بھی مدراس سے شائع ہوتا ہے -

(۸) اخبار سررشتۂ تعلیم اودھ -

(۹) اکمل الاخبار -

(۱۰) ضیاءالاخبار -

(۱۱) اخبار محتشم -

(۱۲) دھلی سے " دھلی نیوز " (Delhi News) انگریزی میں شائع ہوتا ہے -
اس اخبار کا علم مجھے بہادر شاہ بادشاہ کے مقدمہ کے سلسلے میں ہوا تھا - ممکن ہے کہ یہ کسی اردو اخبار کا انگریزی ترجمہ ہو جس کی اشاعت کا خاص کر چند انگریزی دانوں کے لئے مدیر نے اہتمام کیا ہو —

اب میں بعض مذہبی رسائل کی طرف آپ کی توجہ مبذول کراوں گا جو خود دیسی لوگوں کے زیر اہتمام شائع ہوتے ہیں —

(۱۳) حقایق عرفان - یہ مسیحی تبلیغ کا ماہوار رسالہ ہے جس کی ادارت کے فرائض عمادالدین انجام دیتے ہیں - یہ امرتسر سے شائع ہوتا ہے جہاں کا خود مدیر رہنے والا ہے - اس میں امرتسر کے مسلمانوں سے خطاب کیا جاتا ہے - پچھلی جنوری سے اس رسالہ کی اشاعت شروع ہوئی ہے - ہر اشاعت میں مسیحی مذہب اور حضرت مسیح کے متعلق مقالے ہوتے ہیں - لاہور کے مطبع " آفتاب پنجاب " میں یہ طبع ہوتا ہے —

(۱۴) مواعظ عقبیٰ - یہ سنہ ۱۸۶۷ ع سے دھلی سے شائع ہونا شروع ہوا ھے - اس کی ادارت دو نوعیسائی ھندووں کے ھاتھہ میں ھے —

(۱۵) مخزن مسیحی - یہ رسالہ ماھوار ھے اور لاطینی رسم خط میں پچھلی جولائی سے شائع ہوتا ھے - اس کے مدیر الہ آباد کے ریورنڈ جے جے والش ھیں - اس رسالہ کا خطاب ھندوستانی عیسائیوں کی طرف ھوتا ھے جنھیں یہ بہت سستے داموں دیا جاتا ھے - ہر اشاعت کی ویسے قیمت تین آنے ھے - اس کے مضامین نصیحت آموز اور ان کا معیار بلند ھوتا ھے - اب تک اس کے جتنے نمبر شائع ھوے ھیں وہ میرے پیش نظر ھیں - میرے خیال میں اس رسالے کے مضامین اھل یورپ کے لئے بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہے جاسکتے - اس کی زبان فصیح اور صاف اردو ھوتی ھے - ہر اشاعت میں مضامین کا تنوع ھوتا ھے - انگریزی طرز کی نظمیں ھوتی ھیں اور اھم مذھبی کتب کے تراجم بھی ھوتے ھیں —

ھندوستانی اخبارات کے مضامین کے معیار کے متعلق میں اس موقعہ پر زیادہ کچھہ نہیں کہنا چاھتا - دوسرے ممالک کے اخبارات کے خلاف ھندوستان کے اخبارات میں بارش اور موسم کے متعلق بہت زیادہ تحریر کیا جاتا ھے - اھل ھند کے نزدیک بارش کا موسم بہار کہلاتا ھے اور اس کی آمد کا انھیں بے چینی سے انتظار رھتا ھے چنانچہ "اخبار عالم" میں مہاراجہ بلرام پور کی ایک نظم میری نظر سے گذری جس میں خداے عزوجل سے خشک سالی کو دور کرنے کی جو ملک کو تباہ کئے دیتی ھے ' " اور اپنے رحم و کرم کی بارش " کرنے کی التجا اور دعا کی گئی ھے - اس اخبار کے مدیر کا بیان ھے کہ جناب باری میں

یہ دعا قبول ہوئی اور بارش فوراً شروع ہوگئی —

" اخبار عالم " مورخہ ۴ جون ۱۸۹۸ ع کی اشاعت میں میری نظر سے ایک بارہ کالم کا مضمون گذرا جس میں مہاراجہ بلرام پور کے شیر اور جنگلی ہاتھی کے شکار کی مفصل کیفیت بیان کی گئی ہے - اس مضمون کی زبان شاعرانہ استعاروں سے پر ہے جو مشرقی مذاق کے بالکل موافق ہے - بعد میں عاصی کی ایک غزل ہے جو ہمعصر شعراء میں خاص رتبہ رکھتے ہیں —

میں نے ابھی جس اخبار کا ذکر کیا اس میں بس اسی قسم کے مضامین نہیں ہوتے بلکہ دوسرے مفید مضامین بھی ہوتے ہیں - مثلاً سفر کے فوائد ایک مضمون میں بیان کئے گئے ہیں اور نہایت مفید مشورے دیے گئے ہیں - اس مضمون کے بعض حصے مثال کے طور پر میں پیش کرتا ہوں !

" ہندوستان کے ملک میں ایسے بہت کم امراء ملیں گے جو مفید مشاغل کی طرف رغبت رکھتے ہوں - بہت کم ان میں ایسے ہیں جو بلند نقطۂ نظر رکھتے ہیں اور علم و فضل میں جنھوں نے امتیاز حاصل کیا ہے یا جنھوں نے مدارس ' اسپتال ' سراے اور مساجد یا منادر کی بنا ڈالی ہو اور غریب غرباء کو خیرات دیتے ہوں - ایسی مثالیں اس طبقے میں نایاب ہیں جنھیں سفر سے دلچسپی ہو اور دوسرے ممالک کی سیر کا شوق ہو - اگر وہ خود اتنی صلاحیت نہیں رکھتے کہ یورپ جائیں تو کم از کم اتنا تو ضرور کرسکتے ہیں کہ اپنے اہل وطن کو بھجوائیں تاکہ وہ ممالک غیر کے عجائب دیکھیں

اور علمی اور تجارتی فوائد حاصل کریں - بیشتر مہاراجوں اور نوابوں کا دستور ہے کہ مہینوں وہ اپنے محلات کی چار دیواری سے باہر قدم نہیں رکھتے اور اپنی جاگیروں کے نظم و نسق کی انہیں مطلق پروا نہیں ہوتی - اگر وہ کچھہ عرصے کے لئے هندوستان سے باہر چلے بھی جائیں تو بھلا کسی کا کیا نقصان ہوگا ؟ اگر انہیں یہ خوف ہے کہ سفر میں محلات کا سا آرام نہیں ملے گا تو انہیں فارسی کے اس شعر کو یاد رکھنا چاهئے جو آج سات صدی سے زبان زد ہے

منعم بہ کوہ و دشت و بیابان غریب نیست
هر جا کہ رفت خیمہ زد و بارگاہ ساخت

اس زمانے میں اهل یورپ کے انتظام کی بدولت سفر میں بڑی سہولتیں ہوگئی ہیں - گھر کی سی آسائش پردیس میں حاصل ہوسکتی ہے - سڑکیں ہر طرف موجود ہیں - ہوٹلوں کی کمی نہیں - گوشے گوشے میں ڈاک خانے قائم کردیے گئے ہیں - ریلوں اور جہازوں کے ذریعہ ہزارہا میل کا سفر جلد اور سستے داموں طے ہوجاتا ہے - راستے ہر طرف محفوظ ہیں کسی قسم کا خطرہ نہیں ... "

" یورپ کے بادشاہوں میں یگانگت اس وجہ سے بھی قائم ہورہی ہے کہ انہیں ایک دوسرے سے ملاقات کرنے کا موقعہ ملتا ہے - چنانچہ یونان ، روس ، فرانس ، اٹلی اور ڈنمارک وغیرہ کے بادشاہ ایک دوسرے کی سلطنتوں میں جاتے ہیں اور حالات کا مشاہدہ کرتے ہیں - هندوستان میں اس کی مثالیں ناپید ہیں - ابھی حال میں صرف بیگم بھوپال حج کی غرض سے مکہ تشریف لے گئی تھیں اور چند ماہ

تک وہ اپنی ریاست سے دور رھیں - خشکی اور سمندر پر ہزار ھا میل کا سفر کر کے بیگم بھوپال نے یہ ثابت کردیا ھے کہ ھندوستان کے والیان ملک میں اتنا حوصلہ موجود نہیں جتنا کہ اس والیۂ ریاست میں ھے اس لیے کہ یہ لوگ تو اپنی جاگیروں کے باھر قدم رکھنا حرام سمجھتے ھیں - ایسے مردوں سے تو عورتیں ھی اچھی ھیں - .... " (*)

" اخبار عالم " کے مدیر وجاھت علی نے جو اس اخبار اور میرٹھ والے مطبع کے مالک بھی ھیں جس کا نام " دارالعلوم " ھے ' ایک اور دوسرا مطبع قایم کیا ھے جس کا نام " لٹریری پریس " (Literary Press) ھے - اس جدید مطبع میں ٹائپ استعمال کیا جاتا ھے - یہاں سے پندرہ روزہ رسالہ " جنرل اڈورٹائزر " (General Advertiser) شائع ھوتا ھے - اس رسالے میں انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں اشتہارات درج ھوتے ھیں - اس مطبع کا تعلق مکتبہ سے ھے جہاں مشرقی علوم کی کتب فروخت ھوتی ھیں - ان کتابوں کی فہرستیں " اخبارعالم " میں بھی کبھی کبھی شائع ھوتی رھتی ھیں —

" اودہ اخبار " میں ' جو اب دس سال سے نہایت کامیابی کے ساتھ چل رھا ھے ' بعض اوقات تصاویر اور اردو کی اعلیٰ پایہ کی غزلیں شایع ھوتی ھیں - غزلوں کے علاوہ مخمس اور قصیدے بھی ھوتے ھیں - حال

(*) ھمیں خبر ملی ھے کہ بیگم بھوپال جن کا اسم گرامی سکندر (جہاں بیگم) تھا ان کا ۳۰ ستمبر کو پچاس سال کی عمر میں انتقال ھو گیا - ھندوستانی اخبارات نے موصوفہ کے متعلق نہایت اعلیٰ خیالات کا اظہار کیا ھے —

میں فرحت کی ایک نظم شائع ہوئی تھی جس میں ہندوستان کے مناظر کا بیان تھا - موصوف آج کل کے اچھے انشاپردازوں میں شمار کئے جاتے ہیں - آپ نے "پریم ساگر" کا اردو ترجمہ بھی کیا ہے جو لکھنؤ میں طبع ہوا ہے - "اردو" اخبار کی ایک تازہ اشاعت میں علیگڑھ کی سائنٹفک سوسائٹی کے رسالے سے ایک مضمون نقل کیا گیا ہے جس کا موضوع ہندوستانی مصنفین اور ان کی تصانیف ہے * —

گوالیار کے ہندوستانی اخبار نے جو ہندی اور اردو دونوں میں نکلتا ہے (ایک کالم میں ہندی اور دوسرے میں اردو) اپنی ۱۴ جون کی اشاعت میں ان جشنوں کا تفصیل سے ذکر کیا ہے جو نہایت دھوم دھام کے ساتھ مہاراجہ سندھیا کے ولیعہد کی شادی کے سلسلے میں منائے گئے - یہ جشن اپنی آب و تاب کے اعتبار سے خاص مشرقی رنگ کے تھے - ہم ذیل میں چند سطور پیش کرتے ہیں :

"شادی خانہ آبادی کے ضمن میں دربار منعقد ہوا - زہرہ جبیں طوائفوں کا ناچ اور ان کے جسم کے حرکات و سکنات کو دیکھ کر فلک پیر کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں - آفتاب عالمتاب کے غروب ہونے سے تقریباً ایک گھنٹہ قبل دولھا محل شاہی سے رخصت ہو کر پوجا کی غرض سے روانہ ہو گئے '

(*) میں اس مضمون نگار کا شکرگزار ہوں کہ اس نے میری تصانیف کو اس قدر بڑھا چڑھا کر بیان کیا ہے - میرا اب تک کبھی موصوف سے تعارف نہیں کرایا گیا - مجھے افسوس کے ساتھ ایک غلطی کی جانب توجہ دلائی ہے - (۲۲ ستمبر سنہ ۱۸۶۸ ع کے پرچے میں صفحہ ۹۰۹ ' سطر ۲۳ ' پہلے کالم میں بجائے فارسی لفظ انگریزی چھپ گیا ہے جس کے باعث مضمون خبط ہو گیا ہے) —

ھاتھی پر سوار جس پر زرین جھولیں پڑی تھیں اور ھودہ بھی سونے کا تھا - پیچھے پیچھے ریاست کے اعلیٰ عہدہ داروں کی سواریاں تھیں - یہ عہدہ دار بھی ھاتھیوں پر سوار تھے - پھر سوار تھے جو نہایت زرق برق لباس زیب تن کئے ھوے تھے - اس کے بعد توپخانہ تھا اور اس کے پیچھے نیزہ برداروں اورعلمبرداروں کی قطاریں تھیں - جب کیمپ کے محل پر سواری پہنچی تو توپیں داغی گئیں جن کی آواز سے فضاے آسمانی گونج اٹھی - محل کے فرش و فروش اور ساز و سامان کی بوقلمونی سے زمین رشک نہم آسمان بنی ھوئی تھی - چراغوں اور مشعلوں کی روشنی سے محل بقعۂ نور بنا ھوا تھا - رقص و سرود نے اس محفل کو راجہ اندر کی سبھا بنا دیا تھا - مغربی رخ ایک چبوترے پر وشنو کا بت نصب تھا جس کے چاروں طرف شعلے نظر آتے تھے - اس چبوترے پر ایک طرف مہاراجہ سندھیا اور ان کے فرزند ارجمند کی نشست کے لئے الگ الگ دو ریشمی گاؤ تکیہ رکھے تھے - ولیعہد کے پہنچ جانے کے بعد مہاراجہ چنا راجا کی سواری آئی - ان کی آمد پر بھی توپیں سر کی گئیں - اس کے بعد پوجا شروع ھوئی جو جو وھاں موجود تھے انھیں عطر اور پان تقسیم کئے گئے - پھر آتشبازی کی باری آئی - ایسا معلوم ھوتا تھا کہ نہ صرف مخلوق شادماں ھے بلکہ کلیاں تک فرط انبساط میں کھلی جا رھی ھیں - انار اور مہتابی کی رونق کے آگے چاند تک شرما گیا -

بنارس کے بابو ھری چند اُن ھندو اربابِ علم و فضل میں سے ھیں جو ھندی ادب کی نشر و اشاعت کا کام نہایت تندھی کے ساتھہ انجام دے رھے ھیں -

موصوف ہندی کلام کو کتابی شکل میں شائع کر رہے ہیں اور کبھی کبھی منتخبات کی شکل میں جو تھوڑے تھوڑے عرصے کے بعد رسائل کی شکل میں شائع کی جاتی ہیں- ان رسائل کا نام " کوی بچن سدھا " رکھا گیا ہے- موصوف نے از راہ عنایت جو جو نمبر چھپتے جاتے ہیں میرے پاس بھیج دیے ہیں- اس مجموعے میں ایک نظم بعنوان " پریم رتن " میری نظر سے گذری- یہ نظم ایک ہندو دیوی رتن کنور کی لکھی ہوئی ہے- اور دوسری دلچسپ نظموں میں " دلی برنن " اور ایک " ہولی " شامل ہے- اول الذکر گلستان کی ایک حکایت سے ماخوذ ہے اور اسے ہندی جامہ پہنا دیا گیا ہے- اس کے علاوہ کبیر داس کی سکھیاں ہیں- شودروں کی زندگی اور موسم برشکال وغیرہ جیسے موضوعوں پر بھی نظم و نثر کے نمونے دیے گئے ہیں —

بابو صاحب کا ارادہ ہے کہ سنسکرت کے مشہور مشہور ناٹکوں کو ہندی زبان میں منتقل کریں- اس کام میں پنڈت سیتل پرشاد بھی ان کی مدد کرنے کو آمادہ ہیں- موصوف " سدھانت سنگرھا " کے مترجم ہیں- یہ کتاب (Synopsis of Science) کا ہندی ترجمہ ہے جو فٹز ایڈورڈ ہال کی مدد سے پایۂ تکمیل کو پہنچا- اس ترجمہ کی غایت یہ بتلائی گئی ہے کہ اس کے ذریعہ سے مشرقی اور مغربی سائنس میں امتزاج پیدا کیا جائے —

بابو صاحب نے " کوی بچن سدھا " کی ایک اشاعت میں اظہار تاسف کیا ہے کہ " جانکی منگل " کا ناٹک ختم ہوگیا * اگرچہ اس کے تماشے کا

---

* جانکی سیتاجی کا نام ہے اس لیے کہ راجہ جانک نے ان کی پرورش کی تھی اور اپنی بیٹی بنایا تھا- مذکورہ ناٹک تلسی داس کی تصنیف ہے- سنہ ۱۸۶۳ ع میں میرٹھ میں طبع ہوا- پھر سنہ ۱۸۶۵ ع میں آگرہ میں اس کا دوسرا ایڈیشن اور سنہ ۱۸۶۷ ع میں لاہور میں تیسرا

(باقی بر صفحہ آئندہ)

اعلان ہو چکا تھا یہ تماشہ تمام تر دیسی لوگوں کے اہتمام سے منعقد ہوا - پہلا تماشہ ۴ اپریل کو بنارس میں ہوا تھا اور مہاراجہ بنارس' جو ایک نہایت روشن خیال اور تہذیب و ادب کے قدردان ہیں' اس کے مربی تھے - موصوف ہندی ادب کی ترقی کے لیے بھی کوشاں ہیں - پہلے تماشے میں مہاراجہ اور ان کے فرزند ارجمند کے علاوہ ان کی ریاست کے اعلیٰ عہدہ دار و امراء' بنارس کے ہندوستانی اور یورپین باشندے جنھیں خاص طور پر مہاراجہ کی طرف سے مدعو کیا گیا تھا' موجود تھے - چند مستورات نے بھی تماشہ دیکھنے کی غرض سے شرکت کی - تماشہ شروع ہونے سے قبل اور بیچ کے وقفوں میں قومی گیت آرچسترا (Orchestra) پر بجائے گئے - "سترد ھار" (Director) پہلے اسٹیج پر آئے اور اپنی تمہیدی تقریر پڑھی (انڈین میل' مورخہ ۷ مئی سنہ ۱۸۶۸ع) - پھر اس کے بعد ایک عورت اسٹیج پر آئی اور ڈایرکٹر سے گفتگو کرنے لگی - یہ گفتگو سامعین کی توجہ مرکوز کرنے کے لیے کی گئی تھی - یہی طریقہ سنسکرت کے ناٹکوں میں بھی رائج تھا - اسی اثنا میں پردے کے پیچھے کچھ شور سا سنائی دیا اور ڈایرکٹر یہ کہہ کر رخصت ہوا کہ رام چندر جی آے - پردہ اٹھا تو رام چندر جی ایک جنگل میں دکھائی دیے - اب گویا اصل ناٹک شروع ہو گیا —

پہلے ایکٹ میں ایک باغ دکھایا گیا جس میں پاربتی جی بیٹھی

(از صفحۂ گذشتہ)

ایڈیشن نکلا - ہمارے خیال میں یہ ناٹک "ہنومان ناٹک" یا "مہی ناٹک" کے پہلے سین پر مبنی ہے جس کے متعلق ایچ ایچ ولسن نے اپنی کتاب "ہندؤں کے ناٹکوں کے منتخبات" میں ذکر کیا ہے - دیکھو جلد ۳ - صفحہ ۴۹ - راگ ساگر میں ہندی ترجمہ کے نسبت بھی ذکر ہے —

ہوئی ہیں- پاربتی جی شیوجی کی بیوی ہیں جس طرح شیوجی تخریب عالم کے دیوتا ہیں اسی طرح ان کی بیوی بھی تخریب عالم کی دیوی ہیں جنھیں درگا بھی کہتے ہیں- پھر رام اور ان کے بھائی لکشمن نے منظر پر آکر سیتا جی کے دیکھنے کی خواہش ظاہر کی اور قریب جو باغبان کھڑا ہوا تھا اس سے پھول توڑنے کی اجازت مانگی- اسی اثناء میں سیتا جی آگئیں- ان کے ساتھ ان کی سہیلیاں تھیں- سیتا جی نے دیوی جی کو سلام کیا اور باغ میں ٹہلنے لگیں- ایک سہیلی سیتا جی کے پاس دوڑی ہوئی آئی اور کہا کہ میں نے ابھی اس باغ میں ایک نوجوان کو دیکھا ہے جس کے حسن جہاں افروز نے اپنی طرف مجھے محو کرلیا تھا- نوجوان بھی اتنے میں آموجود ہوا اور سیتا جی کے حسن کا جادو اس پر چل گیا- دوسرے اور آخری ایکٹ میں ایک کمرہ کے اندر جو شاہی طریقہ پر آراستہ تھا راجہ جنک سیتا جی کے پتا بیٹھے ہوے تھے- مختلف ممالک کے شہزادے اپنے رنگ برنگ کے لباس میں ملبوس سیتا کی خواہش میں سامنے سے گذر رہے تھے- رام سب سے آخر میں منظر پر آئے- جب سب شہزادے بیٹھ گئے تو راجہ جنک نے خواہش ظاہر کی کہ ہر ایک اس کمان کو جھکانے کی کوشش کرے جو کمرے کے اندر رکھی ہوئی تھی- اس نے کہا کہ میں نے عہد کیا ہے کہ جو کوئی اس کام کو انجام دے گا سیتا اسی کی ہو جائے گی- سب شہزادوں نے کوشش کی لیکن سوائے رام کے کوئی بھی اس کمان کو جھکا نہیں سکا- رام نے نہ صرف اس کو جھکا دیا بلکہ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کردیے- چنانچہ سیتا جی رام کو مل گئیں —

مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس سال ان احباب کی تعداد بہت زیادہ ہے جنھوں نے ہمیں ہمیشہ کے لیے داغ مفارقت دیا

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موت نے چن چن کر انہیں ہم میں سے اٹھا لیا جن کی ہمیں سخت ضرورت تھی - گذشتہ سال ۲۵ نومبر کو گوکل داس تیج پال نے جو ایک نہایت معزز بھاٹیا خاندان کے چشم و چراغ تھے ' جہان فانی کو خیرباد کہا - آپ نے اپنے ہم وطن لوگوں کی تعلیمی ترقی میں خاص سر گرمی کا ثبوت دیا تھا - آپ کے نام پر آج تک لڑکوں کا ایک مدرسہ بطور یادگار موجود ہے - آپ نے تعلیم اور دوسرے کاموں میں کئی لاکھ سے زائد رقم اپنے پاس سے صرف کی - غریب غربا کے لیے آپ نے ایک اسپتال بھی قایم کیا تھا - بمبئی کے اردو اخبار " راست گفتار " میں یہ اعلان شائع ہوا تھا کہ موصوف نے مرتے وقت وصیت میں اپنی کل ملک کا تیسرا حصہ ترقیء تعلیم کے لیے وقف کر دیا ہے - چنانچہ یہ ثلث دس لاکھ روپے کے مساوی ہے * —

پچھلے سال ۳۰ نومبر کو میر سید محمد خاں بہادر نے لکھنؤ میں داعیء اجل کو لبیک کہا - موصوف سید عبداللہ کے والد تھے جن کی نسبت میں اپنے خطبات میں متعدد مرتبہ ذکر کر چکا ہوں - موصوف سنہ ۱۸۱۵ ع سے ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت میں تھے - سنہ ۱۸۲۰ ع میں آپ دکن میں نائب مجسٹریٹ و کلکٹر مقرر کیے گئے اور سنہ ۱۸۳۵ ع میں آپ کا تبادلہ جبلپور بہ حیثیت مجسٹریٹ و کلکٹر ہو گیا - موصوف نے اس خدمت کے فرائض نہایت خوبی کے ساتھ سر انجام دیے - آپ اپنے ہر کام کو نہایت قابلیت اور جوش کے ساتھ کیا کرتے تھے - اور دوسرے مسلمانوں کے خلاف ' جو مذہبی تعصب اور غلو کے باعث مغربی تعلیم کو حرام تصور کرتے ہیں ' آپ نے تمام تعصبات کو بالکل ترک کردیا تھا - اگرچہ

* ٹائمز آف انڈیا (انڈین میل ۲ جنوری سنہ ۱۸۶۸ ع) —

آپ سید اور پابند شرع مسلمان تھے لیکن باوجود اس کے آپ نے اپنے فرزند کو سنہ ۱۸۳۹ ع میں جبلپور کالج میں شریک کیا - یہ کالج کلیۃً انگریزی حکومت کے زیر انتظام تھا - آپ کے صاحبزادہ سید عبداللہ پہلے مسلمان ھیں جنھوں نے اس کالج میں انگریزی تعلیم حاصل کی —

سنہ ۱۸۵۷ ع کی شورش عظیم کے موقعہ پر سید محمد نے برطانوی حکومت کے ساتھہ اپنی وفاداری قائم رکھی - جس وقت جبلپور کے یورپین باشندے ہر طرف سے گھر گئے تھے اور خود ہندوستانی اس پس و پیش میں تھے کہ کیا کیا جائے ' سید محمد نہایت استقلال کے ساتھہ اپنی وفاداری پر قایم رھے - چنانچہ شورش کے بعد حکومت نے موصوف کی خدمات کا اعتراف کیا - بہادر کا خطاب عطا کیا اور خاطر خواہ پنشن دی لیکن افسوس ھے کہ موصوف بہت زیادہ دنوں تک اس پنشن سے فائدہ نہ اتھا سکے * —

میرے نوجوان دوست ایچ پامر جو ایک نہایت ھوشیار ماھر زبان ہندوستانی ھیں ' آج کل قاھرہ کے قدیم قلمی نسخوں کی چھان بین میں مصروف ھیں - موصوف بھی اس تحقیقاتی کمیشن کے ساتھہ ھوگئے ھیں جو کوہ سینا کی باقیات کے متعلق تفتیش کر رھا ھے اور اس علاقہ کی پیمائش میں مصروف ھے - پامر صاحب نے میر سید محمد خاں بہادر کی موت پر جن کے وہ نہایت محبوب شاگرد ھیں ' عربی زبان میں ایک مرثیہ لکھا ھے —

اس سال ۲۴ جنوری کو مستشرقین کے سردار ڈاکٹر جے ڈی میکبرائڈ

---

* ٹائمز - ۱۰ جنوری سنہ ۱۸۶۸ ع ؛ انڈین میل - ۲۳ جنوری سنہ ۱۸۶۸ ع —

نے نوے سال کی عمر میں جہان فانی کو الوداع کہا - موصوف آکسفورڈ یونیورسٹی میں عربی زبان کے پروفیسر تھے - اگرچہ موصوف نے عربی زبان میں خاص طور پر اپنی تحقیق کو محدود رکھا تھا لیکن آپ هندوستانی سے بالکل نابلد نہیں تھے - موصوف کی آخری تصنیف مذهب اسلام پر ایک محققانہ کتاب ہے - اس میں اسلام کی ترقی پر نہایت بصیرت افروز بحثیں ہیں اور اسلامی عقائد کو بدلائل باطل قرار دیا ہے † -

موصوف هماری پیرس کی " ایشیاٹک سوسائٹی " کے سب سے قدیم اعزازی رکن تھے اور اس کے سب سے پہلے صدر سلوستردے ساسی سے موصوف کے خاص تعلقات تھے - آخرالذکر وهی صاحب هیں جن کی بدولت اس کالج میں هندوستانی کی چیر (Chair) قائم هوئی - اب ڈاکٹر جے ڈی میکبرائڈ بھی سلوستردے ساسی آنجہانی سے عالم بالا پر جاکر مل گئے ' " یہ وہ عالم ہے جہاں فراق کا گذر نہیں - نیک بندے وهاں ابدی محبت میں ایک دوسرے کے ساتھہ شریک هوتے هیں - عقیدہ کی بدولت دنیاے فانی سے جانے والے اس عالم بالا پر پہنچتے هیں " ‡

بابو رام گوپال گھوش کے مرنے سے هندو جماعت کا ایک نہایت روشن خیال فرد اُٹھہ گیا - آپ کا کلکتہ میں گذشتہ ۲۵ جون کو ۵۳ سال کی عمر میں انتقال هوا - آپ " مجلس تعلیمی " کے سنہ ۱۸۵۵ ع

---

† " The Mohamedan Religion explained with an introductory sketch of its progress and suggestions for its refutations "

‡ عالم بالا میں جدائی کا وجود نہیں - وهاں محبت کی ابدی زندگی حاصل هوتی ہے جو خیر محض پر مبنی هوتی ہے - عقیدہ میں یہ قوت ہے کہ وہ دنیا میں مرنے والوں کو عالم پاک تک لے جاے " - مونٹگمری —

*

تک برابر رکن رہے جب کہ خود یہ کونسل ختم ہوگئی * - موصوف متعدد اخبارات کے مدیر تھے اور آپ نے بہت سی ادبی انجمنوں کی اپنی زندگی میں بنا ڈالی - ایک مدرسہ اور ایک کتب خانہ تونتونیا میں قایم کیا - آپ کو عمر بھر تعلیمی مشاغل سے خاص لگاو رہا - آپ کا دستور تھا کہ ہر سال کلکتہ کے مختلف مدارس کے ان طلباء کو جنھوں نے امتحان میں امتیاز حاصل کیا ' مارشمن کی " تاریخ ہند " کے سو نسخے تقسیم کیا کرتے تھے - یہ اس وقت کا ذکر ہے جب کہ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا تھا † -

گذشتہ سال میسور کے آخری راجہ کے فرزند کا انتقال ہوگیا - یہ آخری راجہ مہاراجہ کرشن راج دیو بہادر برائے نام راجہ تھے - اس لئے کہ حیدر علی نے ' جو ایک مشہور مسلمان فاتح گذرا ہے ' ملک پر قبضہ کرلیا تھا اور اس کی حکومت چلتی تھی - سنہ ۱۷۹۹ ع میں جب انگریزوں نے ٹیپو سلطان کو شکست دے کر اپنی عملداری قایم کی تو مہاراجہ کے بیٹے کو برسر اقتدار کردیا - اس وقت اس شہزادے کی

---

* مجھے اس وقت مس کارنیٹو کے ہم سفر بابو من موہن گھوش یاد آرہے ہیں - موصوف بیرسٹری کی تعلیم کے لئے انگلستان آئے تھے - موصوف کو بت پرستی سے قطعاً احتراز تھا اگرچہ انھوں نے مسیحی مذہب نہیں قبول کیا تھا - ان کی منگنی ایک نابالغ ہندو لڑکی کے ساتھہ ہوئی تھی جسے انھوں نے کلکتہ کی رومن کیتھولک خانقاہ میں تعلیم کے لیے بھیجا تھا - اس لئے نہیں کہ وہ مسیحی مذہب قبول کرلے بلکہ اس واسطے کہ خانقاہ کی زندگی موصوف کو زنانے کی زندگی سے بہت کچھہ مشابہ معلوم ہوتی تھی جس میں اس لڑکی کو آئندہ زندگی بسر کرنا ہے —

† کلکتہ ریویو - فروری سنہ ۱۸۹۸ ع - صفحہ ۵۱۱ -

صرف ۲ سال کی عمر تھی - مہاراجہ میسور کے اس فرزند کا گزشتہ ۲۷ مارچ کو بنگلور میں انتقال ہوگیا - انتقال کے دوسرے روز اس کی لاش ہندو رسم کے مطابق جلائی گئی - دیسی لوگوں میں مرحوم کی ذات بہت مقبول تھی اس لئے کہ وہ نہایت سخی اور فیض رساں تھے - سنہ ۱۸۵۷ ع کی شورش عظیم کے موقعہ پر راجہ نے انگریزی حکومت کے ساتھہ اپنی وفاداری قایم رکھی - اگر وہ ایسا نہ کرتے تو برطانوی حکومت کی راہ میں مزید دشواریاں پیش آجاتیں - انھوں نے شام راجندر دیار بہادر کو اپنا متبنی بنایا - اس لڑکے کی بھی ۹ سال کی عمر تھی جب میسور کا تخت و تاج اسے ملا - لڑکے کی نابالغی کے زمانے میں انگریزی حکومت کا ریاست پر انتظام قایم رہے گا جس طرح اس سے قبل اس کے والد ماجد کی زندگی میں رہ چکا تھا - نوعمر راجہ کا قیام بنگلور کے قلعہ میں رہے گا - دس سال قبل بنگلور کی آبادی ۷۰ هزار تھی لیکن آج ایک لاکھہ سے زیادہ ہے - یہاں اس کی تعلیم کا انتظام کیا جاے گا - بنگلور کی آب و ہوا نہایت خوشگوار ہے - ریل کی بدولت یہ شہر مدراس سے مل گیا ہے - گویا یہ دونوں شہر در اصل ایک ہی شہر ہوگئے ہیں - (اودھ اخبار ۱۴ جولائی سنہ ۱۸۶۸ ع)

پچھلے اپریل کی ۵ تاریخ کو رچرڈ ہاٹن (Richard Haughton) کا ۸۹ سال کی عمر میں انتقال ہوگیا - موصوف سر گریو ہاٹن کے بھائی تھے - انسٹیٹیوٹ دے فرانس کی " ایکادمی فنون لطیفہ " کے بیرونی رکن تھے اور میرے ہم سبق تھے - ہم دونوں نے سلوسترد دے ساسی کے سامنے زانوے ادب تہ کیا تھا - موصوف کچھہ عرصے سے رمسگیت (Ramsgate) میں اپنی زندگی کے آخری ایام دنیا سے الگ تھلگ گذار رہے تھے - موصوف کو ہندوستانی سے خاص لگاو تھا

اور آپ مدت تک (Addiscombe) کے فوجی کالج میں السنۂ مشرقیہ کے پروفیسر رہ چکے تھے - آخری عمر میں بینائی کے بالکل زائل ہوجانے کے باعث انہوں نے گوشہ نشینی اختیار کرلی تھی - اس کے باعث وہ علمی دنیا میں جتنے چمکنے چاہئیے تھے نہ چمکے --

میرے قدیم اور عزیز دوست ڈنکن فوربس (Duncan Forbes) نے بھی جہان فانی کو الوداع کہا - آپ سے میرے نہایت دیرینہ تعلقات تھے - آپ ایک نہایت فاضل مستشرق تھے - آپ نے متعدد تصانیف اپنی یادگار چھوڑی ہیں - خصوصاً ہندوستانی لغت نہایت کارآمد ثابت ہوئی - آپ کی لغت نے شیکسپیئر کی ہندوستانی لغت کی جگہ اسی طرح لے لی ہے جس طرح فرانس میں الکزنڈر کی یونانی کی لغت نے پلانش کی لغت کو ناکارہ بنادیا ہے - فوربس صاحب کو میری طرح ہندوستانی سے طبعاً مناسبت تھی اور آپ نے اس زبان کی ترقی اور نشرو اشاعت کے لئے اپنی تعلیم سے بہت مدد پہنچائی - فوربس اس کاتستان کے ایک چھوٹے سے قریے میں پیدا ہوے تھے - جوں توں اپنی تعلیم ختم کرکے آپ کلکتہ چلے گئے جہاں دو سال قیام کرنے کے بعد صحت کی خرابی کے باعث سنہ ۱۸۲۶ ع میں یورپ واپس ہوے - اس بار میری ان کی پہلی ملاقات ہوئی - موصوف اپنے دوست سنڈ فورڈ آرناٹ (Santford Arnot) کی طرح جن کا جوانی میں سنہ ۱۸۳۴ ع میں انتقال ہوچکا ہے گلکرسٹ کے شاگرد تھے - فوربس اور آرناٹ دونوں نے مل کر لندن کے "ادارۂ مشرقیہ" (Oriental Institution) کی بنا ڈالی تھی - میں نے بھی اپنے اساتذہ سلوستردے ساسی اور شیکسپیئر کی ہمت افزائی پر پیرس میں لندن والے ادارے کی نقل کی کوشش کی ہے - سنہ ۱۸۳۷ ع میں فوربس

کو لندن یونیورسٹی کے کنگز کالج (King's College) میں السنۂ مشرقیہ کی پروفیسری دی گئی اور سنه ۱۸۴۳ ع میں ڈاکٹر آف لا کی اعزازی سند عطا ہوئی - فوربس کے خطبات کی طرح ان کی جملہ تصانیف کی یه خصوصیت ہے کہ وہ نہایت صاف اور ستھری زبان میں لکھی گئی ہیں - فوربس کے شاگرد لا تعداد ہیں - بعض وہ ہیں جنھوں نے بلا واسطه تحصیل علم کیا اور بعض وہ ہیں جنھوں نے بالواسطه فیض حاصل کیا - ان سب کے دلوں میں اپنے استاد کی بیحد قدر تھی - موصوف نے ایک نہایت قابل قدر قلمی کتب خانه جمع کیا تھا - تین سال ہوے بعض وجوہ کی بنا پر انھوں نے یه کتب فروخت کرڈالیں چنانچه میں نے بھی اس موقع سے فائدہ اٹھاکر بعض نادر نسخے حاصل کرلئے جو میرے کتب خانه کی زینت ہیں - فوربس نہایت سلیم الطبع اور خاکسار منش شخص تھے - ان کی زندگی ایک علم دوست آدمی کا اعلیٰ ترین نمونه ہمارے سامنے پیش کرتی تھی - اپنے اور دوسرے بعض احباب کی طرح جن میں شیکسپیئر، کانرمیر، گرانگرے دے لاکرانج شامل ہیں، فوربس بھی عمر بھر مجرد رہے - ان کے علمی مشاغل میں اہل و عیال کی چپقلشیں حارج نہیں ہوئیں - فوربس نے عمر بھر اپنے کاموں کو انہماک اور انتہائی جوش کے ساتھه انجام دیا اور آخری وقت تک محنت اور کام کرتے رہے - موصوف کا گذشته اگست کی ۱۷ تاریخ کو لندن میں انتقال ہوا - میری دعا ہے که خدا موصوف کی روح کو امن نصیب کرے - ہمیں چاہئے که ان کے کام کو جو ان کی بہترین یادگار ہے عزت و توقیر کی نظر سے دیکھیں —

اب میں دو معروف ہندوؤں کی موت کا اور ذکر کردوں جن کا

پچھلے اگست میں انتقال ہوا ہے - میری مراد اُن سے اُجل لچھمن ارسو چٹی اور پروسو نو کمارٹگور سے ہے - اول الذکر مدراس کی " مجلس وضع قانون " کے رکن تھے اور موصوف نے ہندو مقاصد کو اخبار نویسی اور ادب کے ذریعہ سے ترقی دی - موصوف کو تعلیمی معاملات سے خاص دلچسپی تھی اور مقامی زبانوں اور ہندوستانی کے ذریعہ تعلیمی اشاعت میں عمر بھر کوشاں رہے - ثانی الذکر ایک غیر معمولی خدا داد قابلیت کے شخص گذرے ہیں - آپ نے ہندو قانون پر نہایت فاضلانہ شرح لکھی ہے - یہ کتاب نہایت شستہ انگریزی زبان میں لکھی گئی ہے - یہ اصول قانون اب متھلا (آج کل کا ترہوت) میں تسلیم کئے گئے ہیں - یہ تصنیف اصل سنسکرت پر مبنی ہے (*) - پروسو نوکمارٹگور کا کلکتہ میں ۶۷ سال کی عمر میں انتقال ہوا - موصوف نہایت دولتمند شخص تھے لیکن ابتدا ہی سے طبیعت کو ادب اور قانون سے لگاؤ تھا - انگریزی زبان پر قدرت کا یہ عالم تھا کہ موصوف نے بیس سال کی عمر سے قبل ایک رسالہ بنام 'انڈین ریفارمر" نکالا تھا - شروع میں کچھ روپیہ تجارت میں لگایا لیکن چونکہ اس سے قدرتی مناسبت نہ تھی سب روپیہ ڈوب گیا - پھر وکالت شروع کی اور خوب شہرت حاصل کی - اصول قانون پر موصوف کی نظر نہایت وسیع تھی - اس کے بعد مجسٹریٹی کے متعدد عہدوں پر فائز رہے اور مجلس وضع قانون کے رکن مقرر ہوے - لیکن صحت کی خرابی کے باعث عرصہ تک یہ خدمات انجام نہ دے سکے - آج تک ٹگور کی دریادلی اور حسن سلوک کا ان

(*) سنسکرت نام " وود چلنتا ملی " ہے - اصل کلکتہ میں سنه ۱۸۶۳ ع میں شائع ہوچکی ہے - ۳۴۰ صفحات پر مشتمل ہے ـــ

کے هم مذهب ذکر کرتے هیں - موصوف کلکته یونیورسٹی کے گریجویٹ تھے اور علم و تعلیم کی ترقی سے خاص دلچسپی رکھتے تھے - " آپ برٹش انڈین ایسوسیئشن " کے بانیوں میں سے ایک هیں (*) - لیکن موصوف نے اپنے فرزند بابوگمندر موهن ٹگور کے مسیحی مذهب قبول کرنے کے باعث اس انجمن سے علحدگی اختیار کرلی - موصوف کے فرزند بعد میں کلکته هائی کورٹ کے جج هوے - موصوف کو ابتدا میں اصلاحی خیالات سے لگاؤ تها لیکن بعد میں اصلاحی خیالات سے دلچسپی لینا چهوڑ دیا تها - وه مرتے دم تک پکے هندو رهے ' انتقال پر آپ کی لاش گنگا کے نذر کی گئی - مرتے وقت آپ ۲۰ هزار روپے سالانه کی آمدنی اپنے خاندانی بت کے نام وقف کرگئے اور اپنے بیٹے کو محروم الارث قرار دیا (‡) - همارے خیال میں اگر بابو گمندر موهن ٹگور (بیٹے) کو مسیحی دین سے مخلصانه تعلق هے تو وه اپنے محروم الارث هونے کی پروا نهیں کریں گے اور بلا غم و غصه اپنے ملک کی خدمت کرتے رهیں گے - اهل هند عربی کی اس مثل سے ناواقف نهیں که " حب الوطن من الایمان ' —

——) * (——

(*) ابهی حال میں تجویز پیش کی گئی هے که تعلیمی ترقی کے لیے حکومت خاص ٹکس مقرر کرے بجاے اس کے که عطیات سے کام چلایا جاے - اس انجمن نے اس تجویز کی مخالفت کی هے اور همارے خیال میں بالکل ٹهیک کیا هے - (هوم ورڈ میل - مورخه ۵ اکتوبر سنه ۱۸۶۸ع) -

(‡) موصوف نے تقریباً دس لاکهه کی ملک چهوڑی هے - اس میں سے خوشی کی بات هے که تین لاکهه خیراتی کاموں کے لئے وقف کیا گیا هے -

خطبات گارساں دتاسی

انیسواں خطبہ - ۶ دسمبر ۱۸۶۹ ع

ہر سال میرا یہ دستور رہا ھے کہ ھندوستان میں ادبیات کی ترقی کے متعلق آپ صاحبوں کے سامنے کچھہ نئی باتیں پیش کروں جنھیں سن کر آپ کو اطمینان ھو کہ وھاں ترقی ھو رھی ھے - میں لانگ فیلو کے ان اشعار کو اپنے حسب حال پاتا ھوں :

نہ مسرت اور نہ غم ،
ھمارا مقصد حیات ھو سکتے ھیں ،
ھمارا مقصد حیات عمل ھے ، تاکہ ھر آنے والا کل ،
ھمیں آج کے مقابلے میں آگے بڑھا ھوا پائے -

اردو اور ھندی کا جھگڑا بدستور چلا جا رھا ھے - چنانچہ گزشتہ سال ھندوؤں اور مسلمانوں نے اس جھگڑے میں نہایت گرمجوشی کے ساتھہ حصہ لیا - بالخصوص ھندو اس معاملے میں تعصب سے کام لے رھے ھیں - وہ اپنے حب وطن کے جوش میں ان تمام چیزوں کو پس پشت ڈالنا چاھتے ھیں جن سے ھندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کی یاد تازہ ھوتی ھے - چنانچہ ھندو لوگ کھلم کھلا برطانوی حکومت کو مسلمانوں کی حکومت پر ترجیح دیتے ھیں - لیکن اھل اسلام کی حالت اس سے مختلف ھے - ان

کی ۳ کروڑ آبادی کے لیے برطانوی حکومت دو وجوہ کی بنا پر بری ہے - اول اس لیے کہ انگریزوں نے انہیں ہندوستان کی حکومت سے محروم کیا اور دوسرے اس لیے کہ انہیں ایسی حکومت کے سامنے سر جھکانا پڑا جس کے افراد کے مذہب سے انہیں سخت نفرت ہے - مسلمانوں کو اس وقت بعض شورش پسند پھر انگریزوں کے خلاف بر انگیختہ کرنا چاہتے ہیں - چنانچہ کئی دفعہ حضرت امام مہدی کی آمد کا غلغلہ بلند ہو چکا ہے - امام موصوف اُنہیں غیروں کے تسلط سے نجات دلائیں گے - اس باب میں مختلف پیشین گوئیوں کی نشر و اشاعت کی جارہی ہے - گذشتہ سال وہابیوں کی شورش کی یہی بنا تھی - وہابیوں کے عقائد مسلمانان ہند کی جماعت میں مقبولیت حاصل کر رہے ہیں * —

یہ عجیب بات ہے کہ جس طرح آج کل یورپ میں ایک تحریک اُٹھی ہے جس کا نصب العین یہ ہے کہ پھر سے از منۂ وسطیٰ کی طرف رجوع کیا جائے اور ان زبانوں کو زندہ کیا جائے جو اب بولیاں ہوکر رہ گئی ہیں اسی طرح ہندوستان میں بھی از منۂ وسطیٰ کو زندہ کرنے کی کوشش ہو رہی ہے - کچھہ عرصے سے یورپ میں از منۂ وسطیٰ کے خلاف جو نفرت پھیلائی جا رہی تھی اس کے خلاف یہ تحریک ہے - ہندوستان میں بھی از منۂ وسطیٰ کی ادبیات کو قدر اور احترام کے ساتھہ دیکھا جا رہا ہے - اس وقت ہندی کی حیثیت بھی ایک بولی کی سی رہ گئی ہے جو ہر گانو میں الگ الگ طریقے سے بولی جاتی ہے - چنانچہ ہندوؤں کی کوشش ہے کہ اردو کی بجاے ہندی کو فروغ دیا جائے حالانکہ اردو بہ نسبت ہندی کے زیادہ شستہ ہے - لیکن ہندی ان کے نزدیک خالص

---

* انڈین میل - ۲۳ دسمبر سنہ ۱۸۶۹ ع —

ہندوستان کی زبان ہے اس واسطے کہ وہ سنسکرت سے نکلی ہے - ان کو یہ نہیں سوجھتا کہ اردو زبان میں فارسی اور عربی کی ساری خوبیاں جمع ہوگئی ہیں - یہ دونوں زبانیں (فارسی اور عربی) اسلامی مشرق کی قابل احترام السنہ ہیں اور جمیع علماے عالم ان دونوں کو ہمیشہ سے اسی نظر سے دیکھتے آے ہیں —

اب میں ان دور ازکار اسباب کی تشریح کرتا ہوں جو ہندی کے حامی اردو کے مقابلے میں پیش کر رہے ہیں - اس کے ساتھہ میں ان دلائل کو بھی بیان کروں گا جو مسلمان علما نے جواب میں پیش کی ہیں - لیکن جیسا کہ اس قسم کے مباحثوں میں ہوا کرتا ہے طرفین اپنی راے پر اڑے رہتے ہیں اور کوئی نتیجہ نہیں نکلتا - گزشتہ صدی میں یہ قول مشہور تھا جو اس وقت شاید حسب حال ہو - لیکن آج کل لوگوں نے اس کو فراموش کردیا ہے : "بحث مباحثے سے نہ اپنے تئیں بصیرت حاصل ہوتی ہے اور نہ دوسرے کو کوئی فائدہ ہوتا ہے - بحث کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ لوگوں کو غصہ اور ضد پیدا ہو - غرور اور ضد جہاں ہوتے ہیں وہاں نیک نیتی نہیں باقی رہ سکتی " —

گزشتہ سال ہندی اردو کے جھگڑے کے سلسلے میں جس کی نسبت میں نے ابھی ذکر کیا ، الہ آباد انسٹیٹیوٹ کا وہ جلسہ خاص اہمیت رکھتا ہے جو سال کے آخر میں منعقد ہوا تھا - اردو ہندی کے مسئلہ پر خوب گرمجوشی سے مباحثے ہوے جن کا لکھنؤ کے ہندوستانی رسائل میں تفصیل کے ساتھہ حال چھپا ہے * - اس جلسے کی یہ بات قابل ذکر ہے کہ ان سبھوں نے جو اردو کے مخالف تھے خود اردو میں نہ کہ ہندی میں اردو

* اودھ اخبار ۲۶ - نومبر سنہ ۱۸۹۸ ع —

کے خلاف دھواں دھار تقریریں کیں —

بحث اس مسئلہ سے شروع ہوئی کہ گذشتہ جلسوں کی کارروائی کے متعلق یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ وہ دیسی زبان میں لکھی چاہئے - اب سوال یہ اٹھا کہ دیسی زبان سے آیا اُردو مراد لی جاے یا ہندی - ایک ہندو صاحب نے اٹھہ کر تقریر کی کہ ہندی ملک کی اصلی زبان ہے - ہندی کی طرف سے جو بے اعتنائی برتی جا رہی ہے وہ قابل افسوس ہے - مقرر نے یہ بھی کہا کہ حکومت سے تحریک کرنی چاہئے کہ دفاتر اور عدالتوں میں اردو کی بجاے ہندی کو رائج کرے - اس کے ساتھہ مقرر نے یہ بھی کہا کہ اگر ایسا کیا گیا تو صرف رسم خط میں تبدیلی کرنی ہوگی - ایک اور دوسرے ہندو صاحب نے اس تجویز کی تائید کی اور کہا کہ اگرچہ ہندی کو دفاتر اور عدالتوں کی زبان بنانے سے بہت سے ہندوستانیوں کو زحمت گوارا کرنی ہوگی کیونکہ وہ اردو رسم خط کے عادی ہو چکے ہیں، لیکن بہر نوع یہ تبدیلی گانو میں رہنے والے ہندوؤں کے لیے ہوگی جو صرف ہندی لکھنا پڑھنا جانتے ہیں - چونکہ گانو والے اردو رسم خط سے ناواقف ہیں اس لیے انہیں اردو کی تحریروں سے دھوکا دیا جا سکتا ہے - اس کے علاوہ اردو کا رسم خط چینی رسم خط کی طرح بہت پیچیدہ ہے - مقرر نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ سنسکرت زبان کو دیوناگری رسم خط کے ذریعے پھر سے زندہ کرنے کی کوشش کرنی چاہئے - ہندوؤں نے اٹھارہ صدیوں سے سنسکرت کی طرف سے بے پروائی برتی ہے، اب انہیں چاہئے کہ اس قدیم زبان میں زندگی کی نئی روح پھونکیں —

ایک تیسرے ہندو صاحب نے تجویز کی تائید مزید کرتے ہوے کہا کہ اردو کی بجاے ہندی کو رواج دینے سے صرف رسم خط کی تبدیلی

لاحق نہیں ہوگی بلکہ الفاظ اور محاورے بھی بدلیں گے اس واسطے کہ اردو میں عربی اور فارسی کے بے شمار الفاظ استعمال ہوتے ہیں اور هندی خالص هندوستانی زبان هے —

یہ سچ هے کہ بعض اردو مصنفین ترکی مصنفین کی طرح، اپنا علم و فضل ظاهر کرنے کی غرض سے عربی فارسی کے الفاظ کثرت سے استعمال کرتے هیں اور ملکی زبان کے صرف افعال و حروف ان کی عبارت میں نظر آتے هیں، لیکن فی الحقیقت اردو هندی میں کوئی فرق نہیں هے - همارے لیے یہ امر ناممکن هے کہ اردو اور هندی کو ایک دوسرے سے جدا کرنے والی کوئی حد فاصل قائم کر سکیں - در اصل دونوں هندوستانی کے تحت آجاتی هیں اور صرف ان کا رسم خط هی ان میں امتیاز پیدا کرتا هے —

الہ آباد انسٹیٹیوٹ کے دوسرے اجلاس میں جو ۲۵ دسمبر سنہ ۱۸۶۸ ع کو منعقد ہوا تھا، اردو هندی کا مسئلہ پھر اُٹھایا گیا - اس میں یہ طے پایا کہ دیوناگری رسم خط کو رواج دینا چاهئے - ویسے اردو اور هندی میں لسانی فرق نہیں کیا جائے گا - چاهے هندی کو "هندوئی" کہئے یا اردو کو "دکھنی" کہئے، زبان ایک هی رهے گی اور ایک هی محاورے ان میں مستعمل رهنے چاهئیں —

برطانوی حکومت اس تحریک کے موافق معلوم هوتی هے - حکومت کا خیال هے کہ هندی کی موافقت سے هندو لوگ خوش هو جائیں گے اور چونکہ هندوستان کی آبادی کی کثرت انہیں پر مشتمل هے اس لیے هندی کی تائید ملکی مصالح پر مبنی هے - اضلاع شمال مغربی، اودھ اور پنجاب میں دفاتر اور عدالتوں میں هندی رائج کرنے سے جو سیاسی فوائد منتج

هوں گے ان کے متعلق " انڈین ڈیلی نیوز " کے ایک مقالے میں تفصیلی ذکر کیا گیا ھے - اس مقالے کی نقل ۲۷ جنوری سنہ ۱۸۶۸ ع کے " انڈین میل " میں بھی شائع ہوئی ھے - میرے خیال میں اس مقالے میں ہندی کی تائید میں جو استدلال پیش کیا گیا ھے وہ صحیح نہیں اور جو دعوے پیش کئے گئے ھیں ان پر بحث کی جاسکتی ھے لیکن اس جگہ میں اسے چھیڑنا نہیں چاھتا - اس مقالے میں اردو کے متعلق کم از کم یہ تسلیم کیا گیا ھے کہ اس نے ھندوستان میں وھی حیثیت حاصل کرلی ھے جو فرانسیسی زبان کو یورپ میں حاصل ھے - عدالتوں اور شہروں میں اردو بولی جاتی ھے - مصنفین اپنی کتابیں اسی زبان میں تصنیف کرتے ھیں اور اس کی غزلیں گائی جاتی ھیں ۔ اردو کے ذریعہ اھل ھند یورپین لوگوں سے گفتگو کرتے ھیں - غرض کہ ان تمام امور کو اگر پیش نظر رکھا جائے تو اردو کو ھندی پر فضیلت حاصل رھتی ھے جسے تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں —

علی گڑہ کے اخبار میں اس مسئلہ پر ایک مضمون میں مفصل بحث کی گئی ھے - یہ مقالہ ۲ فروری سنہ ۱۸۶۸ ع کے " اودھ اخبار " میں دوبارہ شائع کیا گیا ھے - مضمون نگار صرف اسی پر اکتفا نہیں کرتا کہ رسم خط بدل دیا جائے بلکہ اس نے یہ بھی واضح کیا ھے کہ اردو میں جو عربی حروف مستعمل ھیں ان کا دیوناگری میں بدل ہوھی نہیں سکتا ، اس لیے سہولت اس کی مقتضی ھے کہ تمام عربی الفاظ کے استعمال سے احتراز کیا جائے اور ان کی جگہ ھندی الفاظ استعمال کئے جائیں - اردو میں عربی فارسی کے الفاظ لینے کی بجائے سنسکرت کے الفاظ لیے جائیں اور اس طرح زبان کو وسعت دی جائے - مضمون نگار کے نزدیک ھندی

در اصل سنسکرت ہی کی ایک شکل ہے —

غرض کہ ہندوؤں کی عام طور پر یہ خواہش ہے کہ عربی اور فارسی کے عنصر سے قطعی احتراز کیا جائے بلکہ بعض ہندو ایسے بھی ہیں جو لاطینی رسم خط کو اردو رسم خط پر ترجیح دیتے ہیں - یہ بات ان کے دلوں میں اسلامی حکومت کی مخالفت کے باعث پیدا ہوئی ہے —

مدیر "اودھ اخبار" نے مقالہ نگار کی خواہش کے موافق مضمون چھاپ تو دیا ہے لیکن بعد میں اس کے استدلال کی دھجیاں بکھیر دی ہیں اور تمام دلائل کو بے معنی لفاظی سے تعبیر کیا ہے - مدیر نے اسی ضمن میں یہ بتایا ہے کہ ہندی اردو کے جھگڑے اسی طرح لایعنی ہیں جس طرح یہ خیال کہ ایک دن آے گا جب کہ اردو ہندی کے قضیے کا خاتمہ ہو جاے گا اور اس کی صورت یہ ہوگی کہ انگریزی زبان ان دونوں پر حاوی ہوجاے گی اس لیے کہ وہ حکام وقت کی زبان ہے اور قدرتی طور پر رعایا اسی زبان کو اختیار کرے گی - مدیر موصوف نے یہ بھی لکھا ہے کہ اردو زبان جس کی ہندو لوگ اس وقت مخالفت کر رہے ہیں، فاتح مسلمانوں اور ہندوؤں کے خلط ملط سے بالکل اسی طرح وجود میں آئی جیسے انگلستان میں سیکسن اور فرانسیسی کا امتزاج عمل میں آیا - اردو میں دوسری زبانوں کے وہی الفاظ استعمال ہوتے ہیں جو کھپ جائیں - ان الفاظ کے انتخاب میں خاص سلیقہ برتا جاتا ہے - یہی وجہ ہے کہ اردو کو عدالتوں میں مقبولیت حاصل ہوئی اور سرکاری تحریرات میں یہ زبان استعمال کی گئی - ان تمام باتوں کی تائید میں خود ہزارہا ہندوؤں کی آرا پیش کی جا سکتی ہیں - بھلا یہ کونسی عقل کی بات ہے کہ اردو کے عوض، جو ایک نہایت شیریں اور شستہ زبان ہے اور جو عام طور پر سمجھی جاتی ہے، ہندی

کو فروغ دینے کی کوشش کی جائے جو ایک نہایت بھدی اور درشت زبان ہے اور جس کے حروف دیکھنے میں بھلے نہیں معلوم ہوتے ـــ

۱۹ فروری سنہ ۱۸۶۸ء کے "اخبار" میں (مطبوعۂ علی گڑھ) ایک اور مضمون چھپا ہے جس میں ہندی اور سنسکرت کی یکسانیت کا مغالطہ پیش کیا گیا ہے - ہندوؤں کی یہ خواہش ہے کہ سنسکرت کا رواج بڑھے لیکن انہیں اس بات پر تو غور کرنا چاہئے کہ دریا کو ماخذ کی طرف بہنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا - بابو سرود پرشاد جنہوں نے یہ مضمون لکھا ہے، سنسکرت ادبیات کی تعریف میں رطب اللسان ہیں - میرے خیال میں ان کا یہ تعریف کرنا بجا ہے - لیکن اس سے تو کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ عربی اور فارسی بھی قابل قدر زبانیں ہیں - برطانوی حکومت نے بنگالیوں کے ساتھ یہ خاص رعایت کی کہ انہیں مقامی عدالتوں میں بجائے فارسی کے اپنی زبان استعمال کرنے کی اجازت دے دی - چنانچہ اضلاع شمال مغربی کے ہندوؤں نے بنگالیوں کی دیکھا دیکھی یہ مطالبہ شروع کیا کہ ہمارے ہاں بھی اردو کی بجائے عدالتی زبان ہندی قرار دی جائے - اس مطالبے سے ان کی مراد یہ ہے کہ بجائے مسلمانوں کی زبان کے ہندوؤں کی زبان کو فروغ حاصل ہو - بابو سرود پرشاد نے دیوناگری رسم خط کی بہت تعریف کی ہے اور یہ دعوی کیا ہے کہ دنیا بھر کی زبانوں میں صرف دیوناگری رسم خط میں یہ صلاحیت بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے کہ صورت انسانی کے ہر نازک فرق کو واضح کرسکے - لیکن واقعہ یہ ہے کہ خود اردو میں ایسے بیشمار الفاظ ہیں جنہیں دیوناگری حروف سے نہیں ادا کیا جا سکتا - چنانچہ ح خ ص ض ط ع غ اور ق کا اظہار نہیں کیا جاسکتا - مضمون نگار نے دیوناگری اور ناگری رسم خط کی تعریف کے

بعد خط شکستہ کی برائیاں گنوائی ہیں اور یہ بھی لکھا ہے کہ اس خط پر پوری قدرت حاصل کرنے کے لیے سالہا سال محنت کرنے کی ضرورت ہے - یہ درست ہے کہ اردو کے خط شکستہ کا پڑھنا دشوار ہے اس لیے کہ سب حروف صاف نہیں ظاہر کیے جاتے - لیکن ناگری خط جو ساہوکارے اور تجارتی ضروریات کے لیے استعمال ہوتا ہے اور جسے "کیتھی ناگری" کہتے ہیں، اس کا پڑھنا بھی بہت دشوار ہے - اس کے پڑھنے میں اس وقت سہولت ہوتی ہے جب کہ پڑھنے والا پہلے سے مضمون سے واقف ہو —

علی گڑھ کے "اخبار" مورخہ ۵ مارچ سنہ ۱۸۶۸ ع میں ایک مضمون اردو کی تائید میں شائع ہوا ہے - یہ مضمون متعدد کالموں میں شائع کیا گیا ہے - بعض باتیں نہایت صحیح مشاہدہ پر مبنی معلوم ہوتی ہیں - عربی کی مثل ہے کل حزب بما لدیهم فرحون * - لیکن اہل ہند کا طریقہ ہے کہ وہ ہر بات میں کوئی نہ کوئی تبدیلی کرنی چاہتے ہیں- مضمون نگار اس باب میں میرا ہم خیال ہے کہ اردو کے خلاف جو تحریک اس وقت اُٹھ رہی ہے اس کا اصلی محرک نسلی اور مذہبی اختلاف ہے† - مضمون نگار نے اس کی وضاحت کی ہے کہ یہ تحریک دراصل سیاسی ہے - مذہبی اعتبار سے مسلمانوں کی زبان عربی ہے اور ہندوؤں کی زبان سنسکرت ہے - اردو اور ہندی کو مذہب سے کوئی واسطہ نہیں - مضمون نگار نے اس کے بعد ان سب اعتراضات کا ایک ایک کرکے جواب دیا ہے جو اردو کے خلاف پیش کیے گئے ہیں - مثلاً کہا گیا ہے کہ ہندو عوام اردو نہیں سمجھتے- لیکن دنیا کے ہر ملک میں کم و بیش یہی حالت نظر آئے گی - چنانچہ برٹانی،

* یہ قرآن کی آیت ہے - سورۂ روم رکوع ۳- (مترجم)

† ملاحظہ ہو میرا سالانہ خطبہ سنہ ۱۸۶۶ ع —

پرووانس اور الساس کے عام باشندے فرانسیسی زبان نہیں سمجھتے - کیا یہ معقول وجہ ہے کہ فرانس کے صوبوں کے دفاتر اور عدالتوں میں فرانسیسی زبان کا استعمال ترک کردیا جاے - مضمون نگار نے اس طرف توجہ مبذول کرائی ہے کہ خالص سے خالص ہندی میں بھی عربی اور فارسی کے الفاظ ضرور ملتے ہیں - ان الفاظ کی جگہ دوسرے الفاظ کو رواج دینا بالکل ناممکن ہے - بہت سے ہندو راج کماروں نے جو اپنے دربار میں ہندی رائج کرسکتے تھے ' اردو کو ترجیح دی ہے - چنانچہ الور ' گوالیار ' جے پور ' اندور اور بیانہ کے راجاؤں کی درباری زبان اردو ہے - اس کے سوا یہ بات بھی غور کرنے کی ہے کہ جس وقت سنہ ۱۸۳۷ع میں برطانوی حکومت نے اعلان کیا کہ فارسی کی جگہ اردو سرکاری طور پر تسلیم کی جاے گی تو اس وقت ایک آواز بھی نہیں اٹھی کہ نہیں ' اردو کے بجاے ہندی کی سرپرستی حکومت کو کرنی چاہئے - کچھ دنوں پہلے تک اس مسئلہ کی کسی کو کانوں کان خبر تک نہ تھی - جس زمانے میں فارسی دفتری زبان تھی اس وقت اس کی کسی نے مخالفت نہیں کی حالانکہ وہ اردو کے بہ نسبت ہندی سے دور کا بھی کوئی تعلق نہیں رکھتی تھی - پھر یہ کیا بات ہے کہ آج ہندو لوگ ایک دم سے اردو کے خلاف چیخ پکار کررہے ہیں - اس وقت اردو اور ہندی کی حیثیت ایسی ہے کہ ہم دونوں میں سے کسی ایک کو دوسرے پر غالب نہیں تصور کرسکتے - لیکن ان دونوں میں جو ربط اور تعلق موجود ہے اسے قائم رکھنے میں کوئی قباحت نہیں - اگر ہندوستان کے بعض حصوں میں ہندوؤں کو اکثریت حاصل ہے تو بعض دوسرے حصوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے - جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے وہاں

ھندی کو زبردستی رواج دینا انہیں ان کے حقوق سے محروم کرنے کے ھم معنی ھوگا ۔ رعایا کی حیثیت سے برطانوی حکومت کے نزدیک ھندو اور مسلمان برابر ھونے چاھئیں ۔ اردو کے خلاف جو یہ دعویٰ کیا جاتا ھے کہ وہ ایک مخلوط زبان ھے درست ھے ۔ لیکن کیا عربی میں سریانی، عبرانی اور یونانی الفاظ کی آمیزش نہیں ھے ؟ کیا فارسی میں عربی الفاظ مستعمل نہیں ؟ اور کیا یہ صحیح نہیں کہ دنیا کی بیشتر زبانوں میں دوسری زبانوں کے الفاظ کا میل پایا جاتا ھے ؟ اگر اردو میں عربی اور فارسی الفاظ استعمال ھوتے ھیں تو اس کے ساتھ یہ بھی ماننا ھوگا کہ سنسکرت اور ھندی کے بھی لاتعداد الفاظ مروج ھیں ۔ بالکل اسی طرح جیسے انگریزی اور فرانسیسی میں لاطینی اور یونانی الفاظ گھل مل گئے ھیں اور ھر اھل زبان انہیں سمجھتا ھے ۔ اردو دو طریقے سے لکھی جاتی ھے ۔ ایک نستعلیق اور دوسرے شکستہ ۔ ۔ لیکن ھندی لکھنے کے طریقے بیشمار ھیں ۔ ان بولیوں کے لکھنے کے طریقوں کا ھم یہاں ذکر نہیں کرتے جو ھندی سے مشابہ ھیں اور اس کی اور ان کی اصل ایک ھی ھے ۔ انہیں وھی شخص پڑھ سکتا ھے جس نے خاص کر ان کا مطالعہ کیا ھے ۔ سنسکرت کے فاضل تک ان تحریروں کو نہیں سمجھ سکتے ۔ ان بولیوں کا پڑھنا خود ھندووں کے لئے سخت دشوار ھوتا ھے اور ان کے لئے بھی یہ بولیاں وھی حیثیت رکھتی ھیں جو کسی اجنبی زبان کی ھوتی ھے ۔ خود دیوناگری رسم خط جسے ناگری بھی کہتے ھیں، اور جسے اردو رسم خط کی جگہ رائج کرنے کی کوشش ھورھی ھے، عیوب سے خالی نہیں —

اردو ھندوستان کے شہروں نیز دیہات میں جہاں بعض دوسری

بولیاں بولی جاتی ہیں سمجھی جاتی ہے - اضلاع شمال مغربی اور اودھ میں تو اردو ہی بولی جاتی ہے - ان تمام امور کے پیش نظر بھلا یہ کیونکر ممکن ہے کہ اردو کو ترک کرکے ہندی کو اختیار کیا جائے جسے عرصے سے اہل ہند چھوڑ چکے ہیں اور جس کو رائج کرنے میں بہت سی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے گا —

علیگڑھ کے " اخبار " مورخہ ۱۲ مارچ سنہ ۱۸۶۸ ع میں (سر) سید احمد خاں نے سرود پرشاد کے اس مضمون کا جواب دیا ہے جس کی نسبت ابھی میں حوالہ دے چکا ہوں —

سید صاحب موصوف نے اردو زبان کی تاریخ بیان کرنے کے ساتھ بابو صاحب کو اس طرف توجہ دلائی ہے کہ انہوں نے زبان اور رسم خط کے دو جداگانہ مسائل کو آپس میں گڈ مڈ کردیا ہے - اردو دراصل قدیم بھاشا اور فارسی کے میل سے بنی ہے - اردو کو شہروں کی شستہ اور شائستہ ہندی کہہ سکتے ہیں - ہندی اور اردو دونوں لسانی حیثیت سے ایک ہیں - دونوں کے رسم خط جدا جدا ہیں - سید صاحب موصوف خود اس بات کے خلاف ہیں کہ اردو میں عربی فارسی کے مغلق الفاظ کثرت سے استعمال کئے جائیں - موصوف عربی فارسی الفاظ کو صرف اس وقت استعمال کرنے کی اجازت دیتے ہیں جب کہ ان کے بغیر چارہ نہ ہو - لیکن عربی فارسی الفاظ کو خارج کرکے ان کی جگہ سنسکرت الفاظ ٹھونسنے کے بھی موصوف مخالف ہیں - اس لئے کہ خود ہندوؤں کے لئے یہ سنسکرت الفاظ عربی فارسی الفاظ کے مقابلے میں اجنبی ہوں گے - عربی فارسی الفاظ کو بہت عرصے سے سنتے سنتے خود ہندو بھی ان سے آشنا ہوگئے ہیں - ہندوؤں کو چاہئے کہ سنسکرت کی بجائے بھاشا کو پھر سے زندہ

کرنے کی کوشش کریں اگرچہ ثانی الذکر بھی اول الذکر کی طرح مردہ ھوچکی ھے - لیکن مردہ زبانوں کو زندہ کرنا ناممکن ھے - ان تمام باتوں کے مدنظر یہی زیادہ مناسب معلوم ھوتا ھے کہ اردو اور ھندی اس وقت جیسی ھیں انہیں بلا تصرف ویسا ھی رھنے دیا جاے —

یہ اعتراض بھی غلط ھے کہ اردو میں حساب کتاب، رسائد اور پروانے نہیں لکھے جاسکتے - بلکہ اس کے برخلاف اردو میں ان تمام ضروریات کو پورا کرنے کے جو اصول مقرر ھوچکے ھیں ان میں تبدیلی کرنا سخت باعث زحمت ھوگا - دفاتر اور عدالتوں میں جہاں اردو لکھنے میں ایک دستہ کاغذ صرف ھوتا ھے وھاں ھندی میں دو دستے ھوں گے - اس کے سوا ھندی لکھنے میں بیحد زیادہ وقت صرف ھوتا ھے —

مظفر پور کے سید وارث علی نے بھی علیگڑہ کے " اخبار " مورخہ ۲۶ اپریل میں اردو کی حمایت میں ایک نہایت پر جوش مضمون سپرد قلم کیا ھے - موصوف نے یہ ثابت کیا ھے کہ اردو ھی در اصل اھل ھند کی عام زبان ھے - اردو کے سمجھنے والے عربستان تک میں ملتے ھیں - اس جگہ اردو کی ھندوستان کے باھر اشاعت کے متعلق ایک واقعہ قابل ذکر ھے - (سر) سید احمد خاں جب بمبئی میں انگلستان جانے کے لیے جہاز پر سوار ھوے تو اسی جہاز پر بعض چینی اور حبشی بھی سفر کر رھے تھے - موصوف کو یہ دیکھہ کر بے حد تعجب ھوا کہ وہ اردو سمجھتے تھے اور بات چیت بھی کر سکتے تھے - چنانچہ موصوف نے اردو میں ان سے گفتگو کی اور وہ آپس میں بھی اردو ھی کے ذریعہ تبادلۂ خیال کرتے تھے - اس واقعہ سے اردو کی

ھمہ گیری کا اندازہ کیا جا سکتا ھے * —

سید وارث علی نے اپنے مضمون میں ھندوؤں کے اس دعوے کی تردید کی ھے کہ ان کی زبان اردو کے مقابلے میں جو آج کل مروج ھے، ترقی کی زیادہ مستحق ھے - اسی ضمن میں موصوف نے یہ استدلال پیش کیا ھے کہ جس بنا پر ھندی کو سرکاری زبان بنانے کی تجویز پیش کی گئی ھے بالکل اسی طرح انصاف کا مقتضی یہ ھے کہ ھندوستان کے طول و عرض میں جو بولیاں بولی جاتی ھیں انھیں بھی سرکاری زبان کیوں نہ بنا یا جاے۔ ایک ھندو صاحب نے جو یہ ادعا کیا تھا کہ ھندی الفاظ کا اردو کے رسم خط میں اظہار نہیں ھو سکتا، اس کا موصوف نے یہ جواب دیا ھے کہ عربی فارسی کے بہت سے ایسے الفاظ ھندی میں مستعمل ھیں جن کا ناگری رسم خط سے اظہار ناممکن ھے - مثال کے طور پر " ضلع، فیض آباد اور زمان ' کی قبیل کے بہت سے الفاظ پیش کئے جا سکتے ھیں - ناگری رسم خط میں مذکورہ الفاظ کا املا " جلا، فیج آباد اور جمان ھوگا -

---

* (سر) سید احمد خاں نے جس جہاز پر سفر کیا اس پر مس کارپنٹر بھی سفر کر رھی تھیں - موصوفہ اپنی صحت درست کرنے کی غرض سے یورپ تشریف لائیں - موصوفہ کو تعلیم نسواں سے اس قدر دلچسپی تھی کہ وہ یورپ میں زیادہ دنوں تک نہیں ٹھیریں اور بمبئی روانہ ھو چکی ھیں - (سر) سید احمد خاں نے مس موصوفہ کی اپنے سفر نامے میں بہت تعریف کی ھے اور ان کی سعی و کاوش کو جو وہ ھندوستانی عورتوں کی خاطر کر رھی ھیں بہت سراھا ھے - لیکن اس کے ساتھ سید صاحب کی خواھش ھے کہ مس موصوفہ انجیل مقدس اور معجزات کے متعلق اپنے خیالات میں، متفقہ علمی تحقیق کی روشنی میں تبدیلی کر لیں تو اچھا ھے —

ناگری میں گ اور غ، پ اور ف، ک اور ق، ج اور ز ذ ض ظ، کا امتیاز نہیں کیا جا سکتا —

علی گڑھ کے "اخبار" مورخہ ۷ مئی سنہ ۱۸۹۸ ع میں "جلوہ طور" سے جو میرٹھ سے شائع ہوتا ہے، ایک مضمون نقل کیا گیا ہے - اس مضمون کا عنوان هندوستانی کی ایک کہاوت "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" ہے - اس مضمون میں یہ بتایا گیا ہے کہ چونکہ هندو لوگ هندوستان میں اکثریت میں ہیں اس لیے وہ اپنے حسب خواهش تبدیلیاں کرنے کے مجاز ہیں - لیکن "اخبار" کی اشاعت میں مولوی فدا حسین کا لکھا ہوا سپاس نامہ شائع ہوا جو اضلاع شمال مغربی کے لفٹنٹ گورنر کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا - اس سپاس نامے میں یہ درخواست کی گئی ہے کہ اردو هندی کی جو موجودہ حالت ہے اس کو برقرار رکھا جائے اور کسی قسم کی تبدیلی نہ کی جائے —

الہ آباد انسٹیٹیوٹ نے یہ قرار داد منظور کی ہے کہ "کمبلی ایکٹ" کا هندی میں ترجمہ شائع کیا جائے - اس کے سوا یہ تجویز منظور ہوئی ہے کہ هندی زبان اور دیو ناگری رسم خط کو فروغ دینے کی تدابیر پر ایک کتاب لکھی جائے اور مصنف کو معقول معاوضہ دیا جائے - ایک یہ تجویز منظور ہوئی ہے کہ هندی میں ایک "انشا" لکھی جائے * جو عدالتی قواعد، کاروباری خطوط اور پروانوں کے نمونوں پر مشتمل ہو - نیز عورتوں کے لیے بھی هندی میں کتابیں تحریر کرائی جائیں † —

* جس طرح اسٹورٹ نے فارسی انشاء لکھی تھی جس وقت فارسی هندوستان کے دفاتر اور عدالتوں کی زبان تھی —

† اودھ اخبار - ۱۸ مئی، سنہ ۱۸۹۹ ع —

"اودھ اخبار" میں اس مسئلہ پر موافقت اور مخالفت میں جو مضمون شائع ہوے ہیں ان میں ہندی کی حمایت میں ایک مضمون میری نظر سے گذرا - اس میں لکھا تھا کہ ہندؤں کو اس میں بڑی دشواری ہوتی ہے کہ اپنے گھروں میں ہندی اور گھر سے باہر اردو بولیں - اگر ایسی کوئی دشواری فی الواقع ہے تو یہ سمجھنا چاہئے کہ وہ ہر اس قدیم زبان بولنے والے کو پیش آتی ہے جس کی زبان بولی ہوکر رہ گئی ہو - چنانچہ جنیوا اور وینس کے اکثر باشندے اپنے گھروں میں اپنی مقامی بولیوں میں گفتگو کرتے ہیں اور گھروں سے باہر اطالوی زبان میں بات چیت کرتے ہیں جو اٹلی کی مشترک اور عام زبان ہے —

"اودہ اخبار" مورخہ ۱۱ جولائی سنہ ۱۸۹۹ ع میں ایک مضمون اردو کی حمایت میں شائع ہوا ہے جس میں مخالفوں کے اعتراضات کے جواب دئے گئے ہیں - اس مضمون میں مضمون نگار نے ثابت کیا ہے کہ اردو ہی وہ زبان ہے جو ہندوستان بھر میں بولی اور سمجھی جاتی ہے - اس ضمن میں اردو کو ایک ایسے دریا سے تشبیہ دی ہے جس میں ندیاں آ آ کر شامل ہوتی ہیں (*) - موصوف نے ثابت کیا ہے کہ اردو کے رسم خط کی بجائے دیوناگری رسم خط اختیار کرنے کا صرف یہ مطلب نہیں سمجھنا چاہئے کہ

(*) ان ندیوں سے ہماری مراد سنسکرت، عربی، فارسی اور ترکی ہیں - یہ عجب اتفاق ہے کہ میں نے بھی چالیس سال قبل اردو کے لئے یہی تشبیہ استعمال کی تھی جس پر میرے ہم عصر علماء میں سے ایک نے جو تنقید میں تنگ نظری سے کام لیتے تھے، مجھہ پر اعتراضوں کی بوچھار شروع کردی تھی —

صرف تحریر کا طریقہ بدل گیا بلکہ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ ایک مکمل اور وسیع زبان کو ترک کر کے ایک کم مایہ اور ناقص زبان کو اختیار کررہے ہیں - ہندی کو اردو پر فوقیت دینے سے جو اور دوسری خرابیاں پیدا ہوں گی ' جن کے متعلق بارہا ذکر ہوچکا ہے ' اس کی بھی وضاحت کی ہے - اب رہا رسم خط کا سوال تو اس باب میں بھی اردو رسم خط کو ترجیح حاصل ہے اس لئے کہ اس کے ذریعہ سے سنسکرت کے ان تمام الفاظ کا پوری طرح اظہار کیا جاسکتا ہے جو ہندی میں مستعمل ہیں - سنسکرت میں تالو سے ادا ہونے والے حروف کو عربی کے حروف موکدہ سے ادا کیا جا سکتا ہے - اگر ثانی الذکر کو سنی حروف (Dental) میں ضم کردیا جاے —

سنسکرت میں جو علحدہ علحدہ چار "ن" آتے ہیں ان کے تلفظ میں کوئی فرق نہیں ہوتا اور ان سبھوں کے اظہار کے لئے عربی "ن" کافی ہے - چونکہ اردو، مختلف زبانوں کے میل سے بنی ہے اس لئے اس کے بولنے والوں کو غیر زبانیں بولنے میں بہت سہولت ہوتی ہے - اس بات سے کوئی بھی انکار نہیں کرسکتا - ہندوستانی زبان کا خزانہ مالا مال ہے حالانکہ ہندوستان کی دوسری زبانیں بالکل بے مایہ ہیں - مضمون ان الفاظ پر ختم ہوتا ہے کہ ہمیں اپنی زبان کی حفاظت کے لیے کوشش کرنی چاهئے اس لئے کہ اس کے ساتھہ ہماری ملی زندگی وابستہ ہے (*) —

(*) مضمون نگار نے اس سلسلے میں برطانوی حکومت پر سخت حملے کئے ہیں جس نے اهل هند کو مطبع کی آزادی دے رکھی ہے - موصوف کا

(بقیہ بر صفحۂ آئندہ)

ہندوستانی زبان کی اہمیت روز بروز تسلیم کی جارہی ہے - ابھی حال میں نیپلز میں چینی کالج کی بجاے ایک مشرقی کالج قایم کرنے کا سوال اٹھا تھا - چنانچہ سب سے پہلے لوگوں کا ہندوستانی کی طرف خیال گیا - پروفیسر این - لاسیسیلیا (N. La Cecilia) نے جو اس کالج کے معتمد ہیں، ہندوستانی کی تعلیم کا نصاب تیار کیا ہے - اس میں ایک جگہہ یہ فقرہ ہے " ہندوستانی جسے اردو بھی کہتے ہیں، برطانوی ہند کی عالمگیر زبان ہے - اس میں عربی، فارسی، مغلی (ترکی) اور تاتاری کے عناصر شامل ہیں - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ برطانوی اثر کے تحت ہندوستان میں جو نیا تمدن قایم ہورہا ہے، اس کی زبان ہندوستانی ہے —

جدید تصانیف اور اخبارات کی اشاعت سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو کے خلاف جو تحریک اٹھی ہے اس کا کوئی اثر نہیں ہوا - اگرچہ ہندو بہت چیخ پکار کررہے ہیں لیکن اردو کی ترقی بدستور جاری ہے - گذشتہ سال سے جو نئے اخبارات شائع ہونا شروع ہوے ہیں ان میں سے بیشتر اردو میں ہیں نہ کہ ہندی میں - " اودھ اخبار " میں خصوصیت کے ساتھ

(نوٹ از صفحۂ گذشتہ)

خیال ہے کہ اردو کے خلاف جو تحریک اٹھی ہے اس کی ذمہ داری حکومت پر عائد ہوتی ہے - حکومت چاہتی ہے کہ ہندوستان کی مشترک زبان کو فنا کردے تاکہ اہل ہند پھر کبھی سنہ ۱۸۵۷ء کی شورش کی طرح یک جہتی کے ساتھہ کوئی کام نہ کرسکیں - یہ مضمون سعدی کے اس شعر پر ختم ہوتا ہے -

ع ہر کہ با فولاد بازو پنجہ کرد ساعد سیمین خود را رنجہ کرد

(*) نصاب اطالوی زبان میں ہے - صفحہ ۱۱ -

اس قسم کے مضامین نکلتے رہتے ہیں جن میں یہ بتایا جاتا ہے کہ نوجوان انشاپرداز اور شاعر اس تحریک سے مطلق متاثر نہیں ہوے اور نہ ان کے حوصلے پست ہوے - ہندو ان کی زبان پر، جو دراصل ایک مخلوط زبان ہے، حملے کئے جائیں لیکن وہ اپنا کام برابر کر رہے ہیں - ان واقعات کو دیکھنے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ سواے چند شورش پسند ہندوؤں کے جو رجعت پسندی کے حامی ہیں، باقی سب اہل ہند اردو زبان کو ترجیح دیتے ہیں - اس لئے کہ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل سے بنی ہے - ان کے نزدیک نہ قدیم بھاشا اور نہ وہ زبان جو سنسکرت کی بگڑی ہوئی شکل رکھتی ہے، اردو کا مقابلہ کرسکتی ہے - اردو کی مقبولیت کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ گذشتہ سال کلکتہ یونیورسٹی کے میٹریکولیشن کے امتحان میں ۲۵۲ طلبہ نے اردو لی اور صرف ۳۸ نے ہندی لی —

مسٹر کمپسن (Kempson) ناظم تعلیمات صوبہ جات شمال مغربی کی رپورٹ میں جو ۱۹ فروری سنہ ۱۸۶۹ ع کو شائع ہوئی یہ مندرج ہے کہ ان کے صوبے میں صرف ۲۴ ہندوستانی اخبارات ہیں - ان میں سے سولہ اُردو میں، پانچ ہندی میں اور تین اردو ہندی دونوں میں ہوتے ہیں یعنے ایک کالم میں اردو اور دوسرے میں ہندی - ان اخبارات میں ۱۳ ہفتہ وار ہیں، پانچ مہینے میں دو دفعہ شائع ہوتے ہیں، اور چھہ ماہوار رسالے ہیں - آگرہ سے ۲، الہ آباد سے ۴، کانپور سے ۲، بنارس سے ۱، مرادآباد سے ایک ہفتہ وار اور ایک ماہوار، بریلی سے ۲، جونپور، علی گڈھ شاہجہاں پور اور فرخ آباد سے ایک ایک شائع ہوتے ہیں —

اب میں اردو اور ہندی کے جدید اخبارات و رسائل کی حروف تہجی کے اعتبار سے فہرست پیش کرتا ہوں - مجھے جہاں تک علم ہے یہ سب میرے

گزشتہ خطبہ کے بعد وجود میں آے ہیں —

(۱) آئینۂ علم - یہ ایک ماہوار ادبی رسالہ ہے اور الہ آباد سے شائع ہوتا ہے - ۸ جزو پر مشتمل ہوتا ہے - ہندی میں برتلت دربن کے نام سے اسی کے مضامین شائع ہوتے ہیں —

(۲) آئینۂ طبابت - یہ ماہوار طبی رسالہ اردو میں شائع ہوتا ہے —

(۳) اخبار سر رشتہ تعلیم - گزشتہ سال ماہ فروری سے یہ ماہوار رسالہ لکھنؤ سے شائع ہونا شروع ہوا ہے- صوبۂ اودھ کے ناظم تعلیمات مسٹر ڈبلو ہنڈفورڈ کے زیر سرپرستی شائع ہو رہا ہے - یہ ۱۱ جزو پر مشتمل ہوتا ہے اور کبھی کبھی ضمیمہ بھی ساتھہ ہوتا ہے - اس کے نظم و نثر کے مضامین کا معیار اچھا خاصا بلند ہے - اس کی چند اشاعتیں ' جو از راہ کرم مجھے بھیجی گئی تھیں ' میرے پیش نظر ہیں - اس کے بعض مضامین نہ صرف اہل ہند بلکہ یورپین لوگوں کے لئے سبق آموز ہیں - اس کے مدیر خصوصی اور دیگر کارپرداز ہندوستان بھر میں اپنی ادبی قابلیت کے لئے مشہور ہیں —

(۴) اخبار الاخبار - مرزا پور (بہار) سے اردو میں شائع ہوتا ہے -

(۵) اتالیق پنجاب - یہ اخبار "سرکاری اخبار" کے بند ہونے کے بعد اس کی جگہہ شائع ہوتا ہے - لیکن اول الذکر کے مقابلے میں اس میں ادبی رنگ زیادہ غالب ہے - میں نے یہ راے اس کی چند اشاعتوں کو دیکھہ کر قایم کی ہے جو مسٹر ہولروڈ ناظم تعلیمات صوبۂ پنجاب نے از راہ لطف مجھے بھجوائی ہیں —

(۶) بدیادرش - یہ ہندی میں مہینے میں دو مرتبہ میرٹھہ سے شائع ہوتا ہے - یہ دراصل اردو کے نجم الاخبار کا ہندی ایڈیشن ہے -

(۷) برهم گیان پرکاش - اس ماهوار رساله کے بانی بابو کشب چندر هیں جو برهموسماج کے بانی هیں -

(۸) برتنت درپن - یه اردو کے " آئینهٔ علم " کا هندی ایڈیشن هے اور اله آباد سے ماهانه شائع هوتا هے -

(۹) چشمهٔ علم - یه پٹنه سے اردو میں مهینے میں دو دفعه نکلتا هے - اس سے پہلے اس شہر میں کوئی اخبار نه تھا - اس کی پہلی اشاعت یکم جنوری سنه ۱۸۶۹ ع کو شائع هوئی - یه چھوٹی تقطیع پر هے اور هر صفحه پر دو کالم هوتے هیں - میرے ایک مهربان نے اس کی ایک اشاعت مجھے بھیجی هے - اس کا ایک مضمون مجھے پسند آیا جس کا موضوع بنی نوع انسان کے اتحاد سے متعلق تھا -

(۱۰) دبدبهٔ سکندری - یه سکندره سے شائع هوتا هے - " علی گڈه گزٹ " مورخه ۷ مئی سنه ۱۸۶۱ ع میں اس اخبار کے چند اقتباس میری نظر سے گذرے -

(۱۱) ڈاکه پرکاش - اس کی ایک اشاعت میں " برٹش انڈین ایسوسیشن " کو مشورہ دیا هے که نئی منتخب شدہ پارلیمنٹ سے تین باتوں کی درخواست کرے (۱) سول سروس کا امتحان اهل هند کے لئے هندوستان میں منعقد کیا جائے - (۲) اهل هند کو ارکان بلدیه منتخب کرنے کا حق حاصل هو - (۳) پولس والوں کی تنخواهوں میں اضافه کیا جاے تاکه وہ پبلک سے رشوت لینا چھوڑ دیں -

(۱۲) دهرم پرکاش - یه آگرہ سے شائع هوتا هے - دراصل یه هندی کے " پاپ موچن " کا اردو ایڈیشن هے جس کے مدیر جوالا پرشاد هیں جو بابو کشب چندر کی طرح وسیع المشرب شخص هیں -

(۱۳) غالب الاخبار - یه هفته وار اخبار اردو میں سیتا پور سے نکلتا هے -

یکم مارچ سنه ۱۸۶۹ ع سے اس کی اشاعت شروع ہوئی - ہر دو شنبه کے روز شائع ہوتا ہے * -

(۱۴) گنجینۂ علوم - یه ماہوار رساله مرادآباد سے شائع ہوتا ہے - گنگا پرشاد اس کے مدیر ہیں † -

(۱۵) گنجینۂ احکام - یه ماہوار قانونی رساله ہے - یه بھی مرادآباد سے شائع ہوتا ہے -

(۱۶) جگت سماچار - یه ہفته وار اخبار ہندی میں ہر سه شنبه کو شائع ہوتا ہے - مطبع "دارالعلوم" میں طبع ہوتا ہے -

(۱۷) جلوۂ طور - یه ہفته وار اردو اخبار میرٹھ سے شائع اور مطبع "سلطان المطابع" میں طبع ہوتا ہے - باوجود اس نام کے اس کے مدیر ایک ہندو رائے گنیشی لال ہیں - یه بڑی تقطیع پر شائع ہوتا ہے اور ۸ صفحات پر مشتمل ہے - ہر صفحه پر ۲ کالم ہیں - سرورق پر بطور عنوان چار اشعار لکھے ہوئے ہیں - دو فارسی کے اور دو اردو کے - ان اشعار کا مضمون یه ہے که اس اخبار کے ذریعه کوہ سینا کی سی تجلی پیدا ہوگی جس نے حضرت موسیٰ جیسے جلیل القدر پیغمبر کی آنکھیں خیرہ کر دی تھیں -

(۱۸) کوکب عیسوی - میرٹھ کے "اخبار عالم" مورخه ۲۶ اگست سنه ۱۸۶۸ ع میں اس کے متعلق اعلان میری نظر سے گذرا —

---

* "اخبار" علیگڑہ - مورخه ۲۶ مارچ سنه ۱۸۶۹ ع —

† موصوف ہندوستانی کے نامور انشاپردازوں میں سے ہیں - میں نے اپنی کتاب "تاریخ ادب ہندی و ہندوستانی" میں ان کے متعلق ذکر کیا ہے - دوسرا اڈیشن - پہلی جلد ، صفحه ۴۸۷ —

(۱۹) خیرالمواعظ - یہ ہفتہ وار اخبار اردو میں دھلی سے شائع ہوتا ہے - ۸ صفحات پر مشتمل ہے - اس کے پیش نظر یہ مقصد ہے کہ اصول اسلام کی نشر و اشاعت کرے اور مسیحی تعلیمات کا رد کرے -

(۲۰) مخزن العلوم - یہ ماہوار رسالہ بریلی سے شائع ہوتا ہے - اس کے مدیر کا نام کالی چرن ہے - اس کی پہلی اشاعت دسمبر سنہ ۱۸۶۷ ع میں ہوی - اسی کو " بریلی مخزن " بھی کہتے ہیں - یہ روھیلکھنڈ کی مجلس ادبی کی طرف سے شائع ہوتا ہے جس کا مرکز مراد آباد میں ہے -

(۲۱) مفید عام - یہ جدید اردو اخبار مہینے میں دو دفعہ نکلتا ہے - ۲۰ صفحات پر مشتمل ہوتا ہے اور ہر صفحہ پر دو کالم ہوتے ہیں - اس کی تقطیع چھوٹی ہے - مسٹر کمپسن ناظم تعلیمات صوبۂ شمال مغربی نے جو نمبر نمونتاً میرے پاس بھیجا ہے اس کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس پر ادبی رنگ غالب ہے - اس اشاعت میں صوبۂ شمال مغربی کی تعلیمی رپورٹ ، تعلیم نسواں ، کلکتہ یونیورسٹی ، سیہور اور جے پور کی تعلیمی حالت ، ہندوستان کے مختلف حصوں کی زرعی پیداوار ، قدیم فلاسفہ اور مورخین ، سبکتگین اور محمود ، مہر ، ذوق ، گویا اور وزیر کے دیوانوں کے انتخاب ، اور اسی قسم کے دوسرے موضوعوں پر مضامین درج ہیں - میرے خیال میں اردو میں پہلی مرتبہ سکوں پر مضمون اس اخبار میں شائع ہوا ہے - مضمون کا عنوان " عہد جہانگیر کے سکے " ہے - ان کے ۲۰ نمونے بھی پیش کئے گئے ہیں جو نہایت واضح ہیں -

(۲۲) مفید انام - یہ ہفتہ وار اخبار فتح گڑھ سے اردو میں نکلتا ہے - اس کے مدیر ایک ہندو شنکر سروپ ہیں - اس اخبار میں عورتوں کو مسیحی

مذہب قبول کرنے سے باز رکھنے کی تجاویز پیش کی گئی ہیں اور اس غرض سے ایک انجمن قایم کرنے کا اعلان کیا گیا ہے - چنانچہ ۴۰ ہزار روپیہ انجمن کے لیے جمع بھی ہو گیا ہے —

(۲۳) میور گزت - میرٹھ کا ماہوار اردو رسالہ ہے - اسے "جلوہ طور" کا ضمیمہ تصور کرنا چاہئے جس کی نسبت میں ذکر کر چکا ہوں - سر ڈبلو میور کے زیر سر پرستی یہ رسالہ گزشتہ سال سے شائع ہو رہا ہے - رسالہ کا نام موصوف کے نام پر رکھا گیا ہے - یہ چھوٹی تقطیع میں ۸ صفحات پر مشتمل ہے اور ہر صفحہ پر دو کالم ہیں - رسالہ کے سر ورق پر عربی کا یہ مقولہ بطور عنوان مندرج ہے: "کل جدید لذیذ" —

(۲۴) نیر اکبر - یہ اردو اخبار بجنور سے نکلتا اور "زین المطابع" میں طبع ہوتا ہے - ہر ہفتہ جمعرات کے روز شائع ہوتا ہے - جمعرات کا روز مسلمانوں میں حدیث نبوی کے مطابق متبرک مانا جاتا ہے - حدیث یہ ہے: خدا نے ساتویں دن (یعنی ہفتہ) اور پانچویں دن (یعنی جمعرات) کو متبرک قرار دیا ہے —

(۲۵) پاپ موچن - یہ "دھرم پر کاش" کا ہندی ایڈیشن ہے جس کے متعلق میں ابھی ذکر کر چکا ہوں —

(۲۶) راجپوتانہ گزت - اس اردو اخبار کے کرنل کیٹنگ (Keating) بانی ہیں - اس کا مقصد یہ ہے کہ اس کے ذریعے سے انگریزی حکومت کے احکام و قواعد کی صوبے میں نشر و اشاعت عمل میں آے * —

(۲۷) روہیلکھنڈ اخبار - یہ ہفتہ وار اردو اخبار مراد آباد سے شائع ہوتا ہے -

* علی گڑہ کا "اخبار" مورخہ ۴ دسمبر سنہ ۱۸۶۸ ع —

(۲۸) سبے بلود - نینی تال کا هندی اخبار هے جو مهینے میں دو دفعه شائع هوتا هے —

(۲۹) تذکرہ بال گوبند - یه ماهوار اردو رساله آگرہ سے شائع هوتا هے —

(۳۰) ادیپور گزٹ - ۲۴ نومبر سنه ۱۸۶۸ ع کے اودھ اخبار میں اس هندی اخبار کی اطلاع مندرج تهی - اخبار مذکور نے افسوس ظاهر کیا هے که "اودیپورگزٹ" کو دیوناگری رسم خط میں چھپنے کے باعث کامیابی نهیں حاصل هوئی - بر خلاف اس کے اگر وہ اردو رسم خط میں چھپتا تو زیادہ مقبولیت حاصل هوتی —

(۳۱) عمدۃ الاخبار - اسی نام کا ایک اخبار بریلی سے نکلتا هے لیکن یه گزشته سال سے مدراس سے شائع هونا شروع هوا هے - اس کا پورا نام "عمدۃ الاخبار، اعظم الانوار" هے - یه مهینے میں تین بار چھوٹی تقطیع پر نکلتا هے - هر صفحه پر دو کالم هوتے هیں - میرے پرانے شاگرد مسٹر ای سیسے (E. Sice) نے، جو آج کل پانڈی چری میں هیں، اس کی ایک اشاعت کا نمونه مجھے بھیجا هے - اس میں نواب کرناٹک کی تصویر بھی هے جن کا خطاب عمدۃ الدوله تھا - نواب صاحب موصوف کے نام پر اخبار کا نام رکھا گیا هے -

میں اس وقت ادب اردو سے تعلق رکھنے والی تصانیف کا نهایت اختصار سے ذکر کروں گا - میری کتاب "تاریخ ادب هندی وهندوستانی" کا دوسرا ایڈیشن تیار هورها هے اور عنقریب شائع هوجاے گا - اس کے متعلق میں اس موقع پر کچھه زیادہ نهیں کهنا چاهتا —

ڈبلو آر هولرائڈ، ناظم تعلیمات پنجاب کی رپورٹ بابته سنه ۱۸۶۷ - ۱۸۶۸ ع کے دیکھنے سے معلوم هوتا هے که صوبۂ پنجاب میں زیر تبصرہ سالوں میں

هندوستانی میں ۱۵۲ کتابیں شائع هوئیں - ان میں سے ۱۱۹ اردو کی هیں اور ۳۳ هندی کی - اسی تعداد میں ۱۴ وہ بھی شامل هیں جو اردو اور هندی دونوں میں هیں ' ایک اردو کی کتاب رومن رسم خط میں هے اور دو اردو اور انگریزی میں هیں - ان میں سے بیشتر لاهور دهلی اور لدهیانه سے شائع هوئی هیں —

مسٹر کمسن ' ناظم تعلیمات صوبۂ شمال مغربی کی گزشته رپورٹ میں ' جو ۲۰ فروری سنه ۱۸۶۹ ع کو شائع هوئی ' ان مطبوعات کا تذکرہ هے جو سنه ۱۸۶۸ ع میں رجسٹر کرائی گئی هیں - ان کی تعداد ۳۶۸ هے - ان میں سے ۲۵۳ هندوستانی کی هیں - ۱۴۶ اردو کی اور ۱۰۷ هندی کی - جن میں سے گیارہ ایسی هیں جو اردو اور هندی دونوں میں هیں اور صرف چھه اردو کی کتابیں رومن رسم خط میں هیں - ۱۸ کتابیں هندی اور سنسکرت کی هیں - ۵ اردو اور انگریزی کی جن میں سے دو رومن رسم خط میں هیں - ۲ اردو اور فارسی کی هیں - ایک اردو ' عربی اور انگریزی کی هے اور ایک اردو ' هندی اور انگریزی کی هے - اسے هم سه زبانی لغت تصور کر سکتے هیں جس کے مصنف کا نام مسٹر ایچ ایس ریڈ (Read) هے -

مذهبی کتب کی مقبولیت بدستور قایم هے - گزشته سال بیس کتابیں هندوؤں میں تبلیغ کرنے کی غرض سے هندی میں شائع هوئی هیں - مسلمانوں کے لیے اردو میں سترہ کتابیں شائع هوئیں - یه تعداد اس اعتبار سے بہت زیادہ هے که مسلمانوں کی تعداد هندوستان میں به نسبت هندوؤں کے بہت کم هے - مدارس کی نصابی کتب میں ۱۳ اردو میں اور ۱۳ هندی میں شائع هوئیں - تعلیم کے متعلق حکومت کی طرف سے جس قدر کتابیں شائع هوی هیں ان کی تعداد وهی هے جو پبلک کی شائع

کردہ کتب کی ہے - لیکن آخرالذکر کم تعداد میں طبع ہوتی ہیں - ہندی میں بہ مقابلہ اردو کے قصے کہانیوں کی کتابیں زیادہ مقبول ہیں- اس بات پر مسٹر کمپسن ناظم تعلیمات صوبہ شمال مغربی نے تعجب ظاہر کیا ہے - خوشی کی بات ہے کہ موصوف بھی میری طرح اس رجعت پسندانہ تحریک کے خلاف ہیں جس کا مقصد یہ ہے کہ اردو کی جگہ ہندی کو ترقی دینے کی کوشش کرنی چاہئے —

صوبۂ شمال مغربی کے لفٹنٹ گورنر نے بہترین ادبی مضامین پر انعام دینے کا جو اعلان کیا تھا اس کا نتیجہ حسب دلخواہ نکلا - چنانچہ ۸۰ مضامین (قلمی اور مطبوعہ) اس کمیٹی کے روبرو پیش ہوے ہیں جو ان کی جانچ کے لئے مقرر کی گئی ہے —

(سر) سید احمد خاں کی اردو لغت کے چار صفحات نمونتاً مجھے بھیجے گئے ہیں - موصوف نے ایس هاول (Howell) اور میری راے کے مطابق اس لغت کا نام، پرانا یورپین نام ترک کرکے، "لغت زبان اردو" رکھا ہے - مسٹر هاول نے میری راے بھی سید صاحب موصوف کو پہنچادی ہے - اس لغت میں وہی عربی ٹائپ استعمال کیا گیا ہے جو سید صاحب کے مطبع میں ہے اور جس میں موصوف نے "انجیل مقدس کی تفسیر" شائع کی ہے - اس ٹائپ کا بڑا عیب یہ ہے کہ اس کے حروف بہت چھوٹے ہیں - مسٹر دبلو ہنڈفورڈ (Handford) نے افسوس ظاہر کیا ہے، اور میں بھی ان کے ساتھ متفق ہوں، کہ اس لغت میں الفاظ کی اصل نہیں بتائی گئی - اگرچہ اس سے انکار نہیں کہ الفاظ کے معنی اور مطلب صاف زبان میں بیان کئے گئے ہیں اور ہر لفظ کے بعد اس کے مشتقات لکھے گئے ہیں - لیکن علیگڑہ کے "اخبار" مورخہ ۵ فروری سنہ ۱۸۶۹ ع میں اس لغت پر جو

تنقید شائع ہوئی ہے میں اس سے متفق نہیں - مثلاً یہ اعتراض معقولیت پر مبنی نہیں کہ چونکہ اردو زبان سنسکرت ' عربی اور فارسی سے بنی ہے اس لیے دیسی لوگوں کے لئے ان زبانوں کی علاحدہ علاحدہ لغتیں تیار کرنی چاہئیں - رہے خالص ہندوستانی الفاظ ' تو ان کے لیے لغت کی کیا ضرورت ہے ' اس لئے کہ ہر کس و ناکس انہیں سمجھتا ہے اور روز مرہ میں استعمال کرتا ہے - یہ بات ایسی ہوئی کہ کوئی یہ کہے کہ بھلا فرانسیسی زبان کی لغت کی کیا ضرورت ہے ' لاطینی کی لغت کافی ہے ' اس لیے کہ فرانسیسی زبان اسی سے نکلی ہے - ان الفاظ کے لیے جو عام طور پر استعمال کئے جاتے ہیں اور جن کے معنی ہر شخص جانتا ہے ' علاحدہ لغت کی کیا ضرورت ہے - اسی طرح انگریزی کی لغت کی بھی ضرورت نہیں - اس کے لیے سیکسن زبان اور فرانسیسی کی لغت سے کام نکل سکتا ہے - بڑے افسوس کی بات ہے کہ ایسے مفید کام پر اس طرح غیر ذمہ داری کے ساتھ تنقید کی جائے - لوگوں کی عادت ہے کہ وہ "دوسروں کی آنکھ کے تنکے کو دیکھ لیتے ہیں لیکن اپنی آنکھ کا شہتیر انہیں نظر نہیں آتا" - بوالو (Boileau) نے ٹھیک کہا ہے : "تنقید آسان ہے لیکن صناعی (Art) مشکل ہے" - سید صاحب جیسے جلیل القدر مسلمان کے حوصلے کو پست کرنے کی کوشش کرنا ' جو تعلیم و تمدن کے سچے دل سے حامی اور قدرداں ہیں ' کہاں کی انسانیت ہے - موصوف کے نکتہ چین جو خود علم و فضل میں زیادہ ممتاز درجہ نہیں رکھتے ' انہیں سبق دینے چلے ہیں - سچے محققوں کا یہ شیوہ ہے کہ وہ ایسی تصنیف کے عیوب سے چشم پوشی کرتے ہیں جو مجموعی طور پر اطمینان بخش ہو اور جس سے لوگوں کو فائدہ پہنچنے کی توقع ہو —

کچھ عرصے سے یورپ اور ہندوستان ' دونوں جگہ ' سنسکرت کی تعلیم

کا رواج بڑھ رہا ہے - بہت سی سنسکرت کی قدیم کتابیں ایسی ہیں جن پر گمنامی کا پردہ پڑا ہوا تھا اور سوائے چند پنڈتوں کے ان تک کسی کی رسائی نہیں تھی ، اب شائع ہورہی ہیں - عام طور پر تو ہندو لوگ سنسکرت مطلق نہیں سمجھہ سکتے - ان محققوں کو بھی جو سنسکرت زبان کے متعلق تحقیق کررہے ہیں بعض اوقات سمجھنے میں سخت دشواریاں پیش آتی ہیں - انہیں بھی خارجی مدد کی ضرورت رہتی ہے - چنانچہ آج کل بنارس میں سنسکرت کی جس قدر کتب شائع ہورہی ہیں ، ان کے ساتھہ شرح ضرور شامل ہوتی ہے - یہ شرح ہندی میں ہوتی ہے - مثال کے طور پر ہم ان ناموں کو پیش کرتے ہیں - "رام چندر نام سہسرا" جو "پدم پران" میں شامل ہے اور "رام گیتا" جو "اتار کا ندا ادھیا تما رامائن" میں شامل ہے ، "سیو پنچ ارتنا" جو سیوا کی منظوم تعریف ہے ؛ ویدیا امرت ، ویدانت تریا (یعنی تتوا بودھا ، آتما بودھا اور مکشا سدھی) —

ہندوستان میں آج کل جو جدید اخبارات اور کتب شائع ہو رہی ہیں ان میں عمرانی زندگی کی اصلاح پر زور دیا جارہا ہے - اس اصلاحی تحریک کا کام بعض انجمنیں کر رہی ہیں جن کے متعلق میں ذکر کرچکا ہوں - ان انجمنوں کی بدولت اصلاحی کام نہایت گرمجوشی کے ساتھہ ہورہا ہے - ان سب انجمنوں کا نصب العین یہ ہے کہ کسی نہ کسی طرح اہل ہند کو جہالت اور تعصب کے جوے سے نجات دلائی جاے اور ان کی فلاح کی راہیں تلاش کی جائیں - انہیں تعصبات کی وجہ سے آج ان میں ایسی رسوم رائج ہوگئی ہیں جنھیں ساری مہذب دنیا برا کہتی ہے - اس کے سوا ان انجمنوں کے مقاصد میں یہ بھی ہے کہ اہل ہند میں حب وطن کا جذبہ

پیدا کیا جاے ان میں مفاد عامه کا احساس پیدا هو اور اس غفلت کو دور کیا جاے جو آج عام طور پر سارے ملک پر چھائی هوئی هے —

انهیں مقاصد کے مدنظر بمبئی میں ایک نئی انجمن قایم هوئی هے جس میں هندو اور مسلمان دونوں شرکت کرتے هیں - اس انجمن کا نام " معراج پلتھه " هے - دیدہ و دانسته اس کے نام میں ایک عربی اور دوسرا هندی لفظ شامل کیا گیا هے * —

اس تبصرے کو هم " برهموسماج " کے ذکر سے شروع کرتے هیں اس لئے که یه انجمن اس وقت هندوستان میں سب سے زیادہ عملی کام کررهی هے - یه وحدانیت باری کے عقیدہ کو ماننے والوں کی انجمن هے - اس انجمن کی بدولت ترقی یافته لوگوں کی ایک جماعت قائم هوگئی هے جو اپنی اصلاحی تحریک کی اشاعت میں سرگرم عمل هے - اس جماعت کی وجه سے جو اصلاحات هورهی هیں انهیں دیکھه کر خوشی هوتی هے - هماری خواهش هے که کیا اچھا هو اگر یه اصلاحات هندوستان کے طول و عرض میں جاری و ساری هوجائیں - یه انجمن چالیس سال سے کام کررهی هے اور آهسته آهسته تنظیم میں منهمک هے - اب اس نے یه بات محسوس کرلی هے که جب تک ایک کلیسا کے مثل وہ اپنی تنظیم نه کرے گی اپنے ارکان پر قابو رکھنا دشوار هے - چنانچه اس جماعت کے سرگروہ بابو کشب چندر کا خیال † هے که کلکته میں مچھوا بازار روڈ پر ایک مندر قایم کیا جاے جہاں پابندی کے ساتھه عبادت کا

---

* " میرٹھه گزٹ " مورخه ۲۵ ستمبر سنه ۱۸۶۹ ع —

† برهموسماج کے ارکان اپنے پیشوا کو " آقا اور گنهگاروں کی ڈھارس " کہتے هیں اور جب کبھی اس کا سامنا هوجاے تو سجدے میں گر جاتے هیں —

انتظام کیا جاے گا * —

بنارس میں بعض وسیع المشرب اشخاص کا ارادہ ہے کہ ایک عبادت خانہ قایم کریں جس کے ایک حصے میں عیسائی ' ایک میں مسلمان اور ایک میں ہندو کے لیے عبادت کا انتظام کیا جاے گا † —

کلکتہ میں ایک انجمن قایم ہوئی ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ ہندوؤں کے مذہب میں جو رسومات قبیح داخل ہوگئی ہیں انہیں خارج کیا جاے - راجہ کرشن بہادر اس انجمن کے صدر ہیں - موصوف وہی ہیں جنہوں نے ہندوستانی کی متعدد کتب تصنیف کی ہیں اور " گے کی کہانیوں " (Fables de Gay) کا ہندوستانی ترجمہ کیا ہے - (اودہ اخبار مورخہ ۳۰ مارچ سنہ ۱۸۶۹ ع) —

لکھنو کی انجمن تہذیب کو روز بروز ترقی ہورہی ہے اور اس کی تنظیم بہتر ہوتی جارہی ہے - اگرچہ یہ انجمن اس قدر بنیادی اصلاحات نہیں چاہتی جیسے کے برهموسماج چاہتی ہے لیکن بہر حال عملی اعتبار سے وہ اصلاح کا کام کررہی ہے - اس کے قواعد میں ایک یہ ہے کہ اس انجمن میں ہر شخص بلا قید مذہب و ملت شریک ہوسکتا ہے ‡ - اس کے زیر اہتمام ہر ماہ لکچر ہوتے ہیں جو بعد میں " رسالہ " کے نام سے شائع ہوجاتے ہیں - میں ارباب انجمن کا تہ دل سے ممنون ہوں کہ انہوں نے مجھے اس کا ایک نمونہ بھیجا ہے - میں نے اسے نہایت

* انڈین میل ' مورخۂ ۱۳ اکتوبر سنہ ۱۸۶۹ ع —

† Saint Sepulcre کے کلیسا کی طرح جہاں مختلف مسیحی فرقوں کے عبادت کے لئے کمرے مقرر ہیں —

‡ اودہ اخبار مورخہ یکم جون سنہ ۱۸۶۹ ع -

شوق اور دلچسپی کے ساتھہ پڑھا - اس ماھوار رسالہ کے سرورق پر انجمن کے قیام کی تاریخ دو اشعار میں بیان کی گئی ھے * —

گذشتہ مارچ کے مہینے میں جے پور کی " راج پوتانہ سوشل سائنس کانگریس ' کا اجلاس منعقد ھوا - یہ انجمن اس ریاست کے مہاراجہ کے زیر سرپرستی قایم ھوئی ھے - اس کا نصب العین یہ ھے کہ مدارس قایم کیے جائیں اور نصابی کتب کی اشاعت بڑھائی جاے - اس کے ساتھہ انجمن زراعت اور صفائی کو ترقی دینا چاھتی ھے - لکھنو کی " انجمن تہذیب " کی طرح یہ انجمن بھی ایک رسالہ شائع کرتی ھے - اس رسالہ کی پہلی اشاعت میں یہ تجویز پیش کی گئی ھے کہ طبقۂ امرا کے بچوں کی تعلیم کے لئے ایک کالج قایم کیا جاے اور اس کالج میں ایسی تربیت کا انتظام کیا جاے جو امراء کے بچوں کو ملنی چاھئے - جہاں ریاضی ' کیمیا ' علوم فطری ' معاشیات ' اردو ' ھندی ' ھندوستان کی قدیم السنہ اور انگریزی کی تعلیم کے ساتھہ ساتھہ جسمانی ورزش اور شناوری وغیرہ کا پورا انتظام کیا جاے گا —

آگرہ کی " انجمن رفاہ خلائق " کا اجلاس گذشتہ جون کے مہینے میں منعقد ھوا تھا - اس موقع پر انجمن کے تمام کاموں کا جائزہ لیا گیا - میرٹھہ کی " انجمن مباحثہ " بھی بنارس کی "انجمن ادبی" کی طرح مضامین شائع کرتی رھتی ھے - معلوم ھوتا ھے یہ مضامین قدر کی نظر سے دیکھے جاتے ھیں اس لئے کہ انگریزی حکومت مضامین کے مجموعہ کو مستقل طور پر خریدتی ھے اور ان کے بعض حصوں کو دوبارہ طبع کراتی ھے —

---

* یہاں اشعار کا فرانسیسی ترجمہ ھے - (مترجم) -

" اودھ اخبار " مورخہ ۸ مئی سنہ ۱۸۶۹ ع میں چلار کی ایک انجمن کے قیام کا ذکر تھا جس کے ماہوار جلسے منعقد ہوا کرتے ہیں —

ایسٹ انڈیا ایسوسیشن (East India Association) جس کا مرکز علیگڑہ ہے ' اس غرض سے قایم کی گئی ہے کہ اہل ہند کے حقوق کی تمام جائز طریقوں سے نگہداشت کی جاے ' ان کی فلاح و تعلیم کے لیے کوشش کی جاے ' اور انہیں ترقی کی راہ پر گامزن ہونے میں مدد دی جاے - اس انجمن میں سنہ ۱۸۶۸ ع کے اواخر میں ۵۴ ارکان شریک تھے - انجمن ایک ماہوار اردو رسالہ شائع کرتی ہے جس میں انجمن کی رودادوں کے سوا لکچروں اور ان مباحثوں کا حال درج ہوتا ہے جو انجمن کے زیر اہتمام ہوتے ہیں * —

گزشتہ سال سر ڈبلو میور (W. Muir) کے زیر سرپرستی مراد آباد میں اس انجمن کی ایک شاخ قایم ہوئی - سال کے آخر میں اس انجمن کے جلسہ میں منشی گنگا پرشاد نے انجمن کی خدمت گذاری کے مقاصد پر تقریر کی اور کہا کہ ان مقاصد کو عملی جامہ پہنانے کی ایک صورت یہ اختیار کی گئی ہے کہ مغربی علوم کو رائج کرنے کی ہر ممکنہ کوشش کی جا رہی ہے - موصوف نے کہا کہ وہ خود علم ہیئت' کیمیا' فلسفہ اور تاریخ پر کام کر رہے ہیں - موصوف نے یہ بھی کہا کہ انجمن کے مقاصد میں یہ بھی شامل ہے کہ سیاسی مسائل معرض بحث میں لاے جائیں اور بالخصوص ان قوانین کے متعلق پوری بحث و تمحیص ہو جو اہل ہند کے لیے وضع کیے جاتے ہیں —

---

* علیگڑہ کا " اخبار " مورخہ ۱۸ دسمبر ۱۸۶۸ ع -

اس انجمن کی یہ بھی کوشش ہے کہ اہل ہند اپنی تہذیب و تمدن کی ترقی کی خاطر یورپ کا سفر کریں اور دنیا دیکھیں - اب بعض مشہور پنڈتوں نے بھی یہ بات تسلیم کرلی ہے کہ یورپ کا سفر کرنا شاستروں کی تعلیم کے خلاف نہیں ہے - چنانچہ انجمن چندے کے ذریعہ ایک رقم جمع کررہی ہے تاکہ یورپ جانے والوں کو مالی امداد بہم پہنچاے اور اپنا ایک پروگرام تیار کرے جس کے مطابق یورپ جانے والے عمل کریں —

انگریزی حکومت بھی حتی المقدور ان لوگوں کی همت افزائی کر رهی ہے جو تعلیم کی تکمیل کی غرض سے انگلستان جانا چاهتے هیں - اس کے لیے خاص وظائف مقرر کیے گیے هیں جو سالانہ عطا کیے جاتے هیں - چنانچہ بنگال ' مدراس اور بمبئی کے صوبوں کے لئے ایک ایک وظیفہ منظور ہوا ہے اور تین وظائف صوبۂ شمال مغربی ' پنجاب ' اودہ اور صوبۂ متوسط کے لیے مقرر ہوے هیں - آخرالذکر دونوں صوبوں کو باری باری سے ایک ایک سال کے بعد ایک وظیفہ ملے گا * —

نواب بنگال نے اپنے هم وطنوں کے لیے بہت اچھی مثال قایم کردی ہے کہ موصوف چند ماہ کے لیے یورپ تشریف لاے † - آپ کے همراہ آپ

---

* (سر) سید احمد خاں کے صاحبزادے سید محمد محمود کو صوبۂ شمال مغربی سے وظیفہ ملا ہے - موصوف اپنے والد محترم کے ساتھہ انگلستان پہنچ چکے هیں —

† انہیں نواب مرشد آباد بھی کہتے هیں - اسلامی حکومت کے زمانے میں مرشد آباد بنگال کا دارالسلطنۃ تھا - نواب صاحب کے خطابات یہ هیں جنہیں اخبارات نے عجب عجب طرح لکھا ہے ' منتظم الملک ' محسن الدولہ ' فریدوں جاہ ' نواب سید منصور علی خان بہادر نصرت جنگ نواب ناظم بنگال ' بہار و اوڑیسہ —

کے دونوں صاحبزادے' ایک ڈاکٹر اور میر وزیر علی کاظمی اور کرنل لیارڈ (Layard) تھے - میر وزیر علی کاظمی نہایت بذلہ سنج شخص ہیں- کرنل لیارڈ کے بھائی برطانوی ہند کے اعلیٰ عہدہ دار اور فاضل شخص گذرے ہیں - نواب صاحب مع اپنے ساتھیوں کے جب پیرس میں ٹھیرے تھے تو اس وقت مجھے ان سے ملاقات کا موقع ملا * - نواب صاحب اور ان کے ساتھی سب شیعہ ہیں - مذہبی پابندی میں شیعہ سنیوں سے زیادہ کٹر اور کھانے پینے کے معاملے میں محتاط ہوتے ہیں† - چنانچہ نواب صاحب اور ان کے ساتھیوں کو فرانس اور انگلستان میں بعض اوقات دعوتوں میں جانے سے انکار کرنا پڑا - بہرحال اس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ یورپ کے سفر کی بدولت نواب صاحب اور ان کے صاحبزادوں کے خیالات میں وسعت پیدا ہوئی ہوگی اور ان کے ساتھیوں اور نوکروں کی معلومات میں اضافہ ہوا ہوگا۔

اس سال ہندوستان کا ایک اور نہایت معزز شخص یورپ آیا ہے - ہماری مراد (سر) سید احمد خاں سے ہے - موصوف کو علمی اور ادبی دنیا

---

* اس سال مجھے دیوان متھرا داس سے بھی ملنے کا اتفاق ہوا جب کہ وہ لندن جاتے ہوئے پیرس میں ٹھیرے تھے - موصوف مہاراجہ کپورتھلہ اندھیر سنگھہ کے وزیر ہیں اور نہایت فاضل اور علم دوست شخص ہیں- نواب سلطان علی خاں سے بھی ملاقات ہوئی - میں موصوف کے ساتھہ ہندوستانی زبان میں گفتگو نہیں کرسکا اس لیے کہ وہ نہایت شستہ فرانسیسی بولتے ہیں - موصوف نے اپنی تعلیم کی تکمیل روس میں کی ہے-

† انھیں ہم مسلمانوں کے پروٹسٹنٹ کہہ سکتے ہیں - دیکھو میری کتاب "مسلمانان ہند کا مذہب" (Memoire Sur la Religion Musulmane dans l'Inde)

میں خاص اہمیت حاصل ہے - سید عبداللہ نے مجھ سے بیان کیا کہ مسلمانان ہند میں (سر) سید احمد خان کا سا عالم اس وقت کوئی اور موجود نہیں - نواب مرشدآباد کی طرح سید صاحب موصوف بھی اپنے صاحبزادوں کو اپنے ہمراہ یورپ لائے ہیں - آپ کا ارادہ ہے کہ دونوں صاحبزادوں کو بیرسٹری کی تعلیم دلائیں - سید صاحب کی آزادخیالی اور وسیع مشربی کا ثبوت آپ کی اس تصنیف میں موجود ہے جو انجیل مقدس پر لکھی ہے - آپ کا سفر کی غرض سے یورپ آنا بھی اسی وسیع مشربی پر مبنی ہے - سید صاحب موصوف نے علی گڑھ کے "اخبار" میں اپنے سفر یورپ کے تجربات شائع کیے ہیں اور اپنے قیام انگلستان کے حالات نہایت دلچسپ طریقے پر بیان کئے ہیں * - ہمیں پوری توقع ہے کہ ان حالات کو پڑھ کر بہت سے ہندوستانیوں کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوگی کہ اپنی تعلیم کی غرض سے انگلستان آئیں اور سفر سے فائدہ اٹھائیں - میری نظر سے یہ خبر گذری ہے کہ آئندہ سال بابو کشب چندر بھی یورپ تشریف لا رہے ہیں —

---

* سید صاحب موصوف کی میرے نوجوان دوست ایچ پامر سے خوب ملاقاتیں رہیں - جو آج کل کیمبرج میں ہیں - کوہ سینا کے کتبوں کی تحقیق میں ایچ پامر نے خاص نام پیدا کرلیا ہے اور ان کا علم و فضل آج مسلم ہوچکا ہے - موصوف نے کوہ سینا کے متعلق کئی ہزار کتبے جمع کیے ہیں اور ان کی عبارتوں کو حل کیا ہے جن پر بہت کچھ بحث مباحثے ہوچکے ہیں - موصوف نے ان کتبوں کی مدد سے یہ تحقیق کیا ہے کہ کوہ سینا کے علاقے میں پہلی صدی عیسوی میں ایک مستقل بستی آباد تھی —

(سر) سید احمد خان کے قیام انگلستان کے دوران میں ہندوستان کے ایک اور مشہور مسلمان عالم سید اولاد علی اپنے وطن واپس گئے ہیں تاکہ وہاں لوگوں کو تمدن جدید کی برکات سے آگاہ کریں اور اخبار بھی کا شوق پیدا کرائیں جس کے ذریعہ یورپ کی ترقیات کا حال اہل ہند کو معلوم ہو اور ہندوستان میں ترقی کی جو مساعی ہورہی ہیں ان کے متعلق لوگوں کو واقفیت حاصل ہو - سید اولاد علی آئرلینڈ کی جامعۂ ڈبلن میں اردو پڑھاتے ہیں اور کئی برس سے ڈبلن میں مقیم تھے —

ہندوستان میں اب تک اصلاحی اور علمی انجمنوں میں زیادہ فرق نہیں کیا جاتا - شاہ جہاں پور میں جو انجمن سنہ ۱۸۶۲ ع میں قایم ہوئی ہے اس کے پیش نظر علمی اور ادبی کام ہے - در اصل صوبۂ شمال مغربی میں یہ پہلی علمی انجمن ہے - ارکان انجمن کی مستقل مزاجی کی بدولت یہ انجمن ترقی کررہی ہے - اب اس وقت جلال آباد اور دوسری تحصیلوں میں اس کی پانچ شاخیں موجود ہیں - اہل ہند کا تعلق جن جن مسائل سے ہے ان سب پر اس کے جلسوں میں بحث ہوتی ہے اور کتابوں کے ذریعہ خیالات کی نشرو اشاعت کی جاتی ہے- چنانچہ انجمن ' بلدیات کے صدر اور اعلیٰ عہدہ داروں کے ساتھہ تعلقات رکھتی ہے اور متعلقہ مسائل ان کے گوش گذار کرتی رہتی ہے - چنانچہ بعض اوقات انہیں اپنا ہم خیال بناکر ضروری اصلاحات رائج کراتی ہے - ابھی حال میں اس انجمن کی مساعی کی بدولت برہمنوں اور کھتریوں نے اپنی شادی کی بعض رسوم قبیحہ ترک کردی ہیں - انجمن کی طرف سے ایک محتاج خانہ ' ایک مدرسہ سنسکرت اور عربی کی تعلیم کے لیے اور تین لڑکیوں کے مدارس قایم کئے گئے ہیں - انجمن زندگی کے ہر شعبہ

کی اصلاح کرنا چاہتی ہے - چنانچہ اردوشاعری میں جس میں عشق و محبت کے اظہار کے سوا کچھہ نہیں' انجمن تبدیلیاں پیدا کرنا چاہتی ہے - انجمن کے نزدیک ہندی زبان کی ترقی ضروری ہے اور اس کی صورت یہ ہے کہ اس میں سنسکرت لفاظ رائج کئے جائیں - انجمن کی طرف سے ایک ہندوستانی رسالہ "رفاہ خلائق" شائع ہوتا ہے (*) - اس رسالے کے ساتھہ تبادلہ کرکے انجمن میں نو دوسرے اخبارات آتے ہیں - ان میں پانچ اردو' ایک بنگالی' اور تین انگریزی کے ہیں - انجمن کے کتب خانہ میں اس وقت دو ہزار کتابیں موجود ہیں (†) —

اس انجمن سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اس کی وجہ سے علیگڑہ' لاہور' اٹاوہ' بنارس‡ ' بدایون ' مرادآباد اور الہ آباد میں انجمنیں قایم ہوئیں - مرادآباد اور الہ آباد کی انجمنوں کی روداد اردو میں شائع ہوتی ہے - الہ آباد کی انجمن کی روداد "کارروائی جلسۂ عام ماہوار" کے نام سے شائع ہوتی ہے - اس کے سوا کالی چرن "مخزن العلوم" کے نام سے الہ آباد سے ایک ماہوار ادبی رسالہ نکال رہے ہیں - مرادآباد کی انجمن کے رسالے کا نام "گنجِ العلوم" ہے —

(سر) سید احمد خاں نے جو "علیگڑہ انسٹیٹیوٹ' قایم کیا تھا وہ وزیر ہند ڈیوک آف ارگائل (Duke of Argyle) کے زیر پرستی خوب فروغ

(*) اس کے متعلق آگے ذکر آے گا —

(†) علیگڑہ کا "اخبار" مورخہ ۱۳ جنوری سنہ ۱۸۶۹ ع —

(‡) بنارس کی انجمن کا نام "انجمن ہند" ہے - بنارس چونکہ مرکزی جگہ ہے اس واسطے وہاں کی انجمن بھی سارے ہندوستان کے لئے ہے -

پا رہا ہے - مسٹر گرانٹ ڈف بھی جو نائب وزیر ہند ہیں ' اس کے حامی ہیں - سید صاحب موصوف بدستور انسٹیٹیوٹ کے معتمد اعزازی ہیں - اس انجمن نے بعض اہم انگریزی تصانیف کے اردو ترجمہ کا انتظام کیا ہے - اس کے علاوہ ہفتہ وار " اخبار " نہایت پابندی سے شائع ہوتا ہے جس میں نہایت مفید معلومات ہوتی ہیں - چنانچہ مجھے اپنے اس خطبے کی تیاری میں "اخبار" سے بہت کچھ مسالا ملا ہے - انسٹیٹیوٹ کی طرف سے ایک مدرسہ قایم کرنے کی تجویز پیش کی گئی ہے جہاں اعلیٰ تعلیم کا انتظام کیا جاے گا - اس مدرسہ کا نام " مدرسۂ مفید خلائق " ہوگا - یہ بھی تجویز ہے کہ اس مدرسہ میں ایک پنڈت سنسکرت اور ہندی کی تعلیم دینے کی غرض سے ملازم رکھا جاے (*) —

علیگڑہ کی انجمن کی طرح لاہور کی " انجمن پنجاب " بھی انگریزی تصانیف کا اردو ترجمہ کرا رہی ہے - مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں اس انجمن کے بانی اور صدر ڈاکٹر لیٹنر کی غیر موجودگی سے یہ کام غیر مکمل نہ رہ جاے - ڈاکٹر لیٹنر (Leitner) عرصہ سے ہندوستان میں مقیم تھے لیکن فی الوقت وہ انگلستان میں ہیں - موصوف نے سب سے پہلے یہ خیال پیش کیا تھا کہ لاہور میں ہندوستان کی کلاسی کی السنہ (سنسکرت عربی اور فارسی) کی تعلیم کے لئے ایک علحدہ جامعہ قایم کی جاے - مجھے افسوس کے ساتھہ بیان کرنا پڑتا ہے کہ موصوف کی اس تجویز کو حکومت نے منظور نہیں کیا حالانکہ پنجاب کے امراء و معززین نے اس تجویز کو کامیاب بنانے کے لئے بڑی بڑی رقمیں دینے کا وعدہ کیا تھا - اگر یہ تجویز منظور ہو

(*) "اخبار" مورخہ ۳۰ اپریل ' اور ۹ مئی سنہ ۱۸۶۹ ع -

جاتی تو یقیناً هندوستانی ادبیات میں نئی جان پڑجاتی - حکومت لاهور میں صرف ایک " مشرقی کالج " (Oriental College) قایم رکھنا چاهتی هے - حکومت کے پیش نظریه بات هے که اگر لاهور میں مشرقی یونیورسٹی قایم کی گئی تو وہ کلکته ' بمبئی اور مدراس کی یونیورسٹیوں سے بالکل مختلف نوعیت کی هوگی —

بهار کی " سائنٹفک سوسائٹی " کا صدر مقام مظفرپور هے - اس انجمن کے معتمد ایک فاضل مسلمان هیں - اس وقت انجمن میں (۳۱۸) ارکان هیں - اس تعداد میں ۱۲۸ مسلمان هیں ' ۱۶۲ هندو هیں اور ۲۰ یورپین هیں - انجمن کی طرف سے "اخبارالاخیار" شائع هوتا هے - تجویز هے که انجمن مشرقی زبانوں کی تعلیم کے لیے ایک کالج قایم کرے اور اس کے ساتھ مغربی علوم کی اشاعت کا کام بھی انجام دے (*) -

' دهلی انسٹیٹیوٹ کی عمارت یورپین وضع کی اب تیار هوچکی هے - عمارت میں ایک کتب خانه اور ایک عجائب گھر بھی شامل هے (†) -

امسال جو نئی انجمنیں قایم هوئی هیں ان میں " نینی تال انسٹیٹیوٹ" قابل ذکر هے - دوسری انجمنوں کی طرح اس کے بانی بھی چند متمول امرا هیں جو قوم میں روشن خیالی پھیلانا چاهتے هیں -

مشاعروں کا سلسله بدستور جاری هے - ایک بڑا مشاعرہ آگرہ میں ۱۹

(*) اودہ اخبار - مورخه ۱۰ نومبر سنه ۱۸۶۸ ع ' اخبار عالم مورخه ۲ مئی و ۸ جولائی سنه ۱۸۶۹ ع -

(†) ملاحظه هو بھولا ناتھ چندر کی کتاب " ایک هندو کا سفر" جلد ۲ - صفحه ۳۸۰ -

اکتوبر سنہ ۱۸۶۹ ع کو ہونے والا تھا - اودھ اخبار مورخہ ۲۸ ستمبر سنہ ۱۸۶۹ع میں ان شعرا کے لئے ہدایات کا اعلان شائع ہوا ' جو اس مشاعرہ میں شرکت کرنا چاہتے ہیں- ان ہدایات میں ہے کہ شعرا پہلے سے اپنے نام ' تخلص' مذہب عمر ' استاد کا نام اور یہ کہ آیا استاد زندہ ہے یا فوت ہوگیا ' مطبوعہ دوانین کےنام اور دوسرے حالات کے متعلق اطلاع کردیں —

ان انجمنوں کے قیام سے اہل ہند کا یورپ کے ساتھہ ربط قایم ہورہا ہے - اس ربط و ضبط کی بدولت ہندوستان میں ایک نئی تہذیب قایم ہونے والی ہے - اس وقت ہندوستان میں جس قدر جامعات ' مدرسے اور کالج قایم ہیں وہ سب کے سب مغربی اصول پر ہیں - آہستہ آہستہ اہل ہند مغربی علوم سے آشنا ہوتے جارہے ہیں - جس طرح انہوں نے قدیم علوم کی تحصیل میں کمال پیدا کیا تھا ' اب وہ مغربی اثر سے جدید طریق تعلیم میں بھی کمال پیدا کرنے لگیں گے (*) -

اس وقت تقریباً ۳۰ لاکھہ ہندو اور ۹۰ ہزار مسلمان سرکاری مدارس میں تعلیم پارہے ہیں - اس کے سوا ۳۳ ہزار لڑکے اور ۸ ہزار لڑکیاں مشن کے مدرسوں میں پڑھ رہی ہیں - اب تک جو بات سننے میں نہیں آئی تھی اس کی عملی صورتیں ہمارے سامنے ظاہر ہورہی ہیں - ہندو ' مسلمان اور پارسی اپنے خرچ سے مدارس قایم کررہے ہیں جہاں نہ صرف لڑکوں بلکہ لڑکیوں کی بھی تعلیم کا انتظام کیا جاتا ہے - یہ مدارس مغربی اصول پر چلائے جاتے ہیں - پورنیا کے ایک باشندے نے آٹھہ سو روپے سالانہ کی رقم اپنے گانوں میں مدرسہ قایم کرنے کے لیے وقف کردی ہے (+) -

(*) بنارس میں بعض اہل ہند لاطینی زبان سیکھہ رہے ہیں -

(+) " اخبار " - مورخہ ۲۶ اپریل سنہ ۱۸۶۹ ع -

ہندووں نے آپس میں مل کر یہ فیصلہ کیا ہے کہ مدارس میں دیسی عورتوں کو نارمل کی تعلیم دینے کے لیے ایک مدرسہ قایم کیا جاے - راجہ وزیانگرم نے وعدہ کیا ہے کہ وہ پانچ طالبات کا خرچ خود برداشت کریں گے - ملکی تعصبات کو تسلیم کرتے ہوے ارباب مدرسہ نے یہ قاعدہ بنادیا ہے کہ شروع شروع میں صرف اونچی ذات کی لوکیاں مدرسہ میں شریک ہوسکیں گی * —

مرادآباد میں مدرسۂ فوقانیہ کے جلسۂ افتتاحی کے موقع پر سر ڈبلو میور لفٹننٹ گورنر صوبہ شمال مغربی نے تقریر کے دوران میں کہا کہ یہ مدرسہ ایک مسلمان خاتون کے وقف کی بدولت قایم ہورہا ہے - اس وقف کا انتظام حکومت کے ہاتھ میں ہے - دراصل اس شہر میں پہلے سے امریکن مشن اسکول موجود تھا لیکن چونکہ اہل ہند نے کثیر تعداد میں مسیحی مذہب نہیں قبول کیا ہے اس لئے حکومت نے بظاہر اس معاملے میں غیر جانبداری کا اظہار کیا ہے - اگرچہ حکومت مشنریوں کے جوش عمل کی قدرداں ہے لیکن وہ ہندوستانی طلبہ کو ان کی تعلیم حاصل کرنے کی ترغیب نہیں دے سکتی —

اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہندوستانی نوجوان نہ صرف مشن اسکولوں بلکہ سرکاری مدارس میں جو تعلیم حاصل کررہے ہیں، اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ وہ عیسائیت کی طرف مائل ہوں - مسلمانوں کو خاص کر اس بات کا احساس ہے اور وہ اپنے بچوں کو ان مدارس میں بھیجنے سے احتراز کرتے ہیں - اس لئے کہ ان کا عقیدہ ہے کہ مذہب

(*) ہوم ورڈ میل - مورخہ ۲۵ جنوری سنہ ۱۸۶۹ ع —

اسلام کے علاوہ نجات کا کوئی دوسرا رستہ نہیں (*) - لیکن ہندو لوگ اس باب میں زیادہ سخت نہیں - چنانچہ انہیں کی جماعت کے افراد مسیحی تبلیغ سے متاثر ہو رہے ہیں - کیتھولک اور پروتسٹنٹ مشنری بھی غافل نہیں ہیں - وہ بھی اپنا کام انہماک سے کئے جاتے ہیں اور اپنی مساعی کا پھل پاتے ہیں - مسیحی جماعتوں کی تصانیف، رسائل اور اخبارات کی بدولت دیسی لوگوں میں مسیحی خیالات کا چرچا بڑھ رہا ہے اور وہ مسیحی دین کی طرف مائل ہو رہے ہیں - کپتان ایکمان (Aikman) کی کتاب "ثلاثة الکتب" جس سے ان کی مراد عہد نامۂ جدید، عہد نامۂ عتیق اور قرآن سے ہے، بہت مقبول ہوئی (†) - یہ کتاب اردو میں لکھی گئی ہے - مدراس کے اسقف نے از راہ عنایت اس کا ایک نسخہ مجھے بھیجا ہے - اس کتاب سے مسلمانوں میں ہل چل مچ گئی ہے - ہر جگہ مولویوں نے جلسے کرکے اس کا پڑھنا ممنوع قرار دیا ہے - اس کتاب میں مسئلۂ نجات اُخروی کے متعلق، جو عیسائیوں اور مسلمانوں میں مختلف فیہ چلا آتا ہے، بحث کی گئی ہے - چنانچہ انجیل اور قرآن کی رو سے مسلمانوں کے بہت سے عقاید کو غلط ثابت کیا گیا ہے ـــ

(*) حیدرآباد سندھ میں ایک مسلمان کے عیسائی ہو جانے کا یہ نتیجہ نکلا کہ دوسو مسلمان طالب علم جو مشن اسکولوں میں تعلیم پا رہے تھے اپنے نام خارج کراکے علحدہ ہو گئے ـــ

(†) یہ کتاب بڑی تقطیع پر ۲۳۲ صفحات پر حاوی ہے - اصل کتاب اردو میں ہے لیکن یورپین پبلک کے لئے مصنف نے اس کا انگریزی ترجمہ بھی شائع کردیا ہے -

کلکتہ کے مشہور و معروف اسقف نے گذشتہ سال اپنے پورے علاقے کا دورہ کیا - موصوف کشمیر اور پشاور بھی گئے - ہر جگہ خوب شاندار استقبال کیا گیا - موصوف اردو بلا تکلف بولتے ہیں جس کے باعث انہیں دیسی لوگوں سے میل ملاقات میں بیحد سہولت ہوتی ہے * - پنجاب میں ۳۰ مرکزوں کا معائنہ کیا - چار نئے کلیساؤں کی افتتاحی رسم ادا کی - آٹھ قبرستانوں کو قدوم میمنت لزوم سے سرفراز کیا ' ۳۶ جلسوں کے موقعوں پر ۳۶۵۰ اشخاص کا کنفرمشین (Confirmation) کیا جن میں سے ۷۳ دیسی لوگ تھے † - موصوف نے " انجمن اشاعت انجیل " کے روبرو کہا کہ چھوٹا ناگپور میں سات ہزار دیسی مسیحی زمرہ میں داخل ہوگئے ہیں - چنانچہ اس علاقہ کے لیے چار لیوتھری مسلک کے پادری مقرر کردئے گئے ہیں اور انہیں حق تبلیغ عطا کیا گیا ہے ‡ —

مسیحی مبلغین نے اس خیال سے کہ ہندوستانی رواج کی خلاف ورزی نہ ہو ' یہ فیصلہ کیا ہے کہ جو عورتیں عیسائی مذہب قبول کریں اور جو پہلے سے پردہ کی زندگی کی عادی ہوں ' وہ اپنے مکان میں ہی بپتسمے کی رسوم پوری کر سکتی ہیں - لیکن عشائے ربانی کے لیے انہیں اجازت ہوگی کہ برقع پہن کر کلیسا اور لوح مقدس کے قریب جائیں - ان کے لیے علحدہ جگہہ مقرر کردی جاتی ہے جہاں انہیں کوئی دوسرا شخص نہیں

---

* سب اخباروں میں میری نظر سے یہی گذرا کہ موصوف اردو بولتے ہیں نہ کہ ہندی —

† کولونیل چرچ کرانیکل - ۲ مارچ سنہ ۱۸۶۹ ع —

‡ انڈین میل - ۲۱ جولائی سنہ ۱۸۶۹ ع —

دیکھہ سکتا - بالکل اسی طرح جیسے Carmelites اور Clarisses کے کلیساؤں میں انتظام کیا گیا ھے - ریورنڈ آر کلارک نے امرتسر کے انگلی کن مشن کی سنہ ۱۸۶۸ ع کی رپورٹ میں یہ باتیں بیان کی ھیں —

جو لوگ ابھی حال میں مسیحی زمرہ میں شامل ھوئے ھیں ان میں مولوی سراج الدین پانی پتی قابل ذکر ھیں - ان کی عمر اس وقت سو سال ھے - وہ عمادالدین کے والد ھیں جن کے متعلق میں گذشتہ سال تذکرہ کر چکا ھوں اور تفصیلی حالات بیان کر چکا ھوں - وہ اس وقت انگریزی کلیسا میں پادری ھیں - ان کے بھائی خیرالدین اور ان کی بیوی اور خود عمادالدین کی بیوی کے سوا اس خاندان کے سب افراد نے عیسائی مذھب قبول کر لیا ھے - کریم الدین اب تک اسلام کے نام لیوا ھیں —

ایک دن آنے والا ھے جب پورا ھندوستان مسیحی جھنڈے تلے ھوگا - ھمیں پوری توقع ھے کہ " خدائے تعالی نے جو دن اس کام کے لیے مقرر کیا ھے وہ قریب آرھا ھے جب کہ زمین پر آسمان کی جانب سے ایک روشنی نازل ھوگی جس سے دنیا جگمگا اٹھے گی - اسی روز کا دنیا اتنے عرصے سے انتظار کر رھی ھے " * —

" صلیب والے علم " ایک دن دنیا میں چھا جائیں گے ، اور خدائے حی و قیوم کی انجیلی تعلیم دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچ جائے گی.....

---

* یہ " دعائے پیرس " کے ابتدائی اشعار ھیں - یہ دعا " دعائے لیون " میں شامل کر لی گئی ھے جو بہت قدیم ھے - لیکن ۱۶ مارچ سنہ ۱۸۶۹ ع کے احکام کی رو سے نئی دعا یا جسے Romano - lyonnaise کہتے ھیں رائج ھوئی ھے -

هندوستان کے جنوبی ساحلوں پر جہاں شیطان پوجا جاتا تھا، آج وہاں همارے آقا یسوع مسیح کے کلمات پاک کا غلغلہ بلند ہے اور مسیحی رواج لوگوں کے دلوں میں گھر کر رہے ہیں * —

اس صدی میں اعداد و شمار کو بہت اهمیت دی جاتی ہے - علیگڑہ کے "اخبار" میں جو اعداد و شمار شائع ہوئے ہیں اُنہیں میں اس جگہ درج کرتا ہوں - ان کے دیکھنے سے آپ کو سنہ ۱۸۶۸ - ۱۸۶۷ ع کی هندوستان کی مذهبی زندگی کا حال معلوم ہو جائے گا - یہ اعداد و شمار "هندوستانی نظم و نسق کے سالنامے" سے نقل کیے گئے ہیں - حکومت برطانیہ کے تحت اس وقت ۱۵ کروڑ نفوس زندگی بسر کر رہے ہیں ان میں سے دس لاکھ ترانبے هزار عیسائی ہیں، جن میں ۶۴۰۰۰۰ کیتھولک ہیں اور ۳۵۳۰۰۰ پروتسٹنٹ وغیرہ ہیں ‡ - گیارہ کروڑ هندو ہیں - تیس لاکھ بدھ مت کے متبعین ہیں - دو کروڑ پچاس لاکھ مسلمان ہیں - ایک کروڑ بیس لاکھ قدیمی باشندے ہیں جو نیم وحشیانہ زندگی بسر کرتے ہیں - ستر لاکھ پارسی یہودی وغیرہ ہیں -

یہ بات آسانی سے سمجھ میں آتی ہے کہ هندو لوگ زمرۂ اسلام میں شامل ہو رہے ہیں - لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ بعض

---

* ورق زورتھہ - "هولی ایئر" (Holy Year) - مناجات ۱۲ -

‡ هندوستان کے قدیم عیسائیوں کو "سینٹ طوماس کے عیسائی" کہتے تھے - ان کی مناجاتیں سریانی میں ہیں یہی حضرت مسیح کی زبان تھی - یہ لوگ رومن کیتھولک یا دوسرے کلیساء میں ضم ہونا نہیں چاہتے - بلکہ وہ اپنے تئیں یونانی کلیساء سے وابستہ ٹھیراتے ہیں اس لیے کہ آخرالذکر قدیمی مسیحیت سے قریب ترین ہے جس کی وہ نمائندگی کے دعویدار ہیں -

عیسائی لوگ نہ معلوم کیوں اسلام قبول کرلیتے ہیں - اگرچہ اس کی مثالیں کم ہیں لیکن ہیں ضرور - امسال بعض تنگدست یوروپین مسلمان ہوگئے - اردو کے ایک اخبار "چشمۂ علم" میں ان غریب یوروپینوں کے اسلام قبول کرنے کے متعلق حالات بیان کئے گئے ہیں - یہ محتاج لوگ مدراس کی ایک مسجد میں جمع ہوے اور شریک اسلام ہونے کا اعلان کردیا اور نماز میں اس کے بعد دوسرے مسلمانوں کے ساتھ شرکت کی - اس مذکورۂ بالا اخبار کے مدیر نے یہ لکھا ہے کہ اور بعض دوسرے یوروپینوں کا بھی یہی ارادہ تھا کہ اسلام قبول کرلیں، مکہ حج کے لئے جائیں اور اس طرح اپنا "پیٹ بھریں" —

ایک سوئٹزرلینڈ کے باشندے نے کمال کردیا - نہ صرف یہ کہ اس نے اسلام قبول کرلیا بلکہ اب وہ مشرقی لباس زیب تن کئے ہوے بلند پلکھنڈ میں تبلیغ کرتا پھرتا ہے - مجمعوں میں تقریریں کرتا ہے اور قرآن کے مطالب اردو میں بیان کرتا ہے حالانکہ اردو پر اسے قدرت حاصل نہیں * —

اب ہم ان ہمدردوں کا حال بیان کرتے ہیں جنھوں نے گزشتہ سال داعیء اجل کو لبیک کہا - میں سب سے پہلے ایک مشہور و معروف انگریز سر ہربرٹ ایڈورڈز کا ذکر کرتا ہوں جن کا گزشتہ دسمبر میں ۲۳ تاریخ کو انتقال ہوا - ان کی عمر صرف ۴۹ سال تھی - موصوف ایک حوصلہ مند فوجی آدمی تھے اور علم و فضل میں بھی ممتاز تھے - میں خاص کر سب سے پہلے موصوف کا ذکر اس لیے کر رہا ہوں کہ آپ کو ہندوستانی زبان سے خاص لگاؤ تھا - شملہ سے جو اردو اخبار نکلتا ہے وہ موصوف ہی کی سرپرستی میں شائع ہونا شروع ہوا تھا - اس اخبار کی زبان اردو ہے لیکن چونکہ چندہ دینے والوں میں کثرت ہندو لوگوں کی ہے اس لیے انہیں

* اودھ اخبار، مورخہ ۵ جنوری سنہ ۱۸۶۹ ع —

خوش کرنے کے لیے اس کی طباعت دیوناگری رسم خط میں ہوتی ہے - موصوف نے ایک نہایت عمدہ کتاب تصنیف کی تھی جس کا نام "پنجاب میں ایک سال" (A Year in the Punjab) ہے - میں نے یہ اعلان دیکھا تھا کہ اس کتاب کا اردو ترجمہ عنقریب لاہور سے شائع ہونے والا ہے - موصوف نے "دھلی گزٹ" میں متعدد مضامین بھی تحریر کیے جو نہایت دلچسپ تھے - آپ نہایت پابند مذہب عیسائی تھے اور آپ کی دلی خواہش تھی کہ سب ہندوستانیوں کو مشرف بہ مسیحیت کریں - آپ نے حکومت کی مذہبی غیر جانبداری کے خلاف متعدد بار صداے احتجاج بلند کی اور حکومت کی توجہ اس طرف مبذول کرائی کہ اسے مسیحی مبلغین کی حوصلہ افزائی کرنی چاہئے - موصوف ہی کی تحریک پران مدراس میں جہاں برطانوی نظم و نسق کی تعلیم دی جاتی ہے' انجیل کی تعلیم لازمی قرار دی گئی اس لئے کہ اس کی حیثیت کلاسکی ادب کی ہے - آج موصوف وہاں ہیں "جہاں بادل اور سایے کا وجود نہیں' اور جہاں آفتاب عدل کی قربت کے باعث ہم سر چشمۂ حقیقت کے دو بدو آ جا سکتے ہیں" * —

پچھلے سال دو مشہور ہندوستانی اہل قلم نے دعوت اجل کو لبیک کہا - ایک رجب علی بیگ سرور ہیں جن کے انتقال کی خبر میں نے علیگڑھ کے "اخبار" مورخہ ۱۴ مئی میں پڑھی - موصوف نثرنگار کی حیثیت سے اپنے ہم عصروں میں امتیاز رکھتے تھے اور عام روش کے خلاف اپنی خیالی تصانیف کو نثر کے ذریعہ ظاہر کیا - موصوف کا شاہکار "فسانۂ

---

* مناجات پیرس —

عجائب" ہے جسے اہل ہند فرصت کے اوقات میں پڑھ کر محظوظ ہوتے ہیں۔ اس کے سوا اور تصانیف بھی موصوف نے یادگار چھوڑی ہیں۔ آپ راجہ صاحب بنارس کے ہاں اعلیٰ خدمت پر مامور تھے اور راجہ صاحب آپ کا بہت لحاظ کرتے تھے۔ دوسرے مشہور شخص اسداللہ خان غالب ہیں۔ آپ اسد بھی تخلص کرتے تھے۔ آپ کا سرور سے دو ماہ قبل ۷۳ سال کی عمر میں انتقال ہوا۔ موصوف اپنے زمانے کے بہترین انشاپرداز اور شاعر تصور کئے جاتے ہیں۔ اہل ہند کا خیال ہے کہ موصوف کی تصانیف ابدالاباد تک زندہ اور باقی رہیں گی۔

علمی اور ادبی دنیا کی ان دو ممتاز شخصیتوں کے علاوہ دو اور ہیں جن کا گذشتہ سال انتقال ہوا اور جنھیں سیاسی حیثیت سے اہمیت حاصل ہے۔ نواب کریم شاہ برادر ٹیپو سلطان کی بیوہ کا ۱۷ اپریل سنہ ۱۸۶۹ء کو انتقال ہوگیا۔ حیدر علی شاہ کے زمانہ میں موصوفہ کی شادی ہوئی تھی۔ انتقال کے وقت بیگم صاحبہ کی عمر ۱۱۴ سال تھی۔ اور آخر وقت تک ہوش و حواس برقرار رہے۔ فروری سنہ ۱۸۶۹ء میں افضل الدولہ نظام الملک والیٔ حیدرآباد (دکن) نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ آپ پابند مذہب مسلمان تھے۔ آپ کے ہاں چار سو حافظ قرآن کی تلاوت میں مصروف رہتے اور ۳۴۰ علما اسلامی علوم اور مسئلے مسائل کی تحقیق میں مشغول رہتے تھے۔ میر محبوب علی خان بہادر جو اس وقت بہت کم عمر ہیں، آپ کے تخت و تاج کے وارث ہیں۔ انگریزی حکومت کی سرپرستی میں (سر) سالار جنگ وزیر اعظم ریاست حیدرآباد انصرام مملکت کے فرائض بحیثیت ولی انجام دے رہے ہیں۔ اگرچہ نظام کو اپنی ریاست میں جو رقبہ میں انگلستان سے بڑی ہے، پوری آزادی حاصل ہے لیکن وہ انگریزی اقتدار کو تسلیم

کرتے ھیں - اس ریاست کی آبادی ایک کروڑ دس لاکھ ھے - اس ریاست کے باشندوں کی زبان دکنی اردو ھے - گولکنڈہ کسی زمانے میں اس ریاست کا پایہ تخت تھا اور ھیرے کی کانوں کے لیے تمام عالم میں مشہور تھا- اب یہاں ھیرے نہیں نکلتے - سند باد جہازي نے وادی گولکنڈہ کے دلفریب حالات کہانی کے طور پر بیان کئے ھیں لیکن دوسرے مشہور سیاحوں نے جو یہاں کا ذکر کیا ھے وہ حقیقت پر مبنی ھے - چنانچہ مارکوپولو نے اپنے سفر نامے میں یہاں کے جو حالات بیان کئے ھیں انہیں ھم بطور مثال پیش کرسکتے ھیں -

بادشاہ ھو یا کوئی عامی، موت ھر ایک کے لئے برحق ھے - عربوں کا مقولہ ھے " حاصل زندگی موت ھے " —

—)•(—

جدید روسی تھئیٹر

از

مولوی عزیز احمد صاحب

(۱)

تماشا پسندی روس کی زندگی کا ایک فطری عنصر ہے - مظاہرے، معاشری جلسے، تماشے، درباری تمثیلیں، ہمیشہ روسیوں کی اہم ترین مصروفیتیں رہیں - وہ دماغی خصوصیتیں، اور جسمانی اہلیتیں جو روسیوں کو عام دنیا سے، اور عام مذاق سے کسی قدر جداگانہ طرز خیال اور طرز عمل کا عادی بناتی رہتی ہیں، ان میں اظہار و تمثیل اور تماشا پسندی کے عناصر کو بھی برابر فروغ دیتی ہیں —

ہمیشہ سے روس کو تھئیٹر سے ایک فطری مناسبت رہی - روس کے درباری رقص اپنا جواب نہیں رکھتے - روس کا رئیس طبقۂ تھئیٹر کی سر پرستی میں ہمیشہ منہمک رہا - روسی دہقان تک اپنی دہقانی تمثیلوں میں جواب نہیں رکھتے - اور اب انقلاب کے بعد بھی اشتراکی روس نے تھئیٹر کو اپنے مسلک کی تبلیغ کے لئے انتخاب کیا —

روسیوں کا طرز خیال، عام یورپ کے طرز خیال سے ہمیشہ مختلف رہا - بہیمیت کا ایک خفیف سا جزو ہمیشہ روسی ذہن پر حاوی رہا - نفسیاتی تجزیہ ان کے ادب پر، اور ان کے فنون پر اس قدر چھا گیا کہ

اُن کے زاویۂ نگاہ کا ایک جزو بن گیا - یہی بہیمیت ' اور یہی زاویۂ نگاہ روسی تھئیٹر پر بھی اپنا مستقل اثر جمائے بغیر نہ رہ سکا —

ایک اور بہت بڑی خصوصیت جو روس کو دنیا کے تمام ممالک سے ممتاز کرتی ہے ' حقیقت شعاری ہے - حقیقت نگاری کو روسیوں نے اپنے ادب میں مبالغہ کی حد تک بڑھا دیا - یہی حال ان کے فنون لطیفہ کا ہے - روسی حقیقت شعاری ہی نے روس کے تھئیٹر کو اس مرتبہ تک پہنچا دیا کہ جس حد تک یورپ کے عام تھئیٹر نے باوجود صدہا سال کے مسلسل ارتقا کے پرواز نہیں کی - پھر حقیقت شعاری کے متعلق ہمیشہ جدا جدا بلکہ اکثر متضاد نظریے پیدا ہوتے رہے - اِن متضاد نظریوں میں سے ہر ایک ایسا تھا کہ برابر کامیاب رہا —

باضابطہ روسی تھئیٹر کی عمر سو سال سے زیادہ نہیں - یہ صرف شخصی دماغوں کی رفعت پرواز اور بلند خیال اور عام روسی فنکاروں کی صلاحیت کا نتیجہ ہے کہ روسی تھئیٹر نے اس قدر کم مدت میں اتنی ترقی کی —

(۲)

استینلی سلاوسکی اور اس کا اثر

روسی تھئیٹر میں حقیقت شعاری کے رجحان کا اصلی باعث روسی ڈراما نگار ہیں - آسترووسکی (Ostrovsky) سے حقیقت شعاری کا آغاز ہوتا ہے - اور چیخوف میں یہ خصوصیت انتہا کو پہونچ جاتی ہے - ان ڈراما نگاروں کے شاہکاروں کو صداقت سے تمثیل کرنے میں سب سے پہلے اسی چیز کی ضرورت تھی کہ حتی الامکان حقیقت شعارانہ اسالیب تمثیل استعمال کیے جائیں - ایک شخصیت نے جس کو تھئیٹر کی حد تک فوق البشر

کہا جا سکتا ہے اس حقیقت شعارانہ اسلوب کو کمال پر پہنچا دیا - میری مراد روس کے مشہور ڈائرکٹر اسٹینی سلاوسکی (Stanislavsky) سے ہے - جس نے تمثیلوں کو نقل کے درجے سے بہت بلند کر کے خود زندگی کا ایک حصہ بنا دیا تھا - تمثیلیں ' زندگی اور فطرت کا حقیقی نمونہ بن گئیں —

قدیم تھیٹریکل اسالیب سے اس نے روسی تھئیٹر کو بالکل پاک کر دیا - پرانے طریقوں سے اسٹیج پر آنا ' ایک خاص لہجے میں باتیں ' خاص قسم کی حرکات — غرض وہ تمام چیزیں جن سے تصنع کا اظہار ہوتا تھا اس نے بالکل مٹا دیں —

اس کی تمثیلوں کا سب سے بڑا اصول یہ تھا کہ تمثیل خود زندگی کا ایک حصہ معلوم ہو - آپ اپنے پورے حواس کے ساتھ یہ محسوس کریں کہ یہ اصلی واقعات ہیں ' کوئی فرضی قصہ نہیں ہے - اس تمثیل کا آپ سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے - یہ تماشہ آپ کو دکھلانے ' آپ کو خوش کرنے کے لیے نہیں پیش کیا جا رہا ہے ' بلکہ یہ ایک اصلی فطری واقعہ ہے جو اسی طرح پیش آ رہا ہے جیسے زندگی کے واقعات پیش آیا کرتے ہیں - اسباب و علل کی زنجیر آپ کے نزدیک قصے کے نشیب و فراز کو نہیں بلکہ زندگی کے اتار چڑھاو کو نمایاں کرتی ہے -

یہ اثر پیدا کرنے میں اسٹینی سلاوسکی کو کمال تھا - فطرت کی نامکمل نقل ہونے کے بجائے اس کی تمثیلیں عین فطرت کا ایک حصہ بن جاتی تھیں - اور یہ " فطری اثر " پیدا کرنا کوئی معمولی کام نہ تھا - سب سے پہلے تو یہ کہ ایک غیر معمولی مہتمم تمثیل اور ادا آموز کی ضرورت تھی ' جو ہر خفیف سی خفیف چیز کو اُس فطری ہم آہنگی کا

ایک حصہ بنادے۔ ذراسی فروگذاشت پوری تمثیل کے مجموعی اثر کو خاک میں ملاسکتی تھی - اس لیے ہر ذرا ذرا سے نکتے پر نگاہ رکھنا، اور اس کو تمثیل کی حقیقت شعارانہ زنجیر میں منسلک کرنا اس کا بہت اہم فرض تھا۔

اس کامقصد یہ تھا کہ زندگی کے ہر رنگ کو، ہر فضا کو ہر شعبے کو انتہائی صداقت اور ہم آہنگی کے ساتھہ پیش کرے۔ اس کے لیے یہ چیزیں بہت ضروری تھیں —

(۱) اداکاروں (ایکٹروں) میں وہ نفسیاتی کیفیت پیدا کردی جائے کہ وہ بالکل کردار میں غرق ہو جائیں اور اس کی نمائندگی کر سکیں —

(۲) ایک ہم آہنگی پیدا کی جائے جو ہر ظاہری شے کو زندگی سے اور فطرت سے حتی الوسع مشابہ بنادے —

(۳) یہی ہم آہنگی تمثیل کے تمامتر ظاہری و باطنی عناصر میں پیدا کردی جائے کہ وحدت عمل، اور احساس وحدت ان میں بالکل طاری و ساری ہوجائے —

لیکن ان شرائط کو پورا کرنے میں اس قدر روحانی اور جسمانی محنت کی ضرورت تھی کہ جس کا اندازہ مشکل سے کیا جا سکتا تھا۔ استنیلی سلاوسکی کے اداکاروں کو جن نفسیاتی اصول کی پابندی کرنی پڑتی تھی وہ ان روحانی ریاضتوں سے کہیں زیادہ مشکل تھے، جو زہاد اپنی عقبیٰ سنوارنے کے لیے کیا کرتے ہیں۔ ان اداکاروں کو اپنے فن سے اس قدر محبت تھی کہ جس قدر کسی روحانی پیشوا کو اپنی ریاضتوں سے ہوسکتی ہے۔ اپنے نفس پر اپنے فن کی خاطر جس قدر جبر وہ کرتے

تھے' اُنھیں کا حصہ تھا —

استینلی سلاوسکی کا لائحۂ عمل یہ تھا - پہلے تو انتہائی مہلت سے بہت بحث و مباحثے کے بعد کسی ڈرامائی شاہکار کو تمثیل کے لئے منتخب کیا جاتا - انتخاب کے بعد مہینوں تک ڈرامے کے متن میں یا عمل میں خفیف تغیر کا سلسلہ جاری رہتا - ایک آدھ سال تک اور بسا اوقات سالہا سال تک اُس کے مطالعے کا سلسلہ جاری رہتا - اس مطالعے کا مطلب یہ تھا کہ ہر ادا کار ڈرامے کے ہر کردار کی ہستی کو پوری پوری طرح محسوس کر لے - صرف اُن واقعات تک کسی کردار سے اُن کا واسطہ محدود نہیں تھا جو ڈرامے کی روئداد کے دوران میں پیش آتے ہیں - بلکہ وہ اُس کردار کو زندگی کے ہر موقعے' ہر کیفیت' ہر حالت میں تصور کرتے تھے' اور اس کے جذبات' احساسات اور حرکات کو محسوس کرتے تھے —

پھر ان تمام محسوسات پر باہم تبادلۂ خیالات ہوتا تھا - وہ تمام تصورات جو اب تک انفرادی طور پر قائم ہوے تھے اب باہم بحث اور نفسیاتی تجزیے کے ذریعے تحلیل کئے جاتے تھے اور مجموعی طور پر ایک مجموعی اور مستقل تصور اُس کردار کا نشو و نما پاتا تھا - سالہا سال کی باطنی ریاضت' اور کامل توجہ کے بعد پہلے تو سایے کی طرح کردار کا تصور اُبھرتا تھا - پھر اس کے کچھہ کچھہ حرکات و سکنات تصور میں مادی شکل اختیار کرتے تھے - یہاں تک کہ آخر کار پورا کردار تصور میں ایک زندگی اختیار کرلیتا تھا - اور اداکار اُس زندگی میں جذب ہو جاتا تھا - اس طرح تمثیل کے لیے اُس کردار کی تخلیق ہوتی تھی - اور پھر اداکار اُس ذہنی تخلیق میں بالکل محو ہو جاتا تھا —

اپنے اداکاروں میں یہ روحانی صلاحیت پیدا کرنے کے لیے استینلی

سلاوسکی نے انتہائی سخت نفسیاتی تربیت کے اصول رائج کئے تھے - مثلاً اگر کسی ڈرامے میں تنہائی کی فضا پیدا کرنا اُس کا مقصد ہوتا تو وہ اپنے اداکاروں کو دور اُفتادہ اضلاع، اور ویران قلعوں اور جھونپڑوں میں منتشر کر دیتا اور دنیا بھر سے اُن کے تعلقات کو منقطع کر دیتا - یہاں تک کہ اُن کی ایک ایک حرکت، اُن کا تلفظ، اُن کا لہجہ، بلکہ اُن کا طرز خیال بھی ہر ممکن طریقے سے اُسی تنہائی کا اظہار کرنے لگتا - اگر تمثیل میں خوف، دہشت، یا رنج کا اثر ظاہر کرنا مقصود ہوتا تھا تو وہ بیدریغ ایسے ذرائع استعمال کرتا کہ اداکار وہی جذبات محسوس کریں، اور زندگی میں محسوس کرنے کا اثر تمثیل میں باقی رہے - یہی اُس کے کمال فن کا راز تھا - اِنہیں مہیب اور صبر آزما ذرایع کے استعمال کا یہ نتیجہ تھا کہ تمثیل میں نقل کا احساس بالکل باقی نہ رہتا بلکہ حقیقت اور تجربے کی فضا محیط ہو جاتی تھی - اداکار کا لہجہ، حرکت، جنبش یہاں تک کہ اُس کی نفسیاتی کیفیت، اُس کی دماغی حالت بالکل اُس کردار کی سی ہو جاتی —

خود اُس کا یہ حال تھا کہ خالی ہال میں کئی کئی گھنٹے وہ محض معمولی معمولی آوازوں کے امتحان اور اہتمام میں گذار دیتا — مثلاً گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز، یا پانی برسنے، یا اولے گرنے کی آوازوں میں حقیقت سے قربت پیدا کرنے میں اُس کے کئی کئی دن صرف ہو جاتے تھے -

اگر تمثیل ایک تقلیدی فن ہے تو شاید آج تک کوئی فن کار اُس فنی بلندی تک نہیں پہونچ سکا جس تک استینی سلاوسکی پہنچ چکا ہے - اُس کی شخصیت نے نہ صرف روسی تھئیٹر کو دنیا کا اہم ترین فنی ادارہ بنا دیا بلکہ خود فن تمثیل کو معراج کمال تک پہنچا دیا —

جدید روسی تھئیٹر کی تاریخ کا پہلا دور اُس کے نام اور اُس کے اثر سے وابستہ ھے - اشتراکیت کی مادہ پرستی نے اُس کے اسلوب کو مٹا دینے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا - پھر بھی اُس کا اسلوب فن نہ صرف زندہ ھے، بلکہ تاریخ تمثیل میں چند بہترین اسالیب میں شمار ھوتا ھے - جدید تھئیٹر کی شخصیوں میں بجز ایڈورڈ گارڈن کریگ کے اور کوئی شخص اُس کا ھم پلہ نہیں ــ

روس میں اُس کے فن کو " ھابرین " کمپنی نے، باقی و بر قرار رکھا - اور اشتراکیت کے تیز و تند جھونکوں میں اُس کے اسلوب کا چراغ گل نہ ھونے پایا - ھابرین کمپنی اُسی کی قایم کی ھوئی تھی - روس سے زیادہ یورپ نے اُس کے اسالیب کو قدر کی نگاھوں سے دیکھا - اگرچہ کہ پیروی کی ھمت نہیں کی - جدید روسی تھئیٹر کے دیگر مکاتیب کے بانی اور ناخدا بھی اکثر اسیٹنلی سلاوسکی کے شاگرد ھیں - اُن کے نظریے بالکل متضاد سہی پھر بھی یہ ایک اھم حقیقت ھے کہ اُنھوں نے اُسی کی آغوش تربیت میں نشو و نما پائی ھے ــ

(۳)

رد عمل - واختنگوف

اسیٹنلی سلاوسکی کے اُصول، اور اُن کے نتائج تھئیٹر کا معراج تھے - مگر طرز عمل کی دقتوں اور اُن تکلیفوں کی وجہ سے جو ان تمثیلوں کی تیاری میں پیش آتی تھیں، ایک شدید رد عمل کا شروع ھونا بھی ناگزیر تھا - چنانچہ بہت جلد مختلف طریقوں پر رد عمل شروع ھو گیا ــ

رد عمل کا ایک باعث یہ بھی تھا کہ وہ نفسیاتی ریاضتیں، جو اسٹینلی سلاوسکی نے اپنی تمثیلوں کے لیے اختیار کی تھیں، اور اپنے اداکاروں پر

عائد کی تھیں زیادہ سے زیادہ محض "جذباتی اور نفسیاتی مصوری" پر منتہی ہوتی تھیں - حقیقت شعاری کے اسالیب کی ایک آھنگی نے سب کو تھکا دیا تھا ' اور پھر اس حقیقت شعاری کا مدعا اور نتیجہ زیادہ سے زیادہ محض یہی تھا کہ زندگی کی نقل اس قدر کامل ہو کہ خود زندگی بن جاے - لیکن کیا صرف یہ اثر پیدا کرنے کے لئے وقت' محنت' ذھانت' اور عمل کی اس قدر قربانی جایز تھی؟

استینی سلاوسکی هی کے دو شاگردوں واختنگوف (Vaktangov) اور میئر هولڈ (Mayerhold) نے بالکل مختلف طریقوں پر رد عمل کی تحریکیں شروع کیں - اِن دونوں کے اصول و اسالیب میں باہم زمین و آسماں کا فرق تھا - واختنگوف کبھی سیاسی اُلجھنوں میں گرفتار نہیں ہوا اور اُس کا مکتب فن‌کاری کا جمالیاتی ذہوارہ رہا - میئر هولڈ نے اشترا کی تھئیٹر کا سنگ بنیاد رکھا اور سیاسی تحریکوں کے لئے تھئیٹر کو استعمال کرنا شروع کر دیا ــ

واختنگوف نے تھئیٹر کو حقیقت شعاری کے اس پرانے ' تھکا دینے والے اسلوب سے نجات دلانے کی کوشش کی - اُس نے نفسیاتی تجزیے کی باریکیوں کو فراموش کر دینا چاھا اور بجاے اس کے تھئیٹر کو اپنے جمالیاتی اسلوب سے ایک "افسانہ نما حقیقت" میں تبدیل کر دینے کی کوشش کی - وہ حاضرین اور سامعین سے کوئی چیز چھپانا نہیں چاھتا تھا - اداکار اپنے معمولی لباس میں آتے ' حاضرین کا خیر مقدم کرتے ' اسٹیج پر پہنچ کر وہ کپڑے پہن لیتے جو اس تمثیل کے کرداروں کے لئے ضروری تھے اور اس طرح حاضرین کی موجودگی میں اپنے آپ کو بدل کر ڈرامے کے کرداروں کا روپ اختیار کر لیتے ــ

یہ اسلوب جس کو واختنگوف نے "تھئیٹر کی افسانہ نما حقیقت" کہا

ہے ، بہت قابل غور ہے - واختنگوف نے تھئیٹر کے اصلی بنیادی اصولوں پر اپنے نظریے کی بنیاد رکھی ہے - تھئیٹر کی اصل محض نقل ہے - آپ سب جانتے ہیں کہ آپ کے سامنے ایک شخص کسی اور شخص کی نقل کررہا ہے - مگر آپ اِس وجہ سے مسرور ہوتے ہیں کہ وہ بہت اچھی نقل کررہا ہے - تو جب نقل ہی دلچسپی کو برانگیختہ کرنے والی چیز ہے تو اس کی کیا ضرورت کہ آپ کو یہ دھوکا دیا جاے کہ یہ نقل نہیں اصل ہے ؟ آپ سے ہر چیز کیوں چھپائی جاے ؟ اور آپ کو بجاے مسرور کرنے کے مسحور کرنے کے ذرائع کیوں اختیار کئے جائیں ؟ اگر اداکار اپنے فن میں کامل ہیں تو باوجود اس کے کہ وہ آپ کے سامنے بھیس بدل چکے ہیں ، محض اپنے کمال فن سے آپ کو متاثر کرسکتے ہیں ، ہنسا سکتے ہیں ، رلا سکتے ہیں —

یہ اسلوب واختنگوف کا اختراع کردہ نہیں تھا - بلکہ قدیم یونانی اور ہندوستانی تھئیٹر کی ایک ترقی یافتہ صورت تھی - ہندوستان قدیم کے پرانے ناٹک جس طرح کھلے میدانوں میں یا درختوں کے نیچے تمثیل کئے جاتے یا جس طرح اثینہ وغیرہ میں کھلے ہوے تھئیٹر میں ایسے اسٹیج پر جس کے چاروں طرف حاضرین ، کی نشستیں ہوتی تھیں ، ایسکائی لس اور یورپیڈیز کے ڈرامے ایکٹ کئے جاتے تھے - اسی طرح بیسویں صدی میں ان تمام ذرائع کو استعمال کرکے ، جو ترقی یافتہ تھئیٹر کے لئے ضروری ہیں ، واختنگوف نے بھی اپنے حاضرین پر وہی کیفیت طاری کرنے کا انتظام کیا تھا - اور اس طرح وہ تصنع کی فضا جو حقیقت شعاری کے اسالیب پر کہر کی طرح چھائی ہوئی ہے ، اس کے اُصول کی وجہ سے بالکل صاف ہوجاتی ہے —

کمال نقل واختنگوف کے اسلوب کی جان ہے - اُس کی تمثیلیں معاشری جلسے معلوم ہوتے ہیں - اُس کے اسلوب کا نتیجہ یہ ہے کہ تمثیل حقیقت میں بدل

ناتی ہے اور حقیقت تمثیل میں- اور حقیقت اور تمثیل میں امتیاز مشکل ہوجاتا ہے-

(۴)

"ہابرین" جماعت - اور اُس کا فن -

لیکن واختنگوف کا سب سے بڑا کارنامہ یہودی اداکاروں کی اُس
ماعت کا نشو و نما ہے جو "ہابرین" کہلاتی ہے - یہودیوں کی ایک جماعت
و ہجرت کر کے روس آئی تھی ' اُن صلاحیتوں سے مالا مال تھی جو استیلی
لاوسکی کی نطر میں نفسیاتی اداکاری کے لئے ضروری ہیں - استھیلی سلاوسکی
، ان کے مذہبی غلو میں وہ نفسیاتی صلاحیتیں تلاش کر لیں جو اُس کے اسلوب
ہ لیے ضروری تھیں- اُن کی روحانی ریاضت کو اُس نے تھئیٹر کی طرف
نتقل کر لیا- اِس کام کے لئے اُس نے اپنے شاگرد واختنگوف کو انتخاب
یا - واختنگوف عبرانی زبان کا ایک حرف بھی نہیں جانتا تھا ' پھر بھی
ن کی روحانی صلاحیتوں کو جلا دیکر اُس نے اُن کو اداکاروں کی اُس
ماعت میں تبدیل کردیا جو آج اپنے فن کے لحاظ سے عدیم المثال ہے -
ات سال کی انتہائی سخت پابندیوں اور قیود کے بعد یہ جماعت اِس قابل
سمجھی گئی کہ اِسے تھئیٹر کے فن کی تعلیم دی جائے —

یہودیوں کی روحانی صلاحیتیں ' جب روسی تھئیٹر کے حقیقت شعارانہ
فسیاتی اسالیب کے قالب میں ڈھال لی گئیں تو قدیم و جدید عناصر
ی اِس یکجائی کا نتیجہ بہت اُمید افزا نکلا - اِن دونوں قوموں کی
صوصیات ' جن میں بعد المشرقین تھا ' جب یکجا ہوگئیں تو ایک ایسا
نکارانہ اسلوب پیدا ہوا کہ جو آج تک باوجود اشترا کی تھئیٹر کے
ور وشر اور مادہ پرستی کے روس میں استیلی سلاوسکی اور واختنگوف
، فن کو زندہ کئے ہے - محض اس جماعت کی وجہ سے ماسکو ' تھئیٹر

کے متعلمین، اور متعلقین کے لیے ایک ضروری درس گاہ اور زیارت گاہ ہے —

انتہائی نفس کشی کے ساتھ "ہابرین" جماعت کے افراد وہ تمام تکلیفیں جھیلتے ہیں، جن کی وجہ سے اُن کے فن میں صداقت پیدا ہو سکے - تمام غیر متعلقہ عناصر سے اپنے نفس کو پاک کر کے، اُس نفسیاتی کیفیت کو پیدا کرنے کی سعی کرتے ہیں جو اُن کے فن کے لیے ضروری ہے - اور اِن کوششوں میں صرف اہم اداکاروں ہی کو راہبانہ اور بے لطف زندگی گذارنے پر مجبور نہیں ہونا پڑتا بلکہ معمولی معمولی اداکاروں کو بھی جو محض چھوٹے چھوٹے کرداروں کی نمائندگی کرتے ہیں تمام دلچسپ مصروفیتوں کو ترک کردینا پڑتا ہے - کیونکہ کامل اور حقیقی اداکاری کی روحانی نفسیات کی فضا پیدا کرنے کے لیے روحانی قوتوں اور صفاے قلب کے مکمل استعمال کی ضرورت ہے —

برسوں تک ایک ڈرامے کی مشق کی جاتی ہے - اور انتہائی صبر و استقلال کے ساتھ ایک ایک لفظ، اور ایک ایک حرکت کی گہرائی کو محسوس کیا جاتا ہے - جس محنت سے فرانس کا مشہور ادیب گستاف فلابیر (Gustav Flaubert) ہر ہر لفظ پر غور کرتا تھا کہ کیا یہی وہ صحیح لفظ ہے جو اُس خاص معنی کی، جو اُس کے دماغ میں ہیں، ترجمانی کر سکتا ہے؟ جس طرح اُس کے خیال میں ایک اور صرف ایک لفظ اُس خیال کو صحیح طور پر ادا کر سکتا تھا، اور وہ اُس لفظ کی تلاش میں انتہائی دماغی ریاضت سے کام لیتا تھا، بالکل اُسی طرح اِس جماعت کا ہر ہر فرد ایک ایک لفظ، ایک ایک جملے کے صحیح طرز ادا کی فکر میں گھنٹوں غرق رہتا ہے - اور ہر ہر حرکت کا صحیح طریقہ ڈھونڈھنے اور سونچنے میں حتی الامکان دماغی محنت، اور زیادہ سے زیادہ وقت صرف کرتا ہے -

چھہ مہینے تک تو یہ نظام العمل رہتا ہے کہ ہر ادا کار اپنے ڈسک پر بیٹھا رہتا ہے - ڈرامہ پڑھ کر سنایا جاتا ہے اور اُس پر دن رات بحث ہوتی ہے - ہر ادا کار اپنی رائے کا اظہار کرتا اور نئے نئے طریقے سونچتا ہے- اس طرح پہلے انفرادی تصورات قائم کئے جاتے ہیں جو مکمل مباحثوں کے بعد ایک "اجتماعی تصور" میں تحلیل ہوجاتے ہیں —

اُس کے بعد پھر انفرادی تصورات کا بلند تر سلسلہ شروع ہوتا ہے جس میں ہر ادا کار اپنے کردار کے ہر پہلو پر غور کر کے اُسے مکمل طور پر محسوس کرنے' اور پوری قدرت کے ساتھہ اُس کو ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہے - ان کوششوں میں مزید چھہ مہینے صرف ہو جاتے ہیں - اسی دوران میں اہم کرداروں کے متعلق بحث بھی ہوتی ہے —

جب کرداروں کی تقسیم کا وقت آتا ہے تو اس کا لحاظ رکھا جاتا ہے کہ کون شخص کس کردار کو بہترین طریقے پر محسوس کرچکا ہے اور اُس کے اظہار کی پوری قدرت رکھتا ہے - ان تمام چیزوں کا لحاظ رکھہ کے کرداروں کی تقسیم کی جاتی ہے - اس طرح مشق شروع ہونے سے پہلے ایک سال محض ان ابتدائی تیاریوں میں گذار دیا جاتا ہے —

ان ابتدائی منازل کے بعد جب تمثیل کی مشق کا وقت آتا ہے تو مہتمم تمثیل' ہر چیز پر حاوی ہوجاتا ہے' اور تمثیل کے تمام تر عناصر ترکیب کو ترتیب دینا شروع کرتا ہے تاکہ وہی حقیقت شعارانہ ہم آہنگی پیدا ہوسکے جو اس جماعت کی منتہائے نظر ہے - ادا کار' منظر کش مصور' موسیقی نگار اور دوسرے تمام عناصر تخلیق اس کے اشاروں پر کام کرتے ہیں —

مناظر کا مصور' مشق کی تمام تر مجلسوں میں موجود رہتا ہے' اور

اُس وقت تک اپنا کام شروع نہیں کرتا جب تک تمثیل کی روح عمل کو سمجھہ نہ لے - اور اس کے بعد وہ پردوں پر اپنے فن سے ڈرامے کی روح عمل کی ایک خاص نقطۂ نظر سے نقاشی کرتا ہے - اسی طرح موسیقی نگار کا فرض یہ ہے کہ وہ ڈرامے کی ہر چیز کو پیش نظر رکھہ کے اپنے نغمے موزوں کرے، جو بجاے خود مستقل طور پر ڈرامے کی روح عمل کو موسیقیانہ اسلوب سے دھراتے رہیں —

اسی طرح ملبوسات، اور سامان آرائش کے انتظام میں بھی خاص اہتمام کیا جاتا ہے - اور جملہ ادا کاروں کی متفقہ راے لی جاتی ہے —

(۵)

تائروف اور مذاقیہ تمثیلیں

استینی سلاوسکی کی سخت حقیقت شعاری کے خلاف جہاد کرنے والوں میں ایک مشہور فن کار تائروف (Tairov) ہے، جس نے تھیٹر کی فضا کو بدلنے کے لیے مذاق کا عنصر نمایاں کرنے کی کوشش کی - اُس کے اسلوب تمثیل میں نفسیاتی تجزیے اپنی شکل بدل کر محض مذاقیہ مظاہرے بن جاتے ہیں - اِس مذاقیہ اسلوب کی بنیاد "مثالیت" (Symbolism) پر رکھی گئی ہے - اور اس مثالیت کو مذاق کا رنگ دیدیا گیا ہے - اس کے تھیٹر میں ادا کار عجیب و غریب حرکات، اور رنگ برنگ ملبوسات کی فضا میں ایک خاص اثر پیدا کرتا ہے - ان قہقہوں کی تہہ میں جو ان تمثیلوں کا ظاہری نتیجہ ہیں، انتہائی گہرے تاثرات، اور احساسات حاضرین کے دلوں میں پیدا ہوتے ہیں - اس طرح تائروف نے اس "جدید روسی طرز ادا" کی بنیاد ڈالی جس کو اشتراکی تھیٹر نے بھی اپنے لیے انتخاب کیا - لیکن بجاے خود اس کا اپنا تھیٹر اور اُس کا مکتب تمام سیاسی شورشوں

اور اشتراکی تحریکوں سے ہمیشہ پاک رہا - اس حیثیت سے اُس کا اور واختنگوف کا کردار، اور ان دونوں کی صداقت قابل تحسین ہے کہ انھوں نے اپنے اسالیب فن کو سیاسی مصالح کا شکار نہیں ہونے دیا —

(۲)

اشتراکی تھیٹر

انقلاب روس کی ذمہ دار شخصیتوں نے شروع ہی سے تھیٹر کی اہمیت کو محسوس کرلیا تھا - اور اس امر کو اچھی طرح جان گئے تھے کہ اُن کے سیاسی اُصول کی تبلیغ کا بہترین ذریعہ بننے کی صلاحیت، تھیٹر میں بدرجۂ اتم موجود ہے - اِس لیے اُنھوں نے کوشش شروع کردی کہ تھیٹر کو اشتراکی تبلیغ کے لیے استعمال کریں —

"اکتوبر تھیٹر" اس سلسلے کی سب سے پہلی کوشش تھی - وجہہ تسمیہ محض یہ تھی کہ اِس میں اکتوبر کے انقلاب کے واقعات کی تمثیلیں پروپاگنڈا کے طور پر پیش کی جاتی تھیں —

تھیٹر کے لیے حکم نافذ کیا گیا کہ قدیم متمدن اور متمول طبقے کے محبوب اسالیب تمثیل کے خلاف جہاد کیا جاے - اور اُن تمام تمثیلی اِداروں کی مخالفت کا علم بلند کیا جاے جو سیاسیات اور اشتراکیت سے بے تعلق ہیں —

میئر ہولڈ (Mayerhold) نے جو اشتراکی تھیٹر کا بانی ہے، سارے ملک کے تھیٹروں کو فوجی حلقوں کی طرح کئی حلقوں میں منقسم کردیا تاکہ سارے ملک میں ان کے ذریعے پروپاگنڈا ہوسکے - "اکتوبر تھیٹر" تقریباً فوجی تھیٹر تھے - تمثیلوں میں فوجی عنصر نہ صرف نمایاں رہتا تھا، بلکہ اس کا کام یہ بھی تھا کہ ممکن ذریعے سے قدیم تھیٹر کے خلاف جہاد کرے -

نتیجہ یہ ہوا کہ جملہ جمالیاتی لطافتوں، فنی خوبیوں سے ملک کے عام مذاق کو بیگانہ کرنے کی انتہائی سعی کی جانے لگی - مقصد محض یہ تھا کہ تھیٹر کی جمالیاتی اور فن کارانہ خصوصیتوں کو مٹا کر اس کو اشتراکیت کی نشر و تبلیغ کا ایک ذریعہ بنا دیا جاے - فن اور جمالیاتی خوبیوں کی ذاتی دلکشیوں کی طرف توجہ نہ کی جاے - فن کا مقصد محض فن نہ رہے، بلکہ وہ ان کے مقصد خاص کا آلۂ کار بن جاے - اشتراکی تھیٹر کی ارتقا کے ساتھہ ساتھہ اس مدعا میں بھی خفیف خفیف تبدیلیاں ہوتی رہیں - رفتہ رفتہ اس کا احساس ہونے لگا کہ صرف قدیم تھیٹر کے خلاف جہاد کافی نہیں - ضرورت اس کی ہے کہ نئے نئے اسالیب اختیار کئے جائیں جن کے باعث اشتراکی تبلیغ میں ترغیب اور دلچسپی کا عنصر بہت بڑھ جاے - چنانچہ اس قسم کے اسالیب اختیار کیے گیے جن میں باوجود دلچسپی اور دلکشی کے اصلی مقاصد یعنی اشتراکیت کی نشر و تبلیغ کا پورا لحاظ رکھا گیا - بلا استثنا ہر ڈرامہ جو اشتراکی تھیٹر میں تمثیل کیا جاتا ہے، اشتراکی پروپا گنڈا کا ذریعہ بنایا جاتا ہے —

اس موجودہ اشتراکی تھیٹر کا صحیح تصور قایم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ جدید روس کی فضا سے آگاہی ہو - تھیٹر میں اشتراکیت کی فضا زندگی سے بھی زیادہ نمایاں معلوم ہوتی ہے —

اشتراکی تھیٹر کا اسلوب دنیا کے ہر ممکن اسلوب سے مختلف ہے - "جسمانیت" اور "مشین پرستی" کا جیسا بیزار کن مظاہرہ اشتراکی تھیٹر میں ہوتا ہے، سواے روسیوں کے اور دنیا کے کسی حصے کی پبلک شاید اس کی تاب لا سکے - اسٹیج مشینوں، آلات حرب، اور دیگر آلات سے

آراستہ ہوتا ہے - تھئیٹر کی آرائش تک میں اقلیدس کی شکلوں سے کام لیا جاتا ہے - اداکاروں کی حرکت میں مشینوں کی حرکت سے مشابہت پائی جاتی ہے اور پوری کوشش اس امر کے لیے ہوتی ہے کہ تھئیٹر بھی ایک مشین معلوم ہو - ایک مکمل بالشویک مشین —

(۷)

میئر ہولڈ اور اس کا فن

اِس اِنقلابی اور اشترا کی تھئیٹر کا اصلی بانی استینی سلاوسکی کا مشہور شاگرد میئر ہولڈ ہے - اُسی نے تھئیٹر میں اشتراکیت کی تبلیغ کی صلاحیت پیدا کی، اور اُس کے فن سے اُس کی ذھانت کا پتہ چلتا ہے - سب سے پہلے تو اُس نے ایک طرح کی "مثالیت" پیدا کرنے کی کوشش کی اور تائروف کی طرح ایک حد تک اس اسلوب میں کامیاب بھی رہا - پھر اُس نے تھئیٹر میں "مشین پرستی" کی وہ فضا پیدا کی، جو آج روسی تھئیٹر کی سب سے بڑی خصوصیت ہے - خود اس کو اپنی کوششوں میں شاید زیادہ کامیابی نہ ہو سکتی اور اُس کا چراغ واختنگوف کی جمالیاتی کوششوں کے مقابلے میں نہ چل سکتا مگر اس کو انقلابیوں نے پوری پوری مدد دی - سویت حکومت نے اس کے تھئیٹر کو نہ صرف ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچائیں بلکہ اُسے اپنی سیاسی تبلیغ کا ایک مستقل جزو قرار دیا - میئر ہولڈ کا تھئیٹر اشتراکیت کی تبلیغ کا فن کارانہ مرکز بن گیا —

سنہ ۱۹۲۱ء میں میئر ہولڈ اور اُس کے ساتھی درشیون (Dershavin) نے اداکاری کے سرکاری "کارخانوں" کی بنیاد ڈالی —

میئر ہولڈ کے فن کے اہم اُصول یہ ہیں :

(۱) جسمانی تربیت، اور آزاد حرکتیں جن کا مقصد استیلی سلاوسکی کے

روحانی نفسیاتی اُصول کا رد عمل ہے —

(۲) حرکات انسانی، اور مشینوں میں ایک قسم کی مشابہت پیدا کرنا جس کا مقصد یہ ہے کہ بنی نوع انسان بھی مجموعی طور پر ایک مشین کی طرح کام کرے —

(۳) اداکاری کے جمالیاتی اور نفسیاتی اُصول کے خلاف جہاد —

(۴) تھئیٹر میں کارل مارکس کے اس نظریے کو عمل میں لانا کہ ہر شے "غیر شخصی" اور "اجتماعی" ہو - میئر ہولڈ کا مقصد صرف ایک ہے یعنی ان تمام ذرایع سے اشتراکیت کی تبلیغ - اپنے نظریوں کی تاویل میں میئر ہولڈ نے استینی سلاوسکی کے اصول پر کئی اعتراضات کئے ہیں - سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ استینی سلاوسکی کے یہاں نفسیاتی کیفیتوں کے پیدا کرنے میں روحانی قوت بہت زیادہ صرف کی جاتی ہے، لیکن تھئیٹر محض جسمانی مظاہرے کا فن ہے - اسی اعتراض کو رد عمل کی وجہ بنا کے جسمانی مظاہروں کو اُس نے اپنے نظریے میں بہت زیادہ اہمیت دی ہے - "جسمانی مظاہرے" سے میئر ہولڈ کی مراد یہ ہے کہ حاضرین کی توجہ بجائے اداکار کی جذباتی یا نفسیاتی کیفیت کے اُس کے ظاہری حرکات، اس کے جسم کی جنبش کی طرف منعطف رہے - اور تمثیل میں جو کچھ اثر پیدا ہو وہ اداکار کی ظاہری، جسمانی جنبشوں، اور حرکتوں سے پیدا ہو —

اِس مقصد کے لئے میئر ہولڈ نے شدید ریاضت جسمانی کو اپنے اسلوب کے لئے ضروری قرار دیا تاکہ اداکار اپنے جذبات کی ترجمانی محض اپنی حرکات و سکنات سے کر سکے - اُس کو اِس بات کا بھی دعویٰ ہے کہ یہ جسمانی ریاضتیں اداکاروں، اور حاضرین، دونوں کے لئے صحت بخش اور مفید

ثابت ھوں گی - اور ان جسمانی ریاضتوں کی وجہ سے ملک اور معاشرے میں صحت کا ایک اثر پھیلتا جائے گا - وہ مشین نما حرکات و سکنات جو اس کے اداکاروں کی طریق اظہار ھیں ' انھی جسمانی ریاضتوں کا نتیجہ ھیں —

اس کے اس اسلوب کا ملک کے سیاسی رجحانات سے بہت اھم تعلق ھے - اور اسی وجہ سے میئر ھولڈ کے فن کے اس پہلو کو ایک ھم ملکی اور معاشری خدمت قرار دیا جاتا ھے کہ وہ تھیٹر کے ذریعے عوام الناس کی جسمانی نشوونما کی کوشش کر رھا ھے —

لیکن میئر ھولڈ کی کوششوں کا سب سے اھم ' اور سب سے زیادہ قابل غور حصہ ' اس کا یہ نظریہ ھے کہ تھیٹر میں " اجتماعی ' اثر پیدا کیا جائے - شخصی نفسیات کا کوئی لحاظ نہ کیا جائے - شخصی خصوصیات کو فنا کر دینا ' اور بنی نوع انسان کے "اجتماع ' کو اصلی اھمیت دینا اشتراکی مشرب کا ایک بہت اھم جزو ھے - اس اشتراکی اصول کو پوری پابندی کے ساتھ تھیٹر پر منطبق کرنے کی کوشش کس حد تک جائز ھے - تمثیل بجائے خود ایک مجموعی اثر کا نام ھے لیکن یہ مجموعی اثر انفرادی نفسیاتی کیفیتوں کی یکجائی سے پیدا ھوتا ھے - اگر انفرادی نفسیاتی کیفیتیں فنا کر دی جائیں ' تو مجموعی اثر میں حقیقت اور فطرت کا نشان تک باقی نہیں رھتا - اس طرح جو مجموعی یا اجتماعی اثر میئر ھولڈ کی کوششوں سے پیدا ھوتا ھے اس پر سب سے بڑا اعتراض یہی کیا جاتا ھے کہ اس کو فطرت اور حقیقت سے کوئی علاقہ نہیں - اس طرح تھیٹر فریب و دروغ کا ایک ھیولیٰ بن کے رہ جاتا ھے —

لیکن سیاسی مصلحتوں ' اور تبلیغ کی ضرورتوں کی وجہ سے جو اسالیب

اختیار کیے جاسکتے ہیں، ان کے لیے میئر ھولڈ خالص جمالیاتی اعتراض کی کوئی پروا نہیں کرتا - چونکہ "اجتماعی کیفیت" اشتراکیت کا اہم جزو ہے ' اس لیے اس کے نزدیک یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے تھیٹر کا بنیادی اصول یہی رہے —

اسی طرح تھیٹر کے مناظر اور سامان آرائش ' سے اس نے ہر اس چیز کو خارج کردیا جس کا کوئی عملی اثر حاضرین پر نہیں پڑ سکتا - جمالیاتی اثر اور ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے زیبائش و آرائش کو وہ جائز نہیں سمجھتا - ہر چیز جو اسٹیج پر نظر آئے اشتراکیت کا اشتہار ہو -

اس کے نزدیک تھیٹر زندگی کی نقل کا نام نہیں - بلکہ تھیٹر ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے زندگی پر اثر ڈالا جا سکے - یہی وہ نظریہ ہے جس پر اشتراکی تھیٹر کی بنیادیں قائم ہیں —

اور اسی نظریے کی بنا پر اس نے روسی تھیٹر کو نہ محض تفریح گاہ بننے دیا اور نہ انسان کی زندگی کی نقل بنا رہنے دیا - اس کا تھیٹر ایک دلچسپ مکتب ہے ' جس میں اشتراکیت کی تعلیم دی جاتی ہے -

(۱)

فاریگر - اور آئی سن سٹاین

میئر ھولڈ کے ساتھیوں میں ایک گروہ انتہا پسندوں کا بھی ہے جنھوں نے اشتراکی تبلیغ کو تھیٹر کا اہم ترین فرض قرار دے کے روسی تھیٹر کی مٹی پلید کردی ہے - تصنع اس حد کو پہنچ گیا ہے کہ اداکاری محض مسخرے پن کی حد تک محدود رہ گئی ہے —

اس طبقے میں قابل ذکر شخصیت صرف ایک ہے یعنی فاریگر (Forregger) جس نے پرولٹ کلٹ (Proletcult) کمپنی اور پروجکشن

یٹر (Projection theatre) کی بنیاد ڈالی ھے - فاریگر کی تمثیلیں
کس کے تماشے بن کر رہ گئی ھیں - اداکاری کے بجاے کود
اند ھوا کرتی ھے یا جسمانی ریاضتیں ھوتی ھیں - مذاق اکثر
ت بھونڈا ھوتا ھے —

فاریگر کے سوا اگر کسی اور شخص کا ذکر اس ضمن میں کیا
سکتا ھے تو وہ آئی سن ستاین (Eisenstien) ھے جو تھیٹر کی طرح سنیما
ں بھی بہت اھمیت رکھتا ھے - تھیٹر کی حد تک تو یہ کہ ایک زمانے میں اس
انتہا پسندی کی انتہا کردی تھی - اور اس کے اداکار محض بھانڈ ھو کر رہ
ے تھے مگر اس کے بعد سنیما نے اس کی توجہ کو اپنی طرف منعطف کر کے
س کے اسلوب کو کسی قدر بدل دیا —

اس گروہ نے تھیٹر میں ایک طرح کی بہیمیت کا اثر پیدا کر دیا - خفیف
ی بہیمیت روسی طبائع کا ھمیشہ سے خاصہ رھی ھے - اس وحشی پن کو
سی تھیٹر ھمیشہ ظاھر کرتا رھا ھے - مگر انتہا پسندوں کے اس گروہ نے
ہیمیت کے اس عنصر کو اس قدر بڑھا دیا ھے کہ روس کی عام پبلک کے مذاق
اس کا اثر بہت برا پڑ رھا ھے —

(۹)

تبلیغ اشتراکیت کے تمثیلی مظاھرے

چونکہ روسی ذھنیت کو تھیٹر سے ایک خاص مناسبت تھی ' اس لیے
تراکیوں نے صرف باقاعدہ تھیٹر ھی کو اپنا آلہ کار نہیں بنایا بلکہ خود
ری زندگی کو تھیٹر کے رنگ میں رنگنے کی کوشش کی - اس مقصد کے
ے تمثیلی مظاھرے کیے جانے لگے' جن میں ھر طرح سڑکوں پر' شاھراھوں'
نات میں اشتراکیت کی تبلیغ انتہائی دلچسپ طریقوں سے کی جاتی

ہے - ان تماشوں کے دیکھنے والے بھی وہی ہوتے ہیں جو ان تماشوں میں کسی نہ کسی طرح حصہ لیتے ہیں - ان مظاہروں میں شہر کی پوری آبادی شریک ہوتی ہے - جوق در جوق لوگ جلوسوں میں نکلتے ہیں - نمائشیں ہوتی ہیں - جشن ہوتے ہیں - ہر فرد خود تماشے کا ایک جزو بھی ہوتا ہے اور تماشے میں حصہ بھی لیتا ہے - حکومت ان مظاہروں میں غیر معمولی دلچسپی لیتی ہے - سرکاری عہدہ دار جا بجا تقریریں کرتے ہیں —

سب سے پہلے معلموں ' تھئیٹر کے منتظموں ' مصوروں ' سنگتراشوں ' اور مغنیوں کا ایک گروہ بڑی محنت اور جانفشانی سے مظاہرے کا نظام العمل بناتا ہے - اور "اجتماع" کی اس تمثیل کے لیے مناظر و مقامات کا انتخاب و انتظام کرتا ہے - یہ مظاہرے اشترا کی تمدن اور اشترا کی مذہب کے بہت اہم نمونے ہوتے ہیں ' حکومت اور عوام الناس دوش بدوش ان کی کامیابی میں حصہ لیتے ہیں - ہر قسم کی دلچسپیاں جمع کردی جاتی ہیں - اور پورا "اجتماع" اِن میں حصہ لیتا ہے اور اِن سے لطف اندوز ہوتا ہے - تہہ میں ان کا مقصد محض یہ ہے کہ اشترا کی جوش پھیلا یا جاے —

تھئیٹریکل تمثیلیں ہوتی ہیں - تقریریں کی جاتی ہیں ' انقلابی گیت گاے جاتے ہیں - آرکسترا اشترا کی موسیقی کے نغمے سناتا ہے - بڑے بڑے شعرا اپنا کلام سناتے ہیں - سرکاری دفاتر کے جھروکوں سے عوام الناس کے لیڈر مجمعوں کو مخاطب کرتے ہیں - مصوری ' سنگتراشی ' اور مصنوعات کی نمائشیں ہوتی ہیں —

کھلم کھلا سیاسی تبلیغ بھی کی جاتی ہے - ملک کی معاشی حالت سے عوام کو آگاہ کیا جاتا ہے - مشینوں اور آلات کی نمائش بہت بڑے

پیمانے پر ہوتی ہے - مختلف پیشوں کے متعلق ہدایتیں کی جاتی ہیں - زرعی اور صنعتی نمائشیں بھی ہوتی ہیں —

سب سے بڑھ کر یہ کہ انفرادیت کو فنا کرنے کی انتہائی کوشش کی جاتی ہے - ان مظاہروں میں ہر مذاق اور ہر ذہنیت کے آدمیوں کے لیے دلچسپی کا سامان ہوتا ہے - سب اس میں انتہائی ذوق سے مل جل کر حصہ لیتے ہیں - اور جوش و خروش کی اس کیفیت میں "اشتراکیت" کی فضا خود بخود پیدا ہو جاتی ہے —

ان مظاہروں کے بانی کا نام نکولائی ایوریئنوف (Nikolai Everinov) ہے -

(۱۰)

اشتراکی آپیرا

اشتراکیت نے اپنا تباہ کن اثر روسی موسیقی اور آپیرا پر بھی ڈالا - درباری سرپرستی کی وجہ سے رقص و موسیقی روس میں بہت ترقی کرتے رہے - چنانچہ "کاساک" اور "تاتاری" رقص اور موسیقی کے اسالیب دنیا بھر میں بہت پسند کئے جاتے ہیں - اگرچہ کہ روس میں صاحب دماغ نغمہ نگار بہت کم پیدا ہوے مگر فنکار بہت کثرت سے پیدا ہوے اور دنیا بھر میں اُن کی شہرت ہے - اینا پنلونا (Anna Pavlcna) اولگا سیکوآ (Olga Tscekova) کے نام تھئیٹر کی تاریخوں میں ہمیشہ باقی رہیں گے —

لیکن اُس "مشین پرستی" نے جو روسی تھئیٹر کو محض مصنوعی تماشا گاہ بنا چکی تھی ، جب آپیرا پر اپنا قبضہ جمانا چاہا تو نتیجہ نسبتاً بہت تباہ کن ثابت ہوا - موسیقی سے زندگی پر اثر پڑ تو سکتا ہے - لیکن موسیقی میں اس قسم کا اثر پیدا کرنا کہ انسانوں کو ایک متحدہ

مشین بنا دے، اُصول فطرت کے بالکل خلاف ہے —

بہر حال جب اشتراکی نظریوں کی بنا پر اشتراکی موسیقی اور اشتراکی آپیرا کی تعمیر کا سوال پیدا ہوا تو سب سے پہلا تصرف یہ کیا گیا کہ آرکسٹرا میں سے کنڈکٹر (Conductor) کو نکال دیا گیا - کیونکہ غیر سوتی موسیقی میں وہ "انفرادیت" کا نمائندہ ہے - اُسی کے اشاروں پر آرکسٹرا کام کرتا ہے - اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آرکسٹرا بجائے کسی ایک شخص کی ہدایات کی پابندی کے اپنے مجموعی اثر کا پابند ہو گیا - اس قسم کا پہلا آرکسٹرا پروفیسر زیٹ لین (Zietlein) نے ماسکو میں قایم کیا -

باوجود اس تصرف کے ابتدا میں آرکسٹرا وہی پرانی موسیقی دہرایا کرتا تھا - موسیقی میں اشتراکیت کی خصوصیات نہیں آسکی تھیں - اس خامی کے دفع کرنے کے لیے اور بالشویکی موسیقی کی اختراع و تعمیر کے لیے سنہ ۱۹۲۳ ع میں " جدید موسیقی کی انجمن " قایم ہوئی - اس انجمن کے بانیوں میں اناطول الکسندروف (Anatole Alexanderov) ولادمر دریا نووسکی (Vladimir Derianovski) نکولائی میاسکووسکی (Nikolai Miaskovski) کانستنتین سارا زدیف (Constantin Sarazdev) اور وکٹر بیلیف (Viktor Balaev) ہیں -

اِن میں نکولائی میاسکووسکی کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے جس نے سب سے پہلے اشتراکی نغمے لکھے - اُس کے نغموں کے متعلق مشہور روسی نقاد گلے بوف (Gla bov) لکھتا ہے " میاسکووسکی کے نغمے ممکن ہے کہ سامعین کے جذبات کو متاثر نہ کرسکیں - اُسکا موضوع اکثر تاریخی ہوتا ہے - نغموں میں ایک انقلابی کیفیت، ایک قسم کا خوف و دہشت پیدا کرنے والا اثر پایا جاتا ہے اور باوجود اس اثر کے اُن نغموں کی خوبیوں

میں کلام نہیں ہو سکتا - ناممکن آوازوں کی تخلیق، غیر متعلق آوازوں کی یک جائی، ... یہ میاسکووسکی کے مخصوص اسالیب ہیں" —

جدید روسی انجمن موسیقی کا ایک مشہور رکن سیموئیل فائنبرگ (Samuel Feinburg) ہے - جس کے نغمے میں آوازیں بالکل دست و گریباں ہو جاتی ہیں - ان کی موسیقی میں روسی بہیمیت کا اثر بدرجۂ اتم موجود ہے - لیکن کہیں کہیں اس کے نغموں میں سادگی بھی پائی جاتی ہے —

دیگر موسیقی نگاروں میں قابل ذکر اناطول الکسندروف ہے جو اکثر عشقیہ نغمے لکھتا ہے - دوسرا موسیقی نگار میخائیل گیزن ہے جس کی موسیقی میں ایشیائی رنگینی کی جھلک بہت نمایاں ہے —

آپیرا میں انقلاب پیدا کرنے کی جو تجویز اشتراکیوں نے سونچی تھی اُس میں کئی دقتوں کا سامنا تھا - صرف موسیقی ہی میں تبدیلی کی ضرورت نہیں تھی بلکہ آپیرا کو ادبی حیثیت میں لکھوانے کا اہم مسئلہ بھی پیش نظر تھا - اور ادبی صورت میں آپیرا اشتراکیت کے کرخت اور مشین پرست اُصول کا متحمل مشکل سے ہو سکتا ہے - اس زمانے کے آپیرا نگاروں میں سرگئی پروکوفیف (Sergei Prokovef) اشتراکی اُصول کا سب سے زیادہ پابند ہے - اُس کے نغموں میں روسی بہیمیت اور وحشت انتہا کو پہنچ گئی ہے —

قدیم درباری بیلٹ (Ballet) اور رقص کے رد عمل کے لیے جدید اسالیب رقص کی بنیاد رکھی گئی - اِن اسالیب کی تہہ میں اشتراکی تمدن کا اثر پیدا کیا گیا ہے - حرکات میں تصنع اِس حد تک رکھا گیا ہے کہ بجائے انسانوں کے رقص کے جدید روسی رقص مشین کے پرزوں کا رقص

معلوم ہوتا ہے - رقص میں مشین کے پرزوں' اور آلات کی جنبشوں کی کیفیت پیدا کی جارہی ہے - اِس رجحان کا ذمہ دار بھی ایک بڑی حد تک فاریگر ہی ہے - جس نے ڈرامائی تمثیلوں کی طرح' اپنی انتہا پسندی کے جوش میں قدیم روسی رقص کو ختم کرکے یہ "مشینوں کا رقص" ایجاد کیا ہے —

موسیقی اور رقص اس قدر لطیف فنون ہیں کہ "اشتراکی فضا" کو برداشت کر ہی نہیں سکتے - جس طرح اور تمام فنون لطیفہ روس کے موجودہ اشتراکی دور میں برباد ہوے ہیں یہ بھی بالکل غیر فطری بن کے رہ گئے —

جدید روسی آپیرا میں اگر کوئی نام کسی قدر عظمت کا مستحق ہے تو وہ استراونسکی (Stravinsky) کا نام ہے جس نے اِس مشین پرستی کے ماحول میں زندگی کے آثار باقی رکھے - اُس کے فن میں قدیم روسی آپیرا کی عظمتیں نظر آتی ہیں - صرف اُسی کی شخصیت کو یورپ نے بھی تسلیم کیا - اُس کی دعوت پر اِساڈ وراڈنکن بھی روس گئی تھی - اور وہاں اُس کے زیر اہتمام' اُس کی موسیقی کے ساتھہ رقص کرتی رہی —

(۱۱)

یہ جدید روسی تھیٹر کے تمام مختلف پہلوؤں کا ایک مختصر سا خاکہ تھا - مختلف اداروں کے اسالیب میں بعدالمشرقین ہے - صرف ایک چیز اِن سب میں مشترک ہے - اور وہ روس کی خاص ذہنیت یعنی بہیمیت کی جانب ایک خفیف رجحان ہے - یہی بہیمیت ہم کو اسٹنی سلاوسکی تک کے شاہکاروں میں باوجود انتہائی روحانی کوششوں اور نفسیاتی تجزیوں کے نظر آتی ہے —

جہاں روسی تھیٹر کے اشتراکی اداروں نے تھیٹر کو جمالیاتی حیثیت سے تباہ کرنے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا ' وہاں غیر اشتراکی اداروں نے روسی تھیٹر کو اُن بلند منازل تک پہنچا دیا جن تک مشکل سے دنیا کا اور کوئی تمثیلی ادارہ پہنچ سکا ہے- اسٹنلی سلاوسکی کو نہ صرف جدید تھیٹر میں یہ اہمیت حاصل ہے بلکہ تھیٹر کو اس سہ ہزار سالہ زندگی میں اُس کی شخصیت کے آدمی خال خال ہی نظر آتے ہیں- اُس کے ہم عصروں میں سے اگر کسی کو اُس کا ہم پلہ قرار دیا جاسکتا ہے تو صرف ایڈورڈ گارڈن کریگ کو- لیکن اُس کے اور ایڈورڈ گارڈن کریگ کے نظریے ' اور زاویہ ہائے نظر بالکل متضاد ہیں- اِن دونوں میں سے ہر ایک اپنے فن کو کمال تک پہنچا چکا ہے —

اب یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ دنیا روسی تھیٹر کو کن نظروں سے دیکھتی ہے- روسی تھیٹر کے مختلف اداروں میں اس قدر فرق ہے کہ ہر ادارے کے لیے جداگانہ نقطۂ نظر ضروری ہے- اسٹنلی سلاوسکی نے دنیا بھر کے تھیٹر کو بے حد متاثر کیا ہے- نہ صرف تمثیلی نقطۂ نظر سے اُس کے نظریے مقبول ہیں بلکہ ڈرامائی ادب پر بھی اُن کا بہت گہرا اثر پڑ رہا ہے- جرمن ڈراما نگار گرہارٹ ہاپٹ مان (Gerhart Hauptmann) کی انتہائی حقیقت نگاری کا ایک باعث وہ اثر بھی ہے جو اسٹنلی سلاوسکی کی عملی کوششوں کی وجہ سے مترتب ہوا —

واختنگوف اور اُن کے ساتھیوں کی تعریف تو کی جاتی ہے مگر عملی حیثیت سے دنیا کے تھیٹر پر اِن کے اسالیب کا کوئی خاص اثر نہیں پڑا —

اشتراکی تھیٹر اور اشتراکی آپیرا کی مخالفت ہر جگہ پوری

قوت سے ہو رہی ہے - گو اس مخالفت کی وجہ زیادہ تر سیاسی ہے پھر بھی اس میں ایک حد تک خالص جمالیاتی عنصر شامل ہے - اِس کے باوجود کم سے کم رقص کی حد تک روس کا اثر نمایاں ہوتا جا رہا ہے - پہلے خم (Curve) کو رقص کی جان سمجھا جاتا تھا - اب زاویوں اور خطوط مستقیم کی حرکت کی طرف توجہ کی جا رہی ہے - لیکن یہ اثر بہت خفیف ہے اور بدنما نہیں معلوم ہوتا —

—— (*) ——

حضرت زکی بلگرامی

(ایک غزل گو کی حیثیت سے)

از

(جناب سید حامد حسن صاحب بلگرامی ایم اے)

حضرت زکی کا تعارف دنیائے ادب سے بعض مشہور اہل قلم کے ہاتھوں ہو چکا ہے - چنانچہ مولوی سید افضل حسین صاحب ثابت رضوی لکھنوی اپنے تذکرۂ دربار حسینی المعروف بہ چراغ مجالس میں تحریر کرتے ہیں —

" سید محمد زکی صاحب بلگرامی مرحوم بڑے ذہین اور زکی تھے - بلگرام کے سادات عظام سے تھے - لکھنؤ میں آرہے تھے - سنا ہے کہ پہلے شیخ گوہر علی صاحب مشیر سے اصلاح لیا کیے پھر مرزا دبیر مرحوم کے شاگرد ہوے " —

" آپ نے مرثیہ گوئی میں بڑی مشق بہم پہونچائی تھی- مرزا سلامت علی صاحب دبیر مرحوم جو اس فن میں اکمل تھے ان کے ارشد تلامذہ میں سے تھے - ہر چند کہ غزل ' قصیدہ ' رباعی سب قسم کی شاعری کرتے تھے لیکن اپنے ہم عصروں سے اس فن خاص میں سبقت لے گئے تھے - عظیم آباد پٹنہ کی

طرف مجالس عزا میں پڑھے، بخوبی پھولے پھلے - دارالسرور رامپور میں کچھہ وظیفہ وہاں کے رئیس کی قدر دانی کی وجہ سے پاتے رہے - پھر وہاں سے زمانۂ جلت آرام گاہ مختارالملک نواب میر تراب علی خاں مغفور سر سالار جنگ مدارالمہام سرکار عالی حیدرآباد میں تشریف لائے - یہاں سے وطن جاکر بارھویں شعبان سنہ ۱۲۸۸ ھ میں انتقال کیا" —

صفحہ ۱۳۵ و ۱۳۶

لالہ سری رام صاحب ایم - اے - مولف خم خانۂ جاوید جلد سوم خم خانۂ جاوید کے صفحہ ۴۲۴ پر رقم طراز ہیں کہ :

"سید محمد زکی - خلف غلام رضا بلگرامی شاگرد جناب دبیر لکھنوی - ان کے نسب کا سلسلہ زید شہید سے ملتا ہے - بڑے طباع اور قابل بزرگ تھے - ریاست رامپور میں ملازم تھے - مرثیہ اور قصیدہ کہنے میں اچھی مشق تھی اور مرثیہ خوانی میں بھی کمال حاصل تھا - سنہ ۱۲۸۸ ھ پچاس سال کی عمر میں وفات پائی - ان کے شاگردوں میں نواب بلے صاحب مشاق لکھنوی بڑے طبیعت دار خوش مذاق شاعر تھے" —

غرض حضرت زکی عموماً ایک مرثیہ گو کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں اور وہ بھی حضرت دبیر کے شاگرد ہونے کی وجہ سے - لیکن حقیقت یہ ہے کہ زکی کا ذہن رسا غزلوں میں بھی ایک امتیازی شان رکھتا ہے - ہر چند مرثیہ گوئی کے رواج نے، اور خود طبیعت کے رجحان نے ان کو رفتہ رفتہ مرثیہ نگاری کی طرف مائل کردیا اور غزلوں سے ایک زمانہ میں یہاں تک منحرف کردیا کہ کہہ اُٹھے :

"جز مدح اور کچھہ نہ کوئی هم زباں کہے"

پھر بھی ابتدائی دور میں جو غزلیں کہیں ہیں لطف و کیف سے لبریز ھیں - جوں جوں طبیعت میں مذهبیت غالب آتی گئی مرثیہ نگاری میں جوش آنا گیا' یہاں تک کہ آج مرثیہ گوهی کی حیثیت سے باقی رهے-

یہیں ایک بات اور لکھتا چلوں' حضرت زکی کو جناب ثابت صاحب * اور لالہ سری رام صاحب نے حضرت دبیر کا شاگرد بتایا هے - لیکن بعض اهل وطن کا اس پر اتفاق نہیں - ان کے نزدیک حضرت زکی انیس و دبیر کے شاگرد نہ تھے بلکہ مد مقابل- ممکن هے یہ خیال وطن پرستی کے جوش پر مبنی هو - لیکن میری نظر سے حضرت زکی کی ایک رباعی گذری جس سے یہ ترشح هوتا هے کہ شاید مہر وماہ سے کچھہ حضرات انیس ودبیر کی طرف اشارہ هو —

مداح امام ابن امام آیا هے	شہدائے شہہ عرش مقام آیا هے
آنکھیں مہ و مہر کی جھپکتی هیں زکی	کیا ذرۂ خاک بلگرام آیا هے

اگر حضرت دبیر کے شاگرد هوتے تو شاید اس طرح کی نوک جھونک نہ هوتی - پھر بھی یہ تاویل هوسکتی هے کہ مہ ومہر صرف ذرۂ خاک

---

* جناب ثابت صاحب نے اسی سلسلے میں دربار حسین کے صفحہ ۱۳۶ پر تحریر فرمایا هے کہ "مرزا محمد جعفر صاحب قیصر شاگرد حضرت دبیر مرحوم مجھہ سے جنوری سنہ ۱۹۱۷ ع میں بمقام لکھنو فرماتے تھے کہ میر محمد زکی صاحب مرحوم پہلے شیخ گوهر علی صاحب مشہر مغفور کے شاگرد تھے - پھر مرزا دبیر کے شاگرد هوئے - امیرالامرا قدم رسول کے یہاں مجلس پڑھی مرزا صاحب موصوف تشریف رکھتے تھے - میرے سامنے تعریف هونے پر میر زکی صاحب نے کہا کہ یہ سب تصدق جناب مرزا صاحب کا هے" —

بلگرام کی رعایت سے نظم کیا گیا ہو نہ کہ کسی اس قسم کے خیال کی بنا پر - جناب منشی محمود صاحب 'حمد' بلگرامی شاگرد جناب بحر و قدر کی بھی یہی راے ہے —

میں اس مختصر مضمون میں زکی کو ایک غزل گو شاعر کی حیثیت سے پیش کرنا چاہتا ہوں۔ اس لیے ان کی مرثیہ نگاری سے فی الحال * چشم پوشی کرنا پڑتی ہے - حالانکہ ان کے ۲۲ مرثیہ، چند سلام، کچھ رباعیات بھی نظر سے گذریں جو اب بھی حضرت زکی کے ایک عزیز جناب مجتبیٰ حسین صاحب بلگرامی کے پاس محفوظ ہیں - موصوف نے نہایت مسرت سے حضرت زکی کے کلام سے مجھے سرفراز فرمایا —

دل نہیں چاہتا کہ ان بزرگ کے خاص رنگ شاعری سے اغماض برتا جاے - مرثیہ نگاری آپ کی طبع جولاں کا خاص میدان تھا - اس لیے دو بند ان کے کلام سے نقل کرتا ہوں کہ بلند خیالی و شیریں بیانی کی اداے دلکش کا کچھ اندازہ کیا جاسکے :—

صبح

جب ہر طرف حجاب عروس سحر ہوا پھولے شگوفے رنگ شفق جلوہ گر ہوا
ظاہر وداع لیلی شب کا اثر ہوا خاموش جھلملا کے چراغ قمر ہوا
پھیلی وہ ضو کہ چشم کواکب جھپک گئی
پھوٹی کرن جو مہر کی بجلی چمک گئی

ہیں قدرتی یہ بذلۂ دلکش کے چہچہے دریا فصاحتوں کےہیں اک بات میں بہے
جز مدح اور کچھ نہ کوئی ہم زباں کہے حاضر جواب صورت آئینہ چپ رہے

* میں نے ان کے مراثی و کلام پر تنقید اپنی تالیف "تذکرۂ شعراء بلگرام" میں کی ہے - عنقریب شایع ہوجاے گی —

کھاے نہ پیچ زلف گرہ گیر کی طرح
بلبل ہو قید بلبل تصویر کی طرح

لیکن مرثیہ نگاری کے اس رنگ تک پہونچنے کے لیے میر صاحب نے اپنی شاعری کی ابتدا میر انیس کی طرح غزل ہی سے کی تھی اور اوائل عمر میں اپنی طبیعت کی جولانی اس رنگ میں دکھائی تھی - لیکن یہ وہ زمانہ تھا کہ آتش کی آتش بیانی اور ناسخ کی مشکل پسندی نے اہل لکھنو کے سامنے شاعری کے گویا دو معیار پیش کر دیے تھے - ناسخ نے شاعری کو بہت کچھہ لغوی اور ذھنی بنا دیا تھا ' جہاں دور از قیاس استعارات ' نادر تشبیہات پر شاعری کا دارو مدار تھا - حضرت دبیر اور ان کے بیشتر شاگرد بھی اسی طرف رجوع معلوم ہوتے ہیں - دوسری طرف آتش نے شاعری کے لیے جذبات و کیفیات کو اہمیت دی تھی - کچھہ لوگوں نے ان کی اتباع شروع کردی تھی لیکن قابل قدر ہستیاں وہ ہیں جنہوں نے کم از کم لکھنو ہی کے ان دونوں اسکولوں کی خوبیوں کو اپنی شاعری کا معیار بنایا - حضرت زکی انہیں جیسی چند ہستیوں میں تھے - جن کے یہاں آتش اور ناسخ کے رنگ کا سنگم نظر آتا ہے —

نہ گئی شوخیء تتدیر بتوں کی نہ گئی
بن کے تصویر بھی گویا لب خاموش رہے

" گویا " کی لفظی خوبی نہ صرف ناسخ کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے بلکہ آتش کی جذباتی شاعری کے لیے بھی " لب خاموش " کے ساتھہ ایک حسن ہے - یا دوسرا شعر لیجئے —

صفت حسن میں سر گرم رہیں اہل زبان
شمع بھی محفل جاناں میں نہ خاموش رہے

شعر میں صنعت لفظی ضرور موجود ہے لیکن جو لطف و کیفیت اس استعارے کے دامن میں پنہاں ہے اپنی داد کی الگ مستحق ہے —

گویا زکی کا یہ انداز بیان تھا کہ ایک طرف لفظی خوبیاں اپنا حسن دکھا رہی ہوں اور دوسری طرف ان سے زیادہ شعر کی معنویت دل کو لبھارہی ہو - مثال کے لیے دو شعر لیجئے —

رحم کر رحم کہ اے برق تجلی جمال لطف کیا طالب دیدار جو بے ہوش رہے
لن ترانی ہی کی پردے سے چلی آے صدا اسی امید میں عاشق ہمہ تن گوش رہے

لیکن انہیں اشعار میں جو امتیازی خصوصیت حضرت زکی کی جھلک رہی ہے ان کے رنگ تغزل کو ناسخ اور آتش کے دونوں کی رنگ شاعری سے الگ کرتی معلوم ہوتی ہے - وہ ان کا ایک مخصوص زاویۂ نگاہ ہے جس کو فلسفہ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے - اس زمانہ میں ایک ایسے شخص کے لیے جو لکھنو کے ماحول میں رہے اور پھر اپنی نظریں بلندی پرواز اور رفعت خیالی کی طرف رکھے ایک ایسا امر محال تھا جس کا مقابلہ آسانی سے نہیں کیا جاسکتا تھا - زکی لکھنو کے ہو رہے تھے - لکھنو کی سر زمین سے اتنی محبت پیدا ہوگئی تھی کہ جب وطن واپس آے اور لکھنو کی یاد نے ستایا تو کہہ اٹھے :

زکی ہر وقت جلسے لکھنو کے یاد آتے ہیں
ہوا وہ باغ ویراں سیر جنت کی جہاں برسوں

باوجود اس کے زکی نے الفاظ کے گورکھ دھندھوں میں پھنس کر عروس خیال کو مجروح نہ کیا - یہ اثر بڑی حد تک خاک بلگرام کا تھا - اہل بلگرام اگرچہ اکثر لکھنو سے متاثر رہے لیکن کبھی ان لوگوں نے ان کی ادبی عظمت کو اس حد تک قبول نہ کیا کہ اس سے مرعوب

ہوکر غلط و صحیح کا امتیاز ہی باقی نہ رکھتے - دوسری وجہ جس نے زکی کے دامن کو خارستان میں الجھنے نہ دیا وہ ان کی غالب پسندی تھی - بلگرام کے اکثر شعراے اردو کے کلام میں غالب کا خاص رنگ جھلکتا ہے - زکی کی شاعرانہ ذہنیت بھی غالب کی بلندی پرواز و رجحان فلسفہ سے بلا اثر پذیر ہوئے نہ رہ سکی - فلسفہ کی یہ جھلک اُن کی بیشتر غزلوں میں موجود ہے -

وہ دنیاے مجاز میں منزل مقصود کے قائل نہیں - چنانچہ کہتے ہیں-

طریق عشق میں کب منزل مقصود ملتی ہے
پھرے ہیں خاک اڑاتے کارواں کے کارواں برسوں

حضرت زکی کے نزدیک کمال عاشقی یہی ہے کہ ایک شخص خود عشق میں اس درجہ غرق ہوجائے کہ اس کے اور معشوق کے درمیان سے امتیاز من و تو بالکل اٹھہ جاوے - وہ خود ہی عاشق ہو اور خود ہی معشوق - عشق کا کمال بھی یہی ہے کہ عاشق حسن کا ہر جلوہ خود اپنی ذات میں دیکھنے لگے —

کمال عاشقی یہ ہے کہ خود معشوق بن جائے
انا لیلیٰ رہا ہے قیس کے ورد زباں برسوں

یا اسی کو اس طرح کہتے ہیں —

کمال عشق ہے اے دل تو جذب کیف پیدا کر
نہ صورت آشنا ہو صورت آئینہ صورت کا

لیکن اس خیال کو جس شعریت اور کیف کے ساتھہ ایک دوسری جگہ لکھا ہے شاید ادب میں اس کا جواب مشکل سے ملے گا —

واہ ' اے عشق کہ معشوق بنا جاتا ہوں

کس کے انداز ہیں خاطر میں سمائے جاتے

دنیا میں رنج و آلام کی اصل وجہ امید موہوم ہی ہے - انسان کو رنج اسی وجہ سے تو ہوتا ہے کہ وہ جس چیز کی امید کرتا ہے اسے نہیں ملتی - اگر امید وصل نہ ہو تو شاید رنج ہجر کا سامنا ہی نہ کرنا پڑے نہ دکھ اٹھانا پڑے نہ درد سہنا پڑے - حضرت زکی ایک شعر میں اس طرف اشارہ کرتے ہیں —

امید وصل و رنج ہجر نے رکھا مصیبت میں

نہ دل ٹھیرا نہ آئی موت رگڑیں ایڑیاں برسوں

اسی سلسلے میں زکی مرحوم کا ایک شعر خاص طور سے قابل ذکر ہے جس میں انہوں نے اجر عمل کے نازک مسئلہ پر اظہار خیال کیا ہے اور نہایت اختصار سے حل کرنے کی کوشش کی ہے - دنیا میں ہزاروں نیکیاں صرف خواہش جنت کی وجہ سے کی جاتی ہیں لیکن جنت اصل میں نام ہے خالص اور بے لوث عبادت کے اجر کا ' نہ کہ خواہش جنت میں نیکیوں کے عوض کا - حقیقت بھی یہی ہے کہ اعلیٰ ترین عبادت وہی ہے جس میں ذاتی خواہشات سے الگ رہ کر ایک عمل صرف اپنی خوبیوں کی بنا پر کیا جائے یا زیادہ سے زیادہ صرف خدا کے واسطے ہو - ماسوا اس کے جو عمل صرف خواہش جنت میں کیا جاتا ہے مفید ثابت نہیں ہوتا —

جنت کی آرزو تھی جہنم ہوا نصیب

اب سمجھے اب کھلا کہ سمجھ کا قصور تھا

یعنی دوزخ اس لیے ملی کہ عمر بھر ہم صرف آرزوئے جنت میں

رھے - ظاہر ھے کہ جو نیکیاں کیں وہ اس خواھش ذاتی کے نذر ھوگئیں- مرنے کے بعد جب دوزخ نصیب ھوئی تو اپنی غلطی کا ھوش آیا —

کلام میں اکثر جگہ اخلاقیات کی بھی چاشنی ھے - اور شاید اسی اخلاقیات نے مذھبیت کے رنگ میں ڈوب کر مرثیہ نگاری کو اپنا شعار بنا لیا تھا - لیکن یہ ماننا پڑتا ھے کہ ایسے خشک موضوع پر بھی زکی نے رنگ تغزل ھاتھہ سے جانے نہ دیا - دو شعر اس قبیل کے بھی ملاحظہ ھوں -

خلاف آدمیت ھے نہ کر پرھیز مے سے
لٹیں گے خاک میں ا وسست نخوت استخواں برسوں

نہ اترا او گل نو خواستہ حسن دو روزہ پر
بہار باغ دم بھر ھے صعوبات خزاں برسوں

زکی بلگرامی کی چند غزلیں نقل کرنے سے قبل یہ کہہ دینا ضروری ھے کہ ھر چند طبیعت کی خود داری نے اپنی انفرادیت دکھلائی ھے پھر بھی کلام پر لکھنؤ کے اثرات نمایاں ھیں' جہاں تک ھوسکا انھوں نے گوھر آبدار سے اپنا کلام سجایا ھے ' اگر دو چار جھوٹے موتی آگئے تو وہ ماحول کے اثر سے -

غرض زکی کے کلام میں فلسفہ و اخلاقیات کی معنوی خوبیوں کے ساتھہ ساتھہ لطف زبان ' برجستگی ' نرمی اور صفائی بدرجۂ اتم موجود ھے - ذیل کا مختصر انتخاب زکی کے اس رنگ طبیعت کا شاھد ھے -

---

انتخاب غزلیات زکی

جاؤں کا کہاں باب قفس کھول دے صیاد
پرواز کی طاقت مرے بازو میں نہیں ھے

کیوں خواستگار وصل دل ناصبور تھا
میں دور تھا نه اوس سے نه وه مجھه سے دور تھا

نسبت تھی اس کو برق تجلی سے کچھه نه کچھه
موسیٰ، کہو؟ یه تھا دل عاشق که طور تھا

کیوں خاک ھوکے داغ محبت مٹا دیا
اے دل اسی چراغ سے آنکھوں میں نور تھا
(ایک بلند مضمون کو جس رنگ سے کہدیا ھے تغزل اسی کا نام ھے)

کیوں اُن سے دل کا حال کہا سوچ ھے یہی
کہنا ضرور تھا که نه کہنا ضرور تھا

در پردہ قتل کرنے سے کیا فائدہ ھوا
قاتل نقاب رخ سے اُٹھانا ضرور تھا

ساقی جھکی نه گردن مینا کسی طرح
شیشه بھی کیا کسی کا سر پر غرور تھا ؟

ھم حشر میں بھی جھومتے اُٹھے زمین سے
کیفیت خمار میں بھی ایک سرور تھا

کھو بیٹھے ، منت عشق میں ھاتھوں سے اے زکی
پروردۂ کنار دل ناصبور تھا

نقاب میں وہ بت بے مثال تھا کیا تھا ؟
قہر تھا پر تو حسن جمال تھا کیا تھا ؟

مٹا دیا ھمیں او بت ترے تلوں نے
فلک کا رنگ زمانه کا حال تھا کیا تھا ؟

پھڑک پھڑک کے اسیروں نے جان دی صیاد
اجل کا دام محبت کا جال تھا کیا تھا؟

جنوں کا جوش تھا پوچھو نہ ذکر فکر شباب
خدا کی یاد بتوں کا خیال تھا، کیا تھا

زمین مجھہ سے، میں لپٹا زمیں سے کھول کے دل
فشار قبر بھی لطف وصال تھا، کیا تھا

زکی کمال تعجب ہے ہجر میں جینا
حیات سہل تھی مرنا محال تھا، کیا تھا

تکرار نہ ہو وصل کے اقرار میں یارب
وہ بت کہیں کہہ دے کسی تدبیر سے اچھا

نہ وقت نزع بھی جھگڑا تھا معنی و صورت کا
بتوں میں دل رہا، لب پر رہا کلمہ شہادت کا

آیا جفائے یار سے دل میں غبار کب
اُٹھتا ہے اپنی خاطر نازک سے بار کب

برپا کریں گی طوفاں آنکھیں پر آب ہوکر
پھوٹیں گے دل کے چھالے اک دن حباب ہوکر

پھروں یہ سوچتا ہوں دنیا میں کیوں میں آیا
خارج حساب سے ہوں مد حساب ہوکر

فرقت میں روتے روتے اب دل پہ آبلی ہے
آنکھیں الٹ گئی ہیں جام حباب ہوکر

حسن و جمال جاناں روشن کرے جہاں کو
کچھ آفتاب ہوکر کچھ ماہتاب ہوکر

جگر جلتا رہا تھا نہ آنکھوں کا دھواں برسوں
چھپایا ہے دل رنجور نے راز نہاں برسوں

لہو روتی رہی فرقت میں چشم خوں فشاں برسوں
خزاں میں بھی رہا گلزار اپنا بوستاں برسوں

کڑی میں ساتھ دینا سہل ہے مشکل پسندوں کو
کیا کیں غل مرے ہمراہ میری بیڑیاں برسوں

یہ خود رفتہ کیا صیاد کی جوش محبت نے
نہ یاد آیا ہمیں کنج قفس میں آشیاں برسوں

جنوں کے جوش سے ہیں اور ہی عالم میں دیوانے
نظر آئی زمیں ہم کو نہ سوجھا آسماں برسوں

کمال عاشقی یہ ہے کہ خود معشوق بن جاے
انا لیلیٰ رہا ہے قیس کے ورد زباں برسوں

امید وصل رنج ہجر نے رکھا مصیبت میں
نہ دل ٹھہرا نہ آئی موت رگڑیں ایڑیاں برسوں

قفس کو جانتا ہوں گھر میں اے صیاد کیا جانوں
کہے کیا جو رہے نا آشنائے آشیاں برسوں

زکی ہر وقت جلسے لکھنؤ کے یاد آتے ہیں
ہوا وہ باغ ویراں سیر جانت کی جہاں برسوں

آہ و فغاں زباں پہ نہیں چشم تر نہیں
صد شکر راز دل کی کسی کو خبر نہیں
اللہ اس لجائی ہوئی آنکھ سے بچائے
قاتل یہ تیغ تیز ہے نیچی نظر نہیں

ولولے دل میں تصور سے ہیں آتے جاتے
یاد کرتے ہیں تمہیں غم میں بھلاتے جاتے
درد پہلو کی کروں فکر ، کہ تھاموں دل کو
اور اک داغ دیے جاتے ہو جاتے جاتے
ذبح کرتے ہی مجھے ، جانے کا ارادہ تھا اگر
مرگ و زیست کا جھگڑا ہی مٹاتے جاتے
کیا میرا قصۂ پرغم ہے کہ سننے والے
سنتے جاتے ہیں اور آنسو ہیں بہاتے جاتے
واہ اے عشق کہ معشوق بنا جاتا ہوں
کس کے انداز ہیں خاطر میں سماتے جاتے

——)•(——

کلام اثر

از

(جناب سید وقار عظیم صاحب ایم - اے)

اردو کی جہاں اور بدنصیبیاں ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ شروع سے آخر تک پچاسوں معروف و غیر معروف شاعر اور ادیب ایسے ہیں جن کا نہ صحیح نام معلوم ہے اور نہ تاریخ پیدائش و وفات کا پتا ہے۔ ایسی صورت میں ان کی زندگی کے تفصیلی حالات کا معلوم ہونا ظاہر ہے - بہت سے بدنصیب ایسے بھی ہیں کہ ان کی پیدائش کا حال معلوم ہوا تو وفات کا پتا نہیں اور اگر وفات کا پتا لگ گیا تو تاریخ پیدائش مفقود - اِس کی ذمہ داری ہمارے تذکرہ نویسوں پر ہے - جنھوں نے ہمیشہ شاعر کی شخصیت اور اُس کی زندگی سے زیادہ کلام کو اہمیت دی اور بعض اوقات تو یہ ستم کیا کہ شاعر کے حالات میں دو سطریں لکھیں اور اشعار کے نمونے سے ورق کے ورق سیاہ کردیے - اِس کا ظاہری نتیجہ یہ ہوا کہ شاعر کے زمانۂ حیات کا صحیح تعین نہ ہونے کی وجہ سے ہم ان کے خارجی اثرات سے کوئی مدد نہ لے سکے جنھوں نے ایک بڑی حد تک شاعر کے کلام کو اپنے اثر میں رنگا ہے —

اثر کا بھی یہی حال ہے - ان کا صحیح نام تو معلوم ہے لیکن نہ تاریخ پیدائش کا پتا ہے نہ تاریخ وفات کا -

اِس وقت ہمارے پاس جتلے تذکرے ہیں اُن میں سے گلشن گفتار، نکات الشعرا، مخزن نکات، چمنستان شعرا اور گلشن بے خار میں اثر کا قطعی ذکر نہیں —

باقی تذکروں میں سے سخن شعرا اور گلشن ہند میں اتنے حالات ہیں جن کا ہونا نہ ہونا برابر ہے - مصحفی کے تذکرے میں اِن دونوں کے مقابلے میں کسی قدر زیادہ حالات ہیں - میر حسن نے بھی جو کچھہ لکھا ہے اس سے صرف یہی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا نام محمد میر اور تخلص اثر تھا اور علم و فضل کے علاوہ شاعری میں بھی ایک خاص مرتبہ کے مالک تھے - نام اور تخلص کے متعلق جتنے تذکروں میں ان کا حال ہے کسی میں اختلاف نہیں - نہ کوئی ان کے علم و فضل سے انکار کرتا ہے —

اُن سب تذکروں کے بعد سب سے اچھا تذکرہ جس میں اِن کے کسی قدر مفصل حالات ملتے ہیں حکیم قدرت اللہ بیگ کا ہے - انھوں نے حتی‌الامکان وہ سب باتیں لکھہ دی ہیں جنھیں اس زمانہ کی تذکرہ نگاری کے معیار سے ضروری اور مکمل سمجھا جا سکتا ہے - ان کے خاندان، ان کے علم و فضل، ان کے استاد، ان کی شاعری وغیرہ کے متعلق ہر ممکن بات لکھہ دی ہے - لیکن نہ تاریخ پیدائش کا ذکر ہے نہ وفات کا - ہمارے زمانے کے تذکرہ نویسوں میں آزاد، لالہ سریرام، مولوی عبدالحی، اور صاحب تذکرۂ طور کلیم نے پرانے تذکرہ نویسوں کی تقلید کی ہے اور بلا کسی مزید تحقیق و کاوش کو کام میں لاے ہوے وہی حالات دہرا دیے ہیں جو اب تک لکھے جا چکے تھے —

لیکن ان مختلف تذکروں کے دیکھنے کے بعد قیاساً ان کی تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات کا تعین کیا جا سکتا ہے —

تاریخ پیدائش و وفات

اثر کی تاریخ پیدائش معلوم کرنے کی کوشش کرتے وقت بھی ہم انہیں مختلف تذکروں ہی سے مدد لے سکتے ہیں - ان کے دیوان سے اس کا پتا چلنا محال ہے —

اِس سلسلہ میں سب سے پہلی چیز جس کی طرف ہماری نظر جاتی ہے یہ ہے کہ اردو کے بالکل ابتدائی تذکروں میں اثر کا قطعی ذکر نہیں - اس لئے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اِس وقت تک اثر شاعری کی دنیا میں بالکل مشہور نہیں ہوے تھے —

اثر کا دیوان دیکھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اُن کا کلام شروع سے آخر تک بالکل ایک انداز کا ہے اور اس کے ہر شعر کو پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس کا کہنے والا ازل سے ایک شاعرانہ فطرت لے کر آیا تھا - اور اس لئے ضروری ہے کہ ایسا آدمی تھوڑی ہی سی عمر میں شاعری شروع کر دے گا اور شباب کی منزلوں تک پہنچتے پہنچتے ارباب ذوق اس کی شاعرانہ فطرت کی لطیف تخلیق کو پسندیدہ نظروں سے دیکھنے لگیں گے - میر اور حمید اورنگ آبادی کے تذکرے سنہ ۱۱۶۵ ہجری میں تالیف ہوے - ان میں اثر کا ذکر نہیں - قائم کا تذکرہ سنہ ۱۱۶۸ ہجری میں لکھا گیا - اس میں بھی اثر کا قطعی ذکر نہیں - اس لئے یہ ماننا پڑے گا کہ اثر اس وقت تک مشہور شاعر نہیں تھے —

درد کی پیدائش سنہ ۱۱۳۳ ہجری ہے - نکات الشعرا لکھے جانے کے وقت وہ ۳۲ سال کے ہوں گے - اور جب مخزن نکات لکھا گیا تو ان کی عمر اسی حساب سے ۳۵ برس کی ہوگی —

خود میر کی عمر ۱۱۶۵ هجری میں ۲۸ سال کی ہوگی *اور ۱۱۶۸ ع میں ۳۱ سال —

سودا نسبتاً ان دونوں سے بڑے تھے اور ۱۱۶۵ میں قریب چالیس سال اور ۱۱۶۸ میں قریب ۴۳ سال کے ہوئے† - ان تینوں ہم عصر شاعروں کی عمر کا اندازہ کرنے اور یہ معلوم کرنے کے بعد کہ اثر درد کے چھوٹے بھائی تھے یہ یقینی ہے کہ وہ سنہ ۱۱۶۵ هجری میں ۳۲ سال سے کم ہوں گے —

اگر ہم فرض کرلیں کہ اس وقت اُن کی عمر ۲۰ سال کے قریب ہوگی تو کئی دقتیں پیش آتی ہیں اور ہمارے پاس ان کا کوئی معقول جواب نہیں —

(۱) پہلی دقت تو یہ ہے کہ جب اثر کی عمر ۱۱۶۵ هجری میں ۲۰ سال کی تھی اور ان کے کلام کے دیکھنے کے بعد یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں بیس سال کی عمر میں کافی مشہور شاعر ہونا چاہئے تھا تو میر نے اُن کا ذکر اپنے تذکرے میں کیوں نہیں کیا —

(۲) اگر بالفرض ۲۰ سال کی عمر میں وہ کافی مشہور شاعر نہیں بھی ہوئے تھے تو شاعری کی دنیا میں تھوڑی بہت حیثیت ضرور حاصل کرلی ہوگی - چونکہ میر نے اپنے ہم عصروں میں اچھے اور بڑے سب شاعروں کا ذکر کیا ہے اس لیے ان کا ذکر کرنا بھی ضروری تھا —

---

* اس لیے کہ ان کی محقق تاریخ پیدائش ۱۱۳۷ هجری ہے (مقدمۂ ذکر میر) —

† سودا کی تاریخ پیدائش زیر تحقیق ہے - اپریل سنہ ۳۴ ع کے اردو میں کسی صحیح نتیجہ پر پہونچنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن کامیابی نہیں ہوئی - اس لیے سر دست یہی تاریخ صحیح سمجھی گئی —

تیسرے یہ کہ ۱۱۹۵ ھجری میں ان کی عمر ۲۰ سال مان لینے کے بعد یہ ظاھر ھے کہ مخزن نکات کی تالیف کے وقت وہ تھئیس سال کے ھوں گے اور اس عمر میں ایک اچھے خاصے مرتبہ کے شاعر - قائم درد کے شاگرد ھونے کے باوجود ایسا نہیں کر سکتے تھے کہ اپنے استاد کے چھوٹے بھائی کا ذکر نہ کرتے - بلکہ خیال تو یہ ھے کہ اگر وہ تھوڑی بہت شاعری بھی کرتے ھوتے تو قائم ان کا ذکر ضرور کرتے - لیکن قائم نے ان کا نام تک نہیں لکھا - اس لیے ھم یہی نتیجہ نکالتے ھیں کہ اثر نے اس وقت تک شاعری شروع بھی نہیں کی تھی —

چوتھے یہ کہ اگر میر اور قائم نے انہیں چھوڑ دیا تھا تو شفیق نے چمنستان شعرا * میں ان کا ذکر کیوں نہیں کیا - جب کہ اس میں دو سو سے زیادہ شاعروں کا تذکرہ ھے جن میں سے اکثر شاعر دلی کے ھیں - ممکن ھے کہ یہ جواب ملے کہ شفیق نے اپنے تذکرے میں میر اور گردیزی کی تقلید کی ھے - لیکن اس کا جواب یہ ھے کہ شفیق کے تذکرے میں بہت سے ایسے شاعروں کا بھی ذکر ھے جن کا ذکر نہ میر کے یہاں ھے نہ گردیزی کے یہاں - شفیق کے تذکرے کی تالیف کے وقت مقررہ حساب سے اثر کی عمر ۳۰ سال کی ھوئی - جس عمر میں میرے نزدیک انہوں نے قبول عام کا شرف حاصل کرلیا ھوگا - پانچویں بات میرے نزدیک یہ ھے کہ درد اور اثر کے والد میر ناصر عندلیب بڑے بزرگ اور اپنے زمانے کے جید عالم تھے - اور اس لیے انہوں نے درد کو خود ھی تعلیم دی - لیکن اثر کے متعلق مشہور ھے کہ انہیں مولوی خواجہ احمد خاں اور خود ان کے بھائی خواجہ میر درد نے پڑھایا - اس کی میرے نزدیک دو وجہیں ھیں - ایک تو یہ کہ چونکہ درد نے علم و

* تالیف ۱۲۷۵ ھجری —

فضل کی وہ منزلیں طے کرلی تھیں جو تبحر کا زینہ ھیں اس لیے بجاے اپنے آپ پڑھانے کے ان کے والد نے اثر کو درد کے سپرد کردیا - خواجہ احمد خاں نے ممکن ھے اس لیے پڑھایا ھو کہ وہ اپنے زمانے کے مشہور عالم تھے - دوسری وجہ یہ بھی ھوسکتی ھے کہ جو زمانہ اثر کی تعلیم کا تھا اس میں عندلیب کافی بوڑھے ھوگئے تھے اور اس لیے ایک اھم کام کو انجام نہیں دے سکتے تھے - چونکہ میر عندلیب کی وفات سنہ ۱۱۷۳ ھجری * کے قریب ھوئی ھے سنہ ۱۱۵۳ ھجری † میں ان کی آخری تصنیف ھوئی - اس کے بعد ان کے علمی مشاغل کا کچھہ پتا نہیں چلتا - یہی زمانہ میرے نزدیک اثر کے بچپن اور حصول تعلیم کا ھوگا —

ان خارجی شواھد کی بنا پر ھم اس نتیجہ پر پہنچتے ھیں کہ میر یا قائم کا تذکرہ لکھے جانے کے وقت اثر کی عمر مشکل سے گیارہ بارہ برس کی ھوئی اور اسی لیے ھمیں ان کا ذکر اس زمانے کے کسی تذکرے میں نہیں ملتا - اس حساب سے اثر کی پیدائش کا سال قریب قریب ۱۱۵۳ - ۵۴ یا ۵۵ یا اس کے بالکل قریب ھوسکتا ھے ‡ —

تاریخ وفات تاریخ پیدائش کے متعلق کسی نتیجے پر پہنچنے کے بعد ھمارے سامنے دوسری دقت یہ ھے کہ ھمیں اُن کا سنہ وفات بھی صحیح نہیں معلوم - کسی تذکرہ نویس نے اس کی طرف اشارہ تک نہیں

---

* و † مقدمہ دیوان درد مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی

‡ اس موقعہ پر ایک بات اور کہی جاسکتی ھے اور وہ یہ کہ اثر نے درد کے متعلق اکثر جگہ جن جن جذبات کا اظہار کیا ھے اُس سے اندازہ ھوتا ھے کہ ان دونوں کی عمروں میں بڑا تفاوت تھا اور اس ذریعے سے بھی ھم اُس نتیجہ پر پہنچتے ھیں جس پر اب تک پہنچے (ملاحظہ ھو اسی مضمون کی سرخی درد سے ارادت) —

کیا - اس موقعہ پر بھی ہمیں خارجی شواہد کی مدد سے صرف قیاسیات سے کام لینا پڑے گا --

ہمیں ان کی زندگی کا آخری واقعہ صرف یہ معلوم ہے کہ اپنے بھائی کی وفات کے بعد سجادہ نشین بھی ہوے - لالہ سری رام نے اس کا ذکر یوں لکھا ہے کہ جب درد ضعیف ہوگئے اور زندگی کے ختم ہونے کے آثار نظر آنے لگے تو لوگوں نے پوچھا کہ اُن کے بعد سجادہ کسے دیا جاے تو آبدیدہ ہوکر حضرت درد نے یہ قطعہ پڑھا --

موت کیا ہم سے فقیروں سے تجھے لینا ہے — مرنے سے پہلے ہی یہ لوگ تو مرجاتے ہیں
تا قیامت نہیں مٹنے کے دل عالم سے — درد ہم اپنے عوض چھوڑے اثر جاتے ہیں *

اس سے معلوم ہوا کہ وہ ۱۱۹۹ تک زندہ تھے - اس کی تائید ایک دوسرے طریقے سے اور ہوتی ہے - حکیم قدرت اللہ لکھتے ہیں کہ "...... و بعد از انتقال آں ستودہ خصال ممکن نبود کہ در حین ذکر خیروے از چشم گوہر فشاں شاں اشک درد آلود حسرت اندود دریا دریا نبارد † " --

یہ تذکرہ ۱۲۲۱ ہجری میں لکھا گیا ہے - حکیم قدرت اللہ نے اس موقعہ پر ان کا ذکر اس طرح کیا ہے کہ گویا اُن کا انتقال ہوگیا - ایک جگہ لکھتے ہیں --

"بریں عاصی بانواع المعاصی زیادہ تراز انکہ در حوصلۂ تقریر و تحریر گنجد لطف عنایت مبذول می داشتند" - آگے چل کر لکھتے ہیں - "دیوان مختصر در نہایت جودۃ و پاکیزگی و مثنوی خوردک درغایت متانت و شستگی یادگار ایں بزرگوار است" --

"می داشتند" اور "یادگار ایں بزرگوار است" سے بھی نتیجہ

---

* خمخانہ جاوید جلد اول صفحہ ۱۲۶ - † مجموعۂ نغز -

نکالا جا سکتا ہے کہ وہ سنہ ۱۲۲۱ ہجری سے پہلے مر چکے تھے —

مولف گل رعنا نے معلوم نہیں کس بنا پر لکھا ہے کہ اُن کے نزدیک وہ ۱۲۵۰ سے پہلے مرے - میرے خیال میں کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ جب ۱۲۲۱ میں بھی اُن کی وفات کا یقین ہو چکا ہے تو اس زمانہ کو اور زیادہ طویل کیوں بنایا جاے —

ان قیاسی نتائج تک پہنچنے کے بعد ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ اثر کی عمر بھی اپنے والد اور بڑے بھائی کی طرح ۶۰ اور ۷۰ کے درمیان ہوگی -

دوسرے حالات

اثر کے متعلق ہر تذکرہ نویس کو اتفاق ہے کہ وہ خواجہ میر درد کے چھوٹے بھائی تھے - اس لئے اُن کا سلسلۂ خاندانی بھی وہی ہے جو درد کا تھا - درد کے متعلق جتنے تذکرہ نویسوں نے حالات لکھے ہیں وہ ہر حیثیت سے معتبر نہیں سمجھے جا سکتے - مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی نے ان کے حالات ان کی کتاب علم الکتاب سے اخذ کئے ہیں اور اس لیے وہ زیادہ معتبر ہیں - وہ لکھتے ہیں کہ "درد صحیح النسب حسینی سید ہیں - آبائی سلسلہ بارھویں پشت میں خواجہ بزرگ بہاؤالدین نقشبندی قدس سرہ سے اور چھبیسویں پشت میں حضرت امام عسکری سے ملتا ہے - مادری سلسلۂ نسب حضرت غوث اعظم (رض) تک منتہی ہوتا ہے - خواجہ صاحب کے والد کی والدہ بھی حضرت غوث اعظم (رض) کی اولاد میں تھیں - والد کا نام خواجہ ناصر، عندلیب تخلص، نانا میر سید محمد حسنی تھے - جو بیٹے تھے نواب میر احمد خاں شہید کے - نواب صاحب پانی پت کے معرکے میں نادر شاہ کے مقابلہ میں شہید ہوے - جہانکشاے نادری میں ان کا ذکر ہے - مرزا رفیع سودا کے ممدوح تھے ...... مسکن پرانی دلی میں تھا ...... خواجہ ناصر صاحب کے والد بخارا سے

تحصیل علم کے بعد عہد عالمگیری میں وارد ہندوستان ہوے تھے - خواجہ ناصر صاحب ہندوستان میں پیدا ہوے - ابتداءً شاہی منصب داروں میں شامل تھے - آخر منصب ترک کرکے یاد الہی میں مصروف ہوئے۔ حضرت قبلۂ عالم خواجہ محمد زبیر سے بیعت تھے " * - یہاں تک جتنے حالات ہیں ان کا تعلق لفظ بہ لفظ میر اثر سے بھی ہے —

تعلیم

اثر کے علم و فضل کی ہر ایک نے تعریف کی ہے - میر حسن لکھتے ہیں " درویشے است موقرو صاحب نسخے است مؤثر عالم و فاضل رتبۂ قدرش بغایت بلند گوہر صدرش نہایت ارجمند " + —

میر حسن نے جتنے شعرا کے متعلق رائیں قائم کی ہیں وہ بے حد جنچی تلی ہیں - ان پر مبالغہ کا گمان بھی نہیں ہوسکتا - اس لیے ان کی یہ راے بھی بے حد وقیع ہے —

حکیم قدرت اللہ خاں نے لکھا ہے " بزیور علم آراستہ و بحلیہ فضل پیراستہ بودند - استفادۂ علوم ضروریہ ایشاں را از جناب افادۂ انتساب .. .. مولوی خواجہ احمد خاں علیہ الرحمۃ والرضوان است " ‡ —

اِس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے اُستاد خواجہ احمد خاں علیہ الرحمہ تھے ۔ مولف گل رعنا کا خیال ہے کہ اثر نے ان سے فنون ریاضیہ کی تعلیم حاصل کی ۔ معلوم نہیں ان کا ماخذ کیا ہے - انہوں نے خواجہ احمد خاں کے متعلق لکھا ہے کہ زیج محمد شاہی انہیں کے اہتمام میں لکھی گئی —

---

* مقدمۂ دیوان درد مطبوعہ بدایوں پریس صفحہ ۳ -
+ تذکرۂ شعراے اردو میر حسن -
‡ مجموعۂ نغز (حالات اثر) -

اُن کی علمی قابلیت کے متعلق یہ دو خارجی شواہد جو ذمہ دار لوگوں کی زبان قلم سے نکلے ھیں معتبر سمجھے جاسکتے ھیں - اب ہم دوسرے وسائل کی طرف رجوع کرتے ھیں -

خواجہ میر درد کی تصانیف میں سے ایک علم الکتاب بھی ھے جو اُن کی مشہور کتاب 'واردات' کی شرح ھے * - مولانا حبیب الرحمن خاں نے لکھا ھے کہ علم الکتاب اثر کی فرمائش سے لکھی گئی + -

نالۂ درد علم الکتاب کے بعد کی تصنیف ھے' اس کے متعلق درد نے دیباچہ میں لکھا ھے کہ " علم الکتاب کے ختم ہونے پر جو مطالب " قلب حیران ' پر تراوش کرتے تھے ان کو میر اثر جمع کرتے گئے - جب مجموعہ تیار ہوگیا نالۂ درد نام رکھا ‡ - اس کی تاریخ بھی میر اثر نے کہی ھے " نالۂ عندلیب درد من است" -

سنہ ۱۱۱۲ ھجری میں درد نے ایک رسالہ آہ سرد لکھا - اُس کی تاریخ بھی اثر نے کہی "آہ سرد ما نماید گرمیء رفتار ما" - یہ چیزیں ایسی ھیں جن سے اندازہ ہوتا ھے کہ درد کے دل میں بھی اثر کے علم وفضل کا اثر تھا ورنہ وہ ان کی فرمائش سے ایسی اہم کتاب نہ لکھتے - نالۂ درد کے مطالب کو ان کے بھروسہ پر نہ چھوڑ دیتے - ان کی کہی ہوئی تاریخوں سے بھی ان کے کمال کا اندازہ ہوتا ھے -

اس کے علاوہ ایک اور چیز جس سے ان کے علم کا پتا چلتا ھے خود ان کا دیوان ھے - جس میں جا بجا تصوف وفقہ کے گہرے مطالب آسان

---

* مقدمۂ دیوان درد صفحہ ۴ -   + مقدمۂ دیوان درد صفحہ ۹ -

‡ مقدمۂ دیوان درد صفحہ ۹ -

لفظوں میں بیان کیے گیے ہیں جس سے پتا چلتا ھے کہ ان کا بیان کرنے والا ان پر کتنا عبور رکھتا ھے۔ تصوف کے اشعار ان کی شاعری کا ذکر کرتے وقت پیش کیے جائیں گے۔ اس جگہہ صرف دو ایک شعر سن کر ان کی علمیت کا اندازہ لگائیے —

باوجو یکہ وہاں نہ ہجر نہ وصل کوئی مہجور کوئی واصل ھے

گر ہم ھی ہم ہیں آہ تو ہم ہم کبھو نہ ہوں اور تو ھی تو ھے سب کہیں تو ہم کہاں رھے
مفہوم متمنع سے عدم میں تو ہاں رھے کہنے کو آہ ہم تو رھے پر کہاں رھے

صلح کل بہت سچ ھے آساں ساتھہ اپنے جدال مشکل ھے
صاحب دید کی زباں ھے لال شمع کو قیل و قال مشکل ھے

عرفان اتم ھے عجز عرفاں تعریف تصور ھے ثنا کا

بعض جگہہ عربی کے فقرے بے حد بے تکلفی سے نظم کیے ہیں —

ازواج مطہرات اُس کے کل ماصدق انہ النساء کا *

ایک غزل کا شعر ھے —

یا رب سوا لقاء وجہک لا مقصودی ولا مرادی

اِن شواہد سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اثر عالم و فاضل تھے یا نہیں۔ میرے نزدیک شبہہ کی کوئی وجہ نہیں۔ ان کے زیادہ اشعار

---

* یہ مصرع تقطیع سے ذرا گرتا ھے۔ مولانا عبدالحق صاحب کا خیال ھے کہ اصل نسخے میں یہ مصرع اسی طرح ھے۔ میرے نزدیک کتابت کی غلطی ھے۔

پڑھ کر یہ یقین اور زیادہ مضبوط ہوجاے گا —

درد سے ارادت

اثر نے بیعت اپنے والد بزرگوار کے ہاتھہ پر کی *- لیکن انہیں اپنے بڑے بھائی سے جتنی محبت، عقیدت اور ارادت تھی وہ ضرب المثل ہونے کے لائق ہے - حکیم قدرت اللہ نے اس بات کو صرف ایک جملے میں اس طرح لکھا ہے " در محبت برادر مہیں آنچناں مستغرق و ہامک بودند کہ زیادہ از آن متصور نیست" + - انہیں کے خیال کے مطابق ان کی اس قدر اطاعت کرتے تھے کہ کوئی بات یا کام بلا ان کی مرضی کے نہیں کیا اور ان کے انتقال کے بعد انہیں یاد کر کر کے بہت رویا کرتے تھے - ان باتوں کا اندازہ اُن کا کلام پڑھ کر بھی ہوتا ہے - اکثر جگہ درد کا ذکر کیا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں وہ سب کچھہ انہیں کو سمجھتے ہیں - حتی کہ عاقبت کی نجات کا ذریعہ بھی اُنہیں کا دامن ہے - جو شعر اس قسم کے دیوان اثر میں ہیں وہ درد کے رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں - کچھہ شعر آپ کی خدمت میں بھی پیش کیے جاتے ہیں —

ہے غلامی اثر کو حضرت درد		بدل و جاں تری جناب کے بیچ

ہے تجھہ سے عاشقوں کی خوبی		یا حضرت درد میرے والی

اس شعر میں حضرت عندلیب کی طرف رجوع ہوئے ہیں لیکن درد کا ذکر وہاں بھی ہے —

یا حضرت عندلیب بخشش		یہ تیرے ہی درد کا اثر ہے

اسی غزل کا مقطع ہے

بے درد تو کیونکہ رہ سکے گا		یہ حضرت درد کا اثر ہے

درد کا صدقہ اثر ہم بھی بھلا حق کے حضور		شمع ساں اشک ندامت سے خودی دھوکرچلے

---

* مجموعۂ نغز - + مجموعۂ نغز -

ایک رباعی ہے —

جب تجھ سے جدائی میری محبوب بلی تب زیست اثر کی بری اسلوب بلی
اُس کی بھی خود بخود تم ہی خوب بلاو جوں درد تمہاری بخدا خوب بلی

ہے درد کا درد اثر کا یار جانی یہ بات تو اب زیست گزارے جانی
صد شکر نہیں رہا غم تنہائی ہے جان اسی کے ساتھ بارے جانی

اے مرشد دستگیر قرباں تیرے اے میرے زندہ پیر قرباں تیرے
تیری ہر بات پر دل و جاں ہے فدا یا حضرت خواجہ میر قرباں تیرے

یا درد یا اثر اثر تیرا ہے اے سر پدر یہ بے پدر تیرا ہے
اللہ کریم اور تو کریم ابن کریم یہ گو کہ گنہگار ہے پر تیرا ہے

مثنوی خواب و خیال میں دو جگہ اسی جذبہ کی ترجمانی ہوئی ہے * —

درد ہی میرے جی پہ چھایا ہے درد کا میرے سر پہ سایا ہے

خصوصاً یہ شعر —

تونے ایسی ہی دستگیری کی پدری مادری و پیری کی
تونے اس مہر و غور سے پالا نہ پڑا مجکو اور سے پالا

ان شعروں میں سے بہت سے شعر ایسے ہیں جن سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اثر اور درد کی عمروں میں کافی فرق تھا ـ

---

* مقدمہ مثنوی خواب و خیال —

اخلاق و عادات

اثر کے اخلاق و عادات کا پتا کسی تذکرے سے نہیں چلتا - صرف حکیم قدرت اللہ نے ان کے متعلق یہ لکھا ہے کہ

" از نیک ذاتی شان چہ بر طرازد - خامہ باوجود دو زبان از تحریر آن عاجز اید خیلے خلیق و متواضع - و رفیق القاب و صاحب درد ..." *

اس کے علاوہ ان کے ان شعروں سے جو انہوں نے درد کے متعلق کہے ہیں یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ انتہا سے زیادہ مہذب ' منکسر مزاج اور فرماں بردار تھے - خود حکیم قدرت اللہ نے بھی لکھا ہے کہ بلا بھائی کی اجازت کے کوئی کام نہ کرتے تھے - ایک دوسری صفت جو ان شعروں میں نمایاں طور پر جھلکتی ہوئی نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ حد سے زیادہ احسان کو ماننے والے تھے - دنیا کے جھگڑوں سے بہت کم سروکار رکھنا چاہتے تھے اور خدا تک پہنچنے کے لئے بھی اپنے بھائی کی مدد کے طالب تھے - مجموعی حیثیت سے ان باتوں کو دیکھ کر ہم ان کے متعلق یہی رائے قائم کرتے ہیں کہ ان میں وہ سارے اخلاق حسنہ موجود تھے جن سے انسانیت کی تکمیل ہوتی ہے - پہلی چیز یہ ہے کہ اپنے بزرگوں کا احترام کیا جائے - دوسری چیز یہ ہے کہ دنیا کے لوگوں سے خاطر اور محبت سے ملا جائے - دل میں نیکی اور سچائی ہو - اثر میں یہ سب باتیں موجود تھیں —

ان کی روحانی بزرگی کا ثبوت یہ ہے کہ خود میر درد نے انہیں اپنے سجادہ کے لئے سب سے زیادہ موزوں سمجھا —

شاعری

اس وقت ہم اثر کی شاعری کے جس پہلو پر نظر ڈالنے جارہے ہیں اس کا تعلق اس دیوان سے ہے جو مولانا عبدالحق صاحب کے مختصر مقدمہ کے ساتھ مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ سے شائع ہوا

---

* مجموعۂ نغز -

ہے - دیوان میں کل ۷۸ صفحہ ہیں - ۹۱ صفحہ تک مختلف ردیفوں میں غزلیں ہیں - صفحہ ۹۱ سے صفحہ ۹۹ تک مختلف مطالع ہیں - صفحہ ۹۹ سے آخر تک رباعیات ہیں - لیکن کلام پر تنقید کرتے وقت ہم ان چیزوں کو الگ الگ نہیں کریں گے بلکہ اثر کے کلام کے جو نکات بیان کریں گے ان کی مثالیں غزلوں، مطالع اور رباعیات سے یکساں طور پر اخذ ہوں گی —

اثر کی شاعری کی مجموعی اور انفرادی صفات بیان کرنے سے پہلے یہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان کے کلام پر جو خارجی اثرات پڑے ہیں ان کا بھی ذکر کردیا جائے —

ان کی زندگی کے ہر پہلو کو جس چیز نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ خواجہ میر درد کی ذات تھی - ان کی نیکیاں، ان کے دنیاوی اخلاق، ان کی روحانی بلندی، ہر چیز درد کے اثر کی مرہون منت ہے - اول تو اسی رنگ میں رنگ جانے کے بعد اثر کی فطرت بالکل ایسی ہوگئی کہ نفسیاتی نقطۂ نظر سے بھی ان کی شاعری کو بالکل ویسا ہی ہونا چاہیے تھا جیسی درد کی شاعری ہے - لیکن میرے نزدیک یہ چیز صرف شاعری کی روح اور اس کے خیالات اور جذبات کے انداز پر اثر ڈال سکتی تھی - لیکن کلام اثر کو گہری نظروں سے دیکھنے سے پتا چلتا ہے کہ جہاں انہوں نے درد سے اور اثرات لئے وہاں ان کی شاعری کے انداز سے بھی بے حد متاثر ہوئے اور میں تو یہاں تک کہنے کو تیار ہوں کہ یہ اثر اس قدر نمایاں ہے کہ درد کے کلام کے متعلق مختلف نقادوں اور تذکرہ نویسوں نے جو تنقیدیں کی ہیں ان میں سے اکثر کا اطلاق لفظ بہ لفظ اثر کے کلام اور دیوان پر ہوسکتا ہے - اس میں شک نہیں کہ اثر نے درد سے اصلاح لی لیکن اردو میں کسی دوسرے شاعر کی اس قسم کی مثال ملنی دشوار ہے

جس میں شاگرد نے استاد کا اتنا گہرا اثر قبول کیا ہو کہ دونوں میں تمیز مشکل ہوجاے - اب ہم مختصر طور پر اس بات کو مثالوں سے واضح کرنے کی کوشش کریں گے —

میر حسن کی تنقید دیوان درد پر یہ ہے کہ "دیوانش اگرچہ مختصر مگر سراپا انتخاب" اثر کا دیوان درد کے دیوان سے بھی زیادہ مختصر ہے اور اس کا ہر شعر انتخاب ہے -

درد کے کلام کے متعلق مجموعی تنقید یہ ہے کہ ان کے یہاں درد اور اثر کوٹ کوٹ کر بھرا ہے - تصوف اردو میں ان سے بہتر کسی نے نہیں کہا - زبان بے حد صاف، سلیس، فصیح اور شیریں ہے - ان سب باتوں کا ذکر آگے چل کر کسی قدر مفصل طور پر کیا جاے گا - لیکن اس جگہ دو ایک باتیں لکھنی ضروری معلوم ہوتی ہیں -

آزاد نے درد کے کلام پر تنقید کرتے وقت اُن کی غزلوں کی ایک تعریف یہ کی ہے کہ چھوٹی بحروں میں جو غزلیں ہیں ان میں تلواروں کی آبداری نشتروں میں بھر دی ہے - یا بقول امیر مرحوم کے پسی ہوئی بجلیاں ہیں - مثال کے طور پر اثر کی دو ایک ایسی غزلیں دیکھ کر اندازہ کیجئے -

جب تلک تو اِدھر کو آوے گا — تب تلک جی نکل ہی جاوے گا
قہر طوفان ہے مرا گریہ — ایک عالم کو یہ ڈوباوے گا
کون ہے وہ کہ خیر خواہی سے — حال میرا تجھے دکھاوے گا
دیکھ لیجو یہ انتظار میرا — ایک دن تجھ کو کھینچ لاوے گا
تو نے بندے سے جو سلوک کیا — بت کافر خدا سے پاوے گا
یاد رکھنا بھلا نہ مل بہتر — پھر کبھو تو خدا ملاوے گا

جس قدر ہو سکے ستالے تو جب یہ بندہ بھی کچھہ ستاوے گا
اثر اب تو ملے ہے تو اس سے
پر یہ ملنا مزا دکھاوے گا

دیکھئے تو سہی کہ کیا ہوتا ایک نالہ اثر کیا ہوتا
چھوٹتے ہی یہ بد معاملگی پہلے دل کو تو لے لیا ہوتا*
اب توقع کسے بھلائی کی دل نہ ہوتا تو کچھہ بھلا ہوتا
خواہ بوسہ ہی خواہ گالی ہی کچھہ تو دل کے عوض دیا ہوتا
جانتا کچھہ قدر ہماری بھی تو بھی عاشق اگر ہوا ہوتا
بےوفائی پہ تیری جی ہے فدا قہر ہوتا جو با وفا ہوتا
کچھہ اثر کا علاج کرتے ہم
رات کی رات گر جیا ہوتا

جو سزا دیجئے بجا مجکو تجہہ سے کرنی نہ تھی وفا مجکو
غم میں بیٹھوں کہاں تئیں بت کے اب اٹھا دے کہیں خدا مجکو
سرد مہری نے تیری اے ظالم آہ کتنا جلا دیا مجکو
گر اسی میں خوشی تمہاری ہے اور بھی کیجئے خفا مجکو
کیوں تو ہر چند جفا ہی کرتا ہے نہیں کچھہ دعوۂ وفا مجکو
وہی میں ہوں اثر وہی دل ہے
اب خدا جانے کیا ہوا مجکو

---

* مطبوعہ دیوان میں اس شعر کا پہلا مصرعہ یوں لکھا ہے 'چھوٹتی ہے یہ بد معاملگی' دوسرے مصرعہ کے ساتھہ اس کے کچھہ معنی نہیں ہوتے - معلوم نہیں عبدالحق صاحب کی نظر اس پر کیوں نہیں پڑی - یہ غلطی اس لیے ہوئی ہوگی کہ قلمی نسخوں میں عموماً یائے مجہول و معروف کی کتابت میں کوئی فرق نہیں سمجھا جاتا -

روز اٹھه کر نیا بہانا ہے کام میرا غرض بہانا ہے
راہ تکتے ہی تکتے ہم تو چلے آئیے بھی کہیں جو آنا ہے
نہ ملوں جب تلک کہ تو نہ ملے اب یہی قصد جی میں ٹھانا ہے
کبھو میرا بھی کہنا مانئے گا جو کہا تو نے میں میں مانا ہے
وعدے کر انتظار میں رکھنا نت نئی طرح کا ستانا ہے
دل گیا جی بھی اب تھکانے لگا تس پہ بھی باقی آزمانا ہے
تیرے در پر بسان نقش قدم نقش اپنا ہمیں بٹھانا ہے
ہر طرف توڑ جوڑ کرتے ہو دلبری ایک کارخانہ ہے
تیری عیاریوں کی باتیں اثر
سب سمجھتا ہے گو دِوانا ہے

لوگ کہتے ہیں یار آتا ہے دل تجھے اعتبار آتا ہے
دوست ہوتا جو وہ تو کیا ہوتا دشمنی پر تو پیار آتا ہے
تیرے کوچه میں بے قرار ترا ہر گھڑی بار بار آتا ہے
زیر دیوار تو سلے نہ سلے نام تیرا پکار آتا ہے
حال اپنے پہ مجکو آپ اثر
رحم بے اختیار آتا ہے

اثر کی یہ غزلیں بلا کسی انتخاب کے لکھی گئی ہیں اور ضروری نہیں که یه سب سے اچھی ہوں - بلکه مجھے یقین ہے که ان کے دیوان میں ان سے اچھی اچھی غزلیں چھوٹی بحروں میں موجود ہیں - بلکه پورے دیوان میں زیادہ غزلیں چھوٹی بحروں میں ہیں اور بہت کم بڑی بحروں میں- اور ان سب غزلوں میں درد کے کلام کی ساری خصوصیات موجود ہیں -

ان میں درد اور اثر ہے - ان میں بلند جذبۂ عشق کی ترجمانی ہے - اُن میں تصوف ہے - اور ساتھ ساتھ سادگی اور زبان کی فصاحت و سلاست ــ

اثر کے دیوان میں کئی غزلیں ایسی ہیں جو درد کی غزلوں کی زمینوں میں کہی گئی ہیں - ان سب کا یہاں نقل کرنا طوالت سے خالی نہیں - لیکن کم از کم دو غزلیں لکھی جاتی ہیں جن سے اندازہ ہو جائے کہ دونوں کے کلام میں کس قدر باتیں یکساں ہیں - درد کے دیوان کی پہلی غزل یہ ہے —

مقدور ہمیں کب ترے وصفوں کے رقم کا — حقا کہ خداوند ہے تو لوح و قلم کا
جس مسند عزت پہ کہ تو جلوہ نما ہے — کیا تاب گذر ہووے تعقل کے قدم کا
بستے ہیں ترے سایہ میں سب شیخ و برہمن — آباد ہے تجھہ سے ہی تو گھر دیر و حرم کا
ہے خوف اگر جی میں تو ہے تیرے غضب کا — اور دل میں بھروسہ ہے تو تیرے ہی کرم کا

مانند حباب آنکھہ تو اے درد کھلی تھی
کھینچا نہ پر اس بحر میں عرصہ کوئی دم کا

اثر کی غزل بھی پانچ شعر کی ہے - دونوں غزلوں میں صرف ایک قافیہ یکساں ہے - باقی جدا گانہ - لیکن خیالات کا اندازہ دیکھئے کیسا ہے -

نے ضد کوئی نے ند تری اوصاف و شیم کا — وہ ہست نہیں تو کہ مقابل ہو عدم کا
کیا کہہ کے بیاں کیجے تری ذات صفت کو — وہاں تو نہ گذر نام و نشاں کا نہ علم کا
کیا تیرے دوام اور بقا کی کہے حادث — اس تن کی عبادت سے ہے اطلاق قدم کا
ہم عاصی گنہگاروں کو بس دونوں جہاں میں — صرف ایک ٹھکانا ہے تیرے فضل و کرم کا

رہتا ہوں بہر حال سبھی وقت میں میں شاد
ہے گا یہ اثر خاص ترے درد و الم کا

دوسری غزل ملاحظہ ہو —

درد

اک آن سنبھلتے نہیں اب میرے سنبھالے
بے طرح کچھہ آنسوؤں نے پاؤں نکالے

جو کچھہ دکھاوے گا خدا دیکھیں گے ناچار
صدقے ترے اک بار تو منہ اپنا دکھالے

ایسے سے کوئی اپنے تئیں کیونکہ بچاوے
دل زلفوں سے بچ جاے تو آنکھوں سے چرالے

وہ سرخ لباس اُس کے گلے میں نظر آیا
جس کے ہیں مرے دل میں پڑے اب تئیں لالے

کب تجھہ پہ گذرتا ہے کبھو میرا سا احوال
یوں چاہے تو تو اور بھی کچھہ باتیں بنالے

کیا جانئے کس دل کے تئیں آہ ڈسیں گے
زلفوں نے تو بے طرح یہ اب چھوڑے ہیں کالے

پھر آئے قیامت ہے اگر اب بھی نہ آؤ
مرمت کے جدائی کے دن اتنے تو ہیں ٹالے

ابرو نے تری جس طرف اب تیغ سنبھالی
مژگاں نے وہیں کردیے تب سامنے بھالے

وعدے کی تو مدت نہ کہی درد کچھہ اُس نے
اس غم کو بھلا کہئے کوئی کب تئیں ٹالے

اثر

اب آنسو کہاں دیدۂ گریاں جو نکالے
یہ اشک نہیں پھوٹ بہے دل میں کے چھالے

دل اپنا پڑا اُس بت بے مہر کے پالے
دشمن کو بھی جس سے کہ خدا کام نہ ڈالے

مشکل ہے میری جان کسو دل کا اُڑانا
یوں مفت پڑا تو نہیں جو کوئی اُٹھا لے

جوں نقش قدم خاک نشیں ہم ترے در کے
اس جا پہ مٹیں پر نہ ٹلیں سو کوئی ٹالے

ساقی نئے جلوے سے اُنھیں کیجئے معمور
ہیں خالی پڑے مثل حباب آنکھوں کے پیالے

سب حیلے حوالے سے تمہارے ہوں میں واقف
مت آئیے پر دل تو میرا کیجے حوالے

دل مارتے یوں ہوگئے با خاک برابر
وہ طفل سرشک اپنے جو میں آنکھوں میں پالے

یک جلوہ دکھاتے ہی ہوا آنکھ سے غائب
ٹک نام بتا دل کو چرا بھاگنے والے

دل نکلے پڑے ہے یہ ادھر اور اودھر آنسو
بے چارہ اثر کیا کرے کس کس کو سنبھالے

جی تو چاہتا تھا کہ اس قسم کی سب غزلیں نقل کر دیتا جو ایک ہی زمین میں دونوں دیوانوں میں ہیں - لیکن طوالت کے خیال سے دو ہی پر اکتفا کرتا ہوں اور میرے نزدیک ان دو غزلوں سے اس کا اندازہ بھی ہو جائے گا کہ درد اور اثر میں کتنی یکسانیت ہے —

غزل کا سب سے مہتم بالشان موضوع محبت اور اس کے متعلقات

ں - غزلوں میں عاشق اپنی حالت ' محبوب کی صفات ' اپنی مجبوریاں '
بوب کی زیادتیاں ' اپنی وفا اور محبوب کی بے وفائی کا رونا روتا
- اُس کے دل کی حالت کبھی ایک سی نہیں رہتی - کبھی محبت اُسے
پہ بنا دیتی ہے اور کبھی کچھہ - کبھی وہ عشق کو اپنا ایمان اور محبوب
اپنا خدا سمجھنے لگتا ہے اور کبھی اپنے کئے پر پچھتاتا ہے - کبھی اپنی
حبت کا اظہار کرتا ہے اور کبھی اسے پوشیدہ رکھہ کر اپنی بلند ہمتی
ر اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دینا چاہتا ہے - سب کچھہ ہوتا ہے ' متضاد
حالات دل میں آتے ہیں لیکن ایک سچا عاشق کبھی اس قسم کی کوئی
ت نہیں کرتا جو اُسے یا اُس کے محبوب کو لوگوں کی نظروں میں پست
ذلیل بنا دے یا لوگ اُس کے جذبۂ عشق کا احترام کرنے کے بجائے
، دیوانگی سے تعبیر کریں —

انسان کی فطرت ایک خاص چیز ہے - اُس کا ہر فعل اُس کی فطرت
رنگ میں ڈوب کر نکلتا ہے - لیکن کبھی کبھی مجبوریوں کی وجہ سے
ایسی باتیں کرنے لگتا ہے جو اُس کی فطرت کے بالکل خلاف ہیں - یہی
الت عاشق کی ہے - وہ ایک عاشق صادق ہونے کی حیثیت سے ہمیشہ
ق کے بلند جذبے سے کام لیتا ہے اور اُس کا ہر فعل اور قول اُس کی
شقانہ فطرت کی بلندیوں کا آئینہ ہے - لیکن انتہائے یاس یا بد گمانی کی
ہ سے وہ کبھی کبھی ایسی باتیں بھی کر جاتا ہے جو اُس کی عاشقانہ
رت کے منافی ہیں - ان چیزوں سے اُس کے بلند جذبۂ عشق پر کوئی
ر نہیں پڑتا - وہ اپنی جگہ قائم ہے - اس کی کمزوریاں فطرت انسانی
خاصہ ہیں اور اگر وہ ایسا نہ کرتا تو اس کا عشق یا اسّ کی محبت
جذبہ غیر فطری معلوم ہوتا - اور اس لیے اس میں کوئی امتیازی

شان باقی نہ رہتی —

اثر کے دیوان میں جن عاشقانہ جذبات کو نظم کیا گیا ہے اُن میں سے بہت کم ایسے ہیں جو ہماری راہبری کسی اعلیٰ (Ideal) محبت کی طرف کرتے ہیں - اُن کی محبت کے جذبات میں جن جن باتوں کی جھلک ہے وہ انسانی محبت کے لئے ضروری ہیں - اعلیٰ (Ideal) محبت انسان اور انسان میں ہونی ممکن نہیں - وہ دو مختلف جنسوں میں ہوسکتی ہے اس لیے اثر کے یہاں جب کسی اعلیٰ (Ideal) عشق کی ترجمانی ہوئی ہے وہاں صاف نظر آتا ہے کہ اُن کا محبوب اس آب و گل کی دنیا سے بالاتر ہے - ورنہ ہمیشہ اُن کی محبت کے فلسفہ میں فطرت انسانی کی صحیح تصویریں نظر آتی ہیں - وہ محبوب کی برائی بھی کرتے ہیں ' اپنے عشق کے انجام کو سونچ کر پچھتاتے بھی ہیں ' اپنی محبت بھی جتاتے ہیں - لیکن صرف اس لیے کہ یہ فطری چیز ہے - لیکن اس کے باوجود ایسا کبھی نہیں کہ اس محبت میں پستی یا ابتذال کا شائبہ تک ہو - کبھی کبھی عشق مجازی میں بھی اعلیٰ (Ideal) عشق کی جھلک ہے —

ایسا عاشق ہمیشہ اپنی محبت کو اپنا ایمان اور مذہب جانتا ہے - اور محبوب کی محبت کو اپنے لئے ایک ایسا فرض سمجھنے لگتا ہے جس کا پورا کرنا اُس کی زندگی کا سب سے پہلا کام ہے - اس قسم کے شعر اثر کے ہاں اچھی خاصی تعداد میں ہیں —

کہوں کیا خدا جانتا ہے صنم محبت تیری اپنا ایمان ہے

ہم راست گو مسلماں حق ہی بتاں کہیں گے
تم بندے ہو خدا کے ہم بندے ہیں تمہارے

جو عاشق اس درجۂ عشق تک پہونچ جاتے ہیں وہ یہ محسوس کرنے

لگتے ہیں کہ عشق کوئی آسان چیز نہیں —

نشۂ عشق سہج ہے پینا لیکن اُس کا سنبھال مشکل ہے

یہی عاشق عشق کی تکلیفوں کو راحت جانتے ہیں —

عاشق جو گداز قلب سے گلتا ہے گلزار خلیل پھولتا پھلتا ہے

جوں شمع دل سوختہ جانان عشق روشن رہتا ہے جب تلک جلتا ہے

اور اُن کی تکلیف اور آرام کا دارومدار محبوب کے ساتھ رہنے نہ رہنے پر ہے —

جلت ہے اُس بغیر جہنم سے بھی زبوں دوزخ بہشت ہے گی اگر یار ساتھ ہے

وفاداری عشق

ایسے عاشق وفاداری کو اپنا ایمان جانتے ہیں اور ہر حالت میں محبت کا دم بھرتے ہیں - اُنہیں کوئی چیز اُن کے راستے سے ہٹا نہیں سکتی —

بے وفائی وہ گو ہزار کرے یہاں وفا ہی شعار اپنا ہے

ظاہرا کچھ سوائے مہر و وفا بات تجھ کو مگر نہیں آتی

ایسے عاشق ہر غم کو بلا شکوہ شکایت کے جھیلتے رہتے ہیں —

میں اور کروں گا تیرا شکوہ جلّیں یہ کہا غلط ہے

تم نیں جو کچھ ستم سہے کوئی اثر وہ کیا کہئے

جی نہ رہے کہ یا رہے اب بھی نباہ کیجئے

کتنی اچھی تلقین ہے جس کا اطلاق زندگی کے ہر شعبہ پر ہو سکتا ہے --

تم جور و جفا کرو جو چاہو ان باتوں پہ کب مجھے نظر ہے

اس مضمون کی ایک رباعی ملاحظہ ہو کس مزے میں کہی ہے —

دام زلفوں نے تیری ایسا ہے تیار کیا دیکھا آزاد جسے اُس کو گرفتار کیا

جو کیا خوب کیا اور جو ہوگا سو قبول تجھ سے کب ہم نے کسی بات کا تکرار کیا

صرف اپنا عشق مکمل | ایسے عاشق اپنے عشق کے نزدیک دوسرے کے عشق کو ہیچ و پوچ جانتے ہیں —

سا ری مجلس میں تیری اے ساقی ایک اپنے تئیں خمار رہا
عاشقی اور عشق کی باتیں سب جہاں سے اثر کے ساتھ گئیں

محبوب سب کچھ | ایسے عاشق اپنی ساری اُمیدوں اور خوشیوں کو صرف محبوب کی ذات سے وابستہ کردیتے ہیں - اُن کے تعلقات کی دنیا محبوب تک جاکر ختم ہو جاتی ہے —

میں تو اپنی بساط میں بے کس تجھکو اے مہربان رکھتا ہوں
تیری اُمید چھٹ نہیں اُمید تیرے در کے سوائے ڈر ہی نہیں

نہ ہم واقف کسو سے نہ کسو سے کام رکھتے ہیں
سوا تیرے بساط اپنی خدا کا نام رکھتے ہیں

ایسے عاشقوں کی ہر طرح مشکل ہے - دیکھیں تو مشکل نہ دیکھیں تو مشکل - محبوب کا دیدار نصیب نہیں ہوتا تو دل تڑپتا ہے - دل کی اُمیدیں پوری ہونے کا وقت آتا ہے تو آنکھیں اُس جلوہ کی تاب نہیں لاسکتیں - جس سے انتہائی محبت ہے اُسی سے حد سے زیادہ ڈر بھی ہے - کس قدر سادگی سے سوال کرتے ہیں کہ —

تو نگہ کی نہ کی خدا جانے ہم تو ڈر سے کبھو نگاہ نہ کی

اسی مضمون کو دوسری طرح کہا ہے —

وہ کون لوگ ہیں جو تجھکو دیکھہ سکتے ہیں نگاہ کرتے ہی اپنا تو جی ہی جاتا ہے

محبوب کا ڈر | تو نے ہی تو یوں نڈر کیا ہے
بس ایک مجھے تیرا ہی ڈر ہے

رباعی• اپنے تو جی سے تیرا ڈر نہ گیا جی گیا یہ نہ گیا پر نہ گیا

آہ کس دن کے لئے یہ رہا   آج کی رات اثر مر نہ گیا

یہ تو اُس عشق کے جذبہ کی ترجمانی ہے جسے مجازی کہنے کے بعد بھی ہم کسی نہ کسی حد تک اعلی (Ideal) کہہ سکتے ہیں - لیکن اثر کی عاشقانہ شاعری کا لطف ان شعروں میں نہیں بلکہ وہاں ہے جہاں وہ اس خیالی دنیا سے اُتر کر حقیقت کی دنیا میں قدم رکھتے ہیں - عاشق ، معشوق ، عشق ، اور محبت سب فطرت کے رنگ میں ڈوبے ہوے ہیں —

دل | اُن کی اس عاشقانہ شاعری میں دل کو ایک خاص اہمیت ہے - وہ اپنی مصیبتوں ، پابندیوں اور مجبوریوں کا ذمہ دار صرف دل کو ٹھیراتے ہیں - وہ اُسے اپنی ہستی کا کوئی جزو نہیں بلکہ ایک ہی راستہ پر چلنے والا مسافر سمجھتے ہیں - جہاں وہ رکا یہ بھی تھم گئے - اُس نے جو کیا انہیں بھی کرنا پڑا - اُس کی حماقتوں کا ساتھ دیا ، اُس کے کیے کو بھرا اور کہیں کہیں مجبور ہوکر ابل پڑے کہ اس بے ہنگام و بدشعار کی وجہ سے خدا جانے کیا کیا آفتیں اُٹھانی پڑیں - اس داستان کا لطف میرے لفظوں میں نہیں خود اثر کے لفظوں میں زیادہ ہوگا —

میرے تئیں تو کام نہ تھا کچھ بتوں سے آہ
پر دل کے ساتھ مفت میں بدنام ہوگیا

———

دل سے فرصت کبھی جو پائیے گا   حال اپنا تجھے سنائیے گا

———

عشق کے صدمہ اٹھاتا تھا دل   اب تو وہ بھی نہیں کیا کیجئے گا

———

گر خانه برانداز یه دل آه نه هوتا رسواے دو عالم کوئی واللہ نه هوتا

اب توقع کسے بھلائی کی دل نه هوتا تو کچھه بھلا هوتا

یا خدا پاس یا بتاں کے پاس دل کبھو اپنے هاں رها هی نہیں

جان سے هم تو هاتهه دهو بیٹھے اس دل بے قرار کے هاتھوں

آسودگی کہاں جو دل زار ساتهه هے
مرنے کے بعد بھی یہی آزار ساتهه هے
کلیجه پک گیا هے کیا کہوں اس دل کے هاتھوں سے
همیشه کچھ نه کچھ اس میں خیال خام رهتا هے

منزل عشق میں اُن کے دوسرے هم سفر آه و نالے هیں - وه قدم قدم پر انهیں کام میں لاتے هیں - لیکن اس دشوار سفر میں اُن کے بنائے بھی کچھه نہیں بنتی ۔ یه سب کچھه معلوم هے لیکن جی نہیں مانتا هے پھر آزمائش کی جاتی هے اور یه تیر خالی جاتے هیں - عاشق کو بھی رونا روتے روتے زندگی ختم هوجاتی هے —

دیکھیں گے اُس کی سنگدلی کو هم اے اثر
گر کوئی نالہ هم سے سر انجام هوگیا

ایک آہ تو کی ہوتی بھلا اُس کے بھی آگے
پھر اُس میں اثر ہوتا اثر خواہ نہ ہوتا

دیکھتے تو سہی کہ کیا ہوتا ایک نالہ اثر کیا ہوتا

اُس سنگدل کے دل میں تو نالہ نے جا نہ کی
کیا فائدہ جو اور کے جی میں اثر کیا

کہسار میں ہر سنگ میں یہ کہتا ہے پکارے
اے درد مقرھوں تیرے نالوں کے اثر کا

تھامتا ہوں اثر میں آھوں کو جل نہ جاوے یہ آسماں کہیں

کچھہ نہ ہوتا اثر اثر اُس کو بھلے کو نالہ تو کیا ہی نہیں

ہردم آتی ہے گرچہ آہ پہ آہ پر کوئی کار گر نہیں آتی

یا اپے نہیں دم میں تاثیر یا اثر اُٹھہ گیا فغاں سے

جب اُس کو اثر اثر نہ ہووے کیا فائدہ نالۂ و فغاں سے

اس قسم کے دیوان اثر میں پچاسوں شعر ہیں - ان میں کہیں شاعر نے یہ کہا ہے کہ میرے نالہ میں اتنا اثر ہے کہ میں اُسے نکالتے ہوے

ڈرتا ہوں - کہیں اس خوف سے نالہ نہیں کیا کہ کہیں رائگاں نہ جاے اور کہیں کیا اور وہ کارگر نہیں ہوا اور آخر میں مجبوراً یہ کہہ کر خاموش ہوگیا کہ ع کیا فائدہ نالۂ و فغاں سے —

محبوب کی بے وفائی

عشق کی دنیا میں وفا سب سے پہلی چیز سمجھی جاتی ہے اور عاشقوں کے نزدیک وفا ساری اُن پر ختم ہے اور بے وفائی محبوب پر۔ اردو کے شاعروں نے اس خیال کو خدا جانے کتنے کتنے طریقوں سے نظم کیا ہے - اکثر اس میں اس قدر بھونڈا پن پیدا ہوگیا ہے کہ پڑھنے والوں کی طبیعت مکدر ہوتی ہے - اثر کے دیوان میں پچاسوں شعر ایسے ہیں جن کا موضوع اپنی وفاداری اور محبوب کی بے وفائی ہے - اُنہوں نے ہر جگہ نئے نئے طریقۂ بیان اختیار کئے ہیں - اور ہر موقعہ پر شوخی اور تغزل کی چاشنی نے اس موضوع کے شعروں کو بے حد کیف آگیں بنا دیا ہے -

محبوب کی بے وفائی کا ذکر اُنہوں نے جن مختلف طریقوں سے کیا ہے اُن میں سے پہلا تو یہ ہے کہ محبوب نے مختلف مواقع پر جو جو وعدہ خلافیاں یا عہد شکنیاں کی ہیں اُنہیں طنزاً یا شاعرانہ انداز میں بیان کردیا ہے - ایسے موقعوں پر اپنی وفا کو درمیان میں نہیں لاے - لیکن طریقۂ بیان اکثر اس قسم کا ہے کہ پڑھنے والے اس میں لذت محسوس کرتے ہیں اور محبوب کی خوش جمالی کے باوجود عاشق کے ہم نوا بن جاتے ہیں - اس شکوہ میں کہیں طنز ہے اور کہیں شوخی لیکن ہر جگہ دل کا درد ضرور شامل ہے —

بے وفائی پہ تری جی ہے فدا قہر ہوتا جو با وفا ہوتا

کس بلا کا تغزل ہے —

جس چیز کو محبوب جفا نہیں سمجھتا وہی عاشق کے لیے جانکاہ ہے - کس

قدر تفاوت ہے —

یہاں تغافل میں اپنا کام ہوا تیرے نزدیک یہ جفا ہی نہیں

کبھی عاشق ان بے وفائیوں کا شکوہ لطیف اشاروں میں کرتا ہے -

کیا کہوں کچھہ کہی نہیں جاتیں باتیں ہیں بے شمار آنکھوں میں

دل اپنا پڑا اس بت بے مہر کے پالے دشمن کو بھی جس سے خدا کام نہ ڈالے

محبوب کی بے مہری کا شکوہ اس سے زیادہ زور دار لفظوں میں کرنا ممکن نہیں - شاعرانہ انداز بیان کا لطف ' جذبات کا جوش اور ساتھہ ہی تغزل کی پر کیف چاشنی شعر میں ایک ایسی روح پھونک دیتی ہے جسے پڑھ کر دل میں تازگی کے آثار پیدا ہونے لگیں -

کبھو جفا کے سوا تجربہ سے کچھہ نہیں دیکھا
پہ تو بھی مجکو وفا کا گمان باقی ہے

اتنا بتلا کہ غم غلط پیارے
کون سی تیری بات پر کیجے

شعر کے لہجے میں کس قدر نرمی ہے - الفاظ کتنے سادے ہیں لیکن اس چھوٹے سے شعر میں جذبات کا ایک طوفان ہے - صاف معلوم ہوتا ہے کہ کہنے والے کے دل میں کتنے داغ ہیں - لیکن کوئی مجبوری زبان کو خاموشی پر مجبور کر رہی ہے —

چھوڑی نہ تو جفا کبھو بھولے نہ کی وفا
اے بے ثبات اس کی ہے کیوں کر نباہ کی

ایک دل جلے کی پکار ہے - کس قدر تلخی ہے —

کبھو دوستی ہے کبھو دشمنی تری کون سی بات پر جائیے

کس قدر فطری جذبہ ہے - انسان کو جس سے محبت ہوتی ہے اس

کی باتوں سے مختلف وقتوں میں مختلف اثر لیتا ہے - کبھی ایک بات میں دوستی کی جھلک نظر آنے لگتی ہے کبھی وہی بات دشمنی کا ذریعہ ٹھہرتی ہے - اس میں انسان مجبور ہے - یہ اس کی فطرت ہے • لیکن اس فطرت کی ترجمانی ایک شاعر جس انداز سے کرسکتا ہے اس کی بہترین مثال یہ شعر ہے —

کبھی بھی تجھے مہر یا وفا ہے یا یہ ھی بساط میں جفا ہے

بتوں کی شان بے نیازی پر ایک رباعی اور سن لیجئے - اس کے بعد اس داستان کو یہیں چھوڑ کر آگے بڑھیں -

نے حال تباہ کی انہیں بینائی نے نالۂ و آہ کی اثر شنوائی

توئی مرتے مرو جیتے جیو بہائیں نہیں اللہ غنی بتوں کی بے پروائی

عاشق کی وفا معشوق کی بے وفائی

اب تک جو شعر لکھے گئے ان میں صرف محبوب کی بے وفائی ' شان بے نیازی ' تلون مزاجی اور تغافل کا شکوہ کیا گیا ہے - اپنی وفا کو کہیں درمیان میں نہیں لائے - لیکن اثر کے اکثر شعر ایسے بھی ہیں جن میں ایک طرف تو محبوب کی بے وفائی کا شکوہ ہے اور دوسری طرف اپنی وفاداری کا ذکر - اس تضاد سے محبوب پر ایک خاص اثر ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے - ممکن ہے کہ اعلیٰ Ideal محبت کے طالب اس طریقہ کو بلند عشق کے معیار سے گرا ہوا جانیں - لیکن میرے نزدیک اس کا اندازہ وہی کرسکتا ہے جس پر گذری ہو - ضبط اور صبر کی بھی ایک انتہا ہوتی ہے - جب کسی کی زیادتیاں حد سے گذر جاتی ہیں تو مظلوم کی فطرت بالکل مفقود ہو جاتی ہے اور مجبوری اسے اسی قسم کی باتیں کرنے پر مجبور کرتی ہے - لیکن عشق کا بلند جذبہ کہیں ان مجبوریوں کے باوجود بھی غالب آجاتا ہے اور

شاعر یہ کہنے لگتا ہے -

کچھہ خوب نہیں یہ تیری باتیں　　ہر چند مجھے نباہ کرنا
تو کیوں عبث ہے دشمن جاں اس فریب کا
رکھتا نہیں عزیز اثر تجھہ سے جاں تلک

بے وفا کچھہ تری نہیں تقصیر
مجکو میری وفا ہی راس نہیں

اس شعر کی کیفیتوں کی جتنی داد دیجئے کم ہے - اپنی وفا کا گمان ہے - محبوب کی بے وفائی کا یقین ہے - محبوب سے اس کا شکوہ کیا جاتا ہے - وہ سب باتوں کو جھوٹ جانتا ہے - کہنے والا عاجز آجاتا ہے اور اپنے جلے ہوئے دل کے پھپولے اس طرح پھوڑتا ہے - صاف معلوم ہوتا ہے کہ جذبات کے ایک طوفان کو دبانے کی کوشش کی گئی ہے لیکن ان کا جوش کسی پابندی کا محکوم نہیں رہ سکتا اس لیے صرف دبے ہوئے لفظوں میں یہ آگ چنگاری بن کر نکلی - شعلے اندر ہی اندر بھڑک رہے ہیں —

اسی طرح کا ایک اور شعر —

کیوں تو برضد جفا ہی کرتا ہے　　نہیں کچھہ دعوۂ وفا مجکو

صاف ظاہر ہے کہ وفا کا دعویٰ ہے لیکن کہیں تو زبان کٹ جائے -

اے بتاں الٹی ہی خدائی ہے　　باوفاؤں سے بے وفائی ہے
میں اور مجھہ سے آہ یہ تیرے سلوک ہیں　　افسوس قدر جانی نہ تو میری چاہ کی
وہ کسی اور سے کرے گا کیا　　جلیں تجھہ سے اثر نباہ نہ کی

ایک شعر اور سنئے - کتنی شوخی اور تغزل ہے --

پڑی ہے تازہ کسو سے معاملت در پیش　　مری وفا کو جو مذکور میں تو لاتا ہے

گو ہم ہیں عاشق وفادار   پر اتنا بھی ستم نہ کیجئے

کس قدر درد بھری التجا ہے —

اِن شعروں کے علاوہ دو رباعیوں میں بھی اسی قسم کے مضامین ہیں۔ صرف ایک رباعی ملاحظہ ہو۔ کس قدر شاعرانہ انداز بیان اختیار کیا ہے —

تو اوروں کے چاہنے کے دے ہے طعنے   میں اور کو چاہتا ہوں چھٹ تجھ یعنی
اس کہنے میں ترے کچھ نکلتی ہے بات   تک اپنے ہی جی سے پوچھ اس کے معنی

دوسرے شعر نے رباعی کی ادبی لطافتوں کو کس قدر بلند بنا دیا۔ جس طرح محبوب اس سوال کا جواب دے کر دل میں کڑھے گا اسی طرح پڑھنے والے اس معمے کو حل کر کے لذت محسوس کریں گے —

اثر کے جتنے شعر وفا اور بے وفائی کے متعلق لکھے گئے ان میں ہر جگہ انہوں نے اپنی وفاداری کا اظہار کیا ہے لیکن ہر جگہ شاعرانہ نزاکت اور ادبی لطافت سے اس میں وہ بات نکالی ہے کہ پڑھنے والا ہمیشہ ان سے ہمدردی کرتا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس کے دل میں ان کی محبت کی طرف سے بدگمانی بھی نہیں پیدا ہوتی —

ابتدائے عشق عاشق جب عشق کے کوچے میں قدم رکھتا ہے تو شروع شروع میں اسے وہاں دنیا کی ہر لذت محسوس ہوتی ہے۔ ہر بات میں حسن، ہر بات میں خوشی۔ لیکن اس ابتدا کی انتہا کوئی انہیں دل جلوں کی زبان سے سنے۔ اثر نے ایک رباعی میں اسی جذبہ کو نظم کیا ہے۔

ہیں یاد مجھے تازہ ملاقات کے لطف   لیئے آپس میں ووں ہر اک بات کے لطف
کیا کیا میں کہوں گذشتہ اوقات کے لطف   تھے دن کے جدے لطف جدے رات کے لطف

انجام عشق

کوئی دیتا میں دل دوانا تھا
تجھے واللہ یہ نہ جانا تھا

اپنی حماقت

واہ ری عقل تجھہ سے دشمن سے
دوستی کا گمان رکھتا ہوں

اس قسم کا ایک اور شعر ہے وہ بھی مزیدار ہے -

کوئی کھاتا تھا دغا جھوٹی مدارات سے میں
آپھنسا دام میں کیا جانئے کس بات سے میں

اور سنیے - اثر اب تک فریب کھاتا ہے	تیری باتوں کو مان جاتا ہے

عشق میں انسان عقل کھو بیٹھتا ہے - اسے غلط و صحیح کی تمیز باقی نہیں رہتی - اس لئے ایک بار نہیں هزار بار وہ اسی فریب میں مبتلا هوتا ہے جس میں اب سے پہلے پچاسوں مرتبہ پھانس چکا ہے —

جان کا زیاں

یہ عشق ابتدا میں نئی نئی ترنگیں اپنے ساتھہ لاتا ہے - لیکن بہت جلد یہ طلسم توت جاتا ہے اور عاشق یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ اس میں جی اور جان کا خطرہ ہے - زندگی اسی درد و الم میں کٹتی ہے اور آخر یہ آزار جان لے کر ٹلتا ہے - اثر نے نئے نئے طریقوں سے ان جذبات کو نظم کیا ہے - نہ ان پر کہیں پستی کا شبہہ هوتا ہے اور نہ وہ کہیں غیر شاعرانہ هیں - حقیقت اور شعریت کی دنیا میں بے حد لطف امتزاج ہے —

اثر اب تو ملے ہے تو اس سے	پر یہ ملنا مزا دکھاوے گا
تجکو اگر اثر نہیں کھلنے کا هم کو کیا	عاشق هوے سے اپنے هی جی کا ضرر کیا
مرض عشق دل کو زور لگا	جاں بلب هوں خیال گور لگا
کس لئے وهاں چلے اثر مگر اور	حال اپنا تباہ کرنے کو

عاشق کے جی پر بنتی ہے اور دنیا کو طعنہ زنی سے کام ہے —

عشق کی نفسیاتی حقیقت اثر نے کس قدر کھلے هوے لفظوں میں

بیان کی ہے - اعلیٰ Ideal عشق پر جان دینے والے خواہ اسی اصول کے پابند ہوں لیکن دل سے اُسے برا ضرور کہیں گے - لیکن حقیقت کی دنیا میں رہنے والوں کے لئے اس میں آپ بیتی کا لطف ہے —

حقیقت جب کھلی دل پر ہوا معلوم تب ہم کو
کدھر کا عشق رے باتیں ترنگیں تھیں جوانی کی

ایک رباعی میں اثر نے بیان کیا ہے کہ عشق کا دل پر کیا اثر ہے- سن کر معلوم ہوتا ہے کہ یہ آگ خود ہمارے سینوں میں سلگ رہی ہے —

جوں شعلہ جلے جی رخ زرد کے ساتھ ہوں سوختہ جاں دل کے اثر درد کے ساتھ
جاڑے کے دنوں کی طرح نت سارے سال نکلے ہے بھاپ ہردم سرد کے ساتھ

اپنی ہستی میں انقلاب

اس عشق کی بدولت انسان میں جو جو تبدیلیاں ہو جاتی ہیں وہ دیکھنے والوں کو حیرت میں ڈال دیتی ہیں - انہیں دیکھ کر خود محبوب بھی کبھی کبھی محو حیرت ہو جاتا ہے - اثر نے اس مضمون کو بھی بہت سی جگہ نظم کیا ہے اور ہر جگہ جدت بیان سے اس میں نیا لطف پیدا کرنے کی کوشش کی ہے —

کر دیا کچھ سے کچھ ترے غم نیں اب جو دیکھا تو وہ اثر ہی نہیں

کبھی کبھی یہ تبدیلی اس قدر فوری ہوتی ہے کہ دیکھنے والے اسے اور شدت سے محسوس کرتے ہیں —

نظر آتا تھا اثر حال ترا روز بروز دیکھتا ہوں ولے اب اور طرح رات سے میں

ابتدائے عشق میں دل پر قابو ہوتا ہے لیکن یاس و حرماں کے تیر اسے چھلنی بنا دیتے ہیں اور انسان کے اختیار میں نہیں رہتا کہ وہ اسے اپنے قابو میں رکھ سکے - شاعر کس قدر حسرت سے کہتا ہے -

آہ وہ دن گئے کہ ہم بھی اثر دل کو اپنے سنبھال رکھتے تھے

اب اس تبدیلی کی حد ملاحظہ ہو کہ خود وہ جو اس انقلاب کا ذمہ دار ہے محو حیرت ہے —

یہ کیا ہوگیا دیکھتے دیکھتے	اثر میں تو میں وہ بھی حیران ہے
کچھہ اور ہی ہوا ہے حال میرا	جب سے حال اثر سنا ہے

اپنی حالت بیان کرنے کا کیا لطیف طریقہ ہے کہ جنھوں نے اُس حال کو سنا ہے اُن کی حالت کا نقشہ کھینچ دیا - ظاہر ہے کہ جس تصویر کا یہ عکس ہے وہ خود کتنی رنگین ہوگی —

اس انقلاب کی آخری منزل یہ ہے کہ انسان اپنی ہستی سے بالکل بے خبر ہوجاے —

حالت مت پوچھہ اب اثر کی	کچھہ بات رہی نہیں خبر کی

عشق میں دنیا کی دشمنی

اس عشق خانہ خراب میں جہاں اور سب باتیں ہیں وہاں یہ بھی ہے کہ زمانہ اپنا دشمن بن جاتا ہے - ایک کی دوستی سب کو دشمن بنا دیتی ہے اور ستم یہ کہ وہ بھی دوست نہیں - ایسی صورت میں عاشق کی زندگی اُس کے لیے وبال ہوجاتی ہے - اُس کی سمجھہ میں نہیں آتا کہ کیا کرے - اپنی اس بے کسی کا رونا یا تو اپنے دل سے روتا ہے یا پھر اسی بے وفا سے جس نے اس انجام کو پہنچایا —

جس کی خاطر سبھی ہوے دشمن	نہ ہوا وہ بھی دوست یا قسمت

ایک تیرے لیے میں ساری عمر	سب کی باتیں ہزارہا تو سہیں

ایک تیری ہی بات کے لیے ہم	باتیں سو سو سبھوں کی سہتے ہیں

اس بے کسی کی آخری منزل یہ ہوتی ہے کہ اپنے پراے سب محبوب

کی طرف ہو جاتے ہیں - عاشق بے چارہ سوائے اس کے کہ اپنے حال پر آپ روے اور کیا کر سکتا ہے —

دوست دشمن سبھی ہوے تیرے کیا برائی کا اب زمانا ہے

خدا سے لگاؤ	مومن کے ایک اس شعر پر:- خدا کی بے نیازی ہائے مومن ہم ایماں لائے تھے ناز بتاں سے

خدا جانے غزل کے کتنے دیوان صدقے اُتارے جاسکتے ہیں - معنی کے دریا ایک کوزے میں بند ہیں - اثر نے اس بے چارگی کو دو تین جگہ نئے نئے انداز میں بیان کیا ہے - عشق کی مجبوریوں کی آخری منزل ہے -

افسوس کہ اِن بتوں کے ہاتھوں اب آن پڑی اثر خدا سے

یہ تو وہ حالت ہے جب اپنے بت طناز کے چھوڑنے کا زخم دل میں تازہ ہے - اُس کے بعد جب یہ زخم ذرا بھرنے لگتا ہے تو مختلف طریقوں سے اُس پر مرہم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں —

دن رات ہر ایک سے نہ فریاد کرو اس خانہ خراب دل کو آباد کرو
اتنا بھی ان بتوں پہ مت بھولو اثر اپنے اللہ کو تم اب یاد کرو

جب دل اس نصیحت پر عمل پیرا ہوجاتا ہے، سکون اور راحت کی منزلوں میں قدم رکھہ دیے جاتے ہیں تو اپنی مصیبتیں یاد آتی ہیں - اس درد اور اس راحت میں توازن پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے - اطمینان کی سانس کے ساتھہ جذبۂ دل باہر آتا ہے —

مر گیا پر بتوں سے کچھہ نہ بنی اب اثر کی خدا سے خوب بنی

انجام عشق کے مختلف جذبات اور اُن کے متعدد درجے اثر کی زبان میں بیان کردیے گئے - عاشق کی وفا داریوں اور محبوب کی بے وفائیوں کی داستان بھی دھرائی گئی - آہ و نالوں کی تاثیریں ہمارے

دلوں میں اُتریں - دل کا افسانہ کانوں کے رستے رگ جاں تک پہنچا - سب کچھہ ہوا مگر ابھی عشق کا قصہ ختم نہیں ہوا - ابھی بہت کچھہ باقی ہے - عشق کے لوازم اُس سے زیادہ مہتم بالشان ہیں - اثر نے ان سب مضامین کو اپنی غزلوں میں دل کھول کر جگہ دی ہے - اس لیے اُن کے ذکر بغیر اس داستان کی تکمیل غیر ممکن ہے —

انتظار

اس سلسلہ میں سب سے پہلی چیز جس سے عاشق کو واسطہ پڑتا ہے انتظار کی وہ تلخ گھڑیاں ہیں جو کسی عہد شکن کے آنے کے خیال میں کاتی جاتی ہیں - دل خدا جانے کیا کیا خیال لے کر بیٹھتا ہے لیکن ایک محدود وقت کے بعد یہ سب خاک میں مل جاتے ہیں - اور اب صرف اُس جذبہ کا احساس باقی رہ جاتا ہے جو انتظار کی دشوار منزل سے گذرنے کا لازمی نتیجہ ہے - ایک وقت ایسا آتا ہے کہ عاشق اس کے نام سے گھبراتا ہے - انتظار کا دوسرا نام اُس کے نزدیک موت ہے —

تیرے آنے کا احتمال رہا مرتے مرتے یہی خیال رہا

وہاں نہ وہ قول نہ وہ قرار رہا یہاں وہی اب تک انتظار رہا

نہ نکلا تو گھر سے یہ یہاں منت جی تیرے منتظر کا نکلتا رہا

جو اس انتظار کی مرگ انجام لذت چکھہ چکا ہے وہ بڑے بڑے مسائل کو اسی روشنی میں دیکھنے کا عادی ہوجاتا ہے —

مانا اثر نہ وعدۂ فردا غلط نہیں لیکن کٹتی نہ آج یہ شب انتظار کی

انتظار کی حد انسان کو بالکل نا امید بنادیتی ہے —

نہ رہا انتظار بھی اے یاس ہم امید وصال رکھتے تھے

انتظار کس قدر شدید چیز ھے اس کا اندازہ صرف ایک شعر سن کر ھو سکتا ھے —

دن انتظار کا تو کٹا جس طرح کٹا لیکن کسو طرح نہ کٹی رات رہ گئی

کبھی کبھی یہ انتظار جان لے کر ٹلتا ھے —

جی ھی جاتا رہا پہ تو نہ پھرا باز آئے ھم ایسے آنے سے

عاشق انتظار کرتے کرتے کچھہ اس قدر بے صبر ھوجاتا ھے کہ انتظار کا خیال تک اس کے لیے جان سوز بن جاتا ھے - یہ بلا اس پر اس طرح مسلط ھوتی ھے کہ ھر بات کی ابتدا اور انتہا کے بعد اس کا مہلک خیال دل پر قبضہ کرلیتا ھے —

تیرے وعدوں کا اعتبار کسے گو کہ ھو تاب انتظار کسے

آج کی رات اثر صبح تو ھونی معلوم نہیں کٹتی نظر آتی ہے سر شام مجھے

عاشق کی مجبوریاں

عشق کی مجبوریوں کی کوئی حد نہیں - عاشق دنیا کی بلاؤں میں گرفتار ھوتا ہے - اس کے پاس ان کا کوئی علاج نہیں - وہ محبوب سے اس کا بدلا لینا چاھتا ھے - اس کے دل سے اس کے لیے بد دعائیں نکلتی ھیں - وہ دنیا کو اپنے سر پر اُٹھا لینا چاھتا ھے - ان مصیبتوں کی انتہا کے بعد وہ خدا جانے کیا کیا کرنا چاھتا ھے - لیکن بے اختیار ھے - کچھہ کرنے کے لیے ھاتھہ بڑھاتا ھے تو کوئی اس سے زیادہ اھم خیال اُس کے مذھب اور شرع کا کوئی اصول دامنگیر ھوتا ھے - زبان کھولنا چاھتا ھے تو پابندیٔ محبت زنجیر بن جاتی ہے - جینا مشکل ھے لیکن مرنا بھی آسانی سے نصیب ھونا ممکن نہیں - ھاتھہ پاؤں ' زبان سب اپنے ھیں لیکن کسی پر اپنا قابو نہیں - یہ سب محسوس کرنے کے بعد

عاشق ہر کام صرف اس نیت اور ارادہ کے ساتھہ کرنا شروع کرتا ہے کہ ممکن ہے کہ اس میں کامیابی ہوجاے —

ان مجبوریوں میں پہلی مجبوری یہ ہے کہ جانکاہیٔ عشق تن بدن کی جان نکال لیتی ہے - کوئی کام کرنے کی طاقت باقی نہیں رہتی - کچھہ کرنا بھی چاہیں تو دل کی حسرت دل میں —

اظہار کیونکہ کیجے کا حال تباہ کا   نہ زور نالہ کا ہے نہ مقدور آہ کا

دل چاہتا ہے کہ اپنا حال محبوب کو دکھایا جاے لیکن مجبوری حائل ہے - خود عاشق کی زبان سے سنئے —

تونہ آیا ایدھر کو ورنہ ہمیں   حال اپنا تجھے دکھانا تھا

اپنی بد نصیبی کا رونا ہے - اُسے دور کرنا اپنے اختیار میں نہیں - اس مجبوری نے دل میں ایک درد پیدا کردیا - اس لیے دوسروں کے لیے دعا نکلنے لگی ..

کیا کہوں اپنی بد نصیبی کی   دے کسو کو نہ یہ خدا قسمت

دل جانتا ہے کہ محبوب بے وفا ہے - اپنی وفا کا بھی پورا یقین ہے لیکن مجبوریوں نے عادی بنادیا ہے - اس لیے بجاے اس کی بے وفائی کے اپنی وفا کا رونا رویا جاتا ہے —

بے وفا کچھہ تیری نہیں تقصیر   مجکو میری وفاہی راس نہیں

سب سے بڑی مجبوری یہ کہ ہر مصیبت کے باوجود بھی محبت کا چھوڑنا اختیار سے باہر ہے —

کیا کیجے اختیار نہیں دل کی چاہ میں
ہیں سب وگرنہ تیری یہ باتیں نگاہ میں

عاشق سب کچھہ کرسکتا ہے لیکن محبوب کو اپنی طرف سے

خوش ظن نہیں بنا سکتا - کتنی بڑی مجبوری ہے —

ایک میری ہی دعا دشنام سے مخصوص ہے
ورنہ پیارے کون تجکو یہاں دعا کرتا نہیں

مجبوری کا ایک درد بھرا مرقع اور ملاحظہ ہو —

ہم سے کشتہ بال اسیروں کے روبرو ناحق خبر نہ لاکے سناؤ بہار کی

سب سے بڑی اور مہلک مجبوری عاشق کی یہ ہے کہ وہ اپنے دل کو قابو میں نہیں رکھہ سکتا —

دل جو یوں بے قرار اپنا ہے یا اس میں کیا اختیار اپنا ہے
آہ وہ دن گئے کہ ہم بھی اثر دل کو اپنے سنبھال رکھتے تھے

عاشق کی ایک اور مجبوری جس کا اُس کے پاس کچھہ علاج ہی نہیں یہ ہے کہ جب اُس نے محبوب سے اس بات کا شکوہ کیا کہ پیارے ہم تو تمہاری یاد میں اتنے بیچین تھے کہ جان پر آبنی' دنیا کی زبان پر ہماری داستان تھی' تم نے بھول کر خبر تک نہ لی - وہاں سیدھے سادے منہ سے جواب دے دیا کہ ہمیں خبر نہیں - اب بتائیے اس کا عاشق کے پاس کیا علاج - سوائے اس کے کہ یا تو معشوق کو جھوٹا ٹھیرائے یا اپنی مجبوری پر صبر و شکر کرے —

شہرا یہ تیرے عشق میں رسوائی کا مری
کیونکر میں مانوں پہنچا تیرے کان تک نہیں

نالہ مرا نہ پہنچا تیرے کان تک کبھی جاتا ہے گو زمین سے لے آسماں تلک

ہے مرا حال تو زبان زد خلق میں نہ مانوں تجھے خبر ہی نہیں

جب عاشق سے ان مجبوریوں کا کوئی علاج نہیں ہوسکتا تو آخر اُس کے پاس صرف وہی وسیلہ رہ جاتا ہے جو ہر ابتدا کی انتہا ہے ۔ اپنی مصیبتوں کا فیصلہ صرف ایک ذات پر چھوڑ دیتا ہے اور یوں کہتا ہے ۔

تونے بندے سے جو سلوک کیا بت کافر خدا سے پاوے گا

صبر کی کمی

عشق میں بے تابیاں جب حد سے گذر جاتی ہیں تو انسان صبر کی طاقت ہاتھہ سے کھو بیٹھتا ہے ۔ موت کا زہر اُسے صبر کی تلخی کے آگے آب حیات نظر آتا ہے ۔ وہ دنیا کی ہر بڑی سے بڑی مصیبت جھیلنے کو تیار ہے لیکن صبر کے نام سے اُس کی روح کانپتی ہے ۔ خود ہم اپنی روزانہ کی زندگی میں یہ محسوس کرتے ہیں کہ صبر ایک حد تک ممکن ہوتا ہے اور اس کے بعد ہم عقل اور سمجھہ کو بالائے طاق رکھہ کر ایسی ایسی حرکتیں کر بیٹھتے ہیں جو کسی اور صورت میں گوارا نہیں ہوسکتیں ۔ شاعر شاعرانہ مبالغہ کو دخل دے کر اس دنیاوی حقیقت کو شاعرانہ حقیقت کی حدود سے جلا دیتے ہیں ۔ اثر کے شعروں میں اس جذبہ کی کثرت ہے —

بس ہو یا رب یہ امتحاں کہیں یا نکل جائے اب یہ جاں کہیں

صبر مجھہ دل سب اور باتوں میں قابل امتحان رکھتا ہوں

آزما اور جس میں چاہے تو صبر میں کر نہ امتحاں دل کو

غم میں بیٹھوں کہاں تئیں بت کے اب اُٹھا دے کہیں خدا مجکو

ہم سے کسو طرح نہ کٹے گی شب فراق اس پر نہ جا کہ روز کہا شام کر چکے

دن کٹا جس طرح کٹا لیکن رات کٹتی نظر نہیں آتی

داستان عشق عاشقی کے جہاں اور لوازم ہیں ایک یہ بھی ہے کہ عاشق کا دل اپنا دکھڑا سنانے کے لئے بیتاب ہو - اس میں تو ایک نفسیاتی پہلو بھی ہے - ہر شخص جب اُس پر غم ہوتا ہے تو اُسے ہلکا کرنے کے لیے اُسے دوسروں سے بیان کر کر کے روتا ہے - عاشق بھی اس سے الگ نہیں ہوسکتا - فرق صرف یہ ہے کہ اس کا دل کبھی اپنی داستان کہنے سے نہیں بھرتا - یہ اپنی جس داستان کو بے حد ضروری سمجھتا ہے وہ دوسروں کے نزدیک ضرورت سے زیادہ طویل ہوتی ہے - وہ دوسروں سے اور خصوصاً محبوب سے اس بات کا طالب ہوتا ہے کہ وہ اُسے کان دھر کے سنے - لیکن وہ اسے ہمیشہ ایک تفریح کی چیز سمجھ کر یا تو سنتا نہیں اور اگر سنتا ہے تو اس کا مذاق اُڑاتا ہے - اس کا جی طرح طرح سے بے چین ہوتا ہے اور خود اُس کی داستان تو کجا اُس کا داستان سننے نہ سننے کا شکوہ ہی ایک دلچسپ افسانہ بن جاتا ہے —

اثر کا حال بھلا تک تو کچھ سنا ہوتا ابھی تو اُس کی بہت داستان باقی ہے

کہیں جل کر کہہ اُٹھتا ہے —

کون سنتا ہے یہاں کسو کی بات بس اثر قصہ مختصر کیجے

اپنی بیتی اگر میں تجربہ سے کہوں بات نبڑے نہ اس کہانی کی

ایک مشکل یہ بھی ہوتی ہے کہ جب بولنے یا داستان کہنے کا موقع

تا ھے تو عاشق کی زباں کو تالا لگ جاتا ھے اور جب وقت نکل جاتا ھے
دل اِسے بیان کرنے کے لئے زیادہ بے چین ھونے لگتا ھے —

صت ملی جو بولنے کی توزباں نہیں	جب تک رھی زبان تو ھم بے زباں رھے

کبھی یہ خیال ھوتا ھے کہ محبوب سے حال کہیں - لیکن ھمت نہیں
ی - لیکن جب جی پر بننے لگتی ھے تو دل اس مصیبت کے اٹھانے پر آمادہ
جاتا ھے —

حال دکھاے کوئی بنتی ھے اثر	بے بات سناے کوئی بنتی ھے اثر
حال دل اس سے کہہ گذرنا مجکو	بن جوکھوں اٹھاے کوئی بنتی ھے اثر

ضبط سے تاب چپ رھنے کی نہیں	طاقت صدمات عشق سہنے کی نہیں
ک بات ھے موقوف ترے آنے پر	بن آے ترے کہوں سو کہنے کی نہیں

دوسری مصیبت یہ ھے کہ اس حال کو سن کر کوئی یقین لانے پر تیار
ں ھوتا - اس مجبوری کا اظہار اثر نے بے حد شاعرانہ انداز میں کیا ھے -

ے ھے جو کچھہ کہ دل پہ کس سے میں کہوں	کوئی نہ چڑھا نظر کہ اس سے میں کہوں
بات ھی ایسی ھے کہ تو کیا پیارے	باور نہ کرے اسے وہ جس سے کہوں

عاشق اپنی داستان سننے کے لئے صرف محبوب کو موزوں سمجھتا ھے -
ب وہ سننا نہیں چاھتا ھے تو خون جگر میں ڈوبے ھوے التجا اور محبت
درد میں سرشار لفظ اس جذبہ کی ترجمانی اس طرح کرتے ھیں —

وال تباہ کو دکھاؤں میں کسے	افسانۂ درد دل سناؤں میں کسے
دیکھہ نہ دیکہہ سن نہ سن جان نہ جان	رکہتا ھوں تجھی کو اور لاؤں میں کسے

ر وصل دونوں مصیبت

عاشق ھر بات کی تمنا کرتا ھے - ھر بات کا
طالب ھے اور سب سے زیادہ وصال محبوب کا

متمنی - لیکن ایسے عاشق جو عشق کی سب منزلوں سے گذر چکے ہیں سمجھتے ہیں کہ عاشق خوش رہنے اور اپنی امیدوں اور تمناؤں کو پورا کرنے کے لئے نہیں پیدا کیا گیا۔ اس کے لئے زہر قاتل ہے لیکن تریاق اس سے بھی زیادہ مہلک - ہجر مشکل ہے لیکن وصال اس سے کہیں زیادہ جاں ستاں - جب یہ معلوم ہوجاتا ہے تو وقتاً فوقتاً اس کی آہیں دل کے جن جذبات کو باہر لاتی ہیں ان کی ترجمانی اثر کی زبان میں اس طرح ہوسکتی ہے۔

نہ ملو یا ملو غرض ہر طرح تم کو آسان مجھکو مشکل ہے

آہ ملیے تو ستم ہے ورنہ ملیے تو غضب
کچھہ نہ پوچھو دل کی حالت بے طرح اب تو پڑی

ہر طرح اب تو حال مشکل ہے ہجر کیسا وصال مشکل ہے

بلندی شوق نا امیدی

حسرت کا شعر ہے —

غم آرزو کا حسرت سبب اور کیا بتاؤں
میری ہمتوں کی پستی میرے شوق کی بلندی

دنیا میں انسان کو اکثر غم اس لئے اٹھانے پڑتے ہیں کہ وہ کسی خوشی کی امید میں رہتا ہے۔ اگر خوشی کا خیال دل میں نہ ہو تو غم کی شدت اس قدر تکلیف نہ دے - ہم اپنی زندگی کے تجربات میں دیکھتے ہیں کہ ایک برائی اگر کوئی دشمن ہم سے کرے تو ہمیں اس سے اتنی روحانی تکلیف نہیں ہوگی جتنی اس صورت میں کہ ہمارا کوئی دوست ہمارے ساتھہ وہی برائی کرے - اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ دشمن سے ہمیں دوستی

کی نہیں دشمنی ہی کی امید ہے - لیکن اپنے دوست سے ہم دشمنی کا گمان بھی نہیں کرتے - اس لئے اس کی کسی معمولی سی بات کو بڑا سمجھا جاتا ہے - عشق کی دنیا میں عاشق کی حالت اس سے بھی بدتر ہے - وہ محبوب سے دنیا کی امیدیں رکھتا ہے اور ان میں سے اگر ایک بھی پوری نہیں ہوتی تو اس پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے - اس نفسیاتی جذبہ کو اثر نے دو ایک جگہہ نہایت شاعرانہ انداز میں بیان کیا ہے —

ہم غلط احتمال رکھتے تھے   تجھہ سے کیا کیا خیال رکھتے تھے

دوسرا شعر ہے —

یوں تو کیا بات ہے تری لیکن   وہ نہ نکلا جو تھا گماں دل کو

پہلا مصرعہ صرف اس لئے کہا کہ عاشق ہیں، محبوب کو بری نظروں سے دیکھنا گناہ جانتے ہیں -

خودداری

کسی شاعر نے کہا ہے —

صدبار جنگ کردہ با وصلح کردہ ایم   اور اخبر نہ بودہ ز صلح و ز جنگ ما

اس شعر کی تشریح یوں ہوسکتی ہے کہ ہر شخص میں خودداری کا کچھہ نہ کچھہ مادہ ضرور ہوتا ہے، کسی میں کم کسی میں زیادہ - عاشق بھی اس سے الگ نہیں - اس لئے جب کبھی محبوب کی طرف سے یہ خیال ہوتا ہے کہ اس نے ہمارے ساتھہ غیر مناسب سلوک کیا تو اس سے لڑائی ٹھان لی جاتی ہے - مگر پھر نتیجہ معلوم - دل کو کون سمجھائے - وہ پھر اسی طرح محبت کا دم بھرنے لگتا ہے - خیر یہ تو سب کچھہ ہوتا ہے لیکن اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ خودداری عاشق کے دل میں کبھی نہ کبھی یہ خیال پیدا ضرور کرتی ہے - اثر کے بھی دو ایک شعر اسی مضمون کے سن لیجئے -

نہ ملوں جب تلک کہ تو نہ ملے اب یہی قصد جی میں ٹھانا ہے

اثر ان سلوکوں پہ کیا لطف ہے پھر اس بے مروت کے گھر جائیے

اس عشق کی داستان کہاں تک سنیے گا - اس میں کیف ضرور لیکن بے جا طوالت اجیرن ہو جاتی ہے - ابھی اثر کی غزلوں کی خصوصیتیں بھی باقی ہیں - اب ان کی طرف متوجہ ہونا چاہئے —

تغزل

غزل کی اصطلاحی تعریف ہو سکتی ہے اور بیسیوں جگہہ کی گئی لیکن تغزل کی کوئی اصطلاحی تعریف کرنے کے معنی شعر یہ خون کرنا ہے - میں اس کے ایسے جن باتوں کو ضروری سمجھتا ہوں اس سے پہلی تو یہ ہے کہ اسے کسی نہ کسی عشق کے جذبہ سے تعلق خواہ محبوب کی طرف سے خواہ عاشق کی طرف سے - خواہ اس میں محبو کے کسی حسن کی تصویر ہو یا کسی عیب کا مرقع- خون عاشق کے غم کی مصو یا شکوہ و خوشی کے جذبات کا نقش - یہ سب باتیں ایک شعر کو تغزل حدود میں لا سکتی ہیں - دوسری چیز جسے میں نے تغزل کے لیے ضرو سمجھہ رکھا ہے شوخی یا شگفتگی ہے - یہ چیز مذاق سلیم کی حدود • رہ کر جتنی وسیع ہوتی جائے گی اتنا ہی شعر کا تغزل بڑھتا جائے گا - میرے نزد تغزل کی بہترین مثالیں مومن کے یہاں مل سکتی ہیں - لیکن اثر کے دیوان پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اس میں بھی اس بلا کا تغزل ہے کہ خدا کی پناہ - اث کچھہ شعر پیش ہیں امید ہے کہ وہ آپ کو میرا ہم خیال بنا لیں گے -

نظریں ہر ایک سے ملاتے ہو تک تو آنکھیں کبھی جلائیے گا

کون ہو لے چلے ہو کس لیے دل نام اپنا ذرا بتائیے گا

کیا ہو گئی تھری شوخ چشمی ایدھر نظریں دو چار کرنا
کیا لطف ہے لے کے دل مکرنا اور الٹے مجھے گواہ کرنا

لے چکے دل تو قصد جاں ہے مگر پھر شروع اب جویہ تپاک ہوا

اوپر کے سب شعروں میں لطف شگفتگی اور شوخی کی جھلک ہے - ہر ایک میں معشوق کو مخاطب کیا گیا ہے اور نئے نئے طریقوں سے تفنن پیدا کرنے کی کوشش - لیکن یہ تفنن ہر موقع پر تغزل کی حدود کے اندر ہے —

امیر مینائی کا یہ شعر مجھے تغزل کے لحاظ سے بے حد پسند تھا —

اُن کو آتا ہے پیار پر غصہ مجھ کو غصہ پہ پیار آتا ہے

لیکن اثر کا شعر پڑھنے کے بعد اسے بھول گیا - اس میں کچھ اور ہی لطف ہے —

جس گھڑی گھورتے ہو غصہ سے نکلے پڑتا ہے پیار آنکھوں میں

مجھ سے لے تو چلے ہو دیکھو پر توڑیو مت کہیں میاں دل کو

اسی غزل کا ایک دوسرا شعر ہے اس میں بھی حد سے زیادہ تغزل ہے -

لیجئے گا نہ لیجئے گا پھر دیکھئے تو سہی بتاں دل کو

کیا کوئی سودے والا گاہک کو اس طرح لبھانے کی کوشش کرے گا -

دل اپنا پڑا اس بت بے مہر کے پالے
دشمن کو بھی جس سے کہ خدا کام نہ ڈالے

سب حیلے حوالے سے تمہارے ہوں میں واقف
مت آئیے پر دل تو میرا کیجے حوالے

یک جلوہ دکھاتے ہی ہوا آنکھہ سے غائب
تک نام بتا دل کو چرا بھاگنے والے

تینوں شعروں میں تغزل کا لطف ہے --

تیری عیاریوں کی باتیں اثر سب سمجھتا ہے گو دیوانہ ہے

کیجے نا مہربانی ہی آکر مہربانی اگر نہیں آتی

چھوٹی بحروں کی غزلوں میں عموماً ایسے شعر کثرت سے ہیں -

دوست ہوتا جو، تو کیا ہوتا دشمنی پر تو پیار آتا ہے

عاشق معشوق کو چھپ چھپ کر دیکھتا ہے۔ انجام کی پروا نہیں - دیکھنے والے دیکھتے ہیں اور جو کچھہ کہتے ہیں اس میں تغزل کی انتہا ہے --

چھپ چھپ کے دیکھنے کے مزے سب یہ اے اثر
معلوم ہوں گے جو کبھو اونیں نگاہ کی

میرا دل مرے ہاتھہ لیجے اور ستم ہے مجھی سے مکر جائیے

کس کے ہاں تم کرم نہیں کرتے کبھو ایدھر نہ مہربانی کی

اب اثر میں بہت نہیں باقی آن کی آن تک رہو بیٹھے

پڑی ہے تازہ کسو سے معاملت در پیش مری وفا کو جو مذکور میں تو لاتا ہے

گو ہیں ہم عاشق وفادار پر اتنا بھی ستم نہ کیجئے

اثر کے شعروں کی اگر صرف مثالیں ہی لکھی جائیں تو صفحے کے صفحے سیاہ ہو جائیں - اُن کی تشریح بھی اس لیے نہیں کی گئی - ان کا لطف صرف طرز بیان سے وابستہ ہے اور طرز بیان ہی وہ چیز ہے جسے پڑھنے والا سب سے پہلے محسوس کر کے اس کا اثر لیتا ہے - ایسے شعروں کی کوئی شرح ان کی لطافتوں پر بار بن جاتی ہے -

طنز اُردو میں لطیف طنزیات کی بہت کمی ہے - نظم میں یہ چیز جس حسن کے ساتھ مومن یا اکبر کے یہاں صرف ہوئی ہے کسی اور کے یہاں نہیں - خصوصاً مومن کی طنز میں تغزل اور ادبی لطافت کے ساتھ ظرافت کی چاشنی عجیب لطف دیتی ہے -

اثر کے کلام میں بھی اس قسم کی طنز کی مثالیں بہت سی مل جائیں گی جن میں صرف لفظوں میں نہیں بلکہ معنی میں طنز کا لطف ہے - اگر اُس کا ترجمہ دوسری زبانوں میں کر لیجئے تو بھی ظرافت یا طنز کی لطافت باقی رہتی ہے - (Addison) کے نزدیک اس قسم کی ظرافت کو لطیف طنز یا مزاح صادقہ کہتے ہیں --

محبوب سے کہنا چاہتے ہیں کہ تیری محبت میں ایسی ایسی مصیبتیں ہیں کہ جو اس پھندے میں پھنس گیا اُس کی زندگی جنجال میں پھنس گئی - لیکن طرز ادا سے اُسے کس قدر لطیف بنا دیا ہے —

خوب دنیا میں خوش رہا ہوگا جو کہ عاشق تیرا ہوا ہوگا

محبت کی، مصیبت سر آئی، خدا خدا کرکے اس مصیبت سے نجات حاصل کی تو لوگ کہتے ہیں —

جی اب کے بچا خدا خدا کر پھر اور بتوں کی چاہ کرنا

لیکن اس غزل میں ایک شعر اور ہے - اُس میں شیخ جی کی خبر لی گئی ہے - کس قدر مزے میں اپنے خیال کو ظاہر کیا ہے —

رحمت کے حضور بے گنا ہی مت شیخ کو روسیاہ کرنا

معشوق نے جی لے لیا، اب جان لینے کی تیاری ہے - عاشق اس فعل کو ظاہر ہے کہ کتنا اچھا جانے گا، لیکن دیکھئے کس طرح تعریف کرتا ہے -

جی لیے پر بھی رہے دشمن جاں آفریں اس نباہ کرنے کو

اسی قسم کا ایک اور شعر ہے —

لیا ہے دل ہی فقط اور جان باقی ہے ابھی تو کام تمھیں مہربان باقی ہے

اور سنئے —

بھلا شکر کرنے لگے پھر شکایت کرم، مہربانی، توجہ، عنایت

ایک رباعی میں بھی نہایت لطیف طنز ہے —

تو اوروں کے چاہنے کے دے ہے طعنے میں اور کو چاہتا ہوں چھٹ تجھ یعنے
اس کہنے میں تیرے کچھ نکلتی ہے بات تک اپنے ہی جی سے پوچھ اس کے معنے

آخری مصرعہ میں طنز کی کتنی گہری جھلک ہے -

تصوف اثر کے کلام کا ایک بے حد نمایاں پہلو اُن کی صوفیانہ شاعری ہے جس پر شروع سے آخر تک درد کا رنگ چھایا ہوا ہے - کہیں کہیں آسان زبان میں صوفیانہ مسائل کو اس قدر بے تکلفی کے ساتھ نظم کیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے تصوف کا گہرا دریا ہے - اُس میں بنے

کھرے کھرے آبدار موتی نکل رہے ہیں - دقیق سے دقیق مسئلہ کے لیے وہی روز مرہ کی زبان ہے - اور لطف یہ کہ ہر شخص اُنہیں آسانی سے سمجھہ بھی سکتا ہے - اب ہم ان کے دیوان میں سے کچھہ ایسے شعر مثال کے لیے لکھتے ہیں جن میں تصوف کا اثر ہے -

انسان کی حقیقت | انسان دنیا میں آتا ہے اور تھوڑے دن رہ کر چلا جاتا ہے - اسے یہ تک علم نہیں ہوتا کہ اس کی ابتدا اور انتہا کیا ہے —

احوال کھلا نہ ابتدا کا		معلوم ہوا نہ انتہا کا

انسان خواہ کتنا ہی دعویٰ کرے کہ اس نے خدا کو پہچان لیا سب غلط ہے - اس لیے کہ اس سے یہ بھی ممکن نہیں کہ وہ خدا کی مکمل اور سچی تعریف کر سکے —

عرفان اتم ہے عجز عرفاں		تعریف قصور ہے ثنا کا

انسان خود اپنی حقیقت سے بے بہرہ ہے —

معلوم ہوئی نہ کچھہ حقیقت		میں کیا ہوں کون ہوں کدھر ہوں

بندہ اور خدا | نسبت مجھے آہ تجھہ سے کیا ہے		بندا بندا خدا خدا ہے

جس طرح دنیا کی ہر چیز کا وجود دوسری چیز کے وجود پر منحصر ہے اسی طرح انسان محض ایک عکس ہے کسی دوسرے نور کا -

جوں عکس کہاں مرا ٹھکانا		ترے جلوہ سے جلوہ گر ہوں

رسول کی حقیقت | محمد صلعم کا مرتبہ سب سے بلند ہے —

جس جاگہ پہنچے نہیں کسو کی		فوق اس سے مقام مصطفیٰ کا

وہ سارے انبیاء کا مقصود اور جن و انس کا مسجود ہے —

مسجود کل ملائک و جن		مقصود تمام انبیا کا

اُس کی تعریف سوائے خدا کے اور کوئی نہیں کرسکتا ـــ

اللہ کی بس کہے محمد مظہر ہے وہ ذات کبریا کا
اور نعت نبی کرے بس اللہ یہ مونھہ نہیں اور ماسوا کا

خدا | خدا ہر جگہہ موجود ہے لیکن کسی کو نظر نہیں آتا ـــ

گرچہ ہے نت وہ پردہ نشیں سب سے در حجاب
بے پردہ ہو پڑی ہے وہی ذات کس طرح

تجھہ سوا کوئی جلوہ گر ہی نہیں
پر ہمیں آہ کچھہ نظر ہی نہیں

خدا رگ جان سے قریب ہے لیکن کسی کو اس کا پتا نہیں ـــ

گرچہ دل میں ہی سدا جان جہاں رہتے ہو
پر بظاہر نہیں معلوم کہاں رہتے ہو

ہر جگہ اسی کا ذکر ہے - مندر میں - مسجد میں - گرجے میں - شیخ و برھمن و پادری کی زبان پر اسی کا نام ہے ـــ

اے رونق بزم جب سنا ہے مذکور ترا ہی جا بجا ہے

اسی خیال کو دوسری طرح یوں ادا کیا ہے ـــ

عالم تمام مظہر اسماء بسکہ ہے کیونکر کسو ہی چیز کو بے نام سمجھئے

اسی خیال کو ذرا فلسفیانہ انداز میں ادا کیا گیا ہے - اس سے اثر کے علمی تبحر کا بھی اندازہ ہوتا ہے ـــ

گر ہم ہی ہم ہیں آہ تو ہم ہم کبھو نہوں اور توھی تو ہے سب کہیں تو ہم کہاں رہے

اس شعر کی شرح اور تفسیر کے لئے ورق درکار ہیں ـــ

زندگی کی حقیقت | خدا سے لو لگانے والے زندگی کو اپنے لئے گناہ جانتے ہیں ـــ

آہ ہم روسیاہ جیتے رہے اور چلدے گناہ کرنے کو

ایسے لوگ دولت اور دنیاوی جاہ و ثروت کو بالکل بے حقیقت سمجھتے ہیں —

یہ دولت مند ہیں پابند انواع گرفتاری
چھٹیں ہرگز نہ قیدوں سے کہ لاکھوں دام رکھتے ہیں

انسان دنیا میں جو کرتا ہے وہ اس کا صحیح مقصد نہیں بلکہ اس سے بہت بلند —

تھا جو منظور سو نہ دیکھا یہاں ہم اثر کیا سمجھ کے آے تھے

عشق | صوفیوں کا عشق دنیا والوں کے عشق سے بالکل جداگانہ ہے - اس کی حقیقت صرف ایک شعر میں سنئیے —

باوجودیکہ وہاں نہ ہجر نہ وصل کوئی مہجور کوئی واصل ہے

اس کی شرح صرف وہ لوگ کرسکتے ہیں جنھیں یہ سعادت نصیب ہوئی ہے - لیکن صوفیوں کے مذہب میں اس سعادت کو حاصل کرنے والے کی جو کیفیت ہوجاتی ہے وہ اثر کی زبانی سنئے -

صاحب دید کی زباں ہے لال شمع کو قیل و قال مشکل ہے

(ع) آناں کہ خبر شد خبرش باز نیامد - جو اس راز سے آگاہ ہوگئے ان کا راز معلوم کرنا اور زیادہ دشوار ہے —

خودی کا پردہ | اس عشق کی ابتدائی منزلوں میں قدم رکھنے کے لئے انسان کو سب سے پہلا سبق یہ دیا جاتا ہے کہ وہ اپنی حقیقت کو کچھ نہ سمجھے - خدا اور بندہ کے درمیان اگر کوئی چیز حائل ہے تو یہی ہستی یا خودی —

کچھ محیط و حباب میں نہیں سد اپنی ہستی کا پردہ حائل ہے

صوفیوں کے مذہب میں شرک بڑا گناہ ہے - وہ صرف ایک ذات کے ماننے والے ہیں - حتیٰ کہ خودی بھی شرک ہے - اور یہ خودی اس وقت تک قائم ہے جب تک زندگی ہے —

مشکل ہے تاکہ ہستی ہے جاوے خودی کا شرک
تار نفس نہیں ہے یہ زنار ساتھ ہے

اور ایک عاشق صادق اپنی خودی کو مٹا دینا اپنی معراج جانتا ہے -

درد کا صدقہ اثر ہم بھی بھلا حق کے حضور
شمع ساں اشک ندامت سے خودی دھو کر چلے

زندگی اور اس کا فلسفہ و وبال

تصوف کی دنیا میں رہ کر زندگی کو جس نقطۂ نظر سے دیکھا جاتا ہے وہ عام یا دنیاوی نقطۂ نظر سے بالکل مختلف ہے - تصوف سے الگ ہٹ کر اثر نے زندگی کو جس نظر سے دیکھا ہے اس میں حسرت و یاس کا جذبہ طاری ہے —

اثر کا فلسفۂ زندگی سر تا سر قنوطی ہے - لیکن کہیں کہیں زندگی اور اس کے غموں کو کسی قدر فلسفیانہ یا شاعرانہ نظر سے دیکھا ہے - ایک جگہ زندگی کو کہتے ہیں —

یہی تار نفس کی آمد و شد جامۂ تن کا تانا بانا ہے

خصوصاً اس جگہ حد کر دی ہے جہاں غم کی ایک فلسفیانہ وجہ بتائی ہے -

اپنے اثر تقلب حالات قلب کو فہم غلط سے گردش ایام سمجھئے

یہ کہنے کے بعد زندگی کو سر تا سر غم کہنا کس قدر حیرت میں ڈالتا ہے - خصوصاً اس صورت میں جب کہ اثر کے کلام میں جگہ جگہ رجائی جذبات بھی ملتے ہیں —

یوں آگ میں سے بھاگ نکلنا نظر بچا اپنے تئیں تو وضع نہ بھائی شرار کی
مرنے کے آے دن اثر اب آنکھہ کھولئے غفلت کے ہاتھوں بس بہت آرام کر چکے

ھلستے ھی مثل زخم رھئے گو سینہ چاک ہو رہا ہے

ایک رباعی میں کہتے ہیں —

اے هم نفساں عبث نہ فریاد کرو گلگشت چمن کدھر ہے مت یاد کرو
اپنے دل کی خوشی تو ہونی معلوم بارے خوشی خاطر صیاد کرو

یہ سب کچھہ کہنے کے بعد وہ زندگی کو بے حد تلخ جانتے ہیں - ان کا خیال ہے کہ زندگی میں غموں کے سوا اور کچھہ نہیں —

شمع ساں جلتے بلتے کاٹی عمر جب تلک سر رہا وبال رہا
صرف غم ہم نہیں نوجوانی کی واہ کیا خوب زندگانی کی
کیا کہوں کس طرح سے جیتا ہوں غم کو کھاتا ہوں آنسو پیتا ہوں

زندگی کا دوسرا تلخ تجربہ انہیں یہ ہے کہ یہاں دوستی کا نام نہیں -

دشمنی بھی ہے جس کے آگے گرد یہاں وہ کہنے کو آشنائی ہے

تیسری مصیبت ہماری آرزوئیں ہیں - جب اِن آرزؤں کی انتہا ہو جاتی ہے تو آرزو مند بے آرزو ہونے کی تمنا کرنے لگتے ہیں —

دل اپنا کچھہ اثر نہ چاہے بس ایک یہی تو آرزو کی

حقائق دنیوی

اثر نے جہاں اپنے شعروں کے ہر شعبہ میں حقیقت طرازی کی ہے وہاں اکثر ان کے کلام میں ایسی حقائق دنیوی بھی بیان کی گئی ہیں جن سے روز دنیا کو واسطہ پڑتا ہے اور جنھیں دنیا والے ہیچ جانتے ہوے بھی زبان سے نہیں کہہ سکتے —

دنیا کی رونق اپنے دم سے ہے - اگر ہم خوش ہیں تو ہمیں ہر چیز اچھی لگے گی اور اگر ہمارا دل غمگین ہے تو ہمیں اچھی باتیں بھی زہر

لگیں گی - اس نفسیاتی حقیقت کو اثر نے یوں بیان کیا ہے —

وابستہ سب یہ اپنے ہی دم سے ہے کائنات
گو ہو جہاں پہ آپ نہیں تو جہاں نہیں

ایک دم سے لگی ہے کیا کیا کچھہ جان ہے تو جہان اپنا ہے

انسان اپنی حقیقت خود جتنی بہتر جانتا ہے کوئی نہیں جانتا - یہ اور بات ہے کہ وہ اس کا اعتراف نہ کرے —

خوب اپنے تئیں سمجھتا ہے ہر کوئی قدردان اپنا ہے

ایک دوسری تلخ حقیقت - ایک عالم پڑا ہے گردش میں
گردش روزگار کے ہاتھوں

مسلسل غزل

اُردو میں مسلسل غزلوں کا شروع سے رواج نہیں رہا - موجودہ دور کو چھوڑ کر اگر مسلسل غزلیں تلاش کی جائیں تو شاید سارے دیوانوں میں مشکل سے ۱۰ - ۱۵ مسلسل غزلیں ملیں گی - اثر کے دیوان میں ایک نہایت اچھی مسلسل غزل ہے —

آشنا جو مزے کا ہوتا ہے اپنے حق میں وہ کانٹے بوتا ہے
شیخ جی ایک روز مجھکو اثر لگے کہنے عبث تو روتا ہے
ان بتوں کے لئے خدا نہ کرے دین و دل یوں کوئی بھی کھوتا ہے
نہ تجھے دن کو چین ہے اک آن ایک دم رات کو نہ سوتا ہے
میں کہا خوب سن کے اے ناداں جا مشیخت کو کیوں ڈبوتا ہے
تو ہے ملاں تیری بلا جانے
عاشقی میں جو کچھہ کہ ہوتا ہے

مسلسل غزلیں اُردو میں جو ہیں اُن میں بھی اتنا لطف

مشکل سے ملے گا —

تخلص سے فائدہ اُردو شاعروں میں مومن نے اپنے تخلص سے بے حد فائدہ اُٹھایا ہے اور جہاں جہاں وہ نام کی طرح نہیں استعمال ہوا اُس نے عجیب لطف دکھایا ہے - اب ذرا اثر کے تخلص کی شان دیکھئے کہ مومن سے پہلے انہوں نے اس رنگ میں کیا گلکاریاں کی ہیں —

رہتا ہوں بہر حال سبھی وقت میں میں شاد
ہے گا یہ اثر خاص تیرے درد و الم کا

تجھکو اگر اثر نہیں کہنے کا ہم کو کیا		عاشق ہوے سے اپنے ہی جی کا ضرر کیا

درد و اثر اثر کے کلام کی بڑی خوبی درد و اثر ہے - اُن کے جتنے شعر اب تک مثالوں میں پیش کئے گئے ہیں اُن میں سے بہت کم ایسے ہوں گے جن میں درد و اثر نہ ہو - اس لیے اُن کے کلام کی اس خصوصیت کا ذکر تحصیل حاصل سے زاید نہیں - البتہ چند شعر بلا کسی تنقید کے درج کئے دیتا ہوں —

اشک خونیں کے یہ نہیں قطرے		بہ رہے ہیں شرار آنکھوں میں
کس لئے وہاں چلے اثر مگر اور		حال اپنا تباہ کرنے کو
ہم سے شکستہ بال اسیروں کے روبرو		ناحق خبر نہ لاکے سناو بہار کی

دل نکلے پڑے ہے یہ ادھر اور اودھر آنسو
بے چارہ اثر کیا کرے کس کس کو سنبھالے

دل جویوں بے قرار اپنا ہے		اس میں کیا اختیار اپنا ہے
اپنے جانے کي مت سنا ہم کو		جي هي جاتا ہے ترے جانے سے

نہ ملو یا ملو فرض ہر طرح تم کو آسان مجھکو مشکل ہے

جور جو چاہئے سو کیجئے پر میری حالت پہ بھی نظر کیجئے

زبان

اثر کے کلام کا اتنا نمونہ دینے کے بعد اُن کی زبان کے متعلق کچھ کہنا بے حد دلچسپ ہے اس لیے دو ایک باتیں کہہ کر اس فرض کو بھی پورا کرتا ہوں —

(۱) اثر کی زبان اپنے ہم عصروں کے مقابلہ میں بے حد صاف ہے - چند لفظوں کے علاوہ باقی زبان بالکل ویسی ہی ہے جیسی آج کل ہماری —

(۲) الفاظ کی نشست و ترتیب بھی بے حد سلیقہ کی اور تعقید سے پاک ہے —

(۳) متروک لفظوں میں کسو - کبھو ' جھت - نپٹ - تئیں - تک اور اس قسم کے دو چار لفظوں کے سوا اور کچھ نہیں استعمال کیا -

(۴) املے میں مجھکو کے بجاے مجکو - یہاں کے بجاے ہاں یا یاں کے بجاے یہاں - اُدھر ' ادھر کے بجاے کہیں کہیں اُودھر اور ایدھر لکھا ہے —

(۵) کہیں کہیں علامت فاعلی میں ' نے ' ترک کردیا ہے —

(۶) اُس نے کے بجاے اُن نے استعمال کیا ہے اور اُس کا املا ' انیں ' رکھا ہے —

یہ اور اسی قسم کی بہت سی چھوٹی چھوٹی باتیں اس دور کے شاعروں کی زبان میں عام طور پر موجود ہیں - لیکن ان باتوں کے باوجود بھی زبان کی شستگی ' سلاست ' روانی اور پاکیزگی میں اپنا جواب نہیں رکھتی - سادگی اُن کے کلام ' زبان اور طرز بیان کی

خصوصیت خاص ہے —

مجموعی حیثیت سے کلام کے متعلق یہ کہا جاسکتا ہے کہ اُن کی فطرت شاعرانہ تھی ' ہر چیز اور خیال کو شاعرانہ انداز میں بیان کیا - لیکن ہر چیز میں حقیقت کا خیال رکھا - مبالغہ اگر کہیں ہے تو وہ شاعرانہ حقیقت کی حدود میں آجاتا ہے - کلام میں ابتذال کا نام نہیں - ہر بات کے بیان میں درد و اثر اتنا ہے کہ پڑھنے والا یہ محسوس کرتا ہے کہ جو کچھہ کہا گیا ہے یہ یہ میرے دل کی بات ہے - یہی سب چیزیں ہیں جو ایک شاعر کی شہرت کو بقاے دوام کا خلعت عطا کرتی ہیں - اثر بھی اُردو کے زندہ رہنے والے شاعروں میں سے ہیں —

شیخ ملا نصرتی ملک الشعرائے بیجاپور

(۴)

[از ایڈیٹر]

قصائد و غزلیات اور کلام پر عام رائے

نصرتی کی تینوں مثنویوں کا ذکر کسی قدر تفصیل سے ہو چکا ہے - لیکن علاوہ مثنوی کے قصیدہ گوئی میں بھی اس کا پایہ بہت بلند ہے - اور اس صنف میں قدیم اردو کا کوئی شاعر اسے نہیں پہنچتا - شوکت لفظی علو مضامین اور زور بیان جو قصیدے کی خاص صفات ہیں وہ نصرتی کے قصائد میں بخوبی پائی جاتی ہیں - اگرچہ نصرتی درباری شاعر تھا لیکن اس کی قصیدہ گوئی صرف بادشاہوں کی مدح و ثنا تک محدود نہیں رہی بلکہ اس نے جنگ کے واقعات اور مظاہر قدرت کے بیان میں بھی بڑے پر زور قصائد لکھے ہیں —

اُس کے بیشتر قصائد علی نامہ کے ضمن میں آگئے ہیں جہاں وہ کبھی جشن کی تقریب میں، کبھی فتح کی مبارک باد پر اور کبھی مظاہر قدرت کے بیان میں موقع موقع سے قصیدے لکھے گیا ہے - لیکن ان کے علاوہ بھی اس کے بعض قصیدے پائے جاتے ہیں - چنانچہ اس کا ایک طولانی قصیدہ جس میں تخمیناً (۱۳۶) اشعار ہیں معراج نبوی کے بیان میں ہے - اسے نصرتی کے "چرخیات" میں شریک کیا گیا ہے - قدیم دکنی میں قصیدے کی ایک قسم "چرخیات" سے موسوم کی گئی ہے یہ وہ قصائد

ھیں جن کی تشبیب فلکیات سے متعلق ھوتی ھے چنانچہ اس قسم کے قصائد سلطان قلی قطب شاہ ، علی عادل شاہ ثانی اور دوسرے شاعروں نے بھی لکھے ھیں - نصرتی نے بھی یہ قصیدہ اسی قسم کی تمہید سے شروع کیا ھے اور معراج کی مناسبت سے سورج کے غروب ہونے اور چاند کے نکلنے اور رات کی کیفیت کو طرح طرح کی تشبیہوں اور استعاروں کے ساتھ بیان کیا ھے - ابتدائی شعر یہ ھیں —

تخت پہ جب دن پتی* سیج پہ بیٹا کرن † نس ‡ کا سپہدار سب گرم کری انجمن
صبح کا فراش چک شمع سے روشن کرے ریگ سے تاریاں کی نت مانج گگن § کا لگن

روز و شب کا متابلہ اور چاند سورج کا دھاوا طرح طرح سے بیان کرتا ھے اور پھر یوں گریز کی ھے —

نور سوں نس کیا عجب روز کو روشن کرے نس کے چندر کوں جتا کیس کی دکھلا کرن
بلکہ جو سر جا خدا نور نبی سے دو جگ تب سوں جمالی جہاں پین جلالی یو تن
نور خدا عین وہ مظہر دیں رین وہ ھے شہ کونین وہ خلق کے جیو کا جیون
سرور پیغمبراں مفتخر نام آوراں مالک پورب پچھم والئی اتر دچھن
طبع کی مجھہ شہبری خوش ھوئی پرواز کوں دھر کے بلند بام کے پانچویں کھن پر گون

اس کے بعد معراج کا ذکر ھے اور خاتمہ پر بادشاہ (محمد عادل شاہ) کی مدح کرتا ھے - جس کے چند شعر یہ ھیں —

حمد ھے منعم کرا خلق پہ اس دور کے ھے جو سمئی ¶ رسول خسرو ملک دکن
صاحب دین و دول مالک ملک و ملل عالم علم و عمل عامل نص و سنن
معدن جود و سخا منبع لطف و عطا حامئی دیں باوفا ماحئی کفر کہن

---

* دن کا سردار یعنے سورج - † جانا ، رخصت ھونا - ‡ رات -
§ آسمان - ¶ رسول خدا کا ھم نام یعنے محمد عادل شاہ -

صاحب فضل و هنر صف شکن بحر و بر | ملجۂ * فتح و ظفر هادی شمشیر زن
سچ هے نکیچ رچہ رهیا تب سوں سلاسیمت کا | دیکھہ جسے دنگ اتھے دیو د ساسر کرن
شو + هوا دنیا کرا شوق سوں بھایا بنی | عدل شجاعت کرا باندهکے سہرا کلگن
گرچہ کسی مرد کوں هاتھہ ندی تھی ولے | شہ نے کنھیوژی کیا لاکے پرت ‡ کی لگن
بھول کے پل پل کوں پل جاے تو کچھ شک نہیں | شہ ساند یکھی بنا عمر ملمیں بیچ سین
شہ سا سولچھن § نول ۹ کون هے جگ میں کہو | یاد سوں جس اسم کی جاے کدورت مدن
راج سوں شہ کے سدا حق تے دعا امن پا | جیوسوں منگے هت پساردور کے سب مردو زن
لطف سوں دهریا الاه شاه کی شاهی نلک | جگ میں جلک پرا چھے عیش پرت کے پنن
جام سوں عشرت کے جم بزم ہو معمور هو | چرخ موں دن رین کے گرم هے جوں انجمن
شہ کی ثنا "نصرتی" نغز نول یوں لکھے | دور کے دفترا اوپر سرا چھے هر یک بچن

یہ ابتدائی زمانہ کا قصیدہ هے - علی نامہ میں جو قصیدے اُس نے لکھے هیں وہ بہت پر زور اور شاندار هیں - قصائد میں عام طور پر اور خاص کر رزمیہ قصیدوں میں بلندئی خیال اور علوِ مضمون کے علاوہ بہت کچھہ دارو مدار الفاظ کی شان و شوکت پر هوتا هے - نصرتی نے هر موقع پر الفاظ کے انتخاب اور بر محل استعمال میں کمال دکھایا هے جس سے واقعات کے بیان میں بڑی قوت پیدا هوگئی هے - اور یہی وجہ هے کہ دوسرے شعرا کے مقابلے میں اس کی زبان زیادہ مشکل هوگئی هے - اس کے قصائد میں مبالغہ بھی هے (اور قصیدوں میں مبالغہ هوتا هی هے) لیکن بے لطف نہیں - تشبیہات و استعارات بھی اُس نے خوب لکھے هیں اور ان میں جدت دکھائی هے —

---

* ملجا - + شوهر - ‡ محبت - § نیک چلن - ۹ نیا —

علی نامے میں کل چھ قصیدے ھیں اور یہ سب بڑے بڑے ھیں - جن میں سے ایک ۲۲۰ شعر کا اور ایک ۱۵۸ شعر کا، ایک ۱۵۰ شعر کا اور ایک ۲۱۸ کا ھے - سب سے پہلا قصیدہ قلعۂ پنالا کی فتح پر لکھا ھے جس کا خلاصہ اور چند شعر نمونے کے میں پہلے لکھہ چکا ھوں - دوسرا قصیدہ بادشاہ کی فتح اور جوھر صلابت خاں کی شکست کے متعلق ھے - اس کا مطلع یہ ھے —

علی عادل شہ غازی یو شاہ بوالمظفر کوں
دیا ھے جس خدا ایسا کہ تھا جیسا سکندر کوں

اس میں جوھر کی نمک حرامی اور بادشاہ کی شجاعت، بادشاہ کے ھاتھی، گھوڑے اور تلوار کی تعریف، جنگ کے معرکہ اور کشت و خون کا ذکر شاعرانہ رنگ میں کیا ھے —

اس فتح کے بعد بادشاہ جب دارالحکومت بیجاپور کی طرف مراجعت کرتا ھے اور فتح کی خوشی میں جو جشن کیا گیا ھے اس پر ایک بڑا قصیدہ لکھا ھے - جس کا مطلع یہ ھے —

اے شہ توں ھم نام علی شاھاں پہ تیری سروری
دلدل فلک کا رام تجہ کرتا زمانہ تنبری

چونکہ یہ زمانہ سردی کا تھا، تو اسی قصیدے کے ضمن میں ایک دوسرا قصیدہ فصل زمستاں کی تعریف میں مختلف قافیہ و ردیف اور بحر میں لکھا ھے، جس کا مطلع یہ ھے —

دی ھے زمستاں نوگزی ڈونگا اوچا دھند کار آج
سردار ھو باد خزاں تھلق کا رچیا ھے بہار آج

پانچواں قصیدہ مجالس عاشورہ کی تعریف میں ھے - اس کا مطلع یہ ھے -

کہتا ہوں اول حمد میں عالم کے سر جلہار کا
افلاک کا اونچا چھجا باندیا ہے کس بستار کا

اس میں مجلس کے انعقاد اور شہادت کا کسی قدر ذکر ہے - مطلع ثانی اور اس کے بعد کے چند شعر میں بادشاہ کی تعریف کر کے والدۂ بادشاہ حاجی بڑے صاحبہ کی مدح اور حسینی محل کی تعریف بڑی شان سے لکھی ہے - یہی وہ محل ہے جہاں مجلس عاشورہ ہوتی تھی - اور اس تعلق سے مجلس کی ترتیب، مرثیہ خوانی اور ماتم کا ذکر کیا ہے - نو دن رات تو یہ مجلسیں ہوتی رہیں، دسویں شب کو بادشاہ کے حکم سے شہر میں علم نکالے گئے —

نو دیس ہور نو رات ادک رونق تو یوں چڑتا کیے
دسویں رین میں قتل کی جیوں وقت آیا مار کا
فرمائے شہ تا شہر گشت اپنے شدیاں کا کاڑنے
دھو لیو اندھارا نورسوں ظلمات کے رخسار کا

اس شہرگشت کا حال بڑی خوبی سے اور کسی قدر تفصیل کے ساتھ لکھا ہے - چھٹا قصیدہ جو فتح ملنار پر ہے بہت طولانی ہے اور پر شکوہ ہے، اس کا مطلع یہ ہے —

ہوا ہے کون عالم کے شہاں میں شہ ترے بل کا
سچا تو نانو کاری ہے وصئی شاہ مرسل کا

یہ بڑے شان کا قصیدہ ہے اور یہاں رزم وبزم کے بیان میں نصرتی نے بڑا کمال دکھایا ہے - اُسے خود بھی اس قصیدے پر ناز ہے —

سنویک فتح کا شہ کے قصیدہ بے بدل یاراں
کہ ہر یک مختصر مضمون دھرے معنی مطول کا

ان کے علاوہ اس کا ایک ہجویہ قصیدہ بھی ہے - غرض اس طرح ایک قصیدہ معراج کے حال میں ' ایک مجلس عاشورہ کے ذکر میں' ایک ہجو میں اور باقی پانچ جنگ یا جنگ کی مبارک باد کے متعلق ہیں —

ان میں صرف معراج کا قصیدہ ایسا ہے جس میں نصرتی نے عام رواج کے مطابق تشبیب لکھی ہے - مجلس عاشورہ کے قصیدے میں حمد و نعت اور منقبت کے بعد شہادت کا کسی قدر ذکر ہے - باقی مبارک باد کے قصیدے بادشاہ کی مدح سے شروع ہوتے ہیں - مبارکبادی کے قصیدوں میں مدح کے علاوہ اس نے زیادہ تر یا تو جنگ کا ذکر کیا ہے یا جشن وغیرہ کی کیفیت دکھائی ہے - البتہ مجلس عاشورہ کے ذکر میں دوسری چیزوں کے ساتھہ علموں کے نکلنے ' مرثیہ خوانی ' الاوا* وغیرہ کا حال بھی درج کیا ہے - مثلاً مجلس مرثیہ خوانی کی نسبت لکھتا ہے ۔

جب شہ اپیں اس بزم کوں ترتیب دے مجلس کریں   ہوے فیض خاص و عام یر یک دھات ادکہ ایثار کا
شکر پھوٹا نیاں کے طبق گویا گگن تارے بھرے   چندر سے کاسیاں بھرسھے شربت کیتی پرکھار کا
یوں مرثیہ خواں مست کرزاری میں ہردل کوستیں   حیرت سوں نا رہے کس منیں احوال کچھہ ہشیار کا
دائم جو پیوے تھے مدام جو تخم غم کا دل منیں   انجواں کی خرشیاں یوں ہوا حاصل و ولک انبار کا

اسی کے ساتھہ الاوے کا ذکر کرتا ہے -

تھا عاشقاں کے دل نمن ہر یک علاوہ سوز میں   جیوں آہ مہجوراں اوٹھے ہر ہر شرارہ نار کا
ماتم میں جلتیاں کوں جنم پھرنیں علاوہ تس گھڑی   تھا لال ماتی تے بی کم کھاتہ لات تیز انگار کا
تس چار دیواری میں بھرلگتے کھنے کوں جب دیوے   تب ہوے ستاریاں کا گگن شرمندہ ہر دیوار کا

اب علموں کا ذکر سنیے :—

نو دیس اور نو رات ادک رونق تویوں چڑتا کیے   دسویں دین میں قتل کی جیوں وقت آیا مار کا

---

* عاشور خانے کے سامنے ایک گڑھا ہوتا ہے جس میں محرم کے زمانے میں آگ جلاتے ہیں

فرماے شہ تا شہر گشت اپے شدیاں کا کاڑنے   دھولیھو اندھارا نورسوں ظلمات کے رخسار کا
شہ کے نکلتے کر شدے سب شہر میں ھلبل ھوا   ھر صحن میں یک ھور ھیا عالم بہتر ھور بھار کا
بسلا جو دیویاں کے رتن کوندن اُجالے کا کیا   ھو جرت لک لکلے لگیا رستہ صفا بازار کا
جمنے میں رونق جابجا جیوں شاہ کے نکلے شدے   چوندھرا رتھیا یک ھاک ھو دل پایک و پروار کا

علموں کی آرائش کا بیان اس طرح کرتا ھے -

ھر ھر شدے کے تن اوپر تھی کسرت ایسی نور کی   سورج کوں جس کے سامنے طاقت نہ تھا چکلا چار کا
سہرے ثوابت سے سہیں ھور کہکشاں سے نوسری   عقد ثریا تے ادگ ھر یک ایلاقہ * ھار کا
دود ھر فرشتے رحتی پنکھے کر اپنے پر پریں   حوراں کے چک کے ھت چنور تھا طرۂ طرار کا
مجمر کے مہکاراں تے ھوے دن کا گریباں مشکبو   دامن رین کا عطر سوں ناقلا ھوا تا تار کا
جہاں وھم دوڑے وھاں تلک یوں حسن کی داتن ھوئی   نہیں بیس سکتی تھی نظر کر سعی لگ بیمار کا
تارے تو اکثر دیس کوں افلاک پر دستے ھیں کم   پن یوں نیں ستاریاں سوں بھرے دیکھا جگت اتبار کا
کیں خوب پتلیاں سوں دسیں مہیندیاں پریاں کی شہوسیاں   بد شکل ریتاں سوں کہیں دامن دسے کہسار کا
تصویر کی مہینداں پلا یوں وانر دسیں سیتا سوں جیوں   کہتا ھے کچہلا لنکا میں جا ھنونت رام اوتار کا
کیں گرز پنکھیاں کے بچے سیمرغ کے اندڑے کہیں   کیں قات ھور شرزا چبل کیں اژدھاے غار کا
کیں چین کے تفتے نول دیکھلائیں بندرابن نری   کیں رست چو بیالیاں کی خوش بسرانے دل دوار کا

اس بیان سے ظاھر ھے کہ آپس کے میل جول سے ھندؤں کی رسمیں کس قدر اسلامی معاشرت اور تیوھاروں میں اثر کر گئی تھیں گویا محرم میں دسہرے کا رنگ نظر آتا ھے —

اب میں نصرتی کے قصیدوں میں سے کچھہ کچھہ اقتباس دیتا ھوں جس سے اس کی قوت بیان اور تخیل کی پرواز کا اندازہ ھوگا - بادشاہ نے

---

* ایلاقہ دراصل علاقہ ھے - ھار کے بیچ بیچ میں جو پھولوں کا گچھا ھوتا ھے اُسے علاقہ کہتے ھیں -

ب سیدی جوھر کی سرکشی کا خاتمہ کر کے بلدۂ بیجاپور کی طرف مراجعت
، ھے تو اس خوشی اور مبارک باد میں نصرتی نے ایک قصیدہ لکھا ھے '
ـ کے بیان کا زور ذیل کے اشعار میں ملاحظہ ھو - سیدی جوھر نے بغاوت
، ھے اور فوج لے کر مقابلہ کو نکلا ھے - بادشاہ اس کی سرکوبی کے لیے
ات خود حملہ کرتے ھیں - بادشاہ کی شمشیر زنی کی کیفیت یوں
ن کی ھے —

برسیا کھڑک کے ابرتے یوں تس پہ پانی قھر کا
خشکی پہ سارے بحر اوبل چوندھر چلے لھو کی تری

(بادشاہ کی تلوار کے ابر سے قھر کا پانی ایسا برسا کہ سارے
ِیا طغیانی سے اُبل پڑے اور چاروں طرف لھو کا سیلاب موجیں
ر رھا تھا) —

دریا رکت تے جوش کھا لنکا کوں کیتے غرق جب
موجاں تے پایہ سبھت کا ڈھل ڈوبے رامیسری

جب خون کے دریا نے جوش کھا کر لنکا کو غرق کیا تو موجوں کے زور سے
، کا پایہ بیٹھہ گیا اور رامیشورم ڈوب گیا (-

کھایا شکست یوں پست ھو اس کل مکھی نے فوج سوں
تاریاں سوں جھوں نس ھوے ھوا دیگ آفتاب خاوری

(اس روسیاہ نے ذلیل ھوکر اس طرح شکست کھائی جیسے آفتاب
لم تاب کو دیکھتے ھے رات کے تارے ھوا ھو جاتے ھیں)

نہاٹا وطن میں گرچہ یوں بیگانہ اوس تے جگ ھوا
تس جھوبی تن ست جاے بن دیکھیا نہ اپلی بھتری

(اگرچہ وہ وطن کو بھاگ گیا لیکن زمانہ اس سے ایسا بیگانہ ھوگیا کہ

بغیر جان دیے اُسے اپنی بہتری کی کوی صورت نظر نہ آئی)-

جب شہ کھرک کے آب سوں جھوں آگ فتلے کی بوجا
دارالخلافت کی طرف چلنے کیا عزم آوری
یوں اوچٹے یکبارگی با جیا دمامہ کوچ کا
جگ کی خوشی کی ھانک تے گوش فلک کو کر کری

(جب بادشاہ کی تلوار کی آگ سے فتلے کی آگ بجھہ گئی اور دارالخلافہ کی طرف مراجعت کا عزم فرمایا تو یکبارگی کوچ کے نقاروں کے بجنے اور اھل زمانہ کی خوشی کے نعروں سے فلک کے کان بھرے ھوگئے)

جوں موج شہ کا فوج تس جل تھل اوپر تے یوں چلیا
دریا کی جیوں اوپرال تے چلتا ھے باد صرصری

(بادشاہ کی فوج خشکی اور تری پر موج کی طرح اس طرح چلی جیسے دریا کے اوپر سے باد صرصر گزر جاتی ھے)

ویسے میں آکر تھلتی نے ایسا دکھائی زلزلہ
پیدا ھوی جس دھاک تے تن میں سورج کےتھرتھری

(ایسے میں تھلتی نے ایک زلزلہ برپا کردیا جس کے ڈر سے سورج کے بدن میں تھرتھری پیدا ھوگئی)

اس کے بعد وہ اسی قصیدے میں " فصل زمستان " کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھہ جاتا ھے —

نصرتی کی رزمیہ نگاری کی کیفیت علی نامے کے ذکر میں آچکی ھے - اُس مثنوی میں اُس نے اپنی قوت بیان ، بلندیء تخیل ، معلومات زمانہ اور قدرت زبان سے یہ ثابت کردیا ھے کہ رزمیہ نگاری میں کوئی اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا - اب میں اس کی شاعری کے دوسرے پہلوؤں

پر نظر ڈالنا چاہتا ہوں —

قدرتی مناظر وغیرہ

نصرتی نے اپنی مثنویوں میں جگہ جگہ قدرتی مناظر کا بیان کیا ہے اور ہر مقام پر اس کا اسلوب نیا ہے - اکثر وہ ان مناظر کو موقع اور محل کی مناسبت سے اس طور پر بیان کرتا ہے کہ وہ واقعہ کا جز معلوم ہونے لگتے ہیں - اگرچہ بعض مناظر کے اشعار مثنویوں کے بیان کے دوران میں اس سے قبل آچکے ہیں، تاہم یہاں چند مناظر سے کچھہ کچھہ اشعار نقل کیے جاتے ہیں جن سے شاعر کی قوت مشاہدہ اور تخیل کا اندازہ ہو سکے گا —

چاندنی کا سماں کیا خوب بیان کیا ہے —

چندر جب گگن کے کہستاں تے	چاند جب آسماں کے کوہستان سے
حشم لے کے نکلیا بڑی شاں تے	بڑی شان کے ساتھہ اپنا حشم لے کر نکلا
کیا کر سورج کوہ مغرب میں جان	سورج جب کوہ مغرب کی طرف جانے لگا تو
لگی مارنے نس شہاباں کے بان	رات شہابوں کے تیر مارنے لگی
دھواں جوت انگے دب نرالا ہوا	دھواں چاند کی روشنی کے آگے غائب ہوگیا
اندھارے پہ غالب اجالا ہوا	اور اندھیرے پر اجالا غالب آگیا
پڑیا چاند کے مکھ تے پرتو جو صاف	جب چاند کے چہرے کا عکس پڑا تو
ہوی آرسی سب زمیں بےخلاف	ساری زمین فی الواقع آئینہ بن گئی
لگیا لکلکانے زمیں کا طبق	طبقۂ زمین جگمگانے لگا اور یہ معلوم
مڑے ہیں اکھلتہ جیوں روپیرے ورق	ہوتا تھا کہ روے زمین پر روپہلے ورق مڑھ دیے ہیں
سورج دیکھہ مغرب میں چندر نے کی چھانوں	سورج نے مغرب میں چاندنی کا یہ سماں دیکھا
ملگیا دیکھنے پھر پچھم ست کے پانوں	تو اس نے اپنے قدم پیچھے ہٹاکر پھر اسے دیکھنا چاہا

اس آخری شعر میں نصرتی نے مشاہدے اور تخیل کی آمیزش کا کمال دکھایا ہے - کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے اور یہ اتفاق نادر ہوتا ہے کہ ایک طرف سورج غروب ہورہا ہے اور دوسری طرف چاند طلوع کررہا ہے اور کچھہ دیر کے لئے دونوں ایک ساتھہ نظر آتے ہیں - مغرب میں سورج نے جو یہ سماں دیکھا تو اس سے رہا نہ گیا اور چلتے چلتے اس نے پلٹ کر پھر اسے دیکھنا چاہا- یہاں قدرتی منظر کے مشاہدے میں شاعر نے جو تخیل کی چاشنی دی ہے وہ نہایت پر لطف ہے —

ایک جگہ اس نے بہار کا سماں باندھا ہے - اگرچہ وہ سعدی کے بہاریہ قصیدے کے سامنے کچھہ حقیقت نہیں رکھتا تاہم اس نے استعارے اور تشبیہ سے جس طرح کام لیا ہے وہ کچھہ کم قابل تعریف نہیں —

سورج آ جو بیت الشرف کے منجھار	سورج نے بیت الشرف میں جلوہ افروز ہو کر
دیا بھوئیں کوں جب خلعت نو بہار	زمین کو خلعت نو بہار عطا فرمایا
کیا حسن پیدا زمانہ نوا	زمانہ نے ایک نیا حسن پیدا کیا
دھری نوجواں ہو کے خوبی ہوا	اور ہوا نوجوان ہو کر اپنی خوبی دکھانے لگی
دیا آبرو پھولبن کوں ابھال	ابر نے چمنستان کو آبرو بخشی
گلاں سرخ رو ہو رہے بالے بال	اور پھول سر تا پا سرخ رو ہوے
لئے چھین گل گلعذاراں تے رنگ	پھولوں نے گلعذاروں سے رنگ چھین لیا
لے آیاں کلیاں دلکوں خوباں کے تنگ	اور کلیاں خوبوں کے تنگ دل لے آئی تھیں
بچے سرو کے قد میں سیدھے ہوے	سرو کے بچے قد میں سیدھے ہوے
گلاں چاند کے نور دیدے ہوے	اور پھول چاند کے نور دیدے
ہنسے پھول ہو شوق کی گد گلی	شوخ کی گدگدی سے پھول ہنسے پڑتے تھے
رہی ناز میں مسکتاتی کلی	اور کلیاں ناز سے مسکرا رہی تھیں

چلی جیونکہ بڈتی چنبیلی کی بیل	چنبیلی کی بیل بڑھتی چلی اور دل لگی
گلے ہار ہو لائی چنپے سوں کھیل	میں چنپے کے گلے کا ہار ہوکر لپٹ گئی
جوانی میں سبزے نے آتا چلیا	سبزہ جوانی پر آرہا تھا اور
مدن بان ریحان پاتا چلیا	مدن بان میں خوشبو پیدا ہو رہی تھی
ہریک گل کے دیدے میں داتیا مدن	ہرپھول کی آنکھہ میں مستی بھری ہوی تھی اور
ہر یک شاخ کوں پھل کے نکلے جوبن	ہر شاخ میں پھل کا جوبن نکل آیا تھا
ہوا زلف سنبل تے جل بے شکیب	پانی زلف سنبل سے بے قرار تھا
لٹک سرو بارے کوں دیتا فریب	اور سرو اپنے ناز سے ہوا کو فریفتہ کررہا تھا
بھولا نے انکھیاں مار بلبل کا من	اشاروں سے بلبل کا من موہنے کے لیے
لیا چک میں لالے نے کالا انجن	لالے نے اپنی آنکھوں میں کالا کاجل لگایا
پلکھی ہر ہر یک گل پہ شیدا دسیا	ہر پرندہ ایک ایک پھول پر شیدا معلوم ہوتا تھا
ہر یک دل میں یک حال پیدا دسیا	اور ہر دل میں ایک عجیب کیفیت پیدا ہو رہی تھی

فتح ملنار کے قصیدے میں باغ کی کیفیت جو اس نے بیان کی ہے وہ پڑھنے کے قابل ہے - حوض کی نسبت کہتا ہے —

تیا کچھہ حوض ڈونگا ہے فلک جاں تیر نے سکنے

یعنی حوض اس قدر گہرا ہے کہ جس میں افلاک تیر سکتے ہیں —

جب اُس صاف شفاف پانی پر ہوا چلتی ہے تو موجوں کی جو حالت ہوتی ہے اُس کی تشبیہ ملاحظہ کیجیے —

چاہیں باد صباتے خوش صفا پانی پہ موجاں یوں

کہ جیوں محبوب کے مکھہ پر ڈھلک زلف مسلسل کا

اس کے بعد شاعرانہ مبالغہ ہے —

فلک سقاے خضری ہو پلاوے نیر سو جگ کوں
سورج کے جام سوں بھرنا ہے نت واں مشک بادل کا

(فلک سقاے خضر ہوکر ساری دنیا کو پانی پلاتا ہے اور وہاں بادل کی مشک ہمیشہ سورج کے پیالے سے بھرتا ہے) —

باغ کے سامنے حوض کی صفائی اور پاکیزگی کی تشبیہ دیکھئے —

دس آوے باغ کے آنگے صفائی حوض کی ایسی
سنواری دھن رکھے ہے یوں انگے آئینہ صیقل کا

باغ کے سامنے مصفا حوض ایسا ہے جیسے بنی سنوری معشوق کے سامنے صقیل کیا ہوا آئنہ —

ذیل کے شعر میں زمین کی سیرابی اور اس سے درخت اگنے کی شان کو کس خوبی سے بتایا ہے —

اوپر پاتال لگ بھوئیں تے بھریا ہے گنج پانی سوں
تلیں ہر رکھہ اوتھیا ہے یوں سدنگ فوارہ جیوں کل کا

اوپر زمین سے پاتال تک پانی کا خزانہ بھرا ہوا ہے اور نیچے سے ہر درخت اس طرح نکلا ہے جیسے کل کا خوبصورت فوارہ -

اس مبالغہ کو دیکھیے —

سرایت آب شیریں کر بھدایا بھوئیں کوں یوں رس میں
بڑے پر نیشکر ہوے لگے کر روپ دیونل کا

آب شیریں نے زمین کو رس سے اس طرح سینچا ہے کہ نرسل بڑہ کر نشکر کا روپ اور مزہ پیدا کرتا ہے -

ہر یک پھل ڈال پھولاں سوں گواوے چھب کی نولاسی
چڑی پر شاخ میوے کی اُسے دعوی سدا پھل کا

هر پهولوں بهری شاخ کے سامنے حسن کی نزاکت اور نرمی هیچ هے اور جو جو میوے سے لدی شاخ هے اسے سدا پهلنے پهولنے کا دعویٰ هے -

پڑے ملدویاں منیں تے یوں صبا کی دهوپ سبزے پر
هری اطلس اوپر گویا لکهے هیں نقش زرحل کا

پهولوں کے ملدیوں میں سے صبح کے وقت کی دهوپ سبزے پر اس طرح پڑتی هے جیسے هری اطلس پر حل کیے هوے سونے کے نقش هوں -

صبا تختیاں کے صفحاں پر لکهی سو لوح پهولاں تے
لیا هر کالوا جاکا کنارا نیمت جدول کا

صبا نے چمن کے تختوں کے صفحوں پر پهولوں سے تحریر کی هے اور اس کی هر نهر بمنزلہ جدول کے هے —

خمیاں ڈالیاں تے دستے یو کنول پانی سوں چشمیاں میں
روپے کی آرتی کے جیوں چمک پر ووٹ آنچل کا

یعنے جهکی هوئی ڈالیوں کی وجہ سے پانی کے چشموں میں کنول کی یہ صورت هے جیسے چاندی کی آرتی کے روشن دیوں پر آنچل کی اوٹ هو —

کیا خوب تشبیہ هے اور کیا پاکیزہ بیان —

کسی پهل ڈال پر کوئی گل دسے نا بے جواب اکثر
پکڑتی هے نظارے میں نظر احوال احول کا

کسی ڈالی پر کوئی پهول ایسا نهیں هے کہ اس کا جواب نہ هو (یعنے ایک پهول کے جواب میں دوسرا ویسا هی پهول تها) جس کے دیکهنے میں نظر احول کی نظر معلوم هوتی تهی (جو ایک کے دو دیکهتی هے) —

ایک دوسرے قصیدے میں باغ کی کیفیت ان اشعار میں بیان کی ہ اور کیسی سچی اور اچهی تعریف کی هے -

ہرگز نہ اس یک پھول پر سورج کی لگ سکتی نظار
ہے چتر ایسا سر بسر ہر برگ سایہ دار کا
سُہتے ہیں کالے نیر کے پن کا لوے گلشن منے
جیوں کیس بکھرے جا دیے رخ مد متے دلدار کا
خوشبو سوں پھولاں کے چمن پائی تھی یوں پروردگی
ہو کلوے کا آب ہرے پُھل نیر ادک مہکار کا ۔

کسی ایک پھول پر بھی سورج کی نظر نہیں پڑ سکتی کیونکہ اس پر برگ سایہ دار کی چھتری لگی ہوی ہے گلشن میں کالے پانی کی نہریں بہتی ہوی ایسی ہی بھلی معلوم ہوتی ہیں جیسے مست دلدار کے رخ پر بکھرے ہوے بال۔ پھولوں کی خوشبو سے چمن نے ایسی پرورش پائی تھی کہ ہر نہر کا پانی پھولوں کا عرق بن گیا تھا جس سے سارا چمن مہک رہا تھا -

بدنور کے جلگل اور چشمے کا بیان بھی خوب لکھا ہے اس مقام کے چند شعر نقل کیے جاتے ہیں -

کہیں رُکھہ دار چیلی کے دھریں سو پوست میں لذت
رکھے سو مغز میں خوشبو کہیں تو بن ہے صندل کا
کیتے رُکھہ جام و جامن ہور پھنس ہور توت تیلدو کے
بھلاواں کنیں ہے کئیں ہرڑا ہے کئیں ماپھل ومیلڈل کا
رنگا رنگ کے گلاں خوشبو معطر جگ کر نہارے
دس آوے راے چنبا جہاں کمینہ پھول پاڑل کا
صفا پانی کے چشمیاں میں سُہے یوں چھانوں پر سیاسی
سواد انکھیاں کوں جوں دیوے درس چشم مکحل کا

(یعنی صاف شفاف چشموں میں کالی کالی چھانو ایسی بھلی معلوم ہوتی تھی جیسے سرمگیں آنکھہ کو دیکھہ کر آنکھیں روشن ہو جاتی ہیں)

دسیں یک یک کراڑے میں گویاں* کئی لاکھہ باگاں کی
ہر یک ڈونگر† کے دامن میں وطن کئی گرگ و اسول‡ کا

اور اس کے آگے کیا خوب مصرع لکھا ہے

---

* شہر کے رہنے کی جگہ ۔ † پہاڑی یا چٹان - ‡ ریچھہ

رین ہور دیس اس جاگہ پہ ہو ہمدرس بیٹھے ہیں

پہلے وہاں جنگل اس قدر گھنا تھا کہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ دن اور رات اس جگہ ہمدرس ہو کر بیٹھے ہیں یعنی جیسے ہمدرس یا ہم جماعت طالب علم بے تکلف ہوتے ہیں اسی طرح وہاں رات اور دن دونوں بڑی بے تکلفی سے ایک جگہ بیٹھے تھے - ایک دوسرے مقام پر اسی کیفیت کو یوں بیان کیا ہے -

اندھارا ملیا یوں دسے نور سوں
کہ دن جنت ہے شام دیجور سوں

مبارک باد کے اس قصیدے کے ضمن میں موسم کے لحاظ سے جاڑے کی شدت کے متعلق بھی ایک قصیدہ لکھا ہے - اس قصیدے میں اصلیت کم ہے اور شاعرانہ تخیل کا رنگ زیادہ ہے - چند شعر یہاں نقل کیے جاتے ہیں -

اوپٹیا ہوا فوج یوں شبنم کیاں گولیاں چھانٹتا
ڈرسوں اگن موں چھانپ لے دب رہی ہے تھارے تھار آج

(ہوا کی فوج شبنم کے گولے اڑاتی ہوی نکلی ہے ' اس کے ڈر سے آگ ہر جگہ مُنہ چھپاے دبی پڑی ہے)

وو آگ کہ کوی مارے تو دم اٹھتی تے ہو سب تن زباں
ویسی بی سرکش سر نوا پیلی دسے سدھار آج

(وہ آگ جو ذرا بھی کوئی دم مارتا تو سراسر بھوک اٹھتی تھی آج ایسی سرکش ہستی بھی سر جھکاے اور زرد رو نظر آتی ہے)

شاعرانہ رنگ میں کیا خوب شعر کہا ہے

بیشک وطن اس جگ تے سٹ جاتی اگن ہو بے نشاں
گر دل میں اپے عاشقاں دیتے نہ اس کو تھار آج

(اس میں شبہ نہیں کہ اگر عاشق اسے اپنے دل میں جگہ نہ دیتے تو
آگ کبھی کی اس دنیا میں بے نام و نشاں ہو جاتی)

حوض ایک ہوا یوں دسے مشرق تے مغرب لگ بوریا
کانپے فلک جیوں بُز بوڑا بیٹھی تو تس کی لہر آج

(ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مشرق سے مغرب تک ہوا کا ایک حوض
بھرا ہوا ہے - فلک اس بلبلے کی طرح کانپ رہا تھا جس کی موج
نیچے بیٹھہ رہی ہو)

شبنم جو اُجلا چھاچ سا آشیر سے جل میں پڑیا
ہر باؤلی ہوی ہے دہاں تھنڈی جم نیر سب یکبار آج

(شبنم جو چھاچھہ سی سفید ہے دودھ جیسے پانی میں پڑی ہے جس
سے ہر باولی کا پانی جم کر تھنڈا دھی ہوگیا ہے)

جل تھیج ہر ایک چہ بچہ بلور کی درپن دسے
اے چاند بھگی دیکھہ لے تس بیچ اپس دیدار آج

(پانی کے جم جانے سے ہر ایک چوبچہ بلور کا آئینہ ہوگیا ہے - اے چاند
جلدی سے تو اپنا دیدار اس آئینے میں دیکھہ لے)

ہر رُکھہ کوں بارا مارتے پیلے ہوے ہیں پات سب
ہر یک نگر کے باغ جہاں ہے تھنڈ سوں بیمار آج

(تھنڈی ہوا چلنے سے ہر درخت کے پتے زرد ہوگئے ہیں اور تھنڈ
کی وجہ سے ہر نگر کے باغ بیمار سے نظر آتے ہیں)

نا سر فرازی پاسکے دولت تے تھنڈ کی کونپلی
نا پھل اپنی گود تے للبا کرے ھت بھار آج

(تھنڈ کی بدولت کونپلیں تھٹر کر رہ گئی ہیں اور پھل اپنی گود

سے اپنا ھاتھ باھر نہیں نکال سکتی)

گلشن کے آئینہ اوپر پڑتا چلیا سردی سوں زنگ
ہر خار و خس شبنم سیتی ھوتا ھے جوھر دار آج

(گلشن کے آئینے پر تو سردی سے زنگ چڑھتا چلا جاتا ھے لیکن ہر خار و خس شبنم کی بدولت جوھر دار بن گیا ھے) —

لئی تھنڈ سوسیا گرچہ میں نہیں سور کی پروا دھریا
کیوں سیکلے بس آنیکا اِتنیاں کو یک انگار آج

(اگر چہ میں نے بہت ٹھنڈ کھای تو بھی سورج کی پروا نہ کی کیونکہ ایک آگ اتنے لوگوں کو کیونکر کافی ھوگی) —

اس کے آگے ٹھنڈ کھانے کی وجہ سے حسن طلب کا بڑا اچھا موقع مل گیا ھے —

ایک مقام پر گرمی کی شدت کا حال لکھتے ھوے کہتا ھے -

نہ کہہ سور بل اگ کا بادل اتھا	اُسے سورج نہ کہو وہ آگ کا بادل تھا
نہ وو دھوپ یک آتشیں جل اتھا	وہ دھوپ نہ تھی بلکہ آگ بھرا پانی تھا
مگر کھینچ دوزخ کے دریا تے نیر	شاید دوزخ کے دریا سے کھولتا ھوا پانی
برستا اتھا جگ پہ جلتاچ تھیر	کھنچ آیا تھا جو مسلسل اس دنیا پر برس رھا تھا
بو سکتی تھی یوں دھوپ جگ پر کڑک	سارے جہاں پر دھوپ یوں کڑک کر برس رھی تھی
سوکوہ و زمیں رھے تھے چھاتی تڑک	کہ پہاڑوں اور زمین کی چھاتی ٹوٹی جاتی تھی

ایک جگہ چشمہ کے پانی کی صفائی کے متعلق لکھتا ھے -

اچھے اچھے پلے تے ات صفای آب کی ایسی
دس آوے تل لگے پر جا ستیں گردانہ چاول کا

(پانی اپنی خوبی کی وجہ سے ایسا صاف شفاف تھا کہ اگر اس

چشمے میں چاول کا دانہ پھینکیں تو تہ میں پہنچنے کے بعد بھی صاف دکھای دیتا تھا) —

بیان واقعہ یا کسی حالت کا سماں

رزمیہ واقعات کے بیان میں نصرتی کو خاص کمال حاصل ہے' وہ فوجوں کی آمد اور جنگ کے زور شور اور ہنگامہ خیزی کو اس خوبی سے بیان کرتا ہے کہ آنکھوں کے سامنے نقشہ کھچ جاتا ہے - مولانا شبلی مرحوم کو اردو زبان میں میرانیس سے قبل کوی نمونہ رزمیہ نظم کا نہیں ملا - میر ضمیر نے رزمیہ کی اِبتدا کی تھی لیکن وہ بالکل نقش اولیں تھا - مولانا کو اگر نصرتی کا کلام دیکھنے کا اتفاق ہوتا تو اعتراف کرنا پڑتا کہ میرانیس سے قبل بھی ایک ایسا باکمال شاعر گزرا ہے جس نے مسلسل رزمیہ نظمیں لکھی ہیں اور جو معرکہ آرای نیز دیگر واقعات کے بیان پر پوری قدرت رکھتا ہے - علی نامہ کے ضمن میں اس کے رزمیہ بیانات نقل ہوچکے ہیں' یہاں صرف یاد تازہ کرنے کے لیے کچھہ کچھہ اشعار نمونے کے طور پر لکھے جاتے ہیں —

مثلاً تلوار کے چلنے اور گھمسان لڑائی ہونے کی کیفیت یوں بیان کرتا ہے —

کھٹا کھٹ تے کھڑ کاں کے یوں شور اٹھیا
جوں تن میں پہاڑاں کے لرزا چھوٹیا

(تلواروں کی کھٹا کھٹ سے اس قدر شور برپا ہوا کہ پہاڑوں کے جسم میں لرزہ پیدا ہوگیا) —

بلا نیند میں تھی سو ہشیار ہوئی
اجل خواب غفلت سے بیدار ہوئی

(بلا جو پڑی سورہی تھی اس شور و غل سے اُٹھ بیٹھی اور اجل خواب غفلت سے جاگ اٹھی) --

سلاحاں میں کھڑ کاں جو دھسنے لگے
اگن ہور رکت مل برسنے لگے

(تلواریں جب ہتھیاروں میں دھسنے لگیں تو آگ اور خون کی ملواں بارش ہونے لگی ' یعنی تلواروں کی ضرب جو ہتھیاروں پر پڑتی تھی اس سے چنگیاریاں نکلتی تھیں اور جو وار آدمیوں پر پڑتا تھا اُس سے خون کی ندی بہنے لگتی تھی اور یہی خون اور آگ کی ملواں بارش تھی) -

ہو یاں لہو کیاں چھٹکاں ہوا پر بخار
ستیں تیغ جیباں تے شعلے ہزار

(لہو کے چھینٹے ہوا پر پہلنچ کر بخار بن گئے اور تلواروں کی زبانوں سے ہزاروں شعلے نکلنے لگے) —

پھر یانس کا کھڑ کاں کے چنگیاں تے روپ
ہوا نرم چندنا سو سب گرم دھوپ

(تلواروں کی پے در پے چنگا ریوں سے رات کا روپ کچھ اور ہی ہوگیا اور نرم نرم چاندنی گرم دھوپ ہوگئی) —

ہوا دھکدھکی یک انگارا ہو لال
سگل اوت پانی کیا جل ابھال

(ہوا دھک اٹھی اور لال انگارا ہوگئی جس کی حدت سے پانی اوٹ کر بادل کی صورت میں نمودار ہوا) -

ہوا پر شراریاں کا ات کھیل تھا
اوڑے لہو سوتس آگ پر تیل تھا

(ھوا پر شراروں کا تماشا نظر آتا تھا اور لہو جو از رھا تھا وہ گویا آگ پر تیل کا کام دے رھا تھا) —

فرنگاں پہ لہو کے کھلالے دسیں
انیاں پرتے دھاراں پنالے دسیں

(تلواروں پر لہو کے فوارے جاری تھے اور انیوں پر سے خوں کی دھاریں پر نالوں کی طرح بہ رھی تھیں) -

پوں کو سرنگ رنگ پیدا ھوا
شفق ابر پر سب ھویدا ھوا

(ھوا کا رنگ سرخ ھوگیا تھا اور بادل پر تمام شفق چھائی ھوئی تھی) -

(ایک دوسری جگہ لڑای کے وقت میدان جنگ کا نقشہ یوں کھینچتا ھے —

ھوا پل میں پیدا کری بے مثال
اگن کا گگن اور دھوئیں کا ابھال

(ھوا نے پل بھر میں آگ کا آسماں اور دھوئیں کا عجیب و غریب بادل پیدا کردیا) -

غنیماں کے بھیجاں کوں کھانے شتاب
خوش آنے لگیا موں میں کھڑگاں کے آب

دشمنوں کے بھیجے کھانے کے لیے تلواروں کے منھہ میں پانی بھر بھر آتا تھا) -

کماناں رکھیا دل کشاکش ملنیں
اوبلنے لگے تیر ترکش ملنیں

(کمانوں نے دلوں کو کش مکش میں ڈال رکھا تھا اور تیر ترکش

مھں سے اُبلے پڑتے تھے) ۔

پھوکیا تھر یوں سخت بھالیا کا انگ
کہ پھکتا ہے جیوں باو لے کر بھو جنگ

(سخت بھالوں کا جسم یوں پھک رہا تھا جیسے اژدھا ہوا کھاکر پھنکارے بھرتا ہے) ۔

بھڑکلے ترنگاں ہو آگاں دسے
سواراں بھوکے ان کے باگاں دسے

(بھڑکتے ہوے گھوڑے آگ بگولا ہو رہے تھے اور بھوکے سوار شیر معلوم ہوتے تھے) ۔

نشانی ہے جوں میھنوں لانے کوں باو
دیویں یوں مھراتے لڑای کوں تاو

(جس طرح ہوا بارش لانے کی نشانی ہوتی ہے ، مرھٹے اسی طرح لڑای کو گرما رہے تھے) ۔

نکلتے ہیں جیوں باگ نخچیر کوں
نکل یوں مھراتے دونو دھیر سوں

(جس طرح شیر شکار پر لپکتا ہے اس طرح دونوں طرف سے مرھٹے لڑنے کو نکلے) ۔

ایک دوسرے مقام پر لڑای میں تلوار کے چلنے اور اس کی خونریزی کا ذکر اس طرح کرتا ہے —

جھوما جھوم دو دھرتے آکر لگی	دونوں طرف سے دھڑا دھڑ تلوار برسنے لگی
اگن خوب شمشیر کی دھک دھکی	اور تلوار کی آگ خوب دھکنے لگی
یکس یک پہ جھباں جو پڑنے لگیاں	ایک ایک پر اس کی ضرب پڑنے لگی

رکت بند کیا ں چلکیا نچہ جھڑ نے لگیاں	اور خون کی بوندوں سے چلکا رہاں جھڑنے لگیں
رکت ان میں بھنے لگیا یوں سرنگ	میدان جنگ میں بہتا ہوا خون یوں معلوم ہوتا تھا
پڑے بھوئیں پہ جیوں آگ جلتی کا رنگ	جیسے زمین پر جلتی ہوی آگ کا رنگ -
ہر یک لر چلی لہو کی بھر پور یوں	خون کی ہر موج ایسی بھر پور تھی گویا
بھوی مانگ میں بھوئیں کی سیاندور جوں	زمین کی مانگ میں سیندور بھرا ہوا تھا
دس آنے لگی ہو زمیں سرخ رو	سطح زمین سرخ نظر آتی تھی اور جتنا
ہوا لال رن بن چتا مو بمو	رن اور بن تھا وہ سب لال ہوگیا -
پہاڑاں و پربت سرنگ یوں دس آے	پہاڑ اور پہاڑیاں ایسی سرخ نظر آتی تھیں
کہ جوں مخملی جھول ہاتیاں پہ بہاے	جیسے ہاتھیوں پر سرخ مخمل کی جھول

بعض اوقات نصرتی کسی حالت کا سماں صرف ایک شعر میں اس طرح کھینچ دیتا ہے کہ آنکھوں کے سامنے اس کا نقشہ کھنچ جاتا ہے - مثلاً نواب بہلول خاں کی فوج کا مقابلہ شیواجی کے لشکر سے ہے - شیواجی کا لشکر کثیر ہے اور نواب کی فوج قلیل - دونوں لڑنے مرنے پر تلے ہوے ہیں نہ اُن کے پانو اکھڑتے ہیں نہ یہ جگہہ سے ہلتے ہیں - اس کیفیت کو اس نے ان دو مصرعوں میں کس خوبی سے بیان کردیا ہے -

دندی بہوت اچہہ وو توڑتے نہ تھے
عجب یو کہ تھوڑے ہو ہلتے نہ تھے

یعنے دشمن (مرہٹے) تو تعداد میں بہت تھے اس لئے ڈٹے کھڑے تھے اور تلنے کا نام نہ لیتے تھے لیکن تعجب ان (بیجا پوریوں) سے ہے کہ باوجود تھوڑے ہونے کے اِنھوں نے اپنی جگہہ سے ذرا جنبش نہ کی -

دیکھنے کی بات یہ ہے کہ اس تمام مطلب کو چند لفظوں سے کس خوبصورتی سے ادا کیا ہے -

دھلی کی فوج کا سپہ سالار جے سنگھہ جب ہر طرف سے گھر جاتا ہے اور سخت پریشان ہوتا ہے تو اس پریشانی اور تردد کی صورت کیا خوب کھینچی ہے -

جم اُس سیس زانو میں مہماں ہوا
نظر کا ٹھکانا گریباں ہوا

یعنی اس کا سر زانو کا مہمان تھا اور اس کی نظر کا ٹھکانا گریبان تھا - اس سے بڑھ کر تردد اور فکر مندی کی صحیح تصویر ہو نہیں سکتی - بلاغت اور فصاحت دونوں ختم ہیں -

ایک جگہ آتش بازی کے بیان میں ہوائیوں کے چھوٹنے کو کس خوبی سے ادا کیا ہے -

بندیاں جب ہوایاں نے بجلیاں تے ہوڑ
ستیاں جب ثریا کے جھوکیاں کوں توڑ
ہوایاں اتھیاں آگ کیاں ناگنیاں
ہوا پر سو جاکر سلپو لے جلیاں

یعنی ہوائیوں نے بجلیوں سے شرط باندھ رکھی تھی اور ثریا کے خوشے توڑ کے پھینک دیے تھے - یہ ہوائیاں نہ تھیں بلکہ ناگنیں تھیں جو ہوا میں جاکر سلپو لے جلتی تھیں -

فراق یار میں انسان پر جو بے بسی اور بیقراری کی حالت طاری ہوتی ہے اور اس حالت میں اس سے جو جو حرکتیں صادر ہوتی ہیں اس کا بیان نصرتی نے گلشن عشق میں دو تین مقام پر کیا ہے اور بعض اشعار میں ایسی سچی اور پتے کی باتیں لکھہ گیا ہے کہ مثنوی میرحسن کا وہ مقام یاد آجاتا ہے جہاں شاعر نے بدر منیر کی اسی کیفیت کو

بیان کیا ہے - اگرچہ نصرتی کا بیان اس قدر صاف سادہ اور نیچرل نہیں جتنا میر حسن کا ہے لیکن دونوں کے اشعار سامنے رکھہ کر پڑھے جائیں تو نصرتی کے کلام کی ضرور داد دینی پڑے گی - یہ بھی خیال رہے کہ ان دونوں کے زمانے میں تخمیناً ڈیڑہ سو سال کا فرق ہے - اگرچہ اعادہ ہوتا ہے لیکن چند شعر یہاں نقل کرنے مناسب معلوم ہوتے ہیں -

کنور منوہر فراق کی حالت میں یوں گریہ و زاری کرتا ہے -

نہ کس سات کہنا مجھے بات بھاے	نہ کسی سے بات کرنے کو جی چاہتا ہے
نہ کوئی بات بولے تو سن خوش لگ آے	اور نہ کسی کی بات سن کر جی خوش ہوتا ہے
ڈے دیس تو نت اندز ھاری مجھے	دن رات سے بھی زیادہ تاریک نظر آتا ہے
رین کال دوزخ تے بھاری مجھے	اور رات کا وقت دوزخ سے بھی زیادہ بھاری معلوم ہوتا ہے
انکھیاں کھولتا ہوں تو یک تل نہ بھاے	آنکھیں کھولنا مجھے ایک لحظے کے لئے بھی نہیں
وگر مونچتا ہوں تو یو خوف آے	بھاتا اور اگر بند کرتا ہوں تو یہ ڈر ہے کہ
کہ مت پھر پڑے خواب دندی سوں سلگ	کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ دشمن جاں پھر خواب
سٹے پھر کے خرمن میں من کے انلگ	میں آجاے اور پھر میرے دل کے خرمن میں آگ لگاے
پڑیا آہ ماھی نمن مجھہ رھنا	مجھے مچھلی کی طرح پڑا رہنا پڑتا ہے
گلوانا زباں ہور نہ چک مونچنا	زبان بند اور آنکھیں کھلی ہوئی

اسی طرح مد مالتی کے فراق کا بھی ذکر کرتا ہے، اس بیان میں سے صرف چند شعر یہاں نقل کئے جاتے ہیں -

اوساساں نہ کچھہ مکھہ ستی بھا سکوں	نہ منہ سے آہ نکال سکتی ہوں
نہ چک تے انجو بھار بھی لا سکوں	اور نہ آنکھہ سے آنسو باھر لا سکتی ہوں
یکت نت رھوں غم سوں کر سر تلار	تن تنہا ہوں اور غم سے سرنگوں
نہ کوئی بانٹ لیوے میرے دل کا بار	کوئی ایسا نہیں جو میرے غم کا بوجھہ بانٹ لے

زرا بن اگن تن پہ سارے لگیں
گلاں سیج کے مجھہ انگارے لگیں
تلے دن تو ہر کیوں سہیلیاں سنگات
پڑے پن بجر سل ہو سینے پہ رات
چندر مجھہ اوپر زہر کا ہو ایاغ
دیوے ہر ستارا میرے دل پہ داغ
ادک سوز لگ مجھہ تلپنا پڑے
اوسی گھات کے باج تپ نا پڑے
اچھے نس تو دوزخ تے کالی کٹھن
دسے دن تو روز قیامت کا دن
میرے سر تلیں یوں کٹیں ماہ و سال
خدا بن کہوں کس سوں مجھہ دل کا حال
کہ ناچار اچھے روریا کے بدل
سو ہنس کھیل گمنا سکیاں میں سگل

لباس اور گہنا مجھے بدن پر آگ سا معلوم ہوتا ھے
اور سیج کے پھول انگارے معلوم ہوتے ھیں
دن تو جوں توں سہیلیوں کے ساتھہ کٹ جاتا ھے
لیکن رات چھاتی پر پتھر کی سل ہوجاتی ھے
چاند میرے لئے زھر کا پیالہ ھے
اور ھر ستارہ میرے دل پر داغ دیتا ھے
سوزش دروں سے میں تڑپتی رھتی ہوں
اور اُس دکھہ بغیر مجھے قرار بھی نہیں
رات دوزخ سے بھی زیادہ تاریک اور کٹھن ھے
اور دن قیامت کا دن ھے
یہ کٹھن زمانہ جس طرح مجھہ پر گزرتا ھے
اُس کا حال میں خدا کے سوا کس سے کہوں
ناچار پاس خاطر کے لئے میں سہیلیوں میں
ھنس کھیل کے وقت گزار دیتی ہوں

لیکن شعر تو یہ کہا ھے -

جو دیکھوں تجھا تو دسے نین میں
جو بولوں بچن تو بسے بین میں

غور سے دیکھتی ھوں تو آنکھوں میں بسا ھوا نظر آتا ھے اور جو بات کرتی ھوں تو آواز میں رچا ھوا معلوم ھوتا ھے —

حسن بیان، تشبیہ و استعارہ اور مبالغہ

نصرتی حقیقی شاعر ھے اس نے واقعہ کی تصویر کھینچنے اور خصوصاً نئی تشبیہوں کے پیدا کرنے میں بڑا کمال دکھایا ھے - اس کے کلام میں

حسن بیان کی خوبی بھی اکثر جگہہ نظر آتی ہے - اس قسم کے متعدد اشعار اس سے قبل آچکے ہیں تاہم بعض شعر وضاحت کی غرض سے یہاں نقل کیے جاتے ہیں —

دیکھئے سپاھیوں کی جرأت اور دلیری ان کے بشرے سے کس خوبی کے ساتھہ دکھائی ہے :

ھتیار ان کے اوسان سہلہ سپر
زمیں پر قدم آسماں پر نظر

زور بیان ملاحظہ ہو-

چڑیا ہم سوں * جھگڑے کے لیلے میں باؤ
ترنگاں ' میں تیزی سواراں میں تاؤ

خوف کی حالت جو فوج پر طاری ہوی تو اس کی ایک کیفیت یہ بتائی ہے کہ ڈر کے مارے ان کے بدن اتنے خشک ہوگئے کہ جسم پر سے ھتیار گر پڑے —

سلح ڈھل پڑے ڈرسوں پتلے ہو آنگ

شایستہ خاں جب دن کی لڑائی اور کامیابی کے بعد شب کو اپنے محل میں جاتا اور ماھرویوں کی صحبت رنگ رلیاں مناتا ہے اور شیواجی دغابازی اور چوری سے اس پر آپڑتا ہے تو اس واقعہ کے بیان کو شب کے منظر سے شروع کرتا ہے اور اُس شب کا سماں حالت کی مناسبت سے کیا خوب بیان کرتا ہے —

سورج وہ کہ جس سامنے ہو زبوں چھپاتے ہیں چوراں بچالی میں مو

---

* دلیری ' ہمت - ؛ گھوڑے -

اوپر تخت وہ جب گیا گھر ملنجھار بیٹھا تب ہو حاکم چندر اُس کی تھار
کیا عیش میں کر سہیلیاں سوں میل ہوا راج میں اُس کے چوراں کا کھیل

جنگ کی شدت اور شمشیر زنی کی گھما گھمی میں زمین اور آسمان پر بھی عجیب حالت طاری تھی —

زمیں ہور فلک ہوکے یک حال میں
لگے ناچنے تیغ کی تال میں

فوج کے کوچ سے جو گرد و غبار اُڑا ہے اُس سے چاندنی اور چاند کی کیا صورت بنی ہے، اس حالت کے بیان میں حسن بیان اور تشبیہ دونوں قابل داد ہیں —

اوڑیا دل * کے دھم † تے دھولارا برا
صفا آب چندنا ہوا گدگرا ‡
سہے گرد یوں تن پہ چندر کے پاکھ
لگایا ہے جیوں مکھہ کوں جوگی نے راکھہ

رات کی تعریف میں کیا پر لطف شعر کہا ہے

جو خوش مکھہ پہ زلفاں پریشاں کرے
ہر یک سیام بادل کو گریاں کرے

حالت فراق کے بیان میں کیا اچھا شعر کہا ہے، اسے میں پہلے بھی لکھہ چکا ہوں اور پھر لکھتا ہوں —

جو دیکھوں تجھا تو دسے نین میں
جو بولوں بچن تو بسے بین میں

---

* فوج - † دھوم - ‡ گدلا -

نصرتی نے تشبیہات میں بڑی جدت کی ہے اور در نادر تشبیہیں نکالی ہیں - مثال کے طور پر چند یہاں لکھی جاتی ہیں —

عجب کیا جو بل تجھہ کرامت سے پائیں
تو یک ہات میں دو کلنگڑے سمائیں

(یعنے کیا عجب تیری کرامت کی بدولت ایک ہاتھہ میں دو تربوز سما جائیں) —

چلیں باد صبا تے خوش صفا پانی پہ موجاں یوں
کہ جیوں محبوب کے مکھہ پر ڈھلک زلف مسلسل کا

یعنے صاف شفاف پانی پر باد صبا کی وجہ سے اس طرح موجیں چل رہی تہیں جیسے محبوب کے چہرے پر زلف مسلسل کا ڈھلکنا -

حوض کی تشبیہ ملاحظہ ہو —

مگر نیم کا سہ فلک کا نکال
رکھیا تھا قضا بھر کے آب زلال

کھڑے پانی پر چاندنی کے پڑنے کی کیفیت کو یوں بیان کرتا ہے -

چلد نا کھڑے پانی پہ پڑ بھٹی پون یون لک لگے
جوں مہرہ پھرنے میں جلا دکھلاے کاغذ آر کا

یعنے جیسے کاغذ پر مہرہ پھرنے سے جلا پیدا ہو جاتی ہے اور وہ چمکنے لگتا ہے یہی حالت پانی کی چاندنی کے پڑنے سے تھی —

شیواجی کی فوج جب شکست کھا کر پسپا ہوتی ہے تو اُس کی زبانی اس حالت کو یوں بیان کیا ہے —

اُڑاے ہیں فوجاں کو مجھہ خس کے ناد
ابھالاں کے تکریاں کو جوں تند باد

مہری فوج کو خس و خاشاک کی طرح یوں ازا دیا ھے جیسے تند ہوا بادلوں کے ٹکڑوں کو اُڑا دیتی ھے —

کچا توڑنا خار بہتر دسے
کہ چھوڑے تو ھو پختہ خنجر دسے

کانٹے کا کچا ھی توڑ دینا بہتر ھے ' چھوڑ دیا گیا تو پختہ ہوکر خنجر ھی بن جاے گا —

مہراتے چپل ماودا ناں سوار
پریاں جیونکہ جناں کے راناں تلہار

مرھٹے تیز رفتار گھوڑیوں پر سوار ایسے معلوم ہوتے ھیں گویا پریاں جنات کی رانوں تلے ھیں۔ کیا خوب تشبیہ ھے -

تلوار کی تیزی اور برش یوں بیان کرتا ھے —

کھڑگ دل میں گزرے خیالاں تے تیز

ایک دوسری جگہ اسی کو اس طرح لکھتا ھے -

سٹیا جس پہ پر تو کھڑگ خان کا
گیا جل وجود اُس کے اوسان کا

یعنے جس پر خان کی تلوار کا پر تو بھی پڑگیا تو اس کے اوسان کا وجود جل کے خاک ہوگیا —

شہے گرد یوں تن پہ چندر کے پاکھہ
لگا یا ھے جیوں مکھہ کوں جوگی نے راکھہ

چاند پر گرد پڑنے سے وہ ایسا اچھا معلوم ہوتا تھا جیسے جوگی اپنے منہ پر راکھہ مل لیئے ہے —

دسے اشتراں تیر بیٹھے پہ ہور
کہ جیوں ناچنے پر پھولایا ہے مہور

کیا اچھی تشبیہ ہے - یعنی اونٹوں پر اس قدر تیر پڑے تھے کہ وہ بیٹھے ہوے ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے ناچتے وقت مور پر پھلائے ہوے -

ہوا رند جن تک کھڑا پانوں گاڑ
دسے کھونٹ جیوں ڈال توڑے سو جھاڑ

یعنی جو میدان جنگ میں ذرا ثابت قدم ہو کے کھڑا رہا اس کا سر قلم ہوگیا - اس کی حالت اس درخت کی سی تھی جس کی ڈالیاں کاٹ لی جائیں اور رنڈ ماﻧﮉ رہ جاے -

ہوا ہر طرف یوں چشم کو شکست
لگے پر دھکا جوں کہ چیٹیاں کی رست

یعنی فوج شکست کھا کر یوں تتر بتر ہوگئی جیسے چیونٹیوں کی قطار دھکا لگنے پر —

صف سے تیروں کے ایک ساتھ چلنے کی تشبیہ کیسی صاف اور نیچرل ہے —

اوڑے کھیت تے جیوں ہزاروں تلیر

جنھوں نے درخت پر سے یا کھیت میں سے تلیر اڑتے دیکھے ہیں وہ اس کی داد دیں گے -

تھلڈا تک ہوا یوں مدن مد کا تاؤ
کہ جیوں دود ابلتے پہ کرنے تھے باؤ

یعنی اس محبوب کا تاؤ یا جوش کسی قدر دھیما ہوا جیسے اُبلتے دودھ کا ابال ہوا دینے سے کم ہوجاتا ہے —

ہوے تن ہو بے سر رکت یوں رواں
ہانڈا جا پڑے شہد کا مرتباں

بے سر تنوں میں سے خون اس طرح جاری تھا جیسے شہد کا مرتباں الٹ جاے تو اس سے شہد بہنے لگتا ہے -

جنگ کے روز کیا کیفیت تھی

گگن پر ستارے ہوے حال میں
ہدرتا ہے سیماب جوں تھال میں

آسماں پر ستارے اس طرح ہل رہے تھے جیسے تھال میں پارہ ہلتا ہے -

کماناں پڑیاں تت کے چلے انوپ
کہ جیوں دھامنیاں بہار لیتاں ہیں دھوپ

کمانیں چلوں سے الگ یوں ٹوٹی پڑی تھیں جیسے دھامنیں دھوپ کھانے کے لیے باہر آپڑتی ہیں -

وو ڑا ووڑ میں آگ کوڑکاں نے جھڑ
سپر چر موتی جیوں بھونے سو پیڑ

یعنے تلواروں سے پے درپے آگ جھڑ رہی تھی جس سے ڈھالوں کی یہ حالت تھی جیسے بھلے پاپڑ —

سراں ہور انتڑیاں ہو یاں چیل پیل
کہے توں کہ پسری کلنگڑیاں کی بیل

سر اور انتڑیاں یوں بکھرے پڑے تھے جیسے تربوز کی بیل پھیلی پڑی ہو - کیا صاف تشبیہہ ہے —

کھڑے تھک ہو رجپوت برچھیاں سلگات
پتھاں موم کیاں جھوں فراشاں کے ہات

راجپوت برچھیاں لیے ہوے اس طرح مبہوت کھڑے تھے جیسے فراشوں کے ہاتھ میں موم بتیاں —

دسیا مغز سر پھوٹ گرزاں تے یوں
رکھیں پھوڑ ناریل کھرڑے کوں جیوں

گرزوں کی مار سے سر پھوٹ پھوٹ کر مغز نکل آئے جیسے کوی ناریل کا خول توڑ کر اس کی گری نکال لیتا ہے —

سراں پھوٹ جیوں خربوزے کے پڑے
دسیں ہو کللگڑے ملتا سے بڑے

سر پھوٹ پھوٹ کر خربوزوں کی طرح پڑے تھے اور سروں کے بڑے بڑے عمامے تربوز معلوم ہوتے تھے۔

یہ شعر بادشاہ کی تعریف میں ہے۔

جم اس ذات میں خلق و خوبی ہے یوں
اچھے پھول میں رنگ ہور باس جوں

یعنی اس کے اخلاق اور خوبیاں فطری ہیں جیسے پھول میں رنگ و بو۔

مبالغہ بھی شعر کے وصف میں داخل ہے' نصرتی نے اس صنعت میں بھی موقع موقع سے اپنا کمال دکھایا ہے۔ مثالیں دو چار یہاں لکھی جاتی ہیں —

پہاڑی رستہ کی دقتوں کے بیان میں کس دقت پسندی اور مبالغے سے کام لیا ہے۔

کوبل تھا کہستان کے مکھہ پہ گھات
معمے سے موہوم تھی جس پہ بات

کہ جس بات مشکل کا لہنے میں نانوں
زباں کا پھسلتا ھے جم مُکھہ میں پانوں

یعنے رستہ بڑا ٹیڑھا تھا اور بتیا معمے سے بھی زیادہ موھوم تھی ' اُس مشکل رستے کا نام لیتے ھوے زبان کا پانوں مُنہ میں لڑکھڑاتا تھا -

گرمی کی حدت کو کس خوبصورتی سے ادا کیا ھے -

لگے جوش کھا سر میں پکنے دماغ
زرہ جل کے دینے لگی تن پہ داغ

گرمی سے دماغ سر میں پکنے لگے اور زرہ اس قدر گرم ھوگئی کہ بدن پر داغ دینے لگی -

گھوڑے کی چھل بل اور تیز رفتاری دیکھئے -

کہا شہ کا تازی تیز پر ھے نازکی بازی بھریا
سیکتی ھے جس طناز کن پرواز نس دن شہپری
خوش رنگ کس یک پھول کا ھرگز تفاوت نا کرے
گلشن اوپر چل جاے تو مانند باد صرصری

بادشاہ کا اسپ تازی کس قدر تیز رفتار اور طناز ھے کہ جس سے شہپری ناز و انداز سیکھتی ھے - اگر اس کا گزر گلشن میں ھو تو باد صرصر کی طرح گذر جاتا ھے اور کیا مجال کہ کسی پھول کا رنگ تک میلا ھو جاے -

تھاڑ کی تعریف میں کیا عجیب مبالغہ کیا ھے -

بیشک وطن اس جگ تے سٹ جاتی اگن ھو بے نشاں
گر دل میں اپہ عاشقاں دیتے نہ اس کوں ٹھار آج

یعنے گرمی اس دنیا سے کبھی کی رخصت ھوجاتی اگر عاشق اُسے اپنے دل میں جگہ نہ دیتے -

نصرتی نے تقریباً ہر صنف سخن میں کچھ نہ کچھ لکھا ہے - مثنویوں اور قصیدوں کا ذکر ہوچکا ہے ' اب دوسری اصناف کا ذکر کیا جاتا ہے -

غزل ہمیں فارسی سے ملی ہے اور یہ ابتدا سے اردو کے ساتھہ ہے اور ہوتے ہوتے اس نے وہ زور پکڑا کہ ایک مدت تک اردو شاعری غزل گوئی کی ہو کے رہ گئی - نصرتی نے بھی غزلیں کہی ہیں - یہاں میں اُس کی ایک مسلسل غزل نقل کرتا ہوں جو خاص لطف رکھتی ہے -

چلدر بدن کہیا تو کہی موں * سنبال † بول
سورج مکھی کہیا تو کہی یوں نہ گھال ‡ بول
دونوں بھی تجھہ نکھوں تو سکے تجکوں کیا کہنا
کہی اس بہشت حسن کوں جم ¶ جگ اوجال § بول
بولیا نشاں ہے عشق کی راوت $ کا قد ترا
بولی کہ فوج فتنہ اوچانے ** کی ڈھال بول
بولیا رھنے منگے ترے سس †† پھول کن ‡‡ ہلال
بولی کہ باولی میں ہے کی تجھہ سے نال ¶¶ بول
بولیا کہ تجھہ فراق تھے کے عاشقاں خراب
بولی مرے وصل ملے کیا تجھہ ہے حال بول
بولیا کہ کعبہ دل ہے تو دل توڑنا حرام
بولی بتاں کے ہت §§ تھے توٹے تو حلال بول

* مُنہ - † سنبھال - ‡ پھیلکنا ' ڈالنا - ¶ ہمیشہ ' سدا - § جہاں افروز -
$ رایت - ** بلند کرنا - †† زیور جو سر میں پہنا جاتا ہے - ‡‡ قریب ' کئے -
¶¶ قریب - §§ ہاتھہ -

بولیا کہ لئی * دنوں تھے تری بندگی میں ہوں
بولی کہ خیر پوچ کیتک ماہ و سال بول

بولیا کہ کیا ہے جلوۂ جاں بخش بیدلاں
بولی شکر لباں کے ادھر † کا اکال بول

تجہ مدمتی‡ کی چال کہیا میں کہ گج§ کو سکھہ
ھنس کر کہی کوے ؂ کوں نکو ھنس کی چال بول

بولیا کہ سروقد ترا لایا نظر میں دل
بولی کہ خوب اس کوں اجھوں¶ دیکھہ بال†† بول

بولیا کہ دیکھنے میں تجھے طبع تازہ ہوتی
کہی نصرتی تو ویسے میں نازک خیال بول

ایک غزل نصرتی نے بعض شاعروں کی ہجو میں بھی لکھی ہے جس کے دو چار شعر یہاں نقل کیے جاتے ہیں -

نا وزن نا تلازم نا قافیہ ردیف ہے
مہمل بچن سراسر جانوں بجور جوڑا

نا علم میں دخل ہے نا باپ کوں (ہیں) بوجتے
جب بلہوس ہو تھرکیں جیوں شہد پر مکوڑا

تازی کی تیز بازی مشہور اس جگت میں
اس کی برابری کوں کیا خر کرے نگوڑا

اے نصرتی کلا کر اب چپ رہنا بھلا ہے
بادل کے گڑگڑے سوں طبل ہوا ہے بورا ‡‡

* بہت - † لب - ‡ مست - § ہاتھی - ؂ کوا - ¶ فی الحال -
†† دیکھہ بھال - ‡‡ بہرا -

ایک غزل میں اور نقل کرتا ہوں ' جس سے اس کے کلام کی روانی ' فصاحت اور عاشقانہ انداز کا صحیح اندازہ ہوتا ہے -

مغرور بے خبر ہے مد سوں مدن کی بالی
عالم کے جیو لینے لوچن * میں ہے سو لالی

اس خام سن میں دیکھو کیا پختگی کے فن ہیں
دینے کو وصل کاهل لینے کو جیو اتالی †

برھی کے نس میں غم سوں جلتا ہوں شمع نمنے
دکھلا صبا ‡ درس § کا اے خاور جمالی

مجہ من کرا کبوتر ہے تجھہ ہوا میں حیراں
پھر پھر نکو ازادے پلکاں کی مار تالی

مجھہ تجہ میں آ کھڑیا ہے احوال شہ گدا کا
کہتا کتھا یو سر تے اُچھتا اگر ہلالی

سنتے سبب عجب کیا ہو تلخ طبع شیریں
نا بات سوں نہیں کم شکر لباں کی گالی

کڑوے بچن ھنسی میں یوں او چھپا لجاوے
کرتے ہیں مکھہ مٹھا جیوں دارو پلا کسالی

سو فن ترے تہو سیں مجہ یک ہنر برابر
جیو کھیلنا کبل ہے اے بلہوس خیالی

رندی کے فن ریا کی باتاں ہیں کیوں چھپے کیں
جو ہے سو عکس دل کا دستا ہے جگ میں خالی

---

* آنکھہ - † جلد باز - ‡ صبح - § درشن -

سرمست نصرتی سوں چل سی نہ کچھہ حریفی
خوبوں کی بزم کا ہے او رند لا اُبالی

نصرتی نے رباعیاں بھی بہت سی کہی ہیں - دو ایک یہاں لکھی جاتی ہیں -

بدگوئی کے مجھ حق میں بچن چل سیں نا
ڈونگر تو کدھیں بھونکی تھے ٹل سیں نا
پھرتی ہے دوتن پیو کی چپ روتی دیکھہ
ہرگز تو تٹے پانی سوں گھر جل سیں نا

ایضاً

دنیا کے سواداں ستی مکھہ موڑ ستو
سب اُس کے تعلق تھے بھی دل توڑ ستو
پھوتوں کے ہے پاں تے (؟) یو فلک کا پرکار
شرکت کی * هنڈی گھر † یہ اپھا پھوڑ ستو

ایضاً

تجھ عشق کے دریا ملیں جن تیر گیا ہے
وہ گوہر مقصود گماں کر سو لیا ہے
گوشے میں نشست ہو کہ توں کر چلہ
تب نامی (؟) نشاں اس کو یو مطلب کوسیا ہے

----- * -----

علی عادل شاہ ثانی کی ایک غزل ہے جس کا مطلع یہ ہے -

تج گال پر نکہ کا نشاں دستا ہے مجھ اِس دھات کا
روشن شفق میں جگمگے جیوں چاند پہلی رات کا

* هانڈی - † گھورا ' کوڑی —

نصرتی نے مخمس کی صورت میں اس غزل کی تضمین کی ہے اس کے چند بند لکھے جاتے ہیں۔

دیکھیا سو رترے تجہ نین برقاں سٹیاں اوسان سب
کرتیں بچن یوں گن بھرے طوطیاں نے بسرے گیان سب
کافور سے عارض تھے تجہ بھولاں دسے حیران سب
تج زلف مشکیں دیکھہ کر سانپاں تجے انپان سب
تج لب کری لالی انگھیں لالاں سٹے سدہ گات کا

نظراں سوں کوندے جیو کے آ صحرا کوں یوں چوندھیر سوں
بوس اس میں جب مشغول ہوے جیونکہ ہوس نخچیر سوں
کیا کام کیتے ناز کے دیکھلا سخت تدبیر سوں
ابرو کماناں کھینچ کر مارے پلک کے تیر سوں
زخمی ہوا دل کا ہرن لا گیا نشان تجہ ہات کا

کسوت مکلل جب پہنا ہو آفتاب آتی ہے توں
دیکھے پہ جی بھولیا ہے سد سمجھے نہ دن ہو رات کوں
بولیا وہی خوشحال ہو سد میں آ دیکھیا سو موں
مکھڑا اس کی کا عید سا دستا اچلبک نور سوں
تس کیس پر زر کا انچل جھلکات ہے شبرات کا

عالم تھے بے پروا ہے او جس دل کوں توں پیاری لگے
خوبی ہے سب دنیا کی وہاں تجہ جیو کی جاں یاری لگے
تجہ لب کوں پیوے سو اسے امرت تھے بیزاری لگے
تیرے بچن شیریں انگھیں شکر دیکھو کھاری لگے
مکھہ میں اوچا کاری لیا ور کر ہیا نابات کا

مشکل پرت کاکھل ملد جب توں سبب سازی کرے
چکچک حریف اپنا علی عادل شہ غازی کرے
آخر عرابوں بر دمار اپنا سر افرازی کرے
بدبل پرت کا ماند کر شاھی سوں جب بازی کرے
لیتے بھولا من کا ترنگ رخ لیا رکھے شہ مات کا

اے نصرتی جب توں ملگے لکھنے مخمس یہ بدل
تو قافیاں میں لیا بندھیا استاد عالم کی غزل
الحق بنایا توں پدک نکہ تلمیں حوراں سے نول
زینت ھے دنیا میں رھنا سب عارفاں کے جیو کی کل
معنے سجھاے قدر وہ جو ہوے دھنی خوش بات کا

اس کے کلام کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ھے کہ اس کے ہم عصروں نے جیسا کہ قاعدہ ھے اس کے کلام پر نکتہ چینی کی ھے جس سے برافروختہ ہوکر وہ کہیں کہیں اپنی تصانیف میں ان نکتہ چینیوں کا جواب دیتا ھے - چنانچہ گلشن عشق کے آخری باب میں لکھتا ھے —

کریں بے سمجھہ یا جو حاسد اوداس   تودونو بی معذور ھیں میرے پاس
سرس شعر ادیکھے کوں کاں خوش لگاے   کہ الوان نعمت دوکھی کوں نہ بھاے

اسی طرح علی نامہ کے آخر میں کہتا ھے —

یکیک فن میں کئی سحر کے کر کے چھند   خبیثاں کی جیباں کوں کیتا ھوں بند
ادیکھے جو یاجوج ہوئیں لاکہ لاک   کہ ھوں میں جہاں وھاں نسکسیں وو تاک
حقیقت میں جو ہوئیں کوتہ نظر   زباں پر رکھیں عیب ست سب ھنر

یہ اشعار تو خیر معمولی ھیں جو شاعر اکثر حاسدوں کے متعلق لکھہ جاتے ھیں لیکن معلوم ہوتا ھے کہ بعض مخالفوں نے اس کی زبان اور کلام

کے متعلق بہت کچھہ زباں درازی کی تھی جس پر جل کر اس نے ایک هجویہ قصیدہ لکھا ھے جسے هم یہاں نقل کرتے هیں - بعض شعر جو فحش هیں خارج کردیے گئے هیں —

سخن ور شعر کہنے تھے رهنا چپ آج بہتر ھے
جماعت هرزہ گویاں کی کہ هر کونچے میں گھر گھر ھے
سخن ور کا سخن کچھہ هور بچن کچھہ هرزہ گویاں کے
مقولہ خام طفلاں کا نہ کہیں مرداں برابر ھے
هنر یو آنہارا نہیں کدهیں مہمل کوں بن جہلتے
هار مندانچہ سوں دایم عداوت دل کی سربر ھے
کہوانا مکھہ سوں شاعر کچھہ ھے فن سوں شعر کہنا کچھہ
کرے راواں • حجابت کیا ٹویک پستک تس ازبر ھے
همن سوں جال + رکھتے آھمن جوساچہ کوی اچھنا
نہ رکھہ سی باز کے بازو گر اشتر مرغ کوں پر ھے
جن اپنی خوب صورت پر هنر میں ناز دیکھلاوے
اُنے تک موں بھرایا تو وو گوز خر تھے کمتر ھے
کہنا نا نازنیں صورت زنانہ شعر یو هرگز
کہ مشکل هوے خلسے کوں سمجنا مادہ یا نر ھے
مصفا هور موزوں چپ کہنے تھے شعر هوتا نہیں
هوا کیا چھاچھہ دود اجلا ولے لذت میں ابتر ھے
جو لذت دل نے سمجی سو کہنے نہیں بات سوں آتی

• طوطا - + برابری -

بزرگی دل کی اس دانگہ زباں میں کاں میسر ہے
نہ آوے علم پڑنے تھے غبی کوں کچھہ ہنر مندی
سیکے کاں دور تازی کی جو کم ذات اصل میں خر ہے
عروضاں پڑکے کرنا کیا' اچھے تو طبع نا موزوں
کہ بیلکی * سطر لکھنے کن نکامی نیت مسطر ہے
طبیعت حق نے بخشی پن سخن کوں قدر نہیں ذرہ
ہوے بن آسمانی فیض کہیں پتھرا بھی جوہر ہے
منافق کی روش کچھہ کم نہیں سند ہے کی بوری تھے
اُپر ہموار ہو بھتر ال سب کاتھاں کیرا تھر ہے
مچے دوموں کے لوکاں سوں بڑا ڈر بات کرنے کا
پچھوں تھے چے کہے سوا و جواب اسکوں نہ اکثر ہے
مثال ایک شعر میں اپے شوری خوب بولیا ہے
کہ جس کی ات ہنر مندی مرے کن نت مقرر ہے
عجب کیا شعر ادیکھ کے کروں کہیں پر درست آخر
جو بسرے بات اسکندر تو گھوڑی اس کوں رہبر ہے
حسد کے درد مندداں تئیں متھا نا مکھہ کوں لگسی ہو
لگے جیوں زہر امرت سا سخن گر روح پرور ہے
بھرا ہے خبث تھے سارا غباراں آن کے بتیاں میں
چکل تک داب پکڑے تو ہزار یکدم میں تر تر ہے
دیکھاویں مولویت وھاں کہ جاں کوئی نہیں ہے مجلس میں
ڈتھاں کا راج اُس جا کا جہاں خالی جو کوئی گھر ہے

* لیڑھی ۔

... ...

اگر خوش شعر پڑ کر بھی سمجھہ سکیے تو کیچھہ غم نہیں
کہ شعر اتنا چہ سمجے ان اپیں جتنا سخنور ہے
نظر میں کور طبعاں کے گلستاں عین خارستاں
ہنر باریک بیں انکھیں ہر یک کاڑی بھی تونگر ہے
گلاں رنگیں نظر پڑ تے رہے ہو داغ چھاتی میں
دسے تو خار یکھا دا رہی آنکھانکا ان کی اثر ہے
جو صاحب طبع ہیں ان کوں بھی سب وقت اختیار و نہیں
کہ ہو الہام تب اتنا کہ جس بن جے مقدر ہے
کرم کر حق تعالی یوں دیا اس فن کی دولت مجھہ
میری نوبت کے طبلاں سن دندی بد مغز نت کر ہے
میرا استاد عالم او مربی ہے کہ اس شہ کوں
پچھانے پیر کر اپنا کہ جس فن کا کبیشر ہے
علی عادل شہ غازی جو ہے صاحب خرد ایسا
کہ ہر مشکل ہنر جس کی غلامی کاج منہر ہے
غزا کا فیض مجہ حق میں عطا ہو شہچہ سمجے پر
ہنر سب بخشنے کے تیں سبب وے بندہ پرور ہے
نوی میں طرز پیدا کر کہا ہو بھانت شعر ایسا
سخن نو سکہ کا منزل کوں انوڑنے نت یو رہبر ہے
دکھن کے شاعراں کی میں روش پر شعر بولیا نہیں
ہوا کیا سب گزر گئے تو دیکھو حاضر وو دفتر ہے

خدا بخشش کوں طبعاں کے پرس * ہے مجہ سخن الحق
لگے یو جس پھتر دل کوں وہ پھر دیکھے تلک زر ہے
مرا شعر اهل کو ... ... مشقت خیر ہوے جانو
ولے کم ذات کے ہت میں سخن پڑنے تھے یوں ڈر ہے
طبیعت جس سخن تھے پا جو ہوے پھر عیب چیں تس کا
ہوا جیوں باپ سوں منکر حرامی نسل اکثر ہے
بجز صاحب نظر ہرگز ہنر کی قدر کین بوجے
دیے تو ہات اندھلے کے برابر سنگ و جوہر ہے
قریحہ ہر سخنور کا ہنر مندان سمجتے ہیں
اچھے جاں موج زن دریا تو کس گنتی میں وہاں لر ہے
غزا کا تیغ ہے الحق اگرچہ مجہ سخن لیکن
سپر جب اتھہ اپیں دوڑے تو لازم وار اس پر ہے
زباں گردان لے رهنا ایتا اے نصرتی بہتر
کہ کرنا ہجو لایق نہیں نہ حاسد تجہ پر ابتر ہے
الٰہی جب تلک لعنت اچھے ابلیس پر تب لگ
سیہ رو اچھیو جگ میں کہ جے حاسد بد اختر ہے

اس ہجویہ قصیدے میں ایک بات قابل غور ہے ، اس نے یہ فخریہ بیان کیا ہے کہ میں نے دکھنی شاعروں کی روش پر شعر نہیں کہے اور جسے باور نہ ہو وہ میرے کلام کو ان کے کلام سے مقابلہ کر کے دیکھہ لے —

دکھن کے شاعراں کی میں روش پر شعر بولیا نہیں
ہوا کیا سب گزر گئے تو دیکھو حاضر وو دفتر ہے

---

* پارس -

حالانکہ خود اس نے بار بار اس کا اعتراف کیا ہے کہ میں نے دکھنی زبان اور دکھنی شعر کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے - یہاں غالباً اس کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پہلے جو شاعر گزرے ہیں ان کی تقلید نہیں کی بلکہ فارسی شعرا کے رنگ میں لکھا ہے - اس کی زبان بھی ٹھیٹ دکھنی کی ہے لیکن دوسرے شعرا کے مقابل میں مشکل ہے اس لیے کہ اس نے رزم و بزم کے دونوں میدانوں میں یکہ تازی کی ہے جس میں مختلف قسم کے حالات اور واقعات طرح طرح کے مناظر اور جذبات کی کیفیت بیان کرنی پڑی ہے اور موقع اور محل کی خصوصیت سے بعض اوقات انوکھے اور غیر مانوس الفاظ اور محاورے استعمال کرنے پڑے ہیں - یہی وجہ ہے کہ اس کے معاصرین نے اس کی زبان پر حرف گیری کی ہے جس کا اظہار خود اس نے اپنے کلام میں کیا ہے —

حقیقت میں جو ہوئیں کوتہ نظر

زباں پر رکھیں عیب ست سب ھنر

شفیق کو بھی اس کی زبان کے متعلق شکایت ہے چنانچہ وہ اپنے تذکرے میں لکھتا ہے " اگرچہ الفاظش بطور دکھنیاں بر زبانہا گراں می آید " - شفیق کی شکایت تو خیر ایک حد تک بجا ہے کہ وہ اورنگ آبادی ہے لیکن نصرتی کے معاصرین کی شکایت کسی قدر حیرت انگیز ہے —

نصرتی خود اپنے کلام کی قدر سمجھتا تھا اور اسے اس بات پر بجا فخر تھا کہ اس نے دکھنی زبان کو سنوارا ہے اور اس میں نیا رنگ پیدا کیا ہے اور وہ وہ چیزیں لکھی ہیں جو اس سے پہلے ناپید تھیں دکھنی ایک بے مایہ اور بے حقیقت زبان تھی اس نے اس میں جان ڈالی اور اسے سزاوار تحسین بنایا —

کھویاں ہوں سلامت سوں یک یک بچن　　مضامین کی مد میں اوتھا سخن
لگایا ہوں کے نگ طبیعت سوں اوت　　دیا خوب سورج کے مہرے سوں جوت
اول کے اگر لوک برنا و پیر　　کئے تھے کہ ہے شعر دکھنی حقیر
حقیقت میں ان کی طرف حق اتھا　　کہ تب شعر بے مایہ مطلق اتھا
سزاوار تحسین ہے یو شعر آج　　نہ کوئی رکھہ سکے بات حاسد کے باج

اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ ہندی میں فارسی کی سی فصاحت اور حسن نہ تھا لیکن ہندی میں بھی بعض خوبیاں ایسی ہیں جو فارسی میں نہیں - میں نے دونوں کی خوبیوں کو دھیان میں رکھا ہے اور ہندی شعر کو فارسی کا ہمسر بنا دیا ہے —

مری ہر بچن ہے معانی کی موت *　　رکھیا ہوں سو ڈونگر کوں کاڑی کے اوٹ
ٹک آیا ہوں جاں سحر کے کام میں　　رکھیا بھر سمندر کوں یک جام میں
ہنر کا ملا موپ + لے مایہ دار　　عمارت اوچایا ہوں خوش پایہ دار
معانی کی صورت کی ہے آرسی　　دکھن کا کیا شعر جوں فارسی
فصاحت میں گر فارسی خوش کلام　　دھرے فخر ہندی بچن پر مدام
وگر شعر ہندی کے بعضے ہنر　　نہ سکتے ہیں لیا فارسی میں سنور
میں اس دو ہنر کے خلاصے کوں پا　　کیا شعر تازہ دونوں فن ملا

(یعنی اگرچہ فارسی کو فصاحت میں ہندی پر فخر حاصل ہے لیکن بعض خوبیاں ہندی میں بھی ایسی ہیں جو فارسی میں نہیں پائی جاتیں - سو میں نے دونوں کی خوبیوں کو ملا کر ایک نئی شان پیدا کی ہے)

اس کے بعد حاسد پر پھر چوٹ کرتا ہے کہ اُس کا حسد سے یہ کہنا

---

* بسکہ - + نقشہ —

کہ یہ تو دکھنی کتاب ہے کوی معقول بات نہیں - خریدار کو اچھے سودے سے کام ہے نہ کہ دوکان کے درو دیوار سے —

ادیکھیا ادک ہو حسد سوں کباب کہے بول اتنا کہ دکھنی کتاب
سمجدار کوں خوب سودے سوں کام نہ دوکان کا دیکھنا سقف و بام

اسی طرح وہ اپنی دوسری مثنوی (علی نامہ) کے بارے میں کہتا ہے -

عجب ڈن کی بولیاں ہوں یہ مثنوی کہ کئی بھانت ہے اس ہنر میں نوی
سنواریا ہوں کئی بزم کی انجمن کھلا یا ہوں خوش رزم کے پھولبن
بھریاں ہوں ہنر سوں سراسر کتاب رکھیا ہوں نزاکت سوں سب بھر کتاب

آگے چل کر پھر اس امر کا اظہار کیا ہے کہ میں نے ہندی اور فارسی دونوں کی خوبیوں کا ست نکال لیا ہے —

میری بات میں لاف نیں ہے خلاف کہ نادان کا ہے ہنر عین لاف
کہ یو شعر میں آج اس دھات سات کہیا ہوں بڑے دبدبے کے سنگات
کیا میں تو قطع نظر لاف سوں ولے داد ہے اہل انصاف سوں
کہ کیوں میں پکڑ آج بھانت اک نوی زبوں بات کوں کر دکھایا قوی
اگر کوی معنی کوں کر وارسی پڑے رزمیہ ہندی و فارسی
اگر اوہے کامل سمج کا دھنی کہ تو اس یک سوں ہوے دو ہنر کا غنی
کہ دونوں کی خوبی منجہ انکھیاں میں آن خلاصہ نکالیا ہوں خوش مایہ چھان

آخر میں فخر کے ساتھہ اپنے تمام کلام پر نظر ڈالتا ہے اور نکتہ چیں کو چلوتی دیتا ہے —

کیا ہوں کوبل تھی سو وہ چلکے پلت کیا ہوں قصائد نول ان گنلت
دیکھو بات منجہ عشق میں بے جواب کہ ہے گلشن عشق حاضر کتاب
جو ہوتے ہیں معشوق و عاشق میں کام کیا ہوں وو سب ناز کہاں سوں تمام

دیکھیں رزمیہ گر کئے کا هنر پڑیں شعر یو ہے سخن مختصر
نوہے مجھ میں اورھر مدعی میں سخن نہ ویسا ہوں میں وو بی نہیں مجھ نمن
ادک تیز تازی تھے میرا خیال تھکانے میں جس کی فلک پر ہے جھال
قلم ہے مرا مست ھاتی تے چر جدر رخ کیا نتھ کیتا رگر
نشان آج مجھ طرز ہے بے مثال صفاں میں سخن کے ھتی پر کی ڈھال

بعض صاحبوں کا یہ اعتراض ہے کہ نصرتی یا اس سے قبل اور بعد کے بعض شعرا کے کلام کو اردو کہنا زبردستی کی بات ہے - انہیں یہ معلوم ہونا چاہئیے کہ زندہ زبان ہر زمانے میں بدلتی رہتی ہے اور یہی اس کی زندگی کی علامت ہے - مردہ زبان ہے جو صحیفوں اور کاغذوں کے قلموں میں بند ویسی کی ویسی ہی رہتی ہے - اگر اُن صاحبوں کے معیار پر اساتذہ کے کلام کو جانچا جائے تو ولی اور ایک مدت کے بعد میر وغیرہ کے کلام کو بھی اردو سے خارج کرنا پڑے گا - میں نصرتی کے چند صاف صاف شعر پیش کرتا ہوں اور اُن حضرات سے پوچھتا ہوں کہ یہ اردو نہیں تو اور کیا ہے --

نہ موجود ہونے کے مختار تھے نہ اُس زندگی کے ہو سدار تھے

کروں شکر منعم کا لاریب میں کہ پایا ہوں یو گنج از غیب میں

جلے جگ میں یوں راست بازی رکھی خدا تس کی تیوں سرفرازی رکھی

طمع اہل عزت کو کرتی ہے خوار کرے جگ منے تولی بے اعتبار

ترا ذہن نرمل تری طبع صاف سخن سلج باریک بیں موشگاف

سزا وار تجھ عشق کا تاج ہے روا تجھ کو عشاق پر راج ہے

علامت قیامت کا پیدا ہوا کہ دجال گویا ہو یدا ہوا
پھریا سب کا ایمان یکبارگی لگے کرنے آپ اپنی آوارگی

دہلی تونچ ہے مسجد و دیر کا تُہیں ہے سبب صلح ہور خیر کا
اگر دین حق کے نہ قابل اہیں ولے تیری وحدت کے قائل اہیں

خدا پاس مقبول تیری دعا تو کل سرا حاصل مدعا
ترے ہاتھ میں دین و دنیا کا بل خدا تجکوں دیتا ہے علم و عمل

تبصرے

ادب

تاریخ و سیر

متفرقات

اردو کے جدید رسالے

ادب

دل کی رانی ایک هریجن کی کہانی

[از فرید مچھلی شہری]

یه ایک چھوٹی سی کہانی هے- موهن ایک برهمن لڑکا هے۔ سیر کے لیے اپنے ایک دوست کے ساتھه اپنے گاؤں جاتا هے- وهاں ایک چماری لڑکی کو مصیبت میں مبتلا دیکھه کر همدردی کرتا هے- دونوں ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار هوجاتے هیں- ماں باپ کو معلوم هوا تو وه سخت غضبناک هوتے هیں- آخر موهن کے دوست کی بیوی ایک ایسی چال چلتی هے که دونوں کی شادی هوجاتی هے- کہانی دل چسپ هے —

—*—

رباعیات اخگر

[مجموعۂ رباعیات اخگر مرادآبادی

مکتبۂ جامعه ملیه اسلامیه دهلی قیمت ۸ آنے]

یه مجموعه مولوی محمد احمد ندوی صاحب نے طبع کرایا هے۔

شروع میں حالات مصنف اور ایک مقدمہ ہے - رباعیاں مختلف مضامین مثلاً معرفت، مذہب، اخلاق وغیرہ پر ہیں - بعض بعض بہت پر اثر ہیں - بڑی بات یہ ہے کہ ہر رباعی سے شاعر کا خلوص ٹپکتا ہے نمونے کے طور پر دو ایک رباعیاں نقل کی جاتی ہیں-

مانا کہ گہر ہار پہنا دیتے ہیں
اور تاج بھی شاہوں کے سجا دیتے ہیں
اُن اوس کے قطروں کا ہے قایل اختر
اک چیونٹی کی جو پیاس بجھا دیتے ہیں

— * —

اے کاش زماں اور مکاں سے چھوٹوں
تیروں کی طرح قید کماں سے چھوٹوں
ہر درد بھرے دل کی دوا بن جاؤں
تفریق فلاں ابن فلاں سے چھوٹوں

— ** —

نغمۂ روح

[کلام حضرت اختر انصاری - قیمت ایک روپیہ

ملنے کا پتا :- مولوی محمد افضل،

محلہ ناہر خاں، بدایوں]

یہ اختر انصاری کی مختلف نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے - اختر صاحب کے حق میں یہ کہنا کافی ہے کہ وہ سچے شاعر ہیں - ان کے کلام

میں درد اور حزن و الم پایا جاتا ہے - طرز بیان صاف اور پر اثر ہے - یہاں چند اشعار نقل کیے جاتے ہیں جس سے اُن کے انداز بیان کا رنگ معلوم ہوگا۔

جو پوچھتا ہے کوئی " سرخ کیوں ہیں آج آنکھیں"
تو آنکھیں مل کے میں کہتا ہوں " رات سو نہ سکا "
ہزار چاہوں مگر یہ نہ کہہ سکوں گا کبھی
کہ "رات رونے کی خواہش تھی اور رو نہ سکا"
دل کا خوں آنکھوں میں کھنچ آیا چلو اچھا ہوا
میری آنکھوں کو مرا احوال کہنا آگیا
سہل ہو جائے گی مشکل ضبط سوز و ساز کی
خون دل کی آنکھ سے جس روز بہنا آگیا
میں کسی سے اپنے دل کی بات کچھ کہتا نہ تھا
اب سخن کی آڑ میں کیا کچھ نہ کہنا آگیا

برشگال

خمار آگیں ہوا، اودی گھٹائیں، ہلکی ہلکی پھوار
سہانا دن ہے، فرط شوق سے طائر چہکتے ہیں
سرود و رقص کی محفل سجی ہے سبز پیڑوں پر
خوشی سے جھومتی ہیں ٹہنیاں پتے لہکتے ہیں
چمن میں ڈھیر ہے ہر سمت لاکھوں سرخ پھولوں کا
کسی آتش کدے میں جیسے انگارے دہکتے ہیں

عجب عالم ہے اس رنگیں سے میں مے پرستوں کا
نہیں حاجت شراب ناب کی' یونہی بہکتے ہیں

—•—

بلبل زار کر رہی ہے فغاں ہل رہی ہے بہار کی چھاتی

—•—

کوئی جب نالہ کرتا ہے کلیجہ تھام لیتا ہوں
فغان غیر بھی اپنی فغاں معلوم ہوتی ہے

—*—

باز کے سو شعر

(مولوی محمد تراب علی خاں صاحب باز
کے کلام کا انتخاب - قیمت دو آنے)

کسی خوش بیان شاعر کے کلام کا انتخاب آسان نہیں ' لیکن جاوید صاحب کے ذوق سلیم نے اس مشکل کو آسان کر دیا ہے - باز صاحب اپنی طبیعت اور رنگ کے لحاظ سے خاص شخص ہیں - انہوں نے اپنا رنگ خود ہی بتا دیا -

مرے اشعار میں ہے داغ کا رنگ
ہے نسبت کہنگی شیریں بیاں سے

اس انتخاب میں سے دو ایک شعر نقل کیے جاتے ہیں —

کوئی مست وصال کیا جانے بجھ گیا یا چراغ جلتا ہے
بے ثمر نخل آرزو دیکھا پھولتا ہے کبھی نہ پھلتا ہے

—•—

کالی گھٹا کو دیکھ کر رندوں میں کھلبلی سی ھے
جھوم رھے ھیں بادہ خوار ابر بہار دیکھ کر

—*—

اگر موت ھی باعث وصل ھے تو پھر اس سے آسان کیا چیز ھے
فرشتوں کا استاد حیران تھا یہ مٹی کا انسان کیا چیز ھے
محبت میں چھوٹا بڑا ایک ھے یہاں شوکت و شان کیا چیز ھے

—*—

جگر کے سو شعر

مکتبہ جامعہ ملیہ - قرول باغ دھلی - قیمت چار آنے

جگر مرادآبادی موجودہ غزل گو شعرا میں ھیں - ان کا کلام اکثر رسایل و جراید میں شایع ہوتا رھتا ھے اس لیے وہ تعارف کے محتاج نہیں - ان کے ایک سو شعر کا انتخاب محمود علی خاں صاحب نے اپنے ذوق اور پسند کے مطابق کیا ھے جس کو مکتبہ جامعۂ ملیہ نے تجلی برقی پریس دھلی میں بہت پاک صاف چھپوا کر شایع کیا ھے- جگر کے کلام میں زبان و بیان اور خیالات کی خوبیاں موجود ھیں - کسی شاعر کے ذخیرۂ کلام سے چند شعروں کا انتخاب کرنا بہت دشوار ھے اور اس میں ذوق شعری کی آزمایش ھے - اس انتخاب کے مرتب نے چند شعر بہت اچھے منتخب کئے ھیں - ذیل کا شعر شاعرانہ خیال اور صناعی کے اعتبار سے خوب ھے —

بگڑا ھوا ھے رنگ جہان خراب کا
بھر لوں نظر میں رنگ کسی کے شباب کا

دو شعر اور ملاحظہ ہوں :-

عشق نے لذت جو دی تھی آہ تو نے عندلیب
اس کو بھی صرف نوا ھاے پریشاں کر دیا

—•—

بھڑکا رہا ہوں آتش عصیاں ہر ایک سمت
پھیلا رہا ہوں رحمت پروردگار کو

(م)

—•—

حشرات الارض

مصنفۂ محمد فضل الرحمان صاحب- ملنے کا پتہ مکتبۂ ابراھیمیہ حیدر آباد دکن- قیمت ایک روپیہ چار آنے- کتابت و طباعت غنیمت حجم ۱۹۳ صفحات-

ہمارے ادب میں ڈراموں کا تقریباً فقدان ہے- اب سے پہلے بعض کمپنیاں شکسپیر وغیرہ کے ماخوذ ترجمے یا اُسی طرز پر لکھے ہوے ڈرامے پیش کرتی رہیں- اب کہیں جا کے تعلیم یافتہ نوجوانوں نے اِس صنف ادب کی طرف توجہ کی ہے اور کوششیں کی جا رہی ہیں کہ جدید طرز کے ڈرامے لکھے جائیں-

زیر نظر ڈراما بھی اسی قسم کی ایک کوشش ہے- لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ڈراما نگار نے اِس ڈرامے کو تھیٹر کے نقطۂ نظر سے لکھا ہے، اور ادبی کوشش اُن کا اولین مقصد نہیں معلوم ہوتی- کم سے کم وہ جوش اور اصلیت جو ادبی ڈرامے کی جان ہیں اس میں پورے طور پر موجود نہیں-

ڈرامے کا پلاٹ ابسن (Ibsen) کے ایک ڈرامے An Enemy Of The

People) سے ماخوذ ہے - لیکن تعجب ہے کہ ڈراما نگار نے اس کا اعتراف نہیں کیا ہے- اِس پلاٹ کو اُردو میں منتقل کرنے میں اُنہیں خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی- اصل ڈرامے کا جوش ' اور اُس کے ایک اہم کردار کی نیم مجنونانہ سرگرمی اور شوکت اِس ماخوذ ڈرامے میں مدھم نظر آتی ہے- جن حصوں میں اصل پلاٹ سے منحرف ہونے کی کوشش کی گئی ہے اُن میں اس ڈرامے کا شیرازہ ناقص ہو جاتا ہے —

یورپ کے جدید ڈرامے یورپ کی معاشرت پر منحصر ہیں' اُن میں کچھہ تبدیلیاں کرکے اُن کو ہندوستان کی معاشرت پر "چسپاں" کرنے کی کوششوں سے اُردو ڈرامے کے معیار کے بگڑ جانے کا امکان بڑھتا جاتا ہے- یا تو ذمہ دارانہ ترجمے کئے جائیں یا ایسے ڈرامے لکھے جائیں جو ہماری معاشرت ' ہماری طرز زندگی ہمارے طرز خیال کی پیداوار ہوں- ادبی اور فنی نقطۂ نظر سے شروع سے آخر تک اس ڈرامے میں حقیقت ' اور زندگی کی صحیح نقاشی کے آثار کم نظر آتے ہیں- اس ڈرامے کا قصہ جو ہندوستان کی معاشرت پر منطبق کیا گیا ہے ' جا بجا سے کچھہ ناقص سا معلوم ہوتا ہے ' اور پوری طرح ہندوستانی فضا پر صادق نہیں آتا- تفصیلوں میں ڈراما نگار کو نسبتاً زیادہ ناکامی ہوئی ہے- عمل اور مکالمے کی تفصیلوں میں روز مرہ کی معاشرت زندہ نظر آ سکتی ہے لیکن اس ڈرامے کے اشخاص جو کچھہ کہتے اور جو کچھہ کرتے ہیں' اُس میں زندگی' اور اصلیت کے حقیقی آثار نظر نہیں آتے- ہر چیز میں "آورد" کا شائبہ ہے' اور ہلکا سا تصنع پایا جاتا ہے —

فنی اعتبار سے "حشرات الارض" میں بعض کمزوریاں ہیں- چوتھے ایکٹ کے دوسرے سین میں ڈاکٹر جاھد کی تقریر کچھہ بے معنی سی ہے -

اِبسن کے ہاں ڈاکٹر کی تقریر ایک خاص چیز تھی - ڈاکٹر جلسے کی پابندیوں اور منہ لگتوں کی وجہ سے اپنے آپ سے گذر جاتا ہے - وہ کہنا کچھہ چاہتا ہے مگر مخالفت اور جوش میں کچھہ اور کہہ جاتا ہے۔ اِبسن نے اِس منظر کی تحریر میں کمال کردیا تھا- "حشرات الارض" میں یہی منظر کچھہ بے معنی سا ہوگیا ہے - ڈاکٹر کی تقریر اس قدر عجیب و غریب قسم کی ہے' اور ڈرامے کی نشو و نما اور مقصد پر اس کا قدرتی اثر اس قدر کم پڑسکتا ہے کہ پورا منظر بے جوڑ معلوم ہوتا ہے۔ کاش اس منظر کی حد تک فاضل ڈراما نگار اصل کی پیروی کرتے تو ڈرامے میں کچھہ نہ کچھہ جان پڑ جاتی ـــ

ڈرامے کا مکالمہ بھی مربوط نہیں - ہر شخص کی گفتگو کا انداز الگ ہوتا ہے اور مکالمے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ہر شخص کے خاص طرز گفتگو سے قدرتی طور پر نشو و نما پائے - اِس ڈرامے میں مکالمہ بالکل یکساں ہے- باتوں سے کسی کردار کی ذاتی خصوصیتیں نمایاں نہیں ہونے پاتیں- تمام اشخاص ایک ہی قسم کی سادہ' بے لطف عبارت میں باتیں کرتے ہیں' جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ڈراما نگار نے مکالمہ نگاری کی طرف پوری توجہ نہیں کی- جوش، اصلیت اور لطف جو مکالمے کی قدرتی روانی سے پیدا ہوتے ہیں' اس ڈرامے میں پورے طور پر موجود نہیں- بعض جگہ مکالمہ بے ربط ہوگیا ہے جس سے ڈرامائی توازن میں فرق آگیا ہے مثلاً پہلے ہی سین کے ابتدائی چند صفحوں میں مختلف کرداروں کی گفتگو- بعض جگہ آداب مکالمہ کا خیال کم رکھا گیا ہے۔ مثلاً صفحۂ ۵۲ اعزاز احمد صاحب (جن کی صاحبزادی سے اُن کے ایک بھتیجے کی شادی ہونے والی ہے) بھتیجے کی والدہ سے گفتگو فرماتے ہیں :-

شہر بانو- "مجھے اتنی جلدی نہیں جتنی آپ کے بھتیجے کو جلدی ہے - دن رات سر کھاتا ہے کہ مجھے زر زیور کپڑا لتا کچھہ درکار نہیں - بس سیدھے سادے دو بول پڑھوا دو" —

اعزاز - " تو اس سے کہیے لڑکی کو بھگا لے جاے " —

شہر بانو- "اُس کا تو کچھہ یہی ارادہ نظر آتا ہے ." —

ڈرامے کے ایک فرد "مری کالج کے منشی صاحب" ھیں جو مدراسی اُردو بولتے ھیں، ان کی زبان سے مدراسی کہلوانے کے لیے مکالمہ طویل ہوگیا ہے جو بے ضرورت معلوم ہوتا ہے - (مثلاً صفحۂ ۳۸ سے صفحۂ ۴۲ تک) - معلوم ہوتا ہے کہ لایق مصنف نے اس ڈرامے کو بہت روا روی میں لکھا ہے - یہی وجہ ہے کہ کہیں کہیں زبان کی فرو گذاشتیں بھی نظر آتی ھیں مثلاً

" کہیں پھر چار سال کی طرح اچار کیا کر بیچش کا دم چھلہ لگالیں گے " (صفحۂ ۳۸) —

" آپ کو کسی قسم کی شکایات ہوں تو بلا خوف و خطر بیان کیجیئے - ان کا "ارتفاع" ہمارا عین فریضہ ہے " (صفحہ ۳۰- یہاں "ارتفاع" غالباً رفع کرنے کے معنوں میں استعمال ہوا ہے) -

" برخلاف اس کے کتاب پڑھلے کے بعد انصافانہ راے قایم کرنا بہت مشکل ہے " - (صفحۂ ۷۷ - اِس "انصافانہ راے" کی داد نہ دینا ظلم ہے) -

پلاٹ اور مکالمے کے بعد کردار نگاری کا سوال آتا ہے - کردار نگاری میں ابسن سے بہت انحراف کیا گیا ہے - اور مصنف نے ایک دو " طبعزاد " اشخاص ڈراما کا اضافہ بھی کیا ہے تاکہ ایک طرف عشق و محبت کی چاشنی بھی آجاے اور دوسری طرف ایک مدراسی منشی صاحب اپنی باتوں سے حاضرین اور ناظرین کو ھنسا سکیں -

"حشرات الارض" کے کردار زندہ آدمی بہت معلوم ہوتے ہیں یہ ایک طرح کا نمونہ (type) ہیں اور محض تھیٹر کی پیداوار ہیں۔ کرداروں کو اس ماخوذ ڈرامے میں غالباً ایکٹروں کو پیش نظر رکھہ کے جا بجا بدلا گیا ہے۔

ڈاکٹر کا کردار اس میں مسخ ہوگیا ہے - ابسن کے وہ دو کردار جو اس ڈرامے میں "رعد" و "برق" بنے ہوے ہیں زبان حال سے شکایت کر رہے ہیں - "مری کالج کے منشی صاحب" البتہ خالص ہندوستانی آدمی ہیں - اور وہ خشکی جو ابسن کے خیالات کی پوری ترجمانی نہ کرنے سے پیدا ہوی تھی اس کو رفع کرنے کے لئے اس کا داخل کرنا کچھہ نامناسب نہیں لیکن اس کردار میں بھی کچھہ جان نہیں البتہ غلط مدراسی اُردو بولنے میں اس کو کمال حاصل ہے —

اب، جب کہ ڈراما کو ملک کے تعلیم یافتہ نوجوانوں نے اپنے ہاتھہ میں لیا ہے، تو ضرورت اس امر کی تھی کہ یا تو وہ خود اپنی زندگی اور معاشرت کا مطالعہ کرکے ایسے ڈرامے لکھیں جو ادب میں باقی رہ جائیں یا یورپ کے معیاری ڈراموں کے ذمہ دارانہ ترجمے کریں جس سے اردو میں ڈراما کا صحیح معیار قائم ہونے میں مدد مل سکے - ورنہ اِس قسم کی کوششیں ممکن ہے کہ اسٹیج پر کامیاب ہوں - مگر ادب کو ان سے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا - اور اردو ڈرامے کے ایک اور غلط معیار کے پیدا ہوجانے کا اندیشہ بھی ہے - (+ +)

مقالات حالی

شایع کردۂ انجمن ترقیٔ اُردو اورنگ آباد - صفحات ۳۱۰ کتابت طباعت اور کاغذ نہایت پاکیزہ اور عمدہ قیمت مجلد ؁ روپیہ غیر مجلد سوروپے ۸۰ آنے

'مولانا حالی' اُردو زبان کے بلند پایہ شاعر اور نثر نگار ہیں ان کی تصانیف مشہور اور مقبول ہیں اور بار بار طبع ہو چکی ہیں لیکن ان کے مضامین وغیرہ

جو مختلف رسائل و جرائد میں شایع ہوئے ہیں اب تک مکمل طور پر یکجا جمع نہیں کئے گئے ۔ انجمن ترقی اردو ۔ مستحق مبارک باد ہے نہ اس نے مولانا کے مضامین ، تبصروں اور تقریروں سب کو جمع کیا ہے اور ان کو خاص اہتمام سے طبع کرکے شایع کرنے کا بیڑا اُٹھایا ہے - اس سلسلے کے دو حصے ہیں' پہلے حصے میں عام مضامین ہیں' اور دوسرے میں کتابوں کے تبصرے اور وہ تقریریں ہیں جو مختلف جلسوں یا کانفرنسوں میں مولانا نے فرمائیں - پہلا حصہ چھپ چکا ہے جو ہمارے پیش نظر ہے دوسرا حصہ زیر طبع ہے —

یہ مقالے تعداد میں ۳۲ ہیں - جس طرح ان کی تعداد کافی ہے ، اسی طرح ان کے موضوعات میں بھی کافی رنگا رنگی اور تنوع ہے - مذہب ' اخلاق ' تعلیم ' ادب ' فلسفہ ' سیاسیات وغیرہ اس کے خاص موضوعات ہیں - ان تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ ہماری زبان میں علمی مضامین اور خیالات پہلے پہل کس طرح داخل ہو رہے تھے اور ان کو عام بنانے اور زبان کے دائرے کو وسیع کرنے میں مولانا حالی اپنے قلم سے کس طرح کام لے رہے تھے - ان مضامین کو لکھے ہوئے پچاس سال سے زیادہ کا عرصہ ہوا ہے ' لیکن ان میں اب تک وہی تازگی اور جدت موجود ہے ' اور آج بھی ہم ان سے رہبری و ہدایت حاصل کر سکتے ہیں —

ان مقالات کی اہمیت اور رنگا رنگی کے قطع نظر ان کے بیان اور زبان میں بھی اُستادانہ خوبیاں ہیں - ' حالی ' کے جچے تلے اور مہذب و متین اسلوب ' اور سلیس و پاکیزہ زبان کے آثار ہر جگہ نمایاں ہیں - اس میں الفاظ و خیالات کا وہ معتدل اور خوش گوار توازن ہے کہ پڑھنے والا علمی مسائل کے ادا کرنے کے لئے ان سے بصیرت حاصل کر سکتا ہے - یہ کتاب ہر اردو داں کی نظر سے گزرنی چاہیے- کتاب کے شروع میں مولانا کی سب سے آخری عکسی تصویر بھی شامل کی گئی ہے - (چ)

— * —

تاریخ و سیر

حیات حافظ رحمت خاں

اٹھارھویں صدی عیسوی میں مغلوں کی مرکزی حکومت میں ضعف آیا اور حسب معمول ہندوستان کے مختلف اقطاع میں ملوک طوائف او بد امنی کا دور دورہ ہوا' تو اس وقت مغلیہ افواج کے بر طرف شد افغانی سپاھی موجودہ روھیل کھنڈ کے علاقوں میں جا بجا خود قابض او حاکم بن بیٹھے اور دھلی کی کمزور حکومت جب ان کو مغلوب نہ کرسک تو ناچار انھیں اپنی طرف سے جاگیر و منصب عطا کرنے لگی اور اس طر یہ لٹیرے پردیسی حکومت و ریاست کے مدعی بن گئے ؛ اس نئی ریاست کی تشکیل و ترقی بہت کچھ ایک عالی خاندان روھیلہ سردا 'حافظ رحمت خاں' کی شجاعت و تدبیر کی رھین منت تھی' بلکہ اس اعتبار سے کہ حافظ موصوف کی شہادت کے ساتھہ ھی روھیلوں کی آزاد حکومت و قوت کا خاتمہ ھوگیا' اس ریاست کو انھی کی ذات سے منسوب و مختص کردینا کچھہ غلط نہ ھوگا - خوشی کی بات ھے کہ ایک ایسے ممتاز اور غیر معمولی شخص کے حالات کو سید الطاف علی صاحب بی' اے' بریلوی نے جمع کیا اور خاصی ضخیم کتاب کی صورت میں نظامی پریس بدایوں سے چکنے کاغذ پر صاف ستھرا چھپوا کر چند تصاویر کے ساتھہ شایع کردیا ھے

شروع میں آنریبل مسٹر سیتا رام صاحب صدر نشین مجلس وضع قوانین صوبۂ متحدہ نے مختصر سا پیش نامہ تحریر فرما کر نو جوان مولف

کی عزت بڑھای ہے اگرچہ خود کتاب کی قدر و قیمت یا آنریبل موصوف کی شہرت میں غالباً ان سطور سے کچھہ اضافہ نہ ہوگا - پھر ایک تعریفی مقدمہ ناشر کتاب مولوی نظام الدین صاحب بدایونی نے تحریر فرمایا ہے- اس کے بعد لایق مولف کا دیباچہ ہے جس میں انہوں نے سیرالمتاخرین اور "فیض بخش" وغیرہ اس عہد کی بعض تاریخوں پر جرح کی ہے کہ چونکہ یہ کتابیں حکومت انگریزی کی سرپرستی میں یا انگریز حکام کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے لکھی گئی ہیں لہذا ان میں روہیلوں سے انصاف نہیں کیا گیا- بخلاف ان کے لائق مولف نے اپنا ماخذ بیشتر 'گل رحمت اور 'گلستان رحمت' کو بنایا ہے جو حافظ رحمت خاں کی گویا حمایت اور ستائش میں لکھوای گئی نہیں - طرفہ یہ کہ خود انصاف پسند مولف نے خان شہید کی اولاد میں صاحبزادہ عبدالواجد خاں کی امداد و سرپرستی سے اپنی کتاب شایع کرنے میں کچھہ مضائقہ نہیں کیا —

اصل کتاب کے آغاز میں ملک روہ' روہیل کھنڈ' خاندان حافظ رحمت خان کے مختصر حالات تحریر کئے ہیں - ان کی ولادت کا تخمینی سنہ ۱۷۰۸ ہے - لیکن هندوستان میں مستقل اقامت کا زمانہ لائق مولف نے نہیں لکھا - البتہ سنہ ۱۷۳۰ کے کچھہ بعد سے هم خان موصوف کو آنولے میں مقیم اور نواب محمد علی خاں کی رفاقت میں سرگرم کار پاتے هیں- سنہ ۱۷۴۹ میں محمد علی خاں نے وفات پائی- وہ اپنا جانشین بھی حافظ رحمت خاں کو بنانا چاهتے تھے لیکن حافظ صاحب نے دستار حکومت محمد علی خاں کے صغیرالسن بیٹے سعداللہ خاں کے سر پر رکھہ دی - بعض مورخوں نے اسے ریا کاری قرار دیا ہے لیکن همارے مولف نے اس خیال کی شد و مد سے تردید کی اور اس فعل کو حافظ صاحب کے خلوص

و ایثار کی حیرت انگیز مثال ثابت کیا ہے اگرچہ خود ان کی کتاب شاہد ہے کہ سعداللہ خاں کی مسند نشینی اور بعد میں اس کے بھائیوں اور روہیلہ سرداروں میں تقسیم مملکت کے باوجود سارے ملکی اختیارات اور جنگی قوت حافظ رحمت خاں ہی کے قبضے میں رہی اور بہت سی فتوحات اور ترقیوں کے بعد وہی دربار اودہ اور ان کے حلیف انگریزوں کے اصلی حریف قرار پائے اور انہی کی شہادت (سنہ ۱۷۷۴ ع) اور شکست کے ساتھ ریاست روہیل کھنڈ بلکہ روہیلہ قوم کی حکومت و شیرازہ بندی کا خاتمہ ہوگیا ــ

کتاب زیر تبصرہ کو تاریخ نویسی کے اس معیار پر کہ واقعات گذشتہ کو پوری طرح سمجھکر سمجھا دیا جائے ' جانچنا شاید بے محل ہوگا کیونکہ مولف صرف ایک سوانح عمری لکھنے بیٹھے ہیں۔ البتہ یہ امر تعجب سے خالی نہیں کے علی گڑہ کے انگریزی تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود ان کی کتاب کا طرز قرون وسطیٰ کی فسانہ آمیز مشرقی تاریخوں سے زیادہ مشابہت رکھتا ہے حتیٰ کہ کمال خوش اعتقادی سے انہوں نے حافظ رحمت خاں کی بعض کرامتیں بھی نقل کردی ہیں - مگر اس سے بھی بڑھکر عجیب ' خاں ممدوح کے علم و فضل ' شعر گوی اور انشاپردازی کی دلیلیں ہیں جنہیں لائق مولف نے درج کتاب کرکے گویا ذوق سلیم کی تضحیک فرمائی ہے - غنیمت ہے وارن ہیسٹنگز کے مخالفین کی کتابیں اور رسالے ان کی نظر سے نہیں گزرے ورنہ عجب نہیں دیوان حافظ شیرازی کو وہ حافظ رحمت خاں کا کلام ثابت کرنے پر آمادہ ہو جاتے ؟ بہر حال کتاب " حیات حافظ رحمت خاں " دلچسپی اور افادے سے خالی نہیں اور یقین ہے کے قومی یا خاندانی تعلقات کی بنا پر اہل روہیل کھنڈ میں کافی قبولیت حاصل کرے گی ــ

قیمت تین روپیہ - مطبع نظامی' بدایوں یا روھیلا بک ڈپو' نینی تال روڈ بریلی سے طلب کی جائے —

(ش)

اسلامی تاریخ کی سچی کہانیاں (حصہ اول)

مرتبۂ مولوی محمد حسین ندوی - شایع کردۂ
مکتبہ جامعہ ملیہ دھلی قیمت ۴ آنہ

لایق مرتب نے اس چھوٹی سی کتاب میں عربی فارسی کی مختلف تاریخوں سے ۵۰ چھوٹی چھوٹی حکایتیں جمع کی ھیں اور ان کو سہل و سادہ عبارت میں تحریر کیا ھے تاکہ بچے سہولت سے پڑھیں اور سمجھیں - مرتب نے اپنے انتخاب میں یہ التزام کیا ھے کہ ایسی کوئی حکایت داخل ھونے نہ پائے جس میں اخلاقی تعلیم کا جوھر موجود نہو - بچوں کے لئے یہ کتاب بے شک مفید اور قابل مطالعہ ھے —

(چ)

متفرقات

سفر شاھانہ

(مولفۂ جناب مولوی محمد اکبر علی صاحب اڈیٹر صحیفہ روزانہ حیدرآباد دکن- قیمت قسم اول چوبیس روپے اور قسم دوم چھ روپے چار آنہ)

کہنے کو تو یہ اعلیٰحضرت حضور پرنور فرمانروائے مملکت آصفیہ کا سفر نامۂ دھلی و رام پور و لکھنؤ ھے لیکن علاوہ سفر کے مفصل حالات کے جو فاضل مولف نے ھمراہ رہ کر قلمبند کئے ھیں ' اس میں اُن تمام مقامات کے تاریخی حالات اور وھاں کی عمارتوں اور آثار قدیمہ کی عکسی تصویریں اور نقشے اور دوسرے بہت سے کارآمد مضامین آگئے ھیں - یہ عجیب دلکش مرقع ھے - صرف تصویروں کا حساب کیا جائے تو شمار میں ۲۸۹ ھیں - تاریخی حالات بہت تحقیق سے جمع کئے گئے ھیں اور ساری کتاب بلاک بنوا کر نہایت خوش خط طبع کی گئی ھے - ایسی کتاب اردو زبان میں اب تک طبع نہیں ھوی تھی - فاضل مولف کی محنت اور تحقیق لایق ھزار آفریں ھے - اس میں انھوں نے وقت اور مصارف کی مطلق پروا نہیں کی اور انتہائی شوق اور محبت سے اس کام کو انجام دیا ھے - قسم اول اعلیٰ درجے کے آرٹ پیپر پر طبع ھوی ھے - اس کا ھر صفحہ بجائے خود ایک مرقع معلوم ھوتا ھے - علاوہ طباعت کے کمال کے جو اس کے ھر ورق سے ظاھر ھے ترتیب میں بھی بڑی خوش سلیقگی سے کام لیا گیا ھے - جہاں کہیں کسی عمارت کی تصویر ھے یا کسی ممتاز شخص کا نام آگیا ھے وھاں اس کے مکمل حالات اختصار کے ساتھ درج کردیے گئے ھیں - علاوہ جدید و قدیم عمارات اور آثار کی تصویروں کے جا بجا حال و گزشتہ تمدن کے مرقعے بھی نظر آتے ھیں - غرض یہ کتاب نہایت قابل قدر ھے اور ھر مدرسہ اور کالج اور ھر دفتر اور کتب خانے میں رکھنے کے لایق ھے —

—— * ——

غدودں کے جوهر اور علاج امراض

(از لفٹننٹ کرنل ڈاکٹر محمد اشرف الحق - قلعہ گولکنڈہ

حیدرآباد دکن - قیمت چھ آنے)

ڈاکٹر محمد اشرف الحق صاحب " اعادۂ شباب و درازئی عمر " پر بہت کچھ لکھ چکے هیں - وہ اس فن کے خاص ماهر هیں - چونکہ اس مضمون کا زیادہ تر تعلق خاص غدد سے ہے اس لئے انہوں نے یہ رسالہ ان غدد پر لکھا ہے اور ان کی پوری کیفیت تحریر کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ کن کن امراض میں غددوں کے جوهر استعمال کئے جاتے هیں - جن صاحبوں نے ڈاکٹر صاحب کے پہلے رسالے پڑھے هیں ان کے لئے اس رسالہ کا مطالعہ بہت مفید هوگا - اس میں بعض بہت کام کی باتیں لکھی هیں خصوصاً علاج بالاعضاء کا باب پڑھنے کے قابل ہے —

—*—

ارکان اسلام

(شایع کردۂ مکتبۂ جامعہ ملیہ اسلامیہ قرول باغ دهلی قیمت ڈھائی آنہ)

یہ چھوٹی سی کتاب مسلمان بچوں کے لئے لکھی گئی ہے جس میں اسلام کے پانچوں ارکان کو مختصر طور پر سمجھایا گیا ہے تمام ضروری امور کو بہت صاف سلیس زبان میں سلیقہ سے ادا کیا ہے جن سے بچے بہت کم وقت میں بآسانی واقف هوسکتے هیں —

(ع)

—*—

کبیر انیڈ دی بھگتی مو ومنٹ

(Kabir and the Bhagti Movement)

(مصنفۂ مسٹر موھن سنگھہ صاحب - صفحات ۹۳ -

پتہ - آتما رام اینڈ سنز پبلشر - لاھور)

مصنف کا قصد ھے کہ کبیر کے متعلق مکمل تحقیق کریں اور اپنی تحقیق کے نتائج کو تین علحدہ علحدہ جلدوں میں شائع کریں - چنانچہ کتاب زیر تبصرہ اس تحقیق پر پہلی جلد ھے جو ابھی حال میں شائع ھوئی ھے - انھوں نے اس جلد کے دیباچہ میں لکھا ھے کہ ڈاکٹر یوسف حسین خاں پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی کے مضمون " از منۂ وسطیٰ میں تحریک بھگتی پر اسلامی اثر " مطبوعہ رسالہ " اسلامک کلچر " دسمبر سنہ ۱۹۳۳ ع کو پڑھنے سے انھوں نے یہ ارادہ کیا کہ کبیر کے متعلق تحقیقات اور چھان بین میں سرگرمی سے کام کریں اور جو غلط رائیں ھندوستان کی از منۂ وسطیٰ کی معاشرتی اور مذھبی تاریخ کے متعلق قایم کی جارھی ھیں ان کی صحت کریں - ان کا یہ ارادہ یقیناً مبارک ارادہ تھا - کسی مضمون نگار کے لیے بھی شاید اس سے زیادہ قابل مسرت اور کوئی بات نہیں ھو سکتی کہ اس کے خیالات دوسروں کے لیے فکر و تحقیق کے محرک بنیں - ھم نے شروع سے آخر تک مسٹر موھن سنگھہ صاحب کی تصنیف کردہ کتاب پڑھی - اس میں ھمیں خالص تحقیق بہت کم نظر آئی - انھوں نے دوسروں کے خیالات و آرا کو تھوڑا بہت بدل کر پیش کردیا ھے اور بس - اگر چہ موصوف نے یہ دعویٰ کیا ھے کہ وہ کبیر کی تحریک کے متعلق اس وقت اپنا کوئی خاص خیال نہیں رکھتے لیکن کہیں کہیں ان کے انداز خیال کی

جھلک صاف نظر آجاتی ہے - ان کی تحریر کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کے قائل نہیں کہ ہندوستان کی ازمنۂ وسطیٰ کی تاریخ میں اسلام کا کوئی خاص اثر پڑا - وہ اس زمانے کی معاشری اور مذہبی تحریکات کا رشتہ بدھ مت کے ساتھ جوڑتے ہیں (صفحہ ۹۱) لیکن یہ نہیں بتاتے کہ یہ تحریکات اسلام کے ہندوستان میں پھیلنے سے کچھ قبل کیوں نہیں شروع ہوئیں - ان میں جو خالص اسلامی عناصر پائے جاتے ہیں، جنہیں ہر منصف مزاج محقق تسلیم کرے گا، وہ کہاں سے اور کیونکر آئے؟ - اس مسئلہ کی تفصیلی بحث کے لئے ہمیں دوسری اور تیسری جلد کا انتظار کرنا ہوگا لیکن بہ ہر حال مصنف نے اشارتاً جہاں کہیں اس مسئلہ کو چھیڑا ہے وہاں ان کے خیال کی عام نہج کا پتہ چل جاتا ہے —

مصنف نے اشارتاً اس کا بھی ذکر کیا ہے کہ نانک نے کبیر سے خوشہ چینی نہیں کی لیکن اس دعوے کی تائید میں کوئی استدلال یا ثبوت پیش نہیں کیا جو تحقیق کی کسوٹی پر پورا اترے - دنیا کا بڑے سے بڑا مجتہد اور امام بھی دوسروں سے استفادہ کرنا اور اپنے گرد و پیش کی فضا سے متاثر ہوے بغیر نہیں رہ سکتا - اب تک یہ بات مسلم رہی ہے کہ نانک نے انہیں خیالات و افکار کو جو پہلے سے کبیر کی تحریک کی بدولت موجود تھے، عوام کے سامنے پیش کیا - اب اگر کوئی اس دعوے کی تردید کرنا چاہتا ہے تو اس پر بار ثبوت عاید ہوتا ہے - محض کہنے سے کوئی بات سچ نہیں ہو جاتی اور نہ دنیا اس کو تسلیم کر سکتی ہے —

مصنف کتاب نے پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے ہندی قلمی مخطوطات کا بار بار ذکر کیا ہے جن سے انہوں نے اس کتاب کی تیاری میں مدد لی - اگر یہ ذکر صرف اس واسطے کیا گیا ہے کہ پڑھنے والے مرعوب ہوں تو اس

سے کوئی فائدہ نہیں ۔

لیکن اگر واقعی 'کبیر' کے متعلق مصنف کو کام کرنے کا سچا شوق ہے تو ہم انھیں مشورہ دیں گے کہ وہ فوراً 'بیجک' 'گرنتھاولی' اور 'پنچاولی' وغیرہ کے ایڈیشن تنقیدی اصول پر تیار کریں - اس ضمن میں وہ یہ تحقیق کر سکتے ہیں کہ واقعی کونسا کلام 'کبیر' کا ہے- کونسا 'دھرم داس' کا ہے اور کون سا بعد کے پنتھیوں نے اضافہ کیا ہے - مختلف زمانوں کی زبان صاف پہچانی جائے گی - یہ ایک زبردست تاریخی اور لسانی خدمت ہوگی جو وہ کر سکتے ہیں - اس کام میں وہ اور دوسرے ہندی کے فاضلوں سے بھی مدد لے سکتے ہیں —

(ی)

قانون مباشرت

از ڈاکٹر فضل مبین احمد دہلوی - ملنے کا پتہ دفتر معارف طبیہ روڈ گراں دہلی - قیمت چار آنے

اس کے نام سے ظاہر ہے کہ جنسی تعلقات اس کا موضوع ہے - بڑی حد تک طبی نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے - شروع میں چند مفید صحت اصول بیان کئے گئے ہیں- اختصار کے ساتھ ضروری جنسی معلومات فراہم کردی گئی ہیں - پھر ہر قسم کے جنسی امراض کا بیان اور اُن کے علاج کی تدبیریں ہیں - کتاب کا بہت بڑا حصہ نسخوں پر مشتمل ہے —

مصنف نے کتاب طب یونانی کے اُصول اور نظریوں کو زیادہ تر پیش نظر رکھ کے لکھی ہے اور جہاں تک ممکن ہوا تحقیقات سے بھی فائدہ

اُتھایا ھے - کہیں کہیں البتہ جدید ترین نظریوں کو وہ نظر انداز کرگئے ھیں - یا اُن مسائل کو تشنہ چھوڑ کے آگے بڑہ گئے ھیں جن پر زیادہ تفصیل سے روشنی ڈالنے کی ضرورت تھی —

مجموعی طور پر یہ کتاب ایک بہت کامیاب کوشش ھے - اور اُردو میں جنسی تعلقات کے موضوع پر قابل قدر اضافہ ھے — (+ +)

——— * ———

اُردو کے جدید رسالے

هفتہ وار هند

(ادیٹر مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی - کلکتہ - سالانہ قیمت پانچ روپے)

اگرچہ هم هفتہ وار یا روزانہ اخبارات پر تبصرہ نہیں کرتے لیکن "هند" معمولی اخبار نہیں ھے - اس کا مقصد توھمات اور تعصبات کو مٹانا اور آزادی کا ولولہ پیدا کرنا ھے - اس کا اڈیٹر بے لاگ اور بے باک شخص ھے - وہ اپنی راے کے اظہار میں کسی کی رو رعایت نہیں کرتا - اس کے قلم میں قوت اور بیان میں جوش ھے - اس اخبار میں مسائل حاضرہ پر پر زور تحریریں اور پر از معلومات مضامین ہوتے ھیں- علاوہ اس کے مختصر فسانے، نظمیں اور لطائف و ظرائف، تصاویر اور کارٹون بھی ایسے ہوتے ھیں جو بصیرت افروز ھیں - اردو اخبارات میں

یہ خاص حیثیت اور خاص درجہ رکھتا ہے - اس کا سر ورق جس پر شیر ببر کی تصویر بنی ہوئی ہے اس کے منشا کو صحیح طور پر ظاہر کرتا ہے - اس کے متعلق اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ یہ روزانہ " ہند جدید " کا بچہ ہے- ہم اُردو داں طبقے سے خاص طور پر سفارش کرتے ہیں کہ وہ اس کی سرپرستی کرے - اُس کا مطالعہ ہر شخص کے لیے جو دنیا کے حالات سے با خبر رہنا اور زندگی کی جد و جہد میں کسی صورت سے بھی حصہ لینا چاہتا ہے ' نہایت مفید ہوگا ـــ

اختر

(ماہانہ - دارالادب ہند' بل روڈ ' لاہور - سالانہ چندہ دو روپے چار آنے)

یہ لاہور سے ایک نیا رسالہ جاری ہوا ہے - اس کے مرتب کرنے والے اختر شیرانی ' میاں محمد حسن بی-اے ' ایل ایل - بی ' محمد عمر فاروق ایم-اے ہیں- یہ "اُردو ادب و شعر کا ماہانہ مخزن" ہے اور فی الحقیقت اسم با مسمیٰ ہے - یہ نوجوانوں کا رسالہ ہے - اس کی تمہید (جو لمعات کے نام سے تحریر کی گئی ہے) پڑھ کر جی خوش ہوا کہ نوجوان اب فرسودہ روایات اور رواج کی تاب نہیں لا سکتے ' وہ اردو ادب میں ایک نئی روح پھونکنا چاہتے ہیں اور تقلید کے پھندوں سے آزاد ہونا چاہتے ہیں - لیکن مضامین دیکھنے کے بعد اس کی تصدیق نہ ہوئی - شاید آیندہ وہ اردو ادب کے پرانے کھنڈروں کو ڈھاکر نئی تعمیر کی بنیاد ڈالیں - رسالہ بیشک دلچسپ ہے - لکھنے والوں کو ذمہ داری کا احساس ہے - شروع میں سر محمد اقبال کی ایک چھوٹی سی اردو نظم ہے جو بطور تبرک کے درج کی گئی ہے - پروفیسر

شیرانی صاحب اس رسالہ میں شاعر اور شکاری کی حیثیت میں جلوہ گر ہوے ہیں - اس کا بہت کم صاحبوں کو علم ہوگا کہ جیسے وہ زبردست نقاد اور ادیب ہیں ویسے ہی زبردست شکاری بھی ہیں - "حکایات شکار" کے نام سے ان کا مضمون اُن کی ضخیم کتاب کا ایک باب ہے - یہ محض دل لگی کی باتیں نہیں ہیں بلکہ تاریخی تحقیق کے نتیجے ہیں —
اتنے کم چندے میں بہترین رسالہ ہے —

—— * ——

سفیر سخن

(اڈیٹر ابوالکیف کیفی سرحدی - پشاور - چندہ سالانہ دو روپے)

یہ ماہانہ رسالہ پشاور سے آنریبل نواب سر صاحبزادہ عبدالقیوم خاں صاحب کی سرپرستی میں شایع ہوا ہے - اردو ادب کی دلچسپیوں کا مجموعہ ہے - اور کوئی خاص بات نہیں ہے —

—— * ——

مرغ سحر

(اڈیٹر ڈاکٹر آئی - بی - ترک مان - سالانہ چندہ ایک روپیہ چار آنے ملنے کا پتہ :- سکرٹری پولٹری اکسپرٹ نمبر ۱ ، سلطانپور روڈ لکھنؤ)

یہ ماہانہ رسالہ مرغیوں کے پالنے اور پرورش کرنے اور مرغیوں کی تجارت کے متعلق ہے - خبریں بھی اس میں اسی فن کے متعلق ہوتی ہیں —

—— * ——

پھول جوبلی نمبر

(اڈیٹر شمس العلما مولوی سید ممتاز علی صاحب - لاہور - قیمت آٹھ آنے)

پھول بچوں کا عزیز رسالہ ہے یہ اس کا جوبلی نمبر ہے جو بڑے سلیقے اور خوش مذاقی سے مرتب کیا گیا ہے - لکھائی چھپائی نہایت عمدہ ہے - نظم و نثر کے مضامین جن میں بچوں کے لیے معلومات بھی ہیں اور تفریح بھی بہت خوبی سے جمع کیے گئے ہیں - بچوں کے واسطے بہت اچھا تحفہ ہے —

سالنامۂ کابل

یہ گذشتہ سالنامہ سے بھی زیادہ ضخیم اور پر از معلومات ہے - افغانستان کے حالات اور وہاں کے نظم و نسق اور مختلف اداروں وغیرہ کے متعلق بہت تفصیلی معلومات درج ہیں - علاوہ اس کے ممالک عالم کے حالات نیز مفید علمی اور تاریخی مضامین بھی جمع کئے گئے ہیں - سیلکڑوں رنگین تصویریں اور فوٹو اور کئی نقشے بھی ہیں - اس کی ترتیب میں ارکان انجمن ادبی نے بڑی محنت اور قابلیت سے کام کیا ہے اور اسے دیکھ کر اور پڑھ کر مسرت ہوتی ہے —

سائنس

انجمن ترقی اُردو کا سہ ماہی رسالہ

جس کا مقصد یہ ہے کہ سائنس کے مسائل اور خیالات کو اُردو داںوں میں مقبول کیا جائے۔ دنیا میں سائنس کے متعلق جو نئی بحثیں یا ایجادیں اور اختراعیں ہو رہی ہیں یا جو جدید انکشافات وقتاً فوقتاً ہوتے ہیں ان کو کسی قدر تفصیل سے بیان کیا جائے۔ ان تمام مسائل کو حتی الامکان صاف اور سلیس زبان میں بیان کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس سے اُردو زبان کی ترقی اور اہل وطن کے خیالات میں روشنی اور وسعت پیدا کرنا مقصود ہے۔

رسالے میں متعدد بلاک بھی شائع ہوتے ہیں۔

سالانہ چندہ سات روپے سکۂ انگریزی (آٹھ روپے سکۂ عثمانیہ) نمونے کی قیمت ایک روپیہ بارہ آنے سکۂ انگریزی (دو روپے سکۂ عثمانیہ) طلباء کے ساتھ یہ رعایت کی جاتی ہے کہ جو رسالہ بہ تصدیق پرنسپل صاحب (یا ہیڈ ماسٹر صاحب) انہیں پانچ روپے چار آنے سکۂ انگریزی (چھ روپے سکۂ عثمانیہ) سالانہ چندہ میں دیا جاتا ہے۔

امید ہے کہ اُردو زبان کے بہی خواہ اور علم کے شائق اس کی سرپرستی فرمائیں گے۔

انجمن ترقی اردو۔ اورنگ آباد دکن

Vol. 14 October 1934 No. 56

The Urdu

The Quarterly Journal

OF

The Anjuman -i-Taraqqi-e-Urdu

EDITED BY

ABDUL HAQ, B. A. (ALIG.)

HONORARY SECRETARY

Anjuman -i- Tarraqqi -e- Urdu, Aurangabad. (Deccan.)